تفسیرِ مکی

جلد سوم

اُستاذُ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ

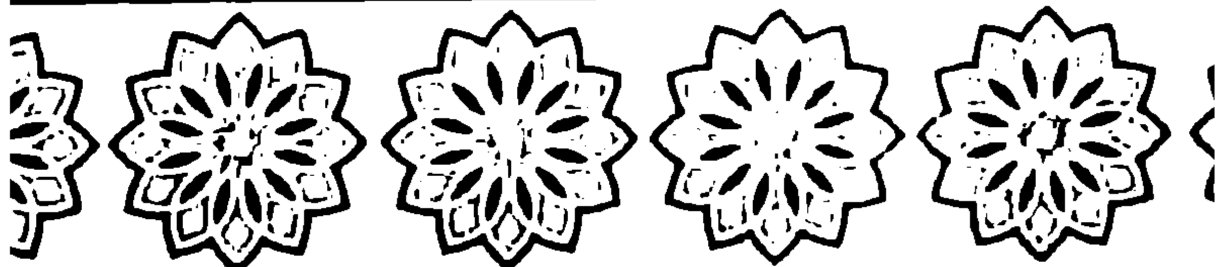
حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم

المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ



اللہ اللہ اللہ





تفسیرِ مکی

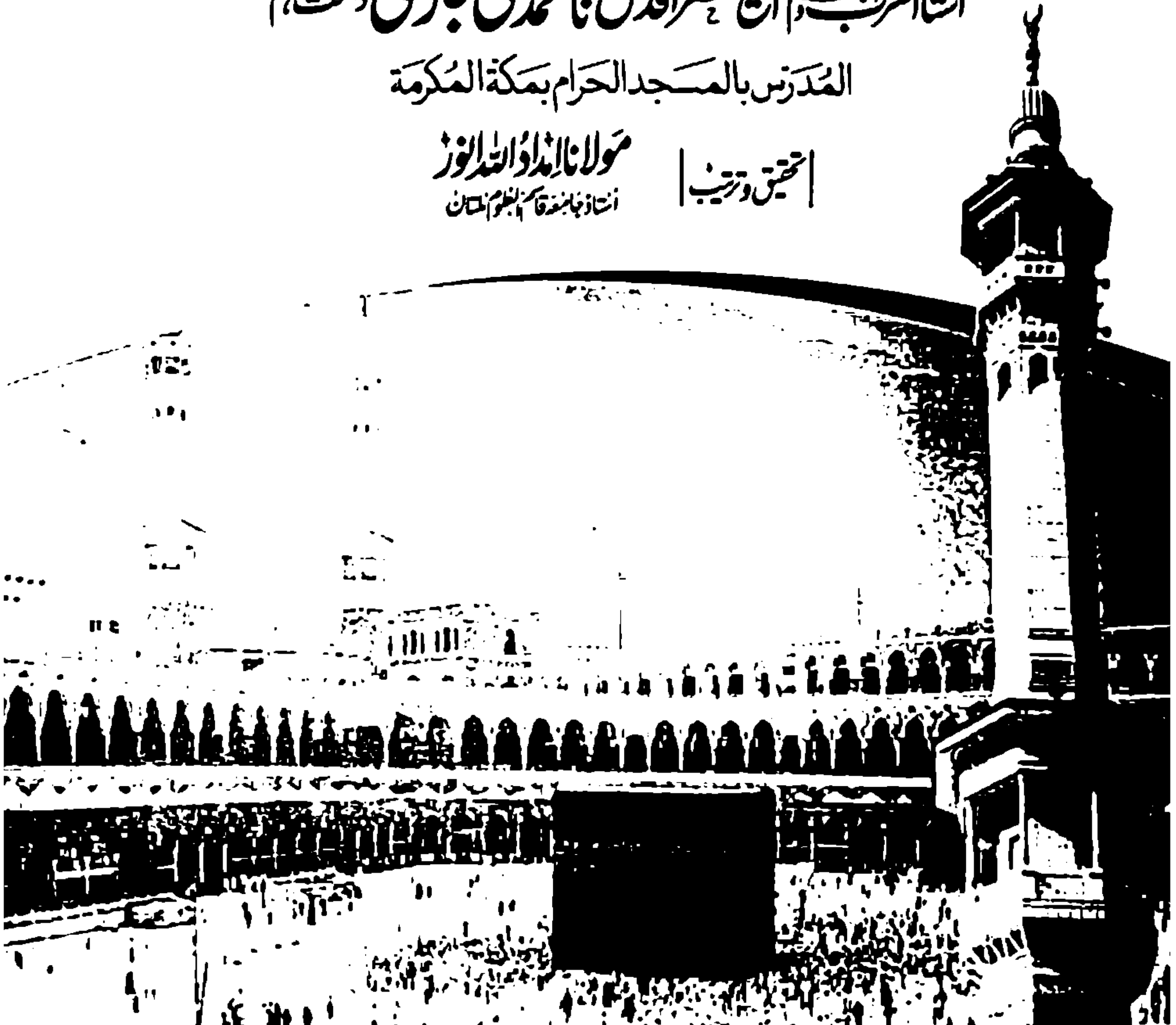
جلد 3

استاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم

المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ

تحقیق و ترتیب | مولانا امداد اللہ انور

استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان





نام کتاب — تفسیر مکی جلد 3

صاحب خطبات — استاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
المدرس بالمسجد الحرام بمكة المكرمة

تحقیق وترتیب — مولانا امداد اللہ انور
استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان

کمپوزنگ — دار التصنیف معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

اشاعت اول — مارچ 2019ء

تعداد — 1100

اجازت طباعت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمام خطبات تفسیر کی طباعت کی اجازت ہے

۳ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ



ناشر

مکتبۃ الفقیر

www.Tasawwuf.org

0300-9652292,03228669680
0335-7873390,03101702690
E-Mail : Alfaqeerfsd@yahoo.com



بسم الله الرحمن الرحيم



فہرست مضامین





تفسیر سورۂ بقرہ







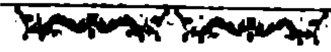














تفسیر سورۂ بقرہ



























عرضِ ناشر

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: 1 ...... بیت اللہ، 2 ...... کتاب اللہ، 3 ...... اہل اللہ۔

اور اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھنچ آنا امر بدیہی ہے، جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درسِ قرآن کے حلقہ میں کیا جاسکتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی، رمضان ہو یا شوال، حج کا موسم ہو یا عمرے کا، حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کا درسِ قرآن مسجدِ حرام میں بلا ناغہ ہوتا ہے۔ مسجد حرام میں دوسرے مشائخ کے دروس بھی ہوتے ہیں، تاہم جس کثرت سے اور ذوق شوق سے لوگ حضرت مکی مدظلہ کے درس میں شرکت کرتے ہیں، دوسرے دروس میں یہ کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ چنانچہ برِصغیر پاک و ہند، بلکہ پوری دنیا میں جہاں بھی اردو دان طبقہ حرم شریف میں آتا ہے، حضرت مکی مدظلہ کے درس سے مستفید ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحیدِ خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں وہاں عشقِ رسول ﷺ اور سلف صالحین کی عقیدت و احترام پر حرف نہیں آنے دیتے،

بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمالِ مہارت سے سامعین کو راہِ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے دروس کا خاصہ ہے۔

حضرتِ اقدس کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکرِ آخرت، اخلاص وتقویٰ، اخلاقِ حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر تفسیر ''انوار الحرم'' المعروف ''تفسیرِ مکی'' حضرتِ اقدس کے چند دروس کا مجموعہ ہے۔ جسے اس سے قبل اک اور ادارہ نے شائع کیا تھا اب اسے حضرت اقدس ہی کے حکم پر ''مکتبۃ الفقیر'' شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

اللہ رب العزت اس کتاب اور ''مکتبۃ الفقیر'' دونوں کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین ﷺ

اجازت ہو تو آکر میں بھی شامل ان میں ہو جاؤں
سنا ہے کل تیرے در پر ہجومِ عاشقاں ہو گا

قارئینِ کرام! گزارش ہے کہ اشاعت کے اس کام میں کہیں کوئی کمی، کوتاہی محسوس ہو یا اس کی بہتری کے لیے تجاویز رکھتے ہوں تو مطلع فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تا زیست اپنی رضا کے لیے یہ خدمت سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور اسے ہماری آخرت کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

دعاؤں کا طالب:
فقیر سیف اللہ احمد نقشبندی مجددی
مکتبۃ الفقیر



تفسیر سورۂ بقرہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَقُلْنَا يَآدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلٰى حِيْنٍ ۝﴾

[البقرۃ:۳۵،۳۶]

اور ہم نے کہا: اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور اس میں سے جہاں کہیں سے چاہو، کھاؤ اور اس درخت کے پاس مت جانا ورنہ تم ظالم ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے ان کو اس جگہ سے ہلا دیا، پھر ان کو اس عزت و راحت سے نکالا جس میں وہ تھے، اور ہم نے کہا: تم سب اُترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانہ ہے اور ایک وقت تک نفع اُٹھانا ہے۔

اماں حواء علیہا السلام کی پیدائش کا پس منظر:

مسجود الملائکہ بنانے کے بعد دوسرا فیصلہ ہوا کہ آدم علیہ السلام کو کتنی دیر جنت میں رکھنا ہے۔ چونکہ یہ اللہ کے علم میں تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقُلْنَا يَآدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ [البقرۃ:۳۵]

اس مسئلے میں ہمیں قرآن مقدس سے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ یہ حکم دونوں کے لیے تھا، آدم علیہ السلام کے لیے بھی ہے اور بی بی حوا علیہا السلام کے لیے بھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنت میں جانے سے قبل بیوی پیدا ہو گئی تھی۔ اگر بیوی پہلے پیدا نہ ہوئی ہوتی تو حکم دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور بی بی کے پیدا کرنے کے بارے میں جو روایات ملتی ہیں، ان میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آدم علیہ السلام پر ہلکی سی نیند (اونگھ) طاری کر دی۔ اس کی مزید تفصیل آگے آ رہی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۸، ۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

جدید دنیا جو آج اپنے علوم پر بڑا فخر کرتی ہے، اصل میں یہ سب کچھ ان لوگوں نے قرآن سے حاصل کیا ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ ایمان نہیں لے آتے۔ آج کل آپ دیکھیں! اگر تو کوئی معمولی سی چیز ہو تو ایسے کاٹ دیتے ہیں، لیکن اگر کوئی بڑا آپریشن ہو تو کہتے ہیں کہ اس سے پہلے مریض کو بے ہوش کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ اگر ہم بے ہوش کیے بغیر ایک آدمی کا پورا ہاتھ کاٹ دیں تو وہ کیسے برداشت کرے گا؟ آخر انسان ہے، اس کو ٹانکے بھی لگانے پڑیں گے، اندر سے گندگی نکالنی ہوگی۔ آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اب وہ بے ہوش پڑا ہے، اسے کچھ پتہ ہی نہیں ہے کہ میرا آپریشن بھی ہو گیا اور ٹانکے بھی لگ گئے۔ جب ہوش آیا تو سب کچھ ہو چکا تھا، وہ مرحلہ گزر گیا۔ اب اگر کوئی درد ہو گا تو گولی دے دیں گے، اس پر ٹنکچر لگا دیں گے۔ تو یہ ساری چیزیں ہوتی ہیں۔

اللہ کا نظام دیکھیں! اللہ قادر تھے کہ آدم علیہ السلام جاگتے رہتے اور حواء کو پیدا کر دیتے، لیکن ان کو سلایا گیا۔ جب ان کو نیند آ گئی تو ان کی بائیں پسلی سے آدم علیہ السلام کی بیوی سیدہ حواء علیہا السلام کو پیدا کیا گیا۔ یہ کمالِ قدرت ہے کہ اللہ چاہیں تو اسی وقت مکمل عورت بن جائے۔

جیسا کہ ایک صحابی نے پوچھا کہ حضور! جنت میں اونٹنیاں بھی ہوں گی؟...... اعرابی لوگوں کو اونٹ بڑا پسند ہوتا تھا۔ اب تک بھی دیکھیں کہ ان کو اونٹ، گھوڑا بڑا پیارا ہے، لاکھوں میں اونٹ کو خریدتے ہیں...... آپ ﷺ نے فرمایا: جو چاہو گے وہ ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ حضور! اگر اونٹنی ہو گی تو پھر اونٹنی کے بچے بھی ہوں گے اور اونٹنی کا دودھ بھی ہوگا؟...... کیونکہ یہ لوگ اونٹ کو بڑا محبوب رکھتے ہیں...... حضور ﷺ نے فرمایا: جب تم تمنا کرو گے اسی وقت اونٹنی حاملہ ہو جائے گی، اسی وقت بچہ پیدا ہو جائے گا اور اسی وقت دودھ دینا شروع کر دے گی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا میں حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو پتھر سے پیدا کر کے دکھلا دیا کہ اللہ اس بات پر قادر

ہیں کہ پتھر سے اونٹنی نکل آئے اور وہ حاملہ بھی ہو، وضع حمل بھی ہو جائے اور اسی وقت دودھ دینا شروع کر دے۔

اس طرح بی بی حواء علیہا السلام کو اللہ نے آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے زندہ نکالا، اس لیے ان کا نام حواء پڑ گیا، کیونکہ ''حی'' زندہ کو کہتے ہیں اور ''میت'' مردہ کو کہتے ہیں تو بی بی صاحبہ کو زندہ آدم علیہ السلام سے نکالا گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

عورت، مرد کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئی:

علماء نے لکھا ہے کہ اس میں بھی اللہ کی حکمتیں ہیں:

ایک تو عورت کو بائیں طرف سے پیدا کیا گیا، کیونکہ دائیں طرف کی افضلیت واضح ہے، جتنا دایاں ہاتھ افضل ہے اُتنا بایاں نہیں ہے، اور کام دونوں کے بغیر نہیں ہو سکتا، اسی طرح مرد و عورت نہ ہوں تو گاڑی بھی نہیں چل سکتی۔ لیکن دائیں ہاتھ میں اللہ نے زیادہ قوت رکھی ہے، زیادہ خیر والے کام دائیں سے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی بڑا آدمی ہو تو آپ اس کو دائیں جانب بٹھائیں گے، مسجد میں داخل ہوں گے تو دایاں قدم پہلے رکھیں گے، کھانا کھائیں گے تو دایاں ہاتھ استعمال کریں گے۔

میں یہ بات اسلام کے نقطۂ نظر سے عرض کر رہا ہوں، جن لوگوں کا مذہب اسلام نہیں ہے تو ان کے نزدیک نہ دائیں کی کوئی اہمیت ہے اور نہ بائیں کی کوئی بات ہے۔ ان کے لیے تو سب برابر ہے، اس لیے کہ جب اسلام ہی دل و دماغ کے اندر نہ ہو تو یہ باتیں سمجھ نہیں آتیں۔ وہ کہتے ہیں: دایاں کیا ہے؟ اور بایاں کیا ہے؟ حالانکہ اُصولاً اگر دیکھا جائے تو یہ بڑی بد بخت قوم ہے۔

آپ دیکھیں! مثلاً کوٹ ہے یا واسکٹ ہے، اس کے اندر جو بٹن لگائے جاتے ہیں، آپ کے بٹن کس طرح ہوتے ہیں؟ اس میں انگریز بھی فرق کرتا ہے کہ مرد کے بٹن ایک طرف ہوں گے اور عورت کے بٹن دوسری طرف ہوں گے، اس لیے کہ بعض اوقات ایک جیسے کوٹ ہوتے ہیں تو بٹن سے پہچانا جاتا ہے کہ بائیں طرف ہیں یا دائیں طرف ہیں۔ اس حد تک وہ اپنے معاملات میں فرق کرتے ہیں، لیکن جب اسلام کی بات آ جائے تو کہتے ہیں کہ دایاں کیا اور بایاں کیا ہے؟

عورت میں ٹیڑھا پن:

اللہ نے بی بی حواء علیہا السلام کو بائیں پسلی سے پیدا کیا اور اس کے لیے حدیث مبارک میں ایک مثال بھی دی گئی



ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ عورت کو ٹیڑھی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ اس میں کچھ نہ کچھ ٹیڑھا پن ہوتا ہے، کچھ نہ کچھ کجی ہوتی ہے، ایسا نہ ہو کہ سیدھا کرنا چاہو اور توڑ ڈالو، اور اس کو اپنے حال پر بھی نہ چھوڑ دو کہ زیادہ ٹیڑھی ہو جائے۔ تھوڑا ٹیڑھا پن تو ہر عورت کے اندر ہوتا ہے، چاہے وہ کتنی بڑی عظیم عورت کیوں نہ ہو۔ لہٰذا وہ برداشت کرو۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان کے ساتھ گزارا کرو، اگر کوئی غلطی ہو جائے تو برداشت کرلو، کوئی کام تمہارے منشاء کے خلاف ہو جائے تو صبر کرلو۔ اور بالکل آزاد نہ چھوڑ دو، اس پر کنٹرول بھی رکھو، ورنہ یہ مزید ٹیڑھی ہو جائے گی۔ [صحیح البخاری، حدیث:٥١٨٦، باب: الوصاۃ بالنساء]

حضور ﷺ نے کتنی پیاری مثال دی!! فرمایا کہ تمہارا ایک ڈنڈا لٹکتا رہے، موجود رہے۔ فرمایا: مارو نہیں، استعمال بھی نہ کرو، لیکن اسے احساس تو رہے کہ گھر میں ایک چیز موجود ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کنٹرول ہو اور برداشت بھی ہو تو گاڑی چلے گی۔ چھوٹی موٹی غلطی ہو جائے تو اس کو برداشت کرو، کیونکہ اس کی پیدائش ہی ایسی جگہ سے ہوئی ہے کہ اس کے اندر کجی فطری طور پر ہوتی ہے۔

بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے اندر یہ حکمت بھی تھی کہ مرد اور عورت کا آپس میں قلبی تعلق بھی قائم رہے۔ چونکہ ہر آدمی کا دل بائیں طرف ہے اور بائیں طرف کا جو پستان ہے اس سے اپنے ہاتھ کی دو انگشت نیچے دل ہوتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت میں ہر چیز کی حکمتیں ہیں، اگر وہ چاہتے تو دائیں پسلی سے بھی پیدا فرما سکتے تھے، لیکن بائیں پسلی سے پیدا فرمایا کہ ایک قلبی تعلق مرد اور عورت کا ہوتا ہے۔

شادی شدہ عورت کی اپنے گھر کی طرف توجہ:

اب دیکھیں کہ ایک عورت کی شادی ہو جاتی ہے۔ اگر صحیح مقام پر رشتہ ہو جائے اور میاں بیوی میں محبت پیدا ہو جائے تو وہ اپنے ماں باپ کو بھی بھول جاتی ہے۔ یہ خدا کی قدرت ہے! چنانچہ اگر وہ ماں باپ کو ملنے آجائے اور شام ہونے لگ جائے تو کہے گی کہ میں نے گھر جانا ہے۔ اور قدرت کی بات دیکھیں کہ جس گھر میں پرورش پاتی ہے اور اٹھارہ برس گزارتی ہے اور جو ماں باپ اس کو پالتے ہیں، پھر اس کی شادی کے لیے اچھی جگہ ڈھونڈتے ہیں اور اپنی طاقت کے مطابق اس کی شادی پر زیور اور کپڑا دیتے ہیں، اس گھر کو لڑکی اپنا گھر نہیں کہتی، جب شادی ہو جائے اور خاوند کے گھر چلی جائے تو کہتی ہے کہ یہ میرا گھر ہے۔ اگر ماں باپ کے گھر بیٹھی ہو اور کہے کہ جانا چاہتی ہوں اور وہ یہ پوچھیں کہ کہاں جانا چاہتی ہو تو کہتی ہے کہ اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ عورت کا گھر تب بنتا ہے جب وہ کسی کی

بیوی بنتی ہے، اسی سے پھر اُنس ہوتا ہے، اسی سے پھر تعلق ہوتا ہے، اسی سے پھر اللہ پاک دلوں کے اندر مودّت اور محبت پیدا کرتے ہیں۔

اصل بیوی تو وہی ہے کہ اللہ دونوں میں محبت، مودّت اور سکون نصیب فرمائے، ورنہ تو ایک جہنم ہے۔ اگر انسان کو محبت کرنے والی، حیا والی بیوی مل جائے تو دنیا کے اندر جنت ہے، وگرنہ دنیا کے اندر جہنم ہے کہ جب بھی گھر جائے تو لڑائی، جب بھی گھر جائے جھگڑا اور جب بھی گھر جائے فتنہ!!! بس شکایات کے بنڈل کہ اس نے یہ کہا تھا اور میں نے یہ کہا تھا۔ کبھی ہمسائے سے لڑائی اور کبھی ہمسائے کے گھر والوں سے لڑائی، کبھی اس کا گلہ اور کبھی اس کا شکوہ، کبھی اس کی شکایت اور کبھی اس کے خلاف بات، کبھی ماں کے خلاف، کبھی سسر کے خلاف، حتیٰ کہ خاوند کو اس کے ماں باپ سے چھڑائے گی، تب اس کو آرام آئے گا۔

عورت، مرد برابر نہیں ہو سکتے:

اللہ کی شان ہے کہ اس نے عورت کو بائیں پسلی سے پیدا کیا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں عورت کی عزت نہیں۔ یہ غلط بات ہے۔ اسلام میں عورت کا بہت بڑا مقام ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ لوگوں نے عزت اس کو سمجھ لیا ہے کہ اگر مرد مصلّی پہ کھڑا ہے تو عورت بھی مصلّیٰ پر کھڑی ہو، تب تو عزت ہے وگرنہ کوئی عزت نہیں، اگر مرد نبی بنتا ہے تو عورت کو بھی نبی بناؤ، مرد کو خلافت ملتی ہے تو عورت کو بھی ملے، مرد کو عہدہ ملتا ہے تو عورت کو بھی عہدہ ملے، تب برابر ہوں گے، وگرنہ ہماری بے عزتی ہوگئی۔ حالانکہ یہ غلط بات ہے۔ اُصول یہ ہے کہ جو جس چیز کا مستحق ہے، اللہ نے وہ اس کو عطا کی ہے۔ وہ بنانے والے ہیں، وہ خالق ہیں، وہ مالک ہیں، اگر کسی انسان نے ایک گلاس بنایا تو اس کو اس کی باریکیوں کا پتہ ہے کہ اس میں کون سا مادہ استعمال ہوا، پلاسٹک کون سا استعمال ہوا ہے، یہ کتنا عرصہ چلنے کے لیے ہے، اس کے اندر کیا کیا خرابی ہے؟ اور کیا کیا اچھائی ہے؟ وہ مالک جس نے انسان کو پیدا کیا ہے، اس نے فیصلے کر دیئے ہیں کہ یہ فرائض مرد کے ہیں اور یہ عورت کے ہیں۔

یہ تو شکر کرو کہ عورتوں کے ہاتھوں میں نہیں، ورنہ وہ کہتیں کہ اگر ایک بچہ مجھے پیدا ہو تو ایک مرد کو پیدا ہو، تب ہم برابر ہوں گے۔ اور ایک مہینہ مجھے حیض آئے تو ایک مہینہ مرد کو آئے، تب ہم برابر ہوں گے۔ اللہ نے فرائض رکھے ہیں، یہ مردوں کے فرائض ہیں اور یہ عورتوں کے فرائض ہیں۔ انہی کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتیں اور انہی کے اندر حکمتیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اسلام اور ایمان ہو۔ اگر ان چیزوں سے محروم ہو تو کم از کم اس کے اندر اتنی عقل سلیم تو

ہو کہ دن کو دن کہے اور رات کو رات کہے۔

آدم علیہ السلام کے جنت میں جانے سے پہلے ان کو نیند آ گئی۔ جب اُٹھے اور دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ میری بیوی ہے کہ گوشت بھی میرا، خون بھی میرا، اسی سے اللہ نے میری بیوی پیدا کی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کا نکاح کس نے پڑھا تھا؟ بات یہ ہے کہ نکاح کا حکم دینے والے اللہ ہیں، اللہ کو مانیں گے تو نکاح ہے، اللہ کو جو نہ مانے، ان کے لیے بیٹی بھی حلال ہے، بہن بھی حلال ہے، بیوی بھی حلال ہے۔ جو لوگ خدا کو مانتے ہی نہیں ہیں، نکاح کے قائل نہیں، بلکہ اس کے برخلاف متعہ کے جواز کے قائل ہیں، ان کے مذہب میں اگر ایک عورت کے ساتھ بیس آدمیوں نے متعہ کیا تو پتہ نہیں کہ کس کا نطفہ ٹھہر گیا؟ اس سے جو لڑکی پیدا ہوئی، اس کا باپ پھر اسی سے جا کر متعہ کر لے۔ ایسے واقعات پر لوگوں نے باقاعدہ کتابیں لکھی ہیں۔

متعہ کے حرام ہونے کی وجہ:

ایک آدمی کا ایک طوائف سے تعلق تھا، اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس نے طوائف کو بھگا دیا۔ وہ لڑکی جوان ہوئی، پھر وہ طوائف بنی تو اسی خاندان کے لڑکے نے پھر اس سے تعلق رکھا۔ اس کو تو پتہ نہیں تھا کہ یہ میرے باپ کا نطفہ ہے۔ کافی عرصہ بعد جا کر اس پر یہ راز کھلا کہ یہ تو میرا بھائی ہے۔

اسلام نے متعہ کو کیوں حرام قرار دیا؟ زنا سے کیوں منع کیا؟ اس لیے کہ متعہ یا زنا کے نتیجے میں ہونے والی اولاد کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں ہوتا کہ یہ کس کے نطفے سے ہوئی ہے؟ کیا پتہ کہ اس کا باپ کون بنے گا؟ یہ عورت کس کی وارث بنے گی؟ اس کے نطفے کا، سکنیٰ کا، رہائش کا، ہر چیز کا کون ذمہ دار ہوگا؟ وہ تو ٹائم پاس ایک بات ہوگئی کہ وقت گزارا اور چل دیئے۔ اس لیے شریعت نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام وحواء علیہا السلام کے باہمی نکاح کا احوال:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو باقاعدہ نکاح کا حکم دیا۔ جب اللہ نے فرمادیا کہ تمہاری بیوی ہے تو بات ختم ہوگئی...... نکاح کا سارا مسئلہ ہم اس لیے کرتے ہیں، تاکہ اللہ کے حکم کے مطابق بیوی حلال ہو جائے۔ قاضی کو بلاؤ، گواہوں کو بلاؤ، ایجاب وقبول کراؤ اور اعلان کرو، تاکہ اللہ کا حکم پورا ہو جائے اور شریعت کے مطابق یہ میری بیوی

کہلانے کی حقدار ہو، میرے لیے حلال ہو...... اور جب خود خالق فرمادے کہ یہ تمہاری بیوی ہے تو پھر کسی مولوی کو بلانے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر کسی قاضی کی یا گواہوں کی کیا ضرورت ہے؟ ابھی تو وہاں آدم علیہ السلام کی اولاد ہی پیدا نہیں ہوئی تو گواہوں کے ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے؟ ابھی تو قاضی صاحب بھی پیدا نہیں ہوئے، گواہ پیدا نہیں ہوئے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی حواء علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی بیوی قرار دے دیا۔ اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود حکم دیا: ﴿وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ [البقرۃ: ۳۵] جب اللہ نے فرمادیا کہ "تم اور تمہاری بیوی" تو باقی تفصیل میں جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

حضور ﷺ کا حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے آسمان پر نکاح:

احادیثِ صحیحہ میں یہ واقعہ موجود ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کی طلاق کے بعد بی بی زینب رضی اللہ عنہا کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ حالانکہ بی بی زینب رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی پھوپھی کی لڑکی تھیں، انہوں نے عرض کیا کہ میں انکار نہیں کرسکتی، جب تک کہ میں استخارہ نہ کرلوں۔

اور استخارے کا حکم بھی تو ہمیں حضور پاک ﷺ نے دیا ہے کہ اگر کوئی کام کرنا ہو، شادی کرنی ہو، تجارت کرنی ہو تو پہلے استخارہ کرلو۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۳۵۱۶]

اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت نماز پڑھو اور اس کے بعد دعائے استخارہ پڑھ لو۔ ایک تو استخارہ کی لمبی دعا ہے، اگر اس کا موقع نہ بھی ملے تو حدیث مبارک میں دو لفظ آتے ہیں: "أَللّٰهُمَّ خِرْ لِيْ وَ اخْتَرْ لِيْ"۔ دو رکعت استخارہ کی نیت سے پڑھ لیں، اس کے بعد یہی دعا سات مرتبہ پڑھ کر سو جائیں۔ اس طرح سات راتوں تک کریں۔ ان شاء اللہ! اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لیے کوئی نہ کوئی جہت متعین ہوجائے گی۔ اگر کرنے کی ہے تو اس میں خیر ہے، یعنی ہم نے اللہ سے پوچھ لیا، اس کے بعد کوئی نقصان ہوگا ہی نہیں۔

[تفسیر القرطبي: ۱۳/۳۰۷، القصص: الآیۃ: ۲۸]

صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ ہمیں استخارہ کی دعا ایسے یاد کرواتے تھے جیسے قرآن سکھا رہے ہوں۔ یعنی اتنی اہم بات تھی اور آج مسلمانوں کے اندر یہ سب سے غیر اہم بات ہے۔ نعوذ باللہ! کتنے لوگ ہیں جو استخارہ کرتے ہیں؟ مسلمان ان سب چیزوں کو بھول گئے۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۶۳۸۲، بابُ: الدُّعاءِ عِنْدَ الاِسْتِخارَۃِ]

شریعت کے اندر اصول یہ ہے کہ آپ دوستوں سے مشورہ بھی لیں اور استخارہ بھی کریں۔ حدیث میں آتا ہے کہ جس نے استخارہ کرلیا، وہ کبھی نامراد نہیں ہوگا اور جس نے مشورہ کرلیا، وہ کبھی شرمندہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ مثال مشہور ہے کہ ایک ایک ہے اور دو ملیں تو گیارہ ہو جاتے ہیں۔ مختلف رائے سامنے آنے کے بعد آدمی کو مشورہ مل جاتا ہے۔

تو بی بی زینب رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میں استخارہ کروں گی۔ اتنی دیر میں جبرائیل علیہ السلام نازل ہو گئے، اللہ نے آسمانوں سے حکم دے دیا: ﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا﴾ [الاحزاب: ۳۷] اللہ نے فرمایا: ہم نے آپ کا نکاح کر دیا، بی بی زینب آپ کی بیوی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حکم کے بعد بی بی زینب کے گھر آئے تو بی بی زینب بول پڑیں کہ آپ میری اجازت کے بغیر اس وقت میں میرے گھر میں کیسے آ گئے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے میرا نکاح کر دیا ہے، قرآن پاک میں آیت نازل ہوگئی ہے۔

[المعجم الكبير للطبراني، حديث: ۱۱۰، ذِكرُ تزويج النبيِّ صلى الله عليه وسلم زَينب...]

اس کے بعد سے بی بی صاحبہ باقی ازواجِ مطہرات پر اس بات میں ہمیشہ فخر فرماتی تھیں کہ تم عورتوں کا نکاح تمہارے والدین اور بھائیوں نے کیا ہے اور میرا نکاح میرے اللہ نے کیا ہے۔

ایسا سوال کرنا جہالت کی دلیل ہوتی ہے کہ آدم علیہ السلام کا نکاح کیسے ہوا تھا؟ قاضی کون تھا؟ گواہ کون تھے؟ خدا کے بندے! جب قرآن میں موجود ہے، جب اللہ نے خود ان کو آدم علیہ السلام کی بیوی بنا دیا ہے تو پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

تفسیر:

﴿وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ جب اللہ کی طرف نسبت ہو تو صیغہ جمع کا لا کر کہیں کہیں ایسے انداز میں خطاب ہوتا ہے۔

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ﴾ وہاں قصہ کی ابتداء ہو رہی تھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے پاک پیغمبر کو سنا رہے تھے: "اُذْكُرْ يَا مُحَمَّدُ!" پھر جب قصہ شروع ہوگیا اور سارا منظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہے تو فرمایا: ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ گویا ایسی منظر کشی کی کہ ابھی آدم علیہ السلام کو سجدہ ہو رہا ہے۔ اس لیے یہاں فرمایا: ﴿وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ ہم نے حکم دیا: اے آدم! ٹھہرو تم بھی اور تمہاری بیوی بھی، تم دونوں جنت میں رہو۔

حضرت آدم علیہ السلام آسمان والی جنت میں رہتے تھے:

جنت سے مراد کون سی جنت ہے؟ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کے اندر معتزلہ اور قدریہ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ

جنت یہاں زمین میں تھی جو ایک بڑا خوبصورت باغ تھا۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ جمہور اسلاف کا یہ فیصلہ ہے اور اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ جنت آسمانوں میں ہے، جس کے اندر آدم علیہ السلام کو رکھا گیا۔ اور یہی قرآن کا سیاق و سباق ہے کہ اگر جنت آسمانوں میں نہیں تو اُتارنے کا کیا فائدہ ہے؟ اگر زمین میں ہوتے تو حکم ہوتا کہ نکلو، حالانکہ لفظ ''اِهْبِطُوْا'' کا ہے۔ اور جمہور اہل سنت والجماعت کا یہ مسلک اور عقیدہ ہے کہ جنت آسمانوں میں ہے اور جنت میں تکلیف کا نہ ہونا اور نہ نکالا جانا، یہ عالم آخرت کے بعد کے حکم ہیں، اور آدم اور حواء علیہما السلام پر جو پابندی لگی اور جنت سے نکالے گئے تو یہ عالم آخرت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ جیسا کہ معراج کی رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی جنت میں داخل ہوئے تھے، لیکن پھر واپس تشریف لے آئے۔ تو دار العمل یعنی دنیا کے اختتام پر دار الجزاء میں جانے پر جنت کے یہ خواص ظاہر ہوں گے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی مفصل بحث ''سورۃ الاعراف'' میں ذکر ہوگی، لیکن بہر حال قول اول راجح ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں ٹھہرایا اور اس سے مراد ''جنت الخلد'' ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۸، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

ان آیات میں کئی مراحل ہیں: پہلا مرحلہ تخلیقِ آدم کا، دوسرا مرحلہ تعلیمِ آدم کا اور تیسرا مرحلہ تکریمِ آدم کا تھا۔ اس کے بعد جنت میں جانے کا حکم دیا اور اس حکم کی نسبت بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے، فرشتوں کو واسطہ نہیں بنایا۔ اس میں بھی آدم علیہ السلام کی بہت بڑی عزت ہے۔

اسی آیتِ مبارکہ میں ''الجنۃ'' معرف باللام آیا ہے، اس سے وہ جنت مراد ہوتی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہو۔ اور آپ اسی سورت میں پڑھ چکے ہیں ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۳] تو اس آیت میں دنیا کے باغ کی خوشخبری تو نہیں تھی، کیونکہ پہلے جہنم کا ذکر تھا کہ جو کافر قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکے اور قیامت تک بھی نہیں کر سکیں گے، ان کے لیے ہم نے جہنم تیار کی ہے کہ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ اب جہنم کے بعد مومنوں کے لیے جو خوشخبری ہے تو وہ اسی جنت کی ہے۔ چونکہ اس جنت کا پہلے ذکر ہو چکا تھا تو اب اللہ نے اس جنت کا ذکر ''الف لام'' کے ساتھ فرمایا۔ لہٰذا اس سے مراد وہی جنت ہے جس کی پہلے خوشخبری دی جا چکی ہے تو وہ بھی جنت الخلد مراد تھی اور اس سے مراد بھی جنت الخلد ہے، دنیا کی جنت اس سے مراد نہیں ہے۔ اسے اصطلاح میں ''معرف باللام'' کہتے ہیں۔ یعنی لفظ ''جنۃ'' کو

الف لام عہد خارجی کے ساتھ سابقہ مذکورہ جنت کے معنی میں معروف کیا گیا۔ اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہو۔ [تفسیر القرطبی: ۱/ ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

جیسے اللہ پاک نے قرآن مقدس میں فرمایا:

﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝﴾ [الانشراح: ۵،۶]

حضور ﷺ نے فرمایا کہ "عسر" ایک ہے اور "یسر" دو ہیں۔ فرمایا کہ کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک "عسر" دو "یسر" پر غالب آ جائے، حالانکہ قرآن میں "عسر" کا ذکر بھی تو دو دفعہ آیا ہے اور "یسر" کا ذکر بھی دو دفعہ آیا ہے، لیکن حضور ﷺ نے فرمایا: "عسر" ایک ہے اور "یسر" دو ہیں۔[1] وجہ یہ ہے کہ "یسرًا" بغیر الف لام کے ہے تو پہلا "یسر" علیحدہ ہے اور دوسرا "یسر" علیحدہ ہے، لیکن دوسرے "العسر" پر الف لام ہے تو اس سے مراد وہی پہلے والا "عسر" ہے، لہٰذا "عسر" ایک ہو گیا اور "یسر" دو ہیں۔[2] تو یہاں بھی جب لفظ "الجنۃ" آیا تو "جنت" وہی پہلے والی مراد ہے جس کا ذکر قرآن مقدس کے اندر ہو چکا ہے۔

مفسرین کرام، محدثین کرام نے ایک استدلال حدیث مبارک سے بھی کیا ہے جو صحیح مسلم میں موجود ہے۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ ذکر فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن جب لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں آئیں گے تو کہیں گے: "يَا أَبَانَا! اسْتَفْتِحْ لَنَا أَبْوَابَ الْجَنَّةِ" (حضرت آدم! مہربانی کرو اور ہمارے لیے جنت کا دروازہ کھلواؤ) آدم علیہ السلام فرمائیں گے: خدا کے بندو! تم مجھ سے جنت کا دروازہ کھلوانا چاہتے ہو، مجھے جنت سے نکلوانے کا ذریعہ بھی تو میری غلطی تھی، میری غلطی کی وجہ سے تو تم جنت سے نکالے گئے تھے اور اب تم مجھ سے جنت کا دروازہ کھلوانا چاہتے ہو، میں شفاعت نہیں کر سکتا، تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۳۲۹، باب: أَدْنَى أَهْلِ الْجَنَّةِ مَنْزِلَةً فِيهَا]

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی جنت تھی جس کے اندر حضرت آدم علیہ السلام رہتے تھے، جس سے آدم علیہ السلام کو نکالا گیا۔ اگر وہ جنت زمین والی ہوتی، کوئی باغ ہوتا تو پھر اس سے نکالنے اور اس میں کی گئی غلطی کا تذکرہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ یہ مکالمہ روزِ قیامت کا ہے، اس وقت تو دنیا ختم ہو چکی ہو گی۔ اس لیے علماء

---

[1] [المستدرک علی الصحیحین للحاکم، حدیث: ۳۹۵۰، تفسیر سورۃ الم نشرح]

[2] [شرح مشکل الآثار، حدیث: ۲۰۲۴، باب بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ مِنْ قَوْلِهِ: "الْمُؤْمِنُ..."]

نے فرمایا کہ جنت سے مراد وہی "جنت الخلد" ہے۔

اسی طرح صحیح حدیث مبارک میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے دربار میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آپس میں ایک مکالمہ ہوگا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام سے یہ کہیں گے کہ آپ ہمارے ابا ہیں، ابوالبشر ہیں اور آپ وہی ہیں جن کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا اور جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود روح پھونکی اور جس کو اللہ نے اپنی جنتوں میں ٹھہرایا، لیکن تم نے ہمیں جنت سے نکالا۔ حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے کہ اے موسیٰ! تم اللہ کے نبی ہو، کیا تم نے تورات میں یہ نہیں پڑھا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے پیدا ہونے سے بھی پہلے اور زمین وآسمان کے پیدا ہونے سے بھی پہلے تورات میں لکھا ہوا تھا کہ ایسے ہوگا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہیں گے: لکھا ہوا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب آدم علیہ السلام غالب آجائیں گے کہ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ جو تقدیر کے فیصلے ہونے تھے، وہ ہونے تھے، ان کو دنیا کی کوئی طاقت بدل نہیں سکتی۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام چپ ہو گئے۔

[صحیح البخاري، حدیث: ٦٦١٤، باب: تحاجّ آدمُ وموسى عند الله]

الحاصل یہ کہ اللہ کی تقدیر کے سامنے کون بات کر سکتا ہے؟ اس لیے علماء نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی آدم علیہ السلام کو یہ کہیں گے کہ اللہ نے آپ کو اپنی جنت میں ٹھہرایا اور پھر اس جنت سے آپ نے ہمیں نکلوایا۔

جنت ہمیں نظر کیوں نہیں آتی؟

بعض لوگ اشکال کرتے ہیں کہ اگر جنت آسمانوں میں ہے تو ہمیں نظر کیوں نہیں آتی؟ یا جہنم اگر زمینوں میں ہے تو ہم نے اب تک کیوں نہیں دیکھی؟ حالانکہ ہم نے ایسی ایسی نئی ایجادات کی ہیں کہ ہم نے زمین کے چکر بھی لگا لیے ہیں اور پوری زمین کے اردگرد ہمارے سیارات گھوم چکے ہیں۔

یہ محض ایک جہل کی بات ہے، یہ دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اتنے سیارات ہیں کہ جن کی ابھی روشنی بھی زمین پر نہیں پہنچی ہے۔ تم تو ابھی تک چاند کے اندر مغز ماریاں کر رہے ہو، اللہ کے کئی اتنے بڑے سیارات ہیں، جن کو ہم ابھی تک نہیں دیکھ سکے تو اللہ کی جنتیں (جب تک اللہ ہمیں نہ دکھلائے) ہم کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ اور دوسری بات قرآن مقدس میں یہ بھی منصوص ہے کہ آدمی چاہے کتنی اونچی اُڑان اُڑ لے، لیکن آسمانوں میں داخل نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ

﴿فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ [الاعراف: ۴۰]

دنیا میں ہر وقت کہیں نہ کہیں نماز کی اذانیں ہو رہی ہیں:

ایک آدمی نے تحقیق کی ہے اور مشینوں کے ذریعے یا کمپیوٹر کے ذریعے حساب لگایا ہے اور عجیب اللہ کی قدرت معلوم ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ اللہ نے جو یہ نظام رکھا ہے، اس میں اوقات کا فرق ہے۔ مثلاً یہاں آٹھ بج رہے ہیں تو آپ کے ملک میں دس بج رہے ہیں اور اسی طرح بعض ملکوں میں ابھی چھ بجے ہیں اور بعض ملکوں میں ابھی چار بجے ہیں، یعنی کہیں دو گھنٹے آگے، کہیں چار گھنٹے آگے اور کوئی دو گھنٹے پیچھے۔ کہیں دن ہے اور کہیں رات۔ ایک فرق چلا آرہا ہے۔ اس حساب سے معلوم ہو رہا ہے کہ تمام عالم جو اس وقت دنیا میں موجود ہے یعنی جو ملک زمین پر موجود ہیں، کوئی وقت ایسا نہیں ہے جس میں کسی نہ کسی جگہ ''اللہ اکبر'' کی صدا بلند نہ ہو رہی ہو۔

آپ اندازہ فرمائیں کہ پورے عالم کے اس نظام کو اللہ نے اقالیم سبعہ میں تقسیم کر دیا۔ یہ اقالیم سبعہ کے اوقات کا اختلاف اس لیے ہے کہ خداوند قدوس نے ہمیں توجہ دلائی ہے کہ ﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا﴾ [الفرقان: ۶۲] ہم نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا خلیفہ بنا دیا، اور کہیں فرمایا: ﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ [الحج: ۶۱] ہم رات کو دن میں داخل کرتے ہیں اور کبھی ہم دن کو رات میں داخل کر دیتے ہیں، اور کسی مقام پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ غور کرو ﴿وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ﴾ [القصص: ۷۳] اللہ تعالیٰ کی رحمت میں سے ہے کہ تمہارے لیے دن اور رات کا ایک نظام بنایا ہے۔

اب جدید تحقیق نے یہ بات واضح کر دی ہے، کمپیوٹرائزڈ طریقے سے حساب کیا ہے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دنیا میں چوبیس گھنٹے کے اندر ایک سیکنڈ بھی ایسا نہیں گزرتا کہ جب ''اللہ اکبر، اللہ اکبر'' کی آواز بلند نہ ہو رہی ہو، یعنی اگر سعودی عرب کے اندر ایک اذان کی آواز ختم ہو رہی ہے تو اسی وقت دوسرے ملک میں دوسری اذان کا وقت ہو رہا ہے تو وہاں ''اللہ اکبر'' شروع ہو رہا ہے، اس کی اذان جب ختم ہو رہی ہوتی ہے تو تیسرے ملک میں وقت شروع ہو رہا ہوتا ہے اور مؤذن ''اللہ اکبر، اللہ اکبر'' کہہ رہا ہوتا ہے۔

اسی حساب سے ہمیں وہ حدیث پاک بھی سمجھ آجاتی ہے کہ ''لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِي الْأَرْضِ: اللّٰهُ، اللّٰهُ''[1] (قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی، جب تک کوئی نہ کوئی ''اللہ اللہ'' کہنے والا موجود رہے گا)۔

[1] [صحیح مسلم، حدیث: ۱۴۸، باب: ذهاب الإيمان آخر الزمان]

"اِخْتِلَافُ الَّیْلِ وَ النَّهَار" کے اندر جہاں دیگر حکمتیں ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتیں ہیں، وہاں ایک سبب یہ بھی ہے کہ کوئی لمحہ بھی ایسا نہ گزرے کہ جس میں اللہ کا ذکر نہ ہورہا ہو۔

لہٰذا کسی کا یہ کہنا کہ جنت ہمیں کیوں نظر نہیں آتی ؟ یا جہنم ہمیں کیوں نظر نہیں آتی ؟ یہ بالکل جاہلانہ بات ہے۔ ہمیں تو اپنی رُوح بھی نظر نہیں آتی، ہمیں تو پھول میں سے خوشبو بھی نظر نہیں آتی، ہم جس ہوا سے زندہ ہیں وہ ہوا بھی نظر نہیں آتی۔ ہمارا نہ دیکھنا کسی چیز کے عدم کی دلیل نہیں ہوتا۔ قاعدہ ہے: "عَدَمُ الرُّؤْيَةِ لَا يَسْتَلْزِمُ عَدَمَ الْوُجُوْدِ" کہ کسی چیز کی عدمِ رؤیت عدمِ وجود پر دلالت نہیں کرتی۔ ہم نے تو کئی ملک نہیں دیکھے تو کیا وہ ملک نہیں ہیں؟ کئی ایسے مناظر ہیں جو ہم نے نہیں دیکھے تو کیا وہ ہوں گے بھی نہیں؟

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ "اَلْجَنَّةُ مَخْلُوْقَةٌ وَ النَّارُ مَخْلُوْقَةٌ" کیونکہ جنت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان قرآن مقدس میں موجود ہے: ﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ اور جہنم کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے: ﴿أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ لہٰذا ﴿وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ میں مذکور "جنت" سے مراد بھی وہی "جنت الخلد" ہے۔

[شرح العقائد النسفية، ص:۲۵۸، مَبْحَثُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ]

آدم علیہ السلام کی تخلیق اور فرشتوں کا سجدہ کرنا جنت میں نہیں تھا:

ان آیاتِ مبارکہ سے ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ تخلیق آدم کا مرحلہ جنت کے علاوہ کسی اور جگہ تھا، اسی طرح تکریم آدم کا مسئلہ بھی کسی اور جگہ تھا، اسی طرح بی بی حواء کا پیدا ہونا، دخولِ جنت اور اسکانِ جنت سے قبل کا مرحلہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ﴾ (تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو)۔ تو پہلے بیوی پیدا ہو چکی تھی، اسی لیے تو اللہ نے حکم دیا کہ تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت کے اندر رہو۔

نکات:

اس لفظ سے ایک اشارہ بھی ملتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو جنت میں مستقل ٹھہرانے کے لیے داخل نہیں کیا گیا تھا، بلکہ فرمایا: ﴿اُسْكُنْ﴾ کہ تم سکون پکڑو۔ اور جب زمین کا مسئلہ آیا تو فرمایا: ﴿مُسْتَقَرٌّ﴾ اور یہاں مجرد حکم تھا۔

اسی سے علماء نے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ ہر بیوی رہائش وغیرہ میں اپنے خاوند کے تابع ہوگی، یعنی جہاں خاوند رہے گا، وہاں بیوی رہے گی۔



لفظ ''زوج'' مماثلت عددی پر دلالت کرتا ہے۔ تو ﴿زَوْجُكَ﴾ سے معلوم ہوا کہ اللہ نے مرد اور بیوی کو برابری دی ہے کہ دونوں کی جنس ایک ہے اور دونوں کے منامات، ماکولات، مشروبات ہر ایک میں تماثل و تشابہہ ہے۔ تو ﴿زَوْجُكَ﴾ (تیری بیوی) یعنی تیرے برابر کہ جیسے تجھے اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے، جیسے تجھے اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا ہے، اسی طرح حواء کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کے تذکرہ میں قرآن کا طرز:

علماء نے لکھا ہے کہ اگر آپ غور کریں، قرآن پاک میں تدبر اور تفکر کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اللہ نے جہاں جہاں انبیاء کی عورتوں کا ذکر کیا ہے، وہاں ''امرأة'' کا لفظ آیا ہے یا سورۃ یوسف میں ''نسوة'' کا لفظ استعمال ہوا ہے: ﴿فَمَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ﴾ [یوسف: ۵۰] لیکن جہاں میرے مدنی سرکار کا ذکر آیا ہے، اللہ نے ان کی بیویوں کے لیے ''امرأة'' کا لفظ استعمال نہیں کیا، بلکہ فرمایا:

﴿يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا﴾ [الاحزاب: ۲۸]

دیکھیں! یہاں ''أزواج النبی'' فرمایا۔ اس میں ایک اشارہ دیا گیا کہ ہم نے اپنے نبی کو بیویاں بھی ایسی دی ہیں جو ان کی شان کے لائق ہیں۔ جبکہ دیگر انبیاء کی بیویوں کا تذکرہ کرتے وقت دوسرا انداز اختیار کیا، چنانچہ فرمایا: ''اِمْرَأَتَ لُوْطٍ'' یعنی لوط علیہ السلام کی بیوی ان کے برابر نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ نبی ہیں اور بیوی کافرہ ہے۔ اسی طرح فرمایا: ''اِمْرَأَتَ نُوْحٍ'' نوح علیہ السلام کی بیوی ان کے برابر نہیں ہو سکتی، کیونکہ نوح علیہ السلام پیغمبر ہیں اور بیوی کافرہ ہے۔ ایک اور جگہ ''اِمْرَأَتَ فِرْعَوْنَ'' کے الفاظ آئے ہیں، اس لیے کہ فرعون کافر ہے اور بی بی آسیہ مومن ہے تو دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اس لیے وہاں اللہ نے ''زوج'' کا لفظ استعمال نہیں کیا، بلکہ ''امرأة'' کا لفظ استعمال فرمایا اور جہاں ''زوج'' کا لفظ آیا، وہاں تماثل اور برابری کی جھلک ملتی ہے، وہاں یہ اشارہ ملتا ہے کہ آدم! تم بھی شان والے ہو تو حواء بھی شان والی ہے، تم اگر ابو البشر ہو، تمام انسانوں کے باپ ہو تو بی بی حواء بھی تمام انسانوں کی ماں ہے۔ تمہیں ہم نے اتنا مرتبہ بخشا ہے تو بی بی حواء کو بہت بڑا مرتبہ بخشا ہے۔

اللہ نے حضرت حواء علیہا السلام کو زندہ آدم علیہ السلام سے پیدا کیا، اور ان کی پیدائش بھی عجیب انداز میں ہوئی، جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔

آج دنیا کے ڈاکٹر جب بھی کوئی آپریشن کرتے ہیں تو پہلے آدمی کو بے ہوش کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ سب کچھ

ہم سے سیکھا ہے اور ہمیں آ کر سکھاتے ہیں۔ آج ساری دنیا کے علوم دیکھ لو، ان کی ابتداء افلاطون سے ہوگی، بقراط سے ہوگی، بوعلی سینا سے ہوگی یا رازی سے ہوگی۔ اور یہ دنیا کہاں جائے گی؟ یہ تو چور ہیں، انہوں نے مسلمانوں کی کتابوں کو چرایا، انہوں نے قرطبہ اور اشبیلیہ کی لائبریریوں نے ہمارے مسلمانوں کے علوم کو چرایا اور بغداد سے دین کو چرایا۔ ان ظالموں نے ان علوم کو حاصل کرنے کے بعد ان کتابوں کو دریا برد کر دیا، جیسا کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی کتاب "الخراج" کو ضائع کیا گیا۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جو تین سو جلدوں پر مشتمل تھیں، لیکن دشمنوں نے ان کو ضائع کیا، اپنے مفادات کو حاصل کر لیا اور ان کو انگریزی زبانوں میں منتقل کر کے اپنے میوزیم کے پنجروں میں ڈال گئے۔

آج بھی آپ ان کی لائبریریوں میں جا کر دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ جیسا کہ اقبال نے کہا ہے کہ میں نے جب کافروں کی لائبریریوں میں آ کر اپنے اجداد کی کتابیں دیکھی ہیں تو دل ہوتا ہے سہ پارہ، یعنی دل دو ٹکڑے نہیں، بلکہ تیس ٹکڑے ہو جاتا ہے کہ علم ہمارا تھا، کتابیں ہماری تھیں، لیکن بدقسمتی ہے کہ مسلمانوں سے اپنے ورثہ سے غفلت کی اور دشمنوں نے ان سے بڑے بڑے علوم حاصل کر لیے اور آج وہ فخر کرتے ہیں کہ یہ ہم نے کیا ہے، حالانکہ انہوں نے کچھ نہیں کیا، یہ تو چور ہیں، انہوں نے تو ہمارے ان علوم کو چرایا ہے۔

تفسیر:

"﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾" اور ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جاؤ۔ یہ نہیں فرمایا: "وَ لَا تَأْكُلَا" (کہ تم اسے مت کھاؤ)، بلکہ حکم دے دیا کہ قریب ہی نہ جاؤ۔ حالانکہ مطلب یہی ہے کہ اس کو نہ کھاؤ، لیکن اسی طرح کہتے ہیں کہ اگر قریب جاؤ گے تو دل میں کھانے کی خواہش پیدا ہوگی، اس لیے قریب ہی نہ جاؤ۔ جیسے فرمایا: "﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى﴾" یہاں بھی اللہ نے آدم علیہ السلام کو اور بی بی حوا علیہا السلام دونوں کو نہی میں شریک کیا ہے۔

[تفسیر القرطبی: ۱/۳۰۴]

"ظالمین" کا معنی:

لفظ "ظالمین" کہیں تو "کافرین" کے معنی میں آتا ہے اور کہیں "حد سے تجاوز کرنے والے" کے معنی میں آتا ہے۔ ظلم کی تعریف ہے: "وضع الشيء في غير محله" (کسی چیز کو اس کے محل میں نہ رکھنا)۔ اس لیے کافر کو ظالم کہا

گیا کہ اللہ نے پیشانی اپنی ذات کو سجدہ کرنے کے لیے پیدا کی تھی، لیکن ان ظالموں نے اللہ کو چھوڑ کر اصنام، اشجار اور ابحار کو سجدے کرنے شروع کر دیے۔ یہ ''وَضْعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَوْضُوْعِهِ'' ہے۔ تو اللہ نے فرمایا: تم اگر میری اس نہی کا ارتکاب کر بیٹھو گے تو پھر گویا کہ تم بھی اپنی جان کے اوپر زیادتی کرنے والے ہو گے۔

کہیں ظالمین سے کافرین مراد ہوتے ہیں، اور کہیں مجرمین مراد ہوتے ہیں اور کہیں فاسقین مراد ہوتے ہیں اور کہیں یہ لفظ تنبیہ کے لیے آ جاتا ہے، جیسے آدم علیہ السلام اور حواء علیہا السلام کے بارے میں یہاں آیا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے چار مراحل

اللہ نے حکم دیا: ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [البقرۃ:۳۵] (کہ تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا) کھانا تو در کنار، بلکہ تم اس درخت کے قریب بھی نہ جانا۔ لیکن آدم علیہ السلام کھا بیٹھے۔ علماء نے کہا ہے کہ اس مسئلے کو آپ چار مراحل میں لے لیں تو اس کا سمجھنا آسان ہو جائے گا: ایک مرحلہ اعتقادیات کا ہے، دوسرا مرحلہ تبلیغ احکام کا ہے، تیسرا مرحلہ فتویٰ و اجتہاد کا ہے اور چوتھا مرحلہ اقوال، افعال، اعمال کا ہے۔ یہ چار حصے کر لیں تو آپ کو مسئلہ سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔

①......اعتقادیات:

اللہ کے تمام انبیاء اعتقادیات میں بالکل دین فطرت پر ہیں۔ ان کے اعتقادیات میں کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اگر اللہ ان کو نبوت کے لیے چُن لیں اور ان کو توحید کا پتہ نہ ہو، ایسی بات نہیں ہے۔ تو اعتقادیات میں عصمتِ انبیاء واضح ہو گئی۔

②......تبلیغِ احکام، تبلیغِ رسالت:

اس میں اللہ کے نبی من کل الوجوہ معصوم ہیں۔ ناممکن ہے کہ اللہ اپنے پیغمبروں کو کوئی حکم دے اور وہ رسالت میں کوئی کوتاہی کریں یا اللہ کے حکم کو پہنچانے میں کوئی کمی کریں۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

عصمتِ یونس علیہ السلام:

حضرت یونس علیہ السلام کے معاملہ میں پاکستان کے ایک معروف سکالر کو دھوکہ لگا۔ وہ لکھ بیٹھے کہ ان سے فریضۂ

رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی ہوئی۔ حالانکہ اگر فریضۂ رسالت ہی ادا نہ ہو تو پھر رسول کہاں رہا؟ اور اگر اس نے فریضۂ رسالت پورا ہی نہیں کیا تو پھر حضرت یونس علیہ السلام کا عذاب کی دھمکی دینے کا کیا مطلب؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی بستی پر اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتے جب تک کہ اس میں کوئی رسول نہ بھیج دیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۞﴾ [الاسراء: ۱۵] اگر رسول آکر اپنا کام پورا نہ کرے تو پھر قوم پر عذاب کیوں سنائے؟ وہاں تو فریضۂ رسالت کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے فریضۂ رسالت مکمل ادا کیا، قوم نہ مانی تو آپ نے قوم کو ڈرایا کہ تم پر تین دن کے بعد عذاب نازل ہوگا۔ اب عذاب کی علامات شروع ہوگئیں تو اللہ کے نبی حضرت یونس علیہ السلام وہاں سے چلے گئے، حالانکہ ان کو انتظار کرنا چاہیے تھا۔ وہ اس بستی سے اس وقت تک باہر نہ جاتے جب تک اللہ کا حکم نہ آتا۔ کیونکہ اللہ اپنے نبیوں کو حکم دیتے ہیں کہ اب تم باہر چلے جاؤ۔ جیسے لوط علیہ السلام کو حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ جب قوم پر عذاب نازل کرتے ہیں تو اپنے نبیوں کو خود نکال لیتے ہیں، اپنے رسولوں کو خود نکال لیتے ہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے اس حکم کا انتظار نہ فرمایا اور چل پڑے۔ اس پر اللہ کی ناراضی آگئی کہ میرے حکم کے بغیر کیوں چلے؟ رسالت تو پوری ہوگئی، رسالت میں تو کوتاہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (نعوذ باللہ!) پھر رسول کیا رسول رہا؟

جب قوم پر عذاب کے آثار آئے اور قوم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اللہ کے نبی چلے گئے ہیں تو قوم یکدم خدا کے دروازہ پر گر گئی، معافی مانگنے اور گڑگڑانے لگ گئی، آخر قوم کو معافی مل گئی۔ اب یونس علیہ السلام گھبرا گئے کہ میں اگر میں ان کے پاس جاؤں تو قوم کہے گی: یہ تو جھوٹا ہے،......نعوذ باللہ!...... میں نے تو ان کو کہا تھا کہ تین دن کے بعد عذاب آئے گا، لیکن عذاب تو ٹل گیا۔ یہ ایک مشکل مرحلہ پیش آ گیا تھا، اس میں تو فریضۂ رسالت کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

اسی لیے یاد رکھ لیں کہ تبلیغِ احکام، تبلیغِ رسالت کے اندر بھی اللہ کے نبی معصوم ہوتے ہیں اور عقیدے میں بھی اللہ کے نبی معصوم ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ کا نبی نبوت سے پہلے کفر کرتا رہا ہو۔ جیسے لوگوں کو دھوکہ لگا کہ ......نعوذ باللہ!...... ابراہیم علیہ السلام نے آہستہ آہستہ توحید سمجھی۔ یہ بڑے مغالطے ہیں جن سے لوگوں کو غلطیاں ہوئیں۔ اللہ ان کو معاف فرمائے۔

امامیہ فرقہ کے نزدیک نبی کفر بھی کرسکتا ہے:

یہ بھی یاد رکھیں کہ امامیہ برادری ہر مسئلے میں عجیب ہے۔ ان کے عقیدے میں امامت، نبوت سے بڑھ کر ہے،

یعنی نبوت کی شان کم ہے اور امام کی شان زیادہ ہے۔ ان کے عقیدے میں ہے کہ اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت میں بیعت لی تھی۔ یہ عجیب لوگ ہیں، ان کے نزدیک نبی کفر بھی کر سکتا ہے۔

③......فتویٰ واجتہاد:

تیسرا مرحلہ فتویٰ واجتہاد کا ہے۔ اس کے اندر انبیاء علیہم السلام پر جو حکم اللہ نازل نہ فرمائے، اس میں کبھی اجتہاد میں لغزش ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ اجتہاد کے طور پر ایک حکم بیان کرتے ہیں، حالانکہ اللہ کی مرضی اس کے خلاف ہوتی ہے تو اللہ اپنے نبیوں کو فوراً وحی نازل کر دیتے ہیں، جیسا کہ بدر کے قیدیوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑ دیا، لیکن اللہ نے فوراً قرآن نازل کر دیا اور اصل مسئلہ سے آگاہ فرما دیا۔ لہٰذا اس سے بھی انبیاء علیہم السلام پاک ہو گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر مجتہد خطا بھی کرے گا اور صواب پر بھی ہو گا، لیکن خطا پر بھی اس کو ثواب ملے گا، کیونکہ اس نے محنت کی ہے، اس کی محنت کو خدا ضائع نہیں کرتے۔ چنانچہ اگر اجتہاد غلط ہو گیا تو ایک اجر ملے گا، لیکن اگر اس نے محنت کی اور مسئلہ ٹھیک معلوم کر لیا تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔ البتہ یہ راز قیامت میں کھلے گا کہ مجتہد نے جو مسئلہ بیان کیا تھا، وہ ٹھیک تھا یا نہیں۔ اس لیے کہ اب تو وحی نہیں آ رہی۔ [صحیح البخاری، حدیث ۷۳۵۲، باب: أجرِ الحاکمِ إذا اجتہدَ فأصابَ أو أخطأ]

④......اقوال، افعال اور اعمال:

اور چوتھا مرحلہ ہے انبیاء کے اقوال، افعال اور اعمال کا۔ اس کے اندر انبیاء سے کبھی ترکِ اَولیٰ و ترکِ افضل ہو جاتا ہے۔ کوئی چھوٹی سی خطا ہو جائے تو وہ بھی ارادۃً نہیں، بلکہ سہواً و نسیاناً ہوتی ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إنَّمَا أنَا بَشَرٌ، أرْضَى كَمَا يَرْضَى الْبَشَرُ، وَأغْضَبُ كَمَا يَغْضَبُ الْبَشَرُ))

''میں اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، بشر ہوں، میں بھی راضی وخوش ہو سکتا ہوں جیسے تم راضی وخوش ہو جاتے ہو۔ مجھے بھی غصہ آ جاتا ہے جیسے تمھیں غصہ آ جاتا ہے۔''

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۶۰۳، بابُ مَنْ لَعَنَهُ النَّبِيُّ ﷺ أوْ سَبَّهُ...]

انبیاء علیہم السلام کے نفوس تو ایسے پاک ہوتے ہیں جیسے پانی کی فطرت میں برودت ہے۔ اس کو خارجی چیزیں گرم کر دیتی ہیں۔ مثلاً آگ پر رکھیں تو پانی گرم ہو جائے گا، دھوپ میں رکھیں تو گرم ہو جائے گا، گرم ہوا چلے تو گرم

ہوجائے گا۔ اب پانی خارجی اثر قبول کر رہا ہے۔ اور اگر پانی کو گرم کرلیں اور اسی کو آپ آگ پر ڈال دیں تو وہ آگ کو بجھا دے گا۔ حالانکہ پانی آگ کی طرح گرم ہے کہ اس میں انگلی ڈالیں تو آپ کے ہاتھ جلا ڈالے لیکن آپ اسی گرم پانی کو آگ پر ڈال دیں تو آگ کو بجھا دیتا ہے، وجہ یہ ہے کہ اس کی فطرت میں برودت ہے۔

انبیاء ﷩ کی فطرت میں بھی عصمت ہے اور اگر غلطی نظر آرہی ہے تو وہ خارجی اثر ہے، اسی لیے قرآن کہتا ہے: ﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ﴾ [یوسف: ۲۴] اللہ نے فرمایا کہ ہم نے یوسف سے پھیرا ''سوء'' اور ''فحشاء'' کو۔ یعنی برائی آرہی تھی، ہم نے اس برائی کو پھیر دیا۔ یہ نہیں کہا کہ یوسف علیہ السلام برائی کی طرف جارہے تھے، بلکہ برائی یوسف کی طرف آرہی تھی تو اللہ نے اس برائی کو پھیر دیا۔

خارجی اثرات بھی اس لیے اثر کرتے ہیں کہ اس کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں، ورنہ وہ خارجی اثرات بھی اثر نہ کرتے، اللہ ان اثرات کو دور کر دیتے، روک دیتے۔

توبہ کا مسئلہ کیسے سمجھ آتا؟

اگر آدم علیہ السلام غلطی نہ کرتے تو توبہ کا مسئلہ کون سمجھاتا کہ توبہ کیا ہے؟ اور جب توبہ کا مسئلہ سمجھ نہ آتا تو قیامت تک اولاد برباد ہوجاتی۔ آدم علیہ السلام سے جب یہ بات ہوئی تو اب رونا دھونا اور آہ وزاری شروع کی اور تین سو سال تک روتے رہے۔[1] اب اولاد کو مسئلہ سمجھ آیا کہ جب تم غلطی کرو تو تمہیں بھی گریہ وزاری کرنی ہے، اللہ کے دروازے پر لوٹنا ہے، توبہ کرنی ہے اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ توبہ قبول فرمالیتے ہیں۔

اس میں ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ (ان کو شیطان نے پھسلایا) خارجی اثر ہے، اندر سے بالکل کچھ نہیں۔ وہ تو معصوم ہیں، باہر سے ایک اثر آرہا ہے اور اثر بھی ایسے انداز میں آرہا ہے کہ آدم علیہ السلام کبھی یہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ کوئی اللہ کے نام پر دھوکہ دے گا، کیونکہ ان کا ابھی تک مخلوق سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

سجدۂ سہو کا طریقہ کون بتاتا؟

حضور ﷺ کو نماز میں سہو آیا۔ چار رکعات کی نماز دو رکعات پڑھا دی اور سلام پھیر دیا۔ ذوالیدین نامی ایک صحابی کھڑے ہوئے اور عرض کیا گیا:

((يَا رَسُولَ اللهِ! أَنَسِيتَ أَمْ قُصِرَتِ الصَّلَاةُ؟))

---

[1] [احیاء العلوم: ۴/ ۲۲۲، السقام الأول من المرابطة]

"یارسول اللہ! آپ بھول گئے یا نماز چھوٹی ہوگئی ہے؟"

حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَمْ أَنْسَ، وَلَمْ تُقْصَرِ الصَّلَاةُ))

"نہ میں بھولا ہوں اور نہ نماز چھوٹی ہوئی ہے۔"

صحابی نے عرض کیا: کچھ تو ضرور ہوا ہے۔ حضور ﷺ نے باقی صحابہ سے پوچھا تو صحابہ نے عرض کیا: حضور! ذوالیدین نے بات تو ٹھیک کی ہے۔ حضور ﷺ نے پھر نماز پوری کی۔

[سنن أبي داود، حدیث:١٠٠٨، باب: السَّهْوِ فِي السَّجْدَتَيْنِ]

اب دیکھیں کہ بظاہر تو سہو آ گیا۔ لیکن اگر یہ سہو نہ آتا تو ہمیں سجدۂ سہو کا مسئلہ کون سمجھاتا؟ حضور ﷺ پر اگر یہ بھول طاری نہ ہوتی تو ہم اگر نماز میں بھول جاتے تو کیا طریقہ اختیار کرتے؟

قضا شدہ نماز کیسے پڑھتے؟

حضور ﷺ کو نیند آ گئی، نماز قضا ہوگئی، سورج نکل آیا۔ اب بظاہر تو سورج نکل آیا، نماز قضا ہوگئی، لیکن اگر حضور ﷺ سے نماز قضا نہ ہوتی تو قضا نماز کا مسئلہ کون سمجھاتا؟

[صحیح مسلم، حدیث:٦٨٠، باب: قَضَاءِ الصَّلَاةِ الْفَائِتَةِ...]

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں، خارجی اثرات کبھی اثر کرتے ہیں، اگر ان سے کبھی ترکِ اَولیٰ اور ترکِ افضل ہو جاتا ہے تو اس میں بھی اللہ کی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ پوری دنیا کو سبق سکھلانا ہوتا ہے۔ اور وہ غلطی اللہ کو اتنی پیاری ہوتی ہے کہ عام شخص کی نیکی بھی اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔

بعض صوفیاء کی غلط فہمی:

بعض صوفی پیر دھوکہ میں آ گئے کہ کبھی کبھی گناہ کرنے دیا کرو کہ اس سے بھی بڑے بڑے مرتبے ملتے ہیں۔ وہ اس چکر میں پڑے ہوئے ہیں، کہتے ہیں کہ بزرگ ایسی حرکتیں کرتے ہیں، اس کے بغیر بھی تو ترقی نہیں ہوتی، حالانکہ شریعت میں اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ خواہ مخواہ اپنے آپ کو گناہ کے لیے پیش نہیں کرنا چاہیے، ورنہ معلوم نہیں توبہ بھی نصیب ہو یا نہ ہو۔ کتنے لوگ ایسے گزرے ہیں جن کی ساری زندگی عبادت میں گزری، مگر کسی ایک گناہ کی وجہ سے سب نیکیاں ضائع ہوگئیں اور انجام اور خاتمہ خراب ہوگیا۔

یہ بات ذہن میں رکھیں کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں، اندر باہر سے پاک ہیں، ظاہر باطن سے پاک ہیں۔ان سے اگر کوئی بات ہوئی ہے تو اثر خارجی کی وجہ سے ہوئی ہے اور اس میں بھی اللہ کی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔اس لیے اللہ نے آدم علیہ السلام کے مسئلے میں بھی فرمایا: ﴿فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾ [طٰہٰ:۱۱۵] کہ آدم بھول گئے۔ اگر تم روزے کی حالت میں بھول کر پانی کا گلاس پی جاؤ، تمہاری بھول تو معاف ہے اور آدم علیہ السلام نے بھول کر اس درخت سے دانہ کھایا تو معاف نہ ہو۔اور پھر اس پر گرفت بھی ہوئی، اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقام بہت اونچا اور بہت نازک ہے، جیسے کہتے ہیں: "حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ" (نیک لوگوں کی نیکیاں مقرب حضرات کے گناہ کے درجہ میں ہوتی ہیں)۔[احیاء العلوم ۴/۴۹، بیانُ ما ينبغي أن يُبادِرَ إليه التائبُ...]

اس لیے یاد رکھیں کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں، اور اندر باہر سے پاک ہوتے ہیں، اور پھر ان لفظوں کو ظلم سے کیوں تعبیر کیا جاتا ہے؟ اس کی مثال ایسے ہے کہ اگر کوئی شان والا چھوٹی سی بھی غلطی کرے تو بڑی نظر آتی ہے، یہ قاعدہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ جیسے مشہور ہے کہ ایک بزرگ کو لوگ پتھر مارے جارہے تھے، وہ برداشت کرتے رہے۔ایک آدمی نے آکر پتھر مارا تو ان کی چیخ نکل گئی۔ پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: یہ تو میری بات کو سمجھتا تھا، اس نے پتھر مارا تو مجھے تکلیف ہوئی۔ دوسرے تو نہیں سمجھتے تھے، اس لیے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی، کیونکہ وہ نہ جاننے والے تھے۔

اس لیے کبھی انبیاء سے ترکِ اَولیٰ ہوجاتا ہے۔ جیسے اگر ایک تہجد گزار کی تہجد بھی رہ جائے تو وہ روتا رہتا ہے اور اگر بے نماز کی نماز چلی جائے تو اس کو پروا بھی نہیں ہوتی، اس کو کوئی غم نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق بات سمجھنے کی توفیق دے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حافظ ابوبکر بن مردویہ نے ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ حضرت ابراہیم تیمی اپنے والد سے نقل کرتے ہیں اور وہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یارسول اللہ! آپ ہمیں یہ بتلائیں کہ کیا آدم علیہ السلام بھی نبی تھے؟ کیونکہ قرآن میں ﴿خَلِيْفَةً﴾ کا لفظ آیا ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! آپ نبی بھی تھے، رسول بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے سامنے کلام فرمایا، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی کلام کا شرف بخشا۔[المعجم الاوسط، حدیث:۴۲۵۹]

اس عبارت میں دو لفظ آ گئے ہیں، نبی کا لفظ بھی آیا ہے اور رسول کا لفظ بھی آیا ہے۔ اگر یہ حدیث مبارکہ درجۂ

صحت تک پہنچتی ہے تو یہ سمجھا جائے گا کہ اصطلاحی طور پر مراد نہیں کہ نبی بھی فرما دیا اور رسول بھی فرما دیا۔ کیونکہ آدم علیہ السلام پر کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی اور نہ آپ کو کوئی شریعت دی گئی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے خلافت بھی دی اور نبوت بھی دی، لیکن آپ سے زیادہ کام عمرانِ ارض (زمین کو آباد کرنے) کا لیا گیا اور یہاں آپ کی نسل کو پھیلایا گیا۔ ان کو اشیاء کے نام سکھائے گئے تھے، پھر ان کو اس دنیا کی چیزوں سے نفع حاصل کرنے کے طریقے بتلائے گئے۔ اور ابتداء رسالت و شریعت حضرت نوح علیہ السلام سے ہوئی۔

کنز العمال حدیث نمبر ۳۲۲۶۹ میں ہے: ''أَوَّلُ الرُّسُلِ آدَمُ وَ آخِرُهُمْ مُحَمَّدٌ'' اور کنز العمال حدیث نمبر ۳۵۵۶۴ میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہے کہ سب سے پہلے نبی آدم علیہ السلام تھے۔

ان احادیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام نبی بھی تھے اور رسول بھی تھے۔ اور اس روایت مبارکہ میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں اپنی قدرت سے اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا اور انہیں نفع حاصل کرنے کے طریقے بتلائے گئے اور ابتداء رسالت و شریعت حضرت نوح علیہ السلام سے ہوئی۔

اور اس روایت مبارکہ میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں اپنی قدرت سے اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا اور ان میں نفخ روح فرمایا اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ تُو اور تیری بیوی جنت میں رہو۔ اس حکم کے درمیان میں کوئی فرشتہ نہیں تھا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے براہِ راست حکم فرمایا: ﴿وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ [البقرة:۳۵]

[المعجم الاوسط، حدیث: ۴۲۵۹]

حضرت حواء علیہا السلام کب اور کیسے پیدا ہوئیں؟

محمد بن اسحاق نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابلیس پر ناراضگی کا اظہار کر کے اس کو مردود و ملعون کر دیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف توجہ فرمائی اور ان کو تمام اسماء کی تعلیم دے چکے تو آدم علیہ السلام پر ایک اونگھ ڈالی گئی، تاکہ ان کو نیند آ جائے۔ یہی باتیں جو ہمیں اہل کتاب سے پہنچی ہیں، یعنی تورات والوں سے، اہل علم سے اور ان روایات میں یہ بھی نقل کیا گیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی بائیں جانب کی ایک پسلی کو نکالا اور وہیں سے بی بی حواء علیہا السلام کو پیدا کیا گیا اور پھر اس جگہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے



ٹھیک کر دیا۔

جیسا کہ حضور پاک ﷺ کا شق صدر ہوا اور کئی دفعہ آپ کا سینہ مبارک کھولا گیا اور پھر جوڑا گیا اور اسی وقت حضور ﷺ ٹھیک ہو گئے۔ ایک حدیث مبارک میں آتا ہے، ایک صحابی فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کے سینہ مبارک پر ٹانکے کا نشان بھی دیکھا۔ لیکن اسی وقت ٹھیک ہو گئے کہ سینہ کھل بھی گیا، حکمت سے بھر بھی دیا گیا اور اندر سے اللہ جو چیز اپنے علم کے مطابق دھونا چاہتے تھے، دھو بھی دیا گیا اور پھر جوڑ دیا گیا اور سب برابر ہو گیا۔ اس لیے فرماتے ہیں کہ اس جگہ گوشت وغیرہ سب ٹھیک ہو گیا۔

آدم علیہ السلام اسی طرح نیند کی حالت میں تھے، ان کو پتہ بھی نہیں تھا، وہ اپنی نیند سے بیدار نہیں ہوئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت حواء علیہا السلام کو پیدا فرمایا اور اس کو عورت بنایا، تاکہ آدم علیہ السلام اس کی طرف سکون پکڑ سکیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۷۸/۱، ۷۹، البقرة: الآية: ۳۵]

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک ایسا نظام بنایا ہے کہ مرد کو جو صحیح معنوں میں تسکین اور سکون ہے، طمانینت ہے، وہ اپنی بیوی سے حاصل ہوتی ہے اور اسی طرح بیوی کو تسکین اپنے خاوند سے حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بی بی حواء علیہا السلام کو پیدا فرما دیا، تاکہ آدم علیہ السلام اس سے سکون حاصل کریں۔ اسی سے علماء نے مسائل استنباط کیے ہیں کہ خدا نہ کرے کسی گھر میں اگر بیوی فرماں بردار نہیں ہے، اطاعت شعار نہیں ہے اور اپنے خاوند کی حاجات اور ضروریات کا خیال رکھنے والی نہیں ہے، یعنی اس سے خاوند کو سکون نہیں ملتا تو علماء نے فرمایا: گویا کہ یہ بیوی نہیں ہے، کیونکہ بیوی کے بنانے کا مقصد یہ ہے کہ خاوند کے سکون کا ذریعہ بنے، اس کے اطمینان کا ذریعہ بنے۔

غریبوں کی بیویاں:

ایسا تو نہیں ہونا چاہیے کہ وہ سارا دن مردوں کی طرح کام کرے، کاشتکاری کرے یا مزدوری کرے۔ اس طرح تو وہ مزدور کہلائے گی، بیوی تو نہ ہوئی۔ غریبوں کے حقیقتاً احوال یہ ہیں کہ ان لوگوں نے بیوی کو ایک بہترین مزدور سمجھا ہوا ہے کہ جس کو تنخواہ بھی نہیں دینی پڑتی اور کام بھی چوبیس گھنٹے لیا جاتا ہے، وہ کھیتی باڑی میں ہے، کہیں چاول کاشت کر رہی ہے، کہیں گندم کاشت کر رہی ہے اور پھر خاوند کی روٹی لا رہی ہے، جانوروں کو چارہ ڈال رہی ہے، پھر گھر کے اندر صفائی بھی اس نے کرنی ہے، کھانا بھی اسی نے پکانا ہے اور بچوں کو بھی اسی نے سنبھالنا ہے، یعنی ایک بہترین نوکر اور مزدور ہے۔



امیر لوگوں کی بیویاں:

اور جو بڑے لوگوں کی بیویاں ہیں وہ اپنے خاوند پر حکومت کرتی ہیں، خاوندوں کے ہاں سب سے اہم شخصیت بیوی ہے، اس کے سامنے نوکروں کی ایک فوج ظفر موج کھڑی ہے، نوکرانیاں علیحدہ ہیں، نوکر علیحدہ ہیں، ڈرائیور علیحدہ ہے اور پھر اس کے باوجود بیگم کا موڈ ہر وقت آف ہے۔

بیوی نہیں......عذابِ خداوندی:

ان دونوں معاملات میں یہ عورتیں نہیں ہوتیں، بلکہ اللہ کی طرف سے عذاب ہوتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کبھی ہمارے گناہوں کی سزا اس شکل میں عطا فرماتے ہیں کہ گھر میں بیوی نافرمان ہوگئی یا اولاد کے اندر نافرمانی آگئی، اس طرح دوستوں کے درمیان جھگڑے پیدا ہوگئے، رشتہ داروں کے اندر بغض وعناد پیدا ہوگیا۔

کیے کا دھرا:

یہ دراصل ہمارے اعمال کی سزا ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے نہیں ہیں، حالانکہ اس کی اصل وجہ ہمارے گناہ ہیں کہ کوئی نہ کوئی ذہنی پریشانی ہے اور پھر گھریلو پریشانی کا کوئی حل ہی نہیں۔ آپ مار بھی نہیں سکتے، اگر بچوں کی ماں ہو تو آپ طلاق بھی نہیں دے سکتے۔ یہ ایک مستقل عذاب ہے جو آپ کے گلے میں پڑا ہوا ہے، یعنی جسے اُردو محاورہ میں کہتے ہیں کہ جسے آدمی نہ تو نگل سکتا ہے اور نہ پھینک سکتا ہے۔ اور اسی طرح جو متوسط طبقہ ہے، ان کے بھی حالات یہ ہیں ﴿وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ﴿١٣﴾﴾ [سبا: ١٣] بہت کم گھرانے ہیں جن کے گھروں کے اندر صحیح معنی میں سکون ہے، آرام ہے۔

ماڈرن بیوی:

ایک دفعہ ہم بیٹھے تھے تو ایک دوست کہنے لگے: اللہ کا فضل اور مہربانی ہے کہ مجھے اللہ نے جو بیوی عطا فرمائی ہے بڑی فرمانبردار ہے، بڑی وفا شعار ہے۔ اور پھر مجھے اس نے اپنا گھر دکھایا کہ دیکھیں! اس نے میرا گھر کیسے سجا رکھا ہے؟ اور کیسے بنایا ہوا ہے؟

خیر! میں اس کی بات سنتا رہا۔ ساری باتیں سننے کے بعد میں نے کہا کہ وہ آپ کی وفا شعار، خدمت گزار اور مخلص بیوی اس وقت کہاں ہے؟......اسے پتہ تھا کہ اتنے سال بعد میں بھی گھر میں آرہا ہوں......کم از کم میرے

لیے کوئی کھانا، کوئی چائے وغیرہ بنانے میں تمہاری مدد کرتی۔ اس نے کہا کہ ایک پارٹی میں گئی ہوئی ہے۔ میں نے کہا: اللہ کے بندے! جب وہ بازاروں میں گھومتی ہے، ڈرائیور کے ساتھ اکیلی پھرتی ہے، شام کو کلب اٹینڈ کرتی ہے اور تم نہیں روکتے ہو، فائیوسٹار ہوٹلوں میں جا کر وہ کھانا کھاتی ہے تم نہیں روکتے ہو تو پھر وہ تمہاری وفادار کیوں نہ ہو؟ جب تم اس کے ایک غلام ہو، تم اس سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتے کہ آج تم کہاں گئی تھی؟ آخر گھر میں مہمان بیٹھا ہوں، تم مجھے نوکروں سے چائے پلا رہے ہو، یہ کوئی فرمانبرداری نہیں ہے۔ فرمانبرداری تو تب ہے کہ تم اسے کوئی حکم دو اور وہ اس کو پورا کرے، اب جب تم اس کے غلام بنے ہوئے ہو، پھر اگر وہ تمہارا گھر ٹھیک کر دے یا دو چار میٹھی باتیں کر دے تو اس میں کون سی وفاشعاری والی بات ہے؟

اصل وفاشعاری؟

وفاشعاری تو یہ ہے کہ وہ بے نماز تھی، تم نے اس کو کہا کہ نماز پڑھو تو وہ نمازی بن گئی، اس نے قرآن پاک کبھی نہیں پڑھا تھا، تم نے کہا کہ قرآن کی تعلیم حاصل کرو، کم از کم دو چار سورتیں یاد کرو، تاکہ نماز صحیح ہو تو اس نے بات مان لی۔ تم نے اسے کہا کہ گھر میں حرام نہیں آنا چاہیے، اگر میں کبھی بھٹکنے لگوں تو مجھے روکو، میرے بچوں کے پیٹ میں حرام مت داخل کرو اور میں جب گھر سے باہر چلا جاؤں تو تمہاری آواز کوئی نہ سنے، تمہیں کوئی کھڑکیوں سے تاکتا جھانکتا ہوا نہ پھرے۔ اگر وہ ان باتوں میں آپ کا کہا مانتی ہے تو بڑی شکرگزار ہے۔ اور اگر اس کے بعد وہ کہے کہ میں کوئی قید میں ہوں، آپ جائیں اپنے دوستوں سے ملیں، میری سہیلیاں ہیں میں بھی ان کو ملنے کے لیے جاتی ہوں، آپ بھی واپس آ جائیں گے اور میں بھی واپس آ جاؤں گی۔ یہ تو کوئی وفاشعاری نہ ہوئی، بلکہ یہ تو گزارے والی بات ہوئی کہ تم بھی اس حال میں گزارہ کرو اور میں بھی اس حال میں گزارہ کروں۔ اس طرح تو جو بری عورتیں ہیں وہ سب سے زیادہ وفادار ہوئیں۔ وہ تو سب سے زیادہ خاوند کا خیال رکھتی ہیں کہ کپڑوں میں، کھانے میں، نہانے دھونے میں، وہ تو پھر بڑی وفادار ہوئیں۔ لیکن بس اتنا ہوتا ہے کہ وہ باقی لوگوں کو بھی راضی کرتی رہتی ہیں، کیونکہ اچھا آدمی تو وہی ہوتا ہے کہ جس سے کوئی ناراض نہ ہو، جس سے لوگ ناراض ہو جائیں وہ کیا اچھا ہے؟ وہ تو بداخلاق ہوئی...... اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ...... اللہ پاک ہمارے گھروں پر رحم فرمائیں، اگر ہمارے گھر صحیح ہوں گے تو ہماری اولادیں صحیح ہوں گی، اگر ہمارے گھر صحیح نہیں ہوں گے تو آنے والی نسل کبھی صحیح نہیں ہوگی۔

یہ اُصول یاد رکھ لیں! باپ بے چارہ جتنا زور لگا لے بیٹا ٹھیک نہیں ہو سکتا، جب تک ماں ٹھیک نہ ہو۔ کیونکہ باپ

کتنی دیر اولاد پر محنت کرے گا؟ اولاد کا زیادہ تر وقت ماں کے ساتھ گزرتا ہے، پیدا ہونے سے جوان ہونے تک اگر والدہ نے اس کو غلط راستہ پر لگا دیا تو آپ جتنی مرضی تقریریں کرتے رہیں، کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

حضرت حواء علیہا السلام کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کا نکاح:

بہر حال اللہ تعالیٰ نے بی بی حواء علیہا السلام کو اس لیے پیدا کیا، تاکہ حضرت آدم علیہ السلام کو تسکین حاصل ہو۔ جس گھر میں سکون نہ ملے وہ گھر نہیں، جس بیوی سے سکون نہ ملے وہ بیوی نہیں۔ اس لیے کہ اللہ نے دونوں چیزیں سکون کے لیے بنائی ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ جب نیند کھلی اور حضرت آدم علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک عورت ساتھ بیٹھی ہوئی ہے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ! تیری قدرت ہے، گوشت بھی میرا ہو، خون بھی میرا ہو اور پھر اسے آپ نے میرے لیے میری بیوی بنایا ہے۔ ﴿لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا﴾ تو حضرت آدم علیہ السلام کو اس سے تسکین ہوئی۔ ''فَلَمَّا زَوَّجَهُ اللهُ'' اللہ نے آپ کا نکاح فرمایا اور ان کو آپ کی بیوی بنایا اور اللہ نے ان کے اپنے سکون کے لیے ان کے بدن سے ایک حصہ نکالا کیونکہ آدمی کا اپنا جزو ہوگا تو اس سے زیادہ قربت حاصل ہوگی۔ اُصولی بات ہے کہ ایک کپڑا ہے، اس سے ایک ٹکڑا کاٹ کر اسی میں لگاؤ تو لگ جائے گا اور اگر دوسرا کپڑا لگاؤ گے تو کوئی نہ کوئی فرق تو ہوگا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۷۸/۱، ۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

اسی لیے قدرتی بات ہے کہ ہر مرد کا فطرتی طور پر عورت کی طرف میلان ہوتا ہے، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں، وہ حلال میں پابند رہتے ہیں اور جو اللہ تبارک وتعالیٰ سے ڈرنے والے نہیں ہیں، ان کے لیے حلال، حرام کا کوئی مسئلہ ہی نہیں، ان کے لیے تو نہ کوئی حلال ہے اور نہ حرام ہے۔ جب آدمی خدا کو ہی نہ مانے، اللہ کے رسول پاک پر بھی ایمان نہ لے آئے، اللہ کے قرآن و شریعت پر بھی ایمان نہ لے آئے تو اس کا ہر روز روزِ عید ہے اور ہر رات شب برأت ہے، اس کے لیے تو ہر وقت محفلیں ہیں، شراب ہے، عریانیاں اور فحاشی ہے۔

''حواء'' نام کی وجہ تسمیہ:

بعض مفسرین نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ بی بی حواء علیہا السلام کو جنت میں داخل ہونے کے بعد پیدا کیا گیا۔

اور ایک روایت یہ بھی نقل کی گئی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنت سے شیطان کو نکال دیا اور آدم علیہ السلام کو جنت میں ٹھہرایا۔ اگرچہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس ہر نعمت موجود تھی، مگر چونکہ اکیلے تھے، اس لیے پریشان سے تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی بائیں پسلی سے بی بی حواء کو پیدا فرمایا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

آدم علیہ السلام اور حواء علیہا السلام کا مکالمہ:

جب بی بی حواء پیدا ہوئیں تو حضرت آدم علیہ السلام سوئے ہوئے تھے۔ جب آپ کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میرے ساتھ ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں عورت ہوں۔ اس سے پوچھا: اللہ پاک نے تجھے کیوں بھیجا ہے؟ اس نے کہا: اس لیے کہ تم میرے ساتھ تسکین حاصل کر سکو، تاکہ ہم اکٹھے رہ سکیں۔ آپ نے فرمایا: اچھا! [تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

آدم علیہ السلام اور ملائکہ کا مکالمہ:

اس موقع پر ملائکہ نے کہا کہ اللہ نے جو انہیں بڑا علم دیا ہے تو اب پتہ کرتے ہیں کہ ان کو اس عورت کا نام بھی آتا ہے یا نہیں آتا، کیونکہ یہ بعد میں پیدا ہوئی ہے۔ چنانچہ ملائکہ نے آدم علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ یہ میری بیوی ہے۔ انہوں نے پوچھا: اس کا نام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: حواء ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ ''حواء'' نام کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا: کیونکہ اللہ نے اس کو ایک زندہ سے پیدا کیا ہے، اس لیے ان کو ''حواء'' کہا گیا ہے۔ اب ملائکہ پھر چپ ہو گئے، آدم علیہ السلام کا علم پھر بھی فائق رہا۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ تو ان کو علم عطا فرما چکے تھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا کہ تم بھی اور تمہاری بیوی بھی جنت میں رہو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

اس لیے بعض علماء نے فرمایا: یہ حکم جنت میں داخل ہونے کے بعد کا ہے اور حضرت حواء علیہا السلام کی پیدائش بھی جنت میں داخل ہونے کے بعد ہوئی ہے کہ ﴿وَقُلْنَا يَآدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا﴾ اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا: ﴿وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ کہ تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جاؤ۔

ایک نفیس بحث:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن قیم رحمہ اللہ وغیرہ نے ایک بڑی نفیس اور دقیق بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک امر ہوتا ہے اور ایک نہی۔ امر یہ کہ اللہ نے حکم دیا کہ یہ کام کرو، اور ایک نہی ہے کہ اس کام کو نہ کرو۔ جہاں اللہ کے حکم کی تعمیل نہ ہو وہاں تو بچنے کی کوئی اُمید نہیں ہے، کیونکہ یہ استکبار پر دلالت کرتا ہے جیسے ابلیس نے کیا، لیکن

جن چیزوں سے اللہ نے روکا، اگر کبھی آدمی سے ارتکاب نہی ہو جائے تو وہاں معافی ملنے کا راستہ ہوتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے بھی ارتکاب نہی ہوا تھا کہ ایک چیز سے روکا گیا تھا، پھر اس کے قریب چلے گئے۔ یہ نہیں کہ اوامر کی خلاف ورزی ہوئی ہو اور نہی کے مرتکب ہوئے، بلکہ امر اور نہی میں بڑا فرق ہے۔

ممنوع درخت کس چیز کا تھا؟

﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ یہ درخت کون سا تھا؟ اللہ نے قرآن میں اس کا ذکر نہیں فرمایا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو وہ درخت دکھلا بھی دیا گیا، ﴿هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ اشارہ کے ساتھ سامنے دکھلا دیا گیا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں مختلف اقوال ہیں:

1 ...... بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ انگور کی بیلیں تھیں، اور بعض یہود نے کہا کہ وہ گندم کا درخت تھا۔

2 ...... حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ کھجور کا درخت تھا۔

3 ...... ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ انجیر کا درخت تھا۔

4 ...... ابو جعفر رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ درخت ایسا تھا کہ اس کے کھانے کے بعد لازماً پیشاب، پاخانہ کی حاجت ہوتی تھی اور جنت میں یہ چیز نہیں ہو سکتی تھی۔

5 ...... حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ درخت ایسا تھا کہ اس کی ٹہنیاں آپس میں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں اور اس کا پھل بھی تھا، وہ ملائکہ کھاتے رہتے تھے اور اس پھل کے کھانے کا یہ فائدہ تھا کہ جو کھائے وہ ہمیشہ جنت میں رہتا ہے، یعنی وہ جنت سے نہیں نکالا جاتا۔

6 ...... مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس درخت کے بارے میں تقریباً چھ اقوال آپ نے پڑھے ہیں، لیکن علامہ ابو جعفر بن جریر رحمہ اللہ جو بہت بڑے مفسر اور محدث ہیں، انہوں نے ''تفسیر ابن جریر'' میں لکھا ہے کہ اس بارے میں ہمارے لیے سب سے محقق بات یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی کو ایک معین درخت سے منع فرمایا کہ اس درخت سے نہیں کھانا، باقی کسی درخت سے منع نہیں کیا تھا۔ لیکن انہوں نے اس کو کھا لیا۔ اب ہمیں کوئی علم نہیں کہ وہ کون سا درخت تھا؟ اس لیے کہ اللہ پاک نے بھی قرآن پاک میں کوئی ذکر نہیں فرمایا کہ وہ درخت کون سا تھا اور اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین مبارک سے بھی ہمیں کوئی ذکر نہیں ملا کہ وہ درخت کون سا تھا؟

لہٰذا جس کے بارے میں قرآن اور حضور پاک ﷺ ہی نہ بتلائیں تو کتب سابقہ کی بنیاد پر ہم ٹھوکریں کھاتے رہیں گے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اللہ کو پتہ ہے کہ کون سا درخت تھا؟

حضرت عبدالرزاق نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ سنبلہ یعنی سٹے والی چیز تھی، جیسے قرآن پاک میں ہے: ﴿أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ﴾ [البقرۃ: ۲۶۱] سنبلہ جس کو ''سٹہ'' کہتے ہیں، اس میں دانے ہوتے ہیں۔ اور محمد بن اسحاق فرماتے ہیں کہ وہ ''بر'' تھا، یہ بھی گندم کی ایک قسم ہے خالص گندم، اور ایک وہ جس کی لال روٹی ہوتی ہے، اس کو ''بر'' کہتے ہیں، وہ بھی گندم کی ایک قسم ہے۔

اس کے بعد مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ابوالجلد کے پاس ایک خط لکھا، ان سے پوچھا کہ تم مجھے بتاؤ کہ وہ کون سا درخت تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو منع فرمایا تھا؟ جس کے نیچے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ منظور فرمائی تھی؟ تو ابوالجلد نے جواب دیا کہ آپ نے مجھ سے پوچھا کہ وہ درخت کون سا تھا؟ جس کے نیچے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ منظور فرمائی تھی، وہ ''زیتون'' کا درخت تھا۔

محمد بن اسحاق فرماتے ہیں: بعض اہل یمن نے وہب بن منبہ کی روایت سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ ''بر'' ہے جس کو ہم ''باجرہ'' کہتے ہیں، لیکن انہوں نے کہا کہ یہ ایسے تھا جیسے گائے کے اندر تلی، گردہ یا دل ہوتا ہے، اتنا بڑا اس کا دانہ تھا اور وہ مکھن سے زیادہ نرم تھا اور شہد سے زیادہ میٹھا تھا۔

لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ وہب بن منبہ یا کعب احبار سے جتنے اقوال ملتے ہیں، وہ اکثر کتب متقدمہ سے ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہود و نصاریٰ کی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے پاس تھا تو ان سے وہ روایات پڑھتے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو سنا دیا کرتے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

درخت کا نام ذکر نہ کرنا خالی از حکمت نہیں:

اللہ نے قرآن مجید میں باقاعدہ کئی چیزوں کے نام بھی لیے ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ ۝١ وَطُورِ سِينِينَ ۝٢ وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ ۝٣﴾ [التین: ۱ تا ۳] اسی طرح اللہ نے فرمایا: ﴿فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرُمَّانٌ ۝٦٨﴾ [الرحمٰن: ۶۸] کھجور اور انار کا نام آیا ہے، اسی طرح ''اعناب'' کا نام بھی آیا ہے۔ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ یہاں بھی چاہتے تو درخت کا ایک نام ذکر فرما دیتے، لیکن اللہ کی حکمتیں ہیں کہ قرآن میں ان چیزوں کا ذکر فرماتے ہیں جس کی



بندوں کو ضرورت ہو، جس کو بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ ہو، اس کو ذکر نہیں فرماتے۔
[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۹، البقرۃ: الآیۃ: ۳۵]

قرآن مجید ..... درسِ عبرت:

کیونکہ قرآن کتابِ ہدایت ہے، کتابِ موعظت ہے، کوئی قصے کہانی کی کتاب نہیں ہے۔ قرآن تو عبرت پکڑنے کے لیے ہمیں دعوت دیتا ہے کہ لوگوں کے قصے کو پکڑو اور سمجھو کہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کیوں پیدا کیا؟

..... آدم علیہ السلام کو اللہ نے ''خلافت فی الأرض'' کے لیے کیوں منتخب کیا؟

..... پھر غور کرو کہ ہم کتنے بڑے باپ کے بیٹے ہیں کہ جن کو تمام ملائکہ نے سجدہ کیا؟

..... پھر غور کرو کہ ہم کس جنت سے نکالے گئے ہیں؟

..... پھر وہاں کس راستے سے پہنچیں گے؟

..... اور پھر غور کرو کہ ملائکہ کے ساتھ رہنے والا ملعون و مردود کیوں بن گیا؟

یہ تو دعوت ہے۔ قرآن اس لیے نہیں آیا کہ بس آپ اس کو پڑھتے رہیں، چومتے رہیں یا سینے سے لگاتے رہیں یا غلاف دے کر اونچی جگہوں پر رکھتے رہیں۔ قرآن تو ہمیں جھنجھوڑنے کے لیے آیا ہے، قرآن ہمیں جھنجھوڑتا ہے کہ آدم علیہ السلام کا قصہ پڑھو، سوچو تو سہی کہ تم کتنے بڑے باپ کے بیٹے ہو اور کیا کر رہے ہو؟

مثال سے وضاحت:

اب دیکھیں! مثال کے طور پر اگر میں کوئی گندا کام کروں تو لوگ کہیں گے کہ دیکھو کتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے، وہ کتنا بڑا عالم تھا اور اس کا حال دیکھو! باپ نے ساری زندگی کس طرح تقویٰ و پرہیزگاری میں گزاری اور یہ ان کی اولاد ہو کر کیا کر رہا ہے۔

دعوتِ فکر:

ہمیں غور کرنا چاہیے کہ اللہ نے ہمیں زمین کی خلافت کے لیے چن لیا تھا اور ہم زمین پر عذاب بن گئے ہیں۔ اور پھر ہمیں غور کرنا چاہیے کہ اللہ نے ہماری جنس کی پیدائش میں ملائکہ کو رد کر دیا تھا کہ میں جانتا ہوں اور تم نہیں جانتے ہو۔ اب جب ہم زمین میں فساد کر رہے ہیں، خون ریزی کر رہے ہیں، ڈاکے مار رہے ہیں، قتل کر رہے ہیں، عصمتیں

لوٹ رہے ہیں، ایک دوسرے کی بے عزتیاں کر رہے ہیں، بھائی بہن کے ساتھ پکڑے جارہے ہیں، باپ بیٹیوں کے ساتھ زنا میں پکڑے جارہے ہیں تو ملائکہ کیا کہتے ہوں گے؟

ہر چیز میں دعوت:

اللہ کا قرآن تو ہمیں یہ دعوت دیتا ہے کہ تم میرے قصوں میں غور کرو کہ میں نے کیوں قرآن اُتارا ہے؟ قرآن اس لیے نہیں آیا کہ تم قرآن پڑھو اور ہضم کر جاؤ۔ تم قرآن پڑھو، ایک کان سے سنو اور دوسرے کان سے قصۂ آدم کو نکال ڈالو۔ قرآن جھنجھوڑتا ہے کہ ہم نے آدم کو کیوں پیدا کیا؟ پھر ہم نے آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے ایک عورت کو کیوں پیدا کیا؟ ایک سلسلہ توالد وتناسل اور ایک سلسلہ اُلفت ومحبت پیدا کرنا تھا کہ قیامت تک یہ مرد اور عورت کا سلسلہ، تعلق اور اُنس قائم رہے۔ کیا تمہاری عورت صحیح معنوں میں حواء کی بیٹی بن رہی ہے؟ صحیح معنوں میں وہ اپنی ماں کے نقش قدم پر ہے یا نہیں؟ صحیح معنوں میں وہ اسی ترتیب سے چل رہی ہے جو ترتیب اللہ نے عورت کے لیے رکھی ہے؟ ہر چیز میں ایک دعوت ہے، عورت پڑھے تو حواء علیہا السلام کی زندگی کو سامنے رکھے، مرد پڑھے تو حضرت آدم علیہ السلام کی زندگی کو سامنے رکھے۔

اللہ کو منانے کا طریقہ آدم علیہ السلام سے سیکھو:

اور پھر ہمیں حکم ملتا ہے کہ ساری نعمتیں دینے کے بعد ایک چیز سے روکا گیا، تمام نعمتیں جو مرضی آئے کھاؤ، صرف ایک درخت کے قریب نہ جاؤ، لیکن آدم علیہ السلام کھا بیٹھے۔ اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ تم بھی اگر کبھی ایسی چیز جس سے اللہ نے منع کیا ہے، کھا بیٹھے تو تمہیں بھی جنت سے محروم ہونا پڑے گا، پھر تمہارے اوپر بھی وہی اختبار وامتحان کے دروازے کھل جائیں گے اور اگر کھا بیٹھو تو پھر جیسے آدم علیہ السلام نے رو رو کر تین سو سال رات اور دن ایک کر دیئے کہ سر سجدے میں ڈال دیا کہ مولا! میری غلطی معاف فرما۔ اگر تم بھی کبھی غلطی کر بیٹھو تو آدم علیہ السلام کی توبہ سے راستہ سیکھو، آدم علیہ السلام کی زاری سے زاری سیکھو، آدم علیہ السلام کے تضرع سے تضرع سیکھو۔

نجات! قرآن پر عمل کرنے میں ہے:

اللہ کا قرآن دعوت دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ ہم قرآن مجید اس لیے پڑھیں گے کہ اللہ کا قرآن ہے۔ بلکہ دیکھو کہ قرآن پڑھنے کے بعد نتیجہ کیا نکلا؟ ایک آدمی نے قرآن پڑھنے کے بعد سینے سے بس لگا لیا اور قرآن اندر داخل نہیں

ہوا۔ اس کی زندگی میں نہ نماز ہے، نہ روزے ہیں، نہ حج ہے، نہ زکوٰۃ ہے، نہ اس کی زبان پر سچ ہے، نہ معاملات میں کوئی دیانت ہے، نہ امانت ہے، نہ اپنے وعدے کا کوئی پاس ہے، نہ قول کا کوئی پاس ہے تو ایسے قرآن پڑھنے کا کیا فائدہ ہوگا؟

ایک ایک حرف میں دعوت:

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ قرآن کے ایک ایک حرف میں دعوت ہے، ایک ایک حرف میں ہمارے لیے عبرت ہے، ایک ایک حرف میں ہمارے لیے تنبیہ ہے۔ کہیں وعدے کہیں وعید ہے، کہیں ترغیب اور کہیں ترہیب ہے۔ اللہ کے قرآن کو پڑھنے کے بعد ہم سمجھیں، وگرنہ قرآن دونوں جہانوں کا بادشاہ ہے۔ کیا بادشاہ کا حکم بھی کبھی ٹالا ہے؟ اگر ہاتھ سے قرآن گر گیا تو کہتے ہیں کہ مسئلہ بتائیں میں کیا کروں؟ یعنی اتنا احترام ہے کہ قرآن شریف ہاتھ سے گر گیا ہے تو خیرات کر رہا ہے، لیکن جو قرآن کہتا ہے کہ نماز پڑھو، نماز نہیں پڑھتا۔ نعوذ باللہ! ہم لوگ اتنے ڈرامے باز بن گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے بھی ڈرامہ کرتے ہیں۔

ڈرامہ بازی چھوڑیئے:

جیسے ڈرامے والے لوگ کبھی رو رہے ہوتے ہیں اور کبھی ہنس رہے ہوتے ہیں، کبھی نقل کر رہے ہوتے ہیں۔ کبھی داڑھی والے اور کبھی بغیر داڑھی کے، کبھی مونچھوں والے اور کبھی بغیر مونچھوں کے۔ اسی طرح ہم بھی ......معاذ اللہ!...... اللہ میاں سے ڈرامے کر رہے ہیں، ہم انسان ہیں یا کیا بلا ہیں کہ ادھر کہتے ہیں کہ اللہ کا قرآن (سبحان اللہ جی!) دونوں جہانوں کا بادشاہ ہے اور اس کو چوم رہے ہیں، دونوں آنکھوں پر رکھ رہے ہیں اور اسی قرآن کو جہاں لگا رہے ہیں، وہاں داڑھی چٹ ہے۔ ایمان سے کہو کہ خدا سے ڈرامہ ہے یا نہیں کہ ہم کہہ کچھ رہے ہیں، دکھلا کچھ رہے ہیں اور عمل ہم کچھ کر رہے ہیں؟

قرآن کی بھی مانیں:

آپ مجھے اپنے ملک میں ایک آدمی دکھا دیں، جو لوگوں میں کھڑے ہو کر جرأت سے یہ کہے کہ میں قرآن کو نہیں مانتا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ آج اتنے سال گزر گئے کیا قرآن کو کسی نے مانا ہے؟ قرآن کے مطابق کوئی حکم آیا ہے؟ قرآن کے مطابق کوئی عمل ہوا ہے؟ قرآن کے مطابق کوئی قانون بنا ہے؟

قرآن پر بدعملی کی ایک مثال:

ایک دفعہ قرآن کا قانون بنایا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ طلاق پہلے دو اور مشورہ بعد میں دو۔ اس کے بارے میں انہوں نے کہا تھا کہ ہم نے جو عائلی قوانین بنائے ہیں وہ بالکل اسلام کے مطابق ہیں۔ کیونکہ وہ بدبخت پرویز کا سمجھا ہوا اسلام تھا۔ اس نے ان کو بنا کر دیئے تھے۔ اس بدبخت نے ان کو جو کہہ دیا کہ یہ قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن نے جو کہا کہ اگر جھگڑا ہو جائے تو ایک ''حَكَمْ'' (فیصلہ کرنے والا) خاوند کی طرف سے بنے اور ایک ''حَكَمْ'' بیوی کی طرف سے بنے، وہ دونوں ان دونوں کے درمیان صلح کرنے کی کوشش کریں۔ اگر اصلاح ہو جائے، اللہ توفیق دے تو بڑی اچھی بات ہے۔ تو اس سے اس نے یہ سمجھا کہ طلاق تو پہلے دے دو اور صلح بعد میں کراتے رہو، یعنی استنجاء پہلے کرلو اور پیشاب بعد میں کرتے رہو، نماز پہلے پڑھ لو اور وضو بعد میں کرتے رہو، غسل پہلے کرلو اور بیوی کو بعد میں مل لینا۔ اور پھر اس کو وہ قرآن کا قانون کہتے ہیں، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

جو بھی اسٹیج پر کھڑا ہوگا، وہ کہے گا: سبحان اللہ! ہم تو پکے قرآن کے خادم ہیں، ہم تو اسلام کے خادم ہیں، لیکن کیا کریں حالات کا تقاضا ہے، مجبوری ہے۔ تو بھائی! کیا کافروں کا ملک ہے کہ اسلام نافذ نہیں ہوسکتا؟ وہاں کافر بستے ہیں، یہودی رہتے ہیں، نصرانی رہتے ہیں، ہندو رہتے ہیں؟ جب مسلمانوں کا ملک ہے، کلمہ پڑھنے والوں کا ملک ہے تو آپ اسلام نافذ کریں، جو نہیں مانتا اس کو سزا دیں۔ اگر کوئی تمہارا حکم نہ مانے تو تم سزا دے سکتے ہو، اگر کوئی تمہاری مخالفت کرے تو تم اس کو جہنم رسید کرنے پر تل جاتے ہو، دنیا کے اندر جائیدادیں ضبط، فیکٹریاں ضبط، کارخانے ضبط، بینک اکاؤنٹ ضبط، اس کی اولادیں جیل میں، بچے جیل میں، ناحق مقدمات اور قدم قدم پر عذاب ڈال دیتے ہو۔ اللہ کا حکم قرآن میں موجود ہے اور جو قرآن کا حکم نہ مانے، اس کی سیدھی سزا ہے، وہ بے دین اور مرتد ہے۔

یہ کیا بات ہوئی کہ ہمیں ماحول اجازت نہیں دیتا؟ گھروں کے اندر اسلام کا ماحول نہیں ہے تو کہتے ہیں کہ کیا کریں، میں نے بڑا زور لگایا ہے بیوی نہیں مانتی، میں نے اپنی بیوی کو بڑا کہا ہے کہ باریک کپڑے نہ پہنا کرو، سر پر دوپٹہ لیا کرو۔ کیا کریں حضرت! مصیبت یہ ہے کہ بیوی نہیں مانتی ہے۔

اسلام پر پوری طرح عمل کرو:

ایک صحابی مسلمان ہوگئے۔ ان کی ماں نے بھوک ہڑتال کردی۔ اس نے کہا کہ میں مرجاؤں گی، اگر تم نے محمد

عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلمہ نہیں چھوڑا۔ وہ صحابی آئے اور کہا: اماں! بات سنو، تم نے اگر کل مرنا ہے تو آج مر جاؤ، میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں چھوڑ سکتا۔ انہوں نے جب یہ کہا تو ان کی ماں ٹھیک ہو گئی۔

کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے:

اللہ کے بندے! اگر تم اسلام پر ڈٹ جاؤ تو بیوی کی کیا طاقت ہے کہ وہ ٹھیک نہ ہو؟ یہ بھی کوئی مسئلہ ہے؟ یا تو بیوی ہو یا اسلام ہو، ان میں سے ایک کو چنو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ دونوں چلتے رہیں۔ یا اسلام یا کفر، یا تختہ مقام آزادی کا یا تخت مقام آزادی کا، کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ درمیان میں کوئی مقام نہیں ہے۔

بیوی کے لیے وارننگ:

سیدھی سی بات ہے، آپ اس کو سمجھا دیں کہ میں آپ کو تین دن کے لیے مہلت دے رہا ہوں۔ نماز پڑھو، مسلمان بنو، حیا کے ساتھ رہو تو میری بیوی ہو۔ وگرنہ تین دن کے بعد اپنا بوریا بستر اُٹھاؤ اور السلام علیکم۔ تجھے کوئی خاوند مل جائے گا تو مجھے کوئی بیوی مل جائے گی۔ پھر دیکھو کہ ٹھیک ہوتی ہے یا نہیں۔ وہ سب سے پہلے مصلی پر تسبیح لیکر بیٹھی ہو گی! شرط لگا لو۔ لیکن تم جو جا کر کہو کہ نماز پڑھو تو وہ کہتی ہے کہ کیا کروں کہ سارا دن بچے کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔ تم کہتے ہو: اچھا! کوئی بات نہیں۔ پھر وہ نماز کیوں پڑھے گی؟ جب خاوند اتنا بے غیرت ہے، نماز معاف کر سکتا ہے تو پھر بیوی کیوں پڑھے؟ سیدھی بات ہے کہ ہم اللہ میاں سے بھی ڈرامے کرتے ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ ہمیں ہدایت دے۔

''عَنۡهَا'' سے مراد جنت ہے یا ممنوعہ درخت؟

﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيۡطٰنُ عَنۡهَا﴾ پھر شیطان نے ان دونوں کو اس سے پھسلایا۔

''عنہا'' کی ضمیر کا مرجع بعض علماء کے نزدیک ''جنت'' ہے کہ جنت سے اس نے پھسلایا۔ جیسا کہ عاصم نے اپنی قرأت میں ''فَاَزَالَهُمَا'' پڑھا ہے کہ وہاں سے اس کو ہٹایا، پھسلایا۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اقرب مرجع ''درخت'' ہے کہ شیطان نے اس کو پھسلایا اس درخت کے ذریعے۔

قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ''زَلَّ'' کا معنی پھسلانا ہے۔ تو اب معنی ہوا: ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيۡطٰنُ عَنۡهَا﴾ ''اَیْ بِسَبَبِهَا'' کہ پھسلانے کا سبب یہی درخت بنا کر شیطان نے اسی درخت کے ذریعہ پھسلایا۔

ابلیس لعین سمجھ گیا تھا کہ اس چیز سے اللہ نے ان کو منع فرمایا ہے کہ اس چیز کے قریب نہ جاؤ۔ اگر میں کسی طرح ان کو اس درخت کے کھانے پر مجبور کردوں تو وہ اللہ کی نہی کو توڑ بیٹھیں گے۔ جب اللہ کی نہی کو توڑ بیٹھیں گے تو لازمی بات ہے کہ اللہ کی طرف سے ان کے اوپر سختی اور ناراضی آئے گی۔

﴿فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ﴾ جس چیز میں وہ تھے یعنی اللہ نے جو ان کو رحمت کے لباس دیئے تھے، جنت کا گھر دیا تھا، وہاں کے بہترین کھانے اور نعمتیں دی تھیں، ان سب سے ان کو نکلنا پڑا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۰، البقرۃ: الآیۃ: ۳۶]

مسئلہ عصمتِ انبیاء علیہم السلام:

"زَلَّ" کا معنی ہے: پھسلنا۔ یعنی شیطان نے ان دونوں کو پھسلایا اور ان دونوں کو اس جنت سے نکالا۔

اب یہاں جو سب سے اہم مسئلہ ہے وہ عصمتِ انبیاء علیہم السلام کا ہے، جس کو سمجھنے کے لیے انتہائی غور وفکر کی ضرورت ہے۔ انبیاء اور رسولوں یا اولیاء کی شان میں آدمی کوئی چھوٹی سی غلطی بھی کر بیٹھے تو بہت بڑا جرم ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے محبوبین، عباد صالحین، اولیاء متقین، انبیاء مرسلین کے بارے میں کسی قسم کی تنقیص یا توہین کو کسی لحاظ سے معناً، لفظاً، قولاً، عملاً، فعلاً، ارادۃً برداشت نہیں فرماتے اور اس پر عتاب آجاتا ہے۔

اہل سنت والجماعت اور تمام سلف صالحین کا اس بات پر اتفاق ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ اللہ کے نبی تمام اور رسول صغائر اور کبائر اور تمام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ انبیاء ملائکہ سے افضل ہیں۔ جیسے اللہ نے آدم علیہ السلام کو مسجود الملائکہ بنا کر افضلیت آدم کا کھلا اظہار کیا ہے۔ اور جب آدم علیہ السلام افضل ہیں تو اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تمام انبیاء بھی معصوم ہوتے ہیں، کیونکہ ملائکہ کے معصوم ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان کے بارے میں قرآن مقدس میں یہ نص موجود ہے کہ ﴿يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ [النحل: ۵۰]
جب ملائکہ معصوم ہوتے ہیں اور انبیاء ملائکہ سے افضل ہیں تو یہ بات کبھی نہیں ہوسکتی کہ غیر معصوم، معصوم سے افضل ہوجائے۔ اس لیے یہ بات طے ہے کہ جتنے اللہ کے پیغمبر ہیں، رسول ہیں، وہ معصوم ہیں۔ کیونکہ اگر خدانہ کرے انبیاء علیہم السلام کی عصمت نہ ہو تو پھر ان کی اطاعت کا کیا مطلب؟ اور اللہ نے یہ حکم دیا ہے:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ [التغابن: ۱۲]

"اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو۔"

اور دوسرے مقام پر تو بڑی واضح بات فرمادی:

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء:۸۰]

''جس شخص نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی، اس نے گویا اللہ کی اطاعت کی۔''

اور ایک آیت میں فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ [الفتح:۱۰]

''جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں گویا اللہ کی بیعت کر رہے ہیں۔''

یعنی حضور پاک ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کو اللہ نے اپنی بیعت قرار دے دیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات متصف بصفات الکمال والجمال ہے اور منزہ ہے ''عَنْ سَائِرِ صِفَاتِ النُّقْصَانِ'' وہ تو ہر صفتِ نقصان سے منزہ اور پاک ہے۔ جب اللہ نے فرمادیا کہ جنہوں نے آپ کی بیعت کی ہے انہوں نے گویا اللہ کی بیعت کی ہے تو جب اتنا بڑا مرتبہ اللہ کے نبی کو سونپا گیا اور پھر یہ بھی فرمادیا: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ [الاحزاب:۵۷] تو یہ ساری آیات اور پھر نبوت کا مقامِ شہادت کہ تمام انبیاء پر اور تمام اُمم پر ان کا شاہد ہونا، گواہی دینا اس بات پر واضح دلیل ہے۔ اور یہی اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ کے تمام انبیاء معصوم ہیں۔

اضطراری اور اختیاری عصمت:

ایک عصمت اضطراری ہے اور ایک عصمت اختیاری ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے، یعنی معصوم تو ملائکہ بھی ہیں، لیکن ان کی عصمت اضطراری ہے، اس لیے کہ اللہ نے ملائکہ میں قواتِ شہوانیہ، حیوانیہ کو رکھا ہی نہیں، ان میں ملکوتی صفات ہیں۔ اور انبیاء معصوم ہیں، لیکن ان کی عصمت کا مرتبہ ملائکہ سے بلند ہے، کیونکہ ان کی عصمت اختیاری ہے، اللہ نے ان میں ساری قوتیں رکھی ہیں م، لیکن اس کے باوجود وہ غلط کام نہیں کرتے۔

معصوم کا معنی ومفہوم:

''معصوم'' اسے کہتے ہیں جو نفس اور شیطان کے حملہ سے پاک ہو اور ان کے دھوکہ میں بھی نہ آئے، یعنی اندر سے بھی پاک اور باہر سے بھی پاک ہو۔

اللہ کے جتنے نبی اور جتنے رسول ہیں (ان پر اللہ کے کروڑوں صلوٰۃ ہوں) وہ نفس اور شیطان کے دھوکہ سے

پاک ہوتے ہیں، یعنی ان کا اندر بھی پاک ہوتا ہے اور باہر بھی پاک ہوتا ہے اور وہ ہر طرح کے دھوکہ سے محفوظ بھی ہوتے ہیں۔

نفس اس طرح پاک ہے کہ اللہ نے ان کو چن لیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ [الحج:۷۵] اور اسی طرح لفظ "يَصْطَفِيْ" آیا ہے، "اِصْطِفَاء" اور "اِجْتِبَاء" یہ افتعال کے وزن پر ہیں، یعنی اللہ نے جن کو اپنے لیے چن لیا ہے۔

اور اسی کو دوسری آیت میں واضح کر دیا: ﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ﴾ [طٰہٰ:۴۱] (میں نے اپنے لیے تمہیں چن لیا ہے)۔

اور تیسری آیت میں فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾ [شوریٰ:۱۳] (اللہ جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے اور جو اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اللہ اس کو اپنی طرف ہدایت دے دیتا ہے)۔

نبوت وولایت میں فرق:

لفظ "اِصْطَفیٰ" نبوت کے لیے ہے۔ اور مرتبۂ ولایت کسب سے، محنت سے، جدوجہد سے حاصل ہوسکتا ہے، لیکن نبوت ورسالت کا عہدہ بغیر آرڈر کے حاصل نہیں ہوسکتا۔

اس بات کو سمجھیں اور یاد رکھیں کہ اللہ کے اولیاء وہ ہوتے ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہوتے ہیں۔ اب جتنا آدمی تقویٰ میں بڑھتا گیا، بڑھتا گیا، بڑھتا گیا وہ مرتبہ ولایت تک پہنچتا گیا۔ حرام سے بچتا گیا، حلال کو اختیار کرتا گیا، اللہ کے تقویٰ میں اور خشیت میں بڑھتا گیا۔ اب وہ محنت سے مقامِ ولایت کو جا پہنچا، اللہ کا ولی بن گیا۔ لیکن نبوت ورسالت محنت سے حاصل نہیں ہوتی، یہ ایسا عہدہ ہے اور مرتبہ ہے کہ جب تک اللہ کا انتخاب نہ ہو، چاہے وہ کتنا پاک کیوں نہ ہو، عظمت والا کیوں نہ ہو، نبی نہیں کہلا سکتا۔

اب دیکھیں! دنیا میں ایک علم حاصل کرتا ہے کہ کسی نے M.A کرلیا، کسی نے ڈبل M.A کرلیا، کسی نے P.H.D کرلی، کسی نے دو علوم کے اندر P.H.D کرلی، کسی نے چار علوم کے اندر P.H.D کرلی۔ تو علم حاصل کرنا ہر کسی کی محنت پر موقوف ہے۔ میں نے محنت کی، اِس نے کی اور اس نے کی، سب کو ڈگری مل جائے گی۔ لیکن کسی ملک کا سفیر بن جانا بغیر آرڈر کے نہیں ہوسکتا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ہر ڈگری والا کہے کہ میرے پاس ڈگری ہے، لہٰذا میں سفیر ہوں۔ اس ملک والا کہے گا کہ میں یہ بات کیسے مانوں؟ پہلے آپ اپنے ملک کا آرڈر دکھلائیں، پھر اسنادِ سفارت پیش کریں، پھر اگر وہ ملک ان اسنادِ سفارت کو قبول کرے اور قبول کرنے کے بعد آپ کے اعزاز میں گارڈ

آف آرڈر پیش کرے، پھر جا کر تمہارا یہ عہدہ پکا ہوگا۔

اسی طرح آدمی محنت کرنے سے مقامِ ولایت تک تو پہنچ سکتا ہے، لیکن مقامِ نبوت تک نہیں پہنچ سکتا، جب تک کہ آرڈر نہ ہو، کیونکہ وہاں اللہ چنتا ہے۔ جب تک اللہ چن کر آرڈر نہ کرے کہ یہ میرا نبی ہے تو اس وقت تک مقامِ نبوت اور مقامِ رسالت حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی سے یہ اندازہ لگالیں کہ جب اللہ نے چن لیا اور اللہ ہر صفتِ نقصان سے پاک ہے اور ساری مخلوق اگر مل کر کسی کو چنے تو غلطی ہوسکتی ہے، لیکن اللہ کے چننے میں کوئی غلطی نہیں ہوسکتی۔ اللہ نے جن کو چنا، اگر ان کے اندر کوئی نقص و کمی رہ جائے تو...... نعوذ باللہ!...... اللہ کے چناؤ پر اعتراض آئے گا۔

نبی کی توہین کرنے والے کی توبہ قابلِ قبول نہیں:

ایک آدمی ساری زندگی شرک میں مبتلا رہا، اگر وہ آخری عمر میں توبہ کرلے تو اس کی توبہ قبول ہے۔ لیکن نبی کی توہین کرنے والا زندیق ہے اور اس کی سزا قتل ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہے۔ جب اس کی توبہ قبول نہیں تو چھٹکارا کیسے ملے گا؟

آپ دیکھیں کہ حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ کی بڑی عظیم الشان کتاب ہے جس کا نام ہے، ''اَلشِّفَاء بِتَعْرِيْفِ حُقُوْقِ الْمُصْطَفٰى ''...... اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے...... میرے خیال میں اس فن اور موضوع پر جو قلم انہوں نے اُٹھایا ہے اور کسی نے نہیں اُٹھایا۔ بڑی جامع اور مدلل کتاب ہے، جس میں انہوں نے کہا کہ کوئی آدمی اللہ، اللہ کے نبی کے بارے میں گستاخی کا کوئی لفظ کہے اور اس کے بعد کچھ بھی کرتا رہے تو اس کی سزا قتل ہے، موت ہے اور اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہے۔

[الشفا: ۲/۲۱۶، اَلْبَابُ الْأَوَّلُ فِيْ بَيَانِ مَا هُوَ فِيْ حَقِّهِ ﷺ سَبٌّ...]

چنانچہ آپ دیکھیں! جب مکہ فتح ہوا تو حضور ﷺ نے چار آدمیوں اور دو عورتوں کے بارے میں اپنے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ تمہیں حرم میں ملیں یا کعبہ کے غلاف کے نیچے بھی کھڑے ہوں تو ان کو قتل کردو، کیونکہ وہ حضور ﷺ کو گالیاں دیتے ہیں۔ [سنن النسائی، حدیث: ۴۰۶۷، اَلْحُكْمُ فِي الْمُرْتَدِّ]

نبی کی شان سے گرا ہوا کوئی لفظ کہہ دیا جائے تو وہ گالی ہے۔ جیسے آپ کسی افسر کو کہیں کہ تم غلط کہہ رہے ہو یا تم بکواس کررہے ہو تو یہ گالی ہے، تم اپنے فرائض صحیح انجام نہیں دے رہے، تم عدل نہیں کررہے۔ اس سے بڑی گالی کیا ہوگی؟ گویا کہ تم اسے ظالم کہہ رہے ہو۔

اگر انبیاء کی شان میں کوئی کوتاہی کا لفظ آجائے تو فرمایا: وہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا تو پھر بندہ کہاں جائے؟ جب توبہ کا راستہ ہی ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ساری محنت اکارت ہو گئی۔ اس لیے جب بھی انبیاء کی شان کا معاملہ آئے تو انسان کو بڑے ادب سے رہنا چاہیے۔ اگر کوئی مسئلہ سمجھ نہ آئے تو قلم روک دے۔ قلم کو روک دینا آسان ہے، لیکن انبیاء کی شان میں کوئی لفظ زیادہ لکھ بیٹھنا، نا قابلِ معافی ہے۔ اسی لیے کسی شاعر نے کیا ہی بات کہی تھی:

؎ با خدا دیوانہ باش
با محمد ہوشیار

خدا کے ساتھ تو دیوانگی کی حد تک چلے جاؤ، لیکن نبی کے دربار میں جاؤ تو خبردار! یہ اللہ کے محبوب کا دربار ہے، یہاں گستاخی کی معافی نہیں ملتی۔

﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِيْنٍ ۝﴾
[البقرة:٣٦]

شیطان جنت میں کیسے داخل ہوا؟

سدی، ابو العالیہ اور وہب بن منبہ نے بہت ساری روایات اسرائیلیہ وغیرہ نقل کی ہیں کہ آدم علیہ السلام کو شیطان نے کیسے نکالا؟ کیسے بہکایا؟ کیسے وسوسہ ڈالا؟ پھر جب شیطان کو جنت سے نکال دیا تو وہ دوبارہ جنت میں داخل کیسے ہوا؟

بعض روایات وقصص میں آتا ہے کہ وہ سانپ کی شکل میں سانپ کے اندر داخل ہو کر چلا گیا۔ یہ واقعات سورۃ الاعراف میں مفصل ذکر ہوں گے، فی الحال کچھ واقعات یہاں بھی ذکر کرتے ہیں۔

ابن ابی حاتم نے اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَمَّا ذَاقَ آدَمُ مِنَ الشَّجَرَةِ فَرَّ هَارِبًا فَتَعَلَّقَتْ شَجَرَةٌ بِشَعْرِهِ فَنُوْدِيَ: يَا آدَمُ! أَفِرَارًا مِنِّيْ؟ قَالَ: بَلْ حَيَاءً مِنْكَ، قَالَ: يَا آدَمُ! أُخْرُجْ مِنْ جِوَارِيْ، فَبِعِزَّتِيْ لَا يُسَاكِنُنِيْ فِيْهَا مَنْ عَصَانِيْ، وَ لَوْ خَلَقْتُ مِثْلَكَ مِلْءَ الْأَرْضِ خَلْقًا ثُمَّ عَصَوْنِيْ لَأَسْكَنْتُهُمْ دَارَ الْعَاصِيْنَ.))

[تفسیر ابن کثیر: ١/٨٠، البقرۃ: الآیۃ:٣٦]

''جب آدم علیہ السلام نے اس درخت سے چکھا تو بھاگے اور ایک درخت کی شاخیں آپ کے بالوں میں پھنس گئیں تو آواز

آئی: اے آدم! کیا تم مجھ سے بھاگ رہے ہو؟ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا کہ آپ سے حیاء کی وجہ سے۔ تو اللہ نے فرمایا: تم میری ہمسایہ گیری سے نکلو، مجھے اپنی عزت کی قسم! میں کسی کو بھی اپنے قریب جنت میں نہیں رکھوں گا جو میری نافرمانی کرے۔ اگر میں زمین بھردوں ایسی مخلوق سے جو میری نافرمانی کرے تو میں ان کو بھی نافرمانوں کی جگہ (جہنم) میں داخل کردوں۔''

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اس کے اندر غرابت ہے، حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ کے درمیان میں انقطاع ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نہیں ٹھہرائے گئے تھے جنت میں، مگر اتنی دیر عصر سے لے کر غروب شمس تک۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ کی شرط پر ہے۔

اوقات کو اللہ تبارک وتعالیٰ ہی جانتے ہیں، ہم ان کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ جیسے آتا ہے کہ قیامت کا ایک دن ہزار سال کے برابر ہوگا۔ لہٰذا جنت کے اسی اندازہ سے عصر سے لیکر مغرب تک کے وقت کا اندازہ لگائیں۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔ تو عصر سے مغرب تک کا وقت اسی حساب سے نکالنا ہوگا۔

عبد بن حمید کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت کے اندر ایک گھڑی ٹھہرے اور ایک گھڑی تقریباً ایک سو تیس سال کے برابر تھی۔

حضرت ابوجعفر الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نو بجے یا دس بجے نکالا گیا۔ آپ جنت سے ایک ٹہنی بھی لے آئے اور آپ کے سر پر جنت کے درختوں میں سے ایک تاج بھی تھا اور اس کا نام ''اکلیل'' ہے۔

بہرحال یہ روایات بھی آئی ہیں۔ یہاں مفسر رحمہ اللہ نے ذکر نہیں فرمایا، جیسا کہ وہ اشارہ فرماگئے ہیں کہ وہ سورۃ الاعراف کے اندر جا کر اس کی مفصل بحث کریں گے۔

لیکن تمام روایات کو جمع کرنے کے بعد اور تمام اقوال جتنے اس بارے میں ملے ہیں، ان سب کا حاصل یہ تھا کہ اصل میں ابلیس لعین نے آدم علیہ السلام کو دھوکہ میں ڈالا تو وہ دھوکہ بھی اس انداز میں تھا کہ ''محبتِ خداوندی میں آکر وہ دھوکہ کھاگئے۔'' [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۰، البقرۃ: الآیۃ: ۳۶]

ابلیس کے گمراہ کرنے کے طریقے:

دھوکہ دینے کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات ایک شریف آدمی کو شریف بن کر دھوکہ دیا جاتا ہے، ایک ڈاکو کو ڈاکو بن کر دھوکہ دیا جاتا ہے اور چور کو چور بن کر دھوکہ دیا جاتا ہے۔

اسی طرح ابلیس لعین کے لوگوں کو بہکانے اور ہلاکت میں ڈالنے کے بھی مختلف انداز ہیں، چنانچہ عالم کو اس کے علم کے ذریعہ دھوکہ دیتا ہے، کبھی عابد کو اس کی عبادت کے ذریعہ دھوکہ دیتا ہے، کبھی ایک آدمی کو اس کی صداقت کی بناء پر دھوکہ دیتا ہے، شریف آدمی کو شرافت کے انداز میں دھوکہ دیتا ہے۔

یہ اس کے جال ہیں، ان اللہ تبارک وتعالیٰ ہی بچا سکتا ہے۔ ہم شیطان کے حملے سے اس کے علاوہ نہیں بچ سکتے کہ ہم اللہ کی پناہ پکڑیں: ''أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' یا اللہ! ہم تجھ سے پناہ پکڑتے ہیں کہ یہ ایسا خطرناک دشمن ہے جو ہمیں نظر بھی نہیں آتا اور اس کے تسلط کا یہ عالم ہے کہ جتنا دور سے چاہے وسوسے ڈال دے اور پھر جس شکل میں چاہے سامنے آجائے۔ اس کے حملوں سے بچنے کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں: ﴿إِنَّهُ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ [الاعراف: ۲۷] کہ وہ تمہیں دیکھ سکتا ہے اور تم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ اب جو دشمن نظر آنے والا بھی نہ ہو تو آدمی اس کے حملے سے کیسے بچے؟ اس سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ پھر ہم پروردگار عالَم کی پناہ میں آجائیں جس کو دنیا کی کوئی طاقت ہی نہیں دیکھ سکتی۔

شیطان نے آدم علیہ السلام کو بہکانے کا کیا طریقہ اپنایا؟

علماء نے لکھا ہے کہ شیطان نے آدم علیہ السلام کو اس انداز میں دھوکہ دیا کہ ان سے کہا: تمہیں پتہ ہے کہ اللہ نے تمہیں اس درخت سے کیوں روکا ہے؟ آدم علیہ السلام نے کہا: نہیں۔ اس نے کہا: یہ شجرة الخلد ہے، یعنی ایسا درخت ہے کہ جو اس سے کھاتا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور اس کا یہ ملک، سلطنت اور راحت و آرام بھی کبھی بوسیدہ نہیں ہوتے۔ ورنہ یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو خلافت فی الارض کے لیے چنا ہے، آپ نے زمین میں جانا ہے اور زمین میں جانے کے بعد آپ نے مرنا ہے۔ آدم علیہ السلام نے پوچھا: وہ موت کیا چیز ہے؟ اس نے کہا: میں آپ کو بتاتا ہوں۔ چنانچہ اس نے موت کی شکل اختیار کی، ایک جانور بنایا اور دکھایا کہ اس کو موت آرہی ہے، سکرات لگی ہوئی ہے اور اس کے بعد وہ مرگیا۔ آدم علیہ السلام نے پوچھا: اس درخت کا کیا فائدہ ہے؟ شیطان نے کہا: یہ درخت کھالو تو کبھی موت نہیں آئے گی، کیونکہ یہ شجرة الخلد ہے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ اس درخت کے کھانے سے آپ ہمیشہ اپنے پروردگار عالم

کے پاس جنت میں رہیں گے۔ اور اگر آپ نے نہ کھایا تو کبھی نہ کبھی آپ کو نیچے بھیجا جائے گا، کیونکہ آپ نے زمین میں خلافت کرنی ہے، آپ یہاں سے نکالے جائیں گے۔

اب آدم علیہ السلام پر دراصل یہ غلبہ ہوا کہ میں اللہ کے قرب میں رہوں، میں اللہ سے دور نہ ہو جاؤں اور میں جنت میں رہوں۔ اور اس بدبخت نے یہ بھی کیا جو قرآن میں آتا ہے: ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ [الاعراف:۲۱] مجھے اللہ کی قسم ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور آپ کو پیدا کیا ہے، میں تم دونوں کا خیرخواہ ہوں، ﴿فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ﴾ [الاعراف:۲۲] اب حضرت آدم علیہ السلام نے دھوکہ اس وجہ سے کھایا کہ مجھے قربِ خداوندی حاصل رہے۔ اگر میں نے نہ کھایا تو میں اللہ سے دور ہو جاؤں گا اور جنت سے نکال دیا جاؤں گا اور مجھے زمین میں جانا ہوگا۔ چونکہ آدم علیہ السلام قربِ خداوندی کے متلاشی تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب چاہتے تھے، اسی لیے ان کو دھوکہ بھی اسی شکل میں دیا گیا۔

شیطان کے گمراہ کرنے کے مختلف جال:

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ بہت بڑے اللہ والے گزرے ہیں، بہت بڑے موحد اور حنبلی المسلک تھے۔

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ عبادت کر رہے تھے، اچانک دیکھا کہ درخت پر روشنی ہی روشنی ہے، اس کے بعد ایک آواز آئی کہ تم نے میری اتنی عبادت کی ہے، اتنی محنت کی ہے، اتنی چلّہ کشی کی ہے، اتنی ریاضت کی ہے کہ میں تجھ سے راضی ہو گیا ہوں، اس کے بعد میں نے تم پر تمام عبادتیں معاف کر دی ہیں...... اب ایک روشنی بھی ہو اور اس سے یہ آواز بھی آ رہی ہو تو فوری طور پر آدمی کے ذہن میں خیال آئے گا کہ یہ تو اللہ کی طرف سے کوئی آواز ہے، جیسے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ درخت سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا تھا...... انہوں نے فوراً ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' پڑھا اور دعا مانگی کہ اے اللہ! مجھے پناہ دے۔ اسی وقت شیطان لعین سامنے آ گیا اور کہنے لگا: اے عبدالقادر! تم بچ گئے، تمہیں تمہارے علم نے بچا لیا ہے، ورنہ میں نے اسی طریقہ سے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ آپ نے دوبارہ پڑھا: ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' اللہ! مجھے پناہ دے۔ شیطان سے تو مجھے اللہ نے بچایا ہے، علم نے کہاں بچایا ہے؟ کتنے علم والے ہیں جو بے چارے بھٹک گئے، مجھے تو میرے اللہ نے بچا لیا۔ اس نے کہا: اے عبدالقادر! میرے پاس دنیا میں لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے ستر ہزار نوری پھندے ہیں، یعنی بظاہر نور ہوتا ہے اور اندر ظلمت ہوتی ہے۔

جیسا کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ دجال جب ظاہر ہوگا تو وہ زمین کو حکم کرے گا کہ خزانے نکالو تو زمین خزانے نکال دے گی، خشک دریاؤں کو چلنے کا حکم دے گا تو وہ چل پڑیں گے، برباد اور اُجڑے ہوئے کھیتوں کو حکم کرے گا کہ آباد ہو جاؤ تو وہ آباد ہو جائیں گے۔

اور اسی طرح فرمایا کہ اس کے ساتھ جنت بھی ہوگی اور جہنم بھی ہوگی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: دجال کی جو ظاہراً جنت ہوگی وہ حقیقت میں جہنم ہوگی اور جو اس کی جہنم ہوگی وہ حقیقت میں جنت ہوگی۔ چنانچہ جس کو وہ اپنی جنت میں داخل کرے گا، گویا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں چلا جائے گا اور جو اس کا انکار کرے گا، اس کی بات نہیں مانے گا، پکا مومن بنے گا تو اسے وہ اپنی جہنم میں ڈالے گا، جبکہ درحقیقت وہ جنت میں چلا جائے گا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۳۳۳۸، بَابُ قَوْلِ اللهِ تَعَالَى: إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا...]

انسان کو کسی نہ کسی رنگ میں دھوکہ لگ سکتا ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ ہمارے بہت سارے مسلمان لوگوں کو ابتداء میں یہی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک بزرگ کا مزار ہے، چنانچہ وہ فاتحہ پڑھنے کے لیے وہاں چلے جاتے ہیں، فاتحہ کے بعد اور آگے بڑھتے ہیں کہ میری ان کے ساتھ زیادہ عقیدت ہو، زیادہ محبت ہو، اب وہ آہستہ آہستہ ہاتھ لگانے پر آتے ہیں، پھر اس کے بعد بوسے پر آجاتے ہیں، پھر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے پر آجاتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ چکر لگانے پر آجاتے ہیں اور پھر انتہاء میں وہ قبر پر سر سجدے میں ڈال دیتے ہیں۔

اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کو کوئی مشکل پیش آگئی تو دوسرے نے کہا کہ آپ فلاں بزرگ کی قبر پر جاؤ اور آپ وہاں نو راتیں بیٹھو اور رات دن تم بس اس بزرگ کا تصور ذہن میں رکھو، گویا کہ وہ بزرگ آگئے ہیں اور تیری مدد کر رہے ہیں اور تجھے مشکل سے نکال رہے ہیں۔

اب وہ بے چارا رات دن قرآن بھی پڑھ رہا ہے، وظیفے بھی پڑھ رہا ہے اور تصورات میں بھی پڑا ہوا ہے۔ رات کو شیطان نے دھوکہ دیا، شیخ کی شکل بنا کر اس کے سامنے آیا اور کہا کہ تمہاری مشکل میں نے حل کر دی ہے۔

خدا کی قدرت ہے کہ کام بھی ہو جاتے ہیں، کیونکہ اللہ کی طرف سے بندے پر امتحان آتا ہے۔ کام تو آخر ہندو کے بھی ہو جاتے ہیں، کام تو یہودیوں اور نصرانیوں کے بھی ہو جاتے ہیں، آخر اللہ نے جو لکھا ہے کام تو ہونا ہے۔

اب اس آدمی کو آپ لاکھ تقریر کریں، قرآن سنائیں، حدیث سنائیں، قبر پرستی سے ڈرائیں، وہ کہے گا کہ مولوی صاحب! بڑی عجیب بات ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ قبر سے شیخ نکل آیا اور اس نے میری مدد کی اور



اس نے کہا کہ جاؤ تمہارا کام میں نے کر دیا ہے، اور میرا کام ہو گیا۔ اب اس پر تقریر کیا اثر کرے؟ ہاں! جس کو اللہ ہدایت عطا فرما دے وہ سمجھ جائے کہ ایسے جنات کے تصرف ہوتے ہیں، ورنہ نفع کا مالک صرف اللہ ہے، اور کوئی نفع دینے والا اور نقصان دینے والا نہیں۔ اور جس بزرگ کو میں اپنا حاجت روا بنا رہا ہوں ان پر تو خود موت آ گئی ہے، وہ تو خود دفن ہو چکے ہیں، ان پر تو خود مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہیں، وہ اپنی مصیبتیں رفع نہیں کر سکے تو میری حاجت روائی کیا کریں گے؟

ایک طرف تو کہتے ہیں کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ مظلوم تھے اور شہید ہو گئے اور ساتھ بہتر (۷۲) حضرات اور بھی شہید ہو گئے اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت چھن گئی، بی بی زہراء رضی اللہ عنہا کا فدک بھی چھن گیا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہ اپنی بیوی کی مشکل کشائی کی، نہ اپنی اولاد کی مشکل کشائی کی، اور نہ اولاد کی اولاد کی مشکل کشائی کی، اور تیری مشکل کشائی کے لیے وہ تیار ہیں!!!

کہتے ہیں کہ وہ تو اللہ کی رضا پر راضی تھے، وگرنہ حضرت علی کا نعرہ لگاتے تو سارے مر جاتے۔ اچھا! وہ تو رضا پر راضی تھے، شہید ہونا چاہتے تھے تو تم اللہ کی رضا پر راضی کیوں نہیں ہو؟ اگر وہ اللہ کی رضا پر راضی تھے تو ہمیں یہی سبق دے گئے ہیں کہ ہمارے ماننے والے بھی اللہ کی رضا پر راضی رہیں، اللہ شہادت لکھے تو الحمد للہ، تکلیفیں لکھے تو الحمد للہ، خوشیاں لکھے تو الحمد للہ، دکھ دے تو الحمد للہ، سکھ دے تو الحمد للہ۔ ہمیں بھی تو پھر ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔

کتنے لوگ ہیں کہ جن کی زندگی میں نہ نماز ہے، نہ روزہ ہے، نہ زکوٰۃ ہے، کبھی کسی کو حج نصیب ہو گیا تو ہو گیا۔ اور اس کے متعلق بھی یہ عقیدہ ہے کہ زواری یعنی کربلا میں امام حسین کے روضہ کی زیارت میں زیادہ ثواب ہے اور حج کا ثواب کم ہے۔ جیسے ہمارے بعض سرمایہ دار یا امیر آدمی حج کے لیے آتے ہیں، حج کرنا ان کا بھی مقصد نہیں ہوتا، بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ پکنک کر لیں اور دیکھ لیں کہ دہاں اتنے آدمی کٹھے ہوتے ہیں، وہاں کیا ہوتا ہے؟ ایسے وہ بھی حج کرنے کے لیے آ جاتے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جن کو مکہ اور مدینہ میں رہتے ہوئے بھی نماز کی فکر نہیں، روزہ کی پروا نہیں، حج وہ نہیں کرتے، زکوٰۃ وہ نہیں دیتے، قرآن پاک کا خیال وہ نہیں کرتے!! وجہ کیا ہے؟

وجہ یہ ہے کہ دماغوں میں ایک دھوکہ آ گیا ہے کہ ہم اہل بیت رسول کے محبّ ہیں اور اہل بیت قیامت کے دن جنتوں کے مالک ہوں گے، ہمیں تو عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہمیں وہ پکڑ کر جنت میں لے جائیں گے۔ ایک بات دماغ میں بٹھا دی گئی ہے اور وہ بات دماغ سے نکلتی ہی نہیں ہے۔ وجہ کیا ہے......؟ وجہ یہ ہے کہ ﴿وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ

الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾ [الانفال: ۴۸] شیطان نے غلط اعمال کو دماغوں میں مزین کر دیا ہے کہ یہ اصل عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں شیطان کے دھوکہ سے بچائے۔

ایک شخص عالم ہوگا۔ اس کی ساری زندگی علم میں گزری ہوگی۔ شیطان اس کے دماغ میں کیڑا ڈال دے گا کہ تم سے بڑا عالم تو کوئی ہے ہی نہیں، باقی تو کچھ بھی نہیں، فلاں کو تو چھوڑ دو وہ تو بالکل جاہل آدمی ہے۔ آپ اس سے پوچھیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کتنے بڑے عالم تھے؟ تو وہ کہے گا: چھوڑ و جی! وہ تو کوفہ کا ایک قصائی تھا...... نعوذ باللہ!...... حالانکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تابعین کے دور کے آدمی ہیں، خیر القرون کے دور کے آدمی ہیں، کوئی ان کی فقہ کو مانے یا نہ مانے، لیکن گستاخی کرنے کا تو کسی کو حق نہیں ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اس مسئلہ پر کوئی صحیح حدیث موجود ہو، تمہیں کیا پتہ ہے؟ ان کا زمانہ اقرب الی زمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے، ہم چودہ سو سال پیچھے آگئے اور وہ صرف سو سال پیچھے ہیں تو جو لوگ تیرہ سو سال حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ہم سے زیادہ قریب ہیں تو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور سنت کا علم، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال کا علم ہو سکتا ہے وہ ہمیں کیسے ہو سکتا ہے؟ جنہوں نے ان لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین پڑھا ہوا اور پھر کوفہ، صحابہ رضی اللہ عنہم کا مرکز بن گیا تھا، یعنی بڑے بڑے اجلاء صحابہ رضی اللہ عنہم ان کا مرکز بن گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دارالخلافہ وہاں بنا لیا تو تمام علم جو مدینہ منورہ کا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا تھا، وہ کوفہ منتقل ہو گیا۔ لیکن بس شیطان دماغ میں ایک کیڑا ڈال دے گا۔

آج کل تو لوگ کہتے ہیں کہ اگر امام ابوحنیفہ پیدا نہ ہوتے تو لوگ بالکل ٹھیک ہوتے، یہ جھگڑے بھی نہ ہوتے۔ یہ جھگڑا ہی ان چاروں اماموں نے کیا ہوا ہے۔ یاد رکھو! اگر یہ چار نہ ہوتے تو تم چار ہزار بن جاتے، چار لاکھ بن جاتے، پھر کیا ہوتا؟ ابھی تو شکر کرو کہ ان چار نے محنت کر کے ایک چیز کو منضبط کیا ہوا ہے، اگر ہم ہر آدمی کو چھٹی دے دیں گے تو کئی ہزار بن جاؤ گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے۔

اصلاحِ نفس کے لیے اولیاء اللہ کی تدابیر:

بعض اولیاء نے لوگوں کی اصلاح کے لیے کچھ طریقے وضع کیے۔ اب اگر ہمیں ان کا بظاہر کوئی ثبوت نہ ملے تو ہمیں یہ سوچ کر خاموشی اختیار کر لینی چاہیے کہ اب تو وہ فوت ہو گئے ہیں، اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ ان کی قبروں پر رحمت فرمائیں۔

اور پھر ہم مجموعی طور پر کسی کی خدمات کا نتیجہ دیکھیں! قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک عالم ہے، مثلاً وہ درس دے رہا ہے، وعظ کر رہا ہے، تفسیر پڑھا رہا ہے، حدیث پڑھا رہا ہے، ہمیں ایک نتیجہ دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ اس کے ساتھ جڑتے ہیں وہ موحد بن رہے ہیں یا بدعتی بن رہے ہیں؟ وہ موحد بن رہے ہیں یا مشرک بن رہے ہیں؟ وہ نمازی بن رہے ہیں یا بے نمازی بن رہے ہیں؟ وہ اچھے بن رہے ہیں یا بُرے بن رہے ہیں؟ ان کی اصلاح ہو رہی ہے یا ان کی خرابی ہو رہی ہے؟ ان کے کام اصلاح والے ہیں تو الحمد للہ کہیں۔ ہوسکتا ہے کسی میں کچھ غلطیاں ہوں، مگر اس کی خدمات تو ہیں اور اس سے لوگوں کو بڑا فائدہ ہوا ہے۔

اصل میں یہ سب کچھ عداوتِ شیطان کا نتیجہ ہے۔ جب شیطان دشمنی پر آتا ہے تو سب سے پہلے وہ اللہ کے اولیاء کے ساتھ دشمنی پیدا کرتا ہے، وہ صحیح معنوں میں عباد اللہ الصالحین کا دشمن بنتا ہے اور جب آدمی ان کا دشمن بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''مَنْ عَادَى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ'' [صحیح بخاری، رقم: ۶۵۰۲] (جو میرے دوستوں کے ساتھ دشمنی رکھے وہ میرے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جائے)۔ پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی بھٹکا اور گیا۔ پھر آدمی ایسے ہے جیسے دو دھاری تلوار پر چل رہا ہے کہ پھسلا تو گیا۔

شیطان جب کسی عابد کو دھوکہ دیتا ہے تو عبادت کے رنگ میں دھوکہ دیتا ہے۔ چنانچہ ایک شخص عابد ہے، ساری رات عبادت میں کھڑا رہتا ہے، تو یہ اس کے دل میں ڈال دے گا کہ تیری جیسی عبادت کسی نے نہیں کی، تُو نے تو کمال کر دیا، تُو واقعی اللہ کا بندہ ہے۔ بس یہ چیز دماغ کے اندر آئی اور بندہ گیا۔ اور عالم کو علم میں دھوکہ دیتا ہے کہ تم اتنے بڑے عالم ہو کہ تم نے جو حدیث سمجھی ہے تیرہ سو سال پہلے کے امام بھی نہیں سمجھ سکے، تم نے کمال کر دیا ہے۔ پہلے تیرہ سو سال والے سب غلط ہیں۔ جب ایسی بات ذہن میں آئی تو سمجھو کہ آدمی سیدھے راستے سے گیا۔

شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکہ کیسے دیا؟

اسی طرح شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو دھوکہ دیا کہ مجھے اللہ کی قسم ہے کہ میں تمہارا خیرخواہ ہوں۔ اب آدم علیہ السلام جیسے مومن، اللہ کے نبی، وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ کوئی اللہ کے نام پر بھی جھوٹی قسم کھا جائے گا...... مومن تو صاف دل ہوتا ہے، مومن جیسے اس کا دل صاف ہوتا ہے وہ دوسرے کو بھی صاف سمجھتا ہے، اس کو تو یہ تصور بھی نہیں ہوسکتا...... اور پھر حضرت آدم علیہ السلام سے کہا کہ یہ شجرۃ الخلد ہے، اس کو جب کھاؤ گے تو ہمیشہ جنت میں رہو گے۔ آدم علیہ السلام پہلے ہی یہ چاہتے تھے کہ میں جنت سے نہ نکلوں۔ اور اسی رنگ میں ان کو دھوکہ دیا گیا۔

باقی یہ باتیں کہ شیطان سانپ کے منہ میں گھس گیا، اس کے اندر کیسے چلا گیا؟ اندر جانے کی ضرورت تو اس کو ہو جس کی باہر بات نہ چلے۔ ایک آدمی اگر یہاں سے بیٹھے بیٹھے اپنی بات دور نہ پہنچا سکے تو وہ سفر کرے گا۔ جب وہ دور بیٹھ کے بھی وسوسہ ڈال سکتا ہے تو پھر اسے اندر جانے کی ضرورت کیا ہے؟ اور ہمیں جھگڑنے کی ضرورت کیا ہے کہ کبھی اس کو سانپ کے منہ میں ڈالیں اور کبھی کسی اور چیز کے منہ میں۔ ہمیں جب گمراہ کرتا ہے تو سانپ بن کر تو نہیں کرتا، ہمارے دلوں کے اندر بھی تو وسوسہ ڈال دیتا ہے، خیال ڈال دیتا ہے اور ہم بھٹک جاتے ہیں۔ جب قرآن نے کہہ دیا: ﴿فَوَسْوَسَ﴾ کہ شیطان نے وسوسہ ڈالا۔

آدم علیہ السلام کو کون سے ملک میں اُتارا گیا؟

﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ اللہ نے حکم دیا کہ جنت سے اُترو۔ چنانچہ آدم علیہ السلام ہند میں اُترے اور جنت کے درختوں کے کچھ پتے بھی اپنے ساتھ لائے، وہ پتے آپ نے ہندوستان کی زمین میں چھوڑے، وہاں کچھ بوٹیاں وغیرہ پیدا ہوئیں جن سے عطر وغیرہ پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے عطر اس وجہ سے مشہور ہیں کہ وہاں کچھ وہ پتے آگئے تھے جو آدم علیہ السلام جنت سے لائے تھے۔ ان سے یہ چیزیں پیدا ہوئیں۔ آدم علیہ السلام اس لیے ساتھ لائے تھے کہ جنت کی کچھ نعمتیں بطور یادگار میرے پاس رہیں، کیونکہ آپ کو دُکھ تھا کہ میں جنت سے اُتارا جا رہا ہوں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہندوستان کی اس جگہ کا نام ''رحنا'' تھا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت میں ہے کہ مکہ اور طائف کے درمیان ''رحنا'' مقام پر اُتارے گئے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ''ہندوستان'' میں اُتارا گیا اور حضرت حواء علیہا السلام کو ''جدہ'' میں اُتارا گیا اور ابلیس کو ''بصرہ'' کے قریب ایک جگہ پر اُتارا گیا اور سانپ کو ''اصفہان'' میں اُتارا گیا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ''صفا'' میں اُتارا گیا اور بی بی حواء علیہا السلام کو ''مروہ'' میں اُتارا گیا۔

حضرت رجاء بن سلمہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام اُترے تو رکوع کی کیفیت میں تھے، سر جھکائے ہوئے تھے اور ابلیس کو جب اُتارا گیا تو اس نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے اور سر کو تکبر کر کے اُٹھایا ہوا تھا۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو زمین پر اُتارا تو آپ کو ہر چیز کی صفت کا

علم بھی عطا فرمایا اور جنت کے پھل بھی عطا فرمائے۔ یہ جو پھل تم کھا رہے ہو، گویا یہ جنت کے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ان کے اندر تغیر آئے گا اور جنت کے پھلوں کے اندر کوئی تغیر نہیں آئے گا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۰، البقرۃ: الآیۃ: ۳۶]

آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن اُتارا گیا؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((خَيْرُ يَوْمٍ طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ يَوْمُ الْجُمُعَةِ، فِيهِ خُلِقَ آدَمُ وَ فِيهِ أُدْخِلَ الْجَنَّةَ وَ فِيهِ أُخْرِجَ مِنْهَا.)) [صحیح مسلم، حدیث: ۸۵۴، بَابُ: فَضْلِ يَوْمِ الْجُمُعَةِ]

''سب سے بہتر دن جمعہ کا ہے، کیونکہ جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت میں داخل فرمایا اور جمعہ کے دن حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالا گیا۔''

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہمارے لیے اس آیت میں بہت بڑی تنبیہ ہے کہ اگر ہمارے ابا حضرت آدم علیہ السلام کو اتنی معمولی سی غلطی پر اتنی بڑی تنبیہ ہوئی تو ہم کس قطار و شمار میں ہیں کہ دنیا میں رہیں اور جو مرضی آئے کھاتے رہیں اور جو مرضی آئے پیتے رہیں اور جو مرضی آئے حرام کرتے رہیں؟ نہیں، بلکہ ہمیں اس سے سبق لینا چاہیے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۰، البقرۃ: الآیۃ: ۳۶]

جنت ہماری میراث ہے:

حضرت فتح الموصلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم جنت کے لوگ تھے، ہمارا گھر جنت میں تھا، لیکن اس نے ہمیں قیدی بنا کر وہاں سے نکالا۔ اب ہمارا سب سے بڑا غم یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے ابا کی اس جگہ جنت میں پہنچیں۔ اور وہ کیسے پہنچیں گے؟ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۱، البقرۃ: الآیۃ: ۳۶]

﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۳۷﴾

پھر آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں، پھر اللہ آدم کی طرف متوجہ ہو گیا، بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

ماقبل آیات سے ربط:

پہلے اللہ نے حکم دیا: ﴿اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ (آدم کو سجدہ کرو)۔ یہ حکم ہے۔ ﴿فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ﴾ سب نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا، امر نہیں مانا، رب کا حکم نہیں مانا۔ کیوں؟ ﴿اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ﴾ انکار کیا، تکبر کیا۔ اللہ نے حکم دیا کہ میرا شریک مت بناؤ، اللہ نے حکم دیا: ﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ اب جو نماز نہیں پڑھتا تو یہ تکبر ہے۔

ایک حکم ہے کہ شراب نہ پیو، زنا نہ کرو، چوری نہ کرو، ڈاکہ نہ مارو اور قتل نہ کرو۔ اب اگر کوئی ان میں پڑ جائے تو یہ ارتکابِ نہی ہوگا کہ زنا کی شہوت ہوئی، لذات کی شہوت میں مبتلا ہو گیا، کسی سے انتقام کی شہوت میں مبتلا ہو کر قتل کر بیٹھا تو اسے تکبر نہیں کہتے، بلکہ یہ شہوت کا غلبہ ہوتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ جو حکم کا انکار کرے، اس کے لیے جہنم ابدی ہے، لیکن جس نے ارتکابِ نہی کیا، اس کے لیے دروازہ کھلا ہوا ہے کہ وہ توبہ کر سکتا ہے، اس کو معافی مل سکتی ہے۔ اگر وہ توبہ توڑ بیٹھے تو وہ پھر توبہ کر لے، بلکہ اگر بندے غلطی نہ کریں تو اللہ فرماتے ہیں کہ پھر میری صفت ''سَتَّار'' ہونے کا...... ''غَفَّار'' ہونے کا...... ''غَفُوْر'' ہونے کا...... ''رَحِيْم'' ہونے کا اور ''رَحْمَان'' ہونے کا اظہار کب ہوگا؟

ایک حدیث مبارک میں یہ لفظ بھی آئے ہیں کہ اگر میرے بندے غلطی نہ کرتے تو میں ان کو تباہ کر دیتا اور ان کی جگہ اور مخلوق پیدا کر دیتا جو گناہ کر کے مجھ سے توبہ کرتی۔ جہاں میں ''قَهَّار'' ہوں وہاں میں ''سَتَّار'' بھی تو ہوں۔ یہ بھی تو شانِ بادشاہی ہوتی ہے کہ آپ بڑے سے بڑا جرم کریں اور آ کر ہاتھ باندھ لیں کہ میں مجرم ہوں تو بادشاہ کہے گا کہ اچھا جاؤ میں نے معاف کیا۔ یہ بھی تو بادشاہوں کی صفت ہے اور اللہ تو شہنشاہوں کے شہنشاہ ہیں، وہ تو ''مَلِكُ الْمُلُوْكِ'' ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ کے حکم کا کہیں انکار نہیں کیا۔ یہ بات یاد رکھیں! صرف ارتکابِ نہی ہوا اور وہ کیوں ہوا؟ اس کے اندر بھی اللہ تعالیٰ کی کئی حکمتیں تھیں۔

اسی لیے علماء نے ایک بڑی باریک بات بیان کی ہے کہ ارتکابِ نہی جب بھی ہوتا ہے تو اس کا تعلق مادۂ غضب کے ساتھ ہوتا ہے اور معافی کا تعلق رحم کے ساتھ ہوتا ہے۔ تو ایک صفت غضب ہے اور ایک صفت رحمت ہے۔ اور یہ بھی حدیث میں واضح موجود ہے کہ میرے اللہ کی صفت رحمت، صفت غضب پر غالب ہے۔

ایک ولی اللہ کا بادشاہ کی دولت ٹھکرانے کا واقعہ:

ایک بادشاہ نے ایک اللہ کے ولی کو خط لکھا کہ چونکہ آپ کا لنگر بہت وسیع ہے، ماشاء اللہ! ہزاروں آدمی لنگر کھانے آتے ہیں اور آپ کے ہاں قیام کرتے ہیں، اتنے زیادہ اخراجات کا بوجھ برداشت کرنا آپ کے لیے باعثِ پریشانی ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے ملک کا چوتھا حصہ آپ کے لنگر کے لیے وقف کر دوں، تا کہ اس کی تمام آمدنی آپ کے لنگر پر خرچ ہو اور آپ کا لنگر ہمیشہ قائم و دائم رہے۔ آپ مجھ سے میری سلطنت کا چوتھا حصہ لے لیں۔ اس اللہ والے نے اس کو جواب میں لکھا، جو فارسی کا ایک شعر تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تمہیں تمہاری نیت اور تمہارے ارادے کے مطابق ثواب عطا فرمائیں گے، لیکن ہمیں جو اللہ نے رات کی شہنشاہی بخشی ہے، اس کے مقابلے میں تمہاری شہنشاہی میں کوئی لذت نہیں ہے۔ تم تو ہمیں چوتھے حصے کی شہنشاہی دینا چاہتے ہو، اللہ نے ہمیں آدھی رات کی شہنشاہی دی ہوئی ہے۔ مجھے جو نیم شب کی سلطنت ملی ہوئی ہے تو میں تمہارے اس ملک کو ایک رات کے بدلے قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ اللہ کا دروازہ چھوڑ کر محتاجوں کا محتاج ہو جاؤں۔ [ملفوظاتِ حکیم الامت: ۳/ ۲۴۳، بزرگوں کا استغنا اور سلطان شمس الدین......]

دیکھیں! ایک بندہ چاہے بادشاہ ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اللہ کا محتاج ہے، چاہے وہ کتنا بڑا غنی ہو، کروڑ پتی ہو، پیسے والا ہو، تب وہ بھی کسی کا محتاج ہے۔ تو محتاج کا محتاج بننے میں کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے محتاج بنو جو کبھی محتاج نہیں ہوگا۔ جو غنی ہے، سارا جہان جس کا محتاج ہے۔ جب ہم اس کے محتاج ہیں تو اس کے بندوں کا محتاج بننے کی کیا ضرورت ہے؟ اسی لیے اقبال رحمہ اللہ نے بھی بڑی اونچی بات کی تھی:

؎ جو اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک

اقبال بھی بڑا مردِ قلندر تھا، فقیر آدمی تھا، آخری زندگی میں اللہ نے اس سے بڑا کام لیا۔ وہ اللہ کے قرآن میں ڈوب جاتا تھا۔

......تم تو قرآن پڑھتے ہو تعویذ لکھنے کے لیے،

......تم تو اس وقت قرآن کا ختم کراتے ہو جب کوئی مقدمہ ہو جائے، تا کہ مصیبت سے بچیں،

......تم تو قرآن پڑھتے ہو جب تم پر کوئی بلا ٹوٹ پڑے،

......یا اس وقت قرآن پڑھتے ہو جب کوئی بوڑھا مرنے والا ہو، تا کہ یہ جلدی مرے اور ہماری جان چھوڑے۔

لیکن ان لوگوں نے زندگی کا درس حاصل کرنے اور پوری دنیا کو سبق پڑھانے کے لیے قرآن پڑھا تھا۔ وہ قرآن پڑھتے پڑھتے بے ہوش ہوجایا کرتے تھے، اور جب ان کو کچھ ہوش آتا تھا تو کچھ کہہ دیتے تھے۔ جو قرآن مقدس کی آیات کا اثر دماغ میں آتا تھا، اس کو پھر اشعار میں ڈھالتے تھے۔ چنانچہ اقبال نے بڑی خوب بات کی:

؎ جو اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو تیرے گدا ہیں دارا و جم

اگر تم اپنے مالک اور رازق کو نہ پہچانو تو بادشاہوں کے دروازے پر بھیک مانگتے رہو، دھکے کھاتے رہو، سرمایہ داروں کے دروازوں پر پڑے رہو اور امیر آدمیوں کے پیچھے بھاگتے رہو۔ ان سے کبھی چندہ، کبھی زکوٰۃ اور خیرات (جو اُن کے مال کا گند اور میل ہو) اس کو ہضم کرتے رہو۔ وہ تمہیں کوئی پاک صاف مال تھوڑا دیتے ہیں، وہ اپنا میل مولویوں کے منہ ڈالتے ہیں۔ زکوٰۃ کیا ہے؟ اور کیوں اللہ نے زکوٰۃ کے مال سے اپنے نبی کو محروم رکھا ہے؟ کیوں اللہ نے حکم دیا کہ آپ کے لیے زکوٰۃ حلال نہیں، آپ کی اولاد کے لیے بھی زکوٰۃ حلال نہیں۔ بہرحال سید کی اولاد کے لیے زکوٰۃ حلال نہیں، اس لیے کہ میرے نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہ تو مال کا میل ہے، اور اللہ اپنے بندوں کو اس میل سے محفوظ فرماتے ہیں۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۱۰۷۲، باب: تَرْكِ اسْتِعْمَالِ آلِ النَّبِيِّ عَلَى الصَّدَقَةِ]

''تواب'' اور ''اوّاب'' میں فرق:

ایک لفظ ''توب'' ہے اور ایک ''اوب'' ہوتا ہے۔ توبہ کا معنی ہوتا ہے: گناہ سے رجوع کرنا، معصیت سے رجوع کرنا۔ اور ''اوب'' کا معنی ہوتا ہے: غفلت سے ذکر کی طرف رجوع کرنا۔ جیسے اللہ نے اپنے نبی کے بارے میں فرمایا: ﴿نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝﴾ [ص: ۳۰] کہ میرا بندہ کتنا اچھا ہے وہ میری طرف لوٹنے والا ہے۔ یعنی غفلت سے ذکر اللہ کی طرف آنے کو ''اوب'' کہتے ہیں۔ اور توبہ کہتے ہیں: گناہ سے نیکی کی طرف لوٹ جانا۔ اور جب یہ کہا جاتا ہے: ''فَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ'' (اللہ نے توبہ قبول فرمالی) تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے جو انتقام کا ارادہ فرمایا تھا، اس سے رجوع فرمالیا۔ اللہ نے اپنے نافرمان کو سزا دینی تھی، لیکن اب اسے سزا کی بجائے معافی دے دی۔

''فَتَابَ عَلَيْهِ'' جب ان کلمات سے آدم علیہ السلام نے معافی مانگی تو اللہ نے ان کی توبہ کو قبول فرمالیا اور آگے توبہ قبول کرنے کی وجہ بھی بیان فرمائی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ﴾ وہ توبہ قبول کرنے والا ہے کہ جب بھی کوئی بندہ

گناہوں کے بعد توبہ کرتا ہے تو اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ اور آگے فرمایا: ﴿الرَّحِيمُ﴾ اللہ نے جو توبہ قبول فرمائی تو کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ کمزور ہے، کمزور ہونے کی وجہ سے معافی دے دی، ڈر کی وجہ سے معافی دے دی، ......نعوذ باللہ!...... کسی غرض کی وجہ سے معافی دے دی۔ نہیں! بلکہ وہ مہربان ہے، اس لیے معافی دے دی۔

سب سے پہلے گناہ کر کے توبہ کرنے والا:

اس آیت سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جس طرح سب سے پہلا گناہ کرنے والا آسمانوں میں جن ہے تو اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ سب سے پہلے توبہ کرنے والے حضرت آدم علیہ السلام ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے توبہ کی توفیق عطا فرمائی۔

خطاء آدم کے متعلق فرقہ ضالہ کے اعتراض کا جواب:

بعض فرق ضالہ اور مستشرقین اس قسم کے اعتراض اُٹھاتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام سے غلطی ہوئی تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے انہیں توبہ کی توفیق بھی دے دی اور معافی کے کلمات بھی سکھا دیئے، لیکن ابلیس کو نہ تو معافی کے الفاظ سکھائے اور نہ ہی توبہ کی توفیق دی۔ ایسا کیوں ہوا؟

اس سے پہلے یہ ذکر کیا گیا کہ ایک ہے اللہ کے اوامر کی نافرمانی اور ایک ہے ارتکابِ منہیات۔ جب اللہ نے حکم دیا کہ سجدہ کرو اور اس نے سجدہ نہ کیا تو اللہ نے بتلا دیا: ﴿أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ﴾ کہ اس نے تکبر کی وجہ سے انکار کیا۔ اور دوسری چیز ہے ارتکابِ نہی۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کام سے منع کیا اور بندہ خواہشات سے مغلوب ہو کر اس میں پڑ گیا۔ ایسی صورتحال میں نافرمانی کی وجہ تکبر نہیں ہوتا، بلکہ ایسا غلبۂ خواہش کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جیسے اللہ نے منع کیا کہ رمضان کے روزے میں پانی نہ پیو، لیکن اب غلبہ آ گیا تو وہ بے چارا پانی پی بیٹھا۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام سے ارتکابِ نہی ہوا ہے، اس لیے اللہ نے ان کو توبہ کی توفیق عطا فرما دی، جبکہ ابلیس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی، اور پھر نہ تو اس نے معافی مانگی اور نہ ہی اس کو معافی ملی۔

علماء کرام نے اس کا ایک دوسرا جواب یہ بھی دیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے ارتکابِ نہی ہو گیا تھا۔ وہ اس طور پر کہ ان کو درخت کے قریب نہ جانے کا حکم دیا گیا تھا، لیکن آپ اس درخت کا پھل چکھ بیٹھے۔ اس کے بعد ان پر ندامت طاری ہو گئی اور رونا شروع کر دیا کہ یا اللہ! مجھ سے غلطی ہو گئی، میں بھول گیا، میں شیطان کے دھوکہ میں

آ گیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمینوں میں اُتار دیا، آدم علیہ السلام پھر بھی روتے رہے، جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ تین سو سال تک روتے رہے۔

[احیاء العلوم: ۳/۴۴۲]

لیکن ابلیس لعین کو جب اللہ نے فرمایا: ﴿مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ۖ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ﴾ [الاعراف: ۱۲] کہ اے بد بخت! تُو نے سجدہ کیوں نہیں کیا جبکہ میں نے تمہیں حکم دیا؟ تو اس نے یہ نہیں کہا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، میں بھول گیا، مجھے معاف فرمادیں، میں دوبارہ سجدہ کر کے اپنی غلطی کا ازالہ کرتا ہوں۔ نہیں، بلکہ اس نے کہا: ﴿أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ﴾ میں تو اس سے بہتر ہوں۔ گویا کہ اس نے پھر بھی تکبر کیا۔ تو جو اللہ کا حکم بھی نہ مانے اور تکبر پر بھی اَڑا رہے تو اس کی سزا یہی تھی: ﴿وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ﴾ [ص: ۷۸] اللہ نے بھی حکم فرمادیا کہ نکل جاؤ اور قیامت تک تجھ پر لعنت ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اتنی بڑی سزا سننے کے بعد سجدے میں گر جاتا کہ مجھے لعنتی اور مرجوم ومردود بنا دیا گیا، میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے دور ہوگیا ہوں، اتنی بات کر کے وہ خدا کے دروازے پر گر جاتا۔ لیکن اس نے کہا: ﴿فَبِعِزَّتِكَ﴾ مجھے آپ کے جلال کی قسم! میں تیرے بندوں کو گمراہ کرتا رہوں گا۔ گویا اس نے باقاعدہ...... نعوذ باللہ!...... اللہ کے ساتھ مقابلہ والی کیفیت اختیار کر لی، مخلوق ہو کر خالق سے ٹکرانے کا منصوبہ بنالیا۔

جنت سے نکالے جانے کی حکمت:

آدم علیہ السلام کی خطا کی وجہ سے اگرچہ ہمیں جنت سے نکال دیا گیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اتنی بڑی نعمت ملی کہ ہم دنیا کو آباد کرنے کا ذریعہ بن گئے۔ چنانچہ آپ نے حدیث مبارک میں پڑھا ہے کہ میرے آقا سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((خَيْرُ يَوْمٍ طَلَعَتْ فِيهِ الشَّمْسُ يَوْمُ الْجُمُعَةِ، فِيهِ خُلِقَ آدَمُ، وَ فِيهِ أُدْخِلَ الْجَنَّةَ، وَ فِيهِ أُخْرِجَ مِنْهَا.)) [صحیح مسلم، حدیث: ۸۵۴، باب: فضل یوم الجمعۃ]

''سب سے بہتر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے وہ جمعہ کا ہے، کیونکہ آدم علیہ السلام اسی جمعہ کے دن پیدا کیے گئے اور اسی جمعہ کے دن ان کو جنت میں داخل کیا گیا اور اسی جمعہ کے دن ان کو جنت سے نکالا گیا۔''

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے آدم علیہ السلام کے جنت سے نکالے جانے کو بڑی عزت میں شمار فرمایا کہ جہاں جمعہ کی شان

کی عظمت بیان فرمائی کہ جمعہ اتنا عظیم الشان دن ہے کہ آدم علیہ السلام پیدا بھی جمعہ کے دن ہوئے، جنت میں بھی جمعہ کو گئے اور جنت سے نکالے بھی جمعہ کے دن گئے، کیونکہ ان کے جنت سے باہر آنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی کروڑوں حکمتیں تھیں۔

توبہ کردن دَر جوانی شیوۂ پیغمبری:

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے گناہ گار بندے کی توبہ سے خوش ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اے میرے ملائکہ! میرے اس گناہ گار بندے کو بھی پتہ چل گیا ہے کہ میرا بھی کوئی رب ہے جو میری غلطیاں معاف کرے گا، اسی لیے تو میرے دروازے پر رو رہا ہے، اسی لیے تو میرے دروازے پر گڑگڑا رہا ہے اور معافیاں مانگ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کہ تم بھی گواہ ہو جاؤ کہ میں نے اپنے اس بندے کے گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔ [مسند احمد، حدیث: ۷۹۴۸]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ بہت بڑی بات ہے۔ جیسا کہ ایک بزرگ شاعر نے بھی کہا:

ع توبہ کردن دَر جوانی شیوۂ پیغمبری

جوانی میں توبہ کرنا پیغمبروں کا شیوہ رہا ہے۔ اس لیے تم بھی جوانی میں توبہ کرو اور صحت کی حالت میں توبہ کرو۔

پانچ سے پہلے:

حضور ﷺ نے فرمایا کہ پانچ چیزوں کا خیال رکھا کرو:

1 ......تم اپنی جوانی میں کوئی عبادت کا کام کرلو بڑھاپے سے پہلے۔

2 ......صحت ہے تو بیماری سے پہلے کوئی کام کرلو۔

3 ......تمہیں اللہ تعالیٰ نے غنیٰ دیا ہے تو فقر سے پہلے پہلے تم اپنا کوئی کام کر جاؤ۔

4 ......فراغت ہے تو مشغولیت سے پہلے پہلے کام کرلو۔

5 ......زندگی ہے تو موت سے پہلے موت کے بعد کے لیے کوئی کام کر جاؤ۔

اگر تم ایسی تیاری کرلو گے تو پھر اللہ تعالیٰ تمہیں کبھی ذلیل و رسوا نہیں کریں گے۔

[مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۵۱۷۴، کِتَابُ الرِّقَاقِ، اَلْفَصْلُ الثَّانِي]

حضرت آدم علیہ السلام کے کلماتِ توبہ کیا تھے؟

حضرت مجاہد، حضرت سعید بن جبیر، حضرت ابو العالیہ، حضرت ربیع بن انس، حضرت حسن، حضرت قتادہ، حضرت محمد بن کعب القرظی، حضرت خالد بن معدان، حضرت عطاء الخراسانی، حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہم اللہ، یہ سب حضرات فرماتے ہیں کہ توبہ کے یہی کلمات تھے: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [الاعراف: ۲۳]

اسی لیے علماء نے فرمایا ہے کہ جب آدمی اللہ سے معافی مانگے تو پہلے اپنی غلطی کا اعتراف کرے، جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اعتراف کیا اور پھر اللہ کی ان صفات سے اللہ کے آگے درخواست پیش کرے جن صفتوں کے اندر رحمت اور اللہ تعالیٰ کے کرم کا تذکرہ ہے۔

بنو تمیم قبیلہ کے ایک آدمی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا کہ ہمیں بتلائیں کہ وہ کون سے کلمات تھے جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سکھلائے؟ انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو حج کرنے کا طریقہ سکھلایا، کیونکہ انسانوں میں سب سے پہلے حج کرنے والے حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اس لیے کہ اور تو کوئی بندہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اگر یہ قول بھی لے لیا جائے تو ٹھیک ہے (کہ جب آدم علیہ السلام حج کریں گے تو حج سے سب گناہ مٹ جائیں گے)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ نہیں فرمایا کہ صرف یہی کلمات سکھلائے، بلکہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو حج کا طریقہ بتلایا۔

حدیث مبارک میں آتا ہے: ''مَنْ حَجَّ فَلَمْ يَرْفُثْ وَ لَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَهَيْئَتِهٖ يَوْمَ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ''
[مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۷۱۳۶]

ایک روایت میں آتا ہے کہ آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی: اے پروردگارِ عالم! اے ارحم الراحمین! میں نے تو غلطی کی ہے، مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے، کیا یہ میرے پیدا ہونے سے پہلے لکھی ہوئی تھی یا نہیں؟ اللہ نے فرمایا: ہاں! لکھی ہوئی تھی۔ عرض کیا: اگر پہلے سے لکھی ہوئی تھی تو معافی بھی عطا فرما دیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت یہ بھی نقل کی گئی ہے کہ آدم علیہ السلام نے کہا کہ اے رب کریم! کیا تُو نے

مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں فرمایا؟ اللہ نے فرمایا: ہاں۔ عرض کیا: کیا آپ نے مجھ میں اپنی رُوح مبارک نہیں پھونکی؟ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۱، البقرۃ: الآیۃ: ۳۷]

کیا آدم علیہ السلام کی بشریت میں خدا کی روح تھی؟

اس معاملے میں بہت لوگ مغالطے میں پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ دیکھو! اللہ نے آدم علیہ السلام میں اپنی روح پھونکی۔ اب لباس تو بشر کا ہے، لیکن اس کے اندر روح تو خدا کی ہے، اندر تو خدا ہے۔ اسی مصیبت میں تو پہلے لوگ گمراہ ہوئے ہیں...... اللہ معاف فرمائے!...... اسی لیے عیسائی گمراہ ہوئے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا لقب آ گیا روح اللہ، کلمۃ اللہ۔ ایسے لقب جب آئے تو عیسائی گمراہ ہو گئے۔ اسی طرح ہمارے بعض جاہل صوفی...... جنہوں نے سبز کپڑے پہن لیے، تسبیح ہاتھ میں پکڑ لی...... کہتے ہیں کہ دیکھو! اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، پھر اللہ نے ان میں اپنی روح پھونکی۔ اور اصل تو روح ہوتی ہے، جسد تو کوئی چیز نہیں ہے۔ تو جب آدم علیہ السلام کے اندر روح چلی گئی تو اصل میں آپ ہوئے باہر سے تو آدم ہے اور جناب غلطی بھی آپ کرتا ہے اور پکڑتا بھی آپ ہے، حالانکہ خود ہی تو وہ درخت کھایا تھا...... معاذ اللہ!......

ان بدبختوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اللہ تو کھانے سے پاک ہے، اور اگر اندر خدا ہے اور باہر آدم کا لباس ہے تو آدم علیہ السلام کے کپڑے کیوں اُتر گئے؟ کیا خدا ننگا ہو گیا؟...... نعوذ باللہ!...... جاہل لوگ ہیں، گمراہی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اب اللہ نے فرمایا کہ یہ میرا گھر ہے تو کیا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں رہتے ہیں؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صالح (علیہ السلام) کی اونٹنی میری ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ باقی تمہاری ہیں؟ یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ایک چیز کو اپنی ذات کے ساتھ نسبت دے کر کہہ دیا کہ میں نے اپنی روح اس میں پھونکی، ورنہ باقی سب کو بھی تو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ آدم علیہ السلام میں جو روح پھونکی گئی تو وہ اللہ کی روح ہے یا تمہاری ہے؟ ...... نعوذ باللہ...... اب آدم علیہ السلام خدا بن گئے؟ یا جیسے حلولیہ فرقہ ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ حلول کر گیا (کسی دوسرے کے جسم میں آ گیا)۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!!!! اسی طرح امامیہ کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں حلول کر گئے کہ پہلے تو علی تھا، پھر اللہ بھی اندر آ گیا تو مولا بن گیا۔ اسی لیے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ''مولا علی'' کہتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ ایک دوسرے کو ملیں گے تو السلام علیکم ورحمۃ اللہ نہیں کہیں گے، بلکہ ایک کہے گا: ''یا علی مدد'' اور دوسرا کہے گا: ''مولا علی مدد'' ان کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مقامِ اُلوہیت اور مقامِ ربوبیت پر پہنچ گئے تھے۔ انا للہ وانا الیہ

راجعون!!!

یہ تمام عقائد قرآن و سنت کے خلاف ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات، اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان، اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظمت، اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفاتِ کمال، اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفاتِ جلال، اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات شان کا جو مقام اور مرتبہ ہے کسی بندے یا کسی مخلوق میں کہاں اتنی طاقت ہے کہ اس تک پہنچ سکے؟

اس لیے ہمیشہ یاد رکھا کریں کہ ایسے الفاظ سے یہ جاہل لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ دیکھو! اللہ نے اپنی روح پھونک دی۔ تمام روحیں اللہ نے پیدا کی ہیں اور پھر روح ایسی چیز ہے کہ جس پر فنا کبھی نہیں آئے گی۔ ہر چیز پر فنا آئے گی لیکن روح باقی رہے گی، اسی طرح عرش باقی ہوگا، جنت باقی ہوگی، غلمان جنت باقی ہوں گے اور اللہ تعالیٰ نے جہنم پیدا کی، وہ باقی ہوگی۔

کلماتِ توبہ کے متعلق روایات کا خلاصہ:

حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا: یا اللہ! آپ ہی نے تو مجھے پیدا فرمایا، آپ ہی نے تو میرے اندر روح پھونکی، آپ ہی نے تو مجھے اتنی بڑی عظمت بخشی اور میرے پیدا ہونے سے پہلے آپ کے علم میں یہ چیزیں لکھی ہوئی تھیں کہ ایسا میرے بندے سے ہوگا یہ اعتراف ہوتا ہے کہ یہ چیز آپ کے علم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں۔ آدم علیہ السلام نے عرض کیا: اے اللہ! اگر میں توبہ کروں، رجوع کروں تو کیا پھر مجھے جنت میں لوٹایا جائے گا یا نہیں؟ اللہ نے فرمایا: ہاں! لوٹایا جائے گا، جب تم توبہ کرو گے تو ہم بھی معافی عطا کر دیں گے۔

اس لیے بعض لوگوں نے کہا کہ یہ کلمات تھے۔ بہر حال ان میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لیے کہ آدم علیہ السلام اتنا عرصہ جو معافی مانگتے رہے تو یہ ساری باتیں کی ہوں گی۔ ان سب کا جو اہم خلاصہ ہے، وہ الفاظ مبارک یہ تھے:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ [الاعراف: ۲۳]

ابن ابی حاتم نے بھی ایک حدیث نقل کی ہے، وہ بھی اسی سے ملتی جلتی ہے۔ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب کریم! میں اگر رجوع کروں، توبہ کروں تو کیا اپنے گھر جنت میں مجھے دوبارہ بھیجیں گے؟ اللہ نے فرمایا: ہاں۔ یہی وہ کلمات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سکھلائے۔ لیکن اس روایت کے اندر انقطاع ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے یہ قول نقل فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جو کلمات سکھائے اور پھر آدم علیہ السلام

نے ان کلمات سے معافی مانگی، وہ یہ ہیں:

''اَللّٰهُمَّ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي، فَاغْفِرْ لِي فَإِنَّكَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ، اَللّٰهُمَّ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي، فَارْحَمْنِيْ إِنَّكَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ، اَللّٰهُمَّ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي، فَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ.''

[کنز العمال: ۵۰۵۶، تفسیر قرطبی: ۱۶،۴۰/۳/ ۶۸]

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾ [البقرۃ: ۳۹،۳۸]

ہم نے حکم دیا تم سب یہاں سے نیچے جاؤ، پھر اگر تمہیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو میری ہدایت پر چلا تو نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو لوگ کافر ہوئے اور ہماری کتابوں کو جھٹلایا تو وہ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم اُترو۔ علماء نے فرمایا کہ ﴿اهْبِطُوْا﴾ جمع کا صیغہ اس لیے استعمال کہ آدم علیہ السلام کی پشت کے اندر ساری مخلوق تو موجود تھی۔

﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى﴾ اللہ پاک خبر دیتے ہیں کہ جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو اُتارا اور آدم علیہ السلام کی بیوی کو بھی اُتارا گیا، اسی طرح ابلیس کو بھی جنت سے نکالا گیا۔ اس آیت کے اندر بظاہر آپ کو خطاب ہے، لیکن اشارہ آپ کی اولاد کو تھا کہ جب میں تمہارے لیے کتابیں، رسول اور نبی بھیجوں گا، وہ میری کتابیں لے کر آئیں گے تو تم ان کی اتباع اور پیروی کرنا، اس لیے کہ انبیاء اور رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح بیان اور ہدایت لے کر آئیں گے۔

﴿هُدًى﴾ سے مراد ایک قول یہ بھی ہے کہ جب تمہارے پاس میرے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئیں تو جو اُن کی اتباع کرے گا، اس پر کوئی ڈر بھی نہیں ہوگا اور اس پر کوئی غم بھی نہیں ہوگا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے ''قرآن'' مراد ہے۔ دونوں قول ٹھیک ہیں، قرآن پاک بھی ہدایت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہدایت ہیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابوالعالیہ کا قول زیادہ عام ہے۔ اللہ نے فرمایا: جو میں نے کتابیں اُتاریں اور جو میں نے رسول بھیجے۔ اس کے اندر ساری کتابیں بھی آگئیں، سارے رسل بھی آگئے، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی آگئے، قرآن بھی آگیا۔

﴿فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [البقرۃ:۳۸] ان پر مستقبل میں ڈر نہیں ہوگا، یعنی آخرت میں ان کو کوئی ڈر نہیں ہوگا۔ اللہ ان کے لیے آسانیاں فرما دیں ﴿وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ اور نہ ان کو ان چیزوں پر غم ہوگا جو دنیا میں گزر چکی ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/ ۸۲، البقرۃ: الآیۃ:۳۸]

مؤمن جہنمیوں کے لیے شفاعت:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث مبارک ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کافر اور مشرک کہ جن کا کفر و شرک پر خاتمہ ہوا ہے، وہ تو ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، ان پر نہ موت آئے گی اور نہ وہ زندہ ہوں گے۔ ہاں البتہ بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو ایمان دار ہوں گے، لیکن گناہوں کی وجہ سے جہنم میں ہوں گے، سزا کے طور پر ان پر موت آئے گی، ان کو جہنم کی آگ جلا کر کوئلہ کر دے گی اور اللہ مجھے اجازت دیں گے، میں ان کی شفاعت کروں گا، وہ بخشے جائیں گے۔ [صحیح مسلم، حدیث:۳۰۶، بَابُ: إِثْبَاتِ الشَّفَاعَةِ...]

''اهْبِطُوْا'' مکرر لانے کی وجہ:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب ﴿اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ میں ﴿اهْبِطُوْا﴾ کا لفظ ایک مرتبہ آگیا تو ﴿اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا﴾ میں اسے دوبارہ کیوں لایا گیا؟ اس کے جواب میں بعض علماء نے فرمایا کہ اصل وجہ یہ ہے کہ اُس ﴿اهْبِطُوْا﴾ کا حکم الگ تھا اور اِس ﴿اهْبِطُوْا﴾ کا حکم الگ ہے۔ جب حکم کے اندر مغایرت آگئی تو تکرار نہ رہا۔

بعض علماء نے کہا کہ پہلے حکم ہوا تو آسمانِ دنیا پر آگئے، اور جب دوبارہ حکم ہوا تو آسمانِ دنیا سے بھی اُتر کر زمین پر آگئے۔

بعض نے کہا کہ تاکید کے لیے ہے۔ جیسے کوئی آدمی دوست سے کہتا ہے: ''قُمْ قُمْ'' حالانکہ ایک دفعہ ''قُمْ'' کہنا کافی ہوتا ہے، لیکن وہ تاکید کے لیے دو بار کہہ دیتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی تاکید کے لیے دوسری بار حکم دیا گیا۔

مفسر فرماتے ہیں کہ پہلا قول صحیح ہے، کیونکہ اگر آسمانِ دنیا مراد ہو اور دوسرا حکم زمین کے لیے مراد ہو تو پھر بھی

اشکال ہوگا، کیونکہ پہلے حکم کے اندر بھی تو زمین کا تذکرہ موجود ہے، ﴿وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ﴾۔ اس لیے اصل بات یہ ہے کہ اس حکم کا تعلق الگ تھا اور اس حکم کا تعلق الگ ہے۔ یہاں یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ ﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ﴾ اور وہاں یہ بتلایا جا رہا تھا کہ تم نے زمین میں رہنا ہے اور اس میں قرار پکڑنا ہے اور مدتِ معلومہ تک رہنا ہے۔ اور جب دونوں احکام کے درمیان تغایر ہے تو قرآن میں کوئی تکرار نہ ہوا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۲، البقرة: الآیۃ: ۳۸]

﴿يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ۝ وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ ۝﴾ [البقرة: ۴۰، ۴۱]

اے بنی اسرائیل! میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیے تھے اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرو۔ اور اس کتاب کو مان لو جو میں نے اُتاری ہے (اور) اس کتاب کو سچ بتانے والی ہے جو تمہارے پاس ہے اور تم سب سے اوّل اس کے منکر نہ بنو اور میری آیات پر تھوڑا سا مول نہ لو اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتوں کا ذکر فرما رہے ہیں۔

سورۃ بقرۃ مدینہ میں سب سے پہلی نازل ہونے والی سورت:

نبی کریم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو اہل کتاب میں سے یہود کے بڑے قبائل بنو قریظہ اور بنو نضیر آباد تھے اور یہ بنی اسرائیل میں سے تھے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی خاص نعمتوں کا ذکر کیا ہے اور ان کو خطاب کیا ہے۔

ہجرت سے پہلے جو سورتیں اُتری ہیں وہ سورتیں ''مکی'' کہلاتی ہیں۔ اور جو حضور پاک ﷺ پر ہجرت کے بعد سورتیں اُتاری گئیں وہ ''مدنی'' کہلاتی ہیں۔[1] تو مدینہ منورہ میں جانے کے بعد جو پہلی سورت نازل ہوئی ہے ''

[1] الدر المنثور للسیوطی: ۶/ ۴۴۵، علوم القرآن، ص: ۶۰]

سورۃ البقرۃ ہے، یہ سورت مکہ سے ہجرت کے بعد نازل ہوئی۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۵، ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِ السَّبْعِ الطُّوَلِ]

بنوقریظہ، بنونضیر اور یہودیوں کا تعارف:

میرے آقا خاتم الانبیاء حبیب کبریاء ﷺ جب مدینہ منورہ میں پہنچے تو وہاں یہود بڑے آباد تھے، بنوقریظہ تھے، بنونضیر تھے بنی قینقاع تھے۔ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ وہ تعداد کے اعتبار سے اتنے زیادہ نہیں تھے، ان کا عدد بڑا محدود تھا۔ اصل میں جو مدینہ منورہ کے بڑے قبائل تھے: اوس اور خزرج، وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے، یہود بہت تھوڑے تھے، لیکن ان کو باقی قبائل پر علمی تفوق تھا، یعنی باقی قبائل کو لوگ اُمی سمجھتے تھے، کہتے تھے کہ یہ جاہل اور اَن پڑھ لوگ ہیں، لیکن یہود کے بارے میں ہر آدمی کے دماغ میں یہ بات تھی کہ یہ اہل کتاب ہیں اور یہ اہل علم ہیں، ان کے پاس اُحبار (بڑے علماء) ہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر آپ ابتداء سے ان کی نسل پر بھی غور کریں تو یہ بنیادی طور پر دولت پرست لوگ ہیں، یعنی بنیادی طور پر انہوں نے مادہ پرستی کا سبق سیکھا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ مال اور دولت پر ہمارا کنٹرول رہے۔ چونکہ یہ بڑی مکار و عیار قوم ہے اور بڑی متعصب قوم ہے۔ ان کے اندر اتنا تعصب ہے کہ اگر ان کا کوئی یہودی رشیہ میں بھی ہو تو اس کو یہ اپنے پاس بلائیں گے، وہ اگر دنیا کے کسی ملک میں بھی ہو تو اس کو بلائیں گے۔ لیکن اگر کوئی آدمی ان کی قوم بنی اسرائیل سے تعلق نہیں رکھتا، وہ چاہے یہودی بھی بن جائے تو اسے یہ یہودی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اگرچہ اسے اپنے قبائل اور مذہب میں شامل کرلیں گے، لیکن اسے دوسرے نمبر کا شہری سمجھیں گے۔ اسے ویسے حقوق دینے پر یہ تیار نہیں ہوں گے جیسے حقوق اپنی نسل کو دیتے ہیں۔

اس قوم میں نسل پرستی، قوم پرستی کا مرض بہت زیادہ ہے۔ ان کے بڑے عجیب مکر و خداع ہیں۔ ان پر سے تاریخ آہستہ آہستہ پردہ اُٹھا رہی ہے اور آہستہ آہستہ پردہ اُٹھتا چلا جائے گا اور ایک وقت آجائے گا جب یہود اپنی ذلت کی انتہاء کو پہنچ جائیں گے۔ تمام دنیا کا یہ اصول ہے کہ ہر چیز کے پکنے کے بعد کٹنے کا وقت بھی آتا ہے۔ دنیا کے اندر جتنی فصلات ہیں آپ نے دیکھا ہوگا کہ گندم کاشت کرتے ہیں، جب وہ پک جاتی ہے تو اسے کاٹا جاتا ہے، اسی طرح یہ نظامِ عالَم ہے کہ جب دن چڑھتا ہے تو دن ڈھلتا بھی ہے۔ جب رات جوش کر کے آتی ہے تو وہ جاتی بھی ہے۔ یہ ایک نظامِ عالَم ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت چیلنج نہیں کرسکتی۔ جس طرح ایک بچہ پیدا ہوتا ہے، بڑا ہوتا ہے، جوانی کی عمر کو پہنچتا ہے تو اسی طرح اس نے بڑھاپے میں بھی قدم رکھنا ہے۔ یہود اپنی مادہ پرستی اور اقتصادی قوت

کے پیش نظر عروج کی انتہاء پر پہنچ گئے ہیں تو ان کی ذلت کے دن بھی قریب آنے والے ہیں اور ان کو پتہ ہے کہ ہماری ذلت عالم اسلام کے ہاتھوں سے ہوگی۔ چنانچہ آپ پوری دنیا پر نظر ڈالیں تو یہودی ہر جگہ آپ کو اسلام کے خلاف زہر پھیلاتا ہوا نظر آئے گا۔

جہاں جتنا مسلمان دین پر زیادہ پختہ ہے، وہ ان کا اتنا بڑا دشمن ہے اور جہاں جہاں مسلمان صرف نام کا مسلمان ہے وہ اس سے گزارا کر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک لیبل ہے، جیسے ہم پر یہودیت کا لیبل ہے، نصرانیوں پر نصاریٰ کا لیبل ہے، ان پر بھی مسلمان ہونے کا ایک لیبل ہے، ورنہ عمل کے اعتبار سے ہمارے اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ خنزیر وہ بھی کھاتے ہیں اور خنزیر یہ بھی کھاتے ہیں، شراب وہ بھی پیتے ہیں اور شراب یہ بھی پیتے ہیں، جیسے وہ کلبوں میں جاتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی ان کلبوں میں جاتے ہیں، جیسے ان کے ہاں مختلف قسم کی پارٹیاں اور مختلف قسم کے کردار ہوتے ہیں وہ مسلمانوں کے اندر بھی ہوتے ہیں۔ جو مسلمان دین پر پختہ ہو، جو مسلمان اپنے مذہب و ایمان اور اعمالِ صالحہ پر پختہ ہو، وہ ان کا دشمن ہے وہ چاہے دنیا کے کسی کونے میں بھی رہتا ہو۔

بہر حال ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے براہِ راست بنی اسرائیل کو خطاب کیا ہے۔ چونکہ حضور ﷺ کے مدینہ منورہ جانے کے بعد سب سے پہلے مخاطب پڑھے لکھے بنی اسرائیل تھے۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں جیسے یہود کے قبائل موجود تھے، ایسے ہی نصاریٰ بھی موجود تھے جو اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے، لیکن یہ لوگ مدینہ منورہ میں آباد نہیں تھے، بلکہ تقریباً شام اور نجران میں تھے، کچھ جانب یمن میں آباد تھے اور زیادہ تر شام کی طرف آباد تھے۔ ان کے وفود آتے رہے، حضور ﷺ سے باتیں بھی ہوتی رہیں، حضور ﷺ سے مکالمات بھی ہوتے رہے، حضور ﷺ سے وہ دین کی باتیں بھی سمجھتے رہے اور ان کے بڑے لوگ اسلام بھی لاتے رہے۔

لیکن مدینہ منورہ میں جو آباد تھے وہ بنی اسرائیل تھے، یہود تھے اور ان کی جگہیں قلعہ نما تھیں، اسی وجہ سے مدینہ پر بھی ان کا کنٹرول تھا۔ جیسا کہ آج کل انہوں نے گریٹر اسرائیل کے نقشہ میں دکھلایا ہوا ہے کہ مدینہ منورہ بھی ہمارا ہے، خیبر، تبوک، فلاں فلاں علاقے بھی ہمارے ہیں۔ دراصل یہ غداری ہے، ورنہ ان کی ان علاقوں میں کوئی حکومت یا سلطنت نہیں تھی، بلکہ یہ تو اپنے علاقوں سے، بیت المقدس سے نکل کر مدینہ منورہ اس لیے آئے تھے کہ انہوں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ ایک آخری نبی پیدا ہوگا جس کا نام محمد رسول اللہ ﷺ ہوگا۔ انہوں نے تورات میں

باقاعدہ پڑھا تھا کہ حضور پاک ﷺ کی پیدائش مکہ میں ہوگی اور حضور پاک ﷺ کی ہجرت یثرب، مدینہ پاک کی طرف ہوگی۔' اور انہوں نے یہ بھی پڑھا ہوا تھا کہ حضور ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان کا فاصلہ زیادہ ہوگا بہ نسبت ایک عام آدمی کے۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۳۶۳۵، باب: مَا جَاءَ فِي صِفَةِ النَّبِيِّ ﷺ]

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ حضور ﷺ کا سینہ مبارک چوڑا تھا، یہ بات نہیں ہے، یہ بھی علاماتِ نبوت میں سے ہے۔ سینے کا چوڑا ہونا مرد کی ایک بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے، حسن سمجھا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو عرب کہہ دیتے: ''وسع صدرہ'' (آپ ﷺ کا سینہ مبارک چوڑا تھا)، لیکن جن صحابہ نے بھی ذکر کیا ہے اور تورات میں بھی علامات کے اندر ذکر آیا ہے، وہاں سینہ کے چوڑا ہونے کا تذکرہ نہیں، بلکہ یہ آتا ہے کہ دو کندھوں کے درمیان میں فاصلہ زیادہ تھا۔ یہ خواص نبوت کی علامت تھی، جیسا کہ مہرِ نبوت تھی۔

اسی طرح حضور ﷺ کا چلنے کا تذکرہ تھا کہ جب آپ زمین پر چلتے تھے تو ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اوپر سے نیچے کی طرف آ رہے ہوں، حالانکہ زمین بالکل سیدھی ہوتی تھی۔

[سنن الترمذي، حديث: ۳۶۳۷]

حضور ﷺ کا قد مبارک بہت زیادہ لمبا نہیں تھا اور نہ ہی بہت چھوٹا تھا، بلکہ آپ ﷺ کا قد مبارک بڑے جمال پر یعنی عین اعتدال پر تھا۔ البتہ یہ بات بھی معجزات اور خصائصِ نبوت میں سے تھی کہ جب آپ ﷺ صحابہ کے درمیان کھڑے ہوتے تو ان سے اونچے نظر آتے تھے۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۳۶۳۸]

یہ شانِ نبوت تھی جس کا ذکر انہوں نے باقاعدہ تورات میں پڑھا تھا، انہوں نے آپ کے صحابہ کا ذکر بھی تورات میں پڑھا تھا، انہوں نے آپ کی اُمت کا ذکر بھی تورات میں پڑھا تھا اور یہ لوگ مدینہ منورہ میں اس انتظار میں آئے تھے کہ جب اللہ کے نبی آئیں گے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے۔ مدینہ منورہ ان کا اپنا ملک تو نہیں تھا کہ یہ کہیں کہ ہمیں یہاں سے کیوں نکالا گیا تھا؟ یہ تو اپنے ملک سے چل کر یہاں آئے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ حضور پاک ﷺ پر ایمان لے آئیں۔ لیکن جب حضور پاک ﷺ کی پیدائش ہوئی تو یہ دشمن بن گئے۔ کہنے لگے کہ نبوت تو ہمارے خاندان سے نکل گئی، بنو اسرائیل کی بجائے بنو اسماعیل میں چلی گئی ہے، اب تو ہمارا نام ونشان مٹ جائے گا۔ وہ اس حسد اور بغض میں مبتلا ہو گئے، عناد میں آ گئے۔ اس لیے انہوں نے حضور پاک ﷺ کا کلمہ نہیں

' [مشكاة المصابيح، حديث: ۵۷۷۱، باب: فضائل سيد المرسلين صلوات الله وسلامه عليه، الفصل الثاني]

پڑھا، بلکہ حضور پاک ﷺ اور اسلام کو نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی، سازشیں کیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں بھی رُسوا کیا اور آخرت میں بھی رُسوا ہوں گے۔

اور بہت جلد وہ وقت آئے گا جس کے بارے میں میرے آقا ﷺ نے خوشخبری دی ہے اور آپ ﷺ نے پیشین گوئی دی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ جتنی طاقت اور قوت کو چلے جائیں، لیکن ایک وقت آئے گا کہ ان کو دنیا میں کہیں پناہ نہیں ملے گی، بلکہ یہ اگر کسی درخت یا پتھر کے پیچھے بھی چھپیں گے تو وہ درخت اور پتھر بھی پکار پکار کر کہے گا: ''يَا عَبْدَ اللهِ! يَا مُسْلِمُ! هٰذَا يَهُوْدِيٌّ فَاقْتُلْهُ'' (اے مسلمان! ادھر آؤ میرے پیچھے ایک بدبخت یہودی چھپا ہوا ہے اس کو مار ڈالو)۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک درخت ہے ''الغرقد''، اس کو ''شجرۃ الیہود'' کہا جاتا ہے، وہ ان کے بارے میں نہیں بتلائے گا۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۹۲۲، باب: لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَعْبُدَ...]

معلوم یہ ہوتا ہے کہ اب نقشہ جو بن رہا ہے، خدا کی قدرت ہے کہ تمام دنیا سے یہودیوں کو بلا کر ایک جگہ آباد کیا جا رہا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی پر موت آنے لگتی ہے تو اپنے ٹھکانہ پر اللہ اس کو پہنچا دیتے ہیں۔

اس میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمتیں ہیں، جنہیں بڑی گہری نظر سے اسلام والے لوگ جانتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ آخر کوئی وجہ ہے کہ یہ کبھی جرمنی میں آباد رہے، کبھی یہ رشیا میں آباد رہے، کبھی یہ دنیا کے مختلف ملکوں میں بکھرے ہوئے تھے، لیکن اب یہ سمٹ سمٹ کر ایک مقام پر پہنچ رہے ہیں اور وہ مقام بالکل عین اس جگہ کے قریب ہے کہ جہاں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اُتریں گے تو عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے اُترنے کے بعد ہی ان پر تباہی کا دور آئے گا۔

یہودیوں کو ''بنی اسرائیل'' کہنے کی وجہ:

حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ''اسرائیل'' تھا، یہ ''اسرا'' اور ''ایل'' سے مرکب ہے۔ ''اسرا'' کا معنی ''عبد'' ہوتا ہے اور ''ایل'' کا معنی ہے ''اللہ''۔ تو ''اسرائیل'' کا معنی ''عبد اللہ'' ہے۔

اور بعض نے کہا کہ ''اسرا'' کا معنی ہے: ''پسندیدہ، چنا ہوا'' اور ''ایل'' کا معنی ''اللہ'' ہوتا ہے تو ''اسرائیل'' کا معنی ''صفوۃ اللہ'' ہوگا۔ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل ہے تو حضرت یعقوب علیہ السلام سے لے کر میرے حضور ﷺ تک اتنی بڑی مدت میں اللہ نے چار ہزار نبی بھیجے ہیں اور یہ سارے بنی اسرائیل میں آئے، اس لیے اللہ نے قرآن میں فرمایا: ﴿وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۴۷] لیکن بنو اسماعیل میں ایک نبی بھیجے جو ان تمام سے زیادہ افضل اور شان والے تھے۔

اس لیے اب خاص طور پر یہاں بنی اسرائیل کو خطاب ہے، اس کو ''تذکیر بنعم اللہ'' کہتے ہیں۔ پہلے ''تذکیر بنعم عامۃ'' تھا، ﴿الَّذِیْ خَلَقَكُمْ﴾، ﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا﴾ وہ خطاب عام تھا، اور یہ ''تذکیر بنعم خاصۃ علی بنی اسرائیل'' ہے، اس لیے خطاب آیا: ﴿یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ﴾ [البقرۃ:۴۰]

اور اسی خطاب میں بھی ایک حکمت ہے کہ جہاں جہاں بھی ذکر آتا ہے وہاں ''بنی اسرائیل'' آیا ہے حالانکہ یہ تو حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے، اللہ نے ''یا بنی یعقوب'' نہیں فرمایا، یہ خطاب بھی دراصل اللہ کے لطف و کرم اور اس کی مہربانیوں کا ایک شاہکار ہے، کیونکہ جب کسی کو خطاب لقب سے کیا جائے تو یہ بڑے پیار کی علامت ہوتی ہے۔ جیسے محاورات میں کہا جاتا ہے: ''یَا ابْنَ الْكَرِیْمِ! اِفْعَلْ كَذَا'' (اے سخی کے بیٹے! تم بھی سخاوت کرو)۔
[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۲، البقرۃ: الآیۃ: ۸۲]

﴿یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ۝﴾
[البقرۃ:۴۰] خاص نعمت جو اللہ نے بنی اسرائیل پر فرمائی، ان میں سب سے بڑی نعمت یہ تھی۔

ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان میں چار ہزار نبی بھیجے اور ان پر اپنی کتابیں بھیجیں۔

اور تیسری نعمت یہ تھی کہ اللہ نے ان کو باقاعدہ بادشاہتیں بھی عطا کیں۔

اور پھر اللہ نے ان کو بیت المقدس میں رہنے کی سعادت بھی بخشی۔

اللہ نے فرمایا: میری تمام نعمتوں کو یاد کرو کہ میں نے تمہیں فرعون سے چھڑایا۔

اور تمہارے دشمن کو تمہارے سامنے غرق کر کے عذاب میں ڈالا۔

میں نے تم پر من وسلویٰ اُتارا۔

﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ علماء نے لکھا ہے کہ اس عہد سے وہ مراد ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا﴾ [المائدۃ:۱۲] کہ ہم نے تمہارے پاس رسول بھیجے اور تمہارے اندر بارہ نقباء بنائے اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر تم نے نمازوں کو قائم کیا اور زکوٰۃ ادا کی اور میرے بھیجے ہوئے رسولوں پر ایمان لے آئے تو پھر میں تمہارے گناہوں کو بدل ڈالوں گا اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کروں گا کہ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ تم اس وعدے کو یاد کرو اور اپنے اس عہد پر

قائم رہو۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ اس عہد سے مراد یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام انبیاء سے عہد لیا اور حکم دیا تھا کہ تم اپنی امت کو بتاؤ کہ ایک آخری نبی محمد رسول اللہ ﷺ پیدا ہوں گے، اور جب میرے اس نبی کا زمانہ آئے تو تم پر لازم ہوگا کہ ان پر ایمان لاؤ اور ان کی اعانت کرو۔ نیز ان کی کتب میں نبی کریم ﷺ کی تمام صفات ذکر کر دی گئی تھیں۔ تو اب اللہ نے فرمایا کہ یاد کرو کہ میں نے جب یہ ساری نعمتیں تم پر کیں اور تم سے وعدہ بھی لے لیا تو اب تم کیا کر رہے ہو؟ تم نے اس وعدہ وعہد کو بھی توڑ ڈالا، ان نعمتوں کو بھی بھول گئے اور محمد رسول اللہ کے دشمن بن گئے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۳]

آیت مبارکہ میں ''اسرائیل'' سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں، جبکہ ابوداؤد طیالسی نے مسند میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، حضور ﷺ نے ان کو بطور سوال فرمایا: ''هَلْ تَعْلَمُوْنَ أَنَّ اِسْرَائِيْلَ يَعْقُوْبُ؟'' (تم جانتے ہو کہ یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل ہے)؟ اس پوری جماعت نے کہا: ''اَللّٰهُمَّ نَعَمْ'' (ہاں! آپ صحیح فرما رہے ہیں)۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ'' (یا اللہ! تُو گواہ ہو جا) کہ اب یہ خود اقرار کر رہے ہیں کہ ''اسرائیل'' سے مراد یعقوب علیہ السلام ہیں اور یعقوب اللہ کے نبی ہیں اور میں بھی اللہ کا نبی ہوں تو پھر آپ کی مخالفت کا کیا معنیٰ؟

ایک قول حضرت عمیر مولیٰ حضرت ابن عباس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا کہ اسرائیل کا ترجمہ ''عبداللہ'' ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۲، البقرۃ: الآیۃ: ۴۰]

تاریخِ انسانی کی قدیم زبانیں:

آج کل جیسے کسی کو اللہ کا بندہ کہا جائے تو اس زبان میں ''اسرائیل'' کہا جاتا تھا۔ یاد رکھیں کہ پہلے جتنی زبانیں بھی گزری ہیں، تقریباً تمام انبیاء اور کتابیں سریانی زبان میں آئیں یا عبرانی زبان میں آئیں، یعنی سب سے پہلے سریانی زبان تھی، اس کے بعد عبرانی زبان آئی، عبرانی کے بعد پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کا زمانہ آیا تو پھر عربی زبان آئی۔ علماء نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے لغت عربی میں کلام کرنے والے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، اور ان تمام لغات کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔

ہوا یوں تھا کہ آدم علیہ السلام ایک لغت لے آئے اور وہ چلتی رہی، چلتی رہی، پھر اولاد بڑھتی گئی، بڑھتی گئی، مکان

بدلتے گئے، ملک بدلتے گئے، آبادیوں میں اضافہ ہوتا گیا تو اب الفاظ میں بھی کچھ تغیر آتا گیا، زبانیں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔

اب چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ جو آخری پیغمبر بھیجے گئے ہیں، ان کو عرب میں مبعوث فرمایا جائے اور ان کی لغت بھی عربی ہو۔ سب سے آخری نبی بھی عربی اور آخری کتاب قرآن بھی عربی اور اسی طرح جنت کی زبان بھی عربی ہے اور اسی طرح اللہ کا قرآن اللہ کا کلام بھی عربی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس زبان کو بڑا شرف بخشا۔
ایک تو اُمّ القریٰ یعنی کعبۃ اللہ کو تمام کائنات کی بستیوں کا مرکز اصلی بنایا اور کعبہ کو مرکز ہدایت بنایا اور اسی کعبہ میں ''رَحْمَةٌ لِلْعَالَمِيْن'' کو پیدا فرمایا اور اسی کعبہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک اُتارا جو ''هُدیً لِلْعَالَمِيْن'' ہے اور پھر قیامت تک کے لیے عربی زبان آگئی۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں اگر آدمی عربی لغت سیکھ لے تو اللہ کے دین کو سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ قرآن بھی عربی، آخری پیغمبر حضور پاک ﷺ بھی عربی اور اہل جنت کا کلام بھی عربی ہوگا تو اس لحاظ سے آدمی کو اس زبان سے ایک تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔
ایک بات ہمیشہ یاد رکھا کریں کہ بعض لوگ جو اعداء اسلام ہیں یعنی اسلام کے دشمن ہیں چاہے وہ یہودی ہوں، وہ نصرانی ہوں، گمراہ فرقے ہوں، جو دنیا میں اس وقت دندناتے پھر رہے ہیں، وہ لوگوں کے دلوں میں ایک نفرت پیدا کرتے ہیں کہ عربوں کا حال آپ نے دیکھا ہے، ان کا کردار دیکھو، ان کا عمل دیکھو، ان کا لباس دیکھو اور یہ اپنی دولت کی کثرت کی وجہ سے دنیا کے ملکوں میں عیاشیاں کرتے ہیں اور اسلام کے خلاف کام کرتے ہیں تو پھر عربی سے محبت کا کیا معنی ہے؟
یہ دراصل اسلام دشمنی ہے۔ ہمیں عرب کے کسی فرد سے تو تعلق نہیں ہے، بعض عرب علاقے ایسے بھی ہیں جہاں مسلمان بھی نہیں ہیں، حالانکہ وہ عرب علاقے ہیں، لیکن ان میں غیر مسلم آباد ہیں۔ ہم تو لغت عربی سے پیار کرتے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کلام اللہ ہے، یہ کلام محمد رسول اللہ ﷺ ہے اور یہ کلام اہل جنت ہے اور ہم عرب سے اس لیے محبت کرتے ہیں کہ انہی سے اللہ نے ہمیں نبی بھی عربی عطا فرمایا۔ اصل محبت ہمیں حضور ﷺ سے ہے، اصل محبت ہمیں اپنے اللہ سے ہے، اصل محبت اللہ کے کلام سے ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے مرکز ہدایت خانہ کعبہ سے ہے۔ اور اب اس مرکز کے اندر کچھ لوگ اچھے ہوں تو کچھ لوگ برے بھی ہوں گے، یہ تو نظام عالم ہے کبھی دن ہوگا تو کبھی رات ہوگی، کبھی روشنی ہوگی تو کبھی اندھیرا ہوگا۔ اگر ساری دنیا ہی صالح بن جائے اور کوئی برا نہ رہے تو

پھر صالحین کی کیا قیمت ہوگی؟ اگر ساری دنیا ہی سچ بولنے والی بن جائے تو ہر آدمی سچا ہوگا، پھر سچ کی قدر کیسے معلوم ہوگی؟

حق اور باطل کا مقابلہ تو ہر دور میں رہا ہے، صدق اور کذب کا مقابلہ تو ہر دور میں رہا ہے، ظلمت اور روشنی کا مقابلہ تو ہر دور میں رہا ہے، اور میرے مدنی سرکار ﷺ کی سب سے پہلے مخالفت کرنے والے قریش مکہ بھی عربی تھے اور سب سے پہلے ایمان لانے والے بھی عرب تھے، سب سے پہلے جان دینے والے بھی عرب تھے اور پھر پوری دنیا میں اسلام پھیلانے والے بھی عرب تھے۔ اگر حضور ﷺ کے صحابہ اتنی قربانی نہ دیتے تو کیا آپ اور میں کلمہ پڑھتے؟ پتہ نہیں ہم ہندو یا سکھ ہوتے یا پتہ نہیں کیا بلا ہوتے؟

آپ کے ملک کو بنے ہوئے پچاس سال ہونے والے ہیں یا ہو گئے ہیں، 1947ء میں آپ کا ملک آزاد ہوا، آپ دیکھ لیں کہ نصف صدی گزرنے کے بعد حال یہ ہے کہ ملک تو مسلمانوں کا ہے، لیکن تہذیب ابھی بھی ہندو کی ہے، شادی میں وہی کچھ ہوتا ہے، غمی میں وہی کچھ ہوتا ہے، موت و حیات میں وہی کچھ ہوتا ہے جس کو ہندوؤں نے رواج دیا ہوا ہے۔

نکاح میں جاہلانہ اور ظالمانہ رُسومات:

یہ منگنی اور مہندی، کیا سب اسلام کی رسمیں ہیں؟ ان کا اسلام سے کیا تعلق ہے؟ آپ کے ہاں انگوٹھی پہنانے کی رسم ہے، مہندی کی رسم ہے، منگنی کی رسم ہے، آج جناب دولہے کے ہاتھ میں لوہے کے کڑے پہنائے جا رہے ہیں، اسے گھوڑے پر چڑھایا جا رہا ہے، وہ بے چارہ ساری زندگی کھوتے پر نہیں چڑھا ہوگا اور آپ اس کو گھوڑے پر بٹھا رہے ہیں، ایسے لگتا ہے کہ بے چارہ ابھی گرا اور ابھی گرا، اور ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ اس کے لیے گھوڑے پر چڑھنا ایک عذاب بن جاتا ہے۔ اصل میں یہ ہندو تہذیب کا ایک پرتاؤ ہے جو ہمارے معاملات میں نظر آتا ہے۔

دوسری طرف دیکھیں تو جہیز کی لعنت ہے۔ جہیز کا اسلام سے کیا تعلق ہے کہ لڑکی والے لڑکی بھی دیں اور دولت بھی دیں؟ وہ غریب اشتہاروں میں لکھتے ہیں کہ ہماری لڑکی کی عمر یہ ہے اور اس کی تعلیم یہ ہے اور ہم لڑکے کو سیٹل کریں گے، بزنس کروائیں گے، تاکہ کوئی اچھا رشتہ مل جائے۔ یہ ہندوانہ رسم نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

آپ نے گویا ان سے لڑکی بھی لے لی اور عہدہ یا ملازمت کی رشوت بھی وصول کر لی۔ حالانکہ یہ بالکل حرام ہے اور سو فیصد حرام ہے، اس کے حرام ہونے میں ایک پیسے کا شبہ بھی نہیں ہے، اس لیے کہ یہ رشوت بھی ہے اور جوا بھی



ہے کہ اگر آپ کا کسی بڑے آدمی کی لڑکی پر داؤ لگ گیا تو آپ کروڑوں کے مالک بن گئے۔اس طرح یہ جُوا ہو گیا۔
اور اس کے بعد آپ نے شرط رکھ کر زبردستی وصول کیا کہ اتنے جوڑے دولہے کے لیے لیں گے اور دولہے کے باپ، ماں اور بہنوں کے لیے بھی اتنے جوڑے لیں گے اور بارات میں اتنے آدمی آئیں گے اور کھانے کا مینو یہ ہوگا تو یہ رشوت بھی ہوگئی۔ایسا کھانا بھی حرام ہے اور اس طرح مشروط کر کے چیزیں لینا بھی حرام ہے۔یہ ساری ہندوانہ رُسوم ہیں۔اسی تہذیب کا اثر ہمارے اندر ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرمائے۔

آج بھی کسی نوجوان عورت کا خاوند مرجائے تو اس کو ڈائن (بلا) کہتے ہیں کہ ہمارے بیٹے کو کھا گئی۔کیا موت لڑکی کے ہاتھ میں تھی؟ کیا یہ مسلمان کا عقیدہ ہے؟ حالانکہ موت دینے والا اللہ ہے، پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ دوسروں سے کہتے ہیں: خبردار! اس لڑکی سے نکاح نہ کرنا، جو اس سے نکاح کرے گا یہ اس کو کھا جائے گی۔

لوگوں کے عجیب عجیب عقیدے ہوتے ہیں کہ اگر مہینے کے فلاں دن فلاں تاریخ کو کوئی مرگیا تو کہتے ہیں: خبردار رہو! یہ مردہ گھر کے سات بندے کھائے گا، یہ قبر سے آئے گا، ان کو بھی پکڑ کر لے جائے گا۔ایمان سے بتلائیں، کیا یہ مسلمانوں کے عقیدے ہیں؟ ان کا اسلام سے کوئی تعلق ہے؟

کتنے بڑے لوگ ہیں جو ذمہ دار ہیں، سرمایہ دار ہیں، جاگیردار ہیں اور ان کی لڑکیوں کی عمر گھر میں بیٹھے بیٹھے سو سال ہوگئی، لیکن ان کی شادی نہیں کی۔اس ڈر سے کہ اگر ان شادی کردی تو انہیں زمین دینی پڑے گی۔اسی طرح جائیداد میں سے اپنی بہنوں کو ان کا حصہ نہیں دیتے، بس ان پر یہ احسان کیا ہوتا ہے کہ وہ گھر میں بیٹھ کر کھا رہی ہیں۔ اور نہ ہی ان کی شادی کرتے ہیں، تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس کا شوہر کوئی تگڑا مضبوط آدمی ہو اور وہ مطالبہ کرے کہ میری بیوی کی جائیداد دو۔اور بعض بڑے بڑے زمیندار ایسے بھی ہیں کہ بہن کی شادی تو کردی، اتفاق سے اس کا خاوند فوت ہوگیا تو اب وہ بیچاری ساری زندگی بیٹھی رہے گی۔جیسے ہندوؤں کی رسم تھی کہ خاوند کے مرنے کے بعد عورت دوسری جگہ شادی نہیں کرسکتی، مسلمانوں کی بھی وہی رسم ہے کہ وہ عورت دوسری شادی نہیں کرسکتی جس کا خاوند فوت ہوگیا۔فرق صرف اتنا ہے کہ وہ زندہ عورت کو جلا دیتے تھے، ستی کردیتے تھے، وہ تو چلو ایک دفعہ جل کر مرجاتی تھی اور یہ تو ساری زندگی گھر میں جل رہی ہے اور مر رہی ہے اور اس کو شادی کرنے ہی نہیں دیتے۔

حالانکہ اسلام کا حکم یہ تھا کہ اگر خاوند فوت ہوجائے تو چار مہینے دس دن عورت انتظار کرے، اس کے بعد غسل کرے، اچھے کپڑے پہنے، تاکہ اور لوگ خطبہ کے لیے آئیں، وہ کسی اور کے گھر جا کر آباد ہو، اللہ اس کا اور کسی

دوسرے مرد کا گھر بھی آباد کرے، ان کی اولاد ہو اور دونوں گناہ سے بچ جائیں۔ یہ ساری رسمیں اسی کفر کی صحبت کی وجہ سے ہیں۔

سود کی مذمت:

آج جو مسلمانوں میں سود ہے، اس کو ہندوؤں نے رواج دیا تھا۔ پہلے ہندو سود دیتے تھے، مسلمانوں میں سود لینے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ آج سے پچاس سال پہلے آپ مجھے کوئی مسلمان گھرانہ بتا سکتے ہیں جو سود کا کام کرتا تھا۔ تمام سودی کاروبار کرنے والا ہندو تھا۔ جب ہندو دفع ہو گیا، اللہ نے اس کو دفع کر دیا تو مسلمانوں نے اس کا پورے کا پورا چارج سنبھال لیا۔ وہ بدبخت سود پیسے اور پائی میں لیتا تھا، آنہ اور روپے میں لیتا تھا اور یہ سینکڑوں اور ہزاروں میں لیتے ہیں۔ سود ہمارے اندر اتنا عام ہو گیا ہے کہ ہم اس سے نکل ہی نہیں سکتے۔ ایک دفعہ آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں...... اللہ معاف فرمائے، اللہ حرام سے بچائے...... ایک دفعہ جب سود میں پاؤں پڑ گیا تو جہنم میں پھنس گئے، اب آگ لگتی جائے گی اور سود آپ کی جائیداد کو کھاتا چلا جائے گا، اور وہ اوپر جو ساہوکار بیٹھے ہوئے ہیں، تمام دنیا کا پیسہ ان کو جا رہا ہے۔

واقعہ:

مجھے سفر میں ایک ماہر اقتصادیات ملے، وہ مجھے اعداد و شمار بتا رہے تھے کہ ایک بینک کے جو ٹریولر چیک ایشو ہوتے ہیں وہ گم ہو گئے اور گر گئے اور پھر ان کا مطالبہ کسی نے نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ یہ جو گم شدہ ہیں جن کا وارث کوئی نہیں بنا، اتنے ارب صرف ایک بینک کے پاس ہیں اور وہ اسی سے اپنا کام چلا رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں: کوئی مانگے تو ہم اسے دیں، ہمیں کیا پتہ کس کے ہیں؟ ان کے پاس پیسہ تو موجود ہے، لیکن لینے والا کوئی نہیں ہے۔

آپ اندازہ کریں کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جو اپنا سرمایہ بینکوں میں امانت رکھوا دیتے ہیں، اولاد کو نہیں بتاتے، بیوی بچوں کو نہیں بتاتے، راستے میں ایکسیڈنٹ ہوا اور مر گئے۔ جب کسی کو بتا نہیں سکا تو بینک اس کا سرمایہ ہضم کر جائے گا۔ اور ساری زندگی وہ اس پیسے سے سود کا کام کرتے رہیں گے اور قبر میں وہ لعنت کا مستحق ہوتا رہے گا۔ وجہ کیا ہے کہ اسلام کے خلاف ایک عمل کیا۔ سود، ربوا حرام ہے، ہم نے ان اداروں میں کام کیا جو سودی کاروبار کرتے تھے۔

اور دوسرا ہم نے اسلام کے خلاف یہ کام کیا کہ اسلام کا حکم ہے کہ تیری دو راتیں نہ گزرے، مگر تیری وصیت



سرہانے کے نیچے لکھی ہوئی موجود ہو۔[1] چلو تم اولاد سے کچھ چھپانا بھی چاہتے ہو تو ایک وصیت نامہ بنوا کر ایک قابل، دیانت دار آدمی کے پاس رکھوا دو، تاکہ کم از کم تمہاری موت کے بعد یہ پتہ تو چل سکے کہ کسی کا قرضہ تم نے دینا ہے اور کس نے تم نے لینا ہے؟ ویسے سب کہتے ہیں کہ دعا کرو، اسلام آجائے۔

اسلام کیسے آئے گا؟

کئی لوگ مجھے ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت! خصوصی دعا فرمائیں اسلام آجائے۔ میں کہتا ہوں: کہاں سے آئے؟ اگر کہیں سے چل پڑا ہے تو اس کے لیے ٹکٹ کا انتظام کریں، کوئی جہاز یا بحری جہاز بھیجیں؟ تاکہ اسلام آجائے۔ اور یہ بھی ہمیں سمجھاؤ کہ پیدل آرہا ہو تو کوئی پانی لے کر جائیں، اسلام راستہ میں بھوکا پیاسا ہوگا، اور ہوائی جہاز سے آرہا ہے تو یہ بھی تو پتہ ہو کہ کون سے ٹرمینل پر جہاز لگے گا، تاکہ وہاں سے جا کر اسلام کو اُتاریں۔

او بدبختو! اسلام تو تمہارے اندر ہے، تم آج ایمان کا اظہار کر دو تو اسلام آجائے گا۔ کیا تم اسلام کو باہر سے امپورٹ کرو گے؟ اس کے لیے لائسنس لینا پڑے گا؟ اس کی باقاعدہ کوئی ایل سی کھولنی پڑے گی؟ بکنگ کروانی ہوگی؟ کوئی پہلے بینک ڈرافٹ بھیجنا پڑے گا؟ آج اگر ہم پکے مسلمان بن جائیں۔ مثلاً بیس گھروں پر مشتمل ایک بستی ہے، وہ سارے پکے مسلمان بن جائیں تو ہم کہہ سکیں گے کہ اس بستی میں اسلام موجود ہے۔ اگر شہر والے سب کھڑے ہو جائیں کہ ہم اللہ اور رسول کے خلاف کوئی بات نہیں سنتے۔ یہی تو اسلام ہے۔ اور کہاں سے اسلام آجائے؟ کیا مدینہ شریف سے پھر اس کو لے کر چلیں گے؟ پہلے جا کر اس پوری آبادی کو کلمہ پڑھائیں گے؟ کیا وہ مسلمان نہیں ہیں؟ اور اگر ہم نے کلمہ پڑھا ہوا ہے، ہم مسلمان ہیں اللہ اور رسول کے حکم کے پابند ہیں تو ہر آدمی اپنے گھر میں نظر ڈالے، جو چیزیں اسلام کے خلاف ہیں ان کو چھوڑ دے اور جو اسلام کے مطابق ہیں ان کو پکڑ لے۔ اسلام آگیا۔

اسلام پر اتفاق:

بعض لوگ کہتے ہیں: حضرت! ہمارے ملک میں لوگ اسلام چاہتے ہیں، لیکن مولوی اسلام نہیں چاہتے، مولوی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ مولوی نہ لڑیں تو اسلام ایک دن میں آجائے گا۔

میں نے کہا کہ مولوی جن باتوں پر نہیں لڑتے، ان باتوں پر تم مہربانی کر کے عمل کر لو۔ کسی مولوی نے تمہیں آج

[1] صحیح البخاری، حدیث: ۲۷۳۸، باب: الوصایا وقول النبی ﷺ: وصیۃ الرجل مکتوبۃ عندہ

تک کہا ہے کہ تم نماز نہ پڑھو، ایک مولوی کا نام بتاؤ۔ کیا وہ مولوی شافعی، حنبلی، حنفی، مالکی یا دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث یا تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتا ہے؟ آپ بتائیں، کیا انہوں نے کبھی باقاعدہ اشتہار چھاپا ہے کہ نمازیں نہ پڑھا کرو؟ یا کسی ایک مولوی نے تمہیں کہا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال دیا ہے تو تم زکوٰۃ نہ دیا کرو۔ ایک مولوی نے کہا ہو کہ شراب پیا کرو، سور کا گوشت کھایا کرو، حرام استعمال کرو، حلال سے بچو۔ کسی ایک مولوی کا نام تو مجھے بتا دو۔ جن باتوں میں مولوی اکٹھے ہیں ان باتوں کو تو پہلے مان لو، جن پر مولویوں کا جھگڑا ہے، ان کو نہ ماننا۔ بعد میں فیصلہ کر لیں گے۔

جب تمام مولوی نماز پر متفق ہیں، روزے پر متفق ہیں، زکوٰۃ پر متفق ہیں، اللہ کی توحید پر متفق ہیں، اللہ کے قرآن پر متفق ہیں اور حضور ﷺ کی ذات پر متفق ہیں تو کتنے لوگ ہیں جو نماز نہیں پڑھتے؟ کیا وہ بھی مولوی کے جھگڑے سے نہیں پڑھتے؟ وہ مسجد بناتے ہیں جھگڑا ہوتا ہے، تم خود مسجد بناؤ جھگڑے والی مسجد میں نہ جاؤ۔ تم لوگوں کے لیے مثال پیدا کرو کہ دیکھو! ہماری مسجد میں جھگڑا نہیں ہوتا۔ تم اپنے گھر کے باہر چٹائی بچھا کر نماز پڑھنا شروع کر دو، کوئی پوچھے کہ مسجد میں کیوں نہیں جاتے؟ تو تم کہو کہ مولوی لڑتے ہیں، اللہ نے تو ساری زمین کو ہمارے لیے مسجد بنایا ہے۔

کہتے ہیں کہ ہم جمعہ پڑھنے کے لیے کہاں جائیں؟ کہاں افطار کرنے کے لیے جائیں؟ مولویوں کا تو ایک وقت پر جمعہ نہیں ہوتا۔ شکر کرو کہ ایک وقت پر نہیں ہوتا تو تمہیں نصیب ہو جاتا ہے، اگر ایک وقت پر ہوتا تو تمہیں یہ بھی نصیب نہ ہوتا۔ یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ کہیں ایک بجے ہوا تو کہیں سوا ایک بجے ہوا۔ کہیں ڈیڑھ بجے ہوا تو کہیں پونے دو بجے ہوا۔ کہیں دو بجے اور کہیں اڑھائی بجے ہوا، سب لوگ کہیں نہ کہیں پہنچ گئے۔ اگر سب کا ایک ٹائم معین ہوتا تو ایک آدمی بھی نہ جاتا، جتنے پڑھتے ہیں ان میں سے دو حصے نہ جاتے۔

اگر شیطان کو کنکریاں مارنے کا ایک گھنٹہ مقرر ہوتا تو کتنے لوگ مر جاتے؟ لیکن اللہ کی شان ہے کہ اللہ نے سارا دن دے دیا۔ بعض ائمہ کے نزدیک تو تینوں دن کنکریاں مارنے کی اجازت ہے کہ جب چاہو، مار لو۔ بعض ائمہ کے نزدیک تو اتنی رعایت ہے کہ آخری دن جا کر پہلے دو دن کی قضا بھی کر لو۔ اتنی رعایت مل گئی تو ہم بچ گئے، وگرنہ تو ہماری جانیں تباہ و برباد ہو جاتیں۔

میرے بھائی! یہ بلاوجہ الزام ہوتا ہے کہ مولوی لڑ رہے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صراط

مستقیم نصیب فرمادے، اللہ تبارک وتعالیٰ ہمارے دل ودماغ اور ظاہر وباطن میں قرآن واسلام کو نافذ کردے۔ اسلام تو ہمارے اندر موجود ہے، صرف یہ ہے کہ ہم نے اس پر عمل کرنا ہے۔

دیکھیں! جب مؤذن ''اللہ اکبر'' کہے گا۔ مکہ میں، مدینہ میں اذان ہوتی ہے اور آپ کے ملک میں اذان ہوتی ہے تو مؤذن ہمیں نماز کے لیے ہی بلا رہا ہوتا ہے۔ لڑانے کے لیے تو بلا رہا ہوتا۔

کائنات میں ایک ساعت ایسی نہیں گزرتی جس میں ''اللہ اکبر، اللہ اکبر'' کی آواز نہ گونجے۔ ایک ملک میں اذانیں ختم ہوتی ہیں تو دوسرے ملک میں شروع ہو رہی ہوتی ہیں۔ کوئی لمحہ اللہ کی ندا سے خالی نہیں ہے۔ جدید پڑھے لکھے لوگوں نے باقاعدہ آج ریسرچ کی ہے کہ پوری کائنات کے اوقات میں جو فرق رکھا گیا ہے اس میں اللہ کی حکمت ہے کہ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں کہ جب پکارنے والا پکار نہ رہا ہو۔ لیکن ہم سب سننے کے باوجود باہر کھڑے ہیں، سگریٹ ہاتھ میں ہے، اس کے بعد ہم نے کپڑا بیچنا ہے اور پھر ہم نے بستر لگانا ہے۔ نماز پڑھتے نہیں اور پھر کہتے ہیں کہ مولوی لڑتے ہیں۔ تمہاری نماز سے مولوی کے لڑنے کا کیا تعلق ہے؟

او خدا کے بندو! تم جس کو اسلام سمجھتے ہو، اسی پر چل پڑو۔ مولویوں کو چھوڑو۔ تم آخر کس کو اسلام سمجھتے ہو؟ تم نے بھی تو آخر کلمہ پڑھا ہے ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' اب تم جس کو اسلام سمجھتے ہو اسی پر چل پڑو، جو اللہ کے فرائض ہیں کم از کم وہ پورے کرلو، واجبات پورے کرلو، اہم چیزوں پر عمل کرلو، پہلے آپ بنیادی مسئلے تو حل کرلیں۔ باقی جو غیر اہم چیزیں ہیں، نوافل ہیں، وہ بعد میں دیکھا جائے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمیں صحیح معنوں میں مسلمان بنادے۔

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ۝۴۰﴾ [البقرة:۴۰]

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلی نعمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام لے کر خطاب کیا۔ اگر اللہ اپنے قرآن میں ان کا نام نہ لیتے تو ان کا نام بھی دنیا میں نہ ہوتا۔

اُمتِ محمدیہ ﷺ پر انعامات:

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے ہمیں جو نعمتیں ملی ہیں ہم ان کو گن ہی نہیں سکتے:

......اللہ نے ہمیں توحید کا عقیدہ دیا،

......اللہ نے کعبۃ اللہ جیسا مرکزِ ہدایت دیا،

......اللہ نے قرآن جیسی جامع مانع کامل کتاب عطا فرمائی،

......خاتم النبیین دیا، رحمۃ للعالمین دیا،

اور پھر اوپر سے پردہ بھی ڈال دیا، تاکہ قبولیت یا عدمِ قبولیت کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ پھر اللہ نے کتنی عنایت فرمائی:

......پوری زمین کو ہمارے لیے مسجد بنا دیا کہ جہاں مرضی آئے نماز پڑھ لو،

......پانی نہ ملے تو تیمم کرلو،

......چار عورتوں سے نکاح کرلو، جھگڑا ہو جائے طلاق بھی دے سکتے ہو،

......وراثت کا نظام بنا دیا،

تاکہ دولت ایک بندے کے گھر میں بند نہ رہے، یہ نظام ایک ہاتھ میں مرکوز نہ رہے، بلکہ آگے آگے چلتا رہے۔ پہلے ایک مالک تھا، پھر چار بیٹے مالک بنے، چار بیٹوں کے چار چار بیٹے ہوئے، ان میں میراث تقسیم ہوئی تو سولہ ہوگئے۔ سولہ کے آگے چار چار بیٹے ہوئے تو چونسٹھ مالک بن گئے۔ جب تک یہ دولت چلتی رہتی ہے تو اس میں فائدہ ہوتا ہے، جہاں رُک گئی جام ہوگئی، یا کسی جگہ اس کو بریک لگ گئی تو تباہی آگئی۔

ہمارا طرزِ عمل:

اللہ نے اتنی بڑی بڑی نعمتیں دیں، لیکن ہم نے کیا کیا؟

......توحید کے مقابلہ پر شرک کیا،

......اللہ کے سجدے کے مقابلہ پر ہم نے قبروں کو سجدہ کیا،

......اللہ کے نام پر قربانی کی بجائے ہم نے قبروں کے نام پر قربانیاں کیں،

......اللہ سے مانگنے کی بجائے ہم نے غیروں سے مانگا،

......حضور ﷺ کی ختم نبوت کے خلاف کسی نے نبوت کے دعوے کیے اور کچھ لوگوں نے دعویٰ کرنے والوں کا ساتھ دیا۔

اب بھی مسلمانوں کی دکانوں پر جا کر دیکھ لیں، قادیانیوں کی بنی ہوئی چیزیں بک رہی ہیں، کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ ہم کیا پی رہے ہیں؟ اور اس کا نفع کس کو جا رہا ہے؟ اور کون کون سی چیزیں ہیں جو ہم یہود سے لے رہے ہیں اور یہودیوں کو ان کا فائدہ پہنچا رہے ہیں؟ کیا کیا چیزیں ہیں جو نصرانیوں سے لے رہے ہیں اور اس کا فائدہ ہم نصاریٰ کو پہنچا رہے ہیں؟ کیا چیزیں ہیں جو ہندوؤں سے لے رہے ہیں اور ان کا فائدہ ہم اس ہندو کو، اس بُت پرست کو پہنچا رہے ہیں جو ہماری مسجدوں کو شہید کر رہا ہے؟ ہماری بیٹیوں کی عزت وعصمت کو لوٹ رہا ہے۔ ہمیں آج بھی اس کا آم بڑا میٹھا لگتا ہے، آج بھی ہمیں اس کی چیزیں بڑی پسند ہیں۔ اور نہیں تو ان کی فلم تو دیکھ ہی لیں گے۔ آخر ہم میں اور بنو اسرائیل میں کیا فرق ہے؟

عمل کی عزت:

ایک بات یاد رکھنا کہ اللہ کے ہاں عمل کی عزت ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری

اگر تمہارے عمل بہتر ہوں گے تو اللہ کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی، کسی اور قوم کے بہتر ہوں گے تو ان کے ساتھ ہوگی۔ باقی فیصلے آخرت میں ہوں گے۔ اللہ کے ہاں عمل کو دیکھا جاتا ہے۔ جب ہمارے عمل اچھے تھے، ہم نے قرآن کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا اور حضور ﷺ کی اتباع کر لی تھی تو بحر و بر، قیصر و کسریٰ اور دنیا کی سلطنتیں مسلمانوں کے پاؤں کے نیچے تھیں۔

جن اعمال کی بناء پر اللہ نے یہودیوں پر ذلت و رُسوائی مسلط کی تھی، جب وہ اعمال ہم نے اپنا لیے تو وہی رُسوائی ہمارے کھاتے میں آ گئی۔ ان کے ساتھ کسی کا کوئی ذاتی جھگڑا تو نہیں ہے، ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ [البقرة: ٦١] اس لیے کہ وہ انبیاء کی مخالفت کرتے تھے، انبیاء کو گالیاں دیتے تھے، انبیاء کو قتل کرتے تھے، اللہ کی کتابوں کو بدل ڈالتے تھے، وہ غلط مسئلے بتاتے تھے، دین کو بیچا کرتے تھے، غیب کی جھوٹی خبریں دیا کرتے تھے، ان میں غیر اللہ کو سجدہ عام ہو گیا تھا، ان میں ربوا عام ہو گیا تھا، زنا عام ہو گیا تھا۔ آج یہ چیزیں مسلمانوں کے اندر عام ہو گئیں تو ذلت ہمارے حصہ میں آ گئی۔ ذات کے ساتھ تو یہ فیصلہ نہیں ہے، بلکہ جن



جن لوگوں کے عمل اس طرح کے ہوں گے ان پر ذلت آئے گی، چاہے وہ کوئی بھی ہوں اور کہیں بھی ہوں۔

سگریٹ نوشی کی مذمت:

آج میں ایک جگہ اعداد وشمار دیکھ رہا تھا کہ مسلمان صرف ایک دن میں جو سگریٹ پر پیسہ خرچ کرتا ہے، اگر اپنے مسلمان ملکوں پر خرچ کرے تو کوئی مسلمان غریب نہ رہے۔ آپ یہودیوں اور کافروں کو چھوڑیں، مسلمان کہلانے والے ایک دن میں کتنے پیسوں کا سگریٹ پیتے ہیں، ان پیسوں کو اپنے ہاتھ سے آگ لگاتے ہیں، اگر وہ یہ پیسہ اپنے غریب مسلمان بھائیوں کو دے دیں تو کوئی آدمی بھوکا نہ رہے اور کوئی مسلمان ملک کسی سے قرض نہ مانگے۔

اور دوسرے نمبر پر چائے ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر سگریٹ اور چائے نہ ہو تو مخلوق مرجائے گی؟ جب تک یہ سگریٹ نہیں تھی اور یہ چائے نہیں آئی تھی تو کیا مخلوق مرگئی تھی یا ان کی صحتیں اچھی نہیں تھیں؟ ایسی بات نہیں ہے۔ جب یہ چیزیں نہیں ہوتی تھیں تو لوگوں کی عمر سو سال ہوا کرتی تھی، اب ہم ساٹھ پر آگئے ہیں۔

مثلاً آپ کی تنخواہ ایک ہزار ریال ہے تو خود اندازہ کرلیں کہ چائے اور سگریٹ مہینہ میں کتنے کا پیتے ہیں؟ اور دشمن نے کیسا خوبصورت جال پھیلایا ہے، ہر ڈبی پر یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ زہر ہے، یہ کینسر پیدا کرتا ہے، یہ بیماریاں پیدا کرتا ہے اور ہر ڈبی پر مہر بھی لگی ہوئی ہے۔ مسلمان ہے، عقل والا، دماغ والا ہے، پھر بھی پیسے دے کرلے بھی رہا ہے، اس سے بڑی جاہل قوم آپ نے دیکھی ہوگی جو دھوئیں میں پیسہ اُڑا دے؟ جو چائے لذت کے لیے پی رہی ہے؟ اس میں ہم بھی شریک ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کوئی یہ کہے گا کہ چائے تو حلال ہے۔ ٹھیک ہے حلال ہے، لیکن اگر نہ پی جائے تو کون سا قہر ٹوٹ پڑے گا؟ کتنی دوسری حلال اشیاء ہیں جو ہم کھالیتے ہیں، پی لیتے ہیں۔ اگر ہم صرف یہ دو چیزیں بچالیں تو کشمیر کا کوئی مسلمان ننگا نہ رہے، بوسنیا کا کوئی مسلمان بھوکا نہ مرے، کشمیر کے اندر کوئی میری بیٹی بغیر کپڑوں کے نہ رہے۔ وہ خیموں میں پڑے ہیں، ان کے پاس پہننے کے لیے کپڑے نہیں ہیں، تن ڈھانپنے کے لیے لباس نہیں ہے، کھانے پینے کے لیے سامان نہیں ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں مسلمان اس حالت میں ہیں کہ اگر پانچ دن تک ان کو غذا نہ پہنچائی گئی تو وہ بھوک سے مرجائیں گے اور ہم ہیں کہ...... ماشاء اللہ!...... حرم شریف کے باہر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔

کہتے ہیں: اللہ تیرا بڑا شکر ہے کہ تُو نے ہمیں کعبہ میں رکھا ہے۔ کیا کعبہ میں رہنے کا ڈھنگ یہی ہے؟ اس سے تو بہتر تھا کہ ہم اپنے ملک میں جا کر رہتے، وہاں دھواں اُڑاتے خدا کے کعبہ میں تو نہ اُڑاتے، وہاں گندگی پھیلاتے

محمد ﷺ کے شہر مدینہ میں تو نہ پھیلاتے، وہاں جھوٹ بولتے اللہ کے حرم میں تو جھوٹ نہ بولتے، اس سے تو کروڑ درجہ بہتر تھا کہ بھوکے رہتے، لیکن حرمین شریفین کی بے ادبی نہ کرتے اور اللہ کے حرم کے گستاخ نہ بنتے۔

ایک آدمی اللہ کے حرم میں رہنے کے بعد ایسی منکرات کرتا ہے، اس کے لیے بس دعا کریں، اللہ فضل فرمادے۔ وہ رحیم ہیں، رحم کا معاملہ فرمائیں۔ لیکن ہماری فصل پک چکی ہے اور کٹنے کے انتظار میں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ کریم ہے، ہمیں کچھ دن مہلت عطا فرمادے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ میری نعمتوں کو یاد کرو۔

تفسیر:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قرآن مقدس میں موسیٰ علیہ السلام کا خطاب ہے کہ آپ نے بھی اپنی قوم سے فرمایا تھا:

﴿يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ [المائدۃ: ۲۰] آیت سے مراد اس زمانہ کے جہان والے ہیں، وگرنہ اُمتِ محمدیہ ﷺ تو افضل ہے اور حضور ﷺ کی امت پر اس سے زیادہ بڑی نعمتیں ہیں۔

اُمتِ محمدیہ ﷺ کی فضیلت:

بعض علماء نے فرمایا کہ جزوی فضیلت، کلی فضیلت کو متاثر نہیں کرسکتی۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ انفرادی طور پر اللہ نے ان کو ایسی نعمت دی ہو، جو دوسری اُمت کو نہیں دی۔ لیکن جب مجموعی نعمتوں پر نظر ڈالیں تو اُمتِ محمد مصطفیٰ ﷺ افضل امت ہے اور تمام امتوں سے زیادہ شرف والی اُمت ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایثار:

آپ نے دیکھا نہیں کہ جب حکم ہوا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور جو لوگ سمجھنے والے ہیں، انہوں نے کیا کیا!!؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ابوبکر تم کیا لے آئے ہو؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! گھر میں جو کچھ تھا سب لے آیا ہوں۔ جب اللہ کے نام پر مانگا گیا ہے، اللہ کے دین کے لیے مانگا گیا ہے تو میں کچھ گھر میں کیسے رکھ کر آتا؟ جو کچھ میرے گھر میں تھا، وہ میں لپیٹ کر حضور ﷺ کے دربار میں لے آیا ہوں۔ تھوڑا ہے یا زیادہ، میرے گھر میں یہی تھا۔ [سنن أبي داود، حدیث: ۱۶۷۸، بابٌ: فِي الرُّخْصَةِ فِي ذٰلِكَ]

حضور پاک ﷺ نے حکم دیا کہ اگر تم سے کوئی گناہ ہوجائے یا غلطی ہوجائے تو فوراً نیکی کا کام کرو، تاکہ نیکی اس

گناہ کو مٹانے والی بن جائے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ [ہود: ۱۱۴]

جب تم نیکی کرتے ہو تو وہ تمہاری برائیوں کو ختم کر دیتی ہے۔

حتیٰ کہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جب آدمی وضو کرتا ہے تو اس کے گناہ گر جاتے ہیں۔ جب کلی کرتا ہے تو منہ کے گناہ گر جاتے ہیں، ناک میں پانی ڈال کر صاف کرتا ہے تو ناک کے گناہ گر جاتے ہیں اور جب چہرہ دھوتا ہے تو آنکھوں اور چہرے کے گناہ گر جاتے ہیں اور جب ہاتھوں پر پانی ڈالتا ہے تو ہاتھوں کے گناہ گر جاتے ہیں اور جب مسح کرتا ہے تو دل و دماغ کے گناہ گر جاتے ہیں، جب پاؤں کو دھوتا ہے تو پاؤں کے گناہ گر جاتے ہیں اور گناہوں سے پاک صاف ہو کر مسجد میں آتا ہے۔ نماز پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے پاک صاف کر کے بھیج دیتے ہیں۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۴، باب: خُرُوجِ الْخَطَايَا مَعَ...]

حدیث مبارک میں یہ بھی آتا ہے کہ ایک نماز دوسری نماز تک کے گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ ایک رمضان دوسرے رمضان تک کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

[شعب الایمان، حدیث: ۳۳۴۸، فَضَائِلُ شَهْرِ رَمَضَانَ]

اسی طرح فرمایا: ہجرت گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور حج گناہوں کو مٹا دیتا ہے، اور فرمایا: اس کے بعد جب بندہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے کبائر بھی معاف فرما دیتے ہیں۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۱۹۲، باب: كَوْنِ الْإِسْلَامِ يَهْدِمُ مَا قَبْلَهُ وَكَذَا الْهِجْرَةُ...]

اگر حقوق العباد ہیں تو وہ ادا کرنے سے معاف ہو جاتے ہیں، اگر ادا نہ کرو تو معاف نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ تو بندے کا حق ہے، اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندے! میں نے اپنے حق تو تجھے معاف کر دیئے، جو تیرے اپنے بھائیوں کے حق ہیں تم ان کو ادا کرو۔ اگر ادا نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تیری نیکیاں چھین لیں گے، پھر نیکیاں ان کو دے دی جائیں گی۔

واقعہ:

میرا ایک دوست بڑا آدمی ہے۔ وہ مجھے بڑے فخر سے بتا رہا تھا کہ اللہ نے مجھے بڑا کام دیا ہے، بڑی آمدنی ہے اور میں ہر سال باقاعدہ اپنے تمام ملازمین کے نام لکھ کر قرعہ اندازی کرتا ہوں، جس کا نام نکل آتا ہے اس کو اپنے



پیسوں سے حج کراتا ہوں۔ میں نے کہا: بد بخت! تُو نے کبھی نماز پڑھی ہے؟ اس نے کہا: نہیں پڑھی، یہ کوتاہی تو ہو جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی کافر لوگوں کو حج پر بھیجتا رہے تو اس کو کیا فائدہ ہوگا؟ خدا کے بندے! جو اللہ نے تم پر فرض کیا ہے، تم نے وہ نماز نہیں پڑھی، میرے ساتھ ہو اور میں تمہارے سامنے اُٹھ کر مسجد میں پڑھ کر آیا ہوں، تمہیں پھر بھی حیا نہیں آئی تو حج پر بھیجنے کا کیا فائدہ ہے؟

نکتہ:

علماء نے لکھا ہے کہ تورات اور انجیل میں باقاعدہ میرے مدنی سرکار ﷺ کی ایک ایک صفت لکھی ہوئی تھی۔ آپ کا حلیہ موجود تھا، آپ کی صورت موجود، آپ کی سیرت موجود، آپ کی جائے پیدائش موجود، اور پیدا ہونے کے وقت کی علامات موجود، حتیٰ کہ بعض لوگوں نے کتابوں کو سامنے رکھ کر اپنے تخیلات سے کچھ تصویریں بھی بنائی ہوئی تھیں...... اب بھی دنیا میں رواج ہے کہ اگر کسی مجرم کا تھوڑا بہت حلیہ مل جائے تو پھر آرٹسٹوں کو بلا کر گورنمنٹ کہہ دیتی ہے کہ اس کا قد کاٹھ ایسے تھا اور حلیہ کچھ یوں تھا، تم ایک فرضی تصویر بناؤ جس سے لوگوں کو اندازہ ہو کہ تقریباً ایسا ہوگا، تاکہ اس کو آسانی سے تلاش کیا جا سکے...... تورات اور انجیل میں حضور ﷺ کی پوری شکل اور تفصیل موجود تھی کہ اس پیغمبر کا نام احمد ہوگا اور یہ بھی موجود تھا کہ حضور ﷺ مکہ میں پیدا ہوں گے۔ یعنی کتنے کاہن اور ان کے منجمین اور کتنے ان کے علم جفر والے اور کتنے ان کے علم کتاب والے، تمام لوگ ایک ایک ذرّے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

غاروں کا باسی کاہن:

کتابوں میں لکھا ہے کہ مشرکین مکہ کے زمانہ میں ایک بہت بڑا کاہن تھا، جو غاروں میں پڑا رہتا تھا اور باہر نہیں آتا تھا...... جیسے آپ کے ملک میں جوگی اور نجومی وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بھی بڑی ریاضت کرتے ہیں، بڑے بڑے مجاہدے کرتے ہیں، سالوں تک بھوکے رہتے ہیں، سالوں تک کبھی گوشت نہیں چکھتے، سالہا سال تک نمک نہیں چکھتے، سالوں تک لباس نہیں پہنتے، صرف دو چادروں میں پڑے رہتے ہیں اور سالوں تک ایک حالت میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اور محنت کرنے سے آدمی بہر حال کسی نہ کسی طرف تو جاتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ سیدھی سڑک نہ ملی، ورنہ آخر آدمی کی محنت بے کار تو نہیں جاتی، کسی نہ کسی طرف اس کا فائدہ تو ہوتا ہے...... جس دن میرے آقا

حضور ﷺ کی پیدائش ہوئی ہے تو اسی دن صبح کے وقت لوگوں نے دیکھا کہ اس کاہن کے بال کھلے ہوئے ہیں، لوگوں سے پوچھ رہا ہے اور پاگلوں کی طرح مکہ کی گلیوں میں پھر رہا ہے۔

ایسے لوگوں کے بڑے معتقد ہوتے ہیں۔ آج کل بھی ایسے ہے کہ جو دو چادریں پہن کر کہیں بیٹھا رہے۔ چھ سات مہینے بھوکا تو مرنا پڑے گا، مگر اس کے بعد مزے ہیں۔ روٹی کھانے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔ ورنہ کسی قبر کے قریب بیٹھ جاؤ تو سمجھ لو کہ تمہاری بل لگ گئی۔ دو چار غلاف ڈال دو اور لوگوں کو خواب سنانے شروع کردو کہ خواب میں حضرت صاحب ملے اور مجھے حکم دیا کہ یہاں پہنچو، ورنہ میں تو مکہ شریف میں رہتا تھا، مدینہ شریف میں رہتا تھا۔ میں مکہ شریف چھوڑ کر آیا ہوں......حرام کھانے کے لیے!!!

تمام ٹیکس سے چھٹکارا:

آپ خود دیکھیں کہ وہ حرام ہوگا، حلال تو ہوگا نہیں، آگے بھی جہنم ملے گی۔ لیکن دنیا میں مزے ہی مزے ہیں، کوئی انکم ٹیکس نہیں، کوئی ہیلتھ ٹیکس نہیں، نہ پیدائش ٹیکس لگے گا اور نہ ہی موت ٹیکس۔ ٹیکس لگانے والا آئے تو لوگ جوتے مار مار کر اس کا سر پلپلا کردیں کہ یہ بے چارا تو فقیر آدمی ہے، کیا اس پر بھی ٹیکس لگے گا؟ توبہ توبہ أَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ! یار کتنا بڑا نالائق افسر ہے، اللہ والوں کا بھی خیال نہیں رکھتا۔ یہ تو اتنا مسکین ہے کہ باپ دادے کی قبر بیچ رہا ہے۔

پہنچی ہوئی سرکار!!

اگر کوئی کپڑے اُتار کر پھینک دے تو کہیں گے کہ یہ تو مجذوب ہے، یہ تو پہنچا ہوا بزرگ ہے، یہ تو مادرزاد ولی ہے، اندر باہر سے یہ اب بالکل پہنچ گیا۔ ہم تو دیکھتے رہے کہ جہاں پہلے تھا اب بھی وہیں ہے، پتہ نہیں کہاں پہنچ گیا؟ جب آدمی بالکل پاگل ہوجائے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس پہنچ گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ عقل والا نہیں پہنچتا، جب دماغ خراب ہوجائے تو پہنچ جاتا ہے۔

اصل مجذوب کون؟

خدا کے بندے! جو اصل مجذوب تھے، وہ اور تھے، وہ اللہ اور اس کے نبی کی سنت کے پابند تھے۔ ''جذب'' کا معنی ہے: دنیا سے اللہ کی طرف چلے جانا، لوگوں سے تعلق ہی نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے کہ وہ شریعت کے خلاف کرتے تھے، وہ تو بالکل گویا اپنی جان اور اپنا سب کچھ فنا کرچکے تھے کہ ان کو کسی بات کا احساس بھی باقی نہیں رہا



تھا، یعنی انہوں نے اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو مٹا دیا تھا۔

اکابر کا مقامِ رضا:

حضرت سری سقطی رحمہ اللہ ایک دفعہ بیٹھے تھے، ایک شاگرد کہنے لگا: حضرت! جب سے میں آپ کو دیکھ رہا ہوں، آپ خوش خوش نظر آتے ہیں، کبھی بھی غمگین دکھائی نہیں دیتے، اس کی کیا وجہ ہے؟ آخر انسان پر کبھی غم بھی تو آتا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ غم تو تب آئے جب کوئی کام ہماری مرضی کے خلاف ہو۔ جب سب کام ہماری مرضی کے مطابق ہو رہے ہیں تو غم کس بات کا؟ اس نے کہا: ہر کام آپ کی مرضی کے مطابق کیسے ہو رہا ہے؟ کیا یہ ساری دنیا آپ کی مرضی کے مطابق چل رہی ہے؟ انہوں نے فرمایا: خدا کے بندے! دنیا میں ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے، ہم نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔ لہٰذا اب دنیا میں جو کام بھی ہو رہا ہے، وہ ایسے ہے جیسے ہماری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔

اب جو اللہ کی رضا ہے وہ ہماری رضا ہے، ''رَضِينَا بِرِضَائِهِ'' جیسا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أَللّٰهُمَّ! لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا رَادَّ لِمَا قَضَيْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ)) [كتاب الدعاء للطبراني، رقم: ٦٨٦]

اور جیسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پڑھا تھا:

((رَضِينَا بِاللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا، وَبِالْقُرْآنِ إِمَامًا وَبِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَبِيًّا))

[شرح مشكل الآثار، حديث: ١٤٧٥، بَابُ بَيَانِ مُشْكِلِ مَا رُوِيَ...]

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگا کرو:

((أَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ إِيمَانًا يُبَاشِرُ قَلْبِي، وَ يَقِينًا صَادِقًا حَتّٰى أَعْلَمَ أَنْ لَا يُصِيبُنِي إِلَّا مَا كَتَبْتَ لِي، وَرِضًا بِمَا قَسَمْتَ لِي)) [المعجم الاوسط، حديث: ٥٩٧٤]

''یا اللہ! مجھے ایسا پختہ ایمان دے دے، ایسا یقین کامل دے دے میں اس مقام تک پہنچ جاؤں، مجھے کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی جب تک تیرا حکم نہ ہو، میں تیری ہر قضا پر راضی ہو جاؤں۔''

مقامِ رضا تو اللہ والوں کا مقام ہے۔ کہاں وہ اور کہاں یہ لوگ جو شریعت سے بھی باہر ہوں، اور اسلام سے بھی باہر ہوں، قرآن وسنت سے بھی باہر ہوں، سر منڈا کر ہر آدمی قلندر بننا چاہے تو سر منڈانے سے قلندری نہیں مل جاتی، اس کے لیے تو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔



تتمہ واقعہ سابقہ:

وہ نجومی آیا اور پاگلوں کی طرح پوچھ رہا ہے کہ لوگو! مجھے بتاؤ کہ آج کوئی بچہ پیدا ہوا ہے؟ لوگوں نے کہا: تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم تو آج تک غار سے باہر نہیں نکلے اور آج دیوانوں کی طرح گلیوں میں پھر رہے ہو؟ اس نے کہا: یہ باتیں چھوڑو اور مجھے بتاؤ کہ آج کوئی بچہ پیدا ہوا ہے؟

پوچھتے پوچھتے وہ حضرت عبدالمطلب کے گھر میں آ گیا۔ ان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہاں! میرے لڑکے کے گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے، میرا لڑکا فوت ہوا ہوا ہے، یہ بچہ یتیم ہے۔ نجومی نے کہا: مہربانی کرو اور وہ بچہ مجھے دکھاؤ۔ حضرت عبدالمطلب حضور ﷺ کو لے کر آئے۔ اس نے دیکھا تو بے ہوش ہو کر گر گیا۔ جب ہوش آیا تو کہنے لگا: ہاں! اس اُمت کا نبی پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس نے جو علامات پڑھی ہوئی تھیں، وہ حضور ﷺ کے اندر منطبق تھیں۔ [سیرت حلبیہ: ۱/ ۲۲۴، ۲۲۵]

حضور ﷺ کی آمد کی بشارات اور خصوصیات:

اکثر انبیاء علیہم السلام نے حضور ﷺ کی آمد کی بشارت دی۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی بشارت دی: ﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝﴾ [الصف: ٦] کہ میرے بعد ایک رسول پیدا ہوں گے جن کا نام احمد ہوگا۔

اسی طرح کتاب تورات کے اندر باقاعدہ موجود تھا، "مَوْلِدُهٗ بِمَكَّةَ" مکہ میں پیدا ہوں گے اور یثرب کی طرف ہجرت کریں گے...... مدینہ منورہ اس وقت "یثرب" کہلاتا تھا...... اور یہ بھی باقاعدہ موجود تھا کہ حضور پاک ﷺ کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت کی علامت ہوگی۔ یہ بھی تورات میں موجود تھا کہ ہدیہ قبول کریں گے اور صدقہ قبول نہیں کریں گے، یعنی صدقہ کا مال نہیں کھائیں گے۔

اسی طرح یہ بھی موجود تھا کہ آپ اور آپ کی امت اللہ کا شکر کرنے والے ہوں گے، اور یہ بھی موجود تھا کہ آپ کی اُمت پنڈلیوں تک چادر باندھنے والی ہوگی اور وضو کرنے والی ہوگی، اور یہ بھی موجود تھا کہ آپ کی امت وقت کا بڑا خیال رکھنے والی ہوگی، تاکہ ان کی نمازیں ضائع نہ ہو جائیں۔

عہد پر چلنے کے سب پابند ہیں:

حضرت ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ﴾ [البقرۃ:۴۰] اس عہد سے دین اسلام کا عہد مراد ہے کہ اللہ نے سب بندوں کو حکم دیا تھا کہ دین اسلام پر چلو گے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۳، البقرۃ: الآیۃ: ۴۰]

عہد کی تفسیر:

حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ کا عہد یہ ہے کہ اگر تم اتباع کرو گے تو میں تمہیں جنت میں داخل کروں گا، اگر تم دین اسلام کو قائم رکھو گے تو میں تمہیں جنت نصیب کردوں گا، اور ان کو یہ بھی حکم فرمایا: صرف مجھ سے ڈرو اور کسی سے نہ ڈرو۔ اصل ڈرنا اور اصل خشیت اللہ کی ذات سے ہے، کیونکہ نفع ونقصان کا مالک وہ ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۳، البقرۃ: الآیۃ: ۴۰]

ایمان نہ لانے کے بہانے:

بنی اسرائیل کہتے تھے کہ اگر ہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں تو ہمارے معتقدین ہم سے بھاگ جائیں گے اور ہمارے نذرانے، ہمارے ہدیے، ہماری دولت یہ سب کچھ ختم ہوجائے گی اور اسی طرح بعض یہ کہتے تھے کہ اگر ہم اسلام لے آئے تو مسلمان تو پہلے سے کمزور ہیں یہ تو ہماری مدد کرنہیں سکتے، ہمیں اگر ہمارے قبائل نے یا دیگر قبائل نے نقصان پہنچایا تو کون ہماری حفاظت کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے غلط خیالات دل میں نہ رکھو، ڈرنا ہے تو صرف اللہ کی ذات سے ڈرو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جو چاہیں گے وہ کردیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے بدر میں بے سروسامانی کے باوجود مسلمانوں کو فتح دی تھی۔

ہاں! اگر ایسا ہوگیا کہ انسان اندھیرے میں ڈر گیا یا کسی درندے سے ڈر گیا تو یہ طبعی تقاضے ہیں۔ چنانچہ بندہ اچھی بات سنتا ہے تو خوش ہوجاتا ہے، کوئی خبر غلط ہو تو غمگین ہوجاتا ہے، تکلیف آئے تو واویلا کرتا ہے، اسی طرح کوئی خطرناک جانور سامنے آجائے تو ڈر جاتا ہے، یہ تو بشری تقاضا ہے۔ لیکن آیت کا مطلب یہ ہے کہ اعتقاد میں محبت بھی اللہ سے کرے اور خوف بھی اللہ کا رکھے، یعنی دل میں اللہ کا اتنا خوف ہو کہ پتہ نہیں مجھے چھوٹی سی غلطی پر مالک پکڑ لے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی رحمت سے امید بھی ہو کہ وہ کلمۂ توحید اور نیک اعمال کی وجہ سے بخش دے گا۔

﴿وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ﴾ کا مفہوم:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "مجھ سے ڈرو" کا معنی یہ ہے کہ تم جو آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے ہو تو کہیں ایسا نہ ہو کہ جیسے تمہارے آباؤ اجداد پر انکار کی وجہ سے سختی آئی، ان پر مسخ کا عذاب آیا، ان کو بندر اور خنزیر بنا ڈالا گیا، تم پر بھی وہ عذاب آجائے، اس لیے تم مجھ سے ڈرو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۳، البقرۃ: الآیۃ: ۴۰]

آیت میں ترغیب وترہیب کا مضمون:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آیت میں غور کیا جائے تو یہ ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی ہے، یعنی پہلے ترغیب تھی کہ اے بنی اسرائیل! تم میری نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کیا۔ اور ﴿وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ﴾ [البقرۃ: ۴۰] میں ترہیب ہے، کیونکہ انسان کے طبائع مختلف ہوتے ہیں، بعض طبیعتیں ترہیب کو زیادہ قبول کرتی ہیں اور بعض طبیعتیں ترغیب کو زیادہ قبول کرتی ہیں، جیسے بعض بچے ڈانٹ ڈپٹ سے کام ٹھیک کرتے ہیں اور بعض پیار کی زبان سمجھتے ہیں۔

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس میں ترغیب بھی دی ہے اور ترہیب بھی دی ہے، وعد بھی ہے اور وعید بھی ہے۔ تمام انواع پر اللہ کا قرآن مشتمل ہے، تاکہ جو لوگ عبرت پکڑنے والے ہیں وہ عبرت پکڑیں اور جو لوگ نصیحت حاصل کرنے والے ہیں، وہ نصیحت حاصل کریں۔

قرآن مقدس سے پہلے تورات، زبور، انجیل، صحائف ابراہیم علیہ السلام، صحائف موسیٰ علیہ السلام جتنی کتابیں ہیں، اللہ کا قرآن ان سب کی تصدیق کرنے والا ہے تو تم ایسی کتاب پر ایمان لے آؤ۔

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس میں اہل کتاب کو خطاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی کتابوں کے اندر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نام، آپ کی صفتیں، آپ کی شان موجود پاتے تھے تو اللہ نے فرمایا: تم ایمان لے آؤ ایسے نبی پاک پر جن کا تمہاری کتابوں کے اندر ذکر موجود ہے اور تم جانتے ہو کہ وہ سچا نبی ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ، حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کی تفسیر کی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۳، البقرۃ: الآیۃ: ۴۰]

﴿وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ ۖ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ﴾ [البقرۃ: ۴۱] اس سے مراد یہ ہے؟

کہ تم پہلا فریق اور پہلی جماعت کفر کرنے والی نہ بنو، حالانکہ تمہارے پاس علم موجود ہے جو دوسرے لوگوں کے پاس نہیں ہے۔

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تم سب سے پہلے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا کفر کرنے والے نہ بنو۔ اور ایک قول یہ ہے کہ تم اہل کتاب میں سے پہلے کافر نہ بنو۔ کیونکہ یہ سورت مدنی ہے اور یہود سے پہلے کفار مکہ کافر بن چکے تھے۔ یہود نے تورات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام صفات پڑھی ہوئی تھیں، اس لیے ان کو کہا گیا ہے کہ تم پہلے کافر نہ بنو۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۳، البقرۃ: الآیۃ: ۴۱]

اہل علم کے انکار اور اقرار کا تاثر:

اور دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی علم والا آدمی انکار کرے تو اس کے انکار کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی علم والا آدمی اقرار کرے تو اس کے اقرار کا بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ اور مدینہ منورہ میں اہل علم تھے۔ اگر وہ سارے کے سارے ایمان لے آتے تو فوراً تمام قبائل عرب مسلمان ہو جاتے، کیونکہ قبائل عرب نے ان پر نظریں ڈالی ہوئی تھیں کہ یہ کیا کرتے ہیں؟ اور انہوں نے کفر کیا تو اسلام پھیلنے میں تو کافی رکاوٹ آئی۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے راستے کھول دیئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اہل کتاب اور اہل علم ہو، تمہارے پاس تورات وانجیل ہے، تم تو پہلے کافر نہ بنو۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تَكُونُوٓا أَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهِۦ﴾ کے اندر "بِہٖ" کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے کیونکہ پہلے گزر چکا ہے: ﴿ءَامِنُوا۟ بِمَآ أَنزَلْتُ﴾۔ تو معنی ہوا کہ تم پہلے قرآن کا کفر کرنے والے نہ بنو۔ اور اسی قول کو انہوں نے ترجیح دی ہے۔

یہ دو قول ہو گئے: پہلا یہ کہ ضمیر کا مرجع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ اور یہ دونوں قول صحیح متقارب متلازمان ہیں، ان میں کوئی تضاد نہیں۔ کیونکہ جو آدمی قرآن سے کفر کرے گا تو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کفر کیا، اور جو آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کفر کرے گا تو وہ قرآن کا بھی کافر و منکر بنا۔ لہٰذا دونوں قول صحیح ہیں، ان کے اندر کوئی تضاد نہیں ہے۔

﴿وَلَا تَشْتَرُوا۟ بِـَٔايَٰتِى ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ تم قرآن کی آیات پر اس لیے ایمان نہیں لا رہے کہ ہمارا پیسہ، ہمارا عہدہ اور

ہمارے ہدیے، نذرانے چلے جائیں گے تو تم آیات اور ایمان دے رہے ہو اور پیسہ لے رہے ہو۔
[تفسیر ابن کثیر:۱/ ۸۳، البقرۃ:الآیۃ:۴۱]

قرآن وحدیث کو بھی مسلمان نہ بیچیں:

گویا کہا کہ اگر تم نے قرآن وحدیث کے بدلے میں پیسے لیے تو تم نے قرآن وحدیث کو بیچ دیا اور پیسہ لے لیا۔ اگر کوئی چیز خریدی جاتی ہے تو پیسہ نہیں خریدا جاتا۔ مقصودِ اصلی متاع ہوتا ہے، مقصودِ اصلی پیسہ نہیں ہوتا۔ تو یہاں ﴿ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ اس لیے کہا گیا کہ اس متاع کا مقصد پیسہ ہوتا ہے کہ کل کو بیچوں گا تو پیسے زیادہ بن جائیں گے۔ تو درحقیقت مقصد تو وہی حصولِ مال ہی ہے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ چند ٹکوں کے لیے تم اللہ کے قرآن کا سودا بھی نہ کرو۔

بلا طمع ہدیہ ملے تو قبول کرلو:

حدیث مبارک میں موجود ہے کہ سیدنا امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک دفعہ تشریف لا رہے تھے اور آگے آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک ہدیہ پیش کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی بڑے خلوص سے عرض کیا: الحمدللہ! میرے پاس تو اب سب کچھ ہے، یہ کسی غریب کو دے دیں، تاکہ اس کی حاجت پوری ہوجائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر! یہ ہدیہ ہے، جب تم آرہے تھے تو کیا تمہارے دل میں خیال تھا کہ میں تمہیں ہدیہ دوں گا؟ انہوں نے عرض کیا: حضور! میرے دل میں تو یہ بات نہیں تھی۔ فرمایا: اگر کوئی چیز بغیر طمع کے تمہیں مل جائے تو اس کو لے لو اور استعمال کرو، یہ رزق ہے جو اللہ نے تمہارے پاس بھیجا ہے، اس سے کیسے انکار کرتے ہو؟

"ثَمَنًا قَلِيلًا" کی تفسیر:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ "ثَمَنًا قَلِيلًا" سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ساری دنیا کو اگر اکٹھا کیا جائے تو اللہ کے دین کے مقابلہ میں متاع قلیل ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ "آیات" سے مراد وہ کتاب ہے جو اللہ نے ان کی طرف اُتاری۔ اور دنیا اور دنیا کی لذات اور شہوات سب "ثَمَن قَلِيل" میں داخل ہیں۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ثَمَنًا قَلِيلًا" کا معنی ہے کہ تم معمولی لالچ کی بناء پر اللہ کی توحید کو نہ چھپاؤ کہ پیسے ملیں گے۔ حالانکہ عزت دینے والا بھی خدا ہے اور ذلت دینے والا بھی خدا ہے۔ اگر وہ عزت نہ دے تو ساری

دنیا عزت نہیں دے سکتی، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ ذلت نہ دے تو ساری دنیا ذلت نہیں دے سکتی۔

حضرت ابوالعالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تم اللہ کے دین پر اُجرت نہ لیا کرو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۳، البقرۃ: الآیۃ: ۴۱]

تعلیم قرآن وغیرہ پر اُجرت لینا:

تعلیم قرآن اور امامت واذان کی اُجرت لینا اس آیت کے تحت داخل نہیں ہے، کیونکہ اگر ان کاموں پر اُجرت نہ لی جائے تو اس میں دین کا ضیاع ہے۔ پہلے ائمہ ان پر اُجرت لینے کو ناجائز قرار دیتے تھے، لیکن متاخرین علماء نے ان کاموں پر اُجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ البتہ قراءتِ قرآن پر اُجرت لینا بالاتفاق ناجائز ہے، کیونکہ اس پر اُجرت نہ لینے میں دین کا ضیاع نہیں ہے۔

اسی لیے میرے پاک سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدم کے بیٹے کا منہ بھرہی نہیں سکتا، قبر کی مٹی ہی بھرے گی۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۶۴۳۶، باب: ما یتقی من فتنۃ المال]

واقعہ:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی وصایا ہیں جو انہوں نے اپنے شاگرد امام ابویوسف رحمہ اللہ کو وصیتیں کی تھیں: اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اگر تم کبھی نائی کی دکان پر حجامت بنوانے کے لیے جاؤ، ریٹ اگر پانچ روپے ہو تو تم دس دیا کرو، یعنی اگر سارے پانچ روپے دیتے ہوں اور تم مولوی حجامت کرانے کے لیے جاؤ تو دس روپے دو۔ اگر تم دو روپے بھی کم دو گے تو سارا دن وہ تمہارے تمام مولویوں کا جلوس نکالتا رہے گا، اور ہر کسی کو کہتا رہے گا کہ وہ مولوی آ کر تین روپے دے کر چلا گیا ہے، یہ تو ساری دنیا کو لوٹ کر کھاتے ہیں۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: لوگوں کے اندر باتیں پھیلانے کے اڈے ہوتے ہیں۔ تم اپنے علم کی عزت کو قائم رکھو۔ کسی سے کوئی چیز خریدو تو اس کا حق مت کھاؤ، تاکہ وہ دنیا میں تمہارے خلاف باتیں نہ کر سکے۔ یہ پھر ایک عالم کی توہین نہیں ہوتی، بلکہ سب کی توہین ہوتی ہے۔ حالانکہ گناہ تو میرا ہوا تو اس میں سارے مولویوں کا کیا قصور؟

یہودیوں کی کتاب کے اندر یہ بات لکھی ہوئی ملی کہ اے آدم کے بیٹے! تم لوگوں کو علم مفت پہنچاؤ، تمہیں بھی تو میں نے مفت سکھایا ہے۔ اللہ نے جو علم دیا، کیا کوئی پیسے لیے ہیں؟ جب اللہ نے ہمیں مفت میں علم دیا ہے۔ کھانے کا، پینے کا، بولنے کا، چلنے کا کیا وہ پیسے لیتے ہیں؟ تم حق بات کھولنے میں، علم کے نشر کرنے میں اس وجہ سے تبدیلی نہ

کرو کہ کہیں ہمارا عہدہ نہ چلا جائے، یہ گدی نہ چلی جائے، ہماری سجادہ نشینی کو دھوکہ نہ لگ جائے۔ اور تم اس کے بدلے کیا یہ دنیا کی عارضی نعمتیں لے رہے ہو، جو قلیل بھی ہیں اور مٹنے والی بھی ہیں۔

جنت کی خوشبو سے محرومی:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا يُبْتَغَى بِهِ وَجْهُ اللهِ لَا يَتَعَلَّمُهُ إِلَّا لِيُصِيبَ بِهِ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ'' [ابوداؤد، حدیث: ۳۶۶۴، باب: فِي طَلَبِ الْعِلْمِ لِغَيْرِ اللهِ...]

''اگر کوئی آدمی ایسا علم حاصل کر رہا ہے جو اللہ کی رضا والا ہے، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ میں اس علم سے دنیا کے اندر کوئی بدلہ حاصل کروں گا تو اس کو قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نصیب نہیں ہوگی۔''

دَم کا معاوضہ لینا:

جمہور علماء نے بخاری شریف کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ایک آدمی کو بچھو نے کاٹ لیا تھا تو صحابی نے اس پر سورۃ فاتحہ پڑھی تھی اور اس پر اُجرت لی تھی۔[1] اور اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کی شادی کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں تو کیا قرآن ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو اتنی سورتیں پڑھا دو۔[2] لہٰذا اُجرت لینا ثابت ہوگیا۔

ایک حدیث پاک میں ہے کہ اصحابِ صفہ میں سے ایک شخص نے کسی کو قرآن پڑھایا تو اس نے آکر اس کو کمان بطور ہدیہ پیش کی کہ یہ تیر کمان لے لو۔ انہوں نے کہا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھوں گا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر چاہتے ہو کہ جہنم کی کمان تیرے گلے میں ڈالی جائے تو لے لو۔ اس نے کہا کہ میں نہیں لیتا۔

[سنن أبي داود، حديث: ۳۴۱۶، أبواب الإجارة في كسب المعلم]

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جب وہ اللہ کے لیے پڑھا چکا تھا تو بات ختم ہوگئی۔ اس کے بعد لینے کا کیا معنی ہے؟ کسی کا بیت المال سے وظیفہ مقرر نہیں ہے تو اگر اس کی باقاعدہ تنخواہ مقرر

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۲۲۷۶، باب: مَا يُعْطَى فِي الرُّقْيَةِ عَلَى أَحْيَاءِ الْعَرَبِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ]
[2] [صحیح البخاری، حدیث: ۵۰۸۷، باب: تزويج المعسر]

کر دی جائے تو یہ جائز ہے۔

تقویٰ کا معنیٰ:

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تقویٰ کا معنیٰ یہ ہے کہ تم اللہ کی اطاعت کرو اللہ کی طرف سے نور و ہدایت پر خالص اسی کے لیے۔ اور اسی طرح اللہ کے عذاب سے بچنے کے لیے گناہوں سے بچو اور خالص اس سے ڈرو، یعنی تم حق بات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات تورات میں لکھی ہوئی ہیں، ان کو نہ چھپاؤ۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۴، البقرۃ: الآیۃ: ۴۱]

مولانا تاج محمود امروٹی رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت تاج محمود امروٹی رحمہ اللہ بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں، بڑے موحد اور بڑے مجاہد تھے، سندھ کے علاقہ امروٹ کے تھے۔

ایک دفعہ بڑے بڑے علماء کا مجمع تھا، والد صاحب نور اللہ مرقدہ بھی وہیں تھے تو انہوں نے کہا کہ میں اپنے سب ساتھیوں کو ہدایت کرتا ہوں کہ تبلیغ کرو، تقریر کرو تو کوئی پیسہ نہیں لینا۔ اگر وہ ہدیہ بھی دیں تب بھی نہیں لینا۔ سب نے کہا کہ ٹھیک ہے...... حضرت اتنے بڑے عالم اور مجاہد جب بات کر رہے ہوں تو ان کے سامنے کون بات کرے؟...... والد صاحب بلوچ تھے، وہ کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے کہا: حضرت! بات سنیں! یا تو جو بزرگی آپ کے پاس ہے وہ ہمیں دے دیں، پھر ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ہدیہ بھی نہیں لیں گے۔ اگر آپ یہ نہیں دے سکتے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی اللہ کے دین پر پیسے نہیں مانگوں گا۔ ہاں! کسی نے مانگے بغیر اور بغیر نیت کے ہدیہ دیا تو وہ میں لے لوں گا۔ حضرت ہنس پڑے اور فرمایا: تم سارے مولوی چپ کر کے بیٹھے رہے، سچی بات نہیں کی، لیکن اس نے سچی بات کر دی۔ بلوچ آدمی ہے، بات کھلی تو کر دی ہے۔ اور فرمانے لگے: ہاں! اگر بغیر سوچے اور بغیر ارادے کے ملیں تو لے سکتے ہیں، جائز ہے۔ لیکن کسی سے ارادتاً نہ لو، کسی جگہ دین پہنچانے جاؤ کہ مجھے کچھ ملے گا، ایسی نیت نہ کریں۔

اللہ پاک سے دعا کریں کہ اللہ پاک ہمیں بچائے، اللہ ہمارے ساتھیوں کو بچائے اور دین کا کام کرنے کی توفیق دے۔



﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِينَ ﴿٤٣﴾﴾ [البقرۃ: ۴۲، ۴۳]

اور صحیح میں غلط مت ملاؤ اور سچ کو جان بوجھ کر مت چھپاؤ۔ اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور نماز میں جھکنے والوں کے ساتھ جھکو۔

ربط آیات:

گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کو نعمتیں یاد دلائی گئی تھیں اور اوامر و نواہی ذکر کیے گئے تھے، ان آیات میں منہیات کا ایک پہلو ذکر کیا گیا ہے۔

یہودی حق کے ساتھ باطل کو ملا دیتے تھے:

ان آیات میں دو چیزوں کے بارے میں تنبیہ کی گئی ہے: ایک یہ کہ تم حق اور باطل کو خلط ملط نہ کرو اور دوسرا یہ کہ حق کو مت چھپاؤ۔

یہودیوں سے جب کچھ لوگ سوال کرتے کہ تم اہل علم اور اہل کتاب ہو اور تورات اور انجیل اللہ کی کتابیں ہیں، کیا ان کتب میں محمد ﷺ کی صفات کا ذکر ہے؟ تو وہ کہتے کہ نہیں۔ گویا کہ انہوں نے حق کو چھپا دیا۔ اور کبھی وہ یہ کرتے تھے کہ اس آدمی کو ہم بالکل انکار تو نہیں کر سکتے کہ اس نے بھی تورات کا کچھ مطالعہ کیا ہوا ہے، یا اس کا تورات والوں سے تعلق ہے۔ چنانچہ وہ کچھ ایسی صفتیں بیان کر دیتے کہ جس سے وہ آدمی شبہات میں پڑ جائے یا ایک صفت بتا دی اور چار اپنی طرف سے ملا دیں تو اس طرح سننے والے کو بات صحیح طریقہ سے سمجھ نہ آتی تھی۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں حق اور باطل کو ملا دینا بھی جرم ہے اور حق کا چھپا دینا بھی جرم ہے۔ اس لیے دونوں سے منع فرما دیا۔

باطل فرقوں کا وطیرہ:

تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ بات واضح نظر آئے گی کہ جب بھی باطل فرقے نے دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے تو انہوں نے حق کو باطل میں ملا دیا ہے یا باطل کے اوپر حق کا ایک ملمع چڑھا دیا ہے۔ چنانچہ دیکھنے والے کو بظاہر اوپر سے حق نظر آتا ہے، لیکن اندر اس کے ایک باطل چھپا ہوا ہوتا ہے اور اس کا مقصد لوگوں کو اپنی طرف مائل کر کے گمراہ کرنا

ہوتا ہے۔جس طرح اگر کوئی ملاوٹ والی چیز یہ کہہ کر فروخت کرے کہ اس میں ملاوٹ کی گئی ہے تو ادنی عقل والا شخص بھی کبھی اس سے وہ چیز نہ خریدے گا۔اس لیے ملاوٹ کرنے والے سو فیصد خالص کا لیبل لگاتے ہیں اور بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں، اس لیے لوگ ان کے دھوکہ میں آجاتے ہیں، لیکن حقیقت اس کے خلاف ہوتی ہے۔

دیکھو! اگر کوئی آدمی بازار میں بیٹھا دودھ بیچ رہا ہو اور کوئی شخص اس کے پاس جا کر کہے کہ مجھے ایک کلو دودھ چاہیے۔جواب میں وہ کہہ دے کہ ایک کلو دودھ کی قیمت دس روپے ہے، لیکن میں ایک کلو دودھ اس شرط پر دوں گا کہ اس میں تین حصے دودھ اور ایک پاؤ پانی ہوگا اور اس کو ایک کلو دودھ شمار کروں گا۔کوئی پاگل سے پاگل بھی خریدنے کے لیے تیار نہیں ہوگا، کیونکہ وہ یہ کہے گا کہ تم عجیب آدمی ہو! میں تم سے دودھ خریدنے کے لیے آیا ہوں، پانی خریدنے کے لیے تو نہیں آیا۔تم نے دس روپے کلو دودھ کی قیمت بتائی ہے، میں دینے کے لیے تیار ہوں، لیکن یہ کون سی عقل مندی ہے کہ تجھ سے ایک پاؤ پانی انہی پیسوں میں خرید لوں، جبکہ اللہ نے پانی کی نعمت عام فرمائی ہے اور بغیر قیمت کے میسر ہے۔دوسری طرف اسی بازار میں ایک اور دکاندار آدھا دودھ اور آدھا پانی ملا کر بیچ رہا ہو تو بڑی سے بڑی عقل والا بھی خرید لے گا، پڑھا لکھا بھی خرید لے گا، اس کو عالم بھی خرید لے گا، اس کو وکیل بھی خرید لے گا اور ڈاکٹر بھی خرید لے گا، کیونکہ اس نے پانی کو دودھ میں ملا دیا ہے۔اب وہاں کھڑے ہو کر کون فیصلہ کرتا رہے کہ کتنا پانی ہے اور کتنا دودھ ہے؟ کتنی مشینیں لے کر گاہک پھرتا رہے؟ وہ کہے گا: جو کچھ ملتا ہے لے لو۔حالانکہ اس نے بھی دس روپے کلو دیا ہے۔لیکن اگر وہ پانی علیحدہ بیچنا چاہے تو کوئی لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

اسی طرح باطل فرقوں کا بھی ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ جب بھی وہ مسلمانوں کو دھوکہ دے کر انہیں گمراہ کرتے ہیں تو وہ کبھی ایسا نہیں کہتے کہ حق یہ ہے اور باطل یہ ہے اور ہم باطل کے پرستار ہیں۔وہ تو حق کو باطل کے ساتھ ملا کر دھوکہ دیتے ہیں۔

ربیع الاول کا مہینہ ہے۔ایمان سے بتائیں کہ پوری دنیا میں کون سا آدمی ایسا ہو سکتا ہے جو حضور ﷺ کا کلمہ پڑھتا ہو، حضور ﷺ کو اپنا نبی اور رہبر و رہنما مانتا ہو، خاتم الانبیاء مانتا ہو، امام الانبیاء والمرسلین مانتا ہو، سید الاولین والآخرین مانتا ہو، شفیع المذنبین مانتا ہو اور حضور پاک ﷺ کی نبوت کو قیامت تک کے لیے مانتا ہو، آپ ﷺ کی ہدایت کو تمام عالم کے لیے مانتا ہو تو وہ حضور ﷺ کی شان یا حضور ﷺ کی ولادت یا حضور ﷺ کے معجزات یا حضور ﷺ کی عظمت شان کا منکر ہو؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے، کوئی ایسا بدبخت انسان پیدا نہیں ہو سکتا کہ جسے حضور ﷺ کی ولادت پر خوشی نہ ہو، حضور ﷺ کی وفات پر غم نہ ہو، لیکن اب ایک طرف عظمتِ رسول کا پہلو ہے، ایک طرف حضور ﷺ کی شان اور عظمت ہے۔ اس کے اندر ہم نے کیا ملا دیا ہے کہ اپنی مجالس، اپنی محفلیں، بینر، جلوس، بدعات ومحدثات اور منکرات کا ایک طوفان برپا کر دیا جاتا ہے۔

دعوتِ فکر:

آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں! آپ اللہ کے کعبہ میں ہیں، آپ بالکل اپنے آپ کو کسی جماعت سے معلق نہ کریں، خالی الذہن ہو کر سوچیں! آج جو امت حضور ﷺ کی عظمت کے نام پر جھنڈیوں میں، بجلیوں میں، قمقموں میں اور سبیلیں لگانے میں جو کروڑہا روپے خرچ ہوتے ہیں، اگر میرے مدنی سرکار ﷺ زندہ ہوتے تو اس فضول خرچی کو گوارا فرما لیتے؟ جبکہ اُمتِ رسول کا یہ عالم ہے کہ پچاس ہزار مسلمانوں کی آبادی کا علاقہ ہے بوسنیا میں، صومالیہ میں، برما میں، فلسطین میں، شام میں جو تین مہینے سے بھوکا اور پیاسا ہے، وہ بھوک سے مر رہے ہیں، لیکن محض ہم اپنی دکان کو چمکانے کے لیے، اپنی پارٹی کا نام اونچا کرنے کے لیے، اپنی جماعت کے جھنڈے بلند کرنے کے لیے، حُبِ رسول کا نام لے کر قوم کو بدعات اور احداثات میں ڈال رہے ہیں۔ اس کا فیصلہ تو قیامت میں ہوگا، جب اللہ کا دربار ہوگا، حضور ﷺ موجود ہوں گے اور تمام اُمتیں سامنے کھڑی ہوں گی، پھر پتہ چلے گا کہ بدعت کا عمل کرنے والوں کی کیا سزا ہے؟ اور اتباعِ سنت کرنے والوں کا کیا مقام ہے؟

اب نتیجہ یہ نکلا کہ نام ولادتِ رسول اللہ ہے اور کام وہ کر رہے ہیں جو حضور ﷺ کی زندگی میں ثابت نہیں ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ روزہ رکھو، تو پھر روزہ رکھو، کسی نے منع نہیں کیا۔ جس کام کا حضور ﷺ نے حکم دیا ہے، اس کو کرو۔

اسی طرح دیکھو کہ سب سے زیادہ محبت کرنے والے اصحابِ رسول اللہ ہیں، ان سب سے زیادہ محبت کرنے والے اہل بیتِ رسول اللہ ہیں۔ اگر یہ باتیں دین کا جز ہوتیں یا بربناء محبت حضور ﷺ کو پسند ہوتیں تو سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مناتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، اہل بیت نبی، بناتِ رسول اللہ ﷺ اور ازواجِ رسول اللہ ﷺ جلوس نکالتے، میلاد کی محفلیں سجاتے۔ آج اگر روکا جائے تو براہِ راست طعنہ دیں گے کہ یہ رسول اللہ کے منکر ہیں، ان کے دلوں میں تو حضور ﷺ کا بغض ہے۔ اندازہ کریں کہ بات کتنی



تھی اور کہاں تک پہنچ گئی؟

اسی طرح آپ دیکھیں کہ جب یہ نعرہ لگایا جاتا ہے کہ ہم انبیاء کے غلام ہیں، کیا اس میں کوئی شک ہے؟ جو انبیاء کا غلام نہ ہو کیا وہ مسلمان ہوسکتا ہے؟ جو انبیاء کے نقشِ قدم پر نہ چلے کیا وہ مسلمان ہوسکتا ہے؟

لیکن انبیاء کے ایک خوش نما اور رنگین نعرے میں نتیجہ کیا نکلتا ہے کہ رب کی توحید کی بجائے شرک کو چھپا دیا جاتا ہے، یعنی شرک کو توحید کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ تم کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتے ہو تو موحد ہو، تم اگر جا کر قبر پر سجدہ کرتے ہو تو یہ تعظیم کا سجدہ ہے، جبکہ نماز کا سجدہ عبادت کا سجدہ ہے۔ اور بزرگوں سے مانگنے کا فلسفہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ دراصل ان بزرگوں کو اللہ نے پیدا کیا ہے، یہ بزرگ اپنے اللہ سے کہتے ہیں۔ اگر یہی بات ہندو کرے کہ جس بھگوان کو میں پوجتا ہوں اس کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے، جن پتھروں کو میں پوجتا ہوں انہیں بھی اللہ نے پیدا کیا ہے، جس گنگا اور جمنا کو میں پوجتا ہوں اس کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے اور جتنی میں نے مورتیاں بنائی ہوئی ہیں ان سب کو اللہ نے پیدا کیا ہے تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟ کیا اللہ کے نبی یہی دعوت دینے کے لیے آئے تھے؟ کیا حضور پاک ﷺ اسی دعوت کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے کہ نماز بھی پڑھ لیا کرو اور اپنے خداؤں کو سجدہ بھی کرلیا کرو؟ نماز بھی پڑھ لیا کرو اور غیر اللہ کو بھی پکار لیا کرو۔ اس لیے تو اللہ کے پیغمبر نہیں آئے۔ حُبِّ نبی میں ہم نے توحید کی مخالفت کی اور شرک کیا، اسی طرح محبتِ ولادتِ رسول میں ہم نے بدعات کو ایجاد کیا۔

اسی طرح حُبِّ علی کے نتیجے میں صحابہ سے بغض کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کا دعویٰ ہے اور حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم سے بغض، عداوت اور دشمنی ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں نے حُبِّ اصحابِ رسول اللہ کو سامنے رکھا اور اہل بیت سے عداوت کرلی۔ اس طریقہ سے حق اور باطل کو گڈمڈ کر دیا گیا۔

بناوٹی اور حقیقی مساوات:

آپ ہر مقام پر دیکھ لیں! تاجر اپنی تجارت میں جھوٹ بول رہا ہے، دکاندار اپنی دکانداری کے سودوں میں ملاوٹ کر رہا ہے، مولوی اپنے مسلکوں میں ملاوٹ کر رہا ہے، لیڈر اپنی لیڈری میں ملاوٹ کر رہا ہے، کبھی وہ کہتا ہے کہ جناب! ہمارا اصل مقصد تو مساواتِ محمدی ہے، ہم تو مساواتِ محمدی کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مساواتِ محمدی کا معنی ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو اللہ نے ایک نعمت دی ہے تو اس نعمت والے اور بغیر نعمت والے کو برابر کردیں۔ کیا مساوات



محمدی کا یہی معنی ہے کہ عورت اور مرد کو ایک کر دیا جائے؟ جاہل اور عالم کو ایک کر دیا جائے؟ باپ اور بیٹے کو ایک کر دیا جائے؟ کیا نبی اور غیر نبی برابر ہو سکتا ہے؟ کیا صحابی اور غیر صحابی برابر ہو سکتا ہے؟ کیا تابعی اور غیر تابعی برابر ہو سکتا ہے؟ کیا ایک عالم اور جاہل برابر ہو سکتا ہے؟ جبکہ اللہ نے فرما دیا: ﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ [الزمر: ۹] کہ کیا علم والے اور بغیر علم والے برابر ہو سکتے ہیں؟ اللہ نے فرمایا: یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کبھی اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتا ہے؟ اللہ نے فرما دیا: کبھی زندہ اور مردہ برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ نے فرما دیا کہ کبھی مومن اور کافر برابر نہیں ہو سکتے۔ یہ تو ایک نظامِ عالم ہے۔

بظاہر مساواتِ محمدی کا نعرہ ہے، لیکن اندر سے چاہتے ہیں کہ ڈسکو کلب قائم ہوں، ہمارے اوپر ہر قسم کے تھیٹر قائم ہوں، مَیں اور تُو کی تمیز مٹ جائے، حیا اور بے حیائی کے فلسفے ختم کر دیئے جائیں اور مرد و عورت سب برابر ہوں، بازار اور مارکیٹ میں برابر ہوں، ملازمت میں بھی برابر ہوں، سکولوں میں کالجوں میں، غرض ہر جگہ برابر ہوں، ایک طوفان بے حیائی اور عریانی کا ہو اور پوری دنیا اس میں ڈوب جائے۔

نفاذِ شریعت کے کھوکھلے نعرے:

اسی طرح بڑے بڑے نعرے لگائے جاتے ہیں کہ ہم اسلام لائیں گے۔ پتہ نہیں کون سا اسلام لائیں گے؟ ایک آدمی سے پوچھو تو کہتا ہے کہ نظامِ مصطفیٰ لایا جائے، دوسرا کہتا ہے کہ اسلام کا آئین لایا جائے، تیسرا کہتا ہے کہ نفاذِ شریعت کیا جائے اور کوئی کہتا ہے کہ آئین نفاذِ شریعت کیا جائے گا۔ ان سے پوچھو کہ یہ ساری چیزیں کیا ہیں؟ کیا نظامِ مصطفیٰ کوئی علیحدہ چیز ہے؟ اسلام کوئی علیحدہ چیز ہے؟ آئین اسلامی کوئی علیحدہ چیز ہے؟ اسلامی آئین کوئی علیحدہ چیز ہے؟ نفاذِ شریعت کوئی علیحدہ چیز ہے؟ وجہ کیا ہے کہ ہمیں بظاہر اتنے خوش نما نعرے دینے کے بعد اپنے گھر والوں میں اسلام نہیں ہے؟ ان کی اپنی چار دیواری کے اندر بھی اسلام نہیں ہے، ان کے اپنے بیٹوں کے اندر بھی اسلام نہیں ہے، اپنی بیٹیوں کے اندر بھی اسلام نہیں ہے۔ اب ایک آدمی اگر نفاذِ اسلام کا نعرہ لگائے اور دھمال ڈال کر اس کا استقبال کیا جائے، ایک آدمی اسلام کا نعرہ دے اور اس کا استقبال بھنگڑا ناچ کر کیا جائے، کیا وہی بھنگڑے والا اسلام لائے گا؟ اور وہی دھمال والا اسلام لائے گا؟ ایک آدمی اسلام کا نعرہ لگائے اور قوالیوں کے ذریعہ اسلام لائے گا۔

یہ اصل میں حق اور باطل کو ملا دیا جاتا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر حق کی پہچان نہیں رہتی۔ اگر ایک

یاقوت کا نگینہ ہو، ایک زمرد کا نگینہ ہو یا ایک مرجان کا نگینہ ہو اور اسی رنگ کے شیشوں کے اندر ڈال دیا جائے یا مثلاً جیسے آج کل ایک اصلی ہیرا ہوتا ہے اور ایک اسی کی طرح آرٹیفشل چیزیں بن رہی ہیں، اگر ہم ان کو آپس میں ملا دیں تو اصلی کی پہچان بڑی مشکل ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے کوئی جوہری مشینیں لگا کر دیکھ لے یا وہ پہچاننے کا کوئی طریقہ جانتا ہو، اس کو رگڑ کر پہچان لے یا اسے آگ پر ڈال کر پہچان لے، ورنہ عام آدمی تو دھوکہ کھا جائے گا۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ سرخ رنگ کے شیشے کو ''یاقوت'' سمجھ کر خرید لے گا، ایک سرخ رنگ کی چیز کو ''مرجان'' سمجھ کر خرید لے گا اور ایک سبز قسم کے شیشے کو ''زمرد'' سمجھ کر خرید لے گا اور اسی طرح باہر کے بنے ہوئے نقلی قسم کے پتھر کو وہ ''ہیرا'' سمجھ کر خرید لے گا۔

یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں اسلام کا نام تو لیا جاتا ہے، لیکن اسلام کہیں ملتا نہیں ہے۔ اسلام کا نعرہ لگایا جاتا ہے، لیکن اسلام نافذ نہیں ہے۔ اسلام سے محبت کا اظہار کیا جاتا ہے، لیکن اسلام ہمیں ملتا نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے خانقاہوں کے رنگ میں اسلام کو ختم کر دیا ہے، بعض لوگوں نے اپنے جلسے اور جلوسوں کے ذریعے لوگوں کو دھوکے میں ڈالا ہوا ہے اور بعض لوگوں نے اسلام کے لیبل لگا کر اندر اتنے بھیانک کام کیے ہوئے ہیں کہ آدمی کو سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔

تیری دنیا کو بہت غور سے دیکھا میں نے:

کسی شاعر نے بڑی عجیب رباعی لکھی تھی!! بڑی مدت سے میری نظر سے گزری۔ اس نے لکھا:

مسجدوں ، مندروں ، گرجاؤں ، کلیساؤں میں
نورِ ایمان کے اُجالے میں اندھیرے میں

بظاہر مندر بنائے ہوئے ہیں، کسی نے کلیسا بنایا ہوا ہے اور کسی نے ہسپتال بنائے ہوئے ہیں، مشنری کے تابع ہیں کہ وہ عیسائی ادارے ہیں، لیکن ان کے در پردہ زنا کے اڈے ہیں، اسمگلنگ کے اڈے ہیں، چوری کے اڈے ہیں، جاسوسی کے اڈے ہیں، کیا کیا بُرائی وہاں نہیں ہوتی؟

اسی طرح کتنے لوگ ہیں جو بظاہر مسجدوں کا نام لیتے ہیں لیکن مقصد پیٹ پالنا ہوتا ہے، مقصد چندہ کر کے زندگی گزارنا ہوتا ہے اور کتنے لوگ ہیں جو مسجدوں میں منہ کالا کرتے ہوئے پکڑے گئے؟ کتنے لوگ ہیں جنہوں نے

مسجدوں کے اندر اللہ کے حکم کی خلاف ورزیاں کی ہیں؟ کتنے لوگ ہیں جو مسجدوں میں بیٹھ کر لوگوں کو غلط فتوے دیتے ہیں؟ اور کتنے لوگ ہیں جو مسجدوں میں بیٹھ کر اللہ کی توحید کی بجائے شرک و بدعت کا پرچار کرتے ہیں؟ حضور ﷺ کی سنت کی بجائے شرک و بدعت کے علمبردار بنتے ہیں۔ اور شاعر نے آگے کہا:

مولوی ، پادری ، پنڈتوں کے حسین روپ میں
ظالم و جابر و سفاک لٹیرے دیکھے
یارب! تیری دنیا کو بہت غور سے دیکھا مَیں نے

بظاہر دیکھیں تو وہ قوم کے لیڈر ہیں اور جناب قوم کی ہمدردی میں بے چاروں کو نیند نہیں آتی ,لیکن اندر مقصود قوم کو لوٹنا ہے۔

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ لہٰذا حق کو باطل میں نہ ملاؤ۔ حق کو حق رہنے دو اور باطل کو باطل رہنے دو۔

﴿وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝﴾ اور تم حق کو چھپاتے ہو، تمہاری تورات و انجیل میں حضور ﷺ کی تمام صفات مذکور ہیں اور تم ان کو چھپاتے ہو۔

تورات میں حضور ﷺ کی آمد اور صفات کا ذکر:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک دن حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: اے عبداللہ بن سلام! میں ایک بات پوچھتا ہوں۔ اب تو تم ...... الحمدللہ! ...... مسلمان ہو گئے، ہمارے بھائی بن گئے اور اسلام والے بن گئے ,لیکن یہ بتاؤ کہ اسلام لانے سے پہلے اور کلمۂ نبوت پڑھنے سے پہلے تم اپنے تورات کے علم کے مطابق حضور ﷺ پاک کو جانتے تھے کہ حضرت محمد (ﷺ) واقعی اللہ کے سچے نبی ہیں؟ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کتنا پیارا جواب دیا!! کہنے لگے: امیر المومنین! خدا کی قسم ہے! ہمیں اپنے بیٹے کے اندر تو شبہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا بیٹا نہ ہو، خدا جانے میری عورت نے خیانت کی ہو...... کیونکہ اولاد کے بارے میں ایک عورت کی گواہی ہے، اس پر اعتماد ہوتا ہے کہ اس نے بُرائی نہیں کی ہوگی، اس کے علاوہ میرے پاس کوئی گواہ تو نہیں ہیں، زیادہ سے زیادہ بعد میں یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اولاد کی شکل باپ سے ملتی ہے، تمہاری بھی شکل کسی اور بندے سے مل سکتی ہے، بڑی سے بڑی یہ شہادت ہو سکتی تھی کہ بلڈ ملتا ہے اور اب بلڈ کا ماننا کوئی گواہی نہیں رہا، کیونکہ اب دنیا کی جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ماں اور باپ اور بیٹے کا گروپ ایک ہو، بلکہ ان کے اندر بھی اختلاف ہو سکتا ہے...... حضرت عبداللہ بن

سلام رضی اللہ عنہ نے کہا: امیر المومنین! ہمیں اپنے بیٹے میں تو شبہ ہو سکتا ہے، لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہے، کیونکہ ان کی گواہی اللہ نے تورات میں دی ہے، ان کی صفتوں کا ذکر تو رب العالمین نے کیا ہے۔

[روح المعاني: ٢/٥٢، البقرة: الآية: الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ]

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے قرآن پاک میں فرمایا: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرة: ١٤٦] کہ وہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولادوں کو پہچانتے ہوں۔ ایک آدمی کا بیٹا دور سے بھی آرہا ہو تو وہ پہچان لیتا ہے کہ میرا بیٹا آرہا ہے، اگرچہ چہرہ بھی نہ دیکھے۔ اس کی چال سے بھی اس کو پہچان لیتا ہے، بیٹے کے قد و قامت سے بھی پہچان لیتا ہے اور بیٹے کو آواز سے بھی پہچان لیتا ہے۔

تو اللہ نے فرمایا کہ یہ جانتے ہیں لیکن حق کو چھپا دیتے ہیں، جب ان سے پوچھا جاتا ہے تو مسئلہ گول کر جاتے ہیں۔

یہودیوں کا سنگسار کرنے کا حکم چھپانا:

یہود کی ایک عورت سے زنا ہو گیا۔ انہوں نے سوچا کہ ہم اس کا فیصلہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جاتے ہیں، یہود کے بڑے خاندان کی عورت ہے اور پھر مسلمان بھی نہیں ہے، شاید ہمیں کوئی رعایت دے دیں۔ اس وجہ سے ہماری عورت بچ جائے گی، ورنہ تورات میں تو زنا کی سزا سنگسار کرنا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب اس عورت کا مقدمہ لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سوچ لو، تم یہودی ہو، میرے مذہب پر ایمان نہیں رکھتے ہو، لیکن اگر تم نے مجھ سے فیصلہ کرانا ہے "فَأَحْكُمُ بِهِ مَا حَكَمَ اللّٰهُ" تو پھر میں وہی فیصلہ کروں گا جو اللہ کا فیصلہ ہوگا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا! اب تم یہ بتلاؤ کہ اگر کسی آدمی سے زنا ہو جائے تو تمہارے دین اور مذہب میں اس کیا سزا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہماری کتابوں میں تو بس اتنا ہے کہ اس کو دو چار دُرّے مار لو یا اس کا منہ کالا کر دو اور اس کو گدھے پر بٹھا کر اس کو گلیوں میں پھراؤ، تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ یہ بڑا ذلیل آدمی ہے، اس نے ایسی حرکت کی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تمہاری شریعت کا فیصلہ نہیں ہے، تم جھوٹ بول رہے ہو۔ انہوں نے کہا: جناب! ہماری کتاب میں بالکل یہی فیصلہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ان کو چیلنج کریں کہ تم تورات لے آؤ، ہم تمہاری کتاب میں دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا فیصلہ ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم کچھ کہہ رہے ہیں اور تم کچھ کہہ رہے ہو، اگر تم اپنے

دعویٰ میں سچے ہو تو کتاب لے آؤ۔ انہوں نے کہا کہ ہم ادھر کیوں لے آئیں؟ ایسا کریں کہ آپ ہمارے پاس آجائیں...... ایک اُصولی بات ہے کہ جب ایسا معاملہ ہو تو باطل ہمیشہ بہانے بناتا ہے...... حضور ﷺ نے فرمایا: چلو میں تمہارے پاس آتا ہوں۔

اللہ کا نبی سچا ہو تو سچ کو کبھی آنچ نہیں آتی، لیکن باطل کہے گا کہ میں چل کر نہیں آؤں گا، آدھا تم چل کر آؤ اور آدھا ہم چل کر آئیں گے، درمیان میں بیٹھ کر بات کریں گے۔ یہ دراصل صرف ایک چکر ہوتا ہے، ورنہ جو حق والا ہے، وہ کہتا ہے: مجھے جہاں لے جانا ہے لے جاؤ، مکہ میں بھی حق بات کہنی ہے اور مدینہ میں بھی حق بات کہنی ہے۔ میں نے کفر کے دیار میں بھی حق بات کہنی ہے۔

بہر حال کتاب تورات منگوائی گئی۔ پہلے تو انہوں نے تورات لانے میں دیر لگادی۔ پھر جب لے آئے تو ان کے بڑے نے چالاکی یہ کی کہ تورات کی جس آیت میں زنا کی سزا لکھی ہوئی تھی، اس پر ہاتھ رکھ لیا اور آگے پیچھے پڑھنا شروع کر دیا۔ اور کہا کہ اس میں کہیں رجم کا تذکرہ نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تورات کے حافظ تھے، انہوں نے کہا: اپنا ہاتھ اُٹھاؤ۔ جب اس نے ہاتھ اُٹھایا تو آیت رجم اس کے نیچے موجود تھی۔

[صحيح البخاري، حديث: ۶۸۱۹، باب: الرَّجْمِ فِي البَلَاطِ]

آج کل بھی یہ ہوتا ہے کہ کوئی بڑا آدمی کسی مولوی کے پاس جا کر مسئلہ پوچھے تو وہ بھی حق کو چھپا دیتا ہے، اس لیے کہ کہیں یہ بڑا آدمی مجھ سے ناراض نہ ہو جائے یا میرے جو وظیفے ہیں وہ بند نہ ہو جائیں۔ یعنی اگر کوئی بات دین کی بھی ہو گی تو ہیرا پھیری کریں گے۔ یہ تو یہودیوں کی عادت تھی۔

یہودیوں کو امر و نہی کرنے کا کیا فائدہ؟

بنی اسرائیل کے لوگ خواہ یہود ہوں یا نصاریٰ وہ حضور ﷺ پر ایمان ہی نہیں لائے اور قرآن کو نہیں مانتے تو ان کو آیات کے ذریعہ امر اور نہی کرنے کا کیا فائدہ ہوگا؟ علماء نے اس کے دو جواب دیئے ہیں:

پہلا جواب: یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمام مخلوق کے خالق ہیں، چاہے وہ مسلمان ہوں یا کافر ہوں، یہودی ہوں یا نصرانی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں اللہ کی مخلوق نہیں ہوں یا میں اللہ کا بندہ نہیں ہوں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں کو حکم دیتے ہیں کہ تم ایسا کرو اور ایسا نہ کرو۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ جو ایمان والے ہیں وہ اسے مان لیتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ اس پر ایمان نہیں لے آتے، لیکن اللہ نے عام خطاب کر کے سب کے لیے وضاحت کر دی

ہے، کیونکہ اللہ نے قرآن اور نبی ﷺ کو ساری مخلوق کے لیے بھیجا ہے۔(اس سے علماء نے ایک مسئلہ مستنبط فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نہ ماننے والوں کو اُصول کے ساتھ فروعات کا بھی حکم دیتے ہیں)۔

دوسرا جواب: اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب سے پہلے ان کو اپنی نعمتیں یاد دلائیں، پھر جب وہ ایمان نہ لائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات میں یہ حکم دیا کہ اگر تم ایمان نہیں لے آتے تو کم از کم حق اور باطل کو تو نہ ملاؤ۔حق کو حق بتلاؤ اور باطل کو باطل بتلاؤ اور حق کو نہ چھپاؤ۔ اگر تم ایسا کرو گے تو دوسرے لوگ بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

مفسرین کا ضابطہ ہے:''اَلْعِبْرَةُ لِعُمُوْمِ اللَّفْظِ لَا بِخُصُوْصِ السَّبَبِ'' کہ آیت اگرچہ ایک سبب خاص میں نازل ہوئی ہو، لیکن اس کا حکم قیامت تک عام ہوتا ہے۔تو پھر ان آیات میں اگرچہ بنو اسرائیل کو مخاطب کر کے حق کو باطل سے خلط ملط کرنے اور کتمانِ حق سے روکا گیا ہے، لیکن یہ حکم قیامت تک کے آنے والے ہر اس شخص کے لیے ہے جو حق کو باطل سے ملاتا اور حق کو چھپاتا ہے۔

کیا خدا دوسروں کی بات ماننے پر مجبور ہے؟

اللہ کو جو نہ مانے، بھلا وہ بھی مسلمان ہے؟ اللہ وحدہ لاشریک ہے، یہ صفت اسی کی ہونی چاہیے، نفع ونقصان کا مالک اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، روزی دینے والا اللہ ہے، بچے دینے والا اللہ ہے، موت وحیات کا خالق ومالک اللہ ہے، انبیاء کو پیدا کرنے والا خدا ہے۔ یہاں خدا کا بھی کوئی انکار کرسکتا ہے؟ لیکن بہر حال یہ بھی اللہ کے پیارے لوگ ہیں، ان کی اللہ تک بڑی پہنچ ہے، خدا ان کی بات کو رد نہیں کرسکتا، یہ اپنی بات زبردستی منوا لیتے ہیں۔اب آدمی اُلجھن میں پڑ گیا کہ اللہ کا نام بھی لے رہا ہے اور اللہ کے پیاروں کو اللہ کی ذات میں اتنا مؤثر اور قوت والا بنا رہا ہے کہ اللہ ان کی بات کو رد کر ہی نہیں سکتا۔ جب کسی کی بات کو کوئی نہ ٹال سکے تو وہ کمزور ہوا۔مثلاً ایک آدمی ایسا ہے کہ آپ اس کی بات کو رد نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کمزور ہیں اور وہ آپ پر حاوی ہے یا آپ کی کوئی مجبوری اس کو پتہ ہے، ورنہ وہ آپ کی مجبوری ظاہر کردے گا۔اس لیے وہ جو بات بھی کرے، آپ اس کی بات کو مان لیتے ہیں، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے ان پیاروں کی بات کو رد ہی نہیں کر سکتے تو پھر وہ خدا کیسے ہوئے؟ آدمی جب قرآن میں پڑھتا ہے کہ نوح علیہ السلام نے بیٹے کے لیے دعا مانگی تو خدا نے رد کردی تو وہ حیران ہو جاتا ہے کہ عجیب بات ہے! اِدھر تو نبی کی نہیں مانی اور اُدھر یہ کہتے ہیں کہ پیروں کی خدا رد نہیں کرسکتا۔اب اس آدمی کے دماغ میں ایک ہلچل مچ گئی۔ اگر وہ اس کو سیدھا مسئلہ بتا دیتا کہ بھائی! نفع ونقصان کا مالک اللہ ہے، اللہ کے نبی بڑی شان

والے ہیں، اللہ کے ولی بھی بڑی شان والے ہیں، وہ اللہ سے مانگتے ہیں۔ اللہ چاہے تو دے دیتا ہے، اللہ نہ چاہے تو نہیں دیتا۔

ایک سیدھی سی بات اس کو سمجھ آجاتی کہ نفع ونقصان کا خالق حقیقی اللہ ہے، نذر و نیاز کا مستحق اللہ ہے، عبادت کے لائق اللہ ہے، مانگنے کا، قربانیوں کا، استغاثہ کا لائق اللہ ہے۔ بھائی! اللہ نے اپنے انبیاء کو بڑی شان دی ہے، لیکن اللہ کے نبی بھی اللہ کے بندے ہیں، اللہ کی مخلوق ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے محتاج ہیں، اللہ تعالیٰ سے مانگنے والے ہیں اور جتنے صحابہ ہیں، اولیاء ہیں، سب اللہ کی مخلوق ہیں، سب اللہ سے مانگنے والے ہیں۔ اب چونکہ یہ مخلوق ہیں اور وہ خالق ہے، یہ مملوک ہیں وہ مالک ہے۔ اگر مالک کی مرضی آئے تو مان لے، نہ آئے تو نہ مانے۔

کتمانِ حق کی ایک اور صورت:

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی نے آکر مسئلہ پوچھا کہ داڑھی کٹانا صغیرہ گناہ ہے یا کبیرہ؟ تو دیکھا کہ سامنے بادشاہ بیٹھا ہے، کوئی وزیر بیٹھا ہے یا بہت بڑا افسر بیٹھا ہے جس سے مجھے نقصان پہنچ سکتا ہے تو مصیبت کو ٹالنے کے لیے کہہ دیتا ہے کہ میں اس مسئلے پر کچھ زیادہ مطالعہ نہیں کر سکا، بعد میں دیکھ کر آپ کو بتا دوں گا۔ یہ بھی کتمانِ حق ہے۔ جب پتہ ہے کہ نبی کی مخالفت ہے، حضور ﷺ کی سنت اور شکل مبارک کی مخالفت ہے، اگر اس کو چھوٹا گناہ بھی مانیں تو بار بار کرنے سے وہ خود بخود بڑا ہو جاتا ہے۔ چھوٹے گناہ کا کیا معنی؟ چھوٹا تو تب ہوا جب پہلی دفعہ کوئی غلطی کرے گا، لیکن جو آدمی روزانہ اسی گناہ کو دوہرا رہا ہے تو پھر وہ چھوٹا کیسے رہا؟ سیدھی بات کریں کہ گناہ کبیرہ ہے اور اس کا منڈانے والا فاسق اور فاجر ہے، اس کی اذان ٹھیک نہیں، اس کی نماز ٹھیک نہیں، اس کی امامت ٹھیک نہیں۔ آپ کھلی بات بتا دیں، تاکہ دوسرا آدمی اس گناہ سے بچے۔ اور اگر اس کو اندھیرے میں ڈال دیں گے تو وہ اُلجھن میں مبتلا رہے گا۔

کسی نے آدمی نے پوچھ لیا کہ یہ جو گیارہویں شریف کرتے ہیں، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کہا: بہر حال پہلے زمانے میں تھی تو نہیں، لیکن کوئی حرج بھی نہیں، خیرات ہی ہے۔ چونکہ یہ پیرانِ پیر کی ہے اور وہ حضور ﷺ کے زمانہ کے بعد میں پیدا ہوئے، اس لیے قرآن وحدیث میں بھی اس کا کوئی حکم نہیں۔ لیکن خیرات ہے، بزرگوں کے نام پر غریبوں کو دودھ مل جاتا ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟ ویسے بہر حال قرآن وحدیث میں نہیں ہے۔ اب آدمی اُلجھن میں پڑ گیا۔ اس نے سوچا کہ چلو قرآن وحدیث میں اس کا حکم نہ بھی ہو تو کوئی بات نہیں، کام تو

اچھا ہے۔ اگر وہ سیدھی بات کر دیتا کہ اس طرح دن کا معین کرنا، یہ گیارہویں کی رات کی تعیین کرنا بندوں کے اختیار میں نہیں، دن یا رات کی تعیین کا حق تو صرف میرے اللہ کو ہے، وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ لیلۃ القدر ہے، یہ دس ذی الحجہ کی رات ہے، یہ نو کا دن ہے، یہ منیٰ میں دس، گیارہ، بارہ کے دن ہیں، یہ رمضان کا مہینہ ہے، یہ عیدین کے دن ہیں۔ بندے اگر کوئی دن متعین کریں تو یہ بالکل دین کے خلاف ہے اور پھر جب ہم اس کی غیر اللہ کی طرف نسبت کر دیتے ہیں تو اس وجہ سے بھی حرام ہو جاتا ہے۔ اس کو چاہیے تھا کہ ایک سیدھی بات کہہ دیتا کہ اللہ کے بندے! خیرات اللہ کے نام پر ہوتی ہے۔

اب اگلا بندہ کہے گا: جناب! میں تو اللہ کے نام پر کرتا ہوں، پیر کو تو ثواب پہنچاتا ہوں۔ اس سے کوئی پوچھے کہ پورا مہینہ ثواب نہیں ہوتا؟ صرف گیارہویں کی رات کو ثواب ہوتا ہے؟ یہ بڑا اچھا ثواب ہے جو گیارہ کی رات میں ہی مخصوص ہے، نہ دس کو ثواب ہوتا ہے، نہ بارہ کو ہوتا ہے اور نہ تیرہ کو ہوتا ہے۔

اس لیے یہ نہ سمجھا کرو کہ یہ حکم یہودیوں کے لیے ہے اور ہمارے لیے نہیں ہے۔ ہمارے لیے بھی اور قیامت تک آنے والے ہر بندے کے لیے ہے کہ کبھی حق کو باطل میں نہ ملاؤ۔ لوگوں نے اس لیے دھوکہ کھایا کہ حق کو باطل میں ملا دیا اور اس پر حق کا پردہ چڑھا دیا اور اس کے اندر باطل کو چھپا دیا۔ بڑے بڑے عقلمند اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس اُلجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مرزا قادیانی کے جھوٹے دعوے:

مرزا قادیانی نے دعویٰ نبوت کیا، آپ اس کی ساری کتابیں دیکھیں، کبھی وہ آپ کو ایک عالم دین کے روپ میں نظر آئے گا، کبھی وہ آپ کو ایک مصلح کے روپ میں نظر آئے گا کہ لوگوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے، کبھی وہ آپ کو عیسائیوں کا سب سے بڑا دشمن دکھائی دے گا کہ اس کی پوری زندگی مناظرے کرتے ہوئے گزر گئی، پھر کبھی وہ مجتہد بن کر مسائل میں اجتہاد کرتا نظر آئے گا، کبھی آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے آپ کو مجدد کے مرتبہ پر لے گیا ہے، کبھی اپنے آپ کو مہدی کے مرتبہ پر لے گیا ہے، کبھی اپنے آپ کو عیسیٰ بن مریم کہلوانے کے درپے ہے اور آخر میں نظر آئے گا کہ وہ نبوت کے دروازے پر آ گیا، بلکہ اپنے آپ کو اور زیادہ افضل کر گیا۔ اس طرح حق کو باطل سے ملاتے ملاتے جب لوگ اس کے معتقد ہو گئے تو اس نے انہیں گمراہی میں ڈال دیا۔



ورقہ بن نوفل کے سچ کا اظہار:

بی بی سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں...... ورقہ بن نوفل پرانی کتابیں پڑھنے والا آدمی تھا......اس نے فوراً کہا: خدیجہ! تمہیں مبارک ہو، یہ مجھے وہی فرشتہ معلوم ہوتا ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اُترتا تھا اور وہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اُترا ہے۔ اس نے سچی بات کہہ دی، حق بات کا اظہار کر دیا۔ اسی لیے اگر کسی میں کوئی اچھی عادت ہے تو آپ کھل کر اس کا اعتراف کریں۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۳، باب: بدء الوحي]

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے ایک مرتبہ میرے آقا کی خدمت میں آئے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا بہت احترام فرمایا، آپ نے ایک ''وسادۃ'' (تکیہ) منگوایا......حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کوئی قالین، غالیچے اور صوفے تو تھے نہیں......اور فرمایا: تم اوپر بیٹھو۔ اتنا احترام کیا۔ لیکن وہ سرہانے پر نہیں بیٹھا، بلکہ اُتر کر بیٹھ گیا کہ حضور! یہ ناممکن ہے کہ میں آپ کے سامنے کسی اونچی جگہ پر بیٹھوں۔ ٹھیک ہے میں مہمان ہوں، آپ نے تکریم کی ہے، آپ نے احترامِ ضیف کا حق ادا کر دیا ہے، لیکن میں یہ جرأت کیسے کر سکتا ہوں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے خود اونچی جگہ پر بیٹھوں اور اللہ کے نبی نیچی جگہ پر بیٹھیں۔ میں بالکل عام لوگوں کے ساتھ مٹی پر بیٹھوں گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں تم ان لوگوں میں سے ہو جن کے دلوں میں تکبر نہیں ہوتا۔

[سیرۃ ابن ھشام: ۲/۵۸۰، قُدُومُ عَدِيٍّ عَلَى الرَّسُولِ وَإِسْلَامُهُ]

دیکھیں! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدھی بات کہہ دی، حالانکہ اس وقت وہ دشمن اسلام تھا، لیکن سچی بات جو ہے وہ سچی بات ہے۔

حضرت ثمامہ بن اُثال رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

ثمامہ بن اُثال نجد کے علاقے کا بہادر آدمی تھا، گرفتار ہو گیا، صحابہ اس کو پکڑ کر لے آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ اسے مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دو۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اپنے امور سے فارغ ہوئے اور آپ اس کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ہاں! کیا خیال ہے تمہارا؟ اب تم کیا چاہتے ہو؟......آپ غور کریں کہ ایک شخص کافر و مشرک ہے، قیدی ہے اور اسے پتہ ہے کہ اب مجھے مدینہ منورہ میں کوئی چھڑانے والا نہیں ہے۔ میں مسلمانوں کے قبضہ میں

ہوں، حضور (ﷺ) اشارہ فرمائیں تو میری گردن اُڑ جائے گی...... اس کے باوجود بھی وہ کہنے لگا: اگر آپ مجھے قتل کرتے ہیں تو کر دیں، لیکن آپ بھی ایک ایسے آدمی کو قتل کریں گے جس کا بدلہ لینے والا اس کا قبیلہ موجود ہے، میں کوئی گرا پڑا آدمی نہیں ہوں۔ اور اگر آپ مجھے معاف کر دیں تو آپ ایک مرد کو معاف کریں گے جو احسان کا بدلہ دینا جانتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں کافر ہوں، لیکن ایک مرد آدمی ہوں۔ اگر آپ مجھ پر احسان کریں گے تو میں احسان کو بھولوں گا نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اس کو اپنے حال پر رہنے دو۔ چنانچہ اسے پیشاب وغیرہ کے لیے کھول دیتے، کھانا پانی بھی دے دیتے اور پھر باندھ دیتے۔

جب ایک دن گزر گیا تو پھر حضور ﷺ نے پوچھا: بتاؤ اب کس نتیجہ پر پہنچے ہو؟ اس نے کہا: میری تو وہی بات ہے۔ قتل کرو گے تو بدلہ لیا جائے گا، چھوڑ دو گے تو احسان کا بدلہ دوں گا، کافر رہوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا اس کو بندھا رہنے دو۔ جب تین دن گزر گئے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ تین دن ہو گئے ہیں، اب تم سوچ کر بات کرو۔ تم جانتے ہو کہ اس وقت تمہیں کوئی چھڑانے والا نہیں۔ اس نے کہا: مجھے پتہ ہے کہ کوئی چھڑانے والا نہیں، لیکن میں اپنی اسی بات پر کھڑا ہوں۔ آپ نے احسان کرنا ہے تو کریں، مجھے موقع ملا تو میں آپ کے احسان کا بدلہ دوں گا۔ اور اگر آپ نے قتل کرنا ہے تو دیر کا ہے کی؟ قتل کر دیں، میرا بھی قبیلہ ہے، میری قوم بدلہ لے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: چلو ہم احسان کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس کو چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر گزری تو غسل کر کے حاضر ہو گیا اور عرض کیا: حضور! مجھے کلمہ پڑھا دیں۔ تین دن جو آپ نے یہاں رکھا ہے، اصل میں مجھے اسلام سمجھ آ گیا ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ۴۳۷۲، باب: وَفْدِ بَنِي حَنِيفَةَ، وَحَدِيثُ ثُمَامَةَ بْنِ...]

اب دیکھیں! ایک کافر جو مسلمانوں کی قید میں تھا، اس نے بھی جھوٹ نہیں بولا، بلکہ سیدھی بات کر دی۔

سراقہ بن مالک کا واقعہ:

ہجرت والی رات جب میرے سرکارِ مدینہ، رحمتِ دو جہان ﷺ جا رہے تھے، سراقہ بن مالک جو حضور ﷺ کے قتل کرنے کا اتنا شوق رکھتا تھا کہ جب اس کو خبر ملی تو اس نے اپنی نوکرانی سے کہا: میرا گھوڑا چپکے سے لے کر فلاں جگہ کھڑا کر دو، میں گھر کے دروازے سے نہیں نکلتا، بلکہ گھر کی پچھلی دیوار کو پھاند کر جاؤں گا، تاکہ اور لوگوں کو پتہ نہ چلے۔ میں جا کر حضور ﷺ کو پکڑ دوں گا اور پھر مجھے انعام میں سو اونٹ ملیں گے۔

بہر حال لمبا واقعہ ہے۔ مختصر یہ کہ اس نے حضور اکرم ﷺ کو دیکھ لیا اور کفار کو خبر کرنا چاہی تو اس کا گھوڑا زمین

میں دھنس گیا۔ اس وقت کہنے لگا کہ میں سمجھ گیا ہوں، یہ آپ کی بددعا کا اثر ہے، ورنہ میرا گھوڑا ایسا نہیں کہ زمین میں دھنس جائے۔ جب تک آپ مجھے معافی نہ دیں مجھے نجات نہیں مل سکتی، آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں بھی وعدہ کرتا ہوں کہ اس راستہ سے آپ کے دشمنوں کو پیچھے نہیں آنے دوں گا۔ میں اپنے کفر پر ہوں، لیکن یہ میرا وعدہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اچھا! ہم بھی تمہیں ایک خوشخبری دیتے ہیں، ایک مبارکباد دیتے ہیں کہ ایک وقت آئے گا جب کسریٰ بادشاہ کے کنگن تمہارے ہاتھوں میں ہوں گے۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ اپنے سفر پر دوبارہ سے روانہ ہو گئے۔

حضور ﷺ کو تلاش کر کے پکڑنے کے لیے مکہ والوں کے قافلے اونٹوں اور گھوڑوں پر دوڑ رہے تھے اور ادھر سراقہ راستے میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب بھی کوئی اس کے پاس سے گزرنے لگتا تو یہ اس سے پوچھتا: ہاں بھائی! کہاں جا رہے ہو؟ وہ کہتا: محمد اور ابوبکر کی تلاش کے لیے نکلے ہیں، یہ ان کو کہتا کہ اس راستے سے میں نے ان کو بڑا دیکھ لیا ہے، اس راستے پر نہیں، تم کسی اور راستہ پر تلاش کرو۔ یعنی اپنے وعدے پر قائم رہا، وعدہ خلافی نہیں کی۔ ایک آدمی کو بھی حضور ﷺ کے تعاقب میں نہیں جانے دیا۔ سب کے سب واپس آ گئے کہ جب سراقہ سردار کہہ رہا ہے تو ٹھیک ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٣٦١٥، باب: علامات النبوة في الإسلام]

ہمیشہ کے لیے یہ حکم ہے کہ جب بھی کوئی بات کرو تو صاف صاف کرو۔ یہ اگر مگر، چونکہ چنانچہ، اوپر نیچے ملا جلا کر دھوکہ دینے والی باتیں نہ کرو۔ ایک آدمی مسئلہ پوچھتا ہے، اگر مسئلہ صحیح جانتے ہو تو اس کو بتا دو اور اگر نہیں جانتے تو کہہ دو کہ میں نہیں جانتا۔ اسی طرح اگر کوئی دنیاوی معاملہ ہے تو جو حق بات ہے، وہ کرو، حق اور باطل کو خلط ملط نہ کرو۔ یہ حکم صرف یہودیوں کے لیے نہیں تھا، یہ ہم سب کے لیے ہے اور قیامت تک اس حکم پر قائم رہنا چاہیے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی یہی فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حق کو باطل کے ساتھ اور صدق کو کذب کے ساتھ خلط نہ کرو۔

حضرت ابوالعالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تم حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم سب اُمتِ محمدیہ کو صحیح معنوں میں نصیحت کرو اور صحیح بات بتلاؤ۔ [تفسیر ابن کثیر: ١/ ٨٣، البقرۃ: الآیۃ: ٤٢]

پسندیدہ دین......صرف اسلام:

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ [آل عمران: ١٩] اور دوسرے مقام پر

فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ [آل عمران: ۸۵] اگر کوئی اسلام کے خلاف کسی دین کا دعویٰ کرے تو اللہ ہرگز قبول نہیں فرمائیں گے۔ لہٰذا اگر کوئی یہ کہے کہ میں تو یہودیت پر رہوں گا، یا کوئی کہے کہ میں نصرانیت پر رہوں گا تو اللہ کے ہاں اس کا دین قبول نہیں ہوگا، کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے بھی میری نبوت کا سنا اور مجھ پر ایمان نہ لے آیا تو وہ کفر پر مرے گا۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۰، باب: وُجُوبُ الْإِيمَانِ أَهْلِ الْكِتَابِ بِرِسَالَةِ الْإِسْلَامِ]

اس لیے اللہ نے فرمایا کہ تم یہ نہ کرو کہ یہودیت کو اسلام سے ملادو، نصرانیت کو اسلام سے ملادو کہ اسلام میں بھی تو یہی توحید، رسالت، آخرت کا حکم ہے اور نصرانیت میں بھی یہی باتیں تھیں اور یہودیت میں بھی، تمہیں بھی حکم ہے کہ ذبح کر کے کھایا کرو اور ہم بھی ذبح کر کے کھاتے ہیں، تمہیں بھی حکم ہے کہ عورت سے نکاح کرو اور ہم بھی نکاح کرتے ہیں، تم آخرت پر یقین رکھتے ہو اور ہم بھی آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور تم بھی خدا کی وحدانیت کے قائل ہو اور ہم بھی خدا کی وحدانیت کے قائل ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کا بیٹا ہے۔ خدا مانتے ہیں تو بیٹا مانتے ہیں۔ خدا نہ مانیں تو بیٹا کیسے مانیں؟ پہلے باپ مانیں گے تو پھر بیٹا بھی مانیں گے۔ تو یہ چیزیں خلط ملط کرنے والی ہیں۔ فرمایا کہ سیدھی بات کرو۔

دھوکہ کی محبت سے عداوت اچھی:

اللہ کی وحدانیت کا معنی یہ ہے کہ اَحَد بھی وہ ہے، صَمَد بھی وہ ہے، لَمْ يَلِدْ بھی وہ ہے، وَ لَمْ يُوْلَدْ بھی وہ ہے۔ یہ نہیں کہ تم واحد بھی مان لو اور بیٹا بھی مان لو۔ یہ نہیں ہے کہ تم واحد بھی مان لو اور بیوی بھی بنا ڈالو۔ یہ نہیں ہے کہ تم واحد بھی مانو اور فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بنا دو۔ یہ نہیں ہے کہ تم اللہ کو وحدہ لاشریک بھی مان لو اور قبروں پر جا کر سجدے بھی کر لو۔ سیدھی بات ہے اسلام پر سیدھے سیدھے چلو، ورنہ بالکل علیحدہ ہٹ جاؤ، تاکہ اسلام کے نام کلنک کا ٹیکہ نہ بنو۔ اس لیے کسی نے کہا تھا:

بگڑی ہوئی عقل سے حماقت اچھی
اور دھوکہ کی محبت سے عداوت اچھی

دوغلی پالیسی (منافقت):

ہمارے ایک دوست ہیں...... میں ان کا نام تو نہیں لیتا۔ وہ بڑے زمیندار ہیں...... وہ مجھے ملنے کے لیے آئے تو میں

نے ان سے ان کے ایک رشتہ دار کے بارے میں پوچھا کہ فلاں صاحب کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا کہ ٹھیک ہیں۔ میں نے کہا کہ ان کے علاقے میں شیعہ سنی کا کوئی جھگڑا ہوا تھا تو اس کا کیا بنا؟ اس نے کہا: کی صاحب! آپ شیعہ سنی کی بات کرتے ہیں، شکر کریں! ہمارے ہاں یہودی نصرانی نہیں، وگرنہ خان صاحب تو ان کے ساتھ بھی بنا کر رکھتے۔ ان کے پاس جو آجائے وہ ان کے ساتھ ہیں۔ دن کو اِس کے ساتھ ہیں تو رات کو اُس کے ساتھ ہیں۔ وہ تو سب سے بڑے منافق ہیں۔

اعمال کی حکمرانی:

میرے پاس کافی سارے لوگ آتے ہیں جو کہتے ہیں کہ دعا کریں، ہمارے ملک میں اچھے لوگ آجائیں۔ میں کہتا ہوں: خدا کے بندے! ایک بات یاد رکھو! جیسے ہم ہوں گے ویسے ہمارے اوپر لوگ ہوں گے۔

ایک موٹی بات یاد رکھو! ہم مکھن نکالتے ہیں تو جیسے دودھ ہوگا ویسے مکھن نکلے گا۔ اگر دودھ بھینس کا ہوگا تو مکھن ویسا نکلے گا، اگر گائے کا ہوگا تو ایسا نکلے گا، بکری کا ہوگا تو ویسے نکلے گا اور اگر دودھ زہریلا ہوگا تو مکھن اور زیادہ زہر والا ہوگا، کیونکہ مکھن تو دودھ کا خلاصہ ہوتا ہے۔ اگر وہ زہر پہلے ایک مَن دودھ میں پھیلا ہوا تھا اور اب ایک کلو مکھن میں آجائے گا۔ جب تک ہم خود ٹھیک نہیں ہوں گے ہمارے اوپر والے کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ اوپر والے ہم میں سے آتے ہیں اور تو کوئی جنس نہیں ہے۔ وہ بھی ہمارے اندر سے نکلتے ہیں۔ جب ہمارے اندر زہر ہے تو مکھن کے اندر بھی زہر ہی آئے گی۔ جب ہم بُرے ہوں گے تو ہم پر بدترین حکمران آئیں گے، جب ہم اچھے ہوں گے تو ہم پر بہترین حکمران آئیں گے۔

آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کا زمانہ دیکھ لیں! ایک سے بڑھ کر ایک آتا رہا، کیونکہ پورا معاشرہ خیر کا تھا، پورے معاشرے میں دین تھا، پورے معاشرے میں اسلام تھا۔ جب ہمارے اپنے اندر دین باقی نہیں رہا تو دین والوں کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایں خیال است و محال است و جنوں

یہ تو بس ایک مجنونوں والی بات ہے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ﴾ یعنی یہودیت اور نصرانیت تمہاری گھڑی ہوئی چیز ہے، اس کا اللہ تبارک وتعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ﴿وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ [البقرة:۴۲] کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو حکم دیا کہ تم حق کو نہ چھپاؤ، تمہارے پاس معرفت اور علم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت اور نبوت ورسالت اور صداقت کو جانتے ہو کہ تمہارے پاس تورات ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری صفتیں لکھی ہوئی ہیں، اس کے باوجود تم حق کو چھپا رہے ہو، ایسا نہ کرو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۴، البقرة: الآية: ۴۲]

کتمانِ حق:

﴿وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ﴾ حضرت مجاہد رحمہ اللہ، حضرت سدی رحمہ اللہ، حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور ربیع بن انس کا ایک قول یہ بھی ہے کہ تم حق کو چھپاتے ہو، یعنی تمہیں پتہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی اور پیغمبر ہیں اور تم تورات میں ان کی صفتیں پڑھ چکے ہو، لیکن تم چھپا رہے ہو۔ یا منصوب ہے، اس کو پچھلی آیت کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو بہر حال ترجمہ یہ ہوگا: "لَا تَجْمَعُوْا بَيْنَ هٰذَا وَ بَيْنَ هٰذَا" کہ تم ایسا نہ کرو کہ حق کو باطل کے ساتھ بھی ملاؤ اور حق کو چھپاؤ بھی۔ یعنی نہ یہ کرو اور نہ یہ کرو۔ جیسے محاوراتِ عرب میں بھی آتا ہے کہ "لَا تَأْكُلِ السَّمَكَ وَ تَشْرَبَ اللَّبَنَ" نہ کھاؤ مچھلی اور نہ پیو دودھ، یعنی مچھلی کھا کر دودھ نہ پیو۔

علامہ زمخشری کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ﴿تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ﴾ ہے۔ دراصل یہ آیتِ مبارک کئی مقام پر آئی ہے، ایک جگہ پر ﴿تَكْتُمُوْنَ﴾ کا لفظ بھی آتا ہے تو مصحف عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ میں بھی قراءت ﴿وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ﴾ آئی ہے۔ اس قراءت میں یہ جملہ حالیہ ہونے کی بناء پر منصوب ہوگا تو معنی ہوگا: "فِي حَالِ كِتْمَانِكُمُ الْحَقَّ" یعنی اس حال میں کہ تم حق کو چھپا رہے ہو اور تم جانتے بھی ہو کہ حق کیا ہے۔ ﴿وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ اور تم جانتے ہو کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے نبی ہیں، ان کی نبوت اور رسالت حق ہے، اور تم جانتے ہو کہ حق چھپانے میں کتنا بڑا نقصان ہے کہ لوگ ایمان سے محروم ہو جائیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے لیے عذابِ جہنم دائمی ہو جائے گا۔ تم حق چھپا کر لوگوں کو جہنم کی طرف جانے والے راستے پر ڈال رہے ہو اور تم اس بات کو جانتے بھی ہو۔

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِينَ﴾ [البقرة: ۴۳] اللہ نے ان کو حکم دیا کہ نماز قائم کرو۔ یعنی تم

حضور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھو اور تم زکوۃ بھی حضور ﷺ کو پہنچاؤ، تاکہ حضور ﷺ اسے مستحقین زکوۃ پر تقسیم کریں اور حضور اکرم ﷺ کے بعد زکوۃ کے مصارف میں خرچ کرو۔ اور تم رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ، یعنی اُمتِ محمد ﷺ کے ساتھ جماعت میں ملو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۴، البقرۃ: الآیۃ: ۴۲]

زکوۃ و تزکیہ میں مناسبت:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے کہ زکوۃ کا معنی یہ ہے کہ تم خالص اللہ کی اطاعت کرو، اپنا تزکیۂ نفس کرو۔ ''زکوۃ'' کا لفظ جیسے مال کے لیے استعمال ہوتا ہے اسی طرح تزکیۂ نفس کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے ﴿وَ یُزَکِّیۡهِمۡ﴾۔ ''تزکیہ'' کا اصل معنی ہوتا ہے: خالص کرنا، پاک کرنا۔ آدمی جب اپنے مال کی زکوۃ نکالتا ہے تو وہ اپنے مال کو پاک کر دیتا ہے، اسی طرح جب آدمی اپنے بدن کا تزکیہ کرتا ہے تو اسے گناہوں اور بُری عادتوں سے پاک صاف کر دیتا ہے۔ اس لیے اس کو ''تزکیہ'' کہا جاتا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۴، البقرۃ: الآیۃ: ۴۲]

زکوۃ کے بعض احکام:

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ جب زکوۃ کا حکم دیا گیا ہے تو کس چیز میں زکوۃ ادا ہوگی؟ انہوں نے فرمایا: دو سو یا دو سو سے اوپر۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۴، البقرۃ: الآیۃ: ۴۲]

اس زمانہ میں دراہم اور دینار ہوتے تھے اور زیادہ تر مال مویشی بکریاں، بھیڑیں اونٹ وغیرہ تھے۔ دورِ حاضر میں تقریباً ہر چیز پر زکوۃ ہوتی ہے کہ وزن دیکھا جاتا ہے سونا اور چاندی سے۔ اصل میں اسلام کا منشاء یہ ہے کہ آدمی اپنے معاملات کو سونے اور چاندی سے کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً میں نے آپ سے دس تولہ سونا لیا تو اب آپ کو دس تولہ سونا ہی دینا ہے۔ اس میں کسی کا بھی نقصان نہیں ہوتا، جبکہ پیسوں کے معاملہ میں تو بڑا نقصان ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی نے آج سے دس سال پہلے آپ کو دس ہزار روپے دینے تھے اور آج وہ آپ کو دس ہزار روپے دے دے تو دس سال پہلے کے دس ہزار آج کے ڈیڑھ لاکھ کے برابر ہوں گے تو آپ کو نقصان ہوگا، اس لیے کہ آج روپے کی وہ حیثیت نہیں ہے جو دس سال پہلے تھی، کیونکہ پیسہ، روپیہ گر گیا۔ لیکن سونا اور چاندی ایک ٹھوس دھات ہیں، اس کا جو اصل ہے وہ قائم رہتا ہے۔ اصل شریعت کا حکم یہ تھا کہ سونا اور چاندی کو سامنے رکھا جائے۔

اس لیے اب بھی فقہاء اسی بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ آدمی کا اگر نکاح ہے تو وہ حق المہر میں سونا چاندی دے۔ یعنی جو مقرر کر رہا ہے، دے رہا ہے یا آئندہ دے گا تو وہ کہے کہ میں دس تولہ سونا دوں گا، میں سو تولہ چاندی دوں گا، ورنہ اگر اس نے کہا کہ میں پچاس ہزار روپیہ اپنی بیوی کو حق المہر دوں گا۔ اگر آج سے پچیس سال پہلے اس کا نکاح ہوا تھا تو آج پچاس ہزار کی قیمت پانچ ہزار کے برابر ہوگی تو ایسا کرنے سے اس عورت کا سارا سرمایہ ہی ڈوب جائے گا۔

کرنسی کیسے ایجاد ہوئی؟

لیکن بعد میں اتنے وزن کا اُٹھانا اور اُسے لے جانا آدمی کے لیے مشکلات کا باعث بننے لگا تو اس کا حل یہ نکالا گیا کہ کاغذ کے نوٹ چھپ گئے، مگر اس میں یہ ذمہ داری ہوتی تھی کہ اگر ایک ملک ایک ارب روپے کے نوٹ چھاپتا ہے تو اس کے پاس ایک ارب کی قیمت کے برابر سونا موجود ہو۔

ہمارا پیسہ کیوں گر جاتا ہے؟ اس کی یہی وجہ ہوتی ہے کہ ہمارے سونے کی سکیورٹی کم ہے اور ہم نوٹ چھاپتے چلے جا رہے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس کاغذ کے ٹکڑے کو خرید کر کیا کریں گے؟ اس لیے وہ آہستہ آہستہ گرتے گرتے اپنی موت مر جاتا ہے۔ چونکہ اس کی اصل سکیورٹی سونا ہے، اگر ہم نے سونا ایک ارب کے برابر رکھا ہے اور نوٹ دو ارب کے چھاپ دیئے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمارا نوٹ خود بخود پچاس پیسے کا ہو جائے گا۔ اگلے لوگ اسی سونے کو سامنے رکھ کر ہمارے روپے کی قیمت لگائیں گے کہ ان کا سونا ہمارے پاس ایک ارب روپے کا پڑا ہے اور نوٹ ان کا دو ارب کا گردش کر رہا ہے، اس کا مطلب ہے کہ اب ان کے پیسے کی قیمت آٹھ آنے کے برابر ہے۔ اسی طرح جب ہم چار ارب پر چلے جائیں تو چار آنے کے برابر رہ جائے گا۔

وجوبِ زکوٰۃ کا ضابطہ:

یاد رکھیں کہ اسلام کا ایک اصول اور ضابطہ ہے کہ اگر آدمی کے پاس ساڑھے سات تولے سونا یا ساڑھے سات تولے سونے کی قیمت کے برابر پیسے ہیں یا ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کے برابر پیسے ہیں تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ مثال کے طور پر: اگر پانچ سو ریال تولہ ہے تو ساڑھے سات تولہ سونے کی قیمت جتنی بنے گی، اس پر زکوٰۃ لاگو ہوگی۔



زکوۃ کی ادائیگی کا طریقہ:

اور پھر زکوۃ دینے کا آسان طریقہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے پاس جتنا پیسے ہیں ان کو جمع کر کے حساب کرلیں اور اس میں آپ کی رہائش، کھانا پینا، آپ کے ہتھیار، آپ کے اوزار، آپ کی سواری وغیرہ سب نکالیں، ان میں زکوۃ نہیں ہوتی، یہ اللہ نے آپ کو معاف کی ہیں۔ جس مکان میں آپ رہتے ہیں یا آپ کے بچے رہتے ہیں چاہے آپ نے وہ مکان دس لاکھ ریال میں خریدا ہے، اس پر کوئی زکوۃ نہیں ہے۔ آپ نے اگر ایک ورکشاپ بنایا ہوا ہے، آپ کے پاس اوزار ہیں وہ چاہے دو لاکھ کے ہوں اور آپ انہی اوزار سے تو کمار ہے ہیں، اسلام نے اس لیے ان میں رعایت دی ہے۔ اسی طرح آپ کے بیوی، بچوں اور گھر کا نفقہ خرچہ سارا نکالنے کے بعد جو حاصل منافع آپ کے پاس بچتا ہے اور جس پر سال بھی گزر چکا ہے، آپ پر صرف اس کی زکوۃ واجب ہے اور وہ بھی صرف اڑھائی فیصد ہے۔

ہاں! اس وقت یہ معاملہ ذرا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک کاروباری آدمی ہر مہینے کا حساب کیسے رکھے؟ مثلاً: ایک دن کسی شخص کی دکان میں ایک لاکھ کا سرمایہ تھا، دوسرے دن اس نے کپڑا خرید لیا تو اس کا سرمایہ فوراً دو لاکھ کا ہو گیا اور دس دن کے بعد اس کا سرمایہ آدھا بک گیا اور آدھا رہ گیا۔ مہینے کے بعد اس نے مزید چار لاکھ کا کپڑا لے کر ڈال دیا۔ اس صورت حال میں زکوۃ کی ادائیگی کے لیے حساب کتاب کیسے ہوگا؟ یہ بات سمجھ لیں کہ جب کوئی آدمی زکوۃ کے نصاب کا مالک ہوتا ہے تو اس وقت سے سال پورا ہونے پر اس سال کی زکوۃ فرض ہوتی ہے۔ درمیان میں اگر مال گھٹتا بڑھتا رہے تو اسی کو سال کے اندر شمار کرلے، اس لیے کہ ہر مہینے کا الگ حساب لگانا مشکل ہو جائے گا۔ کیونکہ ایک مال پر محرم میں سال پورا ہوگا تو دوسرے مال پر صفر میں پورا ہوگا۔ اس لیے سال میں ایک مہینہ معین کرلیں۔ مثلاً: آپ کہتے ہیں کہ میں تو رمضان میں زکوۃ ادا کروں گا یا محرم میں ادا کروں گا یا ذی الحجہ میں ادا کروں گا، تاکہ مجھے زیادہ ثواب ملے۔ تو آپ اسی مہینہ میں حساب کریں، جو خالص نفع تمہارے پاس آئے، اس کی قیمت لگا کر آپ اڑھائی فیصد زکوۃ ادا کریں۔

بعض لوگوں کو یہ مغالطہ بھی ہوتا ہے کہ چونکہ ساڑھے سات تولہ سونے پر زکوۃ ہے، اور میرے پاس ساڑھے دس تولہ سونا ہو گیا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اوپر جو تین تولے ہیں، ان کی ہم نے زکوۃ دینی ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ

ساڑھے سات تولے کے بعد جب ہم صاحبِ نصاب بن گئے۔ اس کے بعد اگر ہمارے پاس ساڑھے دس تولے سونا آ گیا تو اب ہم فقط ساڑھے سات تولہ کے بعد حاصل ہونے والے سونے کی زکوٰۃ نہیں دیں گے، بلکہ پورے ساڑھے دس تولہ کی زکوٰۃ دیں گے۔

باقی جو صدقات ہیں، وہ تو انسان سال میں جب چاہے کرتا رہے اور جتنی اللہ تبارک وتعالیٰ توفیق عطا فرمائے، وہ کرتا رہے۔ وہ صدقاتِ نافلہ ہیں، لیکن زکوٰۃ اللہ کی طرف سے فرض ہے، جیسے نماز اور روزہ فرض ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر آج بھی دنیا صحیح معنوں میں زکوٰۃ دے اور صحیح لوگوں کو دے۔ ایسا نہ ہو جیسے ہمارے ہاں زکوٰۃ چلتی ہے کہ بعض مدرسے ہیں...... اللہ معاف فرمائے اور دعا کریں اللہ مجھے بچائے اور ہر مسلمان کو بچائے......

کہ ان کا فقط بورڈ لگا ہوتا ہے، اندر کوئی مدرسہ نہیں ہوتا۔ دو کمرے بنائے ہوتے ہیں، اوپر ایک بڑا بورڈ لگا ہوا ہے جس پر مدرسے کا نام لکھا ہوتا ہے۔ مہتمم نے ایک حافظ بھی رکھا ہوا ہوتا ہے، ہزار روپے مہینہ اس کو تنخواہ دیتا ہے، وہ آٹھ دس بچے لے کر بیٹھ جاتا ہے، گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ وہ بچے پڑھتے ہیں اور پھر گھر بھاگ جاتے ہیں۔ نہ روٹی کا مسئلہ اور نہ کسی اور چیز کا مسئلہ، وہ تو بستی کے بچے ہوتے ہیں۔ اب مقامی لوگوں سے جھوٹی سفارشیں کرا کر زکوٰۃ حاصل کرتا ہے کہ اس کے پاس اتنے مدرس ہیں اور دو سو بچے ہیں اور کھانے پینے کا انتظام ہے۔

حکومت کی طرف سے ایک لاکھ روپے اس کی زکوٰۃ منظور ہو جاتی ہے۔ اب جب وہ زکوٰۃ لینے کے لیے جاتا ہے تو آگے کلرک اور افسر بیٹھے ہوتے ہیں جنہوں نے چیک پاس کرنے ہوتے ہیں، ان کو بھی پتہ ہوتا ہے کہ اس کا کوئی مدرسہ نہیں ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں: مولوی صاحب! ہم آپ کے مدرسہ کو جانتے ہیں، ہم نے آپ کی رپورٹس دیکھی ہوئی ہیں، ہم نے آپ کا مدرسہ بھی دیکھا ہوا ہے، لہٰذا مہربانی کر کے بیس فیصد ہمیں دے دو اور باقی سارا لے جاؤ۔ اگر ہمیں بیس ہزار نہیں دیتے تو بھاگ جاؤ۔ موقع پر آئیں گے، انکوائری کریں گے کہ تمہارا مدرسہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ وہ بھی سمجھتا ہے کہ میں نے کیا کرنا ہے۔ چنانچہ ان سے کہتا ہے: ٹھیک ہے بیس ہزار آپ رکھیں، اسی ہزار مجھے دے دیں۔ اسی ہزار اس بے ایمان کو مل جاتے ہیں، جس نے ''گزران العلوم'' بنایا ہوا ہے، ان میں سے دس ہزار اس نے مدرسہ کو دے دیئے اور ستر ہزار جیب میں ڈال لیے۔ مونچھوں کو تیل لگایا، گلے میں سبز کپڑا ڈالا، لوگوں نے دیکھا تو کہا: حضرت صاحب آ گئے!!! کتنا آسان کام ہے۔

یاد رکھیں! جب تک زکوٰۃ صحیح بندے کو نہ دی جائے، ادا نہیں ہوتی۔ چنانچہ اگر آپ نے ایک آدمی کو زکوٰۃ دے

دی کہ بھائی! یہ میری طرف سے تقسیم کر دو۔ بعد میں اس نے تقسیم نہ کی تو آپ کے ذمہ سے ادا نہیں ہوگی۔ ایک تو وہ لینے والا گناہ گار ہوگا کہ اس نے بے ایمانی کی اور زکوٰۃ کا پیسہ کھایا، دوسرا تمہاری بھی زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔ مشکل دونوں پر ہے۔

اسلام نے کتنا اچھا اصول بنایا ہے کہ ہر آدمی اپنی زکوٰۃ کا خود حساب کرے۔ اور اللہ نے فرمایا: سب سے پہلے اپنے غریب رشتہ داروں کو دو۔ ہر آدمی کو اپنے رشتہ داروں کا پتہ ہوتا ہے کہ میری بہن غریب ہے، میری چچازاد، میری پھوپھی زاد بہن غریب ہیں۔ اگر...... خدا رحمت کرے...... تیرے رشتہ داروں میں کوئی غریب نہیں ہے تو اپنے محلے کے غریبوں کو دو۔ دور والوں کو تو نہیں، البتہ آدمی اپنے محلے میں تو جانتا ہی ہے کہ فلاں شخص غریب ہے۔ اگر محلے میں بھی کوئی نہیں تو اپنے شہر والوں کو دو۔ شہر والوں میں بھی کوئی غریب نہیں تو قریب کے شہر والے کو زکوٰۃ دو۔

وہاں بھی کوئی نہیں تو پھر بہتر حل یہ ہوتا ہے کہ جو دین کے صحیح مدرسے ہیں، ان میں جمع کرا دو...... کیونکہ یہ بھی نہیں کہ ساری دنیا جھوٹ بول رہی ہے...... بڑے بہترین مدارس بھی قائم ہیں جن کے اندر...... ماشاء اللہ!...... اللہ کی رحمت ہے، ہزار ہزار، دو دو ہزار طلبہ پڑھ رہے ہیں، آپ انکھوں سے جا کر دیکھ لیں کہ کون سا مدرسہ صحیح طریقہ سے چل رہا ہے؟ جو صحیح چل رہا ہو تو سمجھو کہ یہ خرچ بھی صحیح کر رہا ہے۔ کیونکہ جس ادارے میں زکوٰۃ کی رقم صحیح مصرف میں خرچ نہ ہو تو وہ قائم نہیں رہ سکتا۔

یہ لوگ بھی صحیح مصرف میں خرچ کرتے ہیں اور ان کو پتہ ہوتا ہے کہ مد زکوٰۃ کو ہم نے کہاں خرچ کرنا ہے۔ وہ زکوٰۃ کے پیسوں سے اپنے مدرسین کو تنخواہ نہیں دے سکتے، زکوٰۃ کے پیسوں سے مدرسے کی تعمیر نہیں کر سکتے، زکوٰۃ کے پیسوں سے مسجد نہیں بنا سکتے، زکوٰۃ کے پیسوں سے مسجد کے اندر کوئی قالین، غالیچے نہیں ڈال سکتے۔ تو جو صحیح مدرسے والے لوگ ہیں وہ زکوٰۃ کے پیسوں کو علیحدہ رکھتے ہیں، زکوٰۃ کو مطبخ میں بچوں کے کھانے پر خرچ کرتے ہیں، بچوں کے کپڑوں اور وظائف پر خرچ کرتے ہیں۔

زکوٰۃ کی تملیک کا حیلہ:

بعض مدرسہ والوں نے تو بڑا اچھا انتظام کیا ہے...... اللہ ان علماء کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے اور اللہ ہمیں ان کے طریقوں پر چلنے کی توفیق دے...... انہوں نے زکوٰۃ کے خرچ کرنے کا ایک بڑا اچھا حل نکالا ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے ہر طالب علم کے لیے چار سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو چار سو روپے اس

طالب علم کو پکڑا دیتے ہیں، اس طرح زکوٰۃ دینے والے کی زکوٰۃ صحیح ادا ہوگئی۔

اب مدرسہ بے چارا کہاں سے خرچ کرے؟ مدرسے بھی تو غریب ہوتے ہیں، ان کی آمدنی بھی یہی زکوٰۃ ہوتی ہے، صدقات ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مطبخ کا خرچہ چار سو روپے رکھا ہوا ہے۔ طالب علم کو چار سو روپے دے دیئے اور اس کو کہہ دیا کہ تم نے مطبخ سے کھانا ہے تو وہاں جا کر چار سو روپے جمع کرواؤ۔ اس نے ادھر سے لے لیے تو مالک بن گیا اور مطبخ میں جا کر جمع کرا دیئے۔ بندہ حلال کا بھی کھاتا رہا اور مدرسہ بھی چلتا رہا۔ زکوٰۃ بھی صحیح ادا ہوگئی، کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے کسی کو مالک بنانا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً: میں نے ہزار روپے زکوٰۃ نکالی ہے تو مجھ پر لازم ہے کہ میں کسی کو اس کا مالک بناؤں، وہ ان پیسوں کو اپنے قبضے میں لے اور پھر اپنی مرضی سے خرچ کرے، تب جا کر یہ زکوٰۃ ادا ہوتی ہے۔

بعض مدرسوں والے پہلے یہ کرتے تھے کہ طالب علم کو دو سو دے دیئے کہ یہ زکوٰۃ کے ہیں، لے لو اور اس کے بعد اس کو کہا کہ جلدی کرو، ادھر رکھو، اپنا مہینے کا خرچ مدرسے میں جمع کراؤ۔

یہ بڑا اچھا طریقہ ہے کہ کھانے کی قیمت معین کردی جائے۔ لڑکے کو آپ نے ماہانہ وظیفہ دے دیا، لڑکا ان پیسوں کا مالک بن گیا۔ وہ آپ کے مطبخ سے کھانا نہیں کھانا چاہتا تو نہ کھائے۔ بعض لڑکے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں مدرسہ کے مطبخ سے نہیں کھانا ہے، لہٰذا وہ پیسے جمع نہ کرائے، نہ اس کو کارڈ ملے گا اور نہ کھانا ملے گا۔ جہاں سے اس کی مرضی آئے، جا کر کھالے۔

زکوٰۃ کے مستحقین:

زکوٰۃ کے مستحقین معین ہیں، ان مستحقین کے علاوہ کسی جگہ خرچ نہیں کی جاسکتی۔ اللہ نے قرآن میں حصر کردیا ہے کہ زکوٰۃ صرف ان لوگوں پر خرچ ہوسکتی ہے جو فقیر ہیں، جو مسکین ہیں، اسی طرح جن کو ڈیوٹی پر لگایا ہوا ہے کہ زکوٰۃ وصول کرو یا ایسے لوگ جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوتے ہیں، اگر ان کے پاس پیسہ نہیں ہے تو ان کی تالیف قلب کے لیے ان کو زکوٰۃ دیں۔ وہ یہ تو نہ سمجھیں کہ ہم نے اچھا مذہب قبول کیا کہ روٹی بھی نہیں ملتی، کھانا بھی نہیں ملتا۔ اسی طرح کسی آدمی کی گردن پھنسی ہوئی ہے، مثلاً اس سے ایکسیڈنٹ ہوگیا، اس نے دیت بھرنی ہے تو اس کو چھڑائیں۔ یا کوئی غلام ہے آزاد ہونا چاہتا ہے تو اس کو چھڑائیں۔ کوئی آدمی قرضوں میں جکڑا ہوا ہے آپ اس کو قرضہ سے چھڑانے کے لیے زکوٰۃ دیں، زکوٰۃ کے پیسے کا اس کو مالک بنائیں، یعنی وہ لے لے، اب اس کی جو

مرضی آئے وہ کرے۔

ہمارے ہاں بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ کسی غریب رشتہ دار کو زکوٰۃ کے پیسے دے کر حج پر بلا لیتے ہیں...... ہمارے یہاں مکہ مکرمہ میں رہنے والوں میں یہ بڑی مصیبت پھیلی ہوئی ہے......وہ کہتے ہیں کہ مثلاً میری بہن غریب ہے اور میں اس کو حج کرانا چاہتا ہوں اور میرے پاس زکوٰۃ کے پیسے ہیں۔اب مثلاً چالیس ہزار روپے میں داخلہ ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں ان کو چالیس ہزار کا ڈرافٹ بھیج دیتا ہوں یا میں اس کو پارسل کر دیتا ہوں، تاکہ میری بہن حج کر لے۔

اللہ کے بندے! جب چالیس ہزار تم نے اس کو دے دیا تو وہ خود زکوٰۃ دینے والی بن گئی۔اس کے پاس تو اتنا پیسہ آ گیا کہ وہ صاحب نصاب بن گئی۔اور پھر تمہارا یہ شرط لگانا بھی صحیح نہیں کہ میں زکوٰۃ دوں گا، اور تم یہ پیسے حج میں لگاؤ۔تمہارا کام یہ تھا کہ تم اس کو زکوٰۃ کے پیسے بھیج دو، وہ اپنے ہاتھ میں لے لے۔اس کے بعد اگر اللہ کی توفیق سے وہ جہاں خرچ کرے، اس پر کوئی پابندی نہیں۔

اپنی زکوٰۃ دو بھی اور اس کو ضائع بھی نہ کرو۔سب سے پہلے یہ کام کرو کہ اپنے غریب رشتہ داروں کی ایک فہرست بنا کر اپنے پاس رکھ لو اور سال کے بعد جب اللہ تمہیں توفیق دے تو باقاعدہ زکوٰۃ ان کے پاس بھیجو اور ان کو مالک بناؤ۔ اور ان سے کہو کہ اب تمہاری مرضی ہے، ان پیسوں کو جہاں خرچ کرو، ہماری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔ہم نے تو زکوٰۃ دینی تھی، وہ آپ کو دے دی۔اور اس کے علاوہ جو صحیح دینی مدارس ہیں، وہاں بھی زکوٰۃ لگائی جا سکتی ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ زکوٰۃ فریضہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے اور زکوٰۃ اور نماز نہ ہو تو باقی تمہارے کسی عمل کے قبول ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۴، البقرۃ: الآیۃ: ۴۳]

ربیع الاول میں عمرہ کا اہتمام:

اب دیکھا نہیں کہ ربیع الاول میں عمرے پر بڑا زور ہے، گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔کیا ہے کہ حضور پاک ﷺ کے میلاد مبارک کا مہینہ ہے۔اگر کوئی پوچھے کہ حضور پاک ﷺ نے جو نماز کا حکم دیا ہے وہ کب پڑھیں گے؟ تو جواب ملتا ہے: بس جی! اس کے لیے دعا کریں۔

حضور اکرم ﷺ کی محبت ہے تو سنت کی اتباع کرو:

بھائی! حضور پاک ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری سنت کے مطابق شکل بناؤ، سنت کے مطابق کھاؤ، سنت کے مطابق پیو۔ اگر تمہیں حضور پاکِ ﷺ کی ولادت سے محبت ہے تو حضور ﷺ کی اتباع کرو، حضور ﷺ کے حکم پر چلو، حضور ﷺ کے دین اسلام کا جو مشن ہے اسے زندہ رکھو، قائم رکھو۔ جھنڈیاں لگانے سے تو دین نہیں آجاتا۔ یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے کہ اس مہینے میں آپ پورا زور لگا دیں اور اس کے بعد نماز غائب، روزہ غائب۔ ایک رات تو تم کھڑے ہو جاؤ کہ آج حضور ﷺ کی پیدائش کے مہینے کی رات ہے اور پیدائش والا دن ہے، آج تو سو نفل پڑھ لو اور صبح کو فرض نماز بھی نہ پڑھو تو اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ اسلام نے جو باتیں سکھائی ہیں، ان پر عمل کریں۔

ایک صحابی نے آکر پوچھا: حضور! اللہ نے کتنی نمازیں فرض کی ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اس نے کہا: مجھے اللہ کی قسم ہے! نہ میں بڑھاؤں گا اور نہ گھٹاؤں گا۔ بس جو آپ نے حکم دے دیا ہے، اس کو پورا کروں گا۔ جب وہ جانے لگا تو حضور ﷺ نے فرمایا: اگر کسی نے جنتی بندہ دیکھنا ہو تو اس کو دیکھ لو۔ یہ جنتی ہے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۸۹۱، بَابُ وُجُوبِ صَوْمِ رَمَضَانَ]

حق چھپانے والے علماء کا انجام؟

میرے عزیز! اللہ کے کعبہ میں بیٹھ کر میں آپ کو دیانتداری سے بات بتاؤں کہ جو علماء حق کو چھپاتے ہیں یا حق کو ملاتے ہیں، ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو یہودیوں کے علماء کا ہوگا۔

اس لیے سب سے پہلے اپنے عقیدے کو ٹھیک کرلو۔ عقیدے میں ذرا سی جھول آئی تو سمجھو پھر جہنم ہے۔ عقیدہ اتنا ٹھیک ہو جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام منجنیق میں بیٹھے ہوئے ہیں، فرشتے اللہ کے حکم سے آرہے ہیں...... تم تو کہتے ہو کہ ہم اللہ کے پیاروں سے کہتے ہیں اور پیارے آگے کہتے ہیں، ہم ان کو کہتے ہیں یہ اس کو کہتے ہیں۔ ہماری سنتا نہیں، ان کی موڑتا نہیں...... اب دیکھیں کہ اللہ کے فرشتے آگئے، اللہ کی اجازت سے آئے اور فرشتے نے آکر عرض کیا: اے ابراہیم الخلیل! پہاڑوں پر میری ڈیوٹی ہے اور میں اللہ سے تمہاری مدد کرنے کی اجازت لے کر آیا ہوں، آپ مجھے حکم دیں کہ میں ان کافروں پر پہاڑوں کو ملا دوں، یہ ظالم خود بخود اسی آگ کے اندر بھسم ہو کر رہ جائیں گے۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: مجھے کیا ضرورت ہے تم سے مدد لینے کی؟ سارے فرشتے آتے رہے اور آپ

انہیں یہی جواب دیتے رہے۔ آخر میں حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے، انہوں نے فرمایا: آپ مجھے حکم دیں اور آپ نبی ہیں اور میری طاقت کو جانتے ہیں، ایک ہاتھ پر اُٹھا کر ان سب کو پھینک دوں۔ فرمایا: جبرائیل! مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ اب جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا: اگر آپ کو فرشتوں کی مدد کی ضرورت نہیں تو اللہ سے مانگ لیں، اللہ سے مانگنا تو منع نہیں، آپ تو دعا بھی نہیں کر رہے۔

ابراہیم علیہ السلام مسکرا دیئے اور فرمایا: جبرائیل! مجھے ایک بات بتاؤ کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، میرے اللہ کے علم میں ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا کہ واقعی اللہ کے علم میں ہے۔ فرمایا: جب اللہ کے علم میں ہے تو پھر مانگنے سے کیا فرق پڑے گا؟ جب وہ جانتے ہیں کہ خلیل جلنے والا ہے، وہ جلانے پر راضی ہے تو ہم بھی راضی ہیں۔ دروازہ تو میں اس کا کھٹکھٹاؤں جسے پتہ نہ ہو کہ کون سائل میرے دروازے پر کھڑا ہے؟ وہ جانتے ہیں آگ ان کے حکم کے بغیر جلا نہیں سکتی، کوئی حرکت اور کوئی تصرف اس کے حکم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ وہ بھی اگر میرے جلانے پر راضی ہیں تو میں ان کا بندہ ہوں، میں بھی راضی ہوں۔

[تفسیر الرازي، الانبیاء: الآیة: ٦٩]

ایمان سے بتلاؤ کہ پھر اللہ کی مدد آئی یا نہیں؟ پھر آگ گلزار بن گئی کہ نہیں؟ اس لیے سب سے پہلے اپنے عقیدوں کی اصلاح کرو اور اس کے بعد اللہ نے جو فرائض رکھے ہیں ان کو پورا کرو اور اس کے ساتھ کبائر سے بچو اور پھر دیکھو کہ اللہ کی مدد کیسے آتی ہے۔

صدقۃ الفطر:

حضرت حارث العکلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ سے صدقہ فطر مراد ہے۔

صدقہ فطر کا حکم یہ ہے کہ اس دن نماز عید کے ادا کرنے سے پہلے دے دیا جائے۔ یہاں کے علمائے کرام نے اس کا وزن تقریباً تین کلو چاول رکھا ہوا ہے۔ اور ائمہ احناف کے نزدیک پونے دو سیر گندم یا احتیاط میں دو سیر ہے۔

ایک فرق صدقہ فطر میں یہ بھی ہے کہ ان ائمہ کے نزدیک صدقۃ الفطر جنس کے بغیر ادا نہیں ہوتا۔ آپ کھجور دیں، یا آپ کشمش دیں یا آپ چاول دیں یا آپ گندم دیں۔ جنس کو چھوڑ کر قیمت دینے سے ادا نہیں ہوگا۔ صرف امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک قیمت سے بھی ادا ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اگر آدمی نے وہ جنس نہیں دی، بلکہ اتنے پیسے دے دیئے تو مقصد غریب کو نفع پہنچانا ہے۔ ان چیزوں کو لے کر وہ بیچے گا تو گھاٹا کھاتا پھرے گا۔



بہر حال باقی ائمہ کے نزدیک جنس دینا ضروری ہوتا ہے اور حنابلہ کے نزدیک بھی جنس دینا ضروری ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جنس ادا کرو۔

﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ [البقرة:۴۳] اللہ نے حکم دیا تم ان مومنوں کے ساتھ مل جاؤ۔ اور سب سے احسن اور افضل عمل نماز ہے، جس نے نماز ٹھیک کر لی، اس کے سارے عمل ٹھیک ہو گئے، اگر نماز ٹھیک نہ ہوئی تو کوئی عمل ٹھیک نہ ہوگا۔

اس آیت سے بعض علماء نے استدلال کیا ہے کہ جماعت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا واجب ہے۔

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾
[البقرۃ:۴۴]

کیا تم لوگوں کو نیک کام کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھولتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو، پھر کیوں نہیں سوچتے؟

مسلمانوں میں عملی انحطاط:

یہاں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک نئے اسلوب سے مخاطب فرمایا ہے، اس میں زجر و توبیخ اور تہدید ہے اور قیامت تک امت محمدیہ کے لیے ہدایت بھی ہے۔

یہ بیان کیا کہ آدمی لوگوں کو تو بھلائی کا حکم کرے، لیکن خود اپنے اوپر اس بھلائی کو نافذ نہ کرے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ جیسا کہ یہود کے علماء کی یہ عادت تھی کہ وہ لوگوں کو تو بھلائی کا حکم دیتے تھے کہ تم اللہ اور اس کے رسولوں کی اطاعت کرو اور اللہ کی کتاب پہ عمل کرو، لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے۔ یہ ایک بہت بڑی مصیبت ہے کہ آدمی لوگوں سے تو کہے، لیکن خود عمل نہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں جہاں بھی آپ نظر ڈالیں گے عالم اسلام میں مسلمانوں کی حالت زار انتہائی خطرناک حد تک تباہ کن ہے، اگر عالم اسلام کے اعتقاد پر نظر ڈالیں تو حالت تباہ ہے، اسی طرح ان کے معاملات پر

نظر ڈالیں تو حالت تباہ ہے، عبادات پر نظر ڈالیں تو بھی حالات تباہ ہیں اور ان کی موجودہ دور کی جو ضروریات ہیں یا ان کے قوانین ہیں، نظام ہیں، اقتصادیات ہیں اور معاشیات ہیں، سب میں مسلمان کی حالت بڑی خراب ہے۔

اعتقادیات پر نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ آج کتنے مسلمان ہیں جو کلمۂ شہادت بھی ادا کرتے ہیں اور اللہ کے ساتھ شرک بھی کرتے ہیں، جیسا کہ قرآن نے فرمایا: ﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ [یوسف:۱۰۶] ایسے لوگ ہوں گے کہ اللہ پر ایمان بھی لانے والے ہوں گے اور اس کے ساتھ شرک کرنے والے بھی ہوں گے، کلمہ پڑھنے والے ہیں، "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" پڑھ رہے ہیں، ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کا وِرد کر رہے ہیں، نمازوں میں ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ① الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ② مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ③ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ④ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ⑤ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ⑦﴾ [سورۃ الفاتحہ] یہ سب پڑھ رہے ہیں اور قبروں پر سجدے بھی کر رہے ہیں، قبروں کے طواف بھی کر رہے ہیں، قبروں پر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہیں اور اُلٹے پاؤں چل رہے ہیں اور ان کی تعظیم بھی وہی کر رہے ہیں جو اللہ کے گھر کی تعظیم ہے۔

اسی طرح ان کے مسائل نبوت میں عقیدوں کو دیکھو تو کتنے لوگ ہیں جو قادیانیت کے فتنہ میں مبتلا ہو گئے؟ کتنے لوگ ہیں جنہوں نے نبوت کے مرتبہ کو اُلوہیت کے ساتھ ملا دیا؟ عبادات پر نظر ڈالیں، کتنے لوگ ہیں جو نمازیں پڑھتے ہیں؟ میرے خیال میں اگر پوری نسبت نکالی جائے تو پانچ فیصد بھی نمازی نہیں نکلیں گے، یعنی پچانوے فیصد مسلمان تو نماز پڑھتے ہی نہیں، بلکہ ان میں سے یوں سمجھیں کہ اسی فیصد کو تو نماز کا علم ہی نہیں ہے، ان کو پتہ ہی نہیں کہ نماز کیا ہے؟

کتنے لوگ ہیں جو مکہ میں رہتے ہیں، ...... ماشاء اللہ!...... سفید داڑھیاں ہو گئیں، لیکن نماز نہیں آتی، ان کو اب تک دعائے قنوت نہیں آتی، نماز جنازہ کی دعائیں نہیں آتیں، ان کو فاتحہ کا قرآن کے حقوق کے مطابق تلفظ کرنا نہیں آتا اور صحیح لفظ پڑھنے نہیں آتے اور عمر ستر سال ہو گئی ہے۔ مکہ کے اندر بھی ایسے لوگ ہیں۔

واقعہ:

ایک دوست واقعہ سنا رہے تھے کہ میں ایک اسلامی ملک میں گیا۔ مسلمانوں کا ملک ہے، کافروں کا نہیں۔ اور

وہاں تفریح گاہ میں گیا، تاکہ سانس بھی لوں اور آرام بھی کروں اور کوئی چائے پی لوں۔ اتنے میں نماز کا وقت ہو گیا۔ خیال تھا کہ کہیں سے اذان کی آواز آئے گی تو نماز پڑھوں گا، لیکن کہیں سے بھی آواز نہ آئی۔ میں نے سوچا، ممکن ہے کہ مسجد دور ہو، اذان کی آواز مجھے نہ آئی ہو۔ چلو ان مسلمانوں میں سے کچھ لوگ نماز کے لیے اُٹھیں گے تو میں بھی ان کے ساتھ نماز پڑھنے چلا جاؤں گا، لیکن ان میں سے بھی کوئی نماز کے لیے نہیں اُٹھا۔ اب میں اکیلا اُٹھا، میں جانتا تھا کہ قبلہ کس طرف ہے۔ چنانچہ میں نے اسی طرف رُخ کر کے اذان دی اور اس کے بعد خود ہی اقامت کہنا شروع کی کہ شاید کوئی شریک ہو جائے، لیکن کوئی شریک نہیں ہوا۔ میں نے اکیلے نماز پڑھی، پورا پارک لوگوں سے بھرا ہوا تھا، کم از کم اس میں دو سو سے اوپر لوگ ہوں گے اور میں اکیلا نماز پڑھ رہا ہوں۔ ان میں سے ایک بھی نہیں اُٹھا کہ چلو میری جماعت ہو جائے۔

نماز سے فارغ ہو کر میں اسی میز کرسی پر آ کر بیٹھا تو تھوڑی دیر بعد اس ایریا کا مالک میرے پاس آیا، بڑے ادب سے اور احترام سے ملا اور کہنے لگا: میں ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں، اگر آپ مہربانی کر کے مان لیں۔ میں نے پوچھا: آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا کہ آپ مہربانی کر کے عشاء کی نماز میرے گھر میں پڑھ لیں، میری عمر اس وقت پچاس سال ہو گئی ہے، لیکن پچاس سال سے ہمارے گھر میں نماز نہیں ہوئی ہے۔ میں نے آج آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، مجھے تو آتی نہیں، چلو کم از کم تم میرے گھر میں نماز پڑھ لو۔ مسلمان کا گھر ہے، شاید تیرے نماز پڑھنے سے اللہ تعالیٰ کوئی رحمت فرما دیں۔ یہ مسلمان ملک کی بات ہے۔

اسی طرح آپ گاڑیوں میں سفر کریں، ٹرین میں سفر کریں، ہوائی جہاز میں سفر کریں اور بسوں میں سفر کریں۔ آپ خود اندازہ لگا لیں گے کہ ان میں سے کتنے آدمی ہیں جو اُٹھ کر نماز پڑھتے ہیں؟ کیا باقی سفر کرنے والے مسلمان نہیں ہوتے؟

جب کافروں کے جہازوں میں یا ایئر لائنز میں سفر کرتے ہیں، ان کو اگر ہم کہیں کہ ہم نے نماز پڑھنی ہے، آپ نے ہمیں نماز کے ٹائم کے مطابق باخبر کرنا ہے تو وہ بے چارے ہمارے لیے بہت محنت کرتے ہیں، پہلے وہ اوقات کے ٹائم ٹیبل نکالتے ہیں کہ آپ کے ملک کا کیا ٹائم ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ اور اب یہاں کیا ٹائم ہوگا؟ اور پھر وہ ملکیاس سے حساب کر کے قبلہ ڈھونڈتے ہیں اور پھر ان کی یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ نماز پڑھنے کی جگہ آپ کے لیے کھلی رہے، آپ وہاں کھڑے ہو کر نماز پڑھ لیں۔



اس کے برعکس اگر آپ اپنے ساتھ بیٹھے کسی مسلمان سے نماز پڑھنے کا کہہ دیں تو وہ آپ کو یوں جواب دے گا: تُو اتنا بڑا نمازی کہاں سے آ گیا! ابھی تو مسافر ہو، جہاز سے اُتر کر پڑھ لینا، کون سا ابھی مر رہے ہو؟ جہاز میں کوئی نماز نہیں ہوتی، ہم نے بڑے نمازی دیکھے ہیں، لیکن تم جیسا کوئی نہیں دیکھا۔

یہ مسلمان کا رویہ ہے!! ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ آدمی کو غیرت ہو تو اسی وقت مر جائے، چہ جائیکہ وہ بھی ہاں میں ہاں ملائے اور یہ کہے کہ میں بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھ لیتا ہوں، یا صرف اتنا ہی کہہ دے کہ بڑی اچھی بات ہے، ایک بھائی نماز پڑھ رہا ہے۔ نہیں، بلکہ اس کی بجائے اُلٹا پڑھنے والے پر طنز کرے گا اور پھر پڑھنے والے کے سامنے سو بہانے بنائے گا کہ آپ وضو کیسے کریں گے؟ یہاں تو جگہ تنگ ہوگی، آپ ہاتھ کیسے دھوئیں گے؟ اور منہ کیسے دھوئیں گے؟ جب آدمی کی نیت بد ہو تو ہزار بہانے ہوتے ہیں اور نیت ٹھیک ہو تو کوئی تکلیف بھی نہیں ہوتی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے سارے اسباب مہیا فرما دیتے ہیں اور نماز پڑھنے سے اطمینانِ قلب الگ حاصل ہوتا ہے، اللہ کی رضا علیحدہ حاصل ہوتی ہے۔

اور اس کی وجہ سے کافر لوگ ہم فقیروں کی خدمت بھی زیادہ کرتے ہیں۔ دوسروں کو اگر ایک دفعہ چائے پوچھیں گے تو ہم سے چار دفعہ پوچھیں گے۔ یہ بھی پوچھیں گے کہ کوئی گرم چیز بنا کر آپ کے لیے لے آئیں؟ میٹھا کتنا ڈالیں؟ صرف اس وجہ سے کہ چلو کوئی تو ہے اللہ کا نام لینے والا۔

عالم اسلام میں جہاں بھی نظر ڈالو، اعتقادیات میں ختم، عبادات میں ختم اور معاملات میں ختم ہیں۔ معاملات کا یہ عالم ہے کہ کسی کو امانت دے کر تجربہ کر لو کہ وہ چیز واپس ملتی ہے؟ قرض دے کر تجربہ کر لو تمہیں ملتا ہے؟ تمہیں بتلائیں گے کچھ اور کریں گے کچھ۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ معاشرے کو چلانے کے لیے جو قوتیں درکار ہوتی ہیں، ان میں بگاڑ آ چکا ہے۔ ایک وہ قوت ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو، کرسی ہو، قانون ہو، جس کا حکم چلتا ہو اور ایک وہ قوت ہے جس کی حکومت انسانوں کے دلوں پر ہو، یعنی علماء کرام، لوگوں کے دلوں میں جن کا احترام ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ دو طاقتیں انجن بنیں جو ٹرین کو پٹڑی پر چلانے والی ہیں اور جب یہ دو قوتیں بگڑ جائیں تو ضروری بات ہے کہ نقصان ہوگا۔ جب آپ کی گاڑی کا انجن فیل ہو جائے تو گاڑی کھڑے ہو جائے گی، پھسل جائے گی تو پوری گاڑی پٹڑی سے اُتر جائے گی، ٹکرا جائے تو پوری گاڑی تباہ ہو جائے گی۔

اور یہ دونوں طبقے ہمارے اندر سے پیدا ہوتے ہیں، باہر سے تو نہیں آتے۔ جو مولوی پیدا ہوں گے کیا وہ کسی اور ملک سے آئیں گے؟ امپورٹ کر کے کاروبار کے ذریعے منگوائے جائیں گے؟ وہ بھی ہمارے اندر سے نکلیں گے، ہمارے بیٹے ہوں گے، ہماری اولادیں ہوں گی، ہمارے بھائی ہوں گے، ہمارے رشتہ دار ہوں گے، ہماری قوم کا آدمی ہوگا۔ چونکہ ہمارے عمل اتنے تباہ و برباد ہو چکے ہیں، اس لیے اب جو ہمارے اندر سے کریم نکلتی ہے، وہ بھی زہریلی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پورے عالم کے اندر اللہ کی شریعت کے اوامر، اسلامی نظام، اور جو شرائع تھے، وہ ختم ہو گئے۔

اس لیے حکم ہوتا ہے کہ آدمی کسی کو حکم کرے تو خیر کا حکم کرے۔ اللہ نے حضور ﷺ کی اُمت کو ''خَیْرَ اُمَّۃٍ'' بھی اسی لیے فرمایا ہے کہ کسی دوسری اُمت کی اتنی بڑی ذمہ داری نہیں آئی، جتنی اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذمہ داری آئی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

[آل عمران:۱۰۴]

اسی طرح فرمایا:

﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾ [سورۃ العصر]

چونکہ رسول اللہ ﷺ کی اُمت خیر الامم ہے، افضل الامم ہے، اشرف الامم ہے اور خاتم الامم ہے، اس لیے اس کی ذمہ داری بھی عظیم ہے۔ چنانچہ جب آپ کسی کو خیر کا امر کریں تو اس سے پہلے اپنے آپ کو ٹھیک کر لیں۔ کیونکہ علماء کا یہ قاعدہ ہے کہ جو شخص کامل فی ذاتہٖ نہ ہو، وہ کامل لغیرہ کیسے بنے گا؟ جب وہ خود کامل نہیں بنا تو کسی اور کو کیا کامل بنائے گا؟ یوں سمجھ لیں کہ ایک کمہار ہے جو مٹی کے گلاس بناتا ہے، اگر وہ خود گلاس بنانا نہ جانے تو تمہیں کیسے سکھلائے گا؟ جب اپنے فن میں وہ خود کامل ہوگا تب ہی وہ کسی کو سکھلا سکے گا۔

دوسری اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ کسی دوسرے آدمی کو حکم کرتے ہیں اور خود عمل نہیں کرتے تو اس حکم کا اثر نہیں ہوتا۔ لوگ ایک کان سے سن لیں گے اور دوسرے کان سے نکال دیں گے۔ لوگوں پر صرف اس بات کا اثر ہوتا ہے جو دل سے کہی جائے۔ بقول شاعر:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں ، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

جب کوئی بات دل سے نکلے اور بات کہنے والا خود اپنی اس بات پر عمل کرنے والا ہو تو اس بات کو طاقتِ پرواز مل جاتی ہے۔ آپ کسی سے کہیں کہ سونا چاندی جمع نہ کرو، دولت کے چکر میں نہ پڑو، یہ آنی جانی چیزیں ہیں، بس اتنا مال اپنے پاس رکھو کہ عزت کے ساتھ زندگی گزر جائے، زیادہ جھنجھٹ میں نہ پڑو، اصل زندگی تو آخرت کی ہے اور اس کے لیے تیاری کرو۔ دوسری طرف خود تمہارے گھر میں سونے اور چاندی، محلات، گاڑیاں اور کاریں ہوں تو دوسرے پر کیا اثر ہوگا؟

واقعہ:

مثل مشہور ہے کہ ایک بزرگ کی خدمت میں ایک بوڑھی عورت بچہ لے کر آئی اور کہنے لگی کہ اس کو گڑ کھانے کی بڑی عادت ہے، یہ بہت میٹھا کھاتا ہے، کہیں بیمار نہ ہو جائے۔ اس پر دَم کر دیں۔ انہوں نے فرمایا: اس کو کل لے آنا۔ جب وہ بڑھیا چلی گئی تو ساتھیوں نے کہا: حضرت! آپ نے دعا کرنی تھی، آج ہی دعا فرما دیتے، باقی معاملہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ فرمایا: گڑ کھانا کوئی حرام تو نہیں ہے، آج میں نے صبح خود گڑ کھایا تھا تو اس کے لیے کیسے دعا کرتا؟

حضور اکرم ﷺ کی مشقت:

سب سے افضل ذات میرے آقا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ آپ کی شان کے برابر نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ قیامت تک کوئی پیدا ہوگا...... صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم...... اس ذات پاک کو دیکھو کہ ولادت کے بعد سے لے کر چالیس سال تک مکہ میں زندگی گزارنی پڑی اور ہر مشقت والے کام سے گزرنا پڑا۔ کبھی بکریاں چرانی پڑیں اور کبھی تجارت کرنی پڑی، کبھی سفر کرنے پڑے۔ عین کٹھالیوں میں سے نکال کر اور پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا، مہینوں مہینوں حضور ﷺ اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں...... آپ ذرا تصور تو کریں، رات کو آدھا گھنٹہ جاگ کر بیٹھیں، آپ کو پتہ چل جائے گا کہ کتنا مشکل کام ہے!!...... جب اللہ نے اپنی نبی کی تکمیل کر لی، بالکل ''سِرَاجًا مُّنِيرًا'' ہیں، اب حکم ہوا کہ اُٹھو اور لوگوں کو دعوت دو۔ اور پھر یہی وجہ تھی کہ اگر غزوۂ خندق کے موقع پر صحابہ ؓ نے پیٹ پر ایک پتھر باندھا ہوا تھا تو آمنہ کے لعل نے دو پتھر باندھے ہوئے تھے۔

ایک مرتبہ نماز کی اقامت ہوگئی، آپ ﷺ فوراً گھر میں تشریف لے گئے اور پھر واپس آ کر نماز پڑھائی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ آپ نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا کہ تکبیر ہو جائے اور آپ گھر چلے جائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں جب مصلّی پر آیا تو مجھے یاد آیا کہ میرے گھر میں سونے کی ڈلی پڑی ہوئی ہے، میں نے سوچا کہ یہ نبی کی شان نہیں کہ وہ نمازیں پڑھائے اور گھر میں سونا پڑا ہوا ہو۔ چنانچہ میں جا کر حکم دے آیا کہ خیرات کر دو، اور پھر آ کر نماز پڑھائی۔

آج جو شخص اپنے آپ کو دین پر سمجھتا ہے کہ میں دین پر پکا ہوں، اس کا دین بھی بس دو چار باتوں میں محدود رہ گیا ہے اور اتباعِ سنت کا معاملہ چند عبادات میں رہ گیا ہے...... اللہ رحمت کرے...... ان کے گھروں میں دیکھو تو آپ کو پوری انگریزی تہذیب نظر آئے گی، تمام دنیا کے کفار کے جو قیمتی قالین ہوں گے وہ ان کے گھر پڑے ہوں گے، تمام دیواروں پر ریشمی پردے لہرا رہے ہوں گے اور ان کے پانی کے گلاس ایسے ہوں گے جیسا کہ شراب کے جام ہوتے ہیں، ان کی کرسیاں، ڈائننگ ٹیبل، بیڈ روم اور ڈرائنگ روم دیکھیں تو آپ حیران ہو جائیں گے!! وہاں ان کو حضور ﷺ کی سنت نظر نہیں آتی، وہاں سنتِ رسول کہاں چلی جاتی ہے؟ وہاں کیوں کسی سنت والے کو درد نہیں آتا کہ ان کے گریبان کو پکڑ کر جھنجھوڑے کہ یہاں تمہارے پاس کیوں سنت نہیں ہے؟ وہاں ان کے گریبانوں میں ہاتھ کیوں نہیں ڈالا جاتا جہاں ایک شادی پر کئی کئی لاکھ خرچ کرتے ہیں؟

مجھے بتلایا گیا کہ ایک جگہ ان کے شادی گھر کا ایک رات کا کرایہ ایک لاکھ چھپن ہزار ریال تھا۔ اگر آپ اپنے پیسوں میں حساب کریں تو کتنا بنے گا؟ چلو اپنے پیسوں میں بھی حساب نہ کرو، اس کے پیسوں میں رہنے دو، تب بھی کتنی بڑی رقم ہے! میں نے کہا: خدا کے بندے! کون سا ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا کہ ڈیڑھ لاکھ صرف رات کے چھ یا آٹھ گھنٹے کا کرایہ ادا کرنا پڑا؟ اس کے متبادل اگر تم اپنے کسی دوست کی اعلیٰ سے اعلیٰ جگہ دو چار کوٹھیاں خالی کروا لیتے یا شامیانوں سے چاندنی لگوا دیتے تو اس سے ڈبل رونق ہوتی اور خرچ بھی کم ہوتا، پچاس ہزار میں تمہارا کام نکل جاتا۔ کہنے لگے: جی! کیا کریں؟ لڑکی والے نہیں مانتے تھے، ہم نے انہیں بڑا سمجھایا۔ اور پھر کہنے لگے کہ یہ ہمارا کم از کم ریٹ ہے، ورنہ یہاں تین لاکھ، چار لاکھ، پانچ لاکھ ایک رات کا کرایہ دینا پڑتا ہے۔ اب یہ جو انتظام ہو رہے ہیں، کیا یہ سنت کے مطابق ہیں؟

حضور ﷺ جنگ سے تشریف لا رہے تھے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ کے استقبال کے لیے چادر کا ایک



صرف ٹکڑا دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ جب حضور ﷺ آئے اور آپ ﷺ کی نظر پڑی تو آپ بغیر ملے ہوئے گھر سے واپس چلے گئے...... یہی حجرہ تھا جس میں میرے مدنی سرکار کا روضہ ہے، اس کا طول وعرض دیکھ لو۔ اب تو بہت بڑا ہے، اس وقت اس سے بھی چھوٹا تھا۔ یہ جہاں جالی لگی ہوئی ہے، سارا حجرہ نہیں ہے، بلکہ اندر جتنی جگہ رو کی ہوئی ہے، وہ حجرہ ہے۔ یہ چھوٹا سا حجرہ مبارک تھا، دروازہ بھی نہیں تھا، ایسے ٹاٹ اور بوریاں ڈالی جاتی تھیں اور اس دیوار میں ایک طاقچہ تھا جس میں دیا رکھا جاتا تھا، یا کبھی کوئی اور سامان رکھ دیا۔ تو بی بی صاحبہ نے وہاں ایک کپڑا لٹکا دیا، تاکہ اچھا لگے اور گھر صاف ستھرا نظر آئے۔

بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا چونکہ بڑی عالمہ اور بڑی ذکیہ تھیں، ایسے تو حضور ﷺ نے نہیں فرمایا کہ جس نے آدھا دین سیکھنا ہو عائشہ رضی اللہ عنہا سے سیکھ لو...... یہ ملنگ جو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے دشمن ہیں، ان کی دشمنی کا مقصد یہ ہے کہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کی عزت وعصمت ختم ہو جائے، اور جب ان کی عزت وعصمت ختم ہو جائے گی تو نبی کا دین دیسے ختم ہو جائے گا۔ ورنہ ان کا بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا جھگڑا ہے؟ چودہ سو سال گزر گئے، نہ اب یہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ اصل میں ان کی دشمنی دین محمد سے ہے۔ جب بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے اعتماد اُٹھ جائے گا تو نبی کا آدھا دین ختم ہو جائے گا، وہ روایتیں ختم ہو جائیں گی جو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہیں۔

بہر حال حضور ﷺ واپس تشریف لے گئے۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں سمجھ گئی کہ حضور ﷺ کو یہ پردہ ناگوار گزرا ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے بتلا بھی دیا کہ اللہ کے نبی کے گھر میں دیواروں پر پردے کا لگا ہونا نامناسب ہے۔

ایمان سے بتائیں! آج ہمارا کوئی گھر ہے جو اس قسم کے پردوں سے خالی ہو۔ چاہے وہ مولوی صاحب کا ہو، میرا ہو یا تیرا ہو، اس میں چل کر ذرا پردوں کی بہار تو دیکھیں! پردے تو پردے رہے، اب تو لگانے والے ہزاروں روپے لیتے ہیں۔ ہزاروں کے کپڑے ہوتے ہیں اور پھر پردے کئی کئی قسم کے ہوتے ہیں، کوئی دو کپڑے والا، کوئی تین پرت والا، کوئی ریشم والا...... اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ...... دعا کریں کہ اللہ پاک ہمیں ہدایت دے اور ہم دین کی طرف لوٹیں۔

پردہ کی اہمیت پر تالیف:

ایک مولوی صاحب تھے۔ فوت ہو گئے...... اللہ ان کی قبر پر رحمت کرے...... انہوں نے ایک کتاب لکھی،



بلاشبہ بڑی اچھی کتاب لکھی۔ انہوں نے لکھا کہ اسلام میں پردے کا کیا حکم ہے؟ بڑے مضبوط دلائل دیئے، بڑی محنت کی اور پھر اس میں تاریخی طور پر بحث کی اور دلائل دیئے کہ:

......رومن امپائر میں عورت کا کیا مقام تھا؟

......یونان کی تہذیب میں عورت کا کیا مقام تھا؟

......مصر کی تہذیب میں عورت کا کیا مقام تھا؟

......زمانہ جاہلیت میں عورت کا کیا مقام تھا؟

......اسلام میں عورت کا کیا مقام ہے؟

......اسلام نے آکر پردے کا حکم دیا ہے تو کیوں دیا ہے؟

لیکن یہ بات افسوس سے کہنی پڑ رہی ہے کہ ان کی اپنی بیٹیاں پردہ نہیں کرتیں۔

ان کے ایک مخالف تھے، وہ بھی فوت ہو گئے ہیں...... ان کا نام نہیں لینا چاہیے۔ اللہ غیبت سے بچائے...... وہ بھی بڑے لیڈر تھے، اس کی بیٹی بھی پردہ نہیں کرتی تھی، ایک بار تقریر کر رہے تھے تو کسی آدمی نے اسے چٹ لکھی کہ تم بار بار اسلام کا نام استعمال کر رہے ہو، تمہاری اپنی بیٹی بھی پردہ نہیں کرتی، تم اپنے گھر میں پہلے بیٹی کو تو اسلام کا پابند کرو۔ اس نے جواب دیا کہ ٹھیک ہے میری بیٹی پردہ نہیں کرتی، لیکن میں نے کسی مولوی کی طرح پردہ کے موضوع پر کتاب تو نہیں لکھی۔ جن مولویوں نے کتاب لکھی ہے، ان کی بیٹیاں پردہ نہیں کرتیں، پہلے ان کو سمجھاؤ۔

آپ بتائیں کہ اس کے بعد ہمارے پلے کچھ رہ گیا؟

پکوڑے فروش مناظر!!!

جیسا کہ تاریخ میں ایک واقعہ ہے کہ عیسائیوں کا بڑا پادری تھا۔ ہندوستان کے کسی شہر میں آکر اس نے طوفان مچا دیا کہ کوئی مولوی میرے ساتھ مناظرہ کرے۔ سب کو للکار رہا ہے اور اخباروں میں باقاعدہ اشتہار چھپ رہے ہیں، رات دن اس نے دھوم مچا ڈالی...... پیسہ تو ان کے پاس ہوتا ہے، کیونکہ ان کو اپنی تبلیغ کے لیے لاکھوں ڈالر ملتے ہیں، ان کی باقاعدہ مشنریاں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے پادریوں کو ہمارے مولوی کی طرح تو نہیں رکھتے کہ بے چارا جا کر گھر گھر سے روٹیاں بھی لے آئے اور پانچ نمازیں بھی پڑھائے۔ صبح ہوتی جائے تو پھر اس کو روٹی کی فکر ہو کہ کہاں سے میرا ناشتہ آئے گا؟ اور کہاں سے میری دال آئے گی؟ اور کہاں سے میری لسی کا گلاس آئے گا؟ ان کے جو مبلغ ہیں،



مبشر ہیں، داعی ہیں، ان کے پنڈت اور راہب ہیں، ان کو وہ اتنا اعلیٰ سٹیٹس پر رکھتے ہیں کہ جیسے بادشاہوں کا معیار زندگی ہو، کوٹھیاں اور بنگلے ہوتے ہیں، اے سی کا سفر اور ہوائی جہاز کی فرسٹ کلاس کا ٹکٹ اور سالانہ بجٹ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے...... خیر مناظرہ طے ہوگیا۔ اس پادری کا دعویٰ تھا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) خدا کا بیٹا ہے اور اس پر وہ دلائل دے رہا تھا۔ ابھی وہ عالم صاحب جنہوں نے اس کے ساتھ مناظرہ کرنا تھا وہ وہاں نہیں پہنچے تھے کہ ایک مسلمان، جو چھابڑا لگا کر پکوڑے وغیرہ بیچا کرتا تھا، اس کو غصہ آگیا، وہ اندر آگیا، اس نے پکوڑے وہیں چھوڑ دیئے اور چلتے چلتے اسٹیج کے قریب آگیا اور پادری سے کہا کہ کیا بات ہے؟ پادری نے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے کہا: میں مسلمان ہوں اور تم سے بات کرنے آیا ہوں، پادری نے کہا: میں تمہارے ساتھ کیوں بات کروں؟ میں تو تمہارے مولوی صاحب کی انتظار میں ہوں جس سے مناظرہ طے ہے۔ اس نے کہا کہ مناظرہ تم مولوی سے کرنا، پہلے یہ تو سمجھاؤ کہ تم کہتے کیا ہو؟ میں جاہل آدمی ہوں، اَن پڑھ ہوں، پکوڑے بیچتا ہوں۔

پادری نے کہا: عیسیٰ (علیہ السلام) خدا کا بیٹا ہے۔ اس مسلمان نے کہا: یہ بتاؤ کہ خدا کا بس ایک ہی بیٹا ہے یا کوئی اور بھی بیٹا ہے؟ اس پادری نے کہا: خدا کا ایک بیٹا ہے۔ مسلمان نے کہا: کمال کرتے ہو؟ میں پکوڑے بیچتا ہوں، میرے گھر میں روٹی پوری نہیں، میرے سترہ بیٹے ہیں، خدا مجھ سے بھی کمزور ہوا کہ جنا بھی ایک بیٹا ہے، تم ایسے خدا کو مان رہے ہو جس کی اولاد تو صرف ایک لڑکا ہے۔ اس پر لوگوں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے، پادری صاحب بھاگ گئے۔ اب پادری بے چارے سے کیا جواب بنے؟ وہ ملک چھوڑ کر وہیں جہاز پر چڑھ گیا۔

اس عالم نے یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھا کہ حقیقت بات یہ ہے کہ اس بندے نے جس انداز میں مناظرہ کیا، جو طرزِ استدلال اس نے اختیار کیا، میں مولوی ہو کر بھی نہ کر سکتا تھا۔ تو کبھی کبھی اَن پڑھ بندے کے منہ سے بھی ایسی بات نکل جاتی ہے جو پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں کر سکتے۔

ایک بدو کا واقعہ:

ایک بدو گنگنا بھی رہا تھا اور جنگل میں اونٹ چرا رہا تھا۔ ایک مولوی صاحب کی اس سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے سوچا کہ یہ بے چارا اَن پڑھ بندہ ہے، اس کی زندگی اونٹوں میں گزر گئی ہے، اس سے توحید کا مسئلہ پوچھتا ہوں، نہیں آتا ہوگا تو اس کو سمجھا دوں گا۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اسے سلام کیا، اس نے جواب دیا۔ مولوی صاحب نے پوچھا: تم کون ہو؟ بدو نے کہا: میں مسلمان ہوں۔ مولوی صاحب نے پوچھا: خدا کو مانتے ہو؟ اس نے کہا: مانتا

ہوں۔انہوں نے پوچھا: اللہ کے بارے میں کیا عقیدہ ہے؟ بدو نے کہا: اللہ وحدہٗ لاشریک ہے، خدا ہے، احد ہے، صمد ہے۔ پوچھا: اس بات پر تمہارے پاس دلیل کیا ہے؟ کیا تم نے خدا کو دیکھا ہے؟ کبھی تم خدا سے ملے ہو؟ تمہاری ملاقات ہوئی ہے؟ اس بدو نے اپنے اونٹوں کو کھڑا کر دیا اور کہا: مولوی صاحب بات سنو! اور پھر لید اُٹھا کر پوچھا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: لید ہے۔ پوچھا: یہ کس چیز کی لید ہے؟ مولوی صاحب نے جواب دیا: اونٹ کی لید ہے۔ اس نے پوچھا: کیا نشانی ہے؟ عالم نے کہا: پاؤں کا نشان لگا ہوا ہے۔ پوچھا: کس چیز کا پاؤں ہے، گائے کا ہے یا بکری کا ہے؟ عالم نے کہا: اونٹ کا پاؤں ہے۔ اس بدو نے کہا: اگر یہ پاؤں اونٹ پر دلالت کر رہا ہے، لید اونٹ پر دلالت کر رہی ہے تو کیا یہ ساری کائنات خدا پر دلالت نہیں کرتی؟ ایک ڈنڈا مار کر سر پھوڑ دوں گا۔ بڑا مولوی بنا پھرتا ہے! مولوی صاحب نے کہا: میاں! میرا سر نہ پھاڑ، میں تو تیرا امتحان لینے کے لیے آیا تھا، اللہ کا شکر ہے کہ تُو صحیح عقیدے پر ہے اور تیرے پاس دلیل بھی ہے۔

تو کبھی ایک چھوٹا آدمی ایسی بات کہہ جاتا ہے جو بڑے سے بڑا آدمی بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے حکم ہے کہ اگر کوئی آدمی نصیحت کی بات کر رہا ہو تو اس کی بات سنو اور سمجھو۔ اگر کوئی بھلائی کی بات ہے تو لے لو، ورنہ چھوڑ دو۔

شاہ جی کا وکیل کو عقلی جواب:

شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک دفعہ کسی بہت بڑے وکیل نے کہا: شاہ جی! عجیب بات ہے تم مولوی لوگ خواہ مخواہ اپنا مغز مار رہے ہو، لوگوں کو کچھ سمجھ تو آتا نہیں۔ رات دن سفر کرتے ہو، کبھی ریل میں اور کبھی گاڑیوں میں دھکے کھاتے ہو، جلسے کرتے ہو اور نتیجہ کچھ نہیں۔ قوم جہاں پہلے تھی، وہیں کی وہیں ہے۔ جیسے پہلے بگڑا ہوا حال تھا وہی آج بھی ہے۔ پھر یہ اشتہار، یہ بھاگ دوڑ، یہ محنتیں، صبح وشام سفر اور آپ لوگوں کی تقریریں کس فائدے کے لیے ہیں؟ بہتر ہے کہ یہ سب کچھ چھوڑ دیں، کاروبار کریں، تجارت کریں۔ شاہ جی نے بہت پیاری بات کی!! فرمایا: دیکھو بھائی! تم پڑھے لکھے آدمی ہو، قانون دان ہو، عقلیات سے تمہارا تعلق ہے، مجھے معلوم ہے کہ تم عقلی دلیل سے سمجھو گے، منقول سے تم نہیں سمجھ سکتے۔ پھر اس سے فرمانے لگے: مجھے یہ بات بتاؤ کہ آج رات جو میرا جلسہ تھا، تمہارے اندازے کے مطابق اس میں کتنے آدمی ہوں گے؟ اس نے کہا کہ اخبار والوں نے لکھا ہے کہ ایک لاکھ آدمی تھے، لیکن میرا خیال ہے کہ پندرہ بیس ہزار آدمی ہوں گے۔ اخبار والے تو ایسے لکھ دیتے ہیں۔ شاہ جی نے فرمایا: میرے برخوردار وکیل

صاحب! یہ بتائیں کہ جلسہ کب شروع ہوا تھا؟ اس نے کہا: عشاء کے بعد شروع ہوا۔ پوچھا: ختم کب ہوا؟ اس نے کہا: صبح کی اذان ہوئی، نماز پڑھی، ختم ہوگیا۔ پوچھا: کتنے گھنٹے رہا؟ اس نے کہا: تقریباً آٹھ گھنٹے رہا۔

شاہ جی نے فرمایا: وکیل صاحب! بارایٹ لاء تو ہو، تمہارے تیس ہزار آدمیوں کو گناہوں اور جرائم سے روک کر میں نے بٹھائے رکھا، کیا یہ تھوڑی کامیابی ہے؟ ان میں کئی چور ہوں گے تو وہ چوری سے رُک گئے، زانی ہوں گے تو وہ زنا سے رک گئے، شراب والے شراب سے رک گئے، افیون والے افیون سے رک گئے، چرس والے چرس سے رک گئے، جھوٹ بولنے والے جھوٹ بولنے سے بچ گئے، غیبت والے غیبت سے بچ گئے، سگریٹ والے سگریٹ سے بچ گئے۔ آٹھ گھنٹے کے لیے معاشرے کے تیس ہزار آدمیوں کو گناہ سے بچائے رکھا اور قرآن سننے پہ لگائے رکھا، کیا یہ کم ہے؟ اس نے کہا: بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔

فرمایا: یہ تو ایک دن اور ایک جگہ کا جلسہ ہے، جبکہ سینکڑوں مولوی ہر رات لاکھوں لوگوں کو گناہوں سے روک کر اپنے پاس بٹھا لیتے ہیں۔ باقی کوئی فائدہ ہو نہ ہو، چلو ہماری یہی محنت دیکھ لو۔ تمہاری کوئی پولیس اور کوئی مشنری اتنا بڑا کام نہیں کرسکتی کہ بیس ہزار آدمیوں کو اتنے وقت کے لیے جرائم سے روکے رکھے۔ اس وکیل نے کہا: ہاں! اب بات سمجھ آگئی۔

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۴۴]

تفسیر:

حضرت قتادہ ؒ نے اس آیت کے بارے میں فرمایا کہ بنی اسرائیل کی یہ عادت تھی کہ لوگوں کو تو اطاعت و فرمانبرداری، اللہ سے ڈرنے اور تقویٰ کا حکم دیتے تھے، لیکن خود مخالفت کرتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کو شرم دلائی ہے کہ کیسی عجیب بات ہے کہ لوگوں کو تم بھلائی کا حکم کرتے ہو اور اپنی جانوں کو تم بھول جاتے ہو۔ کیونکہ انسان فطری طور پر سب سے پہلے اپنے نفس کی خیر مناتا ہے۔ تم لوگوں کو ہدایت کرو کہ وہ جہنم کی آگ سے بچ جائیں اور خود وہ کام کرو کہ جہنم میں چلے جاؤ تو یہ بڑی عجیب اور خلافِ عقل بات ہے۔

ابن جریج ؒ بھی فرماتے ہیں کہ اہل کتاب اور منافق، لوگوں کو کہتے کہ روزہ رکھو اور ان کو حکم کرتے کہ تم نمازیں ادا کرو اور خود اس عمل کو چھوڑ دیتے۔ منافقین کا اصل مقصد دکھلاوا ہوتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ جو آدمی

دوسروں کو بھلائی کا حکم کرے، اس کو چاہیے کہ وہ سب سے زیادہ خیر کی طرف دوڑنے اور خیر کو ڈھونڈنے والا ہو تو پھر اس کے قول میں بھی اثر اور برکت ہوتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: بھولنے کا مطلب ہے چھوڑ دینا۔ ﴿وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ یعنی تم اپنے نفسوں کو چھوڑتے ہو، اور لوگوں کو تم بھلائی کا حکم کرتے ہو۔

ایک روایت میں حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ترجمہ نقل کیا ہے کہ لوگوں کو تم حکم دیتے ہو کہ دین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہو جاؤ اور خود عمل نہیں کرتے ہو۔ لوگوں کو حکم دیتے ہو کہ نماز قائم کرو، لیکن خود عمل نہیں کرتے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آدمی کو اس وقت فقیہ نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت اپنے نفس پر زیادہ سختی نہ کرے۔ نفس ایک ایسی چیز ہے جو سب سے زیادہ بُرائی پر ڈالنے والی ہے۔ آدمی اس وقت فقیہ ہوگا جب اپنی ذات کی بُرائیوں سے بغض رکھے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۵، البقرة: الآیة: ۴۴]

گناہ گار بھی تبلیغ کر سکتے ہیں:

حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہود کی یہ عادت تھی کہ اگر کوئی فیصلہ آجاتا اور رشوت نہ دی جاتی تو حق کا حکم دیتے اور اگر رشوت دی جاتی تو حق کو بدل دیتے تھے۔

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جو خود گناہ کرتا ہے وہ لوگوں کو نہ روکے۔ ان حضرات نے اسی آیت سے دلیل پکڑی ہے کہ جب تم خود اچھا کام نہیں کرتے ہو تو لوگوں کو اچھائی کا حکم کیوں کرتے ہو؟

لیکن ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ تقریر کرنا علیحدہ نیکی ہے اور عمل کرنا علیحدہ نیکی ہے۔ یہ نہیں کہ ایک نیکی نہ کرے تو دوسری نیکی کو بھی چھوڑ دے۔ جتنا ہو رہا ہے، وہ تو کرے۔ اور صحیح بات یہی ہے کہ عالم کو چاہیے کہ وہ بھلائی کا حکم کرتا رہے، چاہے خود نہ بھی کرتا ہو۔ اگر یہ بات لازم ہو جائے کہ صرف وہی بندہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے جس کے اندر خود کوئی گناہ نہ ہو تو پھر دنیا میں کوئی بندہ ایسا نہیں بچے گا جو تبلیغ کر سکے، کیونکہ ہر بندہ خطا کار اور گناہ گار ہے۔ معصوم تو صرف اللہ کے نبی ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ جب کسی عالم کی بات سنتے ہیں تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ اس شخص کا باپ تو بڑا عالم تھا، بہت بڑا متقی تھا اور بڑا اللہ والا تھا، مگر اس میں باپ والی

بات نہیں ہے۔ فرمایا: یہ بھی دراصل شیطان کا ایک دھوکہ ہوتا ہے، تا کہ اس سے جو دین کا فائدہ ہو رہا ہے اس کو ختم کر دوں۔ وگرنہ جب کوئی غیر صحابی، صحابی کے برابر نہیں ہوسکتا تو ہر بیٹا اپنے باپ کے برابر کیسے ہوسکتا ہے؟ کوئی شاگرد اپنے استاد کے برابر کیسے ہوسکتا ہے؟ کچھ نہ کچھ فرق تو ضرور ہوگا۔

اصل میں یہ دیکھنا ہے کہ ہمیں اس ماحول میں کیا کچھ مل رہا ہے؟ شکر و کرو کہ اس ماحول میں بھی کوئی اللہ کا نام لینے والا ہے، کوئی اللہ کی توحید بیان کرنے والا ہے اور اللہ کا قرآن پہنچانے والا ہے۔

اسی لیے حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر ایسی بات ہو جائے تو پھر دنیا میں کوئی حق کہنے والا ہی نہ بچے، کیونکہ ہر آدمی میں کوئی نہ کوئی خطا تو موجود ہوتی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: انہوں نے سچ کہا کہ کون ایسا آدمی ہے کہ اس کے اندر کوئی غلطی نہ پائی جائے۔

مفسر فرماتے ہیں: لیکن میں اپنی طرف سے یہ کہتا ہوں کہ یہ حالت بہت بُری ہے کہ لوگوں کو تو بھلائی کا حکم کرے اور خود گناہ کرے، لوگوں کو بُرائی سے منع کرے اور خود اس میں مبتلا ہو جائے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ کہنا نہ چھوڑے، تقریریں کرتا رہے، لیکن جب یہ عالم ہو کر گناہ کر رہا ہے تو یہ بے علم لوگوں سے زیادہ سزا کا حقدار بنے گا۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ جب ایک عالم غلطی کرتا ہے تو پھر لوگ اس کی اقتداء کرتے ہیں کہ دیکھو! اگر فلاں عالم صاحب ایسا کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی گنجائش ہے۔ اس وجہ سے ہزاروں لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہر عالم یہ کوشش کرے کہ پہلے خود عمل کرے اور پھر لوگوں کو کہے، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو امر کرنا جائز ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۵، البقرۃ: الآیۃ: ۴۴]

علم پر عمل کی ضرورت:

بہت ساری احادیث ایسی ہیں جن میں ایسے لوگوں کے لیے اور ایسے علماء کے لیے وعید آئی ہے جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتے۔ سب سے پہلے تو قرآن مقدس نے یہودیوں کے علماء کے بارے میں فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ [الجمعہ: ۵]

جن لوگوں پر ہم نے تورات کو رکھا، وہ تورات کے عالم بنے، ان کی مثال ایسے ہے جیسے گدھے پر کتابیں لاد دو تو اس کے لیے بوجھ ہی ہے، یہ کوئی فائدہ تو نہیں اُٹھا سکتا۔ اگر عالم علم پڑھنے کے بعد عمل نہ کرے تو گویا اس کی مثال

بھی ایسے ہوگئی کہ وہ بھی علم کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے، لیکن اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر رہا۔

بے عمل عالم کی مثال:

اسی طرح حدیث پاک میں آیا، حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَثَلُ الْعَالِمِ الَّذِي يُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ وَ لَا يَعْمَلُ بِهِ كَمَثَلِ السِّرَاجِ يُضِيءُ لِلنَّاسِ وَ يُحْرِقُ نَفْسَهُ.))

[درمنثور: ۱/۱۵۷، تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۵]

جو عالم لوگوں کو تو بھلائی کا حکم دے کہ تم نمازیں پڑھو، روزے رکھو، زکوٰۃ دو، برائی کے کام نہ کرو۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور خود عمل نہ کرے تو اس کی مثال شمع جیسی ہے کہ لوگوں کو تو روشنی پہنچا رہی ہے، لیکن خود جلتی جا رہی ہے۔ آپ نے شمع دیکھی ہوگی کہ اس سے گھر میں تو روشنی ہو جاتی ہے، آپ تو اس کی روشنی سے فائدہ اُٹھا لیتے ہیں، لیکن وہ خود جل جل کر ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بے عمل عالم اگر کچھ کہتا ہے تو دوسرے لوگ اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہوتے ہیں، لیکن وہ خود جہنم کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے۔

فرماتے ہیں: اس حدیث کے اندر سند کے اعتبار سے ضعف تو پایا جاتا ہے، لیکن بہرحال اس موضوع پر بہت ساری احادیث و روایات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے پاک پیغمبر ﷺ نے نقل فرمائیں۔ دوسری حدیث مبارکہ کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں نقل فرمایا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

((مَرَرْتُ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِي عَلَى قَوْمٍ تُقْرَضُ شِفَاهُهُمْ بِمَقَارِيضَ مِنْ نَارٍ قَالَ قُلْتُ: مَنْ هَؤُلَاءِ؟ قَالُوا: خُطَبَاءُ مِنْ أَهْلِ الدُّنْيَا كَانُوا يَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ يَنْسَوْنَ أَنْفُسَهُمْ وَ هُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا يَعْقِلُونَ.)) [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۱۲۲۱۱]

مجھے جس رات اسراء اور معراج ہوا، میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ہونٹ جہنم کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے اور وہ پھر ٹھیک ہو جاتے، پھر کاٹے جاتے تو پھر ٹھیک ہو جاتے۔ میں نے جبرائیل سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں جن کو اتنی سخت سزا مل رہی ہے؟ جبرائیل نے عرض کیا: میرے آقا! یہ آپ کی امت کے وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے تھے اور خود نہیں کرتے تھے۔ چونکہ ان کے ہونٹوں سے خیر کی وہ باتیں نکلتی تھیں جن پر یہ

خود عمل نہیں کرتے تھے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے لیے یہ سزا تجویز کی ہے۔ اور اس کے بعد انہوں نے پڑھا کہ وہ لوگوں کو تو بھلائی کا حکم کرتے تھے لیکن اپنی جانوں کو چھوڑ دیتے تھے۔

ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت فرمایا ہے کہ میں نے حضور پاک ﷺ سے سنا کہ میں معراج کی رات ایسی قوم پر گزرا کہ ان کے ہونٹ اور زبانیں جہنم کی مقراضوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا: جبرائیل! یہ کون لوگ ہیں؟ جبرائیل نے جواب دیا: یہ آپ کی امت کے وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو تو بھلائی کا حکم کرتے تھے لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۶، البقرة: الآیۃ: ۴۴]

مسئلہ معراجِ نبوی:

ان احادیثِ مبارکہ اور ان مسائل میں ایک بات سمجھ لیں۔ چونکہ حدیث ایک ہوتی ہے اور اس کے اندر بڑے بڑے مسائل پوشیدہ ہوتے ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ یاد رکھیں کہ معراج اور اسراء حق ہے اور اس کا منکر کافر ہے، کیونکہ قرآن مقدس سے اسراء بھی ثابت ہے اور آپ ﷺ کا معراج بھی ثابت ہے اور اسی طرح قرآن مقدس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اور پھر صحیح احادیث جن کو امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحاح میں نقل فرمایا ہے اور بڑی تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔

حضور ﷺ کے سفر کی ابتداء سے لے کر مسجد اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ اور معراج کے بعد مسجد اقصیٰ سے واپس آنے تک کے واقعات احادیث صحیحہ میں موجود ہیں۔ بعض لوگ جیسے منکرین حدیث...... اللہ تعالیٰ ان کے فتنوں سے بچائے...... اور اسی طرح بعض لوگ منکرین معجزات، اسی طریقہ سے بعض دہریین ہیں، مستشرقین ہیں، جنہوں نے حضور ﷺ کی معراج کا انکار کیا ہے، بڑے رکیک قسم کے حملے کیے ہیں، ان کے پاس نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی حجت ہے۔ بلکہ معراج حق ہے، اسراء حق ہے، قرآن واحادیث سے ثابت ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ معراج حضور ﷺ کے جسد مبارک کے ساتھ تھا یا روحانی معراج تھا؟

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم روحانی معراج کے قائل ہیں، لیکن اس میں بھی جمہور کی رائے یہی ہے کہ حضور ﷺ کو جاگتے ہوئے اور آپ کے وجود کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام نشانیاں دکھلائیں۔ اگر یہ خواب کا معاملہ ہوتا یا یہ صرف

روحانی معاملہ ہوتا تو پھر کفارِ مکہ کو اتنا بڑا اعتراض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔خواب تو کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔دنیا تو بڑے بڑے خواب دیکھ لیتی ہے، ان پر تو کبھی کوئی اعتراض نہیں کرتا۔اس لیے بہر حال جمہور کی رائے اسی طرف ہے کہ معراج حضور ﷺ کو روح اور جسد مبارک کے ساتھ ہوا۔

اور بعض احادیث مبارک میں کچھ یوں بھی اختلاف آیا ہے جس سے دشمنوں نے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ مثلاً حضور ﷺ نے ذکر فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام چھٹے آسمان پر ملے، یوسف علیہ السلام فلاں آسمان پر ملے۔تو انبیاء کی ترتیب میں اور آسمانوں میں ان سے ملاقات کے متعلق روایات میں ذرا اختلاف ہے۔ایک روایت میں اگر ایک پیغمبر سے ملاقات کا ذکر چھٹے آسمان پر آیا ہے تو دوسری روایت میں پانچویں آسمان پر آ گیا ہے۔دراصل یہ کوئی اختلاف یا تعارض نہیں ہے۔یہ عظیم واقعہ تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے جیسے سنا اور جیسے سمجھا اس کو روایت کر دیا۔اور دوسرا اس کے اندر کوئی اشکال نہیں ہے کہ انبیاء سے ملاقات مسجد اقصیٰ میں بھی ہوئی اور آسمانوں پر بھی ہوئی۔پھر یہ بھی ممکن ہے کہ مختلف آسمانوں پر مختلف انبیاء کی ملاقات متعدد بار ہوئی ہو، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام سے حضور ﷺ کی بار بار ملاقات ثابت ہے۔

مسئلہ عذابِ قبر:

اور یہ بات بھی یاد رکھیں کہ اس عذاب سے آخرت والا عذاب مراد نہیں، کیونکہ آخرت کا عذاب تب ہوگا جب یہ دنیا فنا ہو جائے گی، اس عالم کو اللہ تبارک وتعالیٰ فنا کر دیں گے۔پھر ساری مخلوق کو دوبارہ اُٹھایا جائے گا، قیامت قائم ہوگی، ساری مخلوق میدانِ محشر میں جمع ہوگی، پھر ان کا میزانِ عمل ہوگا، صحائف کی تقسیم ہوگی، حساب کتاب ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو گواہ لائیں گے اور اگر کوئی انکار کرے گا تو اُمتِ محمد مصطفیٰ ﷺ کو بطورِ گواہ لایا جائے گا، پھر اگر کوئی انکار کرے گا تو اس کے اپنے بدن کا ذرہ ذرہ گواہی دے گا اور اس کے بعد جنت اور جہنم کے فیصلے ہوں گے۔لہٰذا عذابِ اُخروی اس وقت شروع ہوگا جب میدانِ حشر قائم ہوگا اور عالم آخرت شروع ہوگا۔

یہ جتنے واقعات ہم احادیث مبارک میں پڑھ رہے ہیں کہ حضور پاک ﷺ نے اپنی مبارک آنکھوں سے دیکھا کہ بعض لوگوں کے ہونٹ اور زبانیں کاٹی جارہی تھیں، یہاں عالم برزخ کے عذاب کا تذکرہ ہے۔(حضور اکرم ﷺ کو عالم مثال کے طور پر دکھایا گیا ہے یا سابقہ امتوں کے علماء کو عذاب دکھایا گیا ہے یا ان کو دیا جانے والا جو عذاب حضور اکرم ﷺ کو نظر آرہا تھا وہ ان کی قبر کا عذاب تھا، لیکن حضور اکرم ﷺ کے سامنے سے ان



کے معراج کے موقع پر ان کی قبر تک کے فاصلہ کو ہٹا دیا گیا تھا)۔ جیسے حضور ﷺ دو قبروں پر گزرے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ، وَ مَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ.))

''ان دو قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے، اور کسی بڑے گناہ کی وجہ سے بھی نہیں ہو رہا۔''

[صحیح بخاری، حدیث: ۱۳۷۸، باب: عَذَابِ القَبْرِ مِنَ الغِيبَةِ وَالبَوْلِ]

اسی طرح حضور ﷺ اپنے ایک صحابی کو دفن کیا، اس صحابی کو ''ضغطة القبر'' آیا تو حضور ﷺ نے ان کے لیے اللہ کی پناہ مانگی تو اللہ سے ان پر قبر کو کشادہ فرما دیا۔ [المعجم الکبیر، حدیث: ۱۳۵۵۵]

یہ سارے واقعات عذابِ قبر وغیرہ پر دلالت کرتے ہیں۔

اس لیے یاد رکھیں! ''عَذَابُ القَبْرِ حَقٌّ'' (قبر کا عذاب حق ہے) اور اس کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو گم کردہ راہ ہیں، جو منکرین حدیث ہیں اور جو اللہ کے قرآن میں بھی بلا وجہ تاویلاتِ بعیدہ کرتے ہیں۔ اگر اس کو عذابِ قبر نہ مانیں تو ساری حدیثیں غلط ہو جائیں۔ وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کو جو عذاب دکھایا جا رہا تھا وہ عالم دنیا کا تو نہیں تھا، اس لیے کہ اس وقت وہ لوگ مر چکے تھے، جبکہ ابھی آخرت شروع نہیں ہوئی۔ اور دنیا و آخرت کے درمیان یہی برزخ ہی تو ہے۔

اور یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ عذابِ قبر کے لیے قبر کا وجود ضروری ہے۔ کوئی بندہ جہاں ہے وہیں اس کی قبر ہے۔ کوئی پانی میں ڈوب گیا تو وہی اس کے لیے قبر ہے، کوئی آگ میں جل گیا تو گویا آگ اس کے لیے قبر ہے، کوئی آدمی غاروں میں دب گیا تو وہی جگہ اس کے لیے قبر ہے، کسی کو سمندر میں ڈال دیا گیا تو وہی اس کے لیے قبر ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے آگے ان کو عذاب دینا یا ان کو راحت و آرام پہنچانا کوئی مشکل نہیں ہے۔ لوگوں کو مشکلات اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ بعض اوقات لوگ اپنی حیثیت کا قیاس کرتے ہیں، اپنی قوت اور اپنے علم پر قیاس کرتے ہیں، جس کی وجہ سے پھر جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔

مثلاً دنیا کے اندر آدمی ہے، اس نے ایک سو کتابیں تالیف کیں، اس کو اللہ نے اتنا کام کرنے کی توفیق دی، جبکہ اس کے مقابلہ پر ایک آدمی ہے جس نے ایک قاعدہ بھی نہیں لکھا۔ اب اگر یہ آدمی سوچے کہ جب میں نے کچھ نہیں لکھا تو اس نے بھی کچھ نہیں لکھا ہوگا۔ تو یہ جہالت ہوتی ہے۔ بندوں کے اندر تو تفاوت ہے کہ ایک آدمی محنت کرتا

ہے اور وہ عظیم سے عظیم کامیابی حاصل کرتا ہے اور دوسرا محنت نہ کرنے کی وجہ سے پیچھے رہ جاتا ہے، لیکن بندہ مخلوق کی طاقت کو خالق کی طاقت پر قیاس نہ کرے، کیونکہ خالق تو خالق ہے، اس کی تو یہ شان ہے:

﴿إِذَا قَضَىٰٓ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ۝﴾ [آل عمران: ۴۷]

اور دوسرا دھوکہ آدمی کو اس لیے لگتا ہے کہ عالم برزخ، عذاب قبر یا قبر کی زندگی، قبر کے اندر آرام یا تکلیف کا ہونا، علم غیب ہے اور علم غیب سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا علم ہے جو مغیبات سے تعلق رکھتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ چاہتے ہیں تو کبھی کبھی ظاہر فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے واقعات موجود ہیں کہ قبریں کھودی گئیں تو سانپ اور بچھو پائے گئے۔ ایسے واقعات بھی موجود ہیں کہ سالوں کے بعد قبر کھولی گئی تو میت ٹھیک ٹھاک سالم ہے اور اس کے اندر کوئی تغیر بھی نہیں آیا۔ کفن بوسیدہ ہو گیا ہے، لیکن لاش اسی طرح رکھی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ اس کو آج ہی دفن کیا گیا ہے۔

اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں کے لیے دنیا کے اندر اپنی ان قدرتوں کا اظہار فرما دیتے ہیں کہ کوئی بندہ انکار نہ کر سکے، کوئی بندہ حجت قائم نہ کر سکے کہ مجھے تو یہ بات سمجھ نہیں آسکی یا میری عقل یہاں تک نہ پہنچ سکی۔ اللہ نے اپنے انبیاء کو جتنے معجزات دیئے ہیں، جتنی آیات بینات ہیں، ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ اس دنیا میں بھی کھول کر بیان کر دیتے ہیں، تاکہ کسی کو کل کو کوئی اعتراض کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ اور اسی طرح بڑے بڑے علماء نے حدیثوں کی شروحات میں جو بحثیں فرمائی ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم تک تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے ہیں، ان کو جتنے معجزے ملے ہیں، ان کو اللہ دنیا میں بھی ظاہر کر دیتے ہیں، تاکہ کل کو کوئی آدمی معجزے کا انکار نہ کر سکے اور یہ تصور بھی نہ کر سکے کہ جناب! یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک تخت ہو اور اس پر حضرت سلیمان علیہ السلام بیٹھے ہوں اور پھر اسی پر آپ کے چار ہزار وزراء بیٹھے ہوں، پھر جنات بیٹھے ہوں اور وہ تخت اُڑتا جا رہا ہو۔

اب دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ انسانوں کی بنائی ہوئی چیزیں اُڑ رہی ہیں۔ اگر بندے اپنی عقل سے اتنی اختراعات کر سکتے ہیں اور جو اُن بندوں کا خالق ہے، اس کے لیے یہ کام کون سا مشکل ہے؟ اس لیے جتنے معجزات گزرے، دنیا میں ان کی تصدیق کا کوئی نہ کوئی نمونہ سامنے ہے، تاکہ کوئی بندہ اللہ کی قدرت کا انکار نہ کر سکے، اللہ کے ان انبیاء کے معجزات کا انکار نہ کر سکے۔

اس لیے یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ یہ جتنے واقعات حضور ﷺ کو دکھائے گئے، ان میں عالم برزخ کا انکشاف تھا۔

جنت کا باغ یا جہنم کا گڑھا:

اور یہ بھی یاد رکھیں کہ نعمتیں اور عذاب اسی قبر سے شروع ہو جاتے ہیں۔ یعنی مومن (جو عقیدۂ توحید، عمل صالح اور خاتمہ بالخیر کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوگیا) کے لیے آرام و راحت یہاں مرنے سے شروع ہو جاتا ہے، یعنی روح نکلنے کے وقت سے شروع ہو جاتا ہے۔ ابھی اس کی روح نکلنے کی گھڑی قریب آتی ہے تو ملائکہ جلوس کی شکل میں آتے ہیں، اس کا استقبال کرتے ہیں، جنت کی خوشخبریاں دیتے ہیں۔ تم تو اس کے جسم کو کفن پہناتے ہو اور اللہ کے فرشتے اس کی روح کے لیے کفن جنت سے لے کر آتے ہیں، جنت سے خوشبوئیں لے آتے ہیں اور پھر وہ اس کو جنت والے کفن میں لپیٹتے ہیں، پھر جب اوپر لے جاتے ہیں تو ہر آسمان سے سوال ہوتا ہے کہ کس کی روح لے کر جا رہے ہو؟ فرشتے کہتے ہیں کہ یہ فلاں بن فلاں کی روح ہے۔ تو کہتے ہیں: مبارک ہو! اللہ نے کرم فرمایا، اس کا خاتمہ ایمان پر ہوگیا۔ اسی طرح وہ روح اعلیٰ علیین تک چلی جاتی ہے۔ اور کافر یا گناہگار مومنین کو دیا جانے والا عذاب...... اللہ معاف کرے...... مرنے سے ہی شروع ہو جاتا ہے، ملائکہ جب روح کھینچنے کے لیے آتے ہیں تو ان کے ساتھ ملائکۃ العذاب بھی ہوتے ہیں، وہ آ کر اس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں: اے خبیث روح! تو ایک گندے جثہ میں تھی، جلدی نکل باہر اپنے ایسے رب کے آگے جو تیرے اوپر ناراض ہے۔ اور پھر وہ اس کو اس طرح نکالتے ہیں جیسے کسی بندے کے جسم کو لوہے کی کنگھی سے چھیدا جائے۔ اس انداز میں اس کی روح نکالی جاتی ہے، پھر اس روح کو نیچے سجین میں لے جاتے ہیں اور اس کے بعد عذابِ قبر شروع ہو جاتا ہے۔

[سنن النسائي، حديث: ۱۸۳۳، المعجم الاوسط، حديث: ۴۶۲]

مومن بندے کو قبر میں ہی راحتیں ملنا شروع ہوگئیں۔ سوال و جواب شروع ہوگیا۔ اگر اس نے صحیح صحیح جواب دے دیئے تو اس کے لیے قبر کو کھول دیا گیا، جنت کی طرف کھڑکی کھول دی گئی اور اس کی راحتیں شروع ہوگئیں۔ اب یہ تو نہیں کہ وہ راحتیں اور نعمتیں ہمیں نظر آرہی ہوں۔ اب تو دنیا میں بھی ایسی چیزیں ہیں جنہیں بعض لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا ہوتا۔

جیسے ہمارے دیہات کے رہنے والے نئے حاجی صاحبان آتے ہیں۔ چونکہ انہوں نے کبھی ایئر کنڈیشنڈ نہیں دیکھا ہوتا تو حرم میں داخل ہوتے ہی کہتے ہیں: یار! حرم اتنا ٹھنڈا کیسے ہے؟ یہ ٹھنڈی ہوا کدھر سے آرہی ہے؟

ستون کو ہاتھ لگا کر بے چارے دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ تو دنیا کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں اور اللہ جس کو ٹھنڈک پہنچانا چاہیں اس کے آگے کیا مشکل ہے؟ وہ پروردگارِ عالم بھڑکتی ہوئی آگ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے گلزار بنا سکتے ہیں تو وہ اس مٹی والی قبر میں نہیں بنا سکتے؟ ان کے آگے ایسی کون سی مشکل بات ہے؟

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ یہ تمام احادیث عالم برزخ پر دلالت کر رہی ہیں، ان کا تعلق قبر سے ہے۔ عذاب، قبر سے ہی شروع ہو جاتا ہے اور مزید عذاب آخرت میں ہوگا۔ اصل عذاب نہ دنیا کا ہے اور نہ قبر کا ہے، بلکہ اصل عذاب آخرت کا ہے۔ قبر کا عذاب بھی ایک دن ختم ہو جائے گا اور عالم برزخ بھی ایک دن ختم ہو جاتا ہے، پھر عالم آخرت آئے گا۔ اس لیے قرآن مقدس میں آتا ہے کہ جب وہ عالم آخرت کے عذاب کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ وہ قبر ہمارے لیے بہتر تھی، قبر کا عذاب پھر بھی تھوڑا تھا، اس عذاب کے ختم ہو جانے کی پھر بھی اُمید تھی اور یہ تو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

اور یہ قاعدہ ہے کہ جو عضو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، اللہ کی طرف سے اسی عضو پر عذاب آتا ہے۔ چونکہ جھوٹ بولنے کا تعلق زبان سے ہے، اسی طرح لوگوں کو بھلائی کا حکم دینے اور خود عمل نہ کرنے کا تعلق بھی زبان سے ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ حکم دیں گے کہ ان کی زبانیں کاٹو۔ اور یہ بھی نہیں ہوگا کہ ایک دفعہ کاٹ دی تو معاملہ ختم، بلکہ وہاں قاعدہ یہ ہے کہ جب اللہ کا عذاب شروع ہوگا تو زبان کے ایک دفعہ جل جانے کے بعد فوراً دوسرا چمڑا پیدا ہو جائے گا۔ زبان کٹے گی اور پھر ٹھیک ہو جائے گی۔ اسی طرح وہ عذاب کو بھگتتا رہے گا، تاکہ ہر دفعہ اسے عذاب کی نئی تکلیف پہنچتی رہے۔

جلد کو عذاب دینے میں حکمت:

بعض علماء نے فرمایا کہ قرآن مقدس کی اس آیت کی حکمت سے اندازہ کریں کہ اللہ نے فرمایا:

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ﴾ [النساء:٥٦]

''جب بھی ان کی کھالیں جل جل کر پک جائیں گی تو ہم انہیں ان کے بدلے دوسری کھالیں دے دیں گے، تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔''

آج کی دنیا کی جدید تحقیق نے بھی یہ بات مان لی ہے کہ سب سے زیادہ تکلیف جلد سے ہوتی ہے۔ آپ نے کبھی

انجیکشن لگوایا ہو تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جب سوئی داخل ہونے لگتی ہے تو درد ہوتا ہے پھر آگے درد نہیں ہوتا۔ اور اگر سوئی بہت زیادہ تیز اور نئی ہو تو کم درد ہوتا ہے اور اگر کبھی کسی غلط جگہ پر سوئی لگ جائے تو زیادہ درد ہوتا ہے۔ چونکہ تاثیر اور اثر کا تعلق جلد کے ساتھ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جلد کے عذاب کا ذکر کیا کہ ہم اس جلد کو فوراً بدل دیں گے، جس کی وجہ سے اسے نیا عذاب محسوس ہوگا۔ یہ نہیں کہ ایک دفعہ عذاب ہو جائے تو دوبارہ عذاب محسوس نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ کی حقانیت کی دلیل:

اللہ تعالیٰ نے چودہ سو سال پہلے قرآن مقدس میں ان الفاظ مبارک کو اپنے پاک پیغمبر پر نازل فرما کر یہ بات ثابت کردی کہ حضور ﷺ نے ہمیں جو باتیں بتلائی ہیں، وہ صحیح ہیں، اس لیے کہ انہیں اللہ نے خبر دی ہے۔ وہاں کوئی میڈیکل کالج نہیں تھے، ریسرچ سنٹرز بھی نہیں تھے، جدید تحقیقاتی ادارے بھی نہیں تھے، اور نہ ہی بڑے بڑے لوگ بیٹھ کر مشینریوں پر تحقیق کر رہے تھے۔ صاف بات ہے کہ یہ خبر دینے والے پروردگار عالم ہیں جنہوں نے اپنے نبی ﷺ کو اس بات کی خبر دی، جس کو ہم نہیں جانتے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف جلد کو ہی عذاب ہوگا، بلکہ جہنم کا عذاب اتنا گہرا ہوگا جو دلوں تک کو جھانک لے گا، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ﴾ [الہمزہ: ۷]

امام احمد ؒ نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت ابی وائل کہتے ہیں کہ میں حضرت اسامہ کا ردیف تھا، یعنی ہم دونوں ایک سواری پر بیٹھے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ عثمان سے بات کیوں نہیں کرتے؟ انہوں نے فرمایا: دیکھو! میں نہیں چاہتا کہ اپنی طرف سے کسی نئی بات کا افتتاح کر بیٹھوں اور میں کسی کو یہ نہیں کہوں گا کہ وہ پوری دنیا سے زیادہ بہتر ہے، چاہے مجھ پر امیر اور حاکم ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ اصل حقیقت کا پتہ تو اللہ کو ہوتا ہے کہ خیر ہے یا نہیں ہے۔ میں نے تو حضور ﷺ سے سنا ہے۔ میں نے پوچھا: کیا سنا؟ انہوں نے کہا: میں نے سنا، حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ایک آدمی کو لایا جائے گا اور اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اس کی آنتیں نکل آئیں گی، وہ انہی کے ساتھ ایسے چکر لگا رہا ہوگا جیسے کسی گدھے کو باندھ دیا جائے اور وہ کسی چکی کے ساتھ چکر لگا رہا ہو...... بعض چکیاں ایسی ہوتی ہیں جن پر اونٹ چلتے ہیں، بعض چکیاں ہوتی ہیں جہاں بیل چلتے ہیں، بعض ملکوں کے اندر چکیاں ہوتی ہیں ان پر خچر اور گدھے کو بھی لگا دیتے ہیں تو وہ ان کو گھماتا رہتا ہے...... اس کو جہنم میں ڈالا جائے گا تو وہ اپنی آنتوں میں اسی طرح جکڑا ہوا پھر رہا ہوگا، اس کا پیٹ پھٹے گا اور اس کی آنتیں اس کو ایسے لے لیں گی جیسا کہ چکی

پھیرنے کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ اس کو جب لوگ دیکھیں گے تو کہیں گے: تمہیں کیا ہوگیا؟ تم اس عذاب میں کیسے آگئے؟ کیا تُو دنیا میں ہمیں اچھے کاموں کا حکم نہیں دیتا تھا اور برائی سے نہیں روکتا تھا؟ تُو تو ہمیں تقریریں کرتا تھا، تیری تقریریں سن کر ہم ٹھیک ہو گئے اور تمہیں کیا ہوگیا کہ تم جہنم میں پڑے ہو؟ وہ کہے گا: اس کی وجہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں کو تو کہتا تھا، لیکن خود بھلائی کے کام نہیں کرتا تھا۔ میں تم لوگوں کو تو برائی سے منع کرتا تھا، لیکن خود برائیوں سے نہیں رکتا تھا، اس لیے اللہ نے مجھے اس عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ [مسند احمد، حدیث: ۲۱۷۸۴]

جیسا کہ حضور ﷺ نے مثال دی ہے اور روایات میں بھی آیا ہے کہ جو لوگ دوسروں کو نیکی کا حکم کرتے ہیں اور خود عمل نہیں کرتے، ان کی مثال دیئے اور شمع کی سی ہوتی ہے کہ شمع کو جلا دو تو روشنی کر دیتی ہے، لیکن وہ خود جلتی چلی جا رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح بے عمل عالم لوگوں کو تو فائدہ پہنچا رہا ہوتا ہے، لیکن خود جلتا رہتا ہے۔

[درمنثور: ۱/۱۵۷، تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۵]

یہی تو وجہ ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی زبانوں سے لاکھوں لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن خود بیچارے برباد ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے، لیکن اس کے گھر والوں کو فائدہ نہیں پہنچتا۔ لاکھوں کو فائدہ پہنچتا ہے، لیکن اس کے دوستوں کو فائدہ نہیں پہنچتا۔ لاکھوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، لیکن اپنے اقرباء کو فائدہ نہیں پہنچاتے۔ لاکھوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، لیکن اپنے نفس کو فائدہ نہیں پہنچاتے اور خود اس نیکی پر عمل نہیں کرتے۔ اس لیے یہ بڑی سخت وعید آئی ہے۔ عالم کو چاہیے کہ وہ کبھی ایسی بات کرے تو اس پر خود بھی عمل کرنے کی کوشش کرے۔

حقیقی عالم؟

''عالم'' اس کو نہیں کہا جاتا جس کے دماغ میں معلومات کا ذخیرہ ہو۔ عالم کا معنی وہ ہے جو قرآن ہمیں سمجھاتا ہے:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ﴿٢٨﴾﴾ [فاطر: ۲۸]

عالم وہ ہیں جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ ''إِنَّمَا'' حصر کے لیے ہے، یعنی سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے علماء ہیں۔ تو جو ڈرنے والا ہو وہ برائی کیسے کرے؟ وہ حرام کیسے کھائے گا؟ وہ جھوٹ کیسے بولے گا؟ وہ سود کیسے کھائے گا؟ وہ لوگوں کو دھوکہ کیسے دے گا؟

اس لیے علماء نے فرمایا: علم کے بعد دیکھو کہ اس میں خشیت پیدا ہوئی ہے یا نہیں؟ اگر اس کے اندر خشیت نہیں ہے تو مجرد علم تو کتابیں بھی ہوتی ہیں، لائبریریاں بھی ہوتی ہیں۔ آج کل ایسا وقت بھی آگیا، آج کل کمپیوٹر آگئے ہیں،



ایسی ایسی چیزیں آ گئی ہیں کہ پوری کتاب ایک چھوٹے سے کارڈ کے اندر بند کر دیتے ہیں۔ کیا پھر ہم اس کمپیوٹر کو بھی عالم کہیں گے؟ عالم اسے کہتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والا ہو، جو جنت اور جہنم کو جانتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے قہار ہونے کی صفت کو جانتا ہو، اللہ تعالیٰ کے سَرِیْعُ الْحِسَاب ہونے کی صفت کو جانتا ہو، اللہ تعالیٰ کے شَدِیْدُ الْعِقَاب ہونے کی صفت کو جانتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَام ہونے کی صفت کو جانتا ہو۔ ایسا بندہ گناہ کیسے کر سکتا ہے؟ اور اگر کبھی اس سے غلطی ہو جائے گی تو وہ پگھل جائے گا، وہ ڈرے گا، وہ دوڑے گا، جب تک اپنے پروردگار سے معافی نہ لے لے اس وقت تک اس کو چین ہی نہیں ملتا۔ آپ نے سنا نہیں کہ صحابہ سے جب کوئی غلطی ہوتی تھی تو فوراً دوڑ کر آتے کہ حضور! ہمیں پاک کر دو، دنیا میں سزا دے دو، آخرت کی سزا نہیں چاہیے۔

شیطان نے آدم علیہ السلام کو دھوکہ دیا کہ اگر اس درخت کو کھا لو گے تو ہمیشہ جنت میں رہو گے اور اگر نہیں کھاؤ گے تو نکالے جاؤ گے، زمین میں بھیجے جاؤ گے۔ آدم علیہ السلام اس کی قسم کے دھوکے میں آ گئے، تا کہ میں اللہ کے قرب میں رہوں، میں یہ بعد حاصل نہ کروں، لیکن اس کے باوجود جب غلطی ہو گئی تو تین سو سال تک آپ روتے رہے، اللہ کے آگے فریاد کرتے رہے:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٢٣﴾﴾ [الاعراف: ۲۳]

دیکھا نہیں کہ روتے روتے حضرت نوح علیہ السلام کے رخساروں پر گڑھے پڑ گئے تھے، جیسے کوئی نہر چلتی رہی ہو۔ اس لیے ان کا لقب ''نوح'' رکھا گیا۔

علم کا معنی صرف معلومات نہیں ہیں۔ یہی تو مشکل ہے کہ لوگوں کو کہو تو ان کو غصہ آ جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ پروفیسر ہے، اس کے پاس P.H.D کی ڈگری ہے اور یہ لوگ اس کو عالم نہیں مانتے۔ خدا کے بندے! علم، ڈگریوں کا نام نہیں ہے، علم کسی عہدے کا نام نہیں ہے، علم لچھے دار تقریروں کا نام نہیں ہے، علم زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرنے کا نام نہیں ہے۔ ایسے تو بڑے بڑے انگریز گزرے ہیں جنہوں نے انسائیکلو پیڈیے مرتب کر ڈالے ہیں، ایسے تو بڑے بڑے انگریز سیاح گزرے ہیں کہ دنیا کے طبقات الارض پر بحثیں لکھ ڈالی ہیں، لیکن جس نے اپنے خالق کو نہ جانا تو وہ کیسا عالم ہے؟ اگر اس کو توحید کا مسئلہ ہی سمجھ نہیں آیا تو عالم کیا ہوا؟ اگر اس کو اللہ کے نبیوں کی نبوت اور رسالت سمجھ نہ آئی تو عالم کیا ہوا؟ اگر اس کو جنت اور جہنم کی بات سمجھ نہیں آئی تو پھر عالم کیا ہوا؟ پھر اگر اللہ کا ڈر اس کے دل میں پیدا نہیں ہوا تو پھر وہ عالم کیسے ہوا؟

علم اسے کہتے ہیں کہ جس کے بعد خشیت پیدا ہو، تواضع پیدا ہو، اللہ کا ڈر پیدا ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو اور اس کا قدم عین سنت کے مطابق ہو، کبھی غلطی نہ کرے۔ بحیثیت ایک انسان کے پھسل جائے تو توبہ کرے، اللہ کے توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ اور امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو سلیمان بن مہران الاعمش سے نقل کیا ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يُعَافِي الْأُمِّيِّينَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا لَا يُعَافِي الْعُلَمَاءَ.))

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جاہلوں کی زیادہ بخشش کریں گے بہ نسبت علماء کے۔"

[کنز العمال، حدیث: ۲۸۹۸۴]

ایک عالم اور ایک جاہل کے غلطی کرنے میں بڑا فرق ہے۔ جاہل کو تو پتہ نہیں تھا، لیکن عالم علم کے بعد غلطی کر رہا ہے۔ اس لیے جاہلوں کو زیادہ معافیاں ملیں گی۔ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ جو شخص صحیح معنوں میں عالم ہوگا تو اس کا درجہ بھی اتنا ہی بلند ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص علم دین کے لیے سفر کر رہا ہو اور اسے راستے میں موت آجائے تو اس کے اور انبیاء کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا۔

[سنن الدارمي، حديث: ۳۳۶، بابٌ: في فَضْلِ الْعِلْمِ وَالْعَالِمِ]

اس سے آپ اندازہ لگالیں کہ اگر یہ طالب علم کا مقام ہے تو عالم کا مقام کیا ہوگا؟ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں عالم ہو۔

اس لیے آتا ہے کہ عالم کی نیند بھی عبادت ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ نیند کرے گا تو اگلے سبق کے لیے تیار ہوگا۔ خود سمجھے گا تو آپ کو سمجھائے گا۔ اس لیے اس کی نیند بھی عبادت شمار ہوتی ہے۔ اور اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ نے فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ [الزمر: ۹]

"کہہ دیجیے جو علم والے ہیں اور جو علم والے نہیں ہیں، وہ برابر ہو سکتے ہیں؟"

کسی مقام پر اللہ نے فرمایا کہ اندھا اور آنکھوں والا کبھی برابر ہو سکتا ہے؟ یعنی برابر نہیں ہو سکتے۔ اندھا اسے کہا گیا ہے جو نہیں جانتا اور آنکھوں والے سے مراد جاننے والا ہے، یعنی عالم اور جاہل کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ لیکن عالم ہونے کے بعد جو اللہ سے نہ ڈرے تو پھر اس کے لیے عذاب بھی اتنا ہی سخت ہے، پکڑ بھی اتنی زیادہ ہے۔ اس لیے فرمایا کہ جاہلوں کو تو زیادہ معافی ملے گی، لیکن اہل علم کو کم ملے گی۔

البتہ یہ بات یاد رکھیں کہ عالم پر یہ عذاب تب ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں بغاوت کر کے نافرمانی کرے۔ اگر ویسے اس سے غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو علم دین کی وجہ سے بھی عذاب نہیں دیں گے۔ کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن عالم کو فرمائیں گے کہ میں نے تجھے عذاب دینے کے لیے اپنا علم نہیں دیا تھا۔[1] "اَلْمُتَّجِرُ الرَّابِحُ" اسی طرح آیا کہ جاہل کے لیے ستر مرتبہ استغفار اور عالم کے لیے ایک، کیونکہ عالم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝﴾ [الزمر:۹]

بنی اسرائیل پر اللہ کے زیادہ عذاب اور ناراضی اس لیے آئی، کیونکہ وہ کتاب جاننے والے تھے، وہ علم کو جاننے والے تھے، تورات کو جاننے والے تھے۔

ابن عساکر نے بھی ولید بن عقبہ کے قصہ میں ایک روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ أُنَاسًا مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ يَطَّلِعُونَ إِلَى أُنَاسٍ مِنْ أَهْلِ النَّارِ فَيَقُولُونَ بِمَ دَخَلْتُمُ النَّارَ؟ فَوَاللهِ مَا دَخَلْنَا الْجَنَّةَ إِلَّا بِمَا تَعَلَّمْنَا مِنْكُمْ، فَيَقُولُونَ إِنَّا كُنَّا نَقُولُ وَلَا نَفْعَلُ.))

[تاریخ دمشق لابن عساکر، رقم:۸۰۳۳]

"جنت میں جانے والے لوگ جہنم میں جانے والے لوگوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے: لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم بھی جہنم میں آ گئے ہو؟ ہم تو تم سے سیکھ کر جنت میں پہنچے اور تم خود جہنم میں کھڑے ہو۔ وہ کہیں گے: ہاں! ہم تم لوگوں کو تو کہتے تھے لیکن خود نہیں کرتے تھے۔"

یعنی تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے تھے لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کے خلاف کرتے تھے۔ اس وجہ سے تمہیں تو نجات مل گئی اور ہمیں عذاب ہو رہا ہے۔

---

[1] [جامع الاحادیث، حدیث:۲۶۵۲۱، باب: البناء مع الباء]

مبلغ کے لیے ضروری صفات:

ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: حضرت! میری خواہش ہے کہ میں لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کروں۔ یعنی لوگوں کو بھلائی کا کہوں اور برائی سے منع کروں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اچھا! اس مرتبہ پر پہنچ گئے ہو؟ اس نے کہا: حضرت! میں اس قابل تو نہیں ہوا، لیکن امید تو کرتا ہوں کہ اللہ مجھے اس قابل بنا دے۔ آپ نے فرمایا: اللہ کے قرآن کی تین آیات کی وجہ سے اپنے آپ کو شرمندہ نہ کرنا۔ اس نے پوچھا: حضرت! وہ کون سی آیات ہیں؟ آپ نے یہ آیت پڑھی:

﴿أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٤٤﴾﴾ [البقرۃ: ۴۴]

اور فرمایا: کیا تم اس آیت کے مطابق ہو کہ لوگوں کو وعظ کہتے رہو؟

پھر دوسری آیت پڑھی:

﴿لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴿٢﴾ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴿٣﴾﴾ [الصف: ۲،۳]

اس نے کہا: حضرت! اس مقام پر پہنچنا بڑا مشکل ہے، سب سے ناپسندیدہ چیز اور بڑی بغض والی چیز اللہ کے ہاں یہ ہے کہ جو تم کہو اور نہ کرو۔ آپ نے فرمایا: کیا یہ آیت تم پر منطبق ہوتی ہے؟ اس نے کہا: حضرت! میں اس پر پوری طرح تو منطبق نہیں ہو سکتا۔

آپ نے فرمایا: چلو اچھا! اس بات کو یاد کرو جو حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا:

﴿وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ ۚ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ...﴾ [ہود: ۸۸]

اے میری قوم! ایسی بات نہیں کہ میں تمہیں تو کسی کام سے منع کروں اور خود اسے کرتا رہوں، بلکہ میں تمہیں انہی چیزوں سے منع کرتا ہوں جن سے خود بھی رکتا ہوں اور ایسی چیزوں کے کرنے کا تمہیں حکم دیتا ہوں جن کو میں خود بھی سرانجام دیتا ہوں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اصلاح ہو۔

پوچھا: اس پر عمل ہو گیا؟ اس نے کہا: حضرت! میں تو اس مرتبہ پر بھی نہیں پہنچا۔ آپ نے فرمایا: جلدی نہ کرو، پہلے اپنے نفس کو تبلیغ کرو، پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرو، پہلے اپنے نفس کو سیدھا کرو، جب تمہاری اصلاح ہو جائے تو

پھر تم لوگوں کو امر بالمعروف کرو اور نہی عن المنکر کرو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۶، البقرۃ: الآیۃ: ۴۴]

آج کے مسلمان!!!

مجھے ایک آدمی نے ایک بات سنائی۔ وہ بات سن کر مجھے ہنسی بھی آرہی تھی اور رونا بھی آرہا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ ہمارے ملک میں جو مرغی بکتی ہے اس کی قیمت پچاس روپے ہوگئی ہے اور وہ وزن کے اعتبار سے بکتی ہے۔ چنانچہ لوگ بیچنے سے تھوڑی دیر پہلے اس کو آٹا اور دانے وغیرہ کھلا دیتے ہیں، تاکہ آدھا چھٹانک اس کا وزن اور بڑھ جائے۔

یہ مسلمانوں کا حال ہے!! گائے بیچیں گے تو تین دن تک اس کا دودھ نہیں نکالیں گے، گاہک بیچارا آئے گا، دیکھے گا تو کہیں گے: آپ ہمارے سامنے اس کا دودھ نکال کر دیکھ لیں۔ وہ دودھ نکالتا ہے تو آٹھ سیر دودھ نکلتا ہے۔ کہتا ہے: سُبْحَانَ اللّٰہِ!۔ اسی گائے کو جب وہ گھر لے جاتا ہے تو آٹھ چھٹانک بھی دودھ نہیں دیتی۔ پھر پہلے مالک سے جا کر کہتا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اب گھر بدل گیا ہے، بیچارا جانور ہے، گھر تبدیل ہو جائے تو اس پر کافی دن اثر رہتا ہے۔ دو چار مہینے تو صبر کرو۔

داعی کے لیے وعید:

علامہ طبرانی رحمہ اللہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ دَعَا النَّاسَ إِلَى قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ فَلَمْ يَعْمَلْ هُوَ بِهِ؛ لَمْ يَزَلْ فِي سَخَطِ اللّٰهِ حَتَّى يَكُفَّ أَوْ يَعْمَلَ مَا قَالَ أَوْ دَعَا إِلَيْهِ)) [المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث: ۱۳۹۱۹]

”جو آدمی کسی کو کسی قول و عمل کی طرف بلائے اور خود نہ کرے تو وہ اللہ کے عذاب اور اللہ کی سختی کے سائے میں ہوتا ہے۔ جب تک کہ وہ اس بری بات کو نہ چھوڑے یا اس پر عمل نہ کرے۔“

حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں ان تین آیات کی وجہ سے لوگوں کو قصے وغیرہ بیان کرنے سے ڈرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگوں کو تقریریں کروں اور ان کو قصے سناؤں۔ وہ تین آیات یہ ہیں (پھر آپ نے انہی تین آیات کا ذکر کیا جو اس سے پہلے آپ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی پڑھ چکے ہیں)۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۶، البقرۃ: الآیۃ: ۴۴]



﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۴۵، ۴۶]

اور صبر سے اور نماز سے مدد پکڑو اور البتہ وہ بھاری ہے، مگر عاجزی کرنے والوں پر۔ جن کو خیال ہے کہ وہ اپنے رب کے رُوبرو ہونے والے ہیں اور یہ کہ ان کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

﴿وَاسْتَعِيْنُوْا﴾ جہاں ''سین'' اور ''تاء'' آ جائے وہاں طلب کا معنیٰ بھی آ جاتا ہے کہ مدد پکڑو صبر اور نماز کے ساتھ۔

آیت کے اوّلین مخاطب:

قرآن کی ان آیات کے پہلے مخاطب کون ہیں؟ علماء فرماتے ہیں کہ پہلے بنی اسرائیل کو ہی خطاب ہے کہ تم مدد پکڑو صبر اور نماز سے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر مسلمانوں کو حکم ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۱۵۳]

اس آیت میں مومنین کو خطاب ہے، جبکہ اوپر ذکر کی گئی آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ یہاں مطلقاً حکم ہے۔ خطاب تو بنی اسرائیل کو آ رہا تھا، درمیان میں اللہ نے اپنے تمام بندوں کو حکم دیا ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا کہ یہاں بھی خطاب مومنین کو ہے کہ ساری دنیا بھی اگر مخالف ہو جائے تو تم نہ گھبراؤ اور صبر اور نماز کے ذریعے مدد پکڑو۔

معیتِ خداوندی کا مفہوم اور اقسام:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝﴾ [الحدید: ۴]

اللہ تبارک وتعالیٰ نے کئی مقامات پر اپنی معیت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ معیت کی دو قسمیں ہیں:

عام معیت:

ایک معیت علم ہے۔ جسے سلف صالحین نے ہمیں سمجھایا کہ چونکہ اللہ کا علم محیط ہے اور کائنات کا ہر ذرہ اس کے علم میں ہے تو ہر چیز اس کے قریب ہے۔



خاص معیت:

اور ایک معیت خاص ہوتی ہے، معیت خاص اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت اور حفاظت کے ذریعے ہوتی ہے۔ جیسے اللہ نے اپنے پاک پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا وہ الفاظ نقل فرمائے ہیں جو انہوں نے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کہے تھے: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ [التوبہ:۴۰] کہ اے میرے صحابی! میرے ساتھی، میرے ہمسفر، میرے رفیق غار، ابوبکر! غم نہ کرو، اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہیں۔ یہ خاص معیت ہے۔

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کو بنواسرائیل نے کہا تھا: اے موسیٰ! ہم تو آپ سے پہلے بھی مشکلات میں تھے اور آپ کے بعد بھی مشکلات میں آگئے۔ دیکھیں! آگے دریا ہے اور پیچھے فرعون کی فوج ہے، اگر ہم رک گئے تو فرعون کی فوج ہمیں تہ و بالا کر ڈالے گی اور اگر آگے بڑھتے ہیں تو دریا میں ڈوب جائیں گے۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝﴾ [الشعراء:۶۲] میرا رب میرے ساتھ ہے۔ اس کو بھی معیت خاصہ کہتے ہیں۔

اسی طرح جب اللہ نے مومنین اور صابرین سے فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۱۵۳] تو یہ معیت خاص ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مقام صبر کی اہمیت:

صبر کا اتنا بڑا مقام ہے کہ اللہ نے بطور خاص اپنے پیغمبر کو فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الاحقاف:۳۵] میرے نبی! آپ بھی صبر کریں جیسا کہ پہلے بڑے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا۔ گویا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور ﷺ کو بھی صبر کا حکم دیا۔

صبر کی جزاء:

اور پھر اس کے بعد جو جزائے صبر ہے وہ اتنی بڑی ہے کہ فرمایا: ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ [الزمر:۱۰] قیامت کے دن صبر کرنے والوں کو جو اللہ اجر دیں گے، اس کا کوئی حد وحساب ہی نہیں ہے۔

اعمال کے مختلف درجات:

محدثین کرام، مفسرین عظام نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر عمل کے لیے درجات رکھے ہیں: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ [الانعام:۱۶۰] جو ایک نیکی کا کام کرے گا اللہ کو دس گنا ثواب دیں گے اور اسی طرح

کبھی عمل کا ثواب ستر گنا بڑھ جاتا ہے، جیسے کوئی رمضان میں عمل کرے۔ کبھی اعمالِ صالحہ کا درجہ سات سو تک بڑھ جاتا ہے جیسا کہ اللہ نے باقاعدہ مثال دی تھی۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾
[البقرۃ:۲۶۱]

اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ ثواب، مکان کی برکت کی وجہ سے بڑھ جاتا ہے، جیسا کہ حرم میں کوئی ایک نماز پڑھے یا عبادت کرے تو ایک لاکھ درجہ بڑھ جاتا ہے، آخر اس کی کوئی نہ کوئی حد تو ہے۔ اور ایک ہے کہ جیسے آپ کو کوئی بندہ خالی چیک دستخط کر کے دے دیتا ہے کہ یہ لو اور جتنی مرضی آئے رقم لکھ دو۔ وہاں کوئی حساب نہیں ہے۔

بے حساب اجر:

حدیث میں آتا ہے کہ ہر عمل پر ایک حد کے برابر بدلہ ملے گا، لیکن صبر کرنے والوں کا بدلہ ایسے ہے کہ مٹھیاں بھر بھر کر، ڈول بھر بھر کر ڈالا جائے گا، اس کا کوئی حساب نہیں ہے۔

صبر کی تلقین:

ایک اور حدیث مبارک میں آتا ہے کہ آقائے نامدار خاتم الانبیاء والمرسلین رحمۃ للعالمین ﷺ ایک دن کعبۃ اللہ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صحابی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے آ کر عرض کیا: حضور! کیا آپ ہمارے لیے دعا نہیں کرتے کہ اللہ ہماری مدد کرے؟...... ہم بڑی مشکل میں ہیں کہ کفارِ مکہ نے ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہے، ہم چلتے ہیں تو کانٹے بچھائے جاتے ہیں، گالیاں دی جاتی ہیں، سب وشتم کیا جاتا ہے، ہمیں مارا جاتا ہے، انگاروں پر لٹایا جاتا ہے، اور ہماری عورتوں کو رسے مار مار کر اور نیزے مار مار کر ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، حضور! ہم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں، کیا آپ ہمارے لیے اللہ سے مدد نہیں مانگتے؟...... حضور ﷺ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور آپ نے فرمایا: کیا کہہ رہے ہو؟ تم پر مصیبتیں آ گئی ہیں؟ تم بھول گئے ہو؟ تم تاریخِ انسانیت پر نظر کرو، قصص انبیاء و مرسلین کا مطالعہ کرو۔ تم سے پہلے لوگ جو گزرے ہیں انہیں زمین میں باقاعدہ گڑھا کھود کر دفن کر دیا جاتا تھا، پھر آرا (جس سے لکڑی کو دو ٹکڑے کیا جاتا ہے) اس کے سر پر رکھ کر دو ٹکڑے کیا جاتا تھا، پھر بھی وہ اپنے دین پر ثابت قدم رہتے تھے۔ فرمایا: تم سے پہلے ایسے ایمان والے لوگ بھی

گزرے ہیں کہ لوہے کی کنگھیاں منگوا کر ان کے سروں سے کھینچتے تھے کہ ان کا پورا چمڑا اُدھیڑ لیتے تھے، لیکن پھر بھی وہ اپنے دین پر قائم رہتے تھے، انہوں نے اپنے دین کو نہیں چھوڑا۔ اور تم اتنی جلدی گھبرا گئے ہو کہ ہم پر مصیبتیں آ گئی ہیں؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اللہ کی قسم ہے! اللہ نے جو دین دے کر مجھے بھیجا ہے وہ ضرور پورا ہوگا اور ایک وقت آئے گا کہ اگر کوئی عورت یا مرد یہاں سے صنعاء تک کا سفر کرے گا تو کسی کا اُسے ڈر نہیں ہوگا کہ راستے میں مجھے کوئی لوٹ لے گا یا میری عزت پر حملہ کرے گا۔ ہاں! صرف اتنا ڈر ہوگا کہ کوئی جنگل کا بھیڑیا اس کی بکری اُٹھا کر لے جائے۔ صرف اللہ کا ڈر ہوگا اور کوئی ڈر نہیں ہوگا۔ اسلام، اتنا امن قائم کر دے گا کہ کسی کو بھی کوئی ڈر نہیں رہے گا، لیکن تم جلدی کر رہے ہو، صبر کرو، وہ وقت آئے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صبر کی تلقین فرمائی۔

[صحيح البخاري، حديث: ٣٦١٢، باب: علامات النبوة في الإسلام]

حضرت نوح علیہ السلام کا صبر:

آپ دیکھیں! اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کتنی بڑی عمر دی، ایک ہزار پچاس سال آپ کی عمر تھی، چالیس سال کے بعد نبوت ملی، ساڑھے نو سو سال تک تبلیغ کی اور پھر طوفان آیا، اس کے بعد بھی آپ ساٹھ سال زندہ رہے۔

اتنی بڑی عمر میں حضرت نوح علیہ السلام کو اتنا ستایا گیا، مارا گیا کہ کبھی کبھی بد بخت گلے میں کپڑا ڈال کر کھینچتے تھے کہ آپ بے ہوش ہو کر گر جاتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ مر گئے ہیں تو چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ کافر بد بخت اپنے بچوں کو لے آتے تھے اور دور سے کھڑا کر کے نوح علیہ السلام کی طرف اشارہ کر کے کہتے تھے کہ اس کا خیال کرنا، یہ دیوانہ اور مجنون ہے۔ بچے پتھر اُٹھا کر مارتے تھے، لیکن انہوں نے صبر کیا۔

صبر کی پہلی قسم:

صبر کا معنی ہے: ''منع'' یعنی کسی چیز کا روکنا۔ صبر کی صورت یہ ہے کہ جب کبھی آدمی کو کوئی صدمہ پہنچے تو وہ جزع و فزع اور واویلا کرنے سے رک جائے، بلکہ زبان سے ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' کہے۔ اس طرح وہ اس بشارت کا مستحق قرار پائے گا جس کا حکم اللہ کے اس فرمان میں ہے: ﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ﴾ خوشخبری دے دو صبر کرنے والوں کو۔

اب سوال یہ ہے کہ صبر کرنے والے کون ہیں؟ تو ان کی تفصیل اس آیت میں آئی ہے:

﴿الَّذِينَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوٓا۟ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ ﴿١٥٦﴾ أُو۟لَٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُهْتَدُونَ ﴿١٥٧﴾﴾ [البقرۃ:۱۵۶،۱۵۷]

''یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور ہم کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے خصوصی عنایتیں ہیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ ہیں جو ہدایت پر ہیں۔''

صبر کی عملی مثال:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سفر میں تھے، آپ کو اطلاع ملی کہ آپ کا بیٹا فوت ہو گیا ہے، آپ سواری پر سوار تھے، آپ سواری سے اُترے، فوراً دو رکعت نماز نفل پڑھی اور اس کے بعد زبان سے فرمایا: ''إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' اللہ نے ہمیں یہی حکم دیا ہے کہ صبر اور نماز سے مدد پکڑو۔ مصیبت کی خبر آئی، الحمد للہ! ہم نے نماز بھی پڑھ لی اور صبر بھی کر لیا۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۸۷، البقرۃ: الآیۃ:۴۵]

ماتم اور نوحہ خوانی کی ممانعت:

اسلام کا یہ حکم ہے کہ آدمی کسی میت پر واویلا نہ کرے۔ اسی طرح آواز نکال کر زور زور سے رونا، چیخنا چلانا، ماتم اور نوحہ خوانی کرنا، اپنے رخساروں پر تھپڑ مارنا، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالنا، اپنے سر میں مٹی ڈالنا یا سیاہ لباس پہننا، یہ سارے کام اسلام میں ممنوع ہیں۔

ہم میں سے نہیں:

آقائے نامدار، خاتم الانبیاء، حبیب کبریاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو لوگ مصیبت میں آ کر اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتے ہیں، اپنے رخساروں پر تھپڑ مارتے ہیں اور سیاہ کپڑے پہنتے ہیں کہ یہ غم کی علامت ہے۔ فرمایا: ان کا میری جماعت سے کوئی تعلق نہیں، ان کا میرے طریقے سے کوئی تعلق نہیں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ ایک عظیم واقعہ ہے۔ کوئی مسلمان اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ان سے زیادہ غمناک تو سیدنا محمد رسول اللہ، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا واقعہ ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو تو اس لیے شرف ملا

ہے کہ وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے نواسے ہیں، یعنی حضور ﷺ کی بیٹی کی اولاد ہیں۔ اب جن کی وجہ سے انہیں شرف ملا ہے، ان کی موت صدمہ کتنا بڑا ہوگا!؟

حضور ﷺ کی وفات ہوئی۔ آپ اندازہ کریں کہ صدمے کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا عبقری اور بطل الاسلام اور شدید آدمی، سخت آدمی، مضبوط آدمی کہ جس کے بارے میں تورات میں یہ پیشین گوئی آئی کہ وہ تو ایسا ہے جیسے لوہے کا آدمی ہو۔ اتنے مضبوط آدمی حضور ﷺ کی وفات کے صدمے کو دیکھ کر تلوار نکال کر کھڑے ہو گئے کہ جو کہے گا کہ حضور ﷺ پر موت آ گئی ہے، میں اس کو قتل کر دوں گا۔ حضور ﷺ پر موت کیسے آسکتی ہے؟ اللہ کا نبی کیسے مر سکتا ہے؟ اللہ کے نبی کی نبوت قیامت تک ہے تو حضور ﷺ بھی قیامت تک زندہ رہیں گے۔

فرماتے ہیں کہ میرے دماغ نے مصیبت کے وقت کام چھوڑ دیا۔ اور سیدہ فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کی موت سے مجھے اتنا صدمہ پڑا، اتنا غم ٹوٹا کہ اگر وہ اس دن پر ڈال دیا جائے تو دن، رات میں تبدیل ہو جائے گا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ جب حضور ﷺ ہجرت فرمانے کے بعد مدینے میں آئے تھے اس روشن دن جیسا ہم نے دن کوئی نہیں دیکھا اور جس دن آپ کی وفات ہوئی، اس دن جیسا اندھیرے والا دن ہم نے کوئی نہیں دیکھا۔ ایسے لگتا تھا کہ دن کی روشنی بھی چھن گئی ہے اور ہماری روشنیاں بھی آج ختم ہو گئی ہیں۔

صحابہ کرام پر غم کے بڑے بڑے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ لیکن مجال ہے کہ کسی نے کوئی بات شریعت کے خلاف کی ہو۔ ہم لوگ تو محبت میں بھی سنت کی مخالفت کرتے ہیں اور عداوت میں بھی حضور ﷺ کی سنت کی مخالفت کرتے ہیں، یعنی ہم غلو میں آ گئے ہیں...... نعوذ باللہ!...... احداث فی الدین میں آ گئے اور بدعتوں کے اسیر ہو گئے ہیں کہ اگر محبت کا پہلو آ جائے تو ہم تجاوز اور غلو کر کے آگے نکل جاتے ہیں اور اگر غم کا پہلو آ جائے تو پھر بھی غلو کر کے نکل جاتے ہیں۔

آج اگر کوئی محرم کے دنوں میں شادی کرے تو اس کو مار نہ ڈالیں!! یہ تو شکر ہے کہ ان کو اللہ نے طاقت نہیں دی۔ ایک طرف کہتے ہیں کہ یہ بھی کوئی انسان ہیں جو محرم میں شادی کر رہے ہیں، اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ حضرت نے علی اصغر کی شادی کربلا میں کی تھی۔ اتنا بڑا جھوٹ ہے!!! ادھر کہتے ہیں کہ شادی ہوئی تھی۔ جب شادی ہوئی تھی تو اب جو محرم میں شادی کرے گا تو گویا اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سنت پر عمل کیا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سنت کی اتباع کی۔ اس لیے ان کو بھی چاہیے کہ انہی دنوں میں شادی کیا کریں۔

آنسو بہانا صبر کے منافی نہیں:

ہاں! ایک ہے کہ آدمی غم کی حالت میں آنسو بہاتا ہے تو یہ اللہ کی رحمت کی دلیل ہے کہ آدمی پر غم ٹوٹ گیا، رو رہا ہے، آنسو بہہ رہے ہیں، لیکن زبان سے کوئی آواز نہیں، کوئی آہ وزاری نہیں، کوئی واویلا نہیں، زبان سے خلافِ شریعت کوئی لفظ نہیں نکالتا، فقط آنسو بہہ رہے ہیں تو ایسا کرنا جائز ہے، اسلام نے اس سے منع نہیں کیا۔ جو لوگ اللہ کے خوف سے اس وقت روتے ہیں تو ان پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ یہ تو انسان کی فطرت ہے کہ جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ غمگین ہوتا ہے اور جب اسے کوئی خوشی ملتی ہے تو وہ اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ خوشی اور غمی کے حالات سے کوئی کیسے بچ سکتا ہے؟ یہ تو ہر کسی کو پیش آتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے اظہار کے جو طریقے ہم نے بنائے ہیں، وہ درست نہیں۔

جہلاء کے طور طریقے:

چنانچہ پہلے زمانے میں جاہل لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ جب بھی ان کا کوئی بندہ مرتا تو ایک آدمی مکان کی چھت پر چڑھ کر اعلان کرتا کہ آج ہمارا فلاں سردار، فلاں سردار کا بیٹا، اور اتنا بڑا سخی اور ایسا ایسا بندہ مر گیا ہے۔ پھر کرائے پر عورتوں کو بلایا جاتا، وہ اکٹھی ہو کر باقاعدہ ماتم کرتیں۔ جب لوگ تعزیت کے لیے آتے تو وہ اندر سے رونا شروع کر دیتیں۔ جب لوگ چلے جاتے تو چپ کر کے بیٹھ جاتیں۔ یہ تو جاہلیت کے طریقے تھے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ مصیبت آئے تو صبر کرو اور کوئی بات زبان سے نہ نکلے۔

حضور ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم کی وفات کا صدمہ:

اس سے بڑی کوئی اور مثال ہوگی کہ حضور ﷺ اپنا بیٹا ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں۔ صحابی کہتے ہیں کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ بچے کی سانس اُکھڑ رہی ہے اور گلے سے ایسی آواز نکل رہی ہے جیسے کوئی مشکیزہ کھولا جائے اور پانی ختم ہو جائے اور آخری قطرے ٹپک رہے ہوں، ایسے سانس نکل رہی ہے اور حضور ﷺ کے آنسو بہہ رہے ہیں، فرما رہے ہیں کہ اے میرے بیٹے ابراہیم! تیری جدائی میں ہم بڑے غمگین ہیں، لیکن ہم اپنی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکالیں گے، مگر وہ جو اللہ کو پسند ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

[صحیح البخاري، حدیث: ۱۳۰۳، باب: قَوْلِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم إِنَّا بِكَ لَمَحْزُونُونَ]

ہر حال میں صبر کی تعلیم:

اور اسلام کی تعلیمات میں سے ہے کہ اگر تمہیں پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جائے تو یہ بھی مصیبت ہے، اس پر بھی اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھو، اگر تمہارے دو روپے گر جائیں تو یہ بھی نقصان ہے، اس پر بھی اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھو۔

صبر کے وقت مسنون دعا:

میرے آقا ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی آدمی مصیبت کے وقت میں یہ کلمہ پڑھ لے اور یہ دعا کر لے:

((اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، اَللّٰھُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِیْبَتِي، وَأَخْلِفْ لِيْ خَیْرًا مِنْھَا.))

''اے اللہ! یہ جو چیز مجھ سے چلی گئی ہے اس کا بدلہ تُو اپنی طرف سے بہتر عطا فرما دے۔''

[صحیح مسلم، حدیث: ۹۱۸، باب: مَا یُقَالُ عِنْدَ الْمُصِیبَۃِ]

اور اِنَّا لِلّٰہِ پڑھ کر صبر کر لے تو اللہ تعالیٰ اسے اس سے بہتر چیز عطا فرمائیں گے جو اس کے ہاتھ سے چلی گئی ہو۔

مسنون دعا کی برکت:

حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے خاوند بڑی شان والے صحابی تھے، ان کو اپنے خاوند سے بڑی محبت تھی۔ فرماتی ہیں کہ جب میرے خاوند فوت ہو گئے تو میں نے سوچا کہ حضور ﷺ کی سنت پر عمل کروں۔ چنانچہ میں نے یہی دعا پڑھ لی...... دوسری طرف میرے دل میں یہ بات بھی آ رہی تھی کہ مجھے اپنے پہلے خاوند ابو سلمہ سے اچھا کون ملے گا؟ لیکن حضور ﷺ کا فرمان ہے تو میرا ایمان ہے...... فرماتی ہیں کہ اس دعا کی برکت یہ ہوئی کہ اللہ کے نبی ﷺ نے خود مجھ سے شادی کر لی۔ میں حضور ﷺ کی بیوی بن گئی اور حضور ﷺ ابی سلمہ سے کروڑہا درجہ اعلیٰ و افضل تھے۔ وہ غلام تھا اور آپ ﷺ آقا تھے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۹۱۸، باب: مَا یُقَالُ عِنْدَ الْمُصِیبَۃِ]

صبر کی دوسری قسم:

اور ایک ہے اللہ کی فرمانبرداری پر صبر کرنا۔ مثلاً اللہ نے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے تو اب خواہ گرمی ہو یا سردی، تکلیف ہو یا راحت ہر حال میں بندے کو چاہیے کہ وہ نماز پڑھے۔

صبر کی تیسری قسم:

اور نافرمانی پر صبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نافرمانی کے جتنے بھی کام ہیں، بندہ اپنے آپ کو ان کاموں سے روکے رکھے۔

اللہ نے فرمایا: مدد پکڑو صبر کے ساتھ، یعنی مصیبت آئے تو صبر کرو، فرمانبرداری کا موقع ہو تو جم جاؤ اور اگر لوگ تمہیں گناہوں کی طرف بلائیں تو اس وقت اپنے آپ کو تھام لو۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۹۶، البقرۃ: الآیۃ: ۱۵۳]

نماز بھی صبر ہے:

پھر یہ صبر حاصل کیسے ہوگا؟ تو فرمایا: نماز پڑھو۔ نماز بھی ایک صبر ہے کہ آدمی پر حلال چیزیں، بات چیت، اِدھر اُدھر نگاہ کرنا، سب ممنوع ہو جاتا ہے اور نماز میں اس کی ہر ہر حرکت اور ہر ہر سکون، ہر ہر عمل اللہ کے سامنے ہے۔

ہر مشکل میں نماز:

اس آیت میں اللہ نے دو چیزیں بتائیں: ایک صبر اور ایک نماز کہ ان دو چیزوں سے مدد پکڑو۔ اس لیے حدیث مبارک میں ہے:

((كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ، صَلَّى.))

''جب بھی حضور اکرم ﷺ کو کوئی مشکل پیش آتی تھی تو وہ نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔''

[سنن ابی داود، حدیث: ۱۳۱۹، باب: وَقْتِ قِيَامِ النَّبِيِّ ﷺ مِنَ اللَّيْلِ]

آنکھوں کی ٹھنڈک:

حضور ﷺ نے فرمایا:

((جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ.)) [سنن النسائی، حدیث: ۳۹۴۰، باب: حُبِّ النِّسَاءِ]

اللہ نے نماز کو میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دیا ہے۔ جب کوئی غم ہو، نماز پڑھی تو ٹھنڈک آگئی، سکون مل گیا، اطمینان ہو گیا، تسلی ہو گئی۔

نماز سے عام لوگوں کو فوائد حاصل کیوں نہیں ہوتے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نماز تو پڑھتے ہیں، لیکن ہمیں وہ منافع اور ثمرات حاصل نہیں ہوتے جن کا ذکر قرآن و

حدیث میں ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ اللہ کا قرآن تو حق ہے اور حضور ﷺ کا فرمان مبارک بھی حق ہے، ان میں تو کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ہمیں اس بارے میں فکر کرنے کی ضرورت ہے کہ کہیں ہم سے کوئی ایسی کوتاہی تو نہیں ہو رہی، جس کی وجہ سے ہم نماز کے ثمرات سے محروم ہیں۔

جو دوائی ہمارے لیے تجویز کی گئی ہے، ساری دنیا کے ڈاکٹر اور تمام اطباء اس بات پر متفق ہیں کہ بیماری کا یہی علاج ہے، اس کے علاوہ کوئی علاج نہیں ہے۔ لیکن مریض کو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا...... کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ دوائی اصلی نہیں، بلکہ نقلی ہوتی ہے۔ چلو آدمی اصلی دوائی کہیں سے ڈھونڈ لیتا ہے...... اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر کی تجویز کردہ خوراک کے استعمال میں ہم غلطی کر لیتے ہیں، مثلاً ہم نے چوبیس گھنٹے میں پانچ دفعہ استعمال کرنی تھی، اور ہم چار دفعہ لے رہے ہیں تو وہ کوئی فائدہ نہیں دے گی۔ ہاں! اگر دوا بھی صحیح تجویز ہو جائے، ہم اسے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق استعمال بھی ٹھیک کر لیں، اور پھر بھی مریض کو افاقہ نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دوا میں کوئی نقص نہیں ہے، بلکہ مریض کے اپنے معدے کے اندر کوئی ایسا مادہ ہے جو اس دوائی کو قبول نہیں کر رہا۔

اس کی مثال بھی حدیث مبارکہ میں موجود ہے۔ ایک صحابی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے کہا کہ حضور! میرے بھائی کو اسہال کی تکلیف ہے، اس کا پیٹ چل رہا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کو شہد کا شربت پلاؤ۔ اس صحابی نے جا کر اپنے بھائی کو شہد پلا دیا۔ کچھ دیر بعد واپس آئے اور عرض کیا: حضور! آپ نے جو فرمایا تھا وہ میں نے پلایا ہے، لیکن اسہال تو اور زیادہ ہو گئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو پھر شہد پلاؤ۔ انہوں نے جا کر پھر پلا دیا، پھر کچھ دیر کے بعد حاضر ہوئے اور عرض کیا: حضور! فائدہ نہیں ہوا، وہ تو اور زیادہ ہو رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: پھر پلاؤ...... اب صحابی حضور ﷺ کے حکم کا انکار تو نہیں کر سکتا، چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے...... انہوں نے پھر پلا دیا اور پھر آ کر شکایت کی کہ حضور! وہ تو اور زیادہ بیمار ہو گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر پلاؤ۔ انہوں نے پھر پلا دیا۔ اب ان کے بھائی ٹھیک ہو گئے۔ وہ صحابی آپ ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا: اب تو ٹھیک ہو گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے سچ فرمایا ہے کہ شہد میں شفاء ہے۔ اللہ کا فرمان غلط نہیں ہوسکتا، اتنی دیر اس وجہ سے لگ گئی کہ تیرے بھائی کا پیٹ اسے قبول نہیں کر رہا تھا۔ اس میں تمہارے بھائی کے پیٹ کا قصور ہے، اللہ کا فرمان تو کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔

[صحيح البخاري، حديث: ٥٦٨٤، باب: الدّواء بالعسل، صحيح مسلم، حديث: ٢٢١٧]



یہ مثال میں نے اس لیے عرض کی، تاکہ بات سمجھنی آسان ہوجائے۔ دوائی بھی ٹھیک ہے، طریقۂ استعمال بھی ٹھیک ہے، اور اس کے جو اوقاتِ معینہ ہیں وہ بھی ٹھیک ہیں، لیکن مریض ٹھیک نہیں ہورہا تو اس کا مطلب ہے کہ مریض کے اندر کوئی مزید نقص اور خرابی ہے، اس کے معدے میں کوئی گڑبڑ ہے کہ وہ اس دوائی کو قبول نہیں کررہا، ہضم نہیں کررہا، جس کی وجہ سے دوائی فائدہ نہیں پہنچارہی۔

کوئی دنیوی، جسمانی، مالی، داخلی یا خارجی پریشانیاں آجائیں تو اس کا علاج صبر اور نماز ہے۔ اب یہ علاج تو اللہ کا تجویز کردہ ہے، اس میں تو کوئی شک وشبہ ہو نہیں سکتا، لیکن اگر کوئی بندہ نماز بھی ٹھیک پانچ اوقات میں ادا کررہا ہے اور اس کو فائدہ حاصل نہیں ہورہا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ابھی کوئی اور نقص ہے جس کی وجہ سے اس پر نماز کے ثمرات وبرکات صحیح معنوں میں مرتب نہیں ہورہے۔

ایک گناہ گار کا واقعہ:

بزرگ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ کسی بڑے آدمی کا ایک بیٹا تھا، اس کے عزیز واقارب اسے کسی اللہ والے کی خدمت میں لے گئے اور ان سے درخواست کی کہ یہ نوجوان اپنے ماں باپ کا ایک ہی بیٹا ہے، اس کے والدین کے پاس بے انتہاء دولت ہے، اس کی زندگی گناہوں میں گزر رہی ہے۔ ہم نے اس کو بڑی منتوں سے آپ کی خدمت میں لانے کے لیے آمادہ کیا ہے۔ مہربانی کرکے اس کو بیعت کرلیں اور اس کی اصلاح کے لیے کوشش کریں۔ انہوں نے فرمایا: ہدایت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس کو لائے ہو تو ٹھیک ہے، میں بیعت کرلیتا ہوں۔ اس نوجوان نے کہا کہ مجھے تو یہ لوگ زبردستی مجھے آپ کے پاس لے آئے ہیں، میں بیعت نہیں ہونا چاہتا۔ انہوں نے پوچھا: اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اس نے کہا: ٹھیک ہے، میں آپ کی بیعت ہوجاتا ہوں، آپ کو اپنا مرشد بنالیتا ہوں، لیکن میری ایک شرط ہے کہ میں گانا اور عورت نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ میری کمزوری ہے۔ میں بالکل سیدھی بات کرتا ہوں، جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ دو چیزیں میری غذا بن چکی ہیں اور جزوِ حیات بن گئی ہیں۔ جب تک میں گانا نہ سنوں اور عورت سے نہ ملوں، میرے لیے زندگی گزارنا مشکل ہوجاتا ہے، باقی جو مرضی آئے، آپ مجھ سے منوالیں...... وہ اللہ والے تھے، سمجھدار تھے، طبیب مریض کو سمجھتا ہے...... ان بزرگوں نے فرمایا کہ تمہاری دو باتیں ہم مانتے ہیں، ایک بات تم ہماری مانو۔ اس نے کہا: میں نے تو اپنی بات بتادی، باقی آپ جو مجھ سے منوائیں وہ میں ماننے کے لیے تیار

ہوں۔ چوری میں نہیں کروں گا، ڈاکہ میں نہیں ڈالوں گا، قتل میں نہیں کروں گا، سود میں نہیں کھاتا۔ باقی مجھے کوئی بیماری نہیں، میرے اندر بس یہ دو بیماریاں ہیں۔ اس بزرگ نے فرمایا کہ نماز پابندی سے پڑھا کرو اور کچھ نہیں۔ پابندیٔ اوقات سے مسجد میں جماعت کے ساتھ تم نے اللہ کی پانچ نمازیں ادا کرنی ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ میرا بھی وعدہ ہے۔ اگر آپ نے بزرگ ہوکر اتنی بڑی مہربانی کی ہے، میں نے آپ کو اپنی گندی باتیں بتلائی ہیں، آپ اس پر چپ ہو گئے تو آپ کے فرمان کے مطابق میں نماز نہیں چھوڑوں گا۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

جب اپنے ڈیرے پر پہنچا تو ملازمین نے کہا کہ محفل کا انتظام کریں؟ اس نے کہا کہ آج عصر کو نہ کرو، کیونکہ میں نے اپنے مرشد سے وعدہ کرلیا ہے کہ پانچوں نمازیں باجماعت ادا کروں گا۔ اگر میں مجلس میں بیٹھ گیا اور شراب پی لی تو نشہ آجائے گا اور اس کے بعد اوقات میں پابندی نہیں ہوگی۔ اس لیے یہ محفل عشاء کے بعد کرنا۔ اور آئندہ کے لیے یہ مجلس عصر کی بجائے عشاء کے بعد سے شروع ہوا کرے گی۔ میں پانچ نمازیں بھی پڑھ لیا کروں گا اور عشاء کے بعد اپنی مجلس بھی بھگت لیا کروں گا، صبح تک نشہ اُتر چکا گا تو نہا دھو کر صبح کی نماز بھی پڑھ لیا کروں گا۔ ملازمین نے کہا کہ ٹھیک ہے۔

عصر کی نماز اس نے مسجد میں پڑھنی تھی اور اب جانے کے لیے سوچا تو غسل کیا، اچھے کپڑے پہنے کہ چلو کچھ تو شریفانہ لباس پہن کر مسجد میں جاؤں...... یہ تو نہیں کہ آدمی ایسا لباس پہن کر جائے کہ پیچھے والے سارا بدن دیکھتے رہیں...... اس نے عصر کی نماز پڑھی، پھر مسجد میں ہی رہا، مغرب کے بعد بھی گھر نہیں گیا اور عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد بجائے ڈیرے کی طرف آنے کے اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ اور ملازم سے کہلا بھیجا کہ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آج محفل نہیں ہوگی، کل عشاء کے بعد ہوگی۔ یہ پیغام دیا اور گھر جا کر لیٹ گیا۔

اگلے دن پھر اس نے فجر سے لیکر عشاء تک پانچوں نمازیں مسجد میں پڑھیں۔ عشاء کی نماز جب ختم کی تو نوکروں سے پوچھا کہ سارے انتظامات موجود ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں جی! سارے انتظامات ہو چکے ہیں، بس آپ کا انتظار ہے۔ اس نے کہا کہ آج سے بوتلوں کو بھی توڑ دو اور عورتوں کو بھی یہاں سے نکال دو۔ اب اللہ کے گھر کا سجدہ دے کر عورتوں کو سجدہ دینے سے حیا آتی ہے، میں یہی پیشانی خدا کے دروازے پر جھکاؤں، اسی زبان سے کہوں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اور پھر اسی سے گندی عورتوں کو بوسہ دوں، یہ مجھے گوارا نہیں۔ یہ پاؤں جو اُٹھ کر اللہ کے گھر کی طرف چلے ہیں، اب گناہ کی طرف جائیں تو یہ بات مجھے سمجھ نہیں آتی۔ جب نیک راستے پر آ گئے تو گناہ کے راستے کو چھوڑ دیا۔

چند دنوں کے بعد اس بزرگ کے پاس پہنچا، ماشاء اللہ! داڑھی رکھی ہوئی تھی، پگڑی باندھی ہوئی تھی، جا کر اپنے شیخ سے ملا اور کہا: الحمدللہ!۔ انہوں نے فرمایا: ہم نے تو آپ کو کچھ بھی نہیں کہا، ایک نسخہ بتلایا تھا، تم نے دوائی ٹھیک استعمال کر لی تو اللہ نے بیماریاں دور کر دیں۔ ہمارے پلّے میں کیا ہے؟ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ایک نسخہ تجویز کیا تھا کہ اللہ فرماتے ہیں کہ نماز برائیوں سے روکنے والی ہے۔ نماز، جب نماز ہے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا کہ آدمی برائی کرے، اگر نماز ہمیں برائی سے نہیں روک رہی تو اس نماز میں ہم سے کوئی کوتاہی ہو رہی ہوگی۔

نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ:

حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم عبادت ایسے کرو جیسے تم خدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر ایسے نہیں پڑھ سکتے تو کم از کم یہ خیال کرو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا جو اس طرح نماز پڑھے گا، اس کو نماز کے فوائد و ثمرات بھی ضرور حاصل ہوں گے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۵۰، بَابُ: سُؤَالِ جِبْرِيلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الإِيمَانِ...]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نماز میں انہماک:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے جسم میں تیر پیوست ہو گیا۔ نکالنے لگے تو بہت تکلیف ہوئی۔ چنانچہ جراح سے کہا گیا کہ انتظار کرو، نماز کا وقت آنے دو۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز میں کھڑے ہوئے تو انہوں نے با آسانی تیر نکال لیا۔

[فضائل اعمال، ص: ۴۴۸، فضائل نماز، خشوع خضوع کا بیان]

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ کے حضور نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو اللہ کے خوف سے نماز میں مشغولیت کی وجہ سے ہمہ تن مگن ہو جاتے اور کسی چیز کی پرواہ نہ ہوتی۔ اس وجہ سے نماز میں آسانی سے تیر نکال لیا گیا۔ اور ہم نماز میں کھڑے ہوتے ہیں، بس ایک رسم ہے جو پوری ہو رہی ہے۔ اسی لیے اقبال رحمہ اللہ نے یا شاید حالی نے کہا تھا:

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی

اذان تو اب بھی ہوتی ہے، لیکن جو حضرت بلال والی تڑپ تھی، وہ کہاں سے آئے؟ مسجدیں اب بھی ہم نے بنائی ہوئی ہیں، حضور ﷺ کے زمانہ میں تو پتھر تھے اور ہمیں تو قالین ملے ہوئے ہیں، حضور ﷺ کے زمانہ میں تو پتھر انگاروں کی طرح جلتے تھے اور اب تو ایئر کنڈیشنڈ کے نیچے بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں، پھر بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ ہماری نمازیں ان نمازوں کی طرح نہیں ہیں جو حضور ﷺ کے زمانے میں پڑھی جاتی تھیں۔ اسی لیے شاعر

نے کہا تھا:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
مَن اپنا پُرانا پاپی ہے برسوں سے نمازی بن نہ سکا

صلوٰۃ الحاجت:

ایک بات یاد رکھیں کہ نماز سے پانچ وقت کی فرض نماز، واجبات اور سنن مؤکدہ مراد ہیں اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کبھی تمہیں کوئی مصیبت آجائے تو اس کام کی نیت سے دو رکعت نماز حاجت پڑھو اور اس کے بعد دعا کرو کہ اے میرے اللہ! تیرے قرآن میں حکم ہے کہ مشکل میں نماز سے مدد پکڑو۔ میری یہ مشکل حل نہیں ہو رہی، میں نماز پڑھ کر مدد مانگ رہا ہوں اور تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ میری حاجت پوری فرما۔ اللہ تعالیٰ اس مشکل کو حل فرما دیں گے۔

آگے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ﴾ [البقرۃ:۴۵]

بعض علماء نے فرمایا کہ "اِنَّهَا" کی ضمیر "صبر" اور "صلوٰۃ" دونوں کی طرف راجع ہے اور بعض نے فرمایا کہ بنی اسرائیل سے آخر تک تمام وہ باتیں مراد ہیں کہ ان چیزوں یعنی نماز پر عمل کرنا، حق پر قائم رہنا، حق اور باطل کو آپس میں نہ ملانا، اللہ کی آیات کو نہ بیچنا، بلکہ سچی بات کہنا، یہ بڑا بھاری ہے، بڑا ثقیل ہے، بڑا بوجھل ہے، مگر ان لوگوں پر جن کے دل اللہ کے خوف سے پگھلنے والے ہیں۔

اور جمہور مفسرین نے فرمایا کہ اقرب مرجع "صلوٰۃ" ہے کہ اللہ نے فرمایا: نماز بڑی بھاری ہے، بڑی ثقیل ہے، بڑی بوجھل ہے، مگر ان لوگوں پر جن کے دل اللہ کے خوف سے پگھلنے والے ہیں، ان کے لیے بوجھل نہیں ہے۔

﴿لَكَبِيْرَةٌ﴾ "کبیر" کا معنی یہاں "بوجھل ہونا" ہے۔ یہاں حسی بوجھ مراد نہیں ہے، بلکہ معنوی بوجھ مراد ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۷، البقرۃ: الآیۃ: ۴۵]

نیک عورت کی پسندیدگی:

حضور ﷺ نے فرمایا: اس دنیا میں سے جو چیزیں مجھے پسند ہیں، ان میں سے ایک عورت ہے لیکن وہ عورت جو

صالحات میں سے ہو، جس کی زندگی، سیرت وصورت، قول وعمل سب میں صلاح ہو، جس کی ضد فساد ہے۔

عورت صالحہ ہو، یہ نہیں کہ وہ شارع عام ہو کہ جو آئے، اس پر سے گزر جائے۔ وہ عورتیں نہیں ہوتیں، وہ تو غلاظت کی بوریاں ہیں، وہ تو گندگی کی بوریاں ہیں اور اللہ کی زمین پر بوجھ ہیں۔

نیک عورت کے اوصاف:

حضور ﷺ نے ''مرأة صالحة'' کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ جب اس پر خاوند کی نظر پڑے تو وہ خوش ہو جائے اور خاوند حکم دے تو وہ اطاعت کرے۔ پھر کسی دوسرے لفظ کا سوال نہیں، خاوند کا حکم ہے بس، دوسرا لفظ ختم ہے۔ اور فرمایا کہ جب خاوند گھر سے غائب ہو جائے تو اس کی امانت کی حفاظت کرے، اس کی عزت کی حفاظت کرے، اس کی اولاد کی حفاظت کرے، اس کے مال کی حفاظت کرے، فرمایا: یہ ''مرأة صالحة'' ہوتی ہے۔

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۱۸۵۷، باب: أَفْضَلُ النِّسَآءِ]

یہ نہیں کہ خاوند نے ابھی گھر سے باہر قدم رکھا تو اس نے ٹیلی فون اُٹھایا کہ (Come on) کم آن۔ یہ عورتیں نہیں ہوتیں، بلکہ یہ تو اللہ کا عذاب ہیں، ان کو عورت کہنا لفظ ''عورت'' کی توہین ہے۔

لفظ ''عورت'' کا معنیٰ:

''عورت'' کہتے ہیں: چھپائی جانے والی جگہ اور چھپائی جانے والی چیز کو۔ ''عَوْرَةُ الرَّجُل'' کیا ہے؟ ''مِنَ السُّرَّةِ إِلَى الرُّكْبَةِ'' یہ ''عورة'' ہے، ''عَوْرَةُ الْمَرأَة'' کیا ہے؟ ''مِنَ الرَّأْسِ إِلَى الرِّجْلِ'' عورت کا سارا بدن عورت ہے۔ یہ جو باہر پھرنے والی ہیں محفلوں میں، ہوٹلوں میں، سارے لوگوں سے ہاتھ ملانے والی، یہ عورتیں نہیں ہوتیں، ان پر لفظ ''عورت'' کا اطلاق شرعاً اور عقلاً ہر لحاظ سے قبیح ہے۔ ان کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اپنے آپ کو ''عورت'' کہلوائیں۔ یہ اپنے آپ کو اور جو مرضی آئے کہلوائیں، لیکن عربی لفظ کا استعمال ان کے حق میں نہیں ہو سکتا۔

دوسری چیز حضور اکرم ﷺ کو خوشبو پسند تھی اور تیسری چیز کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ'' (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے)۔

[سنن النسائی، حدیث: ۳۹۴۰، باب: حُبِّ النِّسَاءِ]

سرکارِ دو جہاں کی نماز!!

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو نبی اکرم ﷺ کی محبوبہ بیوی ہیں، جمال والی، علم والی اور ایسی بیوی جو اللہ نے خود چن کر



دی تھی۔ اس کا کیا مقام ہوگا جس کا پیغام دینے کے لیے، صورت دکھلانے کے لیے اللہ نے جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا ہو!!
وہ فرماتی ہیں کہ جب حضور ﷺ نماز میں کھڑے ہوتے تو سورۃ الفاتحہ سے شروع فرماتے اور سورۃ البقرۃ، سورۃ آل عمران، سورۃ نساء، سورۃ مائدۃ، سورۃ انعام آٹھ آٹھ سپارے ایک ایک رکعت میں پڑھتے تھے۔
فرماتی ہیں کہ سجدہ اتنا لمبا ہوتا کہ جب حضور ﷺ سجدہ فرماتے تو میں اپنے پاؤں سمیٹ لیتی تھی، کیونکہ حجرہ سات فٹ چوڑا تھا، اسی میں حضور ﷺ نماز پڑھ رہے ہوتے تھے اور اسی میں مَیں بھی لیٹی ہوتی تھیں۔
[صحیح البخاری، حدیث: ۳۸۲، باب: الصَّلَاۃِ عَلَی الفِرَاشِ]

بیڈروم کا معنی:

ہماری طرح تو نہیں تھا کہ یہ ڈرائنگ روم ہے، یہ بیڈروم ہے اور یہ بس روم ہی روم ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ ''روم'' کا لفظ کہاں سے بنا ہے؟ یہ ''رم'' سے بنا ہے، ''رم'' ایک شراب ہوتی ہے۔ دونوں کا مادہ ملتا جلتا ہے، اُس کے اندر بھی انسان کو سونا ہوتا ہے اور اِس کے اندر بھی انسان کو سونا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں بیڈروم۔ اگر اس کو پڑھنے میں تھوڑی سی غلطی کریں تو بیڈروم بھی تو ہوسکتا ہے۔ یہ بَیڈ نہیں یہ تو بیڈ ہیں، یہ ایڈ نہیں ایڈز ہیں، یہ روم نہیں یہ تو رومن امپائر کے رم ہیں۔ یہ تو ایک عذاب ہے۔ پہلے زمانے میں کوئی روم نہیں ہوتے تھے۔ غربت کی زندگی میں گناہ نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ جب پورے گھر میں کل دو کمرے ہیں تو کوئی گناہ کرنے کے لیے کہاں جا کر چھپے گا؟ گھر کا ہر فرد ایک دوسرے کی نظر میں ہوتا تھا کہ وہاں بیٹا سویا ہے، وہاں بہن سوئی ہے، ادھر میں سویا ہوا ہوں۔ اب جتنے تمہارے روم بڑھتے گئے اتنی رونقیں بڑھتی گئیں، اتنے اللہ کی طرف سے عذاب بڑھتے گئے۔
بی بی صاحبہ فرماتی ہیں کہ میں اپنے پاؤں سکیڑ لیتی اور جب حضور ﷺ سجدے سے کھڑے ہوتے تو سیدھے کر لیتی تھی۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۳۸۲، باب: الصَّلَاۃِ عَلَی الفِرَاشِ]

تہجد کی نماز کا اثر اور طریقہ:

ایک دفعہ تم ایسی نماز پڑھ کر تو دیکھو، پھر مولویوں سے کہنا کہ نماز میں فائدہ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ پچھلی رات جب سب لوگ سو رہے ہوں دو رکعت تو پڑھ کر دیکھو، اللہ کا بتلایا ہوا نسخہ آزما کر دیکھ لو، غسل کر کے پاک صاف ہو کر بہترین مصلے پر کھڑے ہو کر پورے خشوع و خضوع کے ساتھ اور ایک ایک لفظ پر غور کر کے نماز پڑھو اور سجدے میں

جا کر رو پڑو اور پھر نماز پوری کر کے سلام پھیر دو۔ اس کے بعد دیکھو کہ تمہیں اللہ کی طرف سے طمانینت، سکون، راحت اور آرام ملا ہے کہ نہیں ملا؟ یہ چیزیں بتلانے کی نہیں ہیں، چکھنے کی ہیں۔ اب میں آپ کو کیسے بتلاؤں کہ یہ پانی میٹھا ہے یا کڑوا ہے۔ لاکھ تقریر کرتا رہوں کہ بھائی! اس میں چینی ملی ہوئی ہے۔ وہ کہے گا: نظر تو نہیں آ رہی۔ میں کہوں کہ بھائی! چینی بھی سفید اور پانی بھی سفید ہے، کیسے نظر آئے؟ وہ کہے گا: کچھ فرق تو ہونا چاہیے۔ اب میں اس کو کتنی دفعہ سمجھاتا رہوں؟ ہاں! اگر وہ چکھ لے تو ایک منٹ میں پتہ چل جائے گا۔

اُصولاً جتنی عبادات ہیں، ان کی لذت چکھنے سے ملتی ہے۔ تہجد کیا مزہ ہے؟ پڑھو تو مزہ آئے۔ آج رات تجربہ کرو، صرف دو رکعت پڑھ کر دیکھ لو۔ میں روز کا تو نہیں کہہ رہا ہوں، آج فیصلہ کر لو کہ رات کے آخری پہر ہم نے اُٹھنا ہے۔ اور یہ کوئی مشکل نہیں ہے، طلوع فجر سے پندرہ، بیس منٹ پہلے اُٹھ جاؤ۔ دوستوں کے لیے بھی تو تم چھ چھ گھنٹے ضائع کر دیتے ہو، فلم دیکھنے کے لیے بھی تو تین تین گھنٹے تمہاری پلک نیچے نہیں ہوتی۔ آنکھیں تباہ ہو جائیں، برباد ہو جائیں، لیکن نظر اُٹھا کر بیٹھے ہیں۔ آنکھ سے نظر نہ آئے تو چار نمبر کا شیشہ لگا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔

آج رات دو رکعت پڑھ کر دیکھ لو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ نئے کپڑے ہوں، بلکہ جو کپڑے اللہ نے دیئے ہیں وہی پہنو، البتہ پاک اور صاف ضرور ہوں۔ وضو میں سنت کے مطابق بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر شروع کرو، آرام سے ایک ایک عضو کو دھوؤ، اس کے بعد اللہ کے دربار میں کھڑے ہو کر ایک ایک لفظ پر غور کرو، اَللّٰهُ أَكْبَر کہو تو سمجھو کہ اللہ بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، دنیا کی کوئی مخلوق اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جب وہ بڑا ہے تو اس کا حکم بھی چلے گا...... یا تو بڑا مانو نہیں، اگر مانو گے تو پھر اس کا حکم مانو۔ اگر حکم نہیں مان رہے ہو تو بڑا ماننے کا کیا مطلب ہے؟ ایک آدمی کہے کہ آپ ہمارے بڑے ہیں، آپ ہمارے بزرگ ہیں، وہ کہے کہ میری بات مانتے تو نہیں ہو، مجھے بڑا ماننے کا کیا فائدہ؟ جب اَللّٰهُ أَكْبَر کہہ رہے ہو اور مان نہیں رہے تو تم نے یہ بڑا کیا مانا؟...... اور جب ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ پڑھو تو اللہ کی ربوبیت پر غور کرو، اُلوہیت پر غور کرو کہ کون اللہ؟ وہ اللہ جو ''اَلْمُتَّصِفُ بِسَائِرِ صِفَاتِ الْكَمَالِ، اَلْمُتَنَزِّهُ بِسَائِرِ صِفَاتِ النُّقْصَانِ وَ الْاِخْتِلَالِ'' ہے، اللہ کی عظمت دل میں آئے، رب کی ربوبیت دل میں آئے، اور عالمین پر نظر ڈالو اور پھر اللہ کی ''رحمٰن'' والی صفت پر نظر ڈالو، پھر ''رحیم'' والی صفت پر نظر ڈالو۔

اب آگے نکلو اور ﴿يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ پر نظر ڈالو کہ ہم نے اس عالم سے آگے بھی جانا ہے، وہ اس عالم اور انصاف

کے دن کا مالک اللہ ہے۔ جب یہ ساری چیزیں آپ کی نظر میں آجائیں تو پھر آگے پڑھو: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ عبادت کا مستحق بھی وہ ہے، پھر مدد کے قابل بھی وہ ہے، لہٰذا استعانت کے لیے اس کی درگاہ میں درخواست پیش کرو، ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ میرے پروردگار عالم! میرے ذمہ تو اتنا تھا کہ وضو کر کے تیرے رسول کے کہنے پر آج تیرے دروازے پر کھڑا ہو گیا، لیکن سیدھے راستے پر چلا کر جنت میں تُو نے پہنچانا ہے۔

قیام میں ایک ایک حرف پر اور ایک ایک حرکت پر غور ہو۔ جب رکوع میں جاؤ تو اس کی عظمتوں پر غور ہو، جب سجدے میں جاؤ تو اس کے علو پر غور ہو۔ وہ عالی ہے، وہ سب سے اعلیٰ ہے اور اس سے بڑا کوئی نہیں ہے، اس سے پہلے کوئی نہیں ہے، اس کے بعد کوئی نہیں ہے۔ اس انداز میں دو رکعت پڑھو اور پھر مجھے بتانا کہ نماز کا فائدہ ہوا یا نہیں ہوا۔

صبر کی تفسیر:

مقاتل بن حیان نے بھی اپنی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ اگر تم نے آخرت کی بھلائی طلب کرنی ہے تو نماز سے مدد پکڑو، اللہ کے فرائض پر جمے رہو، ان کو پابندی سے ادا کرو۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ صبر سے مراد روزہ ہے جیسے صلوٰۃ سے مراد نماز ہے، کیونکہ صبر کا معنی ہوتا ہے: منع کرنا، یعنی اپنے آپ کو کسی چیز سے روکنا۔ اور روزہ اپنے نفس کو کھانے، پینے اور بیوی سے مجامعت سے روکنے کا نام ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ اس لیے رمضان المبارک کو صبر کا مہینہ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت سفیان ثوری نے ابو اسحاق سے اور انہوں نے جری بن کلیب سے اور انہوں نے بنو سلیم کے ایک آدمی سے روایت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((اَلصَّوْمُ نِصْفُ الصَّبْرِ.)) [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۲۳۱۳۹]

"روزہ آدھا صبر ہے۔"

مثلاً صبر کے اگر سو درجات ہوں تو روزہ رکھنے والے نے گویا پچاس درجے صبر کے حاصل کر لیے۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ صبر کا معنی ہے: گناہوں سے رک جانا۔ کیونکہ ہر انسان فطری طور پر ان چیزوں کی طرف مائل ہوتا ہے جن میں لذت، شہوت اور عارضی مزہ ہو۔ جیسے اللہ نے فرمایا کہ لوگوں کے لیے مزین کر دی ہے عورتوں، مال، اولاد اور پیسے کی محبت۔ طبیعت اس طرف کھنچتی ہے، لیکن یہ رُکتا ہے کہ اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے میں

کہیں آخرت کی بھلائیوں سے محروم نہ ہو جاؤں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے صبر کو نماز کے ساتھ ذکر کیا تو اس سے بھی ایک اشارہ ملتا ہے کہ جب وہ اللہ کی نافرمانیوں سے رکے گا تو نمازیں بھی پڑھے گا۔ اگر کوئی شخص (نعوذ باللہ) گناہوں میں اُلجھ گیا تو وہ اللہ کے فرائض کیا ادا کرے گا؟ اور سب سے اعلیٰ فرض اللہ کی نماز ہے، کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے کہ نماز کو پابندی کے ساتھ اس کے اوقات میں پڑھنا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۷، البقرۃ: الآیۃ: ۴۵]

بڑا صبر:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اَلصَّبْرُ صَبْرَانِ'' صبر دو قسم کا ہے: ایک مصیبت اور صدمہ کے وقت آدمی کا صبر کرنا، یہ بڑی اعلیٰ چیز ہے۔ لیکن اس سے بھی اعلیٰ صبر یہ ہے کہ آدمی ان چیزوں سے بچے جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے منع کیا ہے۔ تو اپنے نفس کو گناہ اور منکرات سے روکنا، سب سے بڑا صبر ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ صبر یہ ہے کہ بندے کو جو تکلیف پہنچے، وہ یہ اعتراف کرے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ جو کچھ بھی اللہ نے دکھ، تکلیف مجھے پہنچایا ہے اسی میں بہتری ہے، اللہ کا جو فیصلہ ہو وہ قبول ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۷، البقرۃ: الآیۃ: ۴۵]

پہلے دن سے صبر:

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے فرمایا: کبھی کبھی آدمی کسی کے مرنے پر بہت واویلا کرتا ہے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر روتے روتے ایک دن صبر کر لیتا ہے۔ جب دو چار دن بعد بھی صبر کرنا ہے تو آدمی پہلے کیوں نہ صبر کرلے۔ کیونکہ اللہ کا فیصلہ بالکل ہمارے حق میں ہے اور خیر ہی خیر ہے۔ اگرچہ بظاہر ہمیں کوئی پہلو نقصان کا بھی نظر آتا ہے، لیکن باطن میں اللہ کی رحمت ہے، اس لیے آدمی فوراً صبر کرے اور اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہے اور اس کے بعد جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا بتلائی ہے، أَللّٰهُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِي، وَأَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا پڑھ لے تو اللہ کی رحمت ہی رحمت ہوگی۔



حضرت ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ [البقرۃ: ۴۵] کہ اللہ کی رضا کے کاموں پر صبر پکڑو، یعنی جمے رہو۔ یہ بھی اللہ کی اطاعت ہے کیونکہ اللہ کی رضا کے کاموں پر جمار ہنا بھی مشکل ہے، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۷، البقرۃ: الآیۃ: ۴۵]

مشکلات کے باوجود دینداری پر صبر:

اور جو آدمی دین کے قریب ہے وہ اتنا کمزور ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے امتحان ہے۔ یاد رکھو! اس بات پر صبر کر کے جمار ہنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔ میرے آقا، خاتم الانبیاء، حبیب کبریا، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے۔ جب نبوت کا اعلان کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی آرام سے گزر رہی تھی یا ابو جہل کی زندگی آرام سے گزر رہی تھی؟ آپ خود ٹھنڈے دل سے فیصلہ کریں۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو یہ تھی: ﴿أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ﴾ [الضحیٰ: ۶] والد، ولادت سے بھی پہلے فوت ہو گئے اور والدہ جب آپ کی عمر سات، آٹھ سال تھی تو فوت ہو گئیں، پھر عبد المطلب کی کفالت میں آ گئے، وہ فوت ہوئے تو ابو طالب نے کفالت کی، بالآخر وہ بوڑھے ہو گئے۔ اب جب عین نبوت اور توحید کے اعلان کا وقت آیا تو ابو طالب نے بھی جواب دے دیا کہ میں تو قوم سے نہیں لڑ سکتا۔ آپ اسی سے اندازہ فرمالیں کہ ابو جہل، عتبہ، عتیبہ، شیبہ، ربیعہ، ابی لہب جیسے کافروں کی زندگی میں مزہ اور آرام تھا یا حضرت بلال، حضرت خباب، حضرت یاسر، حضرت عمار، بی بی سمیہ، حضرت ابی بکر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم کی زندگی میں آرام تھا؟

یہ انگاروں پر لیٹ رہے تھے اور کافر رات کو شرابیں پیتے تھے اور گانے سنتے تھے اور وہی نقشہ تو قیامت تک میرے سامنے بھی رہے گا۔ یہ تو پھر آپ کو برداشت کرنا پڑے گا، جو اللہ کے نبی والی پارٹی میں آئیں گے انہوں نے ماریں بھی کھانی ہیں، تکلیفیں بھی اُٹھانی ہیں، گالیاں بھی سننی ہیں، لوگ دھکے بھی دیں گے، مسجدوں سے بھی نکالیں گے، پتھر بھی ماریں گے۔ اور اگر شیطان والی پارٹی میں جانا ہے تو مزے ہی مزے ہیں اور اس سے بھی ہٹ کر بے دینوں کی طرف چلے جائیں تو ساری قوم تمہارے پیچھے ہے۔

یہ صبر بڑا مشکل ہوتا ہے۔ کوئی مذاق تو نہیں ہے کہ مار کھاتے رہو اور حق پر جمے رہو، انگاروں پر لٹائے جاؤ اور کلمہ پر جمے رہو۔ اور جان رہے ہو کہ ابو جہل جہنمی ہے، بلال جنتی ہے، لیکن بلال مار کھا رہا ہے اور جہنمی مار رہا ہے۔ یہ کوئی

آسان کام تو نہیں ہے کہ دین پر جمے رہیں۔

وجہ کیا ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے لیے اگلا جہان بنایا ہے۔ جن کا ایمان اللہ پر اور آخرت پر پکا ہے وہ دنیا کی تکلیفوں کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں: یہ تو ہوتا رہے گا، یہ چند روزہ ہے، پچاس سال، سو سال کے بعد تکلیفیں ختم ہو جائیں گی، اگلا جہان ہم کیوں برباد کریں جس میں ہم نے ہمیشہ رہنا ہے۔ یہ جہان تو کافر کے لیے جنت اور مومن کے لیے قید خانہ ہے۔

جب ایمان اس مقام پر چلا جائے کہ سامنے کافر وجہنمی ہے، اللہ کا دشمن ہے، اللہ کے رسول کا دشمن ہے، وہ کوڑے لے کر اس پر برسا رہا ہے، جو اللہ کا محبوب ہے اور اللہ کے رسول کا بھی محبوب ہے اور کوڑے کھا رہا ہے، پھر بھی کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! اے اللہ! میں ایمان پر قائم ہوں، یہ صبر ہے۔ اللہ کی رضا پر جم جانا، یہ سب سے بڑا صبر ہے۔ وگرنہ تو دو چار دن کے بعد آدمی کہتا ہے کہ چھوڑو یار داڑھی کو۔ جس دن سے داڑھی رکھی ہے اور نماز پڑھنی شروع کی ہے، اس دن سے روٹی بھی بند ہوگئی ہے، اسی دن سے نوکری سے نکل گئے، دھکے کھا رہے ہیں روٹی ملتی نہیں ہے۔ چھوڑو یار نماز کو، کیا نماز اور کیا روزہ؟ بس داڑھی منڈاؤ، برائی کرو۔ بس یہ آدمی گیا اور صبر نہ کر سکا۔

اس لیے کہا گیا کہ مصیبت کے وقت بھی صبر ہے، گناہوں سے بچنا بھی صبر ہے، اللہ کے احکام پر چلنا اور آخرت پر ایمان رکھنا، یہ بھی صبر کے مدارج ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نصیب فرما دے۔

تفسیر:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نماز اللہ کے کاموں پر جمانے کے لیے بہت زیادہ مددگار ہے، جیسا کہ اللہ نے حکم فرمایا:

﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ﴾ [العنکبوت:۴۵]

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دار صحابی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی امر پیش آتا، کوئی مشکل پیش آجاتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے۔

[سنن أبي داود، حديث: ۱۳۱۹، بابُ وقتِ قِيامِ النبيِّ ﷺ مِنَ الليلِ]



اور دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ فَزِعَ إِلَى الصَّلَاةِ'' جب حضور ﷺ کو کوئی حادثہ یا کوئی مشکل پیش آتی تو نماز کی طرف توجہ فرماتے۔ لیکن آج ہمیں کوئی مشکل پیش آتی ہے تو صرف اللہ کے دروازے پر نہیں جاتے، باقی سب جتن کر لیتے ہیں۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب غزوۂ خندق کے موقع پر کافروں نے مدینہ منورہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا، میں کافی دیر رات کو معلومات لینے کے بعد حضور ﷺ کی خدمت میں لوٹا تو آپ ﷺ کپڑا لپیٹے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بدر کی رات سب سو رہے تھے، مگر ایک جاگنے والی ذات تھی اور وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تھی۔ حضور ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعائیں مانگ رہے تھے اور ساری رات جاگنے میں گزر گئی، حتیٰ کہ صبح ہوگئی۔

ابن جریر رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر گزرے تو وہ پیٹ پکڑے ہوئے زمین پر اوندھے پڑے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے کہا: ''أَشِكَمْ دَرْدْ؟'' (کیا تمہارے پیٹ میں درد ہے)؟ عرض کیا: جی! میرے پیٹ میں درد ہے۔ فرمایا: کھڑے ہو جاؤ، اللہ کی نماز پڑھو، نماز کے اندر اللہ نے شفا رکھی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۷، البقرة: الآیۃ: ۴۵]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی ہر مسئلہ نماز سے حل ہوتا تھا۔ یہ نہیں ہے کہ پیاس لگے تو پانی نہ پیو۔ تمہیں کون پانی پینے سے روکتا ہے؟ یہ تو اسباب ہیں، ان کو تو اختیار کرنا ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ نظریہ یہ ہو کہ اصل میرا مالک اللہ ہے۔ اگر میرا اللہ نہ چاہے تو پانی پینے سے بھی میری پیاس نہ بجھے اور میرا اللہ چاہے تو ایک گھونٹ پانی سے بھی میری پیاس بجھا دے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کھجور کا ایک ایک دانہ کھا کر جہاد کیا تھا اور دشمن کا مقابلہ کیا تھا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی مشقتیں:

آپ سوچ سکتے ہیں کہ کھجور کے ایک دانے پر ایک دن کا گزارا کرنا۔ ذرا ایک دو دن تجربہ تو کرو۔ پھر ذرا صحابہ کے ایمان کو بھی آزماؤ۔ اور اس زمانے میں بھی پوچھنے والے تابعین پوچھ رہے ہیں کہ ایک کھجور کے دانے پر کیسے

گزارا کرتے تھے؟ کمال ہے! تو فرمایا: کمال کر رہے ہو، وہ زمانہ بھی تھا جب ایک کھجور دو آدمی تقسیم کرتے تھے۔ پوچھا: عجیب بات ہے پھر آدھی کھجور سے کیسے گزارا ہوتا تھا؟ فرمایا: خدا کے بندے! یہ تو ہمیں اس وقت پتہ چلا کہ جب وہ آدھی کھجور بھی ختم ہوگئی، صرف گٹھلیاں منہ میں لے کر چوستے رہتے تھے۔

کسی چیز کی قدر اس وقت آتی ہے جب وہ ملنا بند ہو جائے۔ اب میرے سامنے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں رکھی ہیں تو مجھے پانی کی کیا قدر ہوگی؟ آپ سفر کر رہے ہوں، گرمی میں جا رہے ہوں، گرمی سے آپ کا دماغ اُبل رہا ہو اور آگے جا کر آپ کو ایک گلاس کا چوتھا حصہ پانی مل جائے تو آپ کہیں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! میں تو بچ گیا۔ اس وقت پانی کی قدر ہوگی۔ ذرا تجربہ کریں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کے صبر کا واقعہ:

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سفر میں تھے، ان کو اپنے بھائی قُثم کی موت کی اطلاع ملی تو انہوں نے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا۔ پھر راستے سے ایک طرف ہٹ گئے، اپنی سواری کو بٹھایا، اس سے اُتر کر دو رکعت نماز پڑھی، آپ تشہد میں کافی دیر بیٹھے رہے، اس کے بعد جب اُٹھے اور اپنی سواری کی طرف جانے لگے تو یہ آیت پڑھ رہے تھے: ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ [البقرۃ:۴۵] کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ صبر اور نماز سے مدد پکڑو۔

ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں اللہ کی رحمت کی طرف مدد کرنے والی ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۷، البقرۃ: الآیۃ: ۴۵]

قصۂ قارون میں نکتہ:

جیسا کہ اللہ نے قارون کے قصہ میں فرمایا کہ جب لوگ قارون کی دولت کو دیکھ کر للچانے لگے کہ اے کاش! ہمارے پاس بھی اتنا مال ہوتا جتنا قارون کے پاس ہے۔ جو لوگ علم اور ایمان والے تھے، انہوں نے کہا: یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تمہیں بربادی و ہلاکت ہو، اللہ کا ثواب اور اللہ کی نعمتیں اس سے زیادہ ہیں، لیکن ان چیزوں کا پتہ ان لوگوں کو ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، اور یہ چیزیں حاصل نہیں ہوتیں، مگر ان لوگوں کو جو صبر کرنے والے تھے، اللہ کی اطاعت پر جمنے والے ہیں۔ اللہ پاک نے دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۝﴾ [فصلت: ۳۴، ۳۵]

تم برائی اور بھلائی کو برابر نہ سمجھو، بلکہ اگر کوئی تمہارے ساتھ بُرا سلوک کرے تو تم بھلائی کے ساتھ اس کا جواب دو۔ جیسا کہ ہمارے آقا ﷺ نے ہمیں ارشاد فرمایا: جو تمہارے ساتھ رشتہ توڑے تم اس کے ساتھ جوڑو، جو تمہارے ساتھ زیادتی کرے تم بھلائی کرو، جو گالیاں دے تم دعائیں دو۔

وگرنہ تو دعائیں دینے والے کو ہر کوئی دعائیں دیتا ہے، اچھی بات کہنے والے کو تو ہر کوئی اچھی بات کہتا ہے، اصل تو یہ ہے کہ وہ توڑے اور تم جوڑو، وہ گالی دے اور تم کہو: "جَزَاكَ اللّٰهُ" بھائی! اللہ تیرا بھلا کرے، اللہ تجھے بھی اور مجھے بھی ہدایت دے۔ اور فرمایا کہ جو تم پر ظلم کرے تم معاف کرو۔ پھر تو بات ہے، یہ تو نہیں کہ تم رگڑ دو، بلکہ بدلہ تو یہ ہے کہ تم کو موقع ملے پھر بھی تم کہو کہ جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا۔

اللہ فرماتے ہیں کہ اگر تم ایسا کرو گے تو تم اور جن کے درمیان تمہاری دشمنی ہے ایسے ہو جاؤ گے جیسے خالص دوست ہوتے ہیں۔ فرمایا: یہ نعمتیں ایسے نہیں ملتیں، مگر ان لوگوں کو جو صبر کرنے والے ہیں اور جو خوش نصیب ہیں۔

تفسیر:

﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ۝﴾ [البقرة: ۴۵]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "خٰشِعِیْنَ" سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جو اللہ نے اُتارا ہے اس کی تصدیق کرنے والے ہیں۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے پکے مومن مراد ہیں، ان کے لیے نہ نماز مشکل ہے اور نہ صبر مشکل ہے۔

ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "خٰشِعِیْنَ" سے مراد وہ ہیں جو اللہ کے عذاب وعقاب سے ڈرنے والے ہیں۔

حضرت مقاتل بن حیان فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے آگے تواضع کرنے والے ہیں۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے ﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ﴾ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ نماز بڑی بھاری ہے، لیکن ان لوگوں کے لیے جو تواضع کرنے والے ہیں، اطاعت کرنے والے ہیں، اللہ کے عذاب اور اللہ کی پکڑ سے ڈرنے والے ہیں، اللہ نے جو قرآن کے اندر وعدے کیے ہیں ان کے ماننے والے ہیں، اللہ نے جو عذاب کی وعید بیان کی ہے ان کی بھی

تصدیق کرنے والے ہیں۔

حضرت ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ ﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ کا معنی یہ ہے کہ اے یہود و نصاریٰ کے علماء و احبار، جو اللہ کی کتاب تورات کے پڑھنے والے ہو! تمہیں ہم حکم دیتے ہیں کہ اپنے نفسوں کو روکو، اللہ کی اطاعت پر جم جاؤ، نمازیں قائم کرو، تاکہ یہ تمہیں برائیوں اور منکر سے روکے اور یہ چیز تمہیں اللہ کی رضا کے قریب کرنے والی ہے۔ اور اس کا قائم کرنا بڑا آسان ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ سے ڈرنے اور اللہ کے آگے تواضع و عاجزی کرنے والے ہیں۔

﴿الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُّلٰقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رٰجِعُونَ﴾ [البقرۃ:۴۶]

یعنی جنہیں یہ یقین ہے کہ ہمیں حشر میں اُٹھایا جائے گا اور ہم اللہ کے آگے پیش ہوں گے اور ان کے سب کام اللہ کی مشیت کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اللہ ان میں حکم کریں گے عدل سے، اگر وہ کسی کو جہنم میں ڈالیں گے تو وہ عدل وانصاف ہوگا اور اگر کسی کو جنت دیں گے تو وہ اللہ کا فضل اور اللہ کی رحمت ہوگی۔ جب ان لوگوں کو یقین ہوگیا کہ آخرت آنی ہے اور بدلہ ملنا ہے تو اب ان کے لیے اچھے کام کرنے آسان ہوگئے اور منکرات سے بچنا آسان ہوگیا۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۸۸، البقرۃ: الآیۃ:۴۵]

''ظن'' کا معنی:

﴿يَظُنُّونَ﴾ حضرت ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ محاوراتِ عرب میں ''ظن'' کا لفظ ''یقین'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور ''شک'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

عربوں کو اگر یکدم اندھیرا ہوجائے تو کہتے ہیں: ''سدفة'' (اچانک اندھیرا ہوگیا)، اور اگر اچانک روشنی ہوجائے تو بھی ''سدفة'' ہی کہتے ہیں۔ یعنی اس لفظ کا اطلاق ''ظلمت'' پر بھی کردیتے ہیں اور ''روشنی'' پر بھی کردیتے ہیں۔ اور اسی طریقہ سے مدد مانگنے والے کو ''صارخ'' کہتے ہیں اور جو مدد کرنے والا ہے اس کو بھی ''صارخ'' کہہ دیتے ہیں۔

اصل میں ''ظن'' کا معنی ''گمان'' ہے، لیکن اس کی دو طرفیں ہیں، ایک طرف بڑھتے بڑھتے ''یقین'' تک پہنچ جاتی ہے اور ایک گرتے گرتے ''شک'' تک پہنچ جاتی ہے، اس لیے ظن غالب کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ درید بن



اصمعہ کا شعر ہے:

قُلْتُ لَهُمْ ظُنُّوا بِأَلْفَيْ مُدَجَّجٍ
سَرَاتُهُمْ فِي الْفَارِسِيِّ الْمُسَرَّدِ

''میں نے ان سے کہا کہ تم یقین کرلو کہ تم سے دو ہزار سوار غطفان کے پورے ہتھیار بند آ لڑیں گے، جن کے سردار چھوٹے چھوٹے حلقوں والی فارسی زرہیں پہنے ہوئے ہوں گے۔''

فَإِنْ يَعْبُرُوا قَوْمِي وَ أَقْعُدُ فِيكُمْ
وَ أَجْعَلُ مِنِّي الظَّنَّ غَيْبًا مُرَجَّمَا

یہاں بھی ''ظن'' بمعنی یقین ہے۔

مفسر ﷫ فرماتے ہیں کہ اگر شعرائے عرب کا کلام دیکھا جائے تو کئی مقام پر ''ظن'' بمعنی یقین استعمال ہوا ہے۔

حضرت مجاہد ﷫ فرماتے ہیں کہ قرآن میں جہاں جہاں بھی ''ظن'' کا لفظ آیا ہے وہ یقین کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ اس آیت بالا میں ہے۔

اور بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ''علم'' ہے۔ جیسا کہ قیامت کے دن مومن کو اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں ملے گا تو وہ خوش ہو کر دوڑ رہا ہو گا کہ مجھے پروانہ مل گیا ہے اور کہے گا:

﴿إِنِّي ظَنَنتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ﴾ [الحاقۃ:۲۰]

حدیث صحیح میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندے سے فرمائیں گے: میں نے تمہیں جوڑا بنایا، تمہارے لیے سکون بنایا، تمہاری تکریم کی، میں نے گھوڑے، اونٹ اور ہر چیز تیرے لیے مسخر کر دیئے اور تمہیں چھوڑا کہ جیسے چاہو آرام حاصل کرو، سردار بنو۔ یہ ساری نعمتیں میں نے تجھے دی تھیں یا نہیں دی تھیں؟ وہ کہے گا: ہاں ادی تھیں۔ اللہ فرمائیں گے: کیا تم نے کبھی یہ یاد کیا تھا کہ میں نے قیامت کے دن اللہ کے سامنے جانا ہے جس نے یہ ساری نعمتیں دی ہیں؟ وہ کہے گا: اللہ پاک! مجھے خیال نہیں آیا۔ اللہ فرمائیں گے: تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نے تمہیں بھلا دیا۔ اب جہنم میں چلے جاؤ۔

اس آیت کی مزید تفصیل ﴿نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ ۗ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ [التوبۃ:۶۷] کے تحت بیان ہوگی۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۸۸، البقرۃ: الآیۃ:۴۵]

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَـيْــــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝﴾ [البقرة: ۴۷، ۴۸]

"اے بنی اسرائیل! میرے احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیے تھے اور اس کو کہ میں نے تمھیں تمام عالم پر فضیلت دی تھی۔ اور اس دن سے ڈرو کہ کوئی شخص کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے سفارش قبول ہوگی اور نہ اس کی طرف سے فدیہ لیا جائے گا اور نہ اس کی مدد کی جائے گی۔"

گزشتہ آیات میں بھی تذکیر نعم تھی اور ان آیات میں بھی تذکیر نعم ہے۔

حضور ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ میری اُمت کے لوگ قرآن مجید کو ایسا بنا بنا کر اور سنوار کر پڑھیں گے اور اتنی کثرت کے ساتھ پڑھیں گے کہ اگر تم ان کی تلاوت کو سن لو تو حیران ہو جاؤ کہ یہ کتنے قرآن پڑھنے والے لوگ ہیں!! لیکن وہ دین سے ایسے نکلیں گے جیسے تیر اپنے شکار سے نکل جاتا ہے۔ فرمایا کہ وہ لوگ ایسے دین سے نکلنے والے ہوں گے کہ دین کا ان پر کوئی معمولی سا اثر بھی نہیں ہوگا۔

[صحيح البخاري، حديث: ۳۶۱۰، باب علامات النبوة...]

جب آدمی کسی شکار کو تیر مارتا ہے تو بعض اوقات وہ تیر اس سے نکل جاتا ہے اور تیر کو دیکھو تو اس پر کوئی خون بھی نہیں ہوتا، یعنی اس شدت سے وہ اس کے اندر سے گزرتا ہے کہ اس پر خون کا ایک قطرہ بھی نہیں لگا ہوتا۔ کبھی گولی سے شکار کریں تو وہ جانور کے بدن سے تو آر پار ہو جاتی ہے، لیکن بالکل صاف ہوتی ہے، اس پر خون کا کوئی داغ بھی نہیں ہوتا۔

اسی طرح میرے آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ علاماتِ قیامت میں سے یہ بھی ایک علامت ہے کہ قرآن پڑھنے والے تو بہت ہوں گے اور ایک حدیث میں ہے کہ قاری القرآن قرآن کو بڑا سنوار سنوار کر پڑھیں گے، لیکن ایسے لوگ ختم ہو جائیں گے جو اس قرآن کا علم رکھتے ہوں گے اور اس پر عمل کرتے ہوں گے۔

اسی طرح میرے آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بہت سے قاری (قرآن پڑھنے والے) ایسے بھی ہوں گے جو قرآن پڑھ رہے ہوں گے اور اللہ کا قرآن ان پر لعنت کر رہا ہوگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! قرآن

پڑھنے سے تو رحمت ہوتی ہے لعنت کیسے ملے گی؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: قرآن بھی پڑھ رہے ہوں گے اور قرآن کے حکم کی مخالفت بھی کر رہے ہوں گے۔

[روح المعانی، سورۃ: فاطر، آیۃ: ۲۹، تفسیر ابن بادیس، ص: ۴۸]

مثلاً قرآن کہتا ہے: نماز قائم کرو، وہ نماز نہیں پڑھتے ہوں گے۔ قرآن کہتا ہے: زکوٰۃ ادا کرو، وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ہوں گے، قرآن حکم دے رہا ہے کہ اپنی بیٹیوں کو جائیدادوں میں حصہ دو، لیکن وہ نہیں دے رہے ہوں گے۔ قرآن حکم دے رہا ہے کہ جب دولت آجائے تو زندگی میں ایک دفعہ حج کرو، وہ حج ادا نہیں کر رہے ہوں گے۔ قرآن حکم دے رہا ہے کہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جہاد کرو، وہ نہیں کر رہے ہوں گے۔ قرآن انہیں حکم دے رہا ہے کہ اگر کسی ملک میں تمہارے لیے دین پر چلنا مشکل ہو جائے تو اس ملک کو چھوڑ دو، وہ ایسا نہیں کر رہے ہوں گے۔ قرآن حکم دے رہا ہے کہ زنا نہ کرو، وہ زنا کر رہے ہوں گے۔ قرآن حکم دے رہا ہے کہ غیبت نہ کرو، وہ غیبت کر رہے ہوں گے۔

یاد رکھیں! مسیح ایک لقب ہے، لیکن جب مسیح ابن مریم کہیں گے تو اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہوں گے، جیسا کہ قرآن مقدس نے ایک مقام پر یوں بھی ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى جَهَنَّمَ زُمَرًا......﴾ [الزمر: ۷۱] کہ کافروں کو جہنم کی طرف چلایا جائے گا۔ اور دوسری جگہ مسلمانوں کے متعلق بعینہ یہی الفاظ ہیں: ﴿وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا......﴾ [الزمر: ۷۳] چلایا جائے گا ان لوگوں کو جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں جنت کی طرف جماعتیں جماعتیں۔

دیکھیں! یہاں کافروں کے لیے بھی لفظ "سِيقَ" آیا اور مسلمانوں کے لیے بھی لفظ "سِيقَ" آیا ہے۔ "سِيقَ"، سَاقَ يَسُوقُ سے ہے، بمعنی چلانا۔ لیکن دونوں (کافر اور مسلمان) کے چلانے میں آسمان وزمین کا فرق ہے کہ مومنوں کو جب جنت کی طرف لے جایا جا رہا ہوگا تو ان کا بڑا اعزاز و اکرام ہوگا، اللہ کے فرشتے ان کو سلام کر رہے ہوں گے، ان کا استقبال کر رہے ہوں گے۔ اور کافروں کو جب جہنم کی طرف لے جایا جائے گا تو ان کے چہرے اور پشت پر مار پڑ رہی ہوگی اور جہنم کے فرشتے ان کا استقبال کر رہے ہوں گے۔

جیسے یہاں لفظ دونوں جگہ "سِيقَ" کا ہے، لیکن ان دونوں کے درمیان بہت بڑا بعد ہے۔ اسی طرح ایک مسیح ابن مریم ہے اور ایک مسیح الدجال ہے، ان میں بھی بہت بڑا فرق ہے۔ دجال کو مسیح اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی ایک آنکھ بالکل ختم ہوگی اور باہر اُبھری ہوئی ہوگی۔ جیسے آج کل "کانا" کہا جاتا ہے۔ چونکہ وہ ممسوح العین ہوگا اس



لیے اس کا لقب ''مسیح'' پڑ گیا۔ اور حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے لیے ''مسیح'' کا لقب اس لیے آیا کہ انہوں نے دنیا میں بڑی سیر کی، مختلف علاقوں میں، مختلف جگہوں پر آپ تشریف لے گئے اور پھر اس سے بڑی کیا بات ہے کہ اللہ نے انہیں زندگی میں آسمانوں کی سیر کرادی اور زندگی میں آسمانوں پر بٹھا دیا اور پھر زندہ آسمانوں سے زمین پر اُتریں گے اور شریعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے۔ اپنے دور میں وہ بیماروں اور معذوروں پر اپنا ہاتھ پھیرتے تو وہ تندرست ہوجایا کرتے تھے۔ ہاتھ پھیرنے کو بھی ''مسح'' کہتے ہیں اور ''مسیح'' بھی اسی سے مشتق ہے۔ (انور)

''اسرائیل'' دراصل لقب ہے، جیسا کہ اس کی تفصیل آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ ہر لغت کا اپنا ترجمہ ہوتا ہے، جیسے ''اللہ'' عربی زبان کا لفظ ہے اور ''خدا'' فارسی زبان کا لفظ ہے۔ پہلے زمانے میں زیادہ تر سریانی یا عبرانی زبان بولی جاتی تھی۔ سب سے پہلے عربی زبان میں بات کرنے والے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، اسی لیے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ وہ عرب ہیں جنہوں نے عربوں سے لغت سیکھی ہے۔[1] اسماعیل علیہ السلام خود عرب نہیں تھے، اس لیے کہ وہ اولادِ ابراہیم میں سے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام شام سے تشریف لائے تھے۔ اسماعیل علیہ السلام کی زندگی مکہ میں گزری۔ آپ کی والدہ ماجدہ مصر سے تھیں۔ جو قبیلہ جرھم آباد ہوا تھا، وہ قحطانی قبیلہ تھا جو یمن سے آیا تھا۔ یہ لوگ خالص عرب تھے، ان سے اسماعیل علیہ السلام کی رشتہ داری ہوئی، ان سے آپ نے پہلی شادی کی، انہی میں سے آپ کے بیٹے پیدا ہوئے اور اسی قبیلہ جرہم سے آپ نے عربی سیکھی۔ اس لیے وہ ایسے عرب بنے جنہوں نے دوسرے عرب سے عربی کو سیکھا۔ جیسا کہ محاورات میں کہتے ہیں: ''اِسْتَعْجَمَ'' وہ آدمی جس نے عجمیت کی کوئی زبان سیکھی ہو۔ اسی طرح کہتے ہیں: ''عرب مستعربہ'' وہ عرب جنہوں نے عربی سیکھی ہو۔ اس سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہے جنہوں نے ان عربوں سے لغت سیکھی اور عربی لغت میں آپ نے کلام فرمایا۔

یہ سارا سلسلہ دراصل ایک ہی پیغمبر سے چلا آرہا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سیدنا اسحاق علیہ السلام اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے۔

تو اللہ نے خطاب فرمایا: ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ اے اللہ کے بندے کے بیٹو! تم نبی کے بیٹے ہو، تم تو نبیوں کی

[1] [تفسیر القرطبی: ۱/ ۲۸۳، البقرۃ: ۲، الآیۃ: ۳۱]

اولاد ہو۔ یاد کرو میری نعمت۔

''نِعْمَۃٌ'' اور ''نَعْمَۃٌ'' میں فرق:

یاد رکھیں! ایک لفظ ہوتا ہے ''نَعْمَۃٌ'' نون کے فتحہ کے ساتھ، اور ایک ہوتا ہے ''نِعْمَۃٌ'' نون کے کسرہ کے ساتھ۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ ''نَعْمَۃٌ'' کہتے ہیں: خوشحالی، آسودگی، عیش و عشرت کی چیزیں جن میں آدمی لذت سے رہتا ہو، مثلاً باغ ہیں، محل ہیں، بڑے بڑے فارم ہیں۔

جبکہ ''نِعْمَۃٌ'' کا معنی ہوتا ہے: کسی پر احسان کرنا۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون لعین کے مقابلہ پر آئے تو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اعتراض کیا تھا:

﴿اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿١٨﴾﴾ [الشعراء:۱۸]

اے موسیٰ! تم وہی بچے نہیں ہو جو ہمارے گھر میں پلے ہو؟ ہم نے تمہیں اپنے گھر میں پالا پوسا اور جوان کیا اور آج تم ہمارے مقابلے پر آ گئے ہو؟ تم نے یہاں زندگی گزاری، ہماری تربیت کا یہی صلہ دے رہے ہو؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿٢٢﴾﴾ [الشعراء:۲۲]

فرعون! بڑے عجیب آدمی ہو! بڑا عجیب احسان مجھ پر لگا رہے ہو! تم نے میری قوم کے چھ لاکھ بندوں کو اپنی مزدوری پر لگایا ہوا ہے، ان کی مزدوری ہضم کرتے چلے آ رہے ہو، دوسری طرف تم نے اگر ایک بچے کو کچھ عرصہ کھلایا پلایا ہے تو وہ تمہیں بڑا یاد ہے۔ تم نے جو میری قوم متعدد بچوں کو قتل کر ڈالا، اُن کی بچیوں سے بیگار لی، اُن کو اپنے ملک میں قبطیوں کا غلام بنا ڈالا، میری قوم کا چھ لاکھ مزدور کما کما کر تمہارے خزانے بھرتا رہا، وہ تمہیں یاد نہیں اور تم ایک بچے کو کھلا کر احسان جتا رہے ہو، عجیب پاگل آدمی ہو۔

فرعونیت کے جراثیم:

آج کل بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ جتنے بھی وڈیرے ہوتے ہیں...... اللہ ان کو ہدایت دے...... ان سب کا وہی فرعون والا ذہن ہوتا ہے۔ یہ جتنے سرمایہ دار، جاگیردار، کارخانہ دار ہوتے ہیں...... یہ جتنے ''دار'' ہیں، دراصل ''مستحق دار'' ہیں...... ان کے دماغ میں وہی فرعونیت ہوتی ہے کہ تمام علاقے کے غریب کما کما کر ان کے خزانے

بھرتے رہیں اور ایک مرتبہ اگر کسی غریب کو ناجائز مقدمے میں چھڑالیں تو کہتے ہیں: یاد نہیں ہے کہ ہم نے تمہیں تھانے سے چھڑایا تھا؟ تمہیں یاد نہیں کہ ہم نے تمہیں جیل سے نکالا تھا؟ تمہیں یاد نہیں کہ ہم نے تمہارے باپ کو فلاں مصیبت سے بچایا تھا؟

خاندان کے خاندان، نسلوں کی نسلیں کماتی رہیں گے، یہ سب اُن کی کمائی لوٹتے رہیں گے، ان کے خون اور پسینے کی آمدنی اپنی تجوریوں میں ڈالتے رہیں گے اور اگر کبھی ٹھنڈے پانی کا گلاس پلایا ہوگا تو ہمیشہ اس کا طعنہ دیتے رہیں گے کہ تمہیں یاد نہیں کہ ہم نے تمہیں پانی پلایا تھا؟ یاد نہیں کہ جب تم ہمارے پاس آتے تھے تو ہم تمہیں کرسیوں پر بٹھاتے تھے، ہم تمہیں اپنے پاس بٹھاتے تھے، اپنے گھر بلاتے تھے؟ وہ کرسیاں جوان کے پسینے سے بنی ہوتی ہیں، ان کی دولت سے سے بنی ہوتی ہیں، ان کی مزدوریوں سے بنی ہوتی ہیں، وہ بھی انہی پر احسان جتلاتے ہیں، جیسا کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام پر احسان جتلایا۔

حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کا اس کے گھر میں آنا اللہ کی طرف سے ایک عجیب تنبیہ تھی کہ اے فرعون! تمہاری تمام تر فرعونیت کے باوجود، قوت وطاقت کے باوجود، شہنشاہیت کے باوجود، تمہارے اتنے بڑے لاؤ ولشکر کے باوجود دیکھو! جس بچے سے ہم نے تمہیں مروانا ہے، اس کو ہم تمہارے گھر میں پال رہے ہیں۔ اگر اس میں عقل ہوتی تو وہ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی سے سبق سیکھ لیتا، وہ عبرت پکڑتا کہ ایک طرف تو میں بچوں کو قتل کروا رہا ہوں اور دوسری طرف ایک بچے کو خود پال رہا ہوں۔

اور پھر بار بار تنبیہ آنے کے باوجود بھی اس ظالم کو عقل نہ آئی۔ چنانچہ اس نے ایک دن موسیٰ علیہ السلام کو محبت میں اُٹھایا اور ان کو کھلانے لگا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی داڑھی پکڑ کر اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا۔ اس وقت فرعون کو تھوڑی سی عقل آئی کہ یہ وہی بچہ تو نہیں ہے میری حکومت کے زوال کا ذریعہ بنے گا؟ اس کی بیوی بڑی عقلمند تھی، کہنے لگی: یہ تو بچہ ہے اور بچے ایسے مارتے رہتے ہیں، اس کو کیا پتہ کہ آپ بادشاہ ہیں؟ اس کو تو حرہ اور جمرہ میں فرق بھی معلوم نہیں۔ ایک طرف تم انگارے رکھ دو اور دوسری طرف کھجور رکھ دو تو اس کو کوئی پتہ نہیں لگے گا کہ یہ کھجور ہے اور یہ انگارے ہیں۔ ایک طرف تم جواہر رکھ دو اور ایک طرف تم انگارے رکھ دو، یہ روشن چیز کو دیکھ کر اس کو پکڑے گا۔ اس پر فرعون نے یہ معاملہ رفع دفع کر دیا۔ دراصل اس کے اندر عقل نہیں تھی، ورنہ وہ اس تنبیہ کو سمجھ لیتا۔

[تفسیر القرطبی: ۱۱/۱۹۲، سورۃ طٰہٰ: الآیۃ: وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي]



ہر فرعون کا انجام یکساں:

یاد رکھو! ہر زمانے کے فرعون کا انجام وہی ہوگا جو سابقہ فرعونوں کا ہوا ہے، ہر زمانے کے قارون کا وہی انجام ہوگا جو سابقہ قارون کا ہوا تھا، اور ہر ظالم کا انجام وہی ہوگا جو پہلے ظالموں کا ہوتا چلا آ رہا ہے۔

ظلم کو بقا نہیں:

ظلم آخر مٹ جاتا ہے اور مظلوم کو آخر اللہ تعالیٰ کی نصرت مل جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ جلدی ملے۔ خدا کی منشاء ہے، وہ چاہے تو جلدی دے دے، وہ چاہے تو دیر سے دے دے۔

ظالم کی وراثت......مظلوم کے حصہ میں:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں ''نِعْمَةٌ'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جس کا معنی ہے: منت (احسان)۔ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ دیکھو! ہم نے فرعون اور اس کی قوم کو عیش وعشرت کی کتنی چیزیں دی تھیں، وہ لوگ کتنی لذتوں بھری زندگی گزر رہے تھے، لیکن جب وہ مسلسل ظلم کرتے رہے اور بنی اسرائیل پر انہوں نے اپنا احسان جتایا تو ہم نے ان کو پکڑ لیا اور مظلوم بنی اسرائیل کو اس ظالم فرعون کا وارث بنا دیا۔

اللہ نے فرمادیا کہ اے اولادِ اسرائیل! اے اولادِ یعقوب! اے میرے خاص اور چنے ہوئے بندے کی اولاد! یاد رکھو! تم ان نعمتوں کو جو میں نے احسان کیا، فضل کیا تم پر، میں نے تم کو بزرگی دی اور میں نے تم کو سارے جہان والوں پر فضیلت دی۔ ان نعمتوں کو یاد کرو۔ یعنی یاد کرو کہ اللہ نے ہمیں بندہ بنا دیا، انسانوں کے گھر میں پیدا کر دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں حیوان بنا دیتے تو ہم کیا کر لیتے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں ہاتھ پاؤں سالم دے دیئے، اگر لنگڑا کر دیتے تو ہم کیا کر لیتے؟ یا آنکھوں سے اندھا کر دیتے تو ہم کیا کر لیتے؟ اگر کوئی مستقل بیماری لگا دیتے تو ہم کیا کر لیتے؟

ان سب چیزوں کو یاد کرنے کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس منعم کا شکر ادا کرو، یعنی اس پر ایمان لے آؤ اور اس کے احکام کی تعمیل کرو۔

عزت......سب سے بڑی نعمت:

سب سے بڑی نعمت ''عزت'' ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو جو سب سے پہلی نعمت یاد دلائی۔ وہ یہ تھی

کہ میں نے تمہیں تمام عالم والوں پر اور تمام لوگوں پر فضیلت دی۔

آپ نے دیکھا نہیں کہ بعض لوگوں کے پاس دولت تو بہت ہوتی ہے، لاکھوں روپے ان کے پاس ہوتے ہیں، لیکن ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ اگر کبھی ان کی بات چھڑ جائے تو لوگ کہتے ہیں کہ چھوڑو، حضرت! پیسے کا کیا ہے؟ پیسہ تو فقیروں کے پاس بھی ہوتا ہے، پیسہ تو طوائفوں کے پاس بھی ہوتا ہے، پیسہ تو ہندو مہاجن کے پاس بھی ہوتا ہے، اصل تو یہ ہے کہ بندے کی عزت ہو۔ چنانچہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا ایک بیگھا بھی زمین نہیں ہوتی، لیکن اللہ نے ان کو عزت دی ہوتی ہے۔

عالم کی شان کا واقعہ:

میرے ایک دوست تھے، وہ فوت ہو گئے...... اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں فرمائے...... بہت بڑے عالم کے بیٹے تھے اور خود بھی بڑے عالم تھے، بہت بڑی شخصیت تھے، ''رحمت اللہ'' ان کا نام تھا اور ''ارشد'' لقب تھا۔ ایک دن ہم اکٹھے بیٹھے تھے، اسی مجلس میں علاقہ کے دو چار سیٹھ اور تاجر اور بڑے بڑے زمیندار لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے اور چائے چل رہی تھی۔

ایک بڑے سیٹھ صاحب...... ان کا نام نہیں لیتا، تاکہ غیبت نہ ہو...... کہنے لگے: علامہ صاحب! عجیب بات ہے، آپ اتنے بڑے عالم اور فاضل ہیں، اللہ نے تمہیں اتنی لیاقت اور قابلیت دی ہے، تحریر اور تقریر کے میدان میں تمہیں بہت شہرت حاصل ہے، یہ تو بات ٹھیک ہے، لیکن ایسی قابلیت کا کیا فائدہ ہے کہ تمہارے پاس ایک ایکڑ زمین بھی نہیں ہے؟ اللہ کے بندے! اتنی زمین تو بنالو کہ چلو کم از کم تمہاری قبر تو اپنی زمین پر بن جائے...... وہ ان پر طنز نہیں کر رہا تھا، بلکہ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ دنیا میں کچھ جائیداد تو بنالیں...... اس پر علامہ صاحب مسکرا دیئے۔ سیٹھ نے کہا کہ آپ تو میری بات پر ہنس رہے ہیں۔ علامہ صاحب نے فرمایا کہ میں نے اتنا کچھ بنایا ہے کہ تم جیسے کروڑ پتی سیٹھ میرے جوتے پالش کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ میں اور کیا بناؤں؟ تم نے دولت بنائی، تم نے زمین بنائی، تم نے جاگیریں بنائیں، تم نے فیکٹریاں اور ملیں لگائیں اور میں نے یہ بنایا کہ تم سارے آکر میرے جوتے اُٹھاتے ہو۔ میں دولت کو آگ لگاؤں؟ جبکہ تم دولت والے میرے جوتے اُٹھانے میں فخر محسوس کرتے ہو۔

اس آیت میں ''عزت'' کی نعمت کو ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ اصل چیز عزت ہے، دولت نہیں۔ اس لیے اللہ نے فرمایا: اے بنی اسرائیل! تم یاد رکھو میری اس نعمت کو یاد کرو کہ میں نے تم کو سب سے پہلے جہان والوں پر فضیلت

دی۔ اور وہ فضیلت کیا تھی؟ اس کا ذکر دوسری آیت میں ہے:

﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الدخان: ۳۲]

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے علم کی رُو سے دنیا جہان والوں پر فوقیت دی۔''

ایک اور آیت میں نعمت کی تفصیل اس طرح مذکور ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [المائدۃ: ۲۰]

''اور اس وقت کا دھیان کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے میری قوم! اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم پر نازل فرمائی ہے کہ اس نے تم میں نبی پیدا کیے، تمہیں حکمران بنایا، اور تمہیں وہ کچھ عطا کیا جو تم سے پہلے دنیا جہان کے کسی فرد کو عطا نہیں کیا تھا۔''

ایک اشکال اور اس کے جوابات:

یہاں اشکال ہوتا ہے کہ اللہ نے فرمایا: ﴿وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو جہان والوں پر فضیلت دی۔ حالانکہ یہ بات تو واضح ہے کہ سب سے افضل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور تمام اُمتوں سے افضل اُمتِ محمد مصطفیٰ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ...﴾ [آل عمران: ۱۱۰]

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَنَا آخِرُ الْأَنْبِيَاءِ وَ أَنْتُمْ آخِرُ الْأُمَمِ.)) [ابن عساکر: ۱/ ۱۹۱، درمنثور: ۲/ ۲۴۴]

''اللہ نے مجھے نبیوں کا آخری بنایا اور تم آخری اُمت ہو۔''

نیز قرآن مجید میں ہے:

﴿جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ [البقرۃ: ۱۴۳]

قیامت میں ''شہادت علی الناس'' کا مرتبہ اُمتِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے گا۔ جب اللہ کسی اُمت کو ساری اُمتوں پر بطور گواہ چن لیں تو اس کی فضیلت کے اندر کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

﴿وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ کا تقاضا یہ ہے کہ بنی اسرائیل تمام جہان والوں سے افضل ہوں اور دوسری آیات کا تقاضا یہ ہے کہ اُمتِ محمد مصطفیٰ ﷺ افضل واعلیٰ ہو۔ علماء نے اس کے متعدد جواب دیئے ہیں:

❁.....ایک جواب یہ دیا کہ عالَم اسی کو کہتے ہیں جو موجود ہو اور جو موجود نہ ہو وہ تو عالَم ہے ہی نہیں۔ جیسے اس وقت عالمِ دنیا ہے اور عالمِ آخرت نہیں ہے۔ ہم عالم دنیا کو عالم کہتے ہیں، اور عالَم کا اشتقاق علم سے ہے عالَم، عالِم، علماء، علم، ان سب کا مادہ اصلی علم ہے۔ علم تب ہوگا جب کوئی چیز ہوگی، اگر کوئی چیز نہ ہو تو علم کیسے ہو؟

جب اللہ نے بنو اسرائیل کو فضیلت دی تھی اس وقت حضور ﷺ اور آپ کی امت موجود ہی نہیں تھی تو ان پر بنی اسرائیل افضل نہیں ہو سکتے۔ یہ تو ان لوگوں پر افضل ہوں گے جو اس وقت موجود تھے۔ جو عالَم تھا ہی نہیں، ان پر ان کی افضلیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

❁.....بعض علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ جس کو فضیلت دی جا رہی ہے، وہ من کل الوجوہ افضل ہو، بلکہ کبھی کسی ایک چیز میں بھی فضیلت دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: فلاں آدمی بڑا بہادر ہے۔ اس میں بہادری والی صفت پائی گئی۔ لیکن وہ عالم نہیں ہے تو اب اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ عالم سے بھی افضل ہے۔

جیسا کہ صفتِ حیا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اندر زیادہ تھی۔ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضور اکرم ﷺ ٹیک لگا کر لیٹے ہوئے تھے کہ اتنے میں میرے ابا آئے، آپ ﷺ اسی طرح لیٹے رہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے تو حضور ﷺ اسی طرح لیٹے رہے، تھوڑی دیر گزری تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آنے کی اطلاع ملی، حضور ﷺ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنا کپڑا اپنی پنڈلی مبارک کے اوپر کر لیا اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اندر بلایا۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے یہ بات سمجھ نہ آئی کہ جب ابا ابوبکر موجود ہیں، حضرت عمر موجود ہیں تو حضرت عثمان کا آپ نے اتنا خیال فرمایا کہ میرے ابا کے لیے بھی نہیں فرمایا۔ میں نے حضور ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! عثمان بڑا شرمیلا ہے، بڑا حیا والا ہے، اتنا حیا والا ہے کہ اللہ کے فرشتے بھی اس سے حیا کرتے ہیں۔ اگر میں اسی طرح بے تکلفی میں لیٹا رہتا تو وہ بیٹھ نہ سکتا۔ اس کی طبیعت اتنی نفیس و نازک ہے اور صفتِ حیا کا اتنا غلبہ ہے کہ مجھے سیدھا ہو کر بیٹھنا پڑا، تا کہ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ سکے۔ تو صفتِ حیا میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بڑی شان ہے۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۰۱، باب: مِنْ فَضَائِلِ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رضی اللہ عنہ]

حضور ﷺ کی دو بیٹیاں (حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا اور بی بی اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا) یکے بعد دیگرے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی



بیویاں بنیں۔ اسی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا لقب ''ذوالنورین'' ہے کہ جن کے گھر میں اللہ کے نبی ﷺ کی دو نورعین تھیں[1]......بچیوں کو ''نورعین'' کہا جاتا ہے کہ میری آنکھوں کا نور ہے، دل کا سرور ہے...... جب دوسری بیٹی بھی فوت ہوگئیں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے عثمان! اگر اللہ مجھے سو بیٹیاں بھی دیتا تو میں انہیں یکے بعد دیگرے تیرے نکاح میں دیتا رہتا۔

[کنزالعمال، حدیث:۳۶۲۰۶]

دیکھیں! حضور ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کتنی عزت دی، جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں حضور ﷺ کی ایک بیٹی آئی۔ تو یہ جزوی فضیلتیں ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۸۸، ۸۹، البقرۃ: الآیۃ:۴۷]

افضلیتِ خلفاء راشدین:

لیکن جب کلی فضیلتوں کو سامنے رکھا جائے تو حضور ﷺ کے بعد سب سے افضل ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے، کوئی سُنّی، اس وقت تک سُنّی نہیں بن سکتا جب تک اس کا یہ عقیدہ نہ ہو کہ پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ و حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اسی ترتیب سے جو ان کی افضلیت کا قائل نہ ہو، اس کو ''اہلسنت والجماعت'' کہلانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

وجہ یہ ہے کہ اگر ساری صفات اکٹھی کی جائیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں پائی جانے والی صفات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اندر کہاں ملیں گی؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تو اسلام میں لانے والے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وجہ سے عثمان رضی اللہ عنہ اسلام میں آئے۔ سب سے پہلے اسلام لانے والے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نبی کی بیٹیاں لی ہیں اور دینے والے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، انہوں نے اپنی بیٹی حضور ﷺ کو دی ہے، اتنی بڑی قربانی دینے والے اور پھر سب سے اوّل اسلام لانے والے بھی ابوبکر ہیں۔ تو کلی فضیلت بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کی ہوئی۔

اسی طرح بنی اسرائیل کو بھی جزوی فضیلت حاصل تھی۔ ہاں! جب مجموعی فضیلتوں کو سامنے رکھا جائے گا تو اُمت محمدیہ ﷺ ساری اُمتوں سے افضل ہوگی۔ بنی اسرائیل میں سے چار ہزار نبی آئے، وہ چار ہزار نبی بھی شان والے، لیکن اللہ نے ایک آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھیجے، جو اُن چار ہزار انبیاء اور باقی تمام انبیاء سے شان میں بڑھ گئے۔ نیز حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام میرے ابا ہیں، میں ان کا بیٹا ہوں، لیکن قیامت والے دن



[1] [کنزالعمال، حدیث:۳۶۲۴۹]

وہ میرے پرچم کے نیچے ہوں گے۔

یہ جو شان اور شرف ملا، اس کی وجہ سے حضور ﷺ تمام انبیاء و مُرسلین سے اور آپ ﷺ کی اُمت تمام اُمتوں سے آگے نکل گئی۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ انبیاء کو بھی عظمت اور مرتبہ عطا ہوا، وہ بھی حضور ﷺ کی وجہ سے ہوا تو بے جانہ ہوگا۔ جیسا کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے جب اشعار میں حضورِ اکرم ﷺ کی تعریف کی تو فرمایا:

مَا إِنْ مَدَحْتُ مُحَمَّدًا بِمَقَالَتِي
وَ لٰكِنْ مَدَحْتُ مَقَالَتِي بِمُحَمَّدٍ

[الصبح المنبي عن حيثية المتنبي:۱/۲۸۸]

لوگ سمجھتے ہیں کہ میں نے اپنے اشعار اور قصیدوں میں حضورِ اکرم ﷺ کی تعریف کی ہے اور بڑا کمال کر دکھایا ہے۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے، بلکہ میرا قصیدہ اس لیے اچھا بن گیا کہ اس میں میرے مدنی کا نام آ گیا۔ مجھے یہ شرف ملا کہ اس میں محمد مصطفیٰ ﷺ کا ذکر آ گیا۔

جزوی فضیلت کے تذکرے کی مثالیں:

اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اپنی نعمتوں کا ذکر فرماتے ہیں۔ لیکن وہاں کلی فضیلت مراد نہیں ہوتی، بلکہ جزوی فضیلت مراد ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝﴾ [البلد:۸،۹،۱۰] اے میرے بندے! کیا تُو غور نہیں کرتا کہ میں نے تجھے دو آنکھیں دی ہیں، ان آنکھوں پر تُو غور کر لے کہ میں ان آنکھوں کے کیسے بنایا؟ اتنی نازک چیز کہ میں نے تمہارے اندر قوتِ باصرہ رکھا ہے۔ ذرا اس کے شفاف پردوں پر غور کرو، اس کے اندر پُتلی پر غور کرو، اس کے اندر جو پانی کا ایک قطرہ ہے اس پر غور کرو، پھر اس کے مرکزِ اصلی پر غور کرو۔ پھر اتنی نرم و نازک چیز کی حفاظت پر غور کرو کہ اس کے اوپر پردے لگا دیے ہیں، آگے پلکیں لگا دی ہیں، تاکہ کوئی گرد و غبار بھی اندر نہ چلا جائے۔ اور پھر اتنی چھوٹی چیز، اتنے محدب شیشے میں اتنی پاور دے دی ہے کہ اُٹھے تو بجلی پناہ مانگے اور گرے تو خانہ خراب کر دے۔ پھر بھی تُو مجھے نہیں مانتا۔

اور فرمایا کہ غور کرو کہ میں نے تمہیں ایک زبان دی ہے، ایک گوشت کا ٹکڑا ہے، کاٹ کر باہر پھینک دو تو تمہیں اس کی قدر کا اندازہ ہو جائے گا۔ جانور کی زبان دیکھی نہیں ہے کہ اس کو کاٹ کر کھا جاتے ہو؟ اس زبان میں مَیں نے

کتنی طاقتیں رکھی ہیں؟ تم بھی کوئی ٹکڑا بناؤ جو ایسے بولتا ہو۔

اس کے بعد فرمایا: میں نے تمہیں کیسے خوبصورت ہونٹ دیئے؟ اگر ایک ہونٹ کٹ جائے تو پھر دیکھو، اگر ایک ہونٹ میں کٹ لگ جائے تو دیکھو، ہونٹ میں ورم آجائے تو دیکھو، نیچے والا ہونٹ نیچے گر جائے تو گھر والے بھی ڈر جائیں۔

دیکھیں! ان آیات میں اللہ نے آنکھ، زبان اور پھر ہونٹوں کا تذکرہ کیا۔ یہ تینوں اپنے طور پر بہت فوائد کے حامل ہیں، جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ لیکن ان کا یہ تذکرہ اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ ان کو پورے انسانی بدن پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ اس سے فقط ان کی جزوی فضیلت معلوم ہوتی ہے، کلی فضیلت پورے انسانی جسم کو حاصل ہے جس میں یہ تینوں بھی آجاتے ہیں۔

مدینہ وگردونواح میں یہود کی آباد کاری:

تواریخ یہ بتلاتی ہیں کہ جب یمن کا بادشاہ ''تبع'' مدینہ منورہ میں آیا تھا، اس زمانہ میں یہود مدینہ منورہ میں آکر آباد ہونا شروع ہوئے...... تبع، وہ بادشاہ ہے جس نے سب سے پہلے اللہ کے گھر کو غلاف دیا، یہ یمن کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا[1]...... اصل میں وہ مختلف فتوحات کرتے ہوئے مدینہ منورہ میں آیا تو اس کے ضمن میں کچھ یہود مدینہ منورہ میں آگئے اور پھر وہ وہیں اقامت پذیر ہو گئے۔

اپنی کتابوں کی پیشین گوئی کے مطابق کہ ایک آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پیدا ہوں گے اور مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائیں گے تو ہم لوگ ان پر ایمان لائیں گے۔ ان کا مدینہ منورہ میں آنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایمان لانے میں سبقت ملے گی۔ یہ تبع کے زمانہ سے وہاں آکر آباد ہوئے اور اس کے بعد بھی آتے رہے۔ ان کے معروف قبائل: بنو قریظہ، بنو قینقاع اور بنو نضیر تھے۔ ان کے علاوہ متفرق قبائل کے بھی کچھ لوگ ہیں جو مدینہ منورہ میں آکر آباد ہوئے۔

ویسے یہ بات بالکل غلط ہے کہ مدینہ منورہ ان کا اپنا ملک تھا، جیسا کہ ان بدبختوں نے اپنے مکر اور خداع کے پیش نظر دنیا کو یہ تاثر دیا ہوا ہے کہ مدینہ منورہ تک اسرائیل کا حصہ بنتا ہے، یہ ہمارا علاقہ تھا، ہم مدینہ منورہ میں رہنے والے تھے، وہاں ہمارے گھر تھے، ہمارے قلعے تھے، وادیاں تھیں، لہٰذا یہ علاقہ ہمارا ہے۔ یہ سراسر دھوکہ اور فراڈ

[1] [مصنف عبدالرزاق، حدیث: ۹۰۸۶]

ہے۔ نہ ان کا مدینہ منورہ سے کوئی تعلق تھا، نہ ان کا سرزمین عرب سے کوئی تعلق رہا ہے، بلکہ یہ اپنے ملک چھوڑ کر یہاں آباد ہوئے تھے کہ حضور ﷺ پر ایمان لائیں گے، لیکن جب حضور ﷺ تشریف لے آئے تو بغض، حسد اور عناد کی وجہ سے ان لوگوں نے اللہ کے نبی سے کفر کیا۔

ایک شبہ کی وضاحت:

مستشرقین یہاں ایک شبہ پیدا کرتے ہیں کہ خداوند قدوس نے قرآن میں یہ حکم فرمایا ہے کہ اگر تم کسی کو خیرات یا صدقہ دو، یا کسی غریب کی مدد کرو تو پھر احسان جتلا کر اپنے اس صدقہ کو ضائع نہ کرو۔ اللہ نے فرمایا: ﴿لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی﴾ [البقرۃ: ۲۶۴] (اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر ضائع مت کرو)۔ یہاں تو اللہ نے احسان جتلانے سے منع کیا ہے اور ان آیات میں اللہ تعالیٰ خود احسان جتلا رہے ہیں کہ اے بنی اسرائیل! میرے احسان یاد کرو، میری نعمتیں یاد کرو جو ہم نے تمہارے اوپر کیں۔

پہلا جواب:

معاملات اور احکام کی کئی قسمیں ہیں، جب تک ہر قسم الگ سمجھ نہیں آئے گی، دماغ میں ایسی اُلجھنیں پیدا ہوتی رہیں گی:

- ......چنانچہ ایک معاملہ ہے جو بندوں کا بندوں کے ساتھ ہوتا ہے۔
- ......ایک معاملہ ہے جو بندوں کا اپنے اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔
- ......اور ایک معاملہ ہے جو اللہ کا اپنی مخلوق کے ساتھ ہوتا ہے۔

جو معاملہ اللہ اور مخلوق کے مابین ہوتا ہے، اس میں مخلوق کو اللہ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ تم یہ کام کرو اور یہ کام نہ کرو۔ اور ایک معاملہ وہ ہے جو بندوں کا بندوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس دعا میں دو طرح کے معاملات کا ذکر ہے:

''اَللّٰهُمَّ اِنَّ لَكَ عَلَیَّ حُقُوْقًا كَثِيْرَةً فِيْمَا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ وَ حُقُوْقًا كَثِيْرَةً فِيْمَا بَيْنِيْ وَ بَيْنَ خَلْقِكَ.''

[ذخیرۃ العقبی فی شرح المجتبی]

معاملات کی تفصیل:

- ......ایک معاملہ بندوں کا بندوں سے ہے، جیسے لین دین ہے، خیرات، صدقہ، صلہ رحمی اور ہمدردی وغیرہ۔

﷽.....اور ایک معاملہ بندوں کا اپنے اللہ کے ساتھ ہے کہ ہم نے اللہ کے حکم کی اطاعت کرنی ہے، استعانت صرف اللہ سے کرنی ہے، نذر و نیاز اللہ کے نام پر ہے، سجدہ و رکوع اللہ کے لیے ہے اور نفع نقصان کا مالک ہم نے اللہ کو سمجھنا ہے وغیرہ۔ یہ معاملہ بندوں کا اللہ کے ساتھ ہے۔

﷽.....اور ایک معاملہ اللہ کا اپنی مخلوق کے ساتھ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو کسی کام کا حکم دیتے ہیں یا کسی کام سے منع کرتے ہیں۔

ان تینوں معاملات میں سے کسی ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اب دیکھیں! یہ جو اللہ نے کہا ہے کہ احسان نہ جتلاؤ، اس کا تعلق اس معاملے سے ہے جو مخلوق کا مخلوق کے ساتھ ہے، جبکہ اللہ کا بندوں پر احسان جتلانا دوسری قسم (اللہ کا بندوں کے ساتھ معاملہ) ہے۔ جب دونوں معاملے ہی الگ الگ ہیں تو ان کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا جائز نہیں، قیاس تو تب کیا جا سکتا تھا جب اللہ نے مخلوق کو دو طرح کے حکم دیئے ہوتے، ایک جگہ احسان جتلانے سے منع کیا ہوتا اور دوسری جگہ احسان جتلانے کا حکم دیا ہوتا۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو غیر اللہ کے نام کی قسم کھانے سے منع کیا ہے، لیکن خود ''التین، الزیتون'' وغیرہ کی قسم کھائی ہے۔ مخلوق کو غیر کی قسم کھانے سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ جب وہ اللہ کے علاوہ کسی کی قسم کھائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس چیز کو اللہ کے برابر سمجھ رہا ہے۔ اس سے شرک کا اندیشہ پیدا ہو گیا، اس لیے منع کر دیا۔ جبکہ خالق کے ہاں شرک کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہ تو مخلوق کو منع کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے نام کی قسم نہ اُٹھائیں، اللہ تبارک وتعالیٰ خود تو اس کے مکلف نہیں ہے، لہٰذا وہ کسی بھی چیز کی قسم کھا سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کسی چیز کی قسم کھائی ہے تو وہ خالق کا معاملہ ہے اور یہاں (غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع کرنا) مخلوق کا معاملہ ہے، اور مخلوق کے لیے احکام علیحدہ ہوتے ہیں۔

یوں سمجھو جیسے کوئی آدمی کہے: عجیب بات ہے کہ دنیا میں ہمیں چار عورتیں رکھنے کی اجازت ہے اور آخرت میں اللہ ستر حوریں بھی دے گا اور بیویاں بھی ملیں گی۔ تو اس کی یہ بات جہالت پر مبنی ہوگی۔ کیونکہ دنیا کا حکم علیحدہ ہے اور عالَم آخرت کا حکم علیحدہ ہے۔ دنیا میں نماز فرض ہے اور آخرت میں نماز فرض ہی نہیں ہے، دنیا میں ہمارے اوپر روزہ فرض ہے اور جنت میں کوئی روزہ نہیں، دنیا میں اگر اللہ دولت دے تو حج فرض ہے، لیکن جنت میں جانے کے بعد کوئی حج فرض نہیں، دنیا میں ہمارے معاملات ہیں، نکاح ہے، طلاق ہے، میراث ہے، جائیداد ہے، تقسیم ہے،

آخرت میں یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ وہ عالَم ہی الگ ہے اور یہ عالَم ہی الگ ہے۔ لہٰذا اِس عالَم کو اُس عالَم پر کوئی قیاس کرے تو یہ جہالت والی بات ہے، ایسی بات تو ایک ادنیٰ آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ وہ آخرت کا معاملہ ہے اور ہم تو دنیا کے معاملہ کی بات کر رہے ہیں۔

دوسرا جواب:

علماء نے دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ ایک ہے خیرات وصدقہ کر کے اس پر احسان لگانا۔ اور ایک ہے کسی پر اپنی نعمت، انعام کرنا۔ پھر اگر وہ مُنعَمْ عَلَیہِمْ لوگ انکار کے اس مقام پر آجائیں کہ اپنے مُنعِم کے باغی بن جائیں تو وہاں نعمتیں یاد دِلانے کی اجازت ہے، چاہے وہ معاملہ مخلوق کے درمیان ہو یا خالق اور مخلوق کے درمیان ہو۔ جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جب محاصرہ کیا گیا اور کھانا پینا بند کر دیا گیا تو آپ نے اپنے انعامات یاد دِلا کر باغی محاصرین کو شرم دلائی تھی اور اس پر کسی صحابی نے بھی انکار نہیں کیا تھا کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟

شہادتِ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ:

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، ذوالنورین، شہید مظلوم، خلیفہ ثالث، دامادِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں جب ایک سازش کا شکار ہو گئے اور یہودیوں کے مکر میں پھنس گئے، ایسے ان کو اُلجھا دیا گیا کہ ماسوائے شہادت کے پھر کوئی راستہ ہی نہ رہا۔

یہودیوں کے پھیلائے ہوئے جال سے نکلنے کا بڑا لمبا واقعہ ہے۔ مختصراً بات اتنی سی ہے کہ یہودیوں نے اپنے لوگوں کے ذریعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو والیٔ مصر کی شکایت کی کہ آپ نے جو مصر کا گورنر رکھا ہے وہ بڑی زیادتی کر رہا ہے، ظلم کر رہا ہے...... حالانکہ وہ شکایتیں بھی غلط تھیں...... اور مطالبہ یہ کیا کہ مہربانی کریں اور وہاں کے گورنر کو بدل دیں۔ ہم بڑے مجبور ہو گئے ہیں، اس نے تو ظلم وستم کے پہاڑ توڑ ڈالے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے مطالبہ کو ہمدردی کے ساتھ سنا اور اس کے بعد ان کے مطالبہ کو مان کر آپ نے محمد بن ابی بکر کے نام ایک فرمان جاری کیا کہ میں ان کو گورنر بنا کر بھیج رہا ہوں اور جب وہ پہنچیں تو تم فوراً چارج چھوڑ دو اور ان کو گورنری کا اقتدار سپرد کر کے فوراً مدینہ میں حاضر ہو کر رپورٹ کرو۔ حضرت محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اپنا ایک دستہ لے کر چلے، اس دستے میں بھی یہودیوں نے اپنے بندے شامل کر لیے۔



جب وہ مصر کی طرف روانہ ہو گئے تو یہودیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قریب رہنے والے کچھ افراد کو اپنی سازش کا حصہ لیا۔ مروان، جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کاتب تھے، ان کے بارے میں بعض تاریخیں کہتی ہیں کہ ان کو بھی اس سازش میں شریک کیا گیا تھا۔ لیکن صحیح بات یہی ہے کہ مروان کو شریک نہیں بنایا گیا، بلکہ اسے بھی اسی طرح دھوکہ میں ڈالا گیا جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ڈالا گیا۔ اس سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مہر حاصل کر لی گئی اور بعینہ اسی طرز کتابت میں گورنر مصر کے نام ایک خطاب لکھا گیا اور اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مہر لگائی گئی...... اس زمانہ میں چونکہ مہر کا بڑا اعتماد تھا۔ اب بھی دیکھیں! عرب میں جب تک مہر نہ ہو، بات نہیں مانتے...... مہر لگا کر اس خط میں لکھا گیا کہ "جب محمد بن ابی بکر تمہارے پاس پہنچیں تو ان کو قتل کر دو۔" اور یہ لفافہ میں ڈال کر ایک قاصد کو دے دیا گیا کہ گورنر مصر کو یہ پہنچاؤ۔

اور ایسے انداز میں اس کو راستہ بتلایا گیا کہ وہ عین اس سڑک سے گزرے جہاں سے محمد بن ابی بکر کا قافلہ جا رہا ہے۔ دوسری طرف محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے کسی بندے کے ذریعے پوچھا گیا کہ حضرت! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ انہوں نے کہا: میں مصر جا رہا ہوں۔ ان سے کہا گیا: کمال ہے، تمہارے لیے تو سازش تیار ہو گئی ہے، وہاں تم پہنچو گے تو قتل کر دیے جاؤ گے، حضرت عثمان نے یہ آرڈر جاری کیا ہے۔ انہوں نے کہا: میرے قتل کا آرڈر کیسے جاری ہو سکتا ہے، جبکہ مجھے انہوں نے گورنر بنا کر بھیجا ہے؟ ان سے کہا گیا: ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ ایک آدمی جس کا نام فلاں ہے، اس کے اونٹ کا رنگ فلاں ہے، اس کے پاس وہ پروانہ ہے اور وہ بھی مدینہ سے نکل پڑا ہے۔ اب یہ تمہاری ڈیوٹی ہے کہ راستے میں بندے لگاؤ اور اس سے وہ خط حاصل کرو۔ چونکہ اس بندے کو اسی راستے پر بھیجا گیا تھا جس پر محمد بن ابی بکر جا رہے تھے، لہٰذا وہ راستہ میں پکڑا گیا اور اس سے وہ خط نکل آیا۔ جب خط پڑھا تو محمد بن ابی بکر آگ بگولہ ہو گئے کہ عجیب بات ہے کہ اللہ کے نبی کے خلیفہ مجھے ایک حکم دیتے ہیں کہ گورنر بن جاؤ اور دوسرا حکم دیتے ہیں کہ مجھے قتل کر دیا جائے۔ میں نے کیا جرم کیا ہے کہ مجھے قتل کر دیں؟

ان کے وفد میں جو لوگ اس فتنہ کو ہوا دینے کے لیے شریک تھے، وہ کہنے لگے: کیا ایسا آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ بن سکتا ہے؟ چلو فوراً حضرت عثمان پر حملہ کرو۔ انہوں نے آ کر حضرت عثمان کا محاصرہ کر لیا، ان کے گھر پر ڈیرہ ڈال لیا۔ پہلے بیالیس آدمی تھے، پھر ان کے باقی آدمی بھی ملتے گئے تو اسی ہو گئے، پھر ڈیڑھ سو ہو گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر میں محصور کر دیا گیا اور پہرہ لگا دیا کہ باہر نہ نکلنے دیا جائے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: یہ کیسی بات ہے کہ آپ ایک پروانہ جاری کرتے ہیں کہ گورنر بنادو اور دوسرے پروانے میں آپ حکم دیتے ہیں کہ قتل کردو؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے تو دوسرے پروانے کا کوئی پتہ نہیں۔ کہنے لگے: اس پر آپ کی مہر لگی ہوئی ہے، اس کا مطلب ہے کہ یہ شرارت مروان نے کی ہے، پھر آپ مروان کو ہمارے حوالے کردیں، ہم اس سے بدلہ لیتے ہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خدا کے بندو! یہ نبی کا شہر ہے، مدینہ منورہ ہے، یہاں تم کسی کا خون نہ بہاؤ۔ جس طرح مجھے کسی سازش میں اُلجھا دیا گیا ہے، اسی طرح اسے بھی اُلجھا دیا گیا ہوگا۔ جب تک میں تحقیق نہ کرالوں کہ اس کے اندر مروان کا قصور ہے یا نہیں، اس وقت میں اسے قتل کے لیے تمہارے سپرد نہیں کرسکتا۔ آپ اپنا ایک کمیشن بنا دیں، میں بھی انکوائری کرتا ہوں، آپ بھی انکوائری کریں، ثابت ہوجائے تو ہم اس کو سزا دیں گے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ ایک سازش پکڑی جائے، اب خلیفہ تو اس کام میں معطل ہوجائے اور معاملہ تمہارے سپرد کردوں کہ تم جس کو چاہو سزا دو اور قتل کردو۔ پھر میرا خلافت پر بیٹھنے کا کیا فائدہ ہوا؟ مگر انہوں نے بات نہ مانی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹوں سیدنا حسن رضی اللہ عنہ، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو حکم دیا: میرے بیٹو! تم حضرت عثمان کے دروازے پر پہرہ دو۔ تم اگر علی کے بیٹے ہو، نبی کے نواسے ہو، عثمان کی حفاظت کرو، تمہاری لاشوں سے گزرے بغیر کوئی عثمان تک نہ پہنچنے پائے۔ وہ داماد مصطفیٰ ہیں، وہ خلیفہ رسول اللہ ہیں، اگر اللہ کے نبی کے شہر میں خلفاء کو ایسے قتل کردیا گیا تو پھر آنے والوں کا کیا بنے گا؟ حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے اور دروازے پر پہرہ دینے لگے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں قاصد کے ذریعے پیغام بھیجا کہ آپ خلیفہ رسول اللہ ہیں، ڈیڑھ دوسو آدمی آپ کی بغاوت پر آمادہ ہیں، اس وقت پورے مدینے میں ہماری طاقت وقوت موجود ہے، آپ ہمیں صرف بحیثیت خلیفہ رسول اللہ حکم دیں کہ ان باغیوں سے نمٹیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک گھنٹے کے بعد ان کی ایک بوٹی بھی پورے مدینہ میں نہیں ملے گی۔ پورا مدینہ ٹوٹ پڑے گا، وہ تو حکم کے انتظار میں ہے کہ جب خلیفہ آرڈر نہیں کرتا تو ہم کیا کریں؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پیغام بھیجا کہ میں تمہارا شکر گزار ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس نیکی کا بدلہ دنیا وآخرت میں عطا فرمائیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ باغی مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں تو میں اپنا خون دینے کے لیے تیار ہوں، لیکن میں محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں تلوار چلانے کی اجازت نہیں دے سکتا، میں اللہ کے نبی کے شہر



کی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتا کہ میری وجہ سے یہاں تلوار چلے، لوگ لڑیں اور ایک دوسرے کو قتل کریں اور مدینہ منورہ کی گلیوں میں مسلمانوں کا خون بہے۔ میں قیامت میں حضور ﷺ کے سامنے کیسے جاؤں گا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ میں شہید ہو جاؤں گا تو ایک آدمی کی قربانی تو مجھے گوارا ہے، لیکن پورے مدینہ منورہ کے امن کو تہہ و بالا کر دینا اور یہاں قتل و قتال کی اجازت دینا، مجھے گوارا نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سمجھایا کہ حضرت! آپ فتنوں کے روکنے کا دروازہ ہیں۔ اگر آپ کنٹرول نہیں کریں گے تو یہ دروازہ ٹوٹ جائے گا اور پھر بعد میں یہ فتنے ہم سے نہیں رکیں گے۔ آپ مہربانی کریں، ہمیں اجازت دیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اجازت نہیں دے سکتا۔

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کے باہر جھانک کر باغیوں کو خطاب کیا اور فرمایا:

❁......تم یہ جانتے ہو کہ اللہ کے نبی کی دو بیٹیاں میرے گھر میں رہی ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں! ہم جانتے ہیں۔

❁......فرمایا: تم یہ بات بھی جانتے ہو کہ جب اسلام مدینے میں آیا تو ایک بئر رومہ تھا جو یہودیوں کے قبضہ میں تھا جس کنویں کا پانی میٹھا تھا، باقی کسی کنویں کا پانی میٹھا نہیں تھا اور یہودی مسلمانوں کو وہاں سے پانی نہیں بھرنے دیتے تھے، خاتم الانبیاء، حبیب کبریاء، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم تسلیما کثیرا کثیرا نے مسجد نبوی میں اعلان فرمایا کہ جو انسان اس کنویں کو یہودیوں سے خرید کر کے مسلمانوں کے لیے وقف کر دے، اس کی جنت کا قیامت میں مَیں ذمہ دار ہوں، یہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا؟ انہوں نے کہا: بالکل ہمیں معلوم ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا۔

❁......آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کنواں میں نے یہودیوں سے خرید کر مسلمانوں کو دیا تھا؟ انہوں نے کہا: ہمیں بالکل معلوم ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٢٧٧٨، باب: إذا وقف أرضا أو بئرا]

❁......فرمایا: سارے مدینہ والوں کو پانی پلانے والا عثمان تھا اور آج مجھے پانی نہیں دیتے ہو، آج میرے لیے پانی بند ہے۔

❁......پھر فرمایا: یہ بھی یاد رکھو کہ غزوۂ تبوک کے زمانہ میں حضور پاک ﷺ نے جب چندہ مانگا تھا تو ایک ہزار اونٹ اور بعض روایات میں تین سو بمعہ پالان، بمعہ اسلحہ اور بمعہ سارے ساز و سامان کے دیئے اور حضور ﷺ

کے سامنے درہم و دنانیر کے میں نے ڈھیر لگا دیئے۔ حضور ﷺ نے اپنی گود مبارک میں وہ درہم لیے اور یوں ہلا رہے تھے، مسکرا رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ عثمان! تجھے مبارک ہو۔ آج کے بعد جو کچھ تم کرو، تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا، تیری جنت کا میں ذمہ دار ہوں۔[1] اس کے بعد پوچھا: کیا یہ میرا چندہ اور میرے احسان معلوم ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں! معلوم ہیں۔

❁......آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر بھی تم مجھے قتل کرنے کے لیے تیار ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم تو اس لیے کھڑے ہیں کہ آپ نے دو پروانے کیوں جاری کیے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے جاری نہیں کیے۔

بہرحال انہوں نے نہ مانا۔ جوں جوں دیر ہوتی گئی تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی حالت بگڑتی گئی۔ پانی ان کا بند ہو گیا، حسنین رضی اللہ عنہما نے پانی پہنچانے کی کوشش کی تو ان ظالموں نے وہ مشکیزے تیر مار کر چھلنی کر ڈالے، پانی نہ پہنچا۔

اور جب بالکل آخری وقت آ گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اور دیگر صحابہ نے پھر پیغام بھیجا کہ حضرت! مہربانی کریں، آج کتنے دن ہو گئے اور آپ بھوکے پیاسے اپنے گھر میں قید ہیں اور ڈیڑھ سو باغیوں نے مدینہ منورہ کے اندر ایک خلیفۂ رسول کو قید میں رکھا ہوا ہے، مہربانی کریں، آپ ہمیں حکم دیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک جگہ سے جھانکا اور فرمایا: اے علی! کیوں پریشان ہوتے ہو؟ مجھے آج حضور ﷺ کی زیارت ہوئی اور میں حضور ﷺ کا فراق اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں نے تو شہید ہونا ہے۔

اس موقع پر باغیوں نے ایک اور پیشکش کر دی کہ اگر آپ خلافت سے دستبردار ہو جائیں تو ہم آپ کو چھوڑ دیں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں یہ کیسے چھوڑ دوں؟ جبکہ مجھے اللہ کے نبی ﷺ نے خود فرمایا تھا کہ اللہ تمہیں ایک قمیص پہنائے گا، اسے کبھی نہ اُتارنا، مظلوم شہید ہو جانا، لیکن خود خلافت سے نہ دستبردار نہ ہونا۔ اس لیے میں از خود خلافت نہیں چھوڑ سکتا۔

[سنن الترمذي، حديث: ٣٧٠٥]

یہاں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا احسان جتلانا اس لیے تھا کہ اس وقت کچھ لوگ بغاوت کی حدوں کو پہنچ گئے تھے، اور پھر کسی صحابی نے اس پر اعتراض بھی نہیں کیا کہ آپ اپنے کیے ہوئے احسانات کیوں جتلا رہے ہیں۔ لہٰذا اگر ایسے حالات ہو جائیں تو احسان جتلانا جائز ہوتا ہے۔ اور پھر یہ احسانات کسی ایک فرد پر نہیں تھے، بلکہ پورے عالم

[1] [صحيح البخاري، حديث: ٢٧٧٨، باب: إذا وقف أرضا أو بئرا، سنن الترمذي، حديث: ٣٧٠١]

اسلام پر تھے، پورے اہل مدینہ پر تھے، پورے مہاجرین و انصار پر تھے۔

ایسے حالات میں حضرت عثمان کا اپنے احسانات کا ذکر فرمانے اور کسی صحابی کے اس پر انکار نہ کرنے سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو جیسے اللہ نے اپنی نعمتوں کا ذکر کیا ہے، بندوں کو بھی اپنی نعمتوں کا ذکر کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

یہودیوں کے کرتوت:

یہ تورات جو اس وقت دنیا میں ملتی ہے، اگر آپ اس کو پڑھیں تو آپ کان پکڑ لیں۔ اس تورات میں انہوں نے لکھا ہے کہ لوط علیہ السلام......نعوذ باللہ......اپنی بیٹیوں سے زنا کرتے تھے۔ بھلا یہ اللہ کی کتاب ہو سکتی ہے؟ یہ ایسی بدبخت قوم ہے کہ انہوں نے چند روپے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل ہونے کے لیے پکڑوانے کی کوشش کی۔ یہ ایسی بدبخت اور اتنی ذلیل قوم ہے کہ اللہ کی نعمتوں کے بعد بغاوت کی انتہاء کر دی۔

اس لیے دیکھیں! اللہ نے ان کو سزائیں بھی ایسی دی ہیں۔ کسی دوسری اُمت کے بارے میں آپ کو ایسا واقعہ نہیں ملے گا کہ ان کو بندر یا خنزیر بنا دیا گیا، انسانیت سے نکال کر حیوان بنا دیا گیا ہو۔ بنی اسرائیل (یہود) پر اللہ نے ایسا عذاب بھیجا کہ شام کو سوتے وقت انسان تھے، جب صبح اُٹھے تو ستر ہزار آدمی بندر اور خنزیر بن چکے تھے۔

یہود......ہر فتنہ کی جڑ:

آج اگر کوئی آدمی تحقیق کرے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ پوری دنیا میں جتنے فتنے ہیں، ان سب کے پیچھے یہودیوں کا ہاتھ ہے۔ وہ فتنے اگر عقیدے کے بارے میں ہیں تو ان کے پیچھے یہودی ہیں، اگر اقوال، افعال، اعمال کے بارے میں ہیں تو ان کے پیچھے یہودی ہیں، اور وہ فتنے اگر مال کے بارے میں ہیں یا اقتصادیات کے بارے میں ہیں تو ان کے پیچھے یہودی ہیں، اور وہ فتنے اسلامی لوگوں کو مارنے کے سلسلے میں ہیں تو ان کے پیچھے یہودی ہیں۔

یہ ایسے دشمن اسلام ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے دین اسلام سے، ایمان سے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ذات سے بغض و عناد ہے۔ یہ جہاں بھی ہیں، جس جگہ بھی ہیں، ان کا ایک ہی کام ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو کسی طرح نقصان پہنچاؤ۔ یہ ان کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔

اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لیے بڑی بہتری تھی کہ پہلی فضیلت بھی ان کو ملتی اور اب بھی ان کو فضیلت ملتی۔ ان کو دو دفعہ اجر ملتا، ایک پہلے نبی پر ایمان لانے کا اور ایک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لانے کا، ایک پہلی کتاب پر ایمان لانے کا اور اللہ کے قرآن پر ایمان لانے کا۔

[صحيح البخاري، حديث: ٣٤٤٦، باب: قول الله: واذكر في الكتاب مريم]

اس اُمت سے پہلے کتنی اُمتیں گزریں؟

مفسر ؒ فرماتے ہیں کہ حدیثوں میں یہ بھی آیا ہے کہ تم سے پہلے اُمتیں گزر چکی ہیں، تم سترہویں اُمت ہو، یعنی تم سے پہلے اُنہتر اُمتیں گزر چکی ہیں اور ستر کو پورا کرنے والے تم ہو۔ لیکن تم ان ستر اُمتوں میں سے سب سے زیادہ بہتر ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بہتر اُمت ہو۔

[سنن الترمذي، حديث: ٣٠٠١، باب: ومن سورة آل عمران]

مفسر ؒ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کی اُمت کی فضیلت کے بارے میں بہت ساری احادیث ہیں جن کو میں نے ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ والی آیاتِ مبارکہ میں ذکر کیا ہے۔

[تفسير ابن كثير: ١/٨٩، البقرة: الآية: ٤٧]

﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤٨﴾﴾ [البقرة: ٤٨]

''اور اس دن سے ڈرو کہ کوئی شخص کسی کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ اس کی سفارش قبول ہوگی اور نہ اس کی طرف سے فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔''

پچھلی آیات میں ترغیب کا پہلو تھا اور ان آیات میں ترہیب کا پہلو ہے۔

تقویٰ کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ:

لغت میں ''تقویٰ'' کسی چیز کی صیانت وحفاظت کو کہتے ہیں اور اصطلاحِ شریعت میں اس کا آسان مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ کام کو اللہ اور اللہ کے رسول کے فرامین مبارکہ کے خلاف ہو، اس سے بچنا چاہیے۔ ان احکام کا تعلق عقائد

سے ہو یا اقوال و اعمال سے ہو، ان کو شامل ہے۔

تقویٰ کی افادیت:

اگر اسی لفظ ''تقویٰ'' پر غور کریں تو یہ اتنا جامع، مانع، کامل اور مکمل لفظ ہے کہ یہی ایک لفظ بندے کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ اگر تقویٰ پیدا ہو جائے تو مکمل شریعت پر عمل آسان ہے۔ تمام انبیاء نے اپنی قوموں سے کہا: ''اِتَّقُوا اللّٰہَ، اِتَّقُوا اللّٰہَ'' اے قوم! اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو۔ اللہ نے قرآن پاک میں بھی فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝۱۰۲﴾ [آل عمران: ۱۰۲] تم مخلوق کو حکم دیا گیا کہ اپنے رب سے ڈرو۔

تقویٰ کی اہمیت:

حضور اکرم ﷺ کے خطابات پر نظر کریں تو حضور ﷺ نے بارہا اپنے خطابات میں یہ فرمایا کہ ''اِتَّقُوا اللّٰہَ'' (اللہ سے ڈرو) اور ''اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ'' (میں تمہیں ایک ہی وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو)۔

پورے دین کا خلاصہ:

بعض اللہ والوں نے لکھا ہے کہ اگر پورے دین کا خلاصہ نکالا جائے تو صرف دو چیزوں میں نکلتا ہے: ایک اللہ سے ڈرنا اور دوسرا اللہ کی مخلوق پر شفقت کرنا۔ اسی کا نام دین و اسلام ہے۔

جرائم کی روک تھام میں تقویٰ کی اہمیت:

دنیا میں جرائم ختم کرنے کے لیے تمام وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود جرائم کی سو فیصد روک تھام نہیں ہو سکی، بلکہ جتنی فورسز بڑھ رہی ہیں اس سے کہیں زیادہ جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ پر اسلام کا دستور دیکھیں! اسلام کہتا ہے کہ مسلمان جب کلمہ پڑھے تو اس کے دل میں اللہ کا ڈر جاگزین ہو جائے اور اس کے دل میں بھر جائے۔ جب اللہ کا ڈر دل میں داخل ہو گیا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ قتل اور دیگر جرائم پر آمادہ ہو، کیونکہ اسے تو پتہ ہے کہ میری ہر حرکت، میرا ہر عمل اور میرا ہر قول و فعل اللہ کے سامنے ہے، اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کے دل کے اندر تقویٰ آجائے گا تو اسے کسی فورس کی ضرورت نہیں ہے۔

تقویٰ کے درجات

تقویٰ کے بھی مختلف مدارج ہیں:

پہلا درجہ......کفر وشرک سے بچنا:

سب سے پہلے تقویٰ یہ ہے کہ انسان اللہ کے ساتھ کفر وشرک سے بچے۔اسی لیے قرآن نے مومنین کی صفت میں یہ بیان فرمایا: ﴿وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝۲۶﴾ [الفتح:۲۶] صحابہ کے دلوں کو تقویٰ پر جمادیا، وہ اس کے مستحق تھے، اسی کے لائق تھے، وہ اسی کے اہل تھے۔اور کہیں اللہ نے فرمایا: ﴿اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۳﴾ [الحجرات:۳] اللہ نے ان کے دلوں کا امتحان کرلیا، مانجھ لیا، ان کے دلوں کو جانچ لیا تقویٰ کے لیے۔تو جو آدمی کفر وشرک سے نہ بچے، وہ متقین کی صف میں داخل ہی نہیں ہوسکتا۔

دوسرا درجہ......گناہوں سے بچنا:

اور دوسرا تقویٰ یہ ہے کہ جتنے بھی بڑے بڑے اور ہلاک کردینے والے گناہ ہیں، آدمی ان سے بچنے کے ساتھ ساتھ صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرے۔کیونکہ صغیرہ گناہ کو اگر بار بار کیا جائے تو وہ صغیرہ نہیں رہتا۔اس لیے کسی شاعر نے کہا تھا کہ تم اپنے چھوٹے گناہوں کو چھوٹا نہ سمجھا کرو، دیکھا نہیں کہ پہاڑ بھی چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے بنتے ہیں، دیکھا نہیں ہے کہ گندم کے چھوٹے چھوٹے دانے ہوتے ہیں، ان کا ڈھیر لگادو تو ٹیلہ بن جاتا ہے۔بظاہر تو ایک اینٹ ہوتی ہے، لیکن اینٹ پر اینٹ جڑتی چلی جائے تو ایک دیوار بن جاتی ہے۔

کسی گناہ کو چھوٹا نہ سمجھو:

میرے آقا ﷺ نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: عائشہ! خبردار خیال رکھنا، گناہوں کو چھوٹا نہ سمجھنا۔

[سنن الدارمي، حديث:۲۷۶۸، باب: في المحقرات]

آج کل لوگ کہتے ہیں کہ سگریٹ کیا ہے؟ یہ تو چھوٹے موٹے گناہ ہیں...... چھوٹے کے ساتھ ''موٹے'' بھی کہتے ہیں، کیونکہ ان کے ہاں مہملات بڑے ہوتے ہیں: روٹی، سوٹی۔روٹی تو کھانے کی چیز ہے، سوٹی کیسے کھائی

جائے گی؟ کہتے ہیں: ہمارا کیا ہے ہم تو چھوٹا موٹا پہن لیتے ہیں...... اسی طرح کہتے ہیں: داڑھی منڈانا تو چھوٹا گناہ ہے، کوئی کبیرہ تو نہیں ہے۔

اس لیے میرے نبی پاک ﷺ نے فرمایا: خبردار! کبھی گناہوں کو حقیر سمجھ کر اپنے آپ کو اس جرأت پر آمادہ نہ کر لینا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: دیکھو! آدمی جب آگ جلاتا ہے اور بڑی لکڑی لے آتا ہے تو اس بڑی لکڑی کو آگ نہیں لگتی جب تک کہ چھوٹی چھوٹی لکڑیاں رکھ کر آگ نہ بھڑکائی جائے۔ انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے تو آگ بھڑکتی ہے اور یہی چھوٹی چھوٹی چیزیں مل کر انسان کو تباہی و بربادی اور ہلاکت کے کنارے پر ڈال دیتی ہیں۔

آپ دیکھیں! کوئی شخص یہ سوچ کر غیر محرم عورت پر نظر ڈال لیتا ہے کہ یہ تو صغیرہ گناہ ہے، وضو کروں گا تو دھل جائے گا۔ لیکن اگر اس کا انجام دیکھا جائے تو یہ گناہ صغیرہ نہیں رہتا۔ اس لیے کہ جب عورت پر نظر پڑے گی تو پھر دل کے اندر خیالاتِ فاسدہ پیدا ہوں گے، پھر قدم بڑھے گا اور اس کے بعد گناہ ہوگا اور اس کے بعد آدمی ہلاکت کے گڑھے میں گر جائے گا۔

اس لیے کبھی یہ نہ کہیں کہ یہ صغائر ہیں، صغائر کا اصرار کبیرہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ علماء کا مقولہ ہے: "لَا صَغِيْرَةَ مَعَ إِصْرَارٍ وَ لَا كَبِيْرَةَ مَعَ إِسْتِغْفَارٍ" (کبیرہ گناہ توبہ کے ساتھ باقی نہیں رہتا، اللہ معاف کر دیتے ہیں اور صغیرہ بار بار کرنے سے صغیرہ نہیں رہتا، بلکہ کبیرہ بن جاتا ہے)۔

[إحياء العلوم: ۴/۳۲، بَيَانُ مَا تَعْظُمُ بِهِ الصَّغَائِرِ مِنَ الذُّنُوبِ]

آپ ایک دفعہ تھوڑی سی مرچ چکھ لیں تو ذرا سی زبان کو لگے گی، لیکن اگر آپ اس کو کھانا شروع کر دیں تو کھاتے کھاتے انجام یہ ہوگا کہ اندر سے آنتیں بھی جل جائیں گی، معدہ بھی جل جائے گا اور اس کے بعد بیماریاں پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔ آپ حساب لگا لو کہ اگر روزانہ ایک گرام مرچ استعمال کرتے ہو تو مہینہ کے تیس گرام ہو گئے اور سال میں تین سو ساٹھ گرام اندر چلی گئی۔ تو پھر اس نے بھی کوئی نہ کوئی جگہ تو بنانی ہے۔ ایسا ہی معاملہ گناہ کا بھی ہے۔

تیسرا درجہ...... اللہ اور رسول کی ناپسندیدہ سے بچنا:

تیسرا درجہ یہ ہے کہ ہر ایسی چیز جس میں اللہ اور اللہ کے رسول کی ناپسندیدگی کا تصور بھی آ جائے، انسان اس سے بھی بچ جائے۔ پھر ہر وقت دل میں اسی کا خیال رہے کہ میرے دل کی حالت تو نہیں بدلی۔ یہ عظیم درجہ ہے۔

امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ...... جو کہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں اور

قراءتِ قرآن سے اللہ نے ان کو بڑا مقام عطا فرمایا ہے...... سے ایک دن پوچھا: اُبی بن کعب! مجھے بتاؤ کہ تقویٰ کا معنی کیا ہے؟...... یہ نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تقویٰ کا مطلب نہیں جانتے تھے، اصل میں جن کو اللہ سے زیادہ تعلق ہوتا ہے، وہی اس معاملہ میں زیادہ تحقیق کرتے ہیں کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوں۔ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ حضرت عمر قریش میں سے ہیں اور ان کی لغت عربی ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان کو تقویٰ کا معنی نہ آتا ہو۔ چنانچہ انہوں نے ایک مثال سے اس وضاحت کی...... انہوں نے پوچھا: امیرالمومنین! کبھی ایسے راستے سے آپ کا گزر ہوا ہے جو پُرخطر ہو، جس میں کانٹے دار جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ پھسلن ہو؟ کیا زندگی کے اندر ایسا موقع بھی آیا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسا تو ہوتا ہے کہ ہم سفر میں ہوتے ہیں تو کبھی کبھی آدمی ایسی ایسی جگہوں سے گزرتا ہے کہ کانٹے دار جھاڑیاں ہوتی ہیں، پھسلن ہوتی ہے اور گرنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے پوچھا: پھر آپ نے اس راستے پر کیا کیا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے اپنے کپڑوں کو اوپر کر لیا کہ کہیں کوئی کانٹا کپڑے میں نہ اُلجھ جائے اور پھر نظر راستہ پر لگا دی، اپنے بدن کو پورے کنٹرول اور اعتدال میں رکھا اور بچا بچا کر میں نے قدم رکھنے شروع کیے، تا کہ میں اس خطرناک راستے سے بحفاظت گزر جاؤں۔ یوں میں نے وہ راستہ پاس کیا۔

اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امیرالمومنین! اسی کا نام ''تقویٰ'' ہے۔ ایک طرف لذتیں ہیں، گناہ ہیں، زنا ہے، عورت ہے، مال حرام ہے، سود ہے، قمار ہے، نائٹ کلب ہے، ڈانس ہیں، ناچ گانے ہیں، رنگ آمیزی ہے، اس کی چاشنی ہے کہ ایک آدمی رات کو سویا اور صبح کو کروڑوں پتی ہو گیا۔ ساری چیزیں بلا رہی ہیں، لیکن وہ ان سب سے دامن بچا کر صراطِ مستقیم پر چلا جا رہا ہے، اسی کا نام تقویٰ ہے۔

[التذكرة في الوعظ للقرشي، ص:١٢٧]

جیسے دنیا کے راستوں میں کانٹے کھینچتے ہیں، اسی طرح جنت کے راستے میں گناہ کھینچتے ہیں۔ کون نہیں چاہتا کہ مجھے لذت نہ ملے؟ کون نہیں چاہتا کہ میرے دسترخوان پر کھانے نہ ہوں، مطعومات نہ ہوں، ماکولات نہ ہوں، مشروبات نہ ہوں اور میرے حرم میں عورتیں نہ ہوں اور ایک سے ایک جمیلہ قسم کی خادمائیں نہ ہوں، لیکن جو اللہ سے ڈرنے والا ہے وہ کہتا ہے کہ چھوڑو، اللہ جنت میں یہ نعمتیں عطا فرما دیں گے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے بڑی پیاری بات کہی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ

تقویٰ کی تقریر کرنے والے بہت ہیں، لیکن عمل کرنے والے تھوڑے ہیں۔

میں نے پہلے بھی آپ کو ایک مثال عرض کی تھی۔ آج کل یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی بندہ اپنے ملک سے سفر کر رہا ہو، جدہ سے کراچی جا رہا ہو یا کراچی سے کسی اور ملک میں جا رہا ہو تو بڑے آدمی اس سے آ کر پوچھتے ہیں کہ آپ نے کب سفر کرنا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ فلاں دن سفر کرنا ہے۔ کہتے ہیں: آپ فکر نہ کریں، وہاں ایئر پورٹ پر میرا دوست ہے، اگر آپ کو ضرورت ہو تو میں وہاں آپ کی خدمت کر سکتا ہوں۔ آپ کے پاس کتنا سامان ہوگا؟ وہ کہتا ہے کہ آخر دو سال کے بعد جا نا ہے تو دو چار اٹیچی کیس تو بھر کر لے جاؤں گا، ساٹھ، ستر، اسی کلو وزن تو ہوگا۔ دوسرا کہتا ہے: آپ بے شک سو کلو لے آئیں، وہ میرا بڑا پیارا دوست ہے، میرے اس سے بڑے اچھے تعلقات ہیں، آپ غم نہ کریں، آپ کا سارا مال ہم پاس کروا دیں گے، کوئی ایک دھیلا بھی نہیں لگے گا۔

اس پر وہ فخر کرتا ہے اور احسان جتلاتا ہے۔ وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ تقویٰ نہیں۔ جہاز کوئی اس کے باپ کا ہے یا اس کا کمپنی میں حصہ ہے جو رعایت کروا رہا ہے؟ یا اس کو کمپنی نے الاٹ کیا ہوا ہے کہ جس کو تم چاہو، سو کلو چھوڑ دو؟ نہ اس کے دل میں تقویٰ ہے، نہ سفارش کرنے والے کے دل میں تقویٰ ہے اور نہ اس کے دل میں تقویٰ ہے جو مال پاس کروا رہا ہے۔ اللہ کا ڈر نہیں ہے تو چاہے سو کلو گزار دو یا دو سو کلو گزار دو۔ اور وہ بڑا خوش ہو رہا ہوتا ہے کہ یہ کتنا اچھا آدمی ہے، میرا سامان کتنا اوور تھا، لیکن اس نے پروا ہی نہیں کی۔ ایسی دوستی فائدے کی بجائے نقصان کا باعث ہے، کیونکہ نتیجتاً یہ تینوں اللہ کے ہاں مجرم بنے۔ اور جن کے دل میں تقویٰ ہوتا ہے وہ ایسے نہیں کرتے۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کا تقویٰ:

حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ ایک دفعہ مدینہ منورہ جا رہے تھے...... اس زمانے میں مدینہ منورہ کا سفر اونٹوں پر ہوتا تھا، موٹر کاریں تو نہیں تھیں...... ایک ساتھی نے حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں جا کر ایک لفافہ پیش کیا اور کہا: حضرت! یہ میرا خط ہے اور مدینہ منورہ میں فلاں شخص کو دینا ہے...... اس زمانہ میں مدینہ شریف بڑی مشکلوں سے کوئی جاتا تھا، یعنی خط پہنچانا بھی ایک مسئلہ ہوتا تھا...... حاجی صاحب نے فرمایا کہ ذرا ٹھہر جاؤ، وہ اونٹ والا جس کے ساتھ ہم نے سفر طے کیا ہے، وہ موجود نہیں، اس کو آنے دو اور اس کے بعد میں آپ کا خط لے جاؤں گا۔ اس نے پوچھا: خط آپ نے لے جانا ہے یا اونٹ والے نے لے جانا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب میں نے اونٹ والے سے سودا طے کیا جو سامان میں نے اس کو دکھلایا تھا، اس وقت تمہارا یہ خط شامل نہیں تھا۔ اب اگر میں خط شامل کرلوں

تو اس بوجھ کا قیامت میں کون جواب دے گا؟

جن کے دلوں میں یوں تقویٰ اور اللہ کا ڈر ہو تو پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی ایسا کام کریں گے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب بنے۔ جو ایک تولہ وزن سے ڈر رہے ہوں، کیا وہ بیس کلو ناجائز کا سوچ سکتے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

مولانا حبیب اللہ گمانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تقویٰ:

میرے اپنے استاد شیخ حبیب اللہ گمانوی رحمۃ اللہ علیہ تھے...... اللہ ان کی قبر پر رحمت فرمائے...... انہوں نے حج کے لیے آنا تھا تو ہوائی جہاز میں سوار ہوئے۔ جب سیٹ پر بیٹھے تو اس وقت میرے ایک عزیز ان کے ساتھ سفر میں تھے، انہوں نے کہا: حضرت! چار گھنٹے کا سفر ہے، دو چار منٹ کی بات نہیں ہے، آپ یوں سیدھے بیٹھیں اور پھر پٹی بھی باندھنی ہے، سیٹ پیچھے کردوں؟ فرمایا: نہیں! مجھے ایسے بیٹھنے دو۔ اس نے بڑا زور لگایا۔ حضرت کے آنسو نکل آئے اور فرمایا: ٹیک لگاتے ہوئے اپنے اللہ سے ڈرتا ہوں کہیں ناراض نہ ہو جائے۔ حبیب اللہ! تم تو گدھے پر چڑھا کرتے تھے اور آج ہوائی جہاز میں اکڑ کر بیٹھے ہو۔ یہ میرا بیٹھنا کہیں کبر میں نہ آجائے۔ کمزور اور بوڑھے آدمی کراچی سے لے کر جدہ اُترنے تک جھک کر بیٹھے رہے۔ مجال ہے کہ سیٹ سے ٹیک لگائی ہو۔

مولانا گمانوی رحمۃ اللہ علیہ کا گدھے کے ساتھ حسنِ سلوک:

ایک دفعہ میں ان کے ساتھ ایک جلسہ میں تھا، ان کی صدارت تھی۔ بہت بڑا جلسہ تھا اور حضرت موجود نہیں تھے۔ اتفاق سے جب ہم آئے تو اس وقت بھائی سیف الرحمٰن بھی میرے ساتھ تھے۔ جلسے والوں نے کہا کہ شیخ! ابھی تک آپ کے استاد نہیں پہنچے ہیں۔ یہ سارا اہتمام ان کے لیے کیا گیا ہے، ہمارے پاس تو کوئی گاڑی نہیں ہے، آپ لوگوں کے پاس چونکہ اپنی گاڑی ہے تو آپ جا کر حضرت کو لے آئیں۔ اگر ہم بس پر جائیں گے تو لیٹ ہو جائیں گے۔ ہمارے پاس جیپ تھی، ہم نے دوڑائی اور حضرت کے گاؤں پہنچ گئے۔

یہ اتنے بڑے عالم تھے کہ ایک دفعہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث پڑھائی تو اس میں ان سے کوئی غلطی ہوگئی۔ انہوں نے فرمایا کہ حضرت بنوری نے فلاں حدیث میں فلاں غلطی کی ہے۔ پھر فرمایا: حضرت سے کہتے ہو تو بے شک کہہ دو...... یعنی وہ آدمی جو حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ جیسی عظیم شخصیت کو ٹوک سکتا ہو...... اور پھر جب حضرت حبیب اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے متعلق تقریر کی تو حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ رو پڑے۔ اور مجھے یاد ہے کہ حضرت بنوری نے



فرمایا کہ میں خود جاؤں گا، میں سفارش نہیں کروں گا۔ حضرت کے جوتے خود انہوں نے اپنے ہاتھوں سے سیدھے کیے اور کہنے لگے کہ مجھے پتہ نہیں تھا کہ اتنا بڑا عالم تم نے دیہات میں چھپایا ہوا ہے۔

پہنچ کر دیکھا تو حضرت گدھے پر سوار ہو کر گاؤں سے آرہے تھے۔ ہم نے گاڑی روک کر اشارہ کیا، حضرت رُک گئے۔ ان سے جا کر ملے۔ ہم ان کے شاگرد تھے، جا کر کہا: حضرت! وہاں جلسہ میں انتظار ہو رہا ہے، اتنی مخلوق وہاں پریشان ہے، مہربانی کریں، ابھی جلدی چلیں۔ کہنے لگے: ٹھیک ہے، میں آپ کے کہنے سے انکار نہیں کرتا، لیکن گدھے کو بھی تو کہیں کرنا ہے۔ ہم نے کہا: حضرت! آپ اس کی فکر نہ کریں۔ سڑکوں پر لوگ کام کرتے رہے تھے، جن کو "بیلدار" کہا جاتا ہے۔ چونکہ واقف لوگوں کا علاقہ تھا تو میں نے ایک بندے کو اشارہ کیا تو وہ بے چارا دوڑتا ہوا آ گیا۔ میں نے استادوں سے پوچھا کہ گھر میں پہنچائے یا مدرسے میں؟ حضرت کہنے لگے: یہ کوئی تمہارا نوکر ہے؟ میں نے کہا: نوکر تو نہیں ہے۔ فرمایا: تم نے اس کو کیوں بلایا ہے؟ میں نے کہا: حضرت! یہ بلوچ ہے، ہماری برادری کا آدمی ہے، اتنی تو مروت ہوتی ہے کہ میرے کہنے سے ایک میل تک چلا جائے گا۔ کہنے لگے: وہ ڈیوٹی دے رہا ہے، وہ دوسرے کا نوکر ہے، تنخواہ ان سے لیتا ہے اور حکم تم چلاتے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی؟ تمہیں اللہ کا کوئی ڈر نہیں ہے؟ تم نے اللہ کو جواب نہیں دینا؟ میں نے کہا کہ جناب! اس کی ڈیوٹی ہے، اس کو نہیں بھیجتے، میں کوئی دوسرا آدمی لے آتا ہوں۔ یہ سارے بستی والے ایسے ہیں کہ ان میں سے جس کو بھی کہہ دیں، وہ بھاگتا ہوا چلا آئے گا۔

کہنے لگے: بات سنو! تمہارے جلسے پر تو میں جانے کے لیے تیار ہوں، مگر میری ایک شرط ہے، اگر تم مانتے ہو تو میں جاؤں گا، وگرنہ میں نہیں جاؤں گا۔ ہم نے پوچھا: فرمائیں، کیا شرط ہے؟ کہنے لگے کہ گدھے کو اپنی جیپ میں بٹھاؤ۔ ہم نے کہا: حضرت! ہم گدھے کو کیسے جیپ میں بٹھائیں؟ کہنے لگے کہ دیکھو! میں اس پر سوار ہو کر آرہا تھا، اب میں جیپ پر بڑا آدمی بن کر چلا جاؤں اور قیامت میں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے پکڑ لیں کہ تم اتنے اکڑ گئے تھے کہ جو جانور تمہیں اُٹھا کر آرہا تھا، تم نے اُسے چھوڑ دیا؟ یہ مجھے اُٹھا کر آرہا تھا، اب جب مجھے آرام ملے تو اس کو آرام کیوں نہ ملے؟ ہم نے کہا: حضرت! آپ کا حکم سر آنکھوں پر ہے، لیکن گدھا تو گدھا ہوتا ہے، ایسے تو اللہ نے نہیں فرمادیا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ [الجمعۃ:۵]



ایسے تو نہیں فرمادیا گیا کہ حمار سے جاہل جانور کوئی نہیں ہوتا۔ سب سے کند ذہن اور پاگل جانور اگر دیکھنا ہو تو گدھا ہے۔ اگر شاگرد کو سبق سمجھ نہ آرہا ہو تو اسے کہتے ہیں کہ تم گدھے ہو۔

کہتے ہیں کہ یہ واحد جانور ہے کہ اس پر آپ جتنا بھی بوجھ لادتے جائیں، یہ آواز نہیں نکالے گا، دس مَن رکھ دو، بیس مَن رکھ دو یا تیس مَن رکھ دو۔ آواز اس وقت نکالے گا جب بغیر سامان کے اکیلا ہوگا۔ ایسا بے وقوف جانور ہے۔ حالانکہ آدمی وہاں چیختا ہے جہاں اس پر بوجھ پڑے۔ اور اس کی یہ بھی عادت ہے کہ جب اس کو اوپر چڑھانا تو پیچھے جائے گا، پیچھے کھینچیں گے تو آگے جائے گا۔ یہی تو وجہ ہے کہ جب اس کو کشتی میں سوار کرایا جاتا ہے تو اس کو پیچھے کھینچتے ہیں تو یہ آگے بڑھ کر چڑھ جاتا ہے، ورنہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کشتی پر سوار ہو۔ آپ تجربہ کرلیں۔

حضرت نے فرمایا: اس کے بغیر تو میں جلسہ میں نہیں جاتا۔ ایک وہ بیلدار اور دو بندے ہم تھے۔ ہماری خانگی تو وہیں مٹی میں مل گئی کہ ایک گدھے کو اُٹھا رہے ہیں۔ اس سے پہلے ایک سردار تھے، دماغ کے اندر اکڑفوں تھی۔ کپڑے بھی گدھے نے خراب کردیئے۔ اور پھر اس کو آگے بٹھایا۔ جہاں سے بھی گزرتے تو سارے لوگ ہنستے کہ دیکھو! گدھے کو گاڑی میں بٹھایا ہوا ہے۔

جب وہاں پہنچے اور گدھے کو اُتار دیا تو حضرت فرمانے لگے کہ بات یہ ہے کہ آپ لوگ گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ کے پیچھے گن مین اور ٹوپیاں تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ تمہاری خانگی کو ذرا ڈھیلا کروں...... ہم بلوچ لوگ وہاں تو ایسے نہیں جاتے۔ وہاں تو برادری کا مسئلہ ہوتا ہے، جھگڑے ہوتے ہیں، سارے انتظامات کے ساتھ چلنا پڑتا ہے...... استادوں کو وہ بات پسند نہ آئی کہ کیا نوکر اور بندوقیں! تم بھی ایک بندے ہو، جب صحت وحیات کا ایک وقت مقرر ہے تو کیا تمہارے گن مین تمہیں بچالیں گے؟ ایک وقت مقرر ہے وہ ختم ہوجائے گا تو موت آجائے گی۔ اس لیے میں نے تمہاری اصلاح کے پیشِ نظر ایسا کرنے کو کہا تھا۔

اصل میں اللہ کا ڈر دل میں تھا کہ میں چڑھوں اور جانور نہ چڑھے اور اللہ اسی معاملے میں مجھے پکڑ لے تو میرا کیا بنے گا؟ ان لوگوں کی نظر اتنی وسیع تھی!!!

حدیث مبارکہ میں ہے کہ ایک عورت کو اللہ نے اس لیے جہنم میں ڈال دیا کہ اس نے بلی کو باندھ رکھا تھا، اسے کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں دیا اور نہ ہی اسے چھوڑا کہ وہ خود جا کر کھائے۔[1] اور ایک عورت اس لیے جنت میں

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۲۳۶۵، باب: فضل سقي الماء]

چلی گئی کہ اس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا۔ [مسند البزار، حدیث: ۸۷۲۵]

''یوم'' سے کیا مراد ہے؟

﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا﴾ میں ''یوم'' سے قیامت کا دن مراد ہے۔ دن سے تو نہیں ڈرا جاتا، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس دن میں تم کو جو احوال پیش آنے والے ہیں، ان سے ڈرو۔ یہ وہی دن ہے جس میں مومنین کو عزت ملے گی اور کفار کو ذلت ملے گی۔

تفسیر:

﴿لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا﴾ جس دن کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا کہ کوئی کسی کے بدلہ میں کام آجائے۔ دنیا میں تو یہ ہوتا ہے کہ باپ نے جرم کیا تو بیٹے نے اپنے سر پر لے لیا یا مالک نے کوئی جرم کیا تو ملازم نے اپنے سر لے لیا۔ وہاں ایسے نہیں ہوگا، قیامت کے دن کے بارے میں تم یہ نہ سمجھو کہ کوئی کسی کے کام آجائے گا، نہیں۔ بلکہ وہ ایسا دن ہوگا کہ ہر آدمی کو اپنی جان کی فکر ہوگی، جیسے فرمایا: ﴿یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ یَوْمَىٕذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ ﴿۳۷﴾﴾ [عبس: ۳۴تا۳۷]

﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا﴾ ان کو اس لیے ڈرایا گیا کہ وہ کہتے تھے: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ [المائدۃ: ۱۸] ان کے دماغوں میں یہ بات تھی کہ جب ہم اللہ کے بیٹے عزیر کے پوجنے والے اور ماننے والے ہیں تو ان ہماری دوستی ہوگئی اور ہم سب اللہ کے پیارے اور محبّ بن گئے، کیونکہ کسی سے پہلے سے تعلق ہو تو وہ بھی کہتا ہے کہ یہ بھی میرا بیٹا ہے تو جب ہم اللہ کے محبوب ہیں تو ہمیں کون پکڑ سکتا ہے؟ تو اللہ نے فرمایا: خبردار! تم ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا اور نہ سفارش قبول ہوگی۔ ﴿وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ...... الآیۃ﴾ [البقرۃ: ۴۸]

آدمی کے چھوٹنے کے چاروں طریقے کام نہ آئیں گے:

1 ......عذاب سے بچنے کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی کسی کے بدلے میں کام آجائے۔ اس کی تردید میں فرما دیا: ﴿لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا﴾

2 ...... پھر ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی کا کوئی سفارشی آجائے اور سفارش کر کے اسے چھڑوا لے۔ اللہ نے



فرمایا: ﴿لَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ...﴾

3 ......ایک اور صورت یہ ہوتی ہے کہ سفارش تو نہیں چل رہی تو مجرم کہتا ہے کہ کچھ پیسے دے کر میری جان چھڑاؤ۔ تو فرمایا: ﴿وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ ان سے بدلے میں کوئی فدیہ، کوئی مال بھی نہیں لیا جائے گا۔ جیسا کہ قرآن نے دوسرے مقام پر وضاحت فرمادی کہ ساری زمین، آسمان کے برابر یا ساری زمین سونے کی بھر کر بدلے میں دی جائے کہ قبول ہو جائے اور جہنم سے بچ جائے تو یہ بھی قبول نہیں ہوگی۔

4 ......آخری صورت یہ ہوتی ہے کہ پورے قبیلے کو اکٹھا کرو، مقابلہ کرتے ہیں، دیکھا جائے گا۔ یا ہم رہیں گے یا وہ رہیں گے۔ اس کے بارے میں بھی فرمادیا: ﴿وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ﴾ ان کا کوئی مددگار بھی نہیں ہوگا جو ان کی مدد کرے اور اللہ کے عذاب کو قوت وطاقت سے روک سکے۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہے۔ اور جس کے عذاب سے بچنے کا کوئی راستہ نہ ہو تو پھر ہمارے لیے ضروری ہے کہ اس اللہ سے ڈریں۔ اور ڈرنے کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ اور احکام پر ایمان لائیں، اللہ کے مامورات پر عمل کریں اور منکرات ومنہیات سے بچیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۸۹، البقرۃ: الآیۃ: ۴۸]

یہ بات یاد رکھیں کہ یہ سارے حکم کافروں کے لیے ہیں، مثلاً: ایک آدمی کافر ہے اور ایک مسلمان ہے۔ کافر کا کفر مسلمان پر رکھ دیا جائے اور اس کا کوئی نقصان نہ ہو، ایسا نہیں ہوگا۔ یا مسلمان کی وجہ سے کافر رشتہ دار کو چھوڑ دیا جائے، ایسا بھی نہیں ہوگا۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کافر تھا، کفر پہ مر گیا، نوح علیہ السلام بھی اس کو نہ چھڑا سکے۔ جب دنیا میں نہ چھڑا سکے تو آخرت میں بھی نہیں چھڑا سکیں گے۔

مسلمان، شفاعت کا حقدار ہوگا:

مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ چنانچہ اگر ایک مسلمان گناہ گار ہے تو اس کی شفاعت ہوگی، کیونکہ اس کے اندر ایمان موجود ہے۔

اولاد کو والدین کا فائدہ:

اسی طرح ایک مسلمان شخص کی اولاد بھی مسلمان ہے، وہ اپنی ساری زندگی عبادت میں گزار گیا، لیکن اولاد اس

مرتبہ کو نہیں پہنچی، اللہ تبارک وتعالیٰ جب اہل جنت کا فیصلہ فرمادیں گے تو وہ آدمی عرض کرے گا: میری اولاد کا کیا بنے گا؟ اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائیں گے: تمہیں مبارک ہو! وہ بھی جنت میں ہیں، لیکن وہ تمہارے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے، کیونکہ تمہاری عبادت اور محنت زیادہ تھی، اس لیے تمہیں اونچے درجات مل گئے۔ وہ کہے گا: اے اللہ! ٹھیک ہے، میں نے ساری زندگی عبادت کی، لیکن میں اپنی اولاد کے لیے بھی تو مانگتا رہا، اگر میں اتنی بڑی نعمتوں اور جنت میں رہوں اور میری اولاد نہ ہو تو پھر مجھے کیا راحت ملے گی؟ تو اللہ حکم دیں گے کہ اس کے بچوں کو بھی ادھر بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اس کی اولاد کو بھی اس کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ گویا کہ والدین کی وجہ سے اولاد کو فائدہ ہو گیا۔

والدین کو اولاد کا فائدہ:

اسی طرح والدین کو بھی اولاد کے اعمال کا فائدہ ہوگا۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کے عمل ختم ہوجاتے ہیں، لیکن تین عمل ایسے ہیں جو آدمی کے مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے:

1. ...... ان میں ایک تو یہ ہے کہ کوئی آدمی مرنے سے پہلے ایسا صدقہ کر جائے جو ہمیشہ جاری رہنے والا ہو، جیسے اس نے مسجد، مدرسہ یا کوئی ہسپتال وغیرہ بنایا ہو تو جب تک وہ صدقہ پھیلتا رہے گا، مرنے کے بعد بھی اس کو اس کا ثواب پہنچتا رہے گا۔

2. ...... دوسرا یہ کہ ایک عالم بندے نے اپنی زندگی میں کئی لوگوں کو پڑھایا۔ جب تک اس کے شاگرد پڑھتے پڑھاتے رہیں گے تو اس استاد کو بھی ثواب ملتا رہے گا۔

3. ...... تیسرا یہ کہ کوئی بندہ اپنی اولاد صالح چھوڑ گیا، یعنی اس کی اولاد اچھی تھی، والدین کے مرنے کے بعد بھی وہ ان کے لیے دعائیں کر رہے ہیں: اے اللہ! ہمارے والدین کی مغفرت فرما۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۱۶۳۱، باب: مَا يَلْحَقُ الْإِنْسَانَ مِنَ الثَّوَابِ بَعْدَ وَفَاتِهِ]

﴿رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ [بنی اسرائیل: ۲۴]

﴿رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ۞ رَبَّنَا اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ﴾ [ابراہیم: ۴۰، ۴۱]

اور والدین کے صدقات و دیگر نیک کام کر رہے ہیں تو اولاد جو اچھا کام کرے گی، اس کا بدلہ والدین کو بھی ملتا

رہے گا۔

جنت واجب ہوگئی:

صحیح احادیث میں موجود ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے تین بچے بچپن میں فوت ہوگئے اور اس نے صبر کر لیا کہ اللہ کی مرضی ہے، قیامت والے دن اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔

صحابہ کرام فرماتے ہیں: ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر کسی کے دو بچے فوت ہو جائیں؟ فرمایا: دو پر بھی۔

راویٔ حدیث ''محمود'' کہتے ہیں: میں نے جابر سے کہا: تمہارا کیا خیال ہے اگر تم ایک کا کہتے تو کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک کا بھی کہہ دیتے؟ فرمایا: خدا کی قسم! مجھے اس کا بھی گمان ہے۔ فرمایا: ایک کی وجہ سے بھی اس کو جنت مل جائے گی۔ [مسند احمد: ۱۴۲۸۵،۲۲] لہٰذا اب معصوم بچوں کی وجہ سے بھی والدین کو فائدہ پہنچ گیا۔

نیکی کا اجر...... بُرائی کا وبال:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَعُمِلَ بِهَا كَانَ لَهُ أَجْرُهَا وَ مِثْلُ أَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا))

کسی بندے اچھا راستہ بنایا، کسی جگہ توحید و سنت کی اشاعت کا کام کیا، حدیث مبارک کا حکم پھیلایا، نیکی کی بنیاد ڈالی، قیامت تک جو لوگ عمل کریں گے اس کی بنیاد ڈالنے والے کو بھی اللہ ثواب دیتے رہیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا:

((وَ مَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعُمِلَ بِهَا كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَ وِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا.))

[سنن ابن ماجہ حدیث: ۲۰۳، بَابُ مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً أَوْ سَيِّئَةً]

اور اگر کسی آدمی نے بُرائی کی بنیاد رکھی، مثلاً سینما بنایا، کلب بنایا، کوئی ڈانس گھر بنایا، بُرائی کے اڈے قائم کیے، شراب خانہ کھولا تو جب تک لوگ وہاں اس گناہ میں مبتلا رہیں گے، اس کھولنے والے کو بھی اس کا گناہ ملتا رہے گا۔

بہت سخت معاملہ:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب لوگ قبروں سے اُٹھیں گے تو نہ ان کے جسم پر لباس ہوگا، نہ پاؤں میں جوتی ہوگی اور نہ ان کا ختنہ کیا ہوا ہوگا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول



اللہ! مرد بھی اور عورتیں بھی ہوں گی، کیا وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے نہ ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: معاملہ اس سے سخت ہوگا، کسی کو ایسا خیال تک نہ آئے گا۔

[صحیح بخاری، حدیث: ۶۵۲۷، باب: کیف الحشر]

سعودی عرب کے لوگوں کی عملی خوبیاں:

سعودی عرب کے لوگوں میں یہ خوبی ہے کہ ان کی زبان پر ہر وقت کوئی نہ کوئی دعا کا کلمہ ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ:

......وہ آپ کو پانی دیں گے، جب آپ پانی پئیں گے تو وہ کہیں گے: ﴿فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا﴾ [النساء: ۴]

......کوئی کام کریں گے تو کہیں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ!

......بچے کو دیکھتے ہی کہیں گے: مَاشَاءَ اللّٰهُ!

......کسی کے بچے کو بستہ اٹھائے ہوئے دیکھیں گے تو کہیں گے...... مَاشَاءَ اللّٰهُ!...... اللہ اس کو عالم بنائے۔

......کسی کے بچے کو کوئی کام کرتا دیکھیں گے تو کہیں گے: "اَللّٰهُ فِيْ عَوْنِكَ" اللہ تمہاری مدد میں ہے، اللہ تمہارا ساتھی ہے۔

......آپ ان میں سے کسی سے کہیں کہ آئیں میرے ساتھ کھانا کھائیں تو وہ کہے گا: "اَلرَّحْمٰنُ مَعَكَ" اللہ تمہارے ساتھ ہیں، میں مجبور ہوں، میں نے کسی دوسری جگہ جانا ہے۔

......کھانے کے لیے بیٹھیں گے تو سوال پیدا نہیں ہوتا کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" نہ پڑھیں۔

......کھانے کے بعد ناممکن ہے کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا" نہ پڑھیں۔

......کسی کو چھینک آئے تو وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہے بغیر نہیں رہ سکتے اور دوسرا اس کے جواب میں فوراً کہے گا: "يَرْحَمُكَ اللّٰهُ" پھر پہلا کہے گا: "يَهْدِيْكُمُ اللّٰهُ"

......آپ نے کبھی اپنے ملک کے بڑے آدمی کو بھی دیکھا ہے کہ اس کو چھینک آئے تو وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

......کسی کے جنازے کو دیکھیں گے تو میت کو کندھا دینے اور جنازے میں شامل ہونے کے لیے دوڑ پڑیں گے۔ گویا کہ ان کے ہر کلمہ میں اللہ کا نام اور اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔

......اور دعائیں وہ مانگتے ہیں جو حضور پاک ﷺ نے مانگی ہیں، دوسری دعاؤں کے قریب ہی نہیں جاتے۔ آپ

ان سے کہیں کہ فلاں بزرگ نے یہ دعا لکھی ہے، وہ کہے گا: ٹھیک لکھی ہوگی، لیکن جب حضور ﷺ کی لکھی ہوئی دعا ہمارے پاس موجود ہے تو کیا وہ حضور ﷺ سے بڑا ہے کہ ہم اس کی لکھی ہوئی دعا پڑھنے لگ جائیں؟

اگر اللہ ان کو مال دیتا ہے تو ناممکن ہے کہ زکوٰۃ نہ دیں۔ یعنی اگر آپ ڈھونڈنا شروع کر دیں گے تو ہزار میں سے کوئی ایک ملے گا جو زکوٰۃ نہ دیتا ہو اور ہمارے ملک میں ہزاروں میں سے ایک ملے گا جو زکوٰۃ دیتا ہوگا۔

آپ فرق ملاحظہ کریں! رمضان المبارک کا مہینہ آئے گا تو بیوی بچے، آل اولاد، شہزادے، بادشاہ، وزیر، شہزادیاں سب اپنے گھر بار چھوڑ کر مکہ میں آجائیں گے یا مدینہ میں آجائیں گے۔ اور ساری ساری رات عبادت میں گزار دیں گے۔ ہمارے ہاں تو لوگ روزہ رکھ کے تاش کھیلتے ہیں، کوئی گانا لگا لیتا ہے، یا کوئی اور زیادہ پہنچا ہوا آدمی ہو تو وہ فلم لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ ایسا بندہ روزہ گزار رہا ہوتا ہے کہ کسی طرح روزے کا وقت گزر جائے۔

ہمارا آدمی مسجد میں اس وقت آئے گا جب ایک رکعت چلی جائے گی، اللہُ اکبر، اللہُ اکبر کر کے نماز پوری کرے گا اور پھر چلا جائے گا، نفلوں پر تو ویسے ہی زور نہیں دیتے اور سنتیں بھی پوری سوری پڑھ کے جتنا جلدی ہو سکے، مسجد سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عرب کی یہ عادت ہے کہ جماعت کھڑی ہونے سے پہلے مسجد میں آئیں گے، ان کو اگر جماعت سے پہلے پانچ منٹ بھی مل جائیں تو قرآن اُٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

آپ مشاہدہ کر لیں! ان کو آدھا منٹ بھی مل جائے تو وہ کہتے ہیں کہ چلو اتنی دیر میں ہم قرآن کی ایک یا دو آیتیں تو پڑھ لیں گے، ہم اپنا وقت کیوں ضائع کریں؟ یہ ان کے اندر بڑی خوبیاں ہیں کہ اللہ نے ان کو چن لیا ہے اور ان کے اندر اپنے نبی ﷺ کو بھیجا اور ان میں اللہ نے اپنا گھر رکھا ہے، ان لوگوں کے اندر اللہ نے اپنے نبی ﷺ کا شہر رکھا ہے۔ کوئی بات تو ہے، آخر کچھ خوبیاں تو ہیں۔

باقی آپ کہیں کہ یہ کوئی جبرائیل علیہ السلام کے بھائی ہیں، ان سے کوئی غلطی نہ ہو۔ ایسی بات نہیں ہے، یہ بھی آخر انسان ہیں۔

آئینہ دکھا دیا:

ایک آدمی مجھے کہنے لگا کہ فلاں آدمی ایسا کرتا ہے اور ایسا کرتا ہے۔ اللہ نے اس کو اتنی دولت دی ہے کہ اس کا پیسہ بینکوں میں رکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا: اللہ کے بندے! اگر اس کا چوتھا حصہ اللہ پاک تجھے دے دے تو پھر



دیکھیں گے کہ تم کیا کرتے ہو؟ ذرا یوں بھی تو آزمایا کرو کہ جو دولت اللہ نے ان کو دی ہے، اگر ہمیں ملتی تو ہم کیا کرتے؟

﴿عَدْلٌ﴾ کی تفسیر:

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ کہ عدل کا معنی بدل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن ایسا نہیں ہوگا کہ کافر لوگ اپنا مال و دولت یا بیٹا دے کر اس کے بدلے میں عذاب سے نجات پالیں۔ وہاں اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: عدل کا معنی ہے برابری۔ جیسے عدل وانصاف میں برابری ہوتی ہے کہ اس آدمی کے برابر فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ ایسے نہیں ہوگا۔

حضرت ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: عدل کا معنی فدیہ ہے۔

حضرت عبد الرزاق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ عدل کا معنی فرض یا نفل عبادت ہے، کیونکہ جب اس کا ایمان نہیں تو فرض ونفل عبادت کے قبول ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس قول میں غرابت ہے۔ وہی پہلا ترجمہ راجح ہے کہ ان سے کوئی فدیہ نہیں لیا جائے گا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۸۹، البقرۃ: الآیۃ: ۴۸]

اور اس ترجمہ کی تائید اس حدیث پاک سے بھی ہوتی ہے جو ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: ''مَا الْعَدْلُ؟'' عدل کیا ہے جو قرآن پاک میں آتا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عدل کا معنی ''فدیہ'' ہے کہ ان سے کوئی فدیہ نہیں لیا جائے گا۔ [تفسیر جامع البیان لابی جعفر الطبری: ۳/ ۱۴۶]

﴿وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾ کی تفسیر:

اللہ نے فرمایا: ﴿فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ۭ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴾ [الاحقاف: ۲۸] کیوں نہ ان کی مدد کی ان لوگوں نے جن کو انہوں نے خدا، مشکل کشا، حاجت روا بنا رکھا تھا، ان کی منتیں مانتے تھے، اللہ فرمائیں گے کہ وہ کہاں ہیں؟ فرمایا: بلکہ آج تو ان سے وہ بھی گم ہو گئے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ﴿مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ﴾ [الصافات: ۲۵] آج

تمہیں کیا ہو گیا، ہمارے عذاب سے کیوں ایک دوسرے کو نہیں چھڑاتے؟ دنیا میں تو ایک دوسرے کی مدد کے لیے بڑے دوڑتے تھے۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قیامت والے دن کوئی مدد کرنے والا مدد نہیں کرے گا، جیسے کوئی سفارش کرنے والا ان کی سفارش نہیں کرے گا۔ اس دن ان کے بدلہ میں کوئی فدیہ قبول نہیں ہو گا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۰، البقرۃ:الآیۃ:۴۸]

﴿وَإِذْ نَجَّيْنَاكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿٤٩﴾ وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴿٥٠﴾﴾ [البقرۃ:۴۹،۵۰]

اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے رہائی دی جو تمہیں برا عذاب دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔ اور جب ہم نے تمہاری وجہ سے دریا کو پھاڑ دیا، پھر ہم نے تمہیں بچایا اور فرعون کے لوگوں کو غرق کیا، جبکہ تم دیکھ رہے تھے۔

جادو کی حرمت:

علم نجوم، علم فلکیات اور علم کواکب یہ جتنے علوم ہیں، یہ بڑے خطرناک علوم ہیں۔ ان سب کا سیکھنا، سکھانا اور ان کے مطابق عمل کرنا حرام ہے اور ان پر اعتقاد رکھنا بندے کو کفر کے درجہ میں پہنچا دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی کسی پر جادو کرتا ہے، سحر کر کے نقصان پہنچاتا ہے گویا اس نے اللہ کی ذات کے ساتھ کفر کیا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی اس علم کی مبادیات کو اس لیے سیکھتا ہے کہ میں اس کو دفع کر سکوں، اس کو توڑ سکوں، کوئی بے چارا اگر مسحور ہو تو میں اس کا علاج کر سکوں تو اس نیت کے ساتھ کم از کم جائز ہے، ورنہ اس کا سیکھنا بھی حرام ہے، سکھانا بھی حرام ہے، پڑھنا، پڑھانا بھی حرام ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو:

اس دنیا میں جادو اور جادوگروں کا وجود ہے۔ یہ نہیں کہ جادو نہیں۔ جادو، باقاعدہ ایک علم ہے اور علوم سفلیہ میں



سے ہے۔ یہ اتنی ظالم بلا ہے کہ جب اللہ کے نبی حضرت خاتم الانبیاء، حبیب کبریاء، رحمۃ للعالمین ﷺ پر یہودیوں نے جادو کیا تو ان پر بھی اس کا اثر ہو گیا۔

جادو کس نے کیا تھا؟

لبید بن اعصم منافق تھا، یہودیوں کا حلیف تھا، اس نے اور اس کی لڑکیوں نے یہ جادو کیا تھا۔ یہ بھی آتا ہے کہ جادو میں زیادہ تر عورتیں مبتلا ہوتی ہیں۔ اسی لیے قرآن مقدس نے فرمایا: ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ① مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ② وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ③ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ④ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ⑤﴾ [سورۃ الفلق] پھونک مارنے والی لڑکیاں جو گرہوں کے اندر پھونک مارتی ہیں، ان کے شر سے اللہ محفوظ رکھے۔

جادو کے اثرات:

اس جادو کی وجہ سے آقائے نامدار ﷺ کی ذاتی زندگی میں اتنا اثر ہو گیا کہ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر ہم حضور ﷺ کے سامنے پانی رکھ دیتے تو آپ تھوڑا سا لے لیتے تھے، وگرنہ خود کبھی مانگتے نہیں تھے۔ آپ ﷺ کا کھانا اور نہ کھانا برابر ہو گیا تھا، اسی طریقے سے اپنے بیوی بچوں سے ملنا نہ ملنا برابر ہو گیا، اور طبیعت میں اتنا انقباض تھا، اتنا بوجھ اور ثقل تھا کہ حضور ﷺ کی طبع مبارک کی شگفتگی ختم ہو گئی۔ پہلے آپ ﷺ کا چہرہ مبارک گلاب کی طرح کھلا رہتا تھا، اس جادو کی وجہ سے وہ بند کر دیا گیا۔

نجات کا طریقہ:

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور ﷺ کو خواب کے اندر سکھلا دیا۔ حضور ﷺ نے دیکھا کہ اللہ کے فرشتے جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام آئے، ایک سرہانہ کی طرف کھڑا ہو گیا اور دوسرا پاؤں کی طرف کھڑا ہو گیا۔ ایک فرشتے نے سوال کیا کہ یہ جو سور ہے ہیں، ان کو کیا تکلیف ہے؟ اس سرہانہ والے نے جواب دیا کہ ان پر جادو کیا گیا ہے۔ پھر اس نے سوال کیا کہ جادو کس چیز میں کیا گیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ایک کنگھی ہے، جس میں حضور ﷺ کے بال مبارک ہیں۔ اس کنگھی کے اندر ان بالوں کو لپیٹا گیا ہے اور اس کے اندر میخیں لگائی گئی ہیں، اس کے اندر جادو کیا گیا ہے۔ اس نے پھر پوچھا کہ وہ کنگھی کہاں ہے؟ دوسرے فرشتے نے کہا: فلاں جگہ پر کھجوروں کا ایک جھنڈ ہے، وہاں ایک پرانا کنواں ہے، اس کنویں کے اندر جو نیچے لکڑی رکھتے ہیں، اس کے نیچے وہ دفن ہے۔ پوچھا: کس

نے کیا ہے؟ جواب دیا کہ لبید بن اعصم اور اس کی لڑکیوں نے کیا ہے۔

حضور ﷺ جب بیدار ہوئے تو آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو ساتھ لیا اور اس جگہ پہ تشریف لے گئے۔ حضور ﷺ نے حکم دیا کہ کنویں کے اندر کھدائی کی جائے۔ جب کھدائی کی گئی تو وہ کنگھی مل گئی۔ اس کے اندر حضور ﷺ کے بال مبارک تھے اور ان میں سوئیاں لگائی گئی تھیں۔ صحابہ کرام نے ان گرہوں کو کھولنا شروع کیا۔ جیسے جیسے وہ گرہیں کھلتی گئیں، انہی کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کا چہرہ مبارک بھی کھلتا گیا اور ایسے ہوگیا جیسے چودھویں کا چاند روشن ہوتا ہے۔ جادو کا اثر سب ختم ہوگیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اس کو یہیں دفن کر دو۔

حضور پاک ﷺ نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتلایا کہ عائشہ! وہاں کی کھجوریں ایسے معلوم ہوتی تھیں جیسے شیطان کے سر ہوں۔ کھجوروں کے درخت ٹنڈ منڈ کھڑے تھے۔ اور اس کنویں کا پانی ایسے تھا جیسے کسی نے اس میں مہندی ملا دی ہو۔ اور فرمایا: اس ظالم نے کنگھی کے اندر میرے بال پھنسا کر ان کے اوپر سوئیاں لگائی ہوئی تھیں۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ لے آتے، ہم دیکھتے تو سہی کہ اس ظالم نے کیسے جادو کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب اللہ نے مجھے شفا دے دی ہے تو میں نہیں چاہتا کہ بات بڑھائی جائے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٥٧٦٣، باب: السِّحر]

حضور ﷺ رحمۃ للعالمین تھے، آپ نہیں چاہتے تھے کہ میری وجہ سے صحابہ کو جوش آئے اور وہ جا کر دشمن کو قتل کر دیں۔ یہ کوئی ایسی بات تو نہیں تھی کہ جسے صحابہ برداشت کر لیتے۔ لیکن حضور ﷺ نے اپنی رحمت اور شفقت کے پیشِ نظر اس معاملے کو وہیں دفن کر دیا کہ جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ ظالموں نے اپنا زور لگا لیا، ﴿وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ [الانفال: ٣٠] ان ظالموں نے اپنے مکر کی یہ تدبیریں کیں، لیکن اللہ کی تدبیر کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟

جادو کا زمانہ:

فرعون کا زمانہ، سحر کا زمانہ تھا، ہر قریہ میں جادوگر تھے اور بڑے بڑے ماہرین نجوم تھے جو ستاروں سے حساب کرتے تھے اور فلکیات کے ماہر تھے کہ یہ آج کواکب فلاں کا وقت نہیں، بلکہ فلاں کا ہے۔

بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کی وجہ:

علماء تواریخ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے علم نجوم وغیرہ کے ذریعہ سے حساب نکالا تو انہوں نے کہا کہ عنقریب

ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اسی لڑکے کی وجہ سے تمہاری بربادی آئے گی۔ فرعون نے حکم جاری کر دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو، اس کو اس کے ماں باپ کے سامنے قتل کر دیا جائے۔

چنانچہ قتل عام شروع ہو گیا۔ مرد، عورتیں اور جلاد بنی اسرائیل کی بستیوں کے اندر گھومتے رہتے تھے کہ کسی عورت کو حمل تو نہیں ہے۔ اگر کسی عورت کے بارے میں پتہ چلتا کہ وہ حاملہ ہے تو انتظار کرتے، جب ولادت کا وقت آتا تو ان کے آدمی وہاں پہنچے ہوئے ہوتے تھے۔ اگر لڑکی پیدا ہوتی تو چھوڑ دیتے اور اگر لڑکا پیدا ہوتا تو ماں باپ کے سامنے قتل کر دیتے تھے۔

بعض نے کہا کہ فرعون نے خواب دیکھا اور بعض نے کہا کہ فرعون نے نجومیوں کے کہنے پر ایسا کیا۔ بہرحال دونوں باتیں ملتی ہیں کہ اس بدبخت نے خواب بھی دیکھا ہو اور منجمین نے حساب بھی لگایا ہو۔ دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

فرعون کا حکم ثانی:

کچھ عرصہ کے بعد فرعون نے سوچا کہ اگر ہم ہر سال اسی طرح کرتے رہے تو ہماری خدمت کرنے والا تو کوئی باقی نہیں رہے گا۔ چنانچہ اس نے منجمین سے کہا کہ دوبارہ حساب کر کے بتاؤ کہ تقریباً وہ کون سا سال ہوگا؟ انہوں نے حساب کر کے اس سال کی علامات بتا دیں۔ فرعون نے نیا آرڈر جاری کرتے ہوئے کہا کہ اگر ساری نئی نسل کو قتل کر ڈالا تو ہمارے کام کون کرے گا؟ باقی تو بوڑھے رہ جائیں گے، یہ تو ویسے ریٹائر ہو جائیں گے اور ہمارے کام رک جائیں گے۔ لہٰذا ایک سال کے بچوں کو قتل کرو اور ایک سال کے بچوں کو چھوڑ دو۔ اللہ کا اپنا نظام ہوتا ہے، وہ کسی کے ماتحت نہیں ہوتا۔ دنیا اپنے آرڈر بناتی رہتی ہے لیکن خالق کے حکم اپنے ہوتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش:

خدا کی شان دیکھیں! حضرت ہارون علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس سال بچوں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا، لہٰذا ہارون علیہ السلام یوں بچ گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا بھی اس سال ہوئے جس میں انہوں نے بچوں کو قتل کرنا تھا۔ بڑا مفصل واقعہ ہے کہ اللہ نے کیسے ان کی حفاظت فرمائی۔

دشمن سے حفاظت کروائی:

اور حفاظت بھی دشمن کے گھر میں کروائی۔ گویا کہ فرعون سے کہا کہ تم اپنے دشمن کا پہرہ دو، تم ہمارے نبی کے خادم بنو اور تم ہی اس کی حفاظت کرو۔ جب جوان ہوگا تو تمہاری ہی بربادی کا باعث بنے گا۔ تم تو بنی اسرائیل کے گھروں کے اندر بچوں کو قتل کروا رہے تھے اور موسیٰ علیہ السلام کی ماں پر کیسے نرمی کر دی؟

جب اللہ نواز نے پر آئے!!

جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جب اللہ نواز نے پر آتے ہیں تو بیٹا بھی اپنا، دودھ بھی اپنا، پیسے بھی مل رہے ہیں اور ہدیے بھی مل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا﴾ [الاسراء:۳۱] (ظالمو!) اپنی اولادوں کو بھوک کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم ان کو بھی رزق دیں گے، تمہیں بھی رزق دیں گے۔ رزاق تو صرف اللہ کی ذات ہے۔

کفریہ منصوبہ بندی:

اصل میں یہ سارے فلسفے کفر کے ہیں کہ بچوں کو مار ڈالو، تا کہ دشمن پیدا نہ ہو۔ بچیوں کو مار ڈالو، تا کہ بلا وجہ ہماری جائیداد کی وارث نہ بنیں اور ہم پر کھانے کا بوجھ نہ بنیں۔ یا گولیاں دے کر دونوں کو مار ڈالو۔

فرعون سے بڑھ کر فرعون!!

یہ وقت کے فرعون سے بھی بُرے ہیں اور ابو جہل اینڈ کمپنی سے بھی بُرے ہیں۔ چلو انہوں نے تو ایک کے بارے میں فیصلہ کیا تھا کہ لڑکیاں مار دو اور لڑکے رہنے دو اور فرعون نے کہا: لڑکوں کو مار دو اور لڑکیوں کو رہنے دو، جبکہ انہوں نے کہا کہ گولیاں دے کر دونوں کو مار دو۔ اب خود فیصلہ کریں کہ یہ ان دونوں سے بُرے ہیں یا اچھے ہیں؟

خدا کے قانون سے مقابلہ:

انہوں نے کہا کہ بس بندی کر دو۔ مردوں کی رگیں کاٹ دو، عورتوں کی نس بندی کر دو، گولیاں دو، تا کہ بچہ پیدا نہ ہو۔ بس ایک بیٹا ہو اور ایک بیٹی ہو۔ مجھے بتاؤ کہ اگر دونوں بچے پاگل ہوں تو پھر کیا کرو گے؟ یا دونوں اندھے ہوں، لنگڑے ہوں یا کینسر کے مریض ہوں تو پھر کیا کرو گے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کے قانون سے مقابلہ اور جاہلیت ہے۔

منصوبہ بندی صرف مسلمان کے لیے ہی کیوں؟

ان ملکوں نے اپنے ہاں اس منصوبہ بندی پر کیوں عمل نہیں کیا؟ یہ آخر صرف ہمارے مسلمانوں کے لیے ہی کیوں ہے؟ بھائی! اگر آبادی بڑھ رہی ہے تو سب کی بڑھ رہی ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ عالم اسلام کے دشمن نے انتقام لینا ہے، اور وہ انتقام اس شکل میں ہے کہ گولیاں کھلا کر بچے ماردیں گے، تا کہ کسی طریقے سے مسلمانوں کا عدد تباہ ہو۔ ان لوگوں کے پس منظر میں یہ ایک فلسفہ ہے۔

ایک منہ......دو ہاتھ:

ورنہ یادرکھو! جو بچہ اللہ پیدا فرماتے ہیں، اگر کھانے کے لیے وہ ایک منہ لے کے آتا ہے تو کمانے کے لیے دو ہاتھ بھی لے کے آتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو دو پاؤں بھی دیتے ہیں۔

اور پھر کوئی پتہ نہیں ہوتا، کبھی کبھی ایک آدمی کے دس لڑکے ہوتے ہیں، لیکن ان میں سے ایک ایسا ہوتا ہے جو سارے خاندان کو سنبھال لیتا ہے، سارے خاندان کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہوتا ہے۔

نظامِ قدرت!!

اب بھی دنیا میں دیکھ لیں کہ کسی کے چار بچے ہیں تو تین بے کار ہیں اور ایک لڑکا ایسا ہے جو کما کر سب کو کھلا رہا ہے۔ ایک لڑکا باہر ملک چلا گیا تو ان کی عزت کا ذریعہ بن گیا۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک نظام ہے۔ اس نظام سے جو ٹکرائے گا وہ خود پاش پاش ہو کر رہ جائے گا اور کچھ بھی نہیں ہوگا، اللہ کی تقدیر کو کوئی بھی منع نہیں کر سکتا۔

فرعون کے خواب کی تعبیر:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فرعون ملعون نے ایک خواب دیکھا تھا کہ بیت المقدس سے ایک آگ نکلی ہے اور قبطیوں کے جتنے گھر ہیں، سب میں وہ آگ داخل ہو جاتی ہے، مگر بنی اسرائیل کے گھروں میں داخل نہیں ہوتی۔ اس کی تعبیر یہ نکالی گئی کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جس کی وجہ سے تم پر ہلاکت آئے گی۔

فرعون جن لوگوں سے قصے سنتا تھا، ان سے بھی اس نے سنا کہ بنی اسرائیل کہہ رہے ہیں کہ ہمارے اندر ایک آدمی پیدا ہوگا جس کی وجہ سے اللہ ہمیں قوت وعزت دیں گے۔ اس وجہ سے فرعون نے حکم دیا کہ جو بھی بچہ پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے اور بچیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اور بنی اسرائیل کے جتنے لوگ تھے ان کو محنت ومشقت والے

کاموں میں ڈالتا تھا کہ صفائی کرو، جھاڑو لگاؤ، بھنگی کا کام کرو، پتھروں کو توڑو۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۰، البقرۃ: الآیۃ: ۴۹]

بڑا عذاب؟

﴿يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ﴾ [البقرۃ: ۴۹] سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ کسی کے گھر بچہ پیدا ہو اور اس کو والدین کے سامنے تہہ تیغ کر دیا جائے اور پھر لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیا جائے، تاکہ ان سے گھروں کے کام کاج وغیرہ لیے جاسکیں۔

مفسر ﷫ فرماتے ہیں: اس آیت میں ﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ﴾ کے درمیان میں ''واؤ'' عاطفہ نہیں آئی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پچھلے کی تفسیر ہے کہ وہ بُرا عذاب یہ تھا۔ لیکن سورۂ ابراہیم میں ''واؤ'' کے ساتھ ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بُرا عذاب اور تھا۔ اس لیے مفسرین نے فرمایا کہ اصل میں بُرا عذاب یہ بھی تھا کہ ان سے مشقت کے کام لیے جائیں، ان کے لڑکوں کو قتل کیا جائے، لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیا جائے۔ اور وہ زندہ چھوڑ دینا بھی کوئی ہمدردی کے لیے نہیں تھا، بلکہ اپنے گھریلو کام لینا مقصود تھا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۰، البقرۃ: الآیۃ: ۴۹]

﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ﴾ کا معنی:

﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ﴾ کا معنی ہوتا ہے: چکھانا۔ جیسے کہا جاتا ہے: ''سَامَهٗ خُطَّةَ خَسْفٍ'' (اس نے اس کو خسف کا مزہ چکھایا)۔ جیسا کہ عمرو بن کلثوم نے یہ شعر کہا ہے:

إِذَا مَا الْمَلْكُ سَامَ النَّاسَ خَسْفًا
أَبَيْنَا أَنْ نُقِرَّ الْخَسْفَ فِيْنَا

''جب ملک لوگوں کو زمین میں دفن کرنا چاہتا ہے تو ہم انکار کرتے ہیں کہ ہمارے اندر ہی دھنسائے رکھتا۔''

اور بعض مفسرین فرماتے ہیں: ﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ﴾ کا معنی ''يُدِيْمُوْنَ'' ہے، یعنی ہمیشہ عذاب میں رکھتے تھے۔ ہمیشہ چرنے والی بکری کو ''سائمہ'' کہا جاتا ہے۔ ''سَامَ يَسُوْمُ'' کا معنی ہے: ''دَامَ يَدِيْمُ'' یعنی ہمیشہ تم کو بُرے عذاب میں ڈالتے تھے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں تو مناسبت یہی تھی، اس لیے فرمادیا: ﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ﴾ گویا اس کی تفسیر ہے۔

اور سورۂ ابراہیم میں عطف کے ساتھ آیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے اس سے پہلے فرمایا تھا: ﴿وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ⑤﴾ [ابراہیم:۵] یعنی اللہ کی نعمتیں ان کو یاد دِلاؤ۔ تو وہاں علیحدہ علیحدہ ذکر کیا گیا کہ تمہیں بُرا عذاب چکھاتے تھے اللہ نے اس سے چھڑایا، تمہارے بچوں کو زندہ قتل کر دیتے تھے اللہ نے اس سے چھڑایا، تمہاری لڑکیوں کو چھوڑ دیتے تھے اس عذاب سے اللہ نے چھڑایا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۰، البقرۃ: الآیۃ: ۴۹]

''فرعون'' نام نہیں، لقب ہے:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''فرعون'' نام نہیں ہے، بلکہ یہ لقب ہے جو اتنا مشہور ہو گیا کہ مصر کے بادشاہ کا نام بن گیا، جیسا کہ ''قیصر'' روم کے بادشاہ کا لقب تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۰، البقرۃ: الآیۃ: ۴۹]

فرعون کا مختصر تعارف:

موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جو فرعون تھا، بعض کتابوں میں اس کا نام ولید بن مصعب بن الریان اور بعض کتابوں میں مصعب ابن الریان ہے، وہ عملیق بن اود بن ارم بن سام بن نوح کی اولاد میں سے تھا اور اس کی کنیت ابو مرہ تھی، اس کے آباء فارس کے علاقہ اصطخر کے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۰، البقرۃ: الآیۃ: ۴۹]

نعمت بھی......امتحان بھی:

﴿وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ⑭﴾

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہم نے جو تمہیں اور تمہارے باپ کو نجات دی، یہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ ''بَلَاءٌ'' کا معنی ''نعمت'' بھی آتا ہے اور ''فتنہ و اختبار و امتحان'' بھی آتا ہے۔ اصل میں اللہ کی نعمت بھی تو ایک امتحان ہے کہ بندہ اس نعمت کے بعد اللہ کا شکر ادا کرتا ہے یا نہیں کرتا؟ اسی لیے امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ کبھی برائی سے، کبھی بھلائی سے بطور آزمائش کے۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل لغت کے نزدیک ''شر'' میں یہ کلمہ استعمال ہو تو ''بَلَوْتُهُ، أَبْلُوهُ، بَلَاءً'' اور ''خیر'' میں ہو تو ''أُبْلِيهِ، إِبْلَاءً وَ بَلَاءً'' آتا ہے۔ جیسے زہیر بن سلمیٰ نے کہا:

جَزَی اللّٰہُ بِالْإِحْسَانِ مَا فَعَلَا بِکُمْ
وَ أَبْلَاھُمَا خَیْرَ الْبَلَاءِ الَّذِیْ یَبْلُو

یہاں شاعر نے ''إِبلَاء، بَلَاء'' دونوں کو شعر کے اندر جمع کر دیا ہے۔

ویسے عام طور پر خیر میں إِبلَاء اور شر میں بَلَاء استعمال ہوتا ہے، لیکن کبھی دونوں میں بَلَاء استعمال ہوتا ہے۔

اور بعض نے کہا کہ یہ لفظ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس عذاب میں تم تھے وہ بڑا ذلت والا عذاب تھا کہ تمہارے بچے ذبح کر دیئے جائیں اور بچیاں چھوڑ دی جائیں۔ یہ بَلَاء ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ ''بَلَاء'' کا زیادہ استعمال ''شر'' میں ہوتا ہے، اور ذبح تمہارے لیے ایک بُری چیز بھی ہے اور امتحان بھی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۰، البقرۃ: الآیۃ: ۴۹]

ایک عظیم معجزہ:

اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ۝﴾ [البقرۃ: ۵۰]

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ فرعون کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کو نجات ملنے کا واقعہ اللہ کی قدرت کا ایک نظارہ تھا۔ یہ کوئی معجزہ نہیں، بلکہ یہ تو اتفاقات وحادثات میں سے ہے۔ ایسے حادثے ہوتے رہتے ہیں کہ ایک جگہ طوفان آتا ہے اور چند آدمی اتفاقی طور پر بچ جاتے ہیں، کوئی بڑی بلڈنگ گر جاتی ہے، اس میں موجود سارے لوگ ہلاک ہوجاتے ہیں، مگر ایک آدمی بچ جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے...... معاذ اللہ!...... ان واقعات کو اپنے اللہ کی قدرتیں اور معجزے بنا کر قوم کے سامنے پیش کیا۔ یہ باتیں جہالت پر مبنی ہیں۔ ایسے حادثے کی کوئی ایک مثال تو لے آؤ کہ ایک دریا پوری طغیانی سے بہہ رہا ہو، ایک قوم لاکھوں کی تعداد میں اس پر سے صحیح سلامت گزر جائے اور دوسری قوم کے لاکھوں آدمی اسی دریا میں غرق ہوجائیں۔ ایک، دو آدمیوں کا بچ جانا تو کوئی بات نہ ہوئی۔ یہ کیسا حادثہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو بنی اسرائیل تھے، ان کو تو دریا نے راستے دے اور وہ بحفاظت دریا پار کر گئے۔ اور ابھی وہ گزر رہے ہی تھے کہ پیچھے سے فرعون اپنے لاؤ لشکر سمیت وہاں پہنچ گیا، اس نے جب دریا میں بنے خشک راستے دیکھے تو وہ بھی اس میں کود پڑا۔ جب وہ اندر آ گیا تو اس کو دریا نے پکڑ لیا۔ یہ کیسا دریا ہے جو اسرائیلی کو پہچان کر اسے راستہ دے رہا ہے اور قبطی کو پہچان کر اپنے اندر ڈبو رہا ہے؟

صاف ظاہر ہے کہ یہ اللہ کی قدرت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ ایسی باتوں کو حادثات قرار دینا بڑی جہالت کی بات ہے۔

چاند دو ٹکڑے ہونے کا معجزہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کی اور اپنی انگلی مبارک کا اشارہ فرمایا تو چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔

یہ کیسا حادثہ ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا؟ ایسے کہہ دینے سے تو بات نہیں بنتی۔ اگر واقعی یہ کوئی حادثہ تھا تو تم بھی ایسا کوئی حادثہ دنیا کو دکھلاؤ کہ ہم نے بھی انگلی کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا ہے!! اتنے بڑے کرۂ عظیم کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا، اگر معجزہ اور اللہ کی قدرت کا اظہار نہیں تھا تو اور کیا چیز تھی؟ تم تو ارب ہا ڈالر خرچ کر کے چاند پر پہنچے ہو اور ابھی اس پر رہنے کی تم کو طاقت نہیں ہو رہی۔

ایسی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کے دماغ قرآن وسنت کے مطالعہ سے خالی ہوتے ہیں۔ ورنہ جن کی نظر اللہ کے قرآن پر ہے اور احادیث رسول پاک پر ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرتیں ہیں اور اللہ کے انبیاء کے معجزات ہیں۔

متفرق معجزات کا تذکرہ:

اب دیکھیں!

......ایک ایسا وقت بھی آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالے میں ہاتھ رکھا اور انگلیوں سے پانی جوش مار کر نکلنے لگا۔[1]

ایسے واقعات کو کوئی حادثہ کہہ سکتا ہے؟

......ایک صحابی کی ٹانگ ٹوٹ گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ لگایا تو جڑ گئی۔[2]

......ایک صحابی کی آنکھ باہر نکل آئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ مبارک سے واپس اس کی جگہ میں رکھ دی تو ہمیشہ کے لیے جڑ گئی۔ [کنز العمال، حدیث: ۳۵۳۹۴]

تم بھی اسی طرح کسی کی نکلی ہوئی آنکھ واپس لگاؤ اور پھر اسے پہلے کی طرح ٹھیک کر کے دکھلاؤ تو مانیں کہ یہ حادثہ

---

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۳۵۷۳، بابُ: عَلَامَاتِ النُّبُوَّةِ فِي الإِسْلَامِ]

[2] [صحیح البخاری، حدیث: ۴۰۳۹، بابُ قَتْلِ أَبِي رَافِعٍ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي الحُقَيْقِ]

تھا اور ایسا ہو جاتا ہے۔

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ایسا کر سکیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اسلام کے خلاف منفی پروپیگنڈا کریں، لوگوں کے اذہان وقلوب میں شکوک اور شبہات پیدا کر کے انہیں اسلام سے متنفر کریں۔

فرعون کے غرق ہونے کا قصہ:

یہ قصہ اللہ نے کئی سورتوں میں بیان فرمایا ہے۔ یہ واقعہ سورۃ الشعراء میں زیادہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَاَنْجَيْنٰكُمْ﴾ ہم نے چھڑایا تم کو دشمن سے اور ہم نے تمہارے اور ان کے درمیان دریا کو رکاوٹ بنا دیا، ﴿وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝﴾ [البقرۃ: ۵۰] اور ہم نے تمہارے دشمنوں کو غرق کر دیا، اس حال میں کہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ دشمن غرق ہو رہا ہے، تا کہ تمہارے دلوں میں زیادہ سے زیادہ ٹھنڈک پیدا ہو۔ کیونکہ جب آدمی دشمن کو اپنی آنکھوں سے ذلیل ہوتا دیکھ لے تو دل بہت خوش ہوتا ہے۔ اور تمہارے دشمنوں کے لیے یہ بڑی ذلت تھی کہ جن کو وہ ذلیل کرتے تھے، آج وہ ان کے غرق ہونے کو دیکھ رہے ہیں۔

حضرت عبد الرزاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ نکلے اور فرعون کو یہ بات پہنچی تو اس نے کہا کہ ابھی صبر کرو، جب صبح کا مرغ اذان دے گا، اس وقت ہم ان کے پیچھے نکلیں گے۔ اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ اس رات کسی مرغ نے اذان نہ دی تو وہ اللہ کی قدرت سے لیٹ ہو گئے۔ صبح ہوئی تو فرعون نے ایک بکری منگوائی اور اس کو ذبح کیا، اس کے بعد فرعون نے کہا کہ پہلے ہم اس کا جگر وغیرہ بھونتے ہیں، اتنی دیر میں تم چھ لاکھ کا لشکر اکٹھا کرو۔ چنانچہ چھ لاکھ کا لشکر اس نے اکٹھا کر لیا۔

جب موسیٰ علیہ السلام دریا پر پہنچے تو ان کے ساتھ ان کے ایک ساتھی تھے، حضرت یوشع بن نون۔ انہوں نے پوچھا: اللہ کا کیا حکم ہے؟ کس طرف چلنا ہے؟ فرمایا: اسی طرف کا حکم ہے، چلو دریا کی طرف۔ جب حکم دیا تو یوشع بن نون نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈالا، مگر وہ ڈوبنے لگ گیا تو یہ واپس آ گئے۔ دوبارہ ڈالا تو پھر گھوڑا ڈوبنے لگ گیا۔ پھر واپس آ گئے، تیسری مرتبہ گئے تو پھر ایسا ہی ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں نے کوئی جھوٹ تو نہیں بولا، میرے رب کا یہی حکم ہے کہ ہم نے اسی طرف جانا ہے۔ اس وقت اللہ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی کی، جس میں فرمایا: ﴿اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ﴾ [الشعراء: ۶۳] تم اس دریا پر اپنا عصا مارو۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا اس پانی پر مارا تو وہ پھٹ گیا اور ایسے بن گیا جیسے دونوں طرف پہاڑ کھڑے ہوں۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ جو لوگ تھے، وہ سب کے سب

وہاں سے گزرے۔

فرعون، جب اُن کو پکڑنے کے لیے آیا تو وہ بھی اس میں داخل ہوگیا۔ جب فرعون کا پورا لشکر اندر آ گیا تو اللہ نے پانی کو حکم دیا کہ اب مل جاؤ۔ اس طرح موسیٰ علیہ السلام کو نجات ملی اور فرعون غرق ہوا۔ یہ دس (10) محرم کا دن تھا۔

دس محرم کا روزہ کیوں؟

میرے آقا ﷺ جب مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ یہودی لوگ محرم کی دس تاریخ کو روزہ رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم اس دن کا روزہ کیوں رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا: یہ بڑی برکت اور رحمت والا دن ہے، جب اللہ نے بنی اسرائیل کو نجات دی تھی اور فرعون غرق ہوا تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے شکرانے کے طور پر اس دن کا روزہ رکھا تھا۔ اس لیے ہم بھی رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم سے تو زیادہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ میرا حق بنتا ہے، کیونکہ وہ بھی اللہ کے رسول تھے اور میں بھی اللہ کا رسول ہوں۔ پھر ان کا اور میرا طریقہ دعوت بھی ایک ہے، ہمارا اصول ایک ہے، اسلام ایک ہے، توحید ایک ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۲۰۰۴، باب: صِيَامِ يَوْمِ عَاشُورَاءَ]

حضور ﷺ یہ روزہ اتنی پابندی سے رکھتے تھے جیسے رمضان کا روزہ ہو۔ پھر جب رمضان المبارک کے روزے فرض ہوئے تو حضور ﷺ نے اجازت دے دی، جو چاہے یہ روزہ رکھے اور جو چاہے نہ رکھے۔
[صحيح البخاري، حديث: ۲۰۰۲، باب: صِيَامِ يَوْمِ عَاشُورَاءَ]

یہود کی مشابہت سے احتراز:

اس کے بعد حضور پاک ﷺ نے ایک ارشاد مبارک جاری فرمادیا: جو لوگ محرم کا روزہ رکھنا چاہیں تو وہ نَو اور دس محرم (دو دن) روزہ رکھیں یا دس کے ساتھ گیارہ محرم کا بھی روزہ رکھیں، تا کہ یہودیوں کے طریقے سے مخالفت بھی ہو جائے اور اللہ کا شکر بھی ادا ہو جائے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۱۱۳۴، باب: أَيُّ يَوْمٍ يُصَامُ فِي عَاشُورَاءَ]

عاشوراء کے روزے کا پس منظر:

یومِ عاشوراء کا روزہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے چلا آ رہا ہے، جبکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی وجہ سے عاشوراء کے دن روزہ رکھا جاتا ہے۔ بہر حال اس روزے کی بڑی فضیلت ہے، اللہ پاک ہم

سب کو نصیب کرے۔

اور ایک روایت یہ بھی آئی ہے کہ اللہ نے جس دن بنی اسرائیل کے لیے دریا کو پھاڑا تھا، وہ بھی عاشوراء کا دن تھا۔

لیکن مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ ایک تو اس کے اندر زید العمی ہے وہ ضعیف ہے اور پھر اس کا جو شیخ ہے یزید الرقاشی، وہ اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۱، البقرۃ: الآیۃ: ۹۱]

بہر حال پہلی روایت جو ہم نے پڑھی، وہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو نجات دی اور فرعون کو اس کے متبعین سمیت غرق کر دیا۔

﴿وَإِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰى أَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَأَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَإِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿٥٣﴾﴾
[البقرۃ: ۵۱ تا ۵۳]

اور جب ہم موسیٰ سے چالیس رات کو وعدہ کیا، پھر تم نے موسیٰ کے بعد بچھڑا بنا لیا اور تم ظالم تھے۔ پھر ہم نے تمہیں اس پر بھی معاف کر دیا، تا کہ تم احسان مانو۔ اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق کو ناحق سے الگ کرنے والے احکام دیئے، تا کہ تم ہدایت پاؤ۔

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایک عمل، ان کی ناشکری اور اپنی نعمتوں کا ایک اور واقعہ ذکر فرمایا ہے۔

تفسیر:

فرمایا: یاد کرو جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بلایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ وہ کوہِ طور پر تشریف لے آئیں، چالیس راتوں کے لیے وہاں عبادت کریں۔ یعنی روزہ بھی ہو، عبادت بھی ہو، قیام بھی ہو۔

یہاں اختصار ہے، ایک اور جگہ اس کی تفصیل ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو ابتدائی طور پر تیس دن کوہِ طور پر قیام کا حکم ملا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تیس دن تک روزے رکھے اور رات دن اللہ کی عبادت میں مشغول رہے، جب آپ نے تیس دن کے بعد افطار فرما لیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ مزید دس راتیں عبادت میں گزارو۔ نتیجتاً چالیس

راتوں کی عبادت کا حکم دیا گیا۔

فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل کی تاریخ:

اس بات میں علماء کا اختلاف ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر تشریف لے گئے تو اپنی قوم کو کہاں چھوڑا؟ بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو نجات دے دی اور فرعون کو اس کے لاؤ لشکر سمیت غرق کر دیا تو موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر واپس مصر میں داخل ہو گئے۔ قرآن کریم کی بعض آیات سے اس قول کی تائید کا اشارہ ملتا ہے کہ اللہ نے فرمایا: جس مصر پر فرعون کی حکومت تھی، جس پر فراعنہ کا تسلط تھا، جس پر قبط کا قبضہ تھا، ہم نے اس کا وارث ان لوگوں کو بنایا جن کو کمزور سمجھ کر ان پر ظلم کیے جاتے تھے، یعنی بنی اسرائیل کو۔ اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر واپس مصر میں آ کر آباد ہوئے اور قوم کو مصر میں چھوڑ کر پھر آپ کوہِ طور پر تشریف لے گئے۔

جبکہ بعض مفسرین اس قول سے اختلاف کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں دوبارہ مصر میں داخل ہونے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ تو مصر میں اس زمانے میں داخل ہوئے تھے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی تھی اور آپ کے بعد یہ قافلہ حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں آیا۔

بہرحال قرآن پاک نے یہاں اتنی بات کا اشارہ فرما دیا کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو پابند فرما دیا کہ ایک مقام معین پر آ کر راتیں گزاریں۔ یہاں اس مقام اور جگہ کا نام نہیں لیا گیا، لیکن دیگر آیات اور روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ میقات جس پر اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو پابند کیا تھا، وہ ''جبل طور'' تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں حضرت ہارون علیہ السلام کو ٹھہرایا، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہیں، عمر میں تو یہ موسیٰ علیہ السلام سے بڑے ہیں، لیکن شان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے بڑھ کر ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام رسول بھی ہیں اور نبی بھی ہیں، جبکہ حضرت ہارون علیہ السلام صرف نبی ہیں، رسول نہیں ہیں، بلکہ وہ شریعت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابع ہیں۔

دوسرے مقام پر موجود ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے فرمایا: اے میرے بھائی! تم میرے خلیفہ بنو، تم میری عدم موجودگی میں قوم کے اندر رہو، قوم کو سنبھالو اور ان کی اصلاح کرو۔ خبردار! خیال رکھنا کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ تم ان لوگوں کے راستے پر لگ جاؤ جو پہلے دنیا میں فساد کرنے والے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنایا۔

مدینہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نائب:

میرے آقا سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ پر تشریف لے جا رہے تھے، حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا بیمار تھیں، حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم ہمارے ساتھ جہاد میں نہ جاؤ، بلکہ اپنے گھر کو سنبھالو، کیونکہ ما سوا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سنبھالنا مشکل تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑے بہادر تھے، ان کے دل میں جذبہ تھا تو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ حکم بڑا مشکل لگا۔ انکار تو نہیں کر سکتے تھے، البتہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ میرے لیے کتنی مجبوری ہوگی کہ میرے آقا دشمن کے نرغہ میں ہوں اور میں عورتوں کے ساتھ بیٹھا رہوں۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں بھی آپ کے ساتھ جنگ میں چلوں، گھر کے اندر جو تکلیف اور دُکھ سکھ ہے، وہ وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہوگا۔

میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے علی! کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ تم بھی میری اسی طرح نیابت کرو جس طرح ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی نیابت کی تھی؟ اتنا بڑا مرتبہ میں تمہیں بخش رہا ہوں۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ راضی ہو گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے۔

[صحيح البخاري، حديث: ۴۴۱۶، باب: غَزْوَةُ تَبُوكَ وَهِيَ غَزْوَةُ الْعُسْرَةِ]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت بلا فصل کا استدلال:

بعض حضرات قرآن مجید کی آیت ﴿وَقَالَ مُوسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ [الاعراف: ۱۴۲] (اور کہا موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون کو کہ تم میرے خلیفہ ہو میری قوم میں اور اصلاح کرتے رہنا اور پیروی نہ کرنا فساد مچانے والوں کے راستے کی) اور اس حدیث مبارک "أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسَى، إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي"[1] سے دلیل پکڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہاں موسیٰ علیہ السلام کے بھائی خلیفہ بنے اور یہاں حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر کے اندر پیچھے چھوڑا۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کا حق صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی آدمی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت کا حقدار نہیں بن سکتا۔ چنانچہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، ان کے نزدیک برحق خلفاء نہیں، بلکہ یہ زبردستی



[1] [صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۰۴]

حضور ﷺ کے تختِ خلافت پر بیٹھ گئے تھے......نعوذ باللہ!......

استدلالِ مذکور کا جواب:

مذکورہ بالا استدلال بالکل غلط ہے۔ میں آپ کو ایک مثال سے بات سمجھاتا ہوں۔ آپ مجھے بتائیں کہ اگر میں یہاں کوئی غلطی کروں تو کیا یہ سب علماء اور طلبہ میری اس غلطی میں شریک ہو جائیں گے اور مجھے روکنے والا کوئی بھی نہیں ہوگا؟ ایسی بات نہیں ہے۔ آخر کوئی ایک تو اُٹھ کے کہے گا کہ آپ یہ غلطی کی ہے۔

اگر خلافت بلا فصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق تھا اور حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے اُن سے زبردستی یہ حق چھین لیا تھا تو کیا حضور ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے اڑھائی لاکھ صحابہ میں سے کسی ایک صحابی نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دیا اور نہ ہی اس ظلم کے خلاف آواز اُٹھائی؟ کیا اس وقت تمام صحابہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ متفق ہو گئے؟ اور آج چودہ سو سال گزرنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ظلم ہوا تھا؟

چلو اگر کسی ایک صحابی نے اس معاملے میں ان کا ساتھ نہ دیا تو کم از کم حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی کے سامنے اس کا اظہار تو کرتے کہ میرے ساتھ ظلم اور زیادتی ہوئی ہے۔ ایسا تو نہ کرتے کہ جن لوگوں نے ان سے خلافت چھین لی تھی، انہی کے وزیر اور مشیر بن جاتے اور ساری زندگی ان کی غلامی کرتے رہے۔ کم از کم ان سے علیحدگی اختیار کر لیتے، شاید اس وجہ سے صحابہ میں ایک جماعت پیدا ہو جاتی جو اُن کا ساتھ دیتی۔

آپ نے پڑھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ پر تھیں، لیکن صحابہ کی اکثریت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اگر حضور ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کا حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہوتا تو کیا صحابہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑے نہ ہوتے؟

دوسری بات یہ بھی یاد رکھیں کہ صرف ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنانے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر استدلال کرنا اس لیے بھی صحیح نہیں ہے کہ ہارون علیہ السلام تو خود نبی تھے، موسیٰ علیہ السلام بھی نبی اور رسول تھے، وہاں تو خلیفہ بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات تو تب ہوتی جب ہمارے آقا ﷺ کی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی نبی ہوتے۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے واقعہ سے خلافت کے مسئلہ پر دلیل نہیں پکڑی جا سکتی۔

اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی کوئی خلافت کا مسئلہ نہ رہا۔

اور اس سے بھی اندازہ لگائیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿هٰرُوْنَ اُخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ﴾ ہارون اتم میری قوم کے اندر خلیفہ ہو، اور حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: تم گھر کے مسئلہ کے اندر ذمہ دار ہو۔ مملکت تو حضور ﷺ نے ان کے سپرد نہیں فرمائی تھی۔ لہٰذا ایسی باتوں سے استدلال کرنا، اللہ کے دین میں تحریف کرنے کے برابر ہے۔

قیام میں دنوں کا ذکر کیوں نہیں؟

یہاں چالیس راتوں کا ذکر ہے، حالانکہ جہاں چالیس راتیں تھیں وہاں چالیس دن بھی تو ساتھ تھے۔ یعنی ایسے تو نہیں تھا کہ موسیٰ علیہ السلام رات کو وہاں رہتے تھے اور دن کو واپس آجاتے تھے، بلکہ دن رات وہیں رہے۔ جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کے اندر صرف ''رات'' کا ذکر کیا ہے، ''دن'' کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام کے ہر لفظ اور ہر جملے میں حکمتیں ہیں۔ اللہ نے راتوں کا ذکر اس لیے فرمایا ہے کہ روحانی تربیت کے لیے رات کا وقت زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ بندے کو رات کے وقت عبادت میں جتنی یکسوئی ہوتی ہے، اتنی یکسوئی دن میں حاصل نہیں ہوسکتی۔

رات کی اہمیت:

قرآن پاک پر نظر دوڑائیں تو یہ چیز واضح نظر آتی ہے کہ حضور ﷺ کو بہت سے اہم اُمور رات میں پیش آئے۔

...... چنانچہ قرآن مجید ''لیلۃ القدر'' میں نازل کیا گیا، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ①﴾ [القدر:۱]
(ہم نے قرآن اُتارا ہے ایک برکت والی رات میں)۔

...... حضور ﷺ کو جب پہلا حکم ملا تھا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ① قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ②﴾ [المزمل:۱،۲] وہاں بھی رات کو اُٹھنے کا حکم دیا گیا۔ پہلی پہلی نماز کا جو حکم ملا، وہ رات کی عبادت کا حکم ملا۔

...... قرآن مقدس کی ایک اور آیت ہے: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا



مَّحۡمُوۡدًا﴿۷۹﴾ [الاسراء:۷۹] رات کے اندر نیند کو چھوڑ کو اللہ کی عبادتِ زائدہ ادا کریں۔ یہاں بھی رات کو تہجد پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

......اور معراج جیسا عظیم معجزہ بھی میرے مدنی ﷺ کو رات کے وقت ملا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿سُبۡحٰنَ الَّذِيۡۤ اَسۡرٰى بِعَبۡدِهٖ لَيۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ اِلَى الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا﴾ [الاسراء:۱] پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے پاک پیغمبر کو رات کے بعض حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف۔

......اور نفس کی اصلاح کا طریقہ بھی یہ بتایا گیا ہے کہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کے اللہ کی عبادت کی جائے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيۡلِ هِىَ اَشَدُّ وَطۡـاً وَّاَقۡوَمُ قِيۡلًا ؕ﴿۶﴾ [المزمل:۶] میرے مدنی! راتوں کو جاگنا نفس کو سخت روندتا ہے اور بات بھی سیدھی نکلتی ہے۔

اکثر مقامات پر آپ کو رات کا تذکرہ ملے گا۔ چنانچہ ''لیلۃ العید'' اور ''لیلۃ الجمعہ'' بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

......حضور ﷺ نے فرمایا: بندہ رات کے آخری حصے میں جب عبادت کرے تو اپنے رب کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ وہاں بھی ''رات'' کا ذکر آیا ہے۔

......اسی طرح صحیح حدیث میں موجود ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ ہر رات کے آخری حصے میں آسمانِ دنیا پر نزول اجلال فرماتے ہیں جیسے اس کی شان کو زیبا ہے، اور اعلان ہوتا ہے کہ ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اس کی حاجت پوری کروں؟ ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ اس کو معاف کروں؟ ہے کوئی رزق مانگنے والا کہ میں اس کے رزق میں برکت دوں؟ ہے کوئی اولاد مانگنے والا کہ میں اس کو اولاد دوں؟ [صحیح البخاری، حدیث:۱۱۴۵، بابُ:الدُّعاءِ فِي الصَّلاَةِ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ]

......پھر یہ بات بھی ہے کہ رات کو سفر آسانی سے طے ہوتا ہے۔ چنانچہ پچھلے زمانے میں جب لوگ پیدل یا اونٹ وغیرہ پہ سفر کرتے تھے تو وہ شام ہوتے ہی سفر کا آغاز کر لیتے اور پھر ساری رات قافلہ چلتا رہتا تھا۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ چونکہ رات ٹھنڈی ہو چکی ہوتی ہے، اس لیے رات کے سفر میں تکلیف کم ہوتی ہے اور سفر آسانی سے گزرتا ہے۔ آدمی کو بھوک اور پیاس کا بھی اتنا احساس نہیں ہوتا، جتنا دن میں ہوتا ہے۔

......علماء فرماتے ہیں کہ جس طرح دنیا کا سفر رات کو آسانی سے طے ہوتا ہے اسی طرح اللہ کی طرف روحانی ترقیوں کا سفر بھی رات کے اوقات میں آسانی سے طے ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جن لوگوں نے اپنی اصلاح کرنی ہو، اپنے آپ کو

انسان بنانا ہو، اپنے آپ کو اللہ کا مقرب بنانا ہو تو ان کو چاہیے کہ وہ رات کو تہجد پڑھیں، راتوں کو اللہ کے آگے زیادہ سے زیادہ تضرع کریں، زیادہ سے زیادہ عاجزی کریں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے گڑگڑائیں۔ رات کو اللہ کی خصوصی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ تم چالیس راتیں عبادت کرو۔ چنانچہ انہوں نے کوہِ طور پر چالیس راتیں عبادت کی۔

اعداد وشمار کی حکمتیں:

جتنے بھی اعداد ہیں، ان کی حکمت تو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان اعداد پر ہمارا کوئی ایمان اور اعتقاد نہیں ہے۔ جیسا کہ آج کل بعض لوگ عدد کے چکر میں پڑے رہتے ہیں، ناموں کا عدد نکالتے ہیں، ماں باپ کے نام کا عدد نکالتے ہیں، پھر ضرب اور تقسیم کرتے ہیں، جہاں عدد تھوڑا بچ جائے، اسے غالب اور جدھر زیادہ ہو، اسے مغلوب سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے تمام علوم باطل ہیں، ان پر اعتقاد رکھنا جائز نہیں ہے۔

''سات'' (7) کا عدد:

اللہ نے زمینیں سات پیدا فرمائیں، طواف کے سات چکر رکھے، صفا ومروہ کے بھی سات چکروں کا حکم دیا اور اسی طرح سات اعضاء پر سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ سب اللہ کی رحمتیں ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمتیں ہیں، جنہیں ہم نہیں جانتے۔ وہ چاہتے تو آٹھ بھی کر سکتے تھے، وہ چاہتے تو چھ بھی کر سکتے تھے۔

اعداد کی اکائیاں، دہائیاں:

البتہ بعض علماء نے کچھ اشارات دیئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ اعداد میں اکائیاں بھی ہوتی ہیں اور دہائیاں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک اکائی ہے، دس دہائی ہے اور بیس، تیس، چالیس، پچاس دہائیاں ہیں۔ پھر سو، دوسو، یہ سینکڑے ہوتے ہیں، پھر ہزار ہوتے ہیں، ان کے بعد لاکھ کا عدد ہوتا ہے۔

عددِ کامل؟

ان میں سے کامل عدد ''دس'' ہے۔ ایک سے آپ گنیں تو دس کے ساتھ ایک لگے گا تو گیارہ ہو جائیں گے، دو لگیں گے تو بارہ ہو جائیں گے۔ اصل کامل عدد دس کا ہے جیسا کہ اللہ نے ایک جگہ فرمایا: ﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ یہ

دس پورے ہوگئے۔ جب کسی چیز کو زیادہ اہمیت دینی ہو تو اس کو چار دفعہ دہرالیا جائے تو چالیس ہو جائے گا۔

اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ بہت بڑی اہمیت کا کام تھا، اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وہاں چالیس راتیں گزارنے کا حکم دیا۔

چالیس (40) کا عدد:

اللہ کی شان ہے کہ آدمی کی عمر کا بھی یہی عالم ہے کہ وہ چالیس سال تک آ کر بالکل پورا ہو جاتا ہے، ﴿حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً﴾ [الاحقاف:۱۵] یہ مرحلہ بھرپور جوانی کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد نہ تو ہڈیاں بڑھتی ہیں اور نہ ہی قد بڑھتا ہے۔ بلکہ اس کے بعد تو بندے کی عمر میں زوال آنے لگتا ہے۔

چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی:

اس لیے اللہ نے اپنی قدرت سے فیصلہ فرمایا اور ہر نبی کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا فرمائی۔ کسی بھی نبی کو چالیس سال سے پہلے نبوت نہیں ملی۔ البتہ اپنی قدرت کے اظہار کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بچپن میں انہی کی زبانی اعلان کروایا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ان کے بچپن کے زمانے میں حکم دیا: ﴿یٰیَحْیٰی خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا ﴿۱۲﴾﴾ [مریم:۱۲]

انسان کی تخلیق اور چالیس کا عدد:

اسی طرح انسان کی تخلیق کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ﴿۱۴﴾﴾ [المومنون:۱۴]
پہلے چالیس دن تک نطفہ ہوتا ہے، پھر چالیس دن تک مضغہ ہوتا ہے، پھر چالیس دن بعد ہڈیاں بنتی ہیں۔ چالیس، چالیس دن کے بعد ایک مرحلہ طے ہوتا رہتا ہے، یعنی چالیس دن کے بعد بڑی تبدیلی آتی ہے۔ اس میں بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی کچھ حکمتیں ہیں۔

اور اسی طرح سے آتا ہے کہ جو شخص چالیس احادیث یاد کرلے تو اس کو علماء میں شمار کیا جائے گا۔

اور اسی طرح ایک ضعیف حدیث میں آتا ہے کہ جو بندہ چالیس نمازیں مسجد نبوی میں ادا کرے گا، اللہ پاک اس کو نفاق اور جہنم کی بیماری سے نجات دیں گے۔

بزرگوں نے چلہ مقرر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو بندہ چالیس دن تک اپنے گھربار سے کٹ جائے گا، ریاضت کرے گا، نماز پڑھے گا، تہجد پڑھے گا، اللہ کے کام میں لگا رہے گا تو اس میں بھی تبدیلی آئے گی، وہ برائیوں سے اچھائیوں کی طرف تبدیل ہوگا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:

((مَنْ أَخْلَصَ لِلّٰهِ تَعَالَى أَرْبَعِينَ يَوْمًا ظَهَرَتْ يَنَابِيعُ الْحِكْمَةِ عَلَى لِسَانِهِ.))

''جو بندہ چالیس دن اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرے، اس کی زبان پر حکمت کے چشمے ظاہر ہوتے ہیں۔'' [حلیۃ الاولیاء: ۵/۱۸۹]

کچھ باتیں سامری کے بارے میں

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بلالیا تو موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے۔ پیچھے قوم میں ایک شخص تھا جس کا نام ''سامری'' تھا، یہ بھی اسرائیلی تھا۔ بعض روایات کے اندر آتا ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام سے رشتہ داری بھی رکھتا تھا۔

فرشتے کے ذریعے سامری کی پرورش:

لوگوں نے لکھا ہے کہ سامری حلال سے پیدا نہیں ہوا تھا، بلکہ یہ نطفہ حرام سے پیدا ہوا تھا۔ جب یہ پیدا ہوا تو اس کی ماں اس کو ایک غار میں پھینک کر چلی گئی کہ اس کو وہاں سے کوئی لے جائے یا جنگل کا کوئی جانور اسے کھا جائے اور میری عزت محفوظ رہے۔ خدا کی قدرت دیکھیں! اللہ نے فرشتے کی ڈیوٹی لگائی کہ اس کی حفاظت کرو...... ہر کام میں اللہ کی حکمتیں ہوتی ہیں...... اس کی حفاظت کے لیے فرشتہ مقرر ہوگیا۔ اس نے فرشتے کی گود میں پرورش پائی، لیکن پھر بھی مشرک بن گیا۔

ہدایت، اللہ کے ہاتھ میں:

علماء نے لکھا ہے کہ یاد رکھو! ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ آپ دیکھیں! موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی گود میں پرورش پائی تو نبی بن گئے اور سامری ایک فرشتے کی گود میں پرورش پا کر بھی مشرک بن گیا۔

[تفسیر الشعراوي: ۵/۳۰۱۴، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۱۳]

ہدایت اور گمراہی کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ چاہیں تو کسی کو موحد بنا دیں، اور نہ چاہیں تو بندہ ساری زندگی شرک ہی کرتا رہے۔ کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی پوری زندگی شرک میں گزر جاتی ہے، آخر عمر میں مکہ میں

آئے تو موحد بن گئے، ساری زندگی قبروں پر سجدہ کرنے میں گزر گئی، اللہ نے عمرہ کرنے کی توفیق دی، حرم میں قرآن سنا، اللہ نے عقیدوں کی اصلاح کر دی۔

جاہل کے گھر میں عالم کی پیدائش:

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ظالم کے گھر میں ایک رحم والا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ایسے بھی ہوتا ہے کہ ایک جاہل کے گھر میں عالم پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ ہمارے زمانے میں لوگ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کی مثال دیتے ہیں۔ حضرت لاہوری رحمہ اللہ سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے، اللہ نے ہدایت دی، مفسر قرآن بنے اور پھر لاکھوں لوگوں کو ان کے ذریعے ہدایت ملی۔

وارث شاہ کا کارنامہ!

وارث شاہ سیدوں کے گھر میں پیدا ہوا، لیکن ہیر رانجھا کی کہانی لکھ کر چلا گیا۔ آج تک دنیا وہی ہیر رانجھا پڑھ رہی ہے۔ ہیر رانجھا کے پڑھنے سے کتنے لوگوں کو ہدایت ملی؟ یا کتنے لوگوں نے حج کر لیا؟ اس کے پڑھنے سے لڑکیوں کو عشق تو ہو سکتا ہے، ہدایت ملنے کی ذرہ برابر بھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح مردوں کے دلوں میں لوگوں کی لڑکیوں کو بھگانے کا شوق پیدا ہو گا اور وہ اس راستے میں تکلیفیں برداشت کریں گے۔

سیدوں کے گھر میں پیدا ہونے والا تو ''ہیر'' لکھے اور سکھوں کے گھر میں پیدا ہونے والا ''تفسیر'' لکھے!!! یہ اللہ کی شان ہے، جس کو چاہیں ہدایت دیں اور جسے چاہیں گمراہ کر دیں۔

قصۂ سامری کی تکمیل:

جو فرشتہ سامری کی پرورش کے لیے آتا تھا، اس کا گھوڑا جہاں قدم رکھتا، اس جگہ فوراً سبزہ نکل آتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس گھوڑے کے پاؤں میں کوئی ایسی برکت ہے کہ جہاں بھی یہ اپنا پاؤں رکھتا ہے وہاں سے سبزہ نکل آتا ہے۔ اس نے وہ مٹی اُٹھا کر اپنے پاس محفوظ کر لی۔ پھر اس مٹی پر کچھ تجربات کیے۔ وہ اس طرح کہ اسے مختلف بے جان چیزوں پر ڈالا تو ان میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔

سامری، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس بدبخت کے دماغ میں ایک دفعہ ایک بات آ گئی۔ اس نے بنی اسرائیل سے کہا: تم لوگوں نے فرعون کی قوم سے جو سونے کے زیورات لیے تھے، وہ سب اکٹھے کرو...... اگرچہ

وہ دشمن کے زیورات ہیں، لیکن تمہارے لیے ان کا استعمال کرنا حلال نہیں...... چنانچہ وہ سارے زیور اکٹھے کر کے لے آئے۔ اس بدبخت نے ان زیورات کو پگھلا کر بیل کی شکل میں ایک چھوٹا سا بچھڑا بنا دیا۔ پھر اس میں وہی مٹی ڈالی تو اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے اور اس سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے گائے کا بچہ آوازیں نکالتا ہے۔ جب ایسی آوازیں آئیں تو ساری قوم حیران ہو گئی کہ سونے کا بچھڑا ہے اور یہ آوازیں نکال رہا ہے، حالانکہ سونا کوئی بولنے والی چیز تو نہیں ہوتی۔ انہوں نے سامری سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: ﴿هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ ۝﴾ [طٰہٰ: ۸۸] اے بنی اسرائیل! یہ تمہارا خدا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا بھی خدا ہے۔ خدا تو یہاں ہمارے پاس ہے اور موسیٰ علیہ السلام کو وہ طور پر ڈھونڈ رہے ہیں۔ ان کو تو پتہ ہی نہیں ہے کہ اصلی خدا یہ ہے۔ لہٰذا تم اس کی عبادت کرو۔ اس کے کہنے پر بہت ساری قوم بچھڑے کے سامنے سجدے میں گر گئی اور اس کی عبادت شروع کر دی۔ یوں اس نے اللہ کی توحید کے بعد دنیا میں شرک کا ایک فتنہ برپا کر دیا۔ [تفسیر الطبری: ۱۸/ ۳۵۵ طٰہٰ: الآیۃ: ۸۸]

انبیاء علیہم السلام کی خصوصی تربیت

آسمانی کتابوں کو نازل کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ پیغمبروں کی خصوصی تربیت کرتے ہیں، جیسا کہ قرآن مقدس کے نازل ہونے سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصی طور پر تربیت کی گئی (یعنی اس کتاب کے لیے تیار کیا گیا)، کیونکہ رب عظیم نے ایک عظیم کتاب بھیجی، جسے ایک عظیم فرشتہ لے کر آیا اور وہ کتاب سب سے بڑی عظمت والے پیغمبر پر اُتاری گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت:

آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے مراحل پر نظر ڈالیں تو بعثت سے قبل کی زندگی سراپا جدوجہد نظر آئے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے تھے، پوری مخلوق حتیٰ کہ اپنے اہل و عیال سے بھی کٹ جاتے تھے اور علیحدہ پہاڑ کی غار میں جا کر صرف خالق و مالک حقیقی کی طرف توجہ کرتے۔ اسی ذکر اور فکر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ابتدائی زندگی گزاری۔

موسیٰ علیہ السلام کی تربیت:

اسی طرح بعینہٖ ہمیں یہ بات اللہ کے قرآن میں ملتی ہے کہ تورات کے نازل ہونے سے پہلے اللہ نے اپنے پیغمبر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت فرمائی۔

اگر آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی پر نظر ڈالیں تو ان کی پوری زندگی اختبارات، امتحانات میں گزرتی نظر آئے گی۔ پیدا ہوتے ہی ایک صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا گیا، پھر اس سے بڑا امتحان کیا ہو سکتا ہے کہ ایک دودھ پینے والا بچہ ہو اور جس کو پیدا ہوئے چوبیس گھنٹے بھی نہ گزرے ہوں اور اسے دریا میں ڈال دیا جائے، اور پھر جب وہ صندوق پکڑا جائے اور کھلے تو دشمن کے گھر۔ اس کے بعد فرعون کے پاس رہنا اور اس کے پاس رہتے ہوئے بچپن کے اندر امتحانات کا آنا اور آپ علیہ السلام کا فرعون کے منہ پر تھپڑ کا مارنا، یہ سب امتحانات ہی تو تھے، جن کے ذریعے ان کی تربیت کی جا رہی تھی۔

اس کے بعد جوانی آئی تو ایک اور امتحان میں مبتلا ہو گئے کہ ایک قبطی ان کے ہاتھوں سے مارا گیا اور فرعون اور اس کا لشکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پکڑ کر قتل کرنے کے درپے ہو گئے۔

اب موسیٰ علیہ السلام مصر سے جا رہے ہیں اور پتہ بھی نہیں ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟ ایک اندازہ تھا کہ میں مدین کی طرف جا رہا ہوں۔ خیال تھا کہ میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہوں اور مدین والوں کا تعلق بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے، شاید اسی وجہ سے وہ مجھے پناہ دے دیں، لیکن راستہ نہیں جانتے تھے۔ اللہ سے دعا کی اور چل پڑے۔

یہ کتنا بڑا امتحان تھا کہ وہ عظیم رسول اور اللہ کا نبی، جس کو اللہ نے فرعون کی قوت وسطوت کو مٹانے کے لیے پیدا فرمایا، وہ ایک نبی کے گھر دس سال بکریاں چرانے کی نوکری کر رہے ہیں!! ایک تو غربت اور وطن سے دوری ہے، اپنے والدین، بہن بھائیوں اور قبائل سے دوری اور دوسری طرف حکومت کا خوف لاحق ہے، ﴿فَأَصْبَحَ فِي الْمَدِينَةِ خَائِفًا يَتَرَقَّبُ......﴾ [القصص:۱۸] ڈر رہے ہیں کہ کیا ہوتا ہے؟ اور پھر ایک دن یا دو دن نہیں، بلکہ دس سال تک متواتر بکریاں چرانے کی ڈیوٹی لگ گئی۔ کتنے بڑے امتحانات سے حضرت موسیٰ علیہ السلام گزر رہے ہیں!!!

جب آدمی پر امتحانات آتے ہیں تو تربیت خود بخود ہوتی ہے، آدمی جب مشقتوں کے اندر پڑتا ہے تو پھر کندن بن کر نکلتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ سونا اس وقت کھرا بنتا ہے جب اس کو آگ میں ڈالا جاتا ہے، ایسے تو کوئی پتہ نہیں کہ پیتل ہے، سونا ہے؟ یا کیا چیز ہے؟ لیکن جب اس کو کٹھالیوں میں ڈالتے ہیں، تیزاب میں ڈالتے ہیں اور آگ پر چڑھاتے ہیں تب جوہری فیصلہ کرتا ہے کہ یہ سونا ہے۔

بعینہٖ اسی طرح انسان کی بھی ایک تربیت ہوتی ہے، انسان بھی کٹھالیوں سے نکلتے ہیں اور مصائب کی بھٹیوں میں انہیں

ڈالا جاتا ہے اور پھر اس سے جو ختم ہو گئے وہ کھوٹے نکلے اور جو صحیح سالم نکلے، وہ خالص سونا (خالص مومن) کہلائے۔

بعض علماء کرام نے کتب سابقہ سے نقل کیا ہے (جن کی صحت کا علم اللہ کو ہے) کہ ذوالقعدہ کا پورا مہینہ اور دس دن ذوالحجہ کے تھے، تب جا کر یہ چالیس راتیں پوری ہوئیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۱، البقرۃ: الآیۃ: ۵۱]

ذوالحجہ کے دس دنوں کے روزوں کی فضیلت:

احادیث میں آتا ہے کہ جو آدمی عرفہ کے دن کا روزہ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ایک سال کے گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۱۱۶۲، بَابُ اسْتِحْبَابِ...وَصَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ...]

ہاں! یہ علیحدہ مسئلہ ہے کہ اگر آپ حج کر رہے ہیں تو افضل یہ ہے کہ آپ روزہ نہ رکھیں۔ لیکن جو لوگ حج پر نہیں ہیں، مکہ میں رہتے ہیں یا جو بے چارے دور دراز شہروں میں رہتے ہیں، حج پر نہیں آسکے تو ان کے لیے دس دنوں کے روزوں کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اور ان ایام کی راتیں بھی بڑی فضیلت والی ہیں۔ چنانچہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ مزدلفہ کی رات لیلۃ القدر کی رات کے برابر ہے۔

یاد رکھیں! جس طرح اللہ نے زمانوں کو فضیلت بخشی ہے، اسی طرح بعض مقامات کو بھی فضیلت بخشی ہے، چنانچہ بیت المقدس میں ایک نماز پڑھیں تو پانچ ہزار نمازوں کے برابر ثواب ہے، مسجد نبوی میں نماز پڑھیں تو پچاس ہزار نماز کے برابر ثواب ہے اور مسجد حرام میں نماز پڑھیں تو ایک لاکھ نماز کے برابر ثواب ہے۔

[جامع الاحادیث، حدیث: ۱۳۵۹۸]

اس لیے علماء نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو موسیٰ علیہ السلام کو چالیس راتوں کے لیے پابند فرمایا تھا وہ بھی ذیقعدہ کا مہینہ اور ذی الحجہ کی دس راتیں تھیں، کیونکہ یہ حج حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام تو بہت بعد میں آئے۔

ہر ہر لفظ حکمت بھرا:

اللہ کے ہر ہر حکم میں اور قرآن کے ایک ایک لفظ میں حکمت ہے، آخر قرآن اللہ کا کلام ہے، اگر اللہ کے کلام میں اَسرار اور حکمتیں نہیں ہوں گی تو اور کس میں ہوں گی؟



دیکھیے! جہاں روزے کا حکم دیا، وہاں فرمایا: ﴿اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ﴾ [البقرۃ:۱۸۴] جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اللہ نے اس کو اجازت دی ہے کہ وہ روزے رمضان کی بجائے بعد میں رکھ لے۔ یعنی ایام (دنوں) کا ذکر فرمایا، کیونکہ روزہ ''دن'' کو ہوتا ہے۔ اسی طرح جب اللہ نے حکم دیا کہ اگر تم حج میں بکری ذبح نہیں کر سکتے تو ﴿فَصِیَامُ ثَلٰثَۃِ اَیَّامٍ فِی الۡحَجِّ وَ سَبۡعَۃٍ اِذَا رَجَعۡتُمۡ ؕ تِلۡکَ عَشَرَۃٌ کَامِلَۃٌ...... الآیۃ﴾ [البقرۃ:۱۹۶] تو دس دنوں کے روزے رکھ لو۔ دیکھیں! یہاں بھی ''ایام'' کا لفظ ذکر فرمایا، کیونکہ روزے دن کے وقت رکھے جاتے ہیں۔ اور یہاں ''دن'' کا ذکر نہیں فرمایا، بلکہ ''رات'' کا ذکر کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَ اِذۡ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰۤی اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَۃً...... الآیۃ﴾ [البقرۃ:۵۱] اور دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰی ثَلٰثِیۡنَ لَیۡلَۃً وَّ اَتۡمَمۡنٰہَا بِعَشۡرٍ فَتَمَّ مِیۡقَاتُ رَبِّہٖۤ اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَۃً﴾ [الاعراف:۱۴۲] دیکھیے! یہاں بھی ''رات'' کا ذکر فرمایا ہے۔

ہاں! بعض لوگوں کے ہاں رات کو بھی روزہ ہوتا ہے، وہ سورج ڈوبنے کے بعد افطار نہیں کرتے، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ بیٹھے رہیں گے، جب تک تارے نہ نکل آئیں۔ یہ لوگ ''تقیہ'' کے پرانے مریض ہیں، وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ قرآن مقدس کا حکم ہے: ﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیۡلِ﴾ [البقرۃ:۱۸۷] پھر روزہ کو پورا کرو رات تک۔ وہ کہتے ہیں کہ اِلٰی، مَعَ کے معنی میں ہے، لہٰذا رات داخل ہوگی تو ہمارا روزہ پورا ہوگا۔

اہلسنت والجماعت نے بھی اسی آیت سے دلیل دیتے ہوئے کہا ہے کہ ''اِلٰی'' بمعنی ''مَعَ'' بھی ہوتا ہے اور ''انتہاء'' کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ اب ہم اس آیت کا ترجمہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے معلوم کریں گے۔

سوچنے کی بات ہے کہ روزہ افطار کرنا کوئی چوری والی بات تو تھی نہیں کہ ایک یا دو آدمیوں کو اس کا پتہ چلا ہوگا اور باقیوں کو نہیں۔ حضور ﷺ مسجد نبوی میں بیٹھے ہیں، پروانے ساتھ بیٹھے ہیں اور حضور اکرم ﷺ افطار کر رہے ہیں، سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ ﷺ نے تارے نکلنے کا انتظار کیا یا مغرب کی اذان ہونے کا؟ نہیں! بلکہ اذان ہوتے ہی میرے نبی پاک ﷺ روزہ افطار کر لیتے تھے۔

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک میری اُمت افطار میں جلدی کرے گی اور سحری میں دیر کرے گی، اس وقت تک خیر پر رہے گی، کامیابی اور بھلائی پر رہے گی۔ یعنی افطار تو سورج ڈوبنے کے فوراً بعد کرے اور سحری کھانے میں دیر کرے، یعنی آخری وقت میں کھائے۔

اس حدیث کو غور سے سمجھیں! ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ افطار میں تاخیر کرنے پر زیادہ ثواب ملتا، مگر حضور اکرم ﷺ

نے فرمایا کہ افطار میں جلدی اور سحری میں دیر کی جائے۔ لیکن جلدی کا معنی یہ بھی نہیں کہ سورج ڈوبنے سے پہلے افطاری کرلیں، بلکہ ''جلدی'' کا معنی یہ ہے کہ جونہی افطار کا وقت شروع ہو، اسی وقت افطاری کرلی جائے۔ کیونکہ اللہ پاک نے ہمیں رات تک روزے کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا جونہی رات شروع ہوگئی تو ہمارے روزے کی انتہاء ہوگئی۔ اور پھر سحری میں دیر کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم انتظار کرتے رہیں کہ ابھی تو اندھیرا ہے، سورج نکلنے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے، لہٰذا کھاتے پیتے رہو۔ نہیں، بلکہ صبح صادق ہوتے ہی سحری بند کردینی چاہیے۔

بندے پر لازم ہے کہ طاقت کا اظہار کرنے کی بجائے اپنی عاجزی کا اظہار کرے اور یوں کہے کہ مولا! اتنی دیر تُو نے کھانے پینے سے باز رہنے کا حکم دیا، میں نے صبر کرلیا، اب اجازت آگئی ہے تو اب میں کیوں صبر کروں؟ میں پانی کا پیاسا ہوں، کھانے کے لیے بھوکا ہوں، میں تو صرف تیرے حکم سے رُکا ہوا تھا۔

اور سحری میں تاخیر کا حکم دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جب بندہ آخری وقت میں پانی پیے گا اور کھانا کھائے گا تو اس کو اتنا فائدہ ہوگا کہ دن میں اس کی قوتیں بحال رہیں گی۔ اگر عشاء کے بعد ہی کوئی بندہ سحری کرکے سوجائے تو دن کے بارہ گھنٹوں کے ساتھ ساتھ رات کے آٹھ گھنٹے بھی اس کے ذمے ہوجائیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ۳۰ دن کا روزہ:

بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ روزہ ایسے نہیں تھا جیسے ہمارے روزے ہوتے ہیں، بلکہ متواتر تیس دنوں اور راتوں کا روزہ تھا۔ اور اللہ کے نبیوں کے لیے یہ کوئی مشکل بھی نہیں ہے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ کئی مرتبہ مسلسل دو دو دن، تین تین دن، چار چار دن کے روزے رکھتے تھے۔

بعض صحابہ نے بھی ایسا روزہ رکھنا شروع کیا تو دوسرے تیسرے دن بیہوش ہوگئے۔ کوئی یہاں گرا ہوا ہے، کوئی وہاں گرا ہوا ہے، کسی پر پانی ڈال رہے ہیں، کسی پر کپڑا ڈال رہے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: کیا ہوگیا؟ عرض کیا: روزہ رکھا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کون ہو تم میرا مقابلہ کرنے والے؟ خدا کے بندو! مجھے تو میرا رب کھلا دیتا ہے، پلا دیتا ہے، اللہ نے اپنے نبیوں کے لیے خصائص رکھے ہوئے ہیں، تم کیسے مقابلہ کرسکتے ہو کہ میں اگر چار دن کا مسلسل روزہ رکھوں تو تم بھی اس طرح رکھنے شروع کردو؟ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ خصوصی طاقت اور خصوصی قوت دیتے ہیں۔

آج بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جو ایمان والے لوگ ہیں، جن کے اندر قوتِ ایمانی موجود ہے، وہ سو سال کے



بوڑھے ہی کیوں نہ ہوں، ان کی تہجد نہیں چھوٹتی۔ دوسری طرف ہمارے ہٹے کٹے نوجوان ہیں جو فرض نماز ہی نہیں پڑھتے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت سے روزانہ چار چار کلو فروٹ کھا تو جائیں گے اور جب ان کو نماز کے لیے کہا جائے تو کہتے ہیں کہ پاؤں میں تکلیف ہے، موچ آ گئی ہے۔ بعض شریف آدمی تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ حضرت! نماز پڑھنے کو تو ہم تیار ہیں، لیکن ہمارے کپڑے خراب ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ عورتوں کی طرح اب ان کے بھی کپڑے خراب ہونے شروع ہو گئے ہیں!! پہلے تو ہم سنتے تھے کہ عورتوں کے کپڑے خراب ہوتے ہیں۔ اب عورتوں کے کپڑے خراب نہیں ہوتے، عورتیں ترقی کر گئی ہیں، اب مردوں کے خراب ہوتے ہیں...... اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ......

تیس راتوں پر مزید دس کیوں بڑھائی گئیں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے تیس دن کا روزہ رکھا، پھر مزید دس دن کا حکم کیوں ہوا؟ بعض علماء فرماتے ہیں کہ روزہ دار کے منہ سے ایک ہوا پیدا ہوتی ہے، اللہ کے ہاں وہ مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ محبوب ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے منہ سے روزہ کی خوشبو آنے لگی تو انہوں نے مسواک کر لیا، اس پر اللہ نے فرمایا: دس دن مزید روزہ رکھو۔ اس کے اندر حکمتیں بھی تھیں، اللہ نے چالیس راتیں پوری کرائی تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے وہاں یہ عبادت کی اور قوم نے پیچھے ایک بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ اللہ نے فرمایا: پھر بھی میری نعمت یاد کرو کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔

یاد رکھیں! منہ سے بدبو آنا دو وجہ سے ہوتا ہے: ایک منہ میں گندگی کی وجہ سے۔ مثلاً ایک بندہ پان کھاتا رہتا ہے، اس نے کبھی اپنے منہ کو صاف نہیں کیا، کبھی مسواک کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ یہ تو بدبو ہے، یہ اللہ کو پسند نہیں ہے، یہ تو اللہ کا عذاب ہے کہ ساتھ کوئی شریف آدمی کھڑا نہیں ہو سکتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب آدمی بھوکا ہوتا ہے تو خالی معدہ کی وجہ سے اندر سے ایک ریح پیدا ہوتی ہے، یہاں وہ مراد ہے۔ منہ سے نکلنے والی بدبو جو اسباب خارجیہ وغیرہ سے ہو، وہ مراد نہیں، کیونکہ بدبو سے تو اسلام نے منع کیا ہے۔ حتیٰ کہ شریعت کہتی ہے کہ پیاز کھا کر مسجد میں نہ آؤ، لہسن کھالو تو مسجد میں نہ آؤ، یعنی جو بھی بدبو والی چیز کھالو تو جب تک منہ اچھی طرح سے صاف نہ کر لو، مسجد میں نہ آؤ۔

پھر میری نعمت یاد کرو کہ میں نے موسیٰ کو کتاب دی، میں نے موسیٰ کو فرقان دی، یعنی جو حق اور باطل کو جدا کرنے

والی ہے، حلال اور حرام کو جدا کرنے والی ہے، سچ اور جھوٹ کو جدا کرنے والی ہے۔ ایسی روشن کتاب عطا کی، تا کہ تم ہدایت پا سکو۔ تو تم میری نعمتیں یاد رکھو۔ کیا ان نعمتوں کا صلہ یہی ہے کہ تم میرے محمد مدنی کی مخالفت کرتے ہو؟ اسی بات کے لیے اللہ نے نعمتوں کا تذکرہ کیا۔

﴿وَإِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ﴾ ''الکتاب'' سے مراد ''تورات'' ہے اور ''الفرقان'' سے مراد حق و باطل اور ہدایت و گمراہی کے درمیان فرق کرنے والی تورات کی صفت ہے۔

یہ واقعہ بھی دریا سے نکلنے اور فرعون سے نجات کے بعد کا ہے، کیونکہ سورۃ الاعراف کا سیاق اسی پر دلالت کرتا ہے کہ ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ [القصص: ۴۳] ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، قرونِ اُولیٰ کو ہلاک کرنے کے بعد۔ جس میں لوگوں کے لیے بصیرتیں، ہدایت اور رحمت ہے۔ اور تورات کا نام ہی فرقان ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ﴿وَإِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۵۳] میں ''واؤ'' زائدہ ہے، لیکن ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول غریب ہے کہ واؤ زائدہ ہے، بلکہ عطفِ (تفسیر) کے لیے ہے۔ لفظ ''الکتاب'' سے مراد ''تورات'' ہے اور ''الفرقان'' سے مراد بھی ''تورات'' ہے۔ اور کبھی ایسے ہوتا ہے کہ ایک چیز پر عطف ہوتا ہے، چیز وہی مراد ہوتی ہے، ان میں تغایر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ شعر کے اندر ہے:

وَ قَدَّمَتُ الْأَدِيْمَ لِرَاقِشِيْهِ
فَأَلْفَى قَوْلَهَا كَذِبًا وَ مَيْنًا

اور اسی طرح شعر ہے:

أَلَا حَبَّذَا هِنْدٌ وَ أَرْضٌ بِهَا هِنْدُ
وَ هِنْدٌ أَتَى مِنْ دُوْنِهَا النَّأْيُ وَ الْبُعْدُ

یہاں پہلے شعر میں ''وَمَيْن'' سے مراد ''کذب'' ہے اور ''نَأْي'' کے معنی ''بعد'' کے آتے ہیں۔ گویا کہ معنی ایک ہے، لیکن آنے والے لفظ ''اَلْبُعْد'' کا عطف اسی پر ہو رہا ہے، جیسے قرآن میں ہے: ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴾ [المائدۃ: ۱۵] چنانچہ یہاں بھی ''نور'' اور ''کتاب'' کا معنی ایک ہی ہے، اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا قرآن ہے۔ شاعر کا قول ہے:

حُيِّيتَ مِنْ طَلَلٍ تَقَادَمَ عَهْدُهُ
أَقْوَىٰ وَ أَقْفَرَ بَعْدَ أُمِّ الْهَيْثَمِ

اس شعر میں بھی ''أقفر'' اور ''أقوی'' دونوں ایک چیز ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۹۱/۱، ۹۲، البقرۃ: الآیۃ: ۵۳]

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾﴾ [البقرۃ: ۵۴]

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے قوم! تم نے بچھڑا بنا کر اپنا نقصان کیا، پس اب اپنے پیدا کرنے والے کی طرف توبہ کرو اور اپنی اپنی جان کو مار ڈالو۔ یہ تمہارے لیے تمہارے خالق کے نزدیک بہتر ہے۔ پھر اس نے تمہاری توبہ کو قبول کیا۔ بے شک وہی معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پہاڑ پر بلا کر کتاب تورات عطا فرمائی۔ پھر موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف لوٹے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کی توبہ قبول کی۔ اس آیت میں یہ واقعہ اختصار کے ساتھ آیا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے دیگر مختلف سورتوں (سورۃ الاعراف، سورۃ البقرۃ) اور ان کے علاوہ قرآن میں مختلف مقامات پر اس قصے کا تفصیلی ذکر فرمایا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام آزمائش میں مبتلا:

موسیٰ علیہ السلام جب دشمن کے امتحان سے نکل گئے تو اپنی قوم کے امتحان میں مبتلا ہو گئے۔ کیونکہ بسا اوقات اپنی قوم ایک ایسے مقام پر لے جاتی ہے کہ وہ داعی کے لیے مصیبت بن جاتے ہیں، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ماننے والوں نے ایک فتنہ کھڑا کر دیا کہ حضرت علی خود خدا ہیں۔ اس سے بڑا فتنہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ بندے کو خدا کہہ دیا جائے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابو طالب کے بیٹے، داماد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، خلیفہ رسول اللہ ہیں، ان کے متعلق یہ کہہ دیا جائے اور عقیدہ بنا لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اندر داخل ہو گئے ہیں...... نعوذ باللہ!......

بنی اسرائیل کی جہالت:

موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ کتنا بڑا امتحان تھا کہ آپ میقات پر بیٹھے ہیں، اللہ کی عبادت میں مشغول ہیں اور قوم نے ایک بچھڑے کو خدا بنالیا ہے، جس کو انسان کھیتوں میں ہل میں جوتتا ہے، کنویں پر رہٹ کے کام لگاتا ہے اور وہ رہٹ پر پھرتا رہتا ہے، جس سے باربرداری کا کام لیا جاتا ہے، جو ایک جانور ہے اور جس میں عقل بھی نہیں۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ ایسی بدبخت قوم ہے کہ انہوں نے بچھڑے کو خدا بنالیا۔ حالانکہ بچھڑے سے تو فرعون بہتر تھا، وہ انسان تو تھا، اس میں عقل تھی، وہ بولتا بھی تھا، انہوں نے ایک انسان (فرعون) کو تو خدا نہیں مانا۔ لیکن جب ایک بیل کھڑا ہو گیا تو اسے خدا بنالیا۔ چھوٹا سا بچھڑا اور وہ بھی سونے کا بنا ہوا...... ! کتنا بڑا امتحان ہے!!

حضرت ہارون علیہ السلام منع کر رہے ہیں، روک رہے ہیں، لیکن کوئی ان کی بات سننے کو تیار نہیں، بلکہ کہنے لگے کہ یہ بچھڑا خدا ہے۔ اس پر بطور دلیل وہ لوگ یہ جواب دیتے تھے کہ اس کے اندر سے آواز آتی ہے۔ حالانکہ یہ کوئی دلیل نہیں۔ وگرنہ پھر تو ٹیپ ریکارڈر کے اندر سے بھی آواز آتی ہے، پھر کوئی اس کو بھی خدا کہہ دے!! کوئی عقل کی بات ہے؟ خدا کے بندو! جو چیز تمہارے ہاتھ سے بنائی جائے، وہ تو مصنوع ہے، پھر مصنوع، صانع کیسے بن گیا؟ اور وہ چیز سونا ہے، اس کو تم نے آگ کے اندر پگھلایا، پھر اس کو مجسم شکل دی ہے۔ کیا خدا بھی آگ کے اندر پگھلتے ہیں؟ ڈھلتے رہتے ہیں؟ بنتے رہتے ہیں؟ اچھا خدا ہے کہ کبھی آگ میں پڑا ہے اور کبھی باہر پڑا ہے، عجیب خدا ہے!!!

موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ سنا ہوگا کہ ان کی محنتوں کا یہ نتیجہ نکلا ہے تو ان کے دل پر کیا گزری ہوگی!؟ قوم کہنے لگی کہ ہمارے لیے بھی ایسا خدا کسی نے دیکھا نہیں۔ یہ چیز کم از کم نظر تو آرہی ہے، محسوس تو ہے، اسے دیکھ رہے ہیں اور ہاتھ لگا رہے ہیں، اس کی آواز سن رہے ہیں، اس کو چھوڑ کر ہم اس کو خدا مانیں جس کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا!! (بس موسیٰ علیہ السلام) کہتے ہیں کہ خدا ہے اور کوئی اس کو دیکھ تو نہیں سکتا۔

توحید کی خاطر جلال کا مظاہرہ:

موسیٰ علیہ السلام کو وہیں کوہِ طور پر اطلاع مل گئی اور موسیٰ علیہ السلام غصہ سے بھرے ہوئے تشریف لائے اور اللہ کی توحید کے لیے اتنے جلال میں آئے کہ آپ نے اپنے بھائی کو بالوں سے پکڑ لیا۔ اللہ نے دوسرے مقام پر اس واقعہ کو بڑا کھول کر بیان کیا ہے۔ اس میں داعی کو سبق ملتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے توحید کے لیے کتنی غیرت کا مظاہرہ کیا کہ اپنے

بھائی کے بال پکڑ لیے!! یہ بھی بھول گئے کہ ہارون (علیہ السلام) بھی اللہ کا نبی ہے اور میں ایک نبی کے بال پکڑ رہا ہوں۔ اتنا بھی نہیں کیا کہ پہلے ان سے رپورٹ (پوچھ گچھ) تو لے لیتے کہ ان کا قصور کیا ہے؟

یہ وہی قوم ہی تو تھی جو موسیٰ علیہ السلام کی اپنی بات بھی نہیں مانتی تھی۔ چنانچہ جب یہی قوم دریا کے کنارے کھڑی تھی، اللہ کے حکم سے دریا میں راستے بن گئے، ان میں سے بعض کہنے لگے کہ پہلے ہم اندر نہیں جاتے، پہلے آپ اندر چلیں اور روشندان بنوائیں، تاکہ ہم ایک دوسرے کو بھی دیکھتے چلے جائیں۔ اگر انہوں نے ہارون علیہ السلام کی بات بھی نہ مانی ہوتی تو اس وقت بھی نہ مانتے۔

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام توحید کی وجہ سے جلال میں آئے ہوئے تھے۔ ہارون علیہ السلام نے عرض کیا: ﴿يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۖ إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَاءِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي ﴿٩٤﴾﴾ [طٰہٰ: ۹۴] حضرت! مہربانی فرمائیں، میرے بال نہ پکڑیں، میری داڑھی مبارک نہ پکڑیں، میرا کیا قصور ہے؟ میں نے ان کو بہت روکا، لیکن نہ مانے تو میں نے مناسب سمجھا کہ یہ آپ کے واپس آنے تک کسی ایک بات پر کھڑے تو رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کے اندر ایسا تفرقہ پیدا ہو جائے کہ آپ کے آنے سے پہلے لڑائیاں شروع ہو جائیں۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام کا جوش ٹھنڈا ہوا۔

سامری سے پوچھ گچھ:

پھر موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو پکڑا اور کہا: بدبخت! تمہیں کیا سوجھی تھی؟ یہ تم نے کیا کر ڈالا ہے؟ اس نے کہا کہ جب فرعون اور اس کی فوج غرق ہوئی تو میں نے دیکھا کہ فرشتے کی سواری جس جگہ قدم رکھتی تھی تو وہ جگہ سرسبز ہو جاتی تھی اور وہاں فوری طور پر زمین سے گھاس اُگ آتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس مٹی میں، اس قدم میں کوئی کمال ضرور ہے۔ چنانچہ میں نے وہ مٹی سنبھال کر رکھ لی اور یہاں میں نے سونے کو اکٹھا کر کے اس کو ایک بچھڑے کی شکل دی، اس کے اندر یہ مٹی ڈالی تو وہ بولنے لگ گیا۔ میں نے کہا کہ یہ تمہارا خدا ہے۔

سامری! اب تیری خیر نہیں!!

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: میں تمہاری بھی خبر لیتا ہوں اور تمہارے اس جھوٹے خدا کی بھی خبر لیتا ہوں...... حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے جلال والے تھے...... فرمایا: اس بچھڑے کو ابھی ہم توڑتے ہیں اور توڑنے کے بعد اس کو جلاتے



ہیں اور پھر اس کی راکھ کو دریا کے اندر بکھیر دیں گے۔ اب تم دیکھو کہ خدا بھی کٹتا، جلتا اور بکھرتا ہے!!! اب قوم کو بھی ہوش آئی کہ وہ تو ہمارے سامنے جل گیا۔ بھلا یہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟

سامری کا انجام:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے کہا کہ تیرے لیے عذاب ہے، میں نے تیرے لیے ایک بددعا کردی ہے، ساری زندگی تُو بھٹکتا رہے گا۔ تُو نے قوم کو توحید کے راستے سے بھٹکایا، تُو نے ان کو صراطِ مستقیم سے ہٹا کر بت پرستی میں ڈالا، اب تیرا انجام یہ ہے کہ تجھے کہیں تمہیں چین نہیں ملے گا اور تُو اپنی زبان سے کہتا رہے گا: ''لَا مِسَاسَ! لَا مِسَاسَ!'' رک جاؤ، میرے قریب کوئی نہ آئے، کوئی مجھے ہاتھ نہ لگائے۔ اللہ نے سامری پر ایک عذاب ڈال دیا کہ اس کو جو ہاتھ لگاتا تھا اس کو فوراً بخار چڑھتا تھا، تکلیف بڑھ جاتی تھی۔ اس لیے وہ چیختا تھا کہ میرے قریب نہ آنا، مجھے ہاتھ نہ لگانا۔

واقعات میں عبرت کا درس:

یاد رکھیں! ان قصوں میں عبرت ہوتی ہے کہ جب خدا چاہتا ہے تو وہ بڑے بڑے جبروت اور بڑے بڑے طاغوت اور بڑے بڑے سامری اور بڑے بڑے بت، ایسے پاش پاش کر دیتا ہے کہ پھر ان کو اپنا وجود دنیا کے اندر بوجھ لگتا ہے۔ اور حق پر قائم رہنے والے اگر شہید ہو جاتے ہیں تو سرفراز ہو جاتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں تو غازی بن جاتے ہیں۔ اللہ کے راستے میں قتل ہونے کے بعد ابھی دفن نہیں ہوتے کہ اللہ ان کو جنتوں کی سیر کرا دیتے ہیں۔

داعی کے لیے سبق:

جب موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو انہوں نے اپنی قوم کو ''یَا قَوْمِ!'' کے الفاظ سے مخاطب کیا۔ اس میں داعی کے لیے ایک سبق ہے کہ جب تم قوم کو دعوت دو تو غصہ اور جلال میں نہ آؤ اور سخت الفاظ نہ کہو۔ دیکھیں! موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کتنا بڑا گناہ کیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر بچھڑے کی پوجا کر رہے تھے، لیکن موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''اے میری قوم!'' ﴿اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ﴾ مؤکد کلام فرمائی کہ تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے۔

اس سے سبق ملتا ہے کہ اگر کوئی بندہ کفر و شرک کرتا ہے تو وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑتا، بلکہ اپنی جان پر ظلم کر رہا ہوتا ہے کہ جہنم میں جلے گا۔ یہ بات یاد رکھیں! اگر ساری دنیا کافر ہو جائے تو اللہ کا کوئی نقصان نہیں اور اگر ساری دنیا کلمہ

پڑھ لے تو اللہ کو کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اللہ تو غنی ہے، ساری دنیا محتاج ہے، ﴿وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ﴾ [محمد:۳۸] غنی کو ہماری کیا ضرورت؟

﴿بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ﴾ (بچھڑے کو بنانے کی وجہ سے کہ اس کو تم نے معبود بنالیا)۔ جو بلید ہے، کند ذہن ہے، معمولی سا شعور رکھتا ہے، عقل سے بھی محروم ہے، جو اپنی طرف سے کچھ کرنے سے بھی قاصر ہے، تم نے اس کو اپنا معبود بنالیا؟ یہ تو پھر بھی سونے کا بچھڑا ہے، اگر دوسرا زندہ بچھڑا ہوتا تو وہ بھی گھاس کا محتاج ہوتا ہے۔ اور جو خود کسی دوسری چیز کا محتاج ہو، وہ کبھی خدا نہیں بن سکتا۔

توبہ کی قبولیت کی منظوری:

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی کہ اے میرے مولا! اب یہ قوم ٹھیک ہوگئی ہے، یہ توبہ کرنے پر تیار ہے، مہربانی فرمائیں۔ اللہ نے فرمایا: موسیٰ! اتنے معجزے، اتنی نعمتیں اور اتنے دلائل دیکھنے کے بعد جس قوم نے یہ ظلم کیا ہے اور پھر بھی وہ توبہ کرنے کے لیے تیار ہے تو اب بھی ہم ان کی توبہ منظور کر لیتے ہیں، لیکن سزا کے بغیر منظور نہیں کرتے۔ اور سزا یہ ہے کہ یہ اپنی جانوں کو ماریں، قتل کریں، پھر ہم توبہ قبول کریں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ اگر واقعی تم صحیح معنوں میں شرمندہ ہو تو شرط یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو، پھر تمہاری توبہ قبول ہوگی۔

توبہ کا طریقہ کار:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ تمہارے ذمہ یہ ہے کہ مجرمین میں سے جو تمہارے سامنے آئے، اس کو مار دو۔ چاہے باپ کے سامنے بیٹا آئے یا بیٹے کے سامنے باپ آئے۔ اس قتل کے بعد تمہاری مغفرت ہو جائے گی، جنت میں بھی جاؤ گے اور تمہاری توبہ بھی منظور ہو جائے گی۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۲، البقرۃ: الآیۃ: ۵۴]

شریعتِ محمدی اور شریعتِ موسوی میں مماثلت:

بعض علماء نے فرمایا کہ جیسے ہماری شریعت میں بھی بعض گناہ ایسے ہیں کہ ان کی توبہ سزا کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔ مثلاً:

❁ ...... ایک آدمی نے قتل عمد کیا اور اب وہ توبہ کرنا چاہے تو اس کے لیے مطلقاً معافی نہیں، بلکہ اس کو مقتول کے ورثاء

کے سپرد کیا جائے گا۔ وہ چاہیں تو اسے قتل کر دیں، چاہیں تو معاف کر دیں اور اگر چاہیں تو دیت لے لیں، پھر جا کر معافی ملے گی۔

❀.....اسی طرح اگر کوئی شادی شدہ مرد یا عورت زنا کرے اور مقدمہ ثابت ہو جائے اور گواہ مل جائیں تو ان کی سزا رجم ہے، پتھر مار مار کر انہیں قتل کیا جائے گا، پھر ان کی توبہ منظور ہوگی۔

علماء فرماتے ہیں کہ ان آیات میں بھی اللہ نے اسی طرح کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ کہ جن لوگوں نے اس بچھڑے کی پوجا نہیں کی، وہ ان لوگوں کو قتل کریں، جنہوں نے اس کی پوجا کی ہے۔

یہود کی دو جماعتیں:

دراصل یہود کی دو جماعتیں بن گئی تھیں: ایک جماعت نے کہا کہ جب تک موسیٰ علیہ السلام واپس نہ آئیں اس وقت تک ہم اس کو خدا نہیں مانتے۔ اور دوسرے وہ تھے جو پوجا کرنے والے تھے۔ چنانچہ پوجا نہ کرنے والوں کو حکم دیا گیا کہ وہ پوجا کرنے والوں کو قتل کریں۔ جب وہ بیٹھ گئے تو ان پر اندھیرا چھا گیا اور انہوں نے اندھیرے میں قتل کرنا شروع کر دیا۔

بنی اسرائیل بڑی عجیب قوم ہے! یہ غلطی کرنے پر آئی تو بچھڑے کو خدا بنا لیا اور ٹھیک ہونے پر آئی تو کہنے لگے: ہم قتل ہونے کے لیے تیار ہیں۔ اسی دن اور انہی واقعات میں بنی اسرائیل کے ستر ہزار آدمی قتل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اندر واقعہ کو اختصار سے نقل کیا ہے۔

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ یہ قتل کرنا تمہارے لیے بہتر ہے، کیونکہ دنیا کی زندگی خدا جانے کتنی باقی ہے؟ پانچ سال ہیں، دس سال ہیں، پچاس سال ہیں، لیکن آگے جو ہمیشہ کا عذاب ہے اس سے چند منٹ قتل کی سزا تمہارے لیے بہتر ہے، بجائے اس کے کہ ابدالآباد جہنم میں پڑے رہو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۲، البقرة: الآیة: ۵۴]

اسلام لانے اور ہجرت سے تمام گناہ معاف:

احادیث مبارکہ میں آیا ہے کہ جب انسان مسلمان ہوتا ہے...... اس کی پوری زندگی چاہے کفر پر کیوں نہ گزری ہو...... تو اس کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ دیکھیں! جب کفر و شرک معاف ہو جاتا ہے تو دوسری چیزیں خود بخود ختم ہو جاتی ہوں گی۔ اسی طرح احادیث مبارکہ میں آیا ہے کہ جب آدمی اللہ کے راستہ (دار الکفر سے نکل

دارالاسلام) کی طرف ہجرت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دیتے ہیں۔[صحیح مسلم، حدیث: ۱۹۲، باب: کَوْنِ الْإِسْلَامِ یَهْدِمُ مَا قَبْلَهُ...]

قوم کی اپنے کیے پر شرمندگی:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے آ کر اس جھوٹے خدا کو توڑا اور وہ ان کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تو قوم والے شرمندہ ہوئے کہ اگر یہ خدا ہوتا تو یہ کیسے ٹوٹ پھوٹ جاتا؟ ہم نے تو بڑی بیوقوفی کی ہے، ہم نے تو بہت بڑی غفلت کی ہے، ہم اللہ کی توحید کو چھوڑ کر اس کو خدا بنانے میں مشغول ہو گئے۔
[روح البیان: ۱/۱۴۰]

﴿بَارِئِكُمْ﴾ کا معنی:

﴿فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ، حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿بَارِئِكُمْ﴾ کا معنی "خَالِقِكُمْ" ہے کہ تم اپنے خالق کی طرف لوٹو۔[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۲]

﴿إِلَىٰ بَارِئِكُمْ﴾ ملانے کی وجہ:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صرف لفظ ﴿فَتُوبُوا﴾ بھی تو بولا جا سکتا تھا، لیکن اللہ نے فرمایا: ﴿فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ﴾ یہاں یہ بتانا مقصود تھا کہ تم بہت بڑا جرم کر چکے ہو، خالق کو چھوڑ کر مخلوق کی عبادت کر رہے ہو، لہٰذا تم اپنے خالق کی طرف لوٹو۔ اس لیے ﴿بَارِئِكُمْ﴾ کا لفظ ساتھ لایا گیا۔[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۲]

قصاصاً قتل کرنا باعث ثواب ہے:

جو کام اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اس میں اللہ پاک سزا نہیں دیتے، ہاں اگر ایک کام بندہ اپنی منشاء سے کرتا ہے تو اس پر سزا دی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو یہ جرم عظیم ہے، لیکن اگر اس قاتل کا مقدمہ عدالت میں چلا جائے اور اس کا ثبوت مل جائے اور قاضیٔ وقت قصاص کا حکم دے تو اس کو قتل کرنے پر بھی ثواب ملے گا۔ اس لیے کہ وہ تو اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کر رہا ہے، اللہ نے حکم دیا ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی کو قتل کرے تو اس کو قصاصاً قتل کیا جائے گا۔



''رجم'' کرنا باعثِ ثواب ہے:

اسی طرح اگر آپ کسی آدمی کو ایک پتھر بھی ماریں تو بہت بڑا گناہ ہے، لیکن اگر زانی اور زانیہ دونوں شادی شدہ ہوں اور جرم ثابت ہو جائے تو قاضی ان کے لیے ''رجم'' کا حکم دے گا کہ ان دونوں کو پتھر مار مار کر ہلاک دیں۔ اس صورت میں رجم کرنے والے گناہ گار نہیں ہوں گے، بلکہ وہ ثواب حاصل کر رہے ہوں گے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے مطابق انہوں نے عمل کیا ہے۔

اب بنی اسرائیل ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں، قاتل تو قتل کر رہا ہے، لیکن قاتل اور مقتول دونوں کو اللہ نے معاف فرما دیا، کیونکہ ان دونوں نے اللہ کے حکم کی اطاعت کی تھی، اللہ کے حکم کی تعمیل کی تھی۔

حکمِ خدا کی تعمیل میں بلا تفریق قتل:

حضرت مجاہد رحمہ اللہ اور حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا: ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ تو وہ خنجر لے کر ایک دوسرے پر چڑھ گئے، پھر کوئی پروا نہیں کر رہا تھا کہ سامنے میرا رشتہ دار ہے، میرا عزیز ہے یا میرا بیٹا ہے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کپڑے سے اشارہ کیا کہ بس کرو، بس کرو۔ جب ان کے اشارے پر بس کی تو تقریباً ستر ہزار بنی اسرائیل قتل ہو چکے تھے۔

مزید قتل کرنے سے منع:

موسیٰ علیہ السلام نے جو اُن کو کپڑے کے ساتھ اشارہ کیا تھا، یہ اپنی طرف سے نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ان کی توبہ قبول کر لی ہے۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے اشارہ کر کے کہا کہ اب قتل کرنا بند کر دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۲]

مقتولین درجۂ شہادت پر فائز:

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کے لیے بڑا سخت حکم آیا کہ ایک دوسرے کو قتل کرو۔ چنانچہ انہوں نے ہاتھوں میں چھرے اور چاقو لے لیے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ جب انہوں نے اللہ کے حکم کی اطاعت کی اور تقریباً ستر ہزار کے قریب قتل ہو گئے تو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی قوم کو روک دو، اس سے آگے قتل نہ کریں، میں نے ان کی توبہ قبول کر لی ہے۔ ان میں سے جو مارے گئے ہیں، ان کو ہم درجۂ شہادت دیتے ہیں اور

جو زندہ ہیں ان کی توبہ ہم نے قبول کر لی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۲]

شہداء کے فضائل و مناقب

شہادت کے وقت تکلیف سے نجات:

احادیث مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ شہید کو جب بندوق، گولہ، تلوار یا کوئی بھی چیز لگتی ہے تو اس کو صرف اتنا درد ہوتا ہے جتنا درد بدن پر چیونٹی کے کاٹنے کا ہوتا ہے۔ یا کوئی بندہ اپنے ہاتھ سے بدن کے کسی حصے کو کاٹے، اتنی سی تکلیف ہوتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کو زیادہ تکلیف سے بچا لیتے ہیں۔

[سنن الترمذي، حديث: ۱۶۶۸، بَابُ: مَا جَاءَ فِي فَضْلِ الْمُرَابِطِ]

جنت میں اپنے مکان کا دیدار:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: شہید ابھی اللہ کے راستے میں شہید ہوتا ہے کہ اس کو اللہ پاک جنت میں اس کا مکان دکھلا دیتے ہیں۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۱۶۶۳، بَابُ: فِي ثَوَابِ الشَّهِيدِ]

عذابِ قبر سے حفاظت اور جنت کے مزے:

اسی طرح حضور پاک ﷺ نے فرمایا: جو اللہ کے راستے میں شہید ہوتا ہے اس کو عذابِ قبر سے بچا لیا جاتا ہے۔

[سنن الترمذي، حديث: ۱۶۶۳، بَابُ: فِي ثَوَابِ الشَّهِيدِ]

شہید کا تو بڑا مرتبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اُرواح مبارکہ کو سبز پرندوں کے اندر بھیج دیتے ہیں اور کبھی قنادیل معلقہ کے اندر بھیج دیتے ہیں اور جنت میں پھرتے ہیں، کھاتے ہیں اور لذتیں اُٹھاتے ہیں۔

[صحيح مسلم، حديث: ۱۸۸۷، بَابُ: بَيَانِ أَنَّ أَرْوَاحَ الشُّهَدَاءِ فِي...]

بہتر (72) حورعین سے شادی:

اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر شہید کی بہتر (۷۲) حورعین سے شادی کر دیں گے، یعنی اس کو خصوصی طور پر ستر حوریں ملیں گی۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۱۶۶۳، بَابُ: فِي ثَوَابِ الشَّهِيدِ]



لفظ ''حُوْر'' کا مفہوم:

حور، حوراء سے اور عین، عیناء سے ہے، یعنی بڑی بڑی آنکھوں والی۔ وہ اس طرح کہ سفیدی بالکل سفید اور سیاہی بالکل سیاہ ہوگی، جس میں آنکھ کا جمال ہے۔ اس میں اگر کوئی اور رنگ پیدا ہو جائے تو پھر وہ جمال باقی نہیں رہتا۔

بنی اسرائیل کے قتل ہونے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا:

حضرت زہری رحمہ اللہ نے روایت کی ہے کہ جب بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ ایک دوسرے کو قتل کرو تو وہ تلواریں لے کر نکلے۔ موسیٰ علیہ السلام بھی ان کے ساتھ تھے۔ ایک دوسرے پر وہ تلواروں اور خنجروں سے حملہ کر رہے تھے اور موسیٰ علیہ السلام ہاتھ اُٹھائے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعائیں مانگ رہے تھے اور جب بنی اسرائیل کو ذرا موقع ملتا تو کہتے: اے اللہ کے نبی! اللہ کو پکارو، اللہ کو پکارو، ہمارے گناہ معاف فرما دے، ہماری خطائیں معاف فرما دے۔ اور آپ کے ہاتھ اُٹھانے میں مدد کرتے، کیونکہ کھڑے کھڑے تھک گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعائیں کیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی توبہ منظور فرمائی۔

لیکن جب واضح ہوا کہ ستر ہزار قتل ہو چکا ہے تو موسیٰ علیہ السلام بھی بڑے غمگین ہوئے۔ جو بنی اسرائیل بچ گئے تھے، ان کو بھی بڑا غم ہوا کہ ایک دو کی بات تو نہیں، ہزاروں آدمی قتل ہو گئے!!! اس وقت اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ غم کیوں کر رہے ہو؟ جو قتل ہو گئے وہ زندہ ہیں، میرا رزق کھا رہے ہیں، ان کو تو مرتبۂ شہادت مل گیا اور جو بچ گئے ہیں ان کی میں نے توبہ قبول کر لی ہے۔ اس طرح سے موسیٰ علیہ السلام بھی خوش ہو گئے اور بنی اسرائیل بھی خوش ہو گئے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۲]

بنی اسرائیل کی صفات:

آپ بنی اسرائیل کے واقعات پڑھیں تو آپ کو ان میں عجیب عجیب باتیں نظر آئیں گی۔ دیکھیے! اگر قربانی دینے پر آئیں تو اپنی جانیں بھی قربان کر دیں کہ ہمیں قتل کرو، تاکہ اللہ راضی ہو جائے۔ اور اگر انکار کرنے اور بے وقوفی کرنے پر آئیں تو ایک بچھڑے کو خدا بنا کر اس کی عبادت شروع کر دیں۔

عناصر اربعہ کی تاثیر:

اصل میں آدم علیہ السلام کی اولاد کو اللہ نے عناصر اربعہ (آگ، پانی، ہوا اور مٹی) سے مرکب فرمایا ہے۔ ان میں

سے ہر ہر عنصر کی اپنی ایک حیثیت ہے، ہر ایک میں اپنی اپنی تاثیر ہے۔ چنانچہ آگ کا کام ''جلانا'' ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آدمی جب غصہ ہو تو اس کے چہرے کا رنگ لال ہو جاتا ہے، ایسے لگتا ہے کہ انگارہ ہو گیا، اور جب آدمی کو کوئی خوشی ملتی ہے تو اس کا چہرہ ایسے کھل جاتا ہے جیسے گلاب کا پھول کھل گیا ہو۔ اگر غم آجائے تو چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر آدمی کسی کام میں شرمندہ ہو تو اس کو پسینہ آجاتا ہے، کیونکہ تمام عناصر اربعہ اختلاط رکھتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ نے ہر بندے کے اندر مختلف قوتیں رکھی ہیں، اس کے اندر قوتِ حیوانیہ بھی ہے اور قوتِ ملکیہ بھی ہے۔ چنانچہ کبھی تو فرشتوں کے قریب ہو جاتا ہے، دن میں روزہ رکھتا ہے اور ساری ساری رات تہجد میں کھڑا رہتا ہے۔ ایسے لوگ جنہوں نے سال کے گیارہ مہینے مسجد میں قدم نہیں رکھا ہوتا، رمضان المبارک کے مہینے میں وہ بھی ساری ساری رات مسجد میں کھڑے عبادت میں مشغول ہوتے ہیں۔ جو لوگ کبھی فرض نہیں پڑھتے، وہ بھی روزہ رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں کہ اس کے بندوں کے اندر قوتیں مختلف ہیں، جب ایک قوت دَب جاتی ہے تو دوسری کا ظہور ہوتا ہے۔ انسان پر اسی کے مطابق حالات سامنے آتے ہیں۔

آپ دیکھیں! جو لوگ اسلام سے پہلے اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے وہ جب اسلام لے آئے تو پھر دوسروں کی لڑکیوں کے سر کو بغیر دوپٹے کے برداشت نہیں کرتے تھے اور دوسروں کی بچیوں کے محافظ بن گئے۔ یتیموں، بیواؤں اور غریب بچیوں کے محافظ بن گئے۔ وجہ کیا تھی کہ اللہ نے ان کے اندر قوتِ ملکیہ غالب کر دی اور قوتِ شہوانیہ دَب گئی۔

بے نمازی پر نماز کا بوجھ:

ایک آدمی نماز نہیں پڑھتا (اللہ معاف فرمائے) آپ اسے نماز پڑھنے کا کہہ کے دیکھیں، اس کے لیے ایک نماز ایسے بن جاتی ہے جیسے کوئی بڑا پہاڑ اس کے سر پر کھڑا کر دیا گیا ہو، وہ مر مر کر مسجد کی طرف آئے گا اور ایسے سمجھے گا کہ جیسے مجھے پھانسی پر چڑھا رہے ہیں، اتنی مشکل سے وہ اُٹھے گا، وضو کرے گا اور آخری صف میں کھڑے ہونے کی کوشش کرے گا، تاکہ سلام کے بعد جلدی بھاگنے کا موقع ملے، اللہ کے گھر میں زیادہ دیر نہ ہو جائے، کہیں میں اللہ کے گھر میں پھنس نہ جاؤں، اس لیے آخری صف میں کھڑا ہوگا، تاکہ امام کے سلام پھیرتے ہی میں بھاگ جاؤں۔

نماز کی فکر:

اس کے برعکس جن لوگوں کو اللہ نے اپنی اطاعت، اپنی عبادت، اپنی نماز اور اپنے دروازوں کے لیے خشوع نصیب

فرمایا ہے وہ ایک نماز پڑھ کر ابھی گھر نہیں پہنچتے کہ ان کو دوسری نماز کی فکر لگ جاتی ہے۔

دیکھیے! بعض بوڑھے آدمی ہوتے ہیں، نماز کے بعد بے چارے پیدل گھر جا رہے ہوتے ہیں۔ کسی کام سے فارغ ہو کر جب گھر پہنچے تو دیکھا کہ ڈیڑھ یا دو بجے کا وقت ہو گیا ہے۔ کھانا کھاتے کھاتے اڑھائی بج گئے، پھر وہ سوچتے ہیں کہ اگر قیلولہ کیا تو نیند آجائے گی اور جماعت کا وقت نکل جائے گا، اس لیے وضو کر کے اللہ کے حرم میں چلے جاتے ہیں۔ ظہر کی نماز پڑھ کر گھر جائیں گے، چائے کی ایک پیالی پی کر تھوڑا سا آرام کریں گے تو پھر ان کو فکر ہو گی کہ عصر کی اذان ہونے والی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر وقت ان کا دل اللہ کے گھر میں اٹکا ہوا ہوتا ہے، یہ لوگ ''قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ'' کا مصداق ہوتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ایمان والے کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ جہاں بیٹھا ہو، اس کا دل اللہ کے کعبے سے، مسجد سے اٹکا ہوتا ہے۔

مومن اور منافق کی مثال:

اسی طرح بعض روایات میں آتا ہے کہ مومن کو مسجد میں ایسے آرام ملتا ہے جیسے مچھلی کو پانی کے اندر۔ مچھلی جب تک پانی کے اندر ہوتی ہے تو کبھی اِدھر جاتی ہے اور کبھی اُدھر جاتی ہے۔ اور اگر اس کو پانی سے باہر نکال دیا جائے تو کچھ ہی دیر میں تڑپ تڑپ کر مر جائے گی، اس لیے کہ پانی کے بغیر اس کی زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ایسی مثال مومن کی ہے جس کا دل مسجد کے بغیر نہ لگے۔ اور منافق کی مثال ایسی ہے جیسے پرندہ پنجرے کے اندر قید ہو اور اس انتظار میں ہو کہ دروازہ کھلے اور میں اُڑ جاؤں۔ [کشف الخفاء، حدیث: ۲۶۸۹]

اب سمجھیں کہ ادھر بنی اسرائیل کی زیادتی کا یہ عالم ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر پہنچے تو انہوں نے ایک بچھڑے کو خدا بنا لیا اور جب اللہ کی فرمانبرداری پر آ گئے تو ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لیے بھی تیار ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے اندر مختلف قوتیں اور مختلف صفات رکھی ہیں، جن کا ظہور مختلف اوقات میں ہوتا رہتا ہے۔

بچھڑے کی پوجا کے متعلق اسرائیلیوں کی آراء:

حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام جب واپس آئے تو آپ کے ساتھ ستر آدمی تھے جو ہارون علیہ السلام کے ساتھ علیحدہ رہے تھے، جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی اور اس کی عبادت کے بارے میں

سوچا بھی نہیں تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۳]

دراصل موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں بعض لوگ ایسے تھے جنہوں نے باقاعدہ عبادت کی، بعض لوگ ایسے تھے جن کے دلوں میں یہ بات آئی کہ ہم بھی عبادت کریں، لیکن انہوں نے اس کی پوجا کی نہیں تھی اور بعض لوگ ایسے تھے جنہوں نے اس بچھڑے کی عبادت بھی نہیں کی اور نہ ہی ان کے دلوں میں اس کا خیال آیا۔ وہ بالکل علیحدہ ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کے سوا کسی غیر کی عبادت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔

رسم و رواج:

رسم و رواج غلط یا صحیح ہو، جب ایک دفعہ قوموں میں چل پڑتا ہے تو چلتا رہتا ہے۔ اس لیے میرے آقا ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی کوئی اچھا رواج ڈالے گا، قیامت تک اللہ اس کو اجر دے گا اور جو آدمی بُرا راستہ پیدا کرے گا، اس پر جو لوگ بھی قیامت تک عمل کریں گے، اس گناہ میں وہ بھی شریک ہو گا۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۱۰۱۷، باب: الحث علی الصدقة...]

بنی اسرائیل نے اس زمانہ میں بچھڑے کی عبادت کی تھی، ہندو قوم آج تک گائے کی پوجا کر رہی ہے۔ اب تو لوگوں نے باقاعدہ گھروں کے اندر گائے کے مجسمے بنا کر رکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں نے اپنے گھروں میں مختلف جانوروں (گائے وغیرہ) کے بچوں کی شکلیں بنائی ہوئی ہیں، کسی نے بڑی گائے کی تصویر لگائی ہوگی، کسی نے ہرن کی کھال کے اندر بھوسا بھروا کر پورا ہرن کھڑا کیا ہوا ہے، کسی نے کتا بنایا ہوا ہے اور وہ گھروں اور گاڑیوں میں ڈیکوریشن پیس کے طور پر سجایا ہوا ہے۔

یہ ایسی بُرائیاں ہیں جو ایک دفعہ چل پڑتی ہیں تو چلتی ہی رہتی ہیں، جب تک کہ اللہ اپنی رحمت سے ان کو ختم نہ کرے۔

کتے کے جھوٹے کا حکم:

بعض جانور تو حلال ہیں، اگر وہ برتن میں منہ مار دیں تو اسے دھونا بھی ضروری نہیں ہوتا، اگر وہ پانی میں منہ مار لیں تو پانی ناپاک نہیں ہوتا، لیکن کتا ایسا نجس ہے کہ اس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس برتن میں کتا منہ مار جائے، اس کو سات دفعہ دھوؤ اور ایک حدیث مبارک میں ہے کہ آٹھویں دفعہ مٹی کے ساتھ مانجھو، یعنی اتنا نجس ہے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۷۹، باب: حکم ولوغ الکلب]

اب جدید تحقیق نے یہ بات واضح کردی ہے کہ کتے کے منہ کے اندر جو جراثیم پائے جاتے ہیں، ان سے بچنے کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ برتن کو ایک بار مٹی سے مانجھ لو، کیونکہ مٹی سے مانجھے بغیر اس کے جراثیم ختم نہیں ہوتے۔
لیکن مسلمانوں نے کتوں کی تمثیلیں بنائی ہوئی ہیں، ان کے مجسمے اور فوٹو بنائے ہوئے ہیں، ان کی صورتیں بنائی ہوئی ہیں اور گھروں میں سجائی ہوئی ہیں...... نعوذ باللہ!...... اب اس پر ماسوائے ''اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ'' کے آدمی اور کیا کہہ سکتا ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو ہدایت دے اور ایسے فتنوں سے بچائے۔
حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کی روایت میں ہے کہ جب بنی اسرائیل ایک دوسرے کو قتل کررہے تھے تو ان کے اوپر ایک دھند چھا گئی، اندھیرا سا ہو گیا، اس کو ''سحاب'' کہتے ہیں۔ یہ اندھیرے میں ایک دوسرے کو ہاتھ لگا کر ڈھونڈتے اور اسے قتل کرتے، یعنی نظر نہیں آرہا تھا کہ کون ہے؟ ایسا بھی ہوتا تھا کہ بندے کے سامنے اس کا باپ آگیا، بھائی آگیا، بیٹا آگیا، لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ کون ہے؟ اس کو بھی قتل کرتے جارہے تھے، اور ایک دوسرے کو کہتے جارہے تھے کہ اللہ رحمت کرے اس بندے پر جس نے اللہ کے حکم پر صبر کیا اور اپنی جان دے دی، تاکہ اللہ کی رضا حاصل کرے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۳]

﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۵۵، ۵۶]

اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم تیرا ہرگز یقین نہ کریں گے جب تک کہ اللہ کو سامنے نہ دیکھ لیں، پھر تمہیں بجلی نے پکڑا اور تم دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے تمہیں تمہارے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کردیا، تاکہ تم احسان مانو۔

خدا سے ہمکلامی اور آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ:

ان تمام آیات کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب موسیٰ علیہ السلام تورات لے کر آئے۔ اس وقت بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ کہنے لگے کہ یہ تورات اللہ کی کتاب ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے بعثت سے پہلے بھی آپ کو ہمکلامی کا شرف بخشا...... جب موسیٰ علیہ السلام مدین سے مصر کی

طرف تشریف لا رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے کسی فرشتے کے واسطے کے بغیر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام فرمایا تھا...... اور اب بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلایا، چالیس راتوں کی ایک طویل مدت آپ اللہ کی عبادت میں مشغول رہے اور اللہ سے آپ کی کلام ہوئی اور کتاب کا انعام ملا تو ہمیں بھی اللہ کا کلام سنوائیں، تا کہ ہم بھی اپنے اللہ کا کلام سنیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے درخواست کی کہ یارب! آپ جانتے ہیں، آپ کے آگے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے، میری قوم میں یہ تمنا پیدا ہوگئی ہے، اگر آپ مہربانی فرمائیں تو آپ کے لیے کوئی بعید نہیں۔ جیسے آپ مجھ سے ہمکلام ہو سکتے ہیں، مجھے اپنا کلام سنا سکتے ہیں ایسے ہی ان کو بھی سنا سکتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے آپ کی درخواست منظور کی ہے، آپ اپنی قوم کے کچھ لوگ جو زیادہ علم، زیادہ سمجھ والے ہیں ان کو چنیں اور ان میں سے ستر آدمیوں کا ایک وفد لے کر پھر اسی مقام پر حاضر ہوں۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو چن لیا، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَاخْتَارَ مُوْسٰي قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا﴾ [الاعراف:۱۵۵] (اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمی منتخب کیے، تا کہ انہیں ہمارے طے کیے ہوئے وقت پر (کوہِ طور) لائیں)۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۳]

فرقِ مراتب:

اُمورِ مہمہ ہر آدمی سرانجام نہیں دے سکتا، بلکہ ان کے لیے افراد چنے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جتنی مخلوق پیدا فرمائی ہے ان کے اندر ہر لحاظ سے تفاوت رکھا ہے۔ مخلوق میں سے سب سے اعلیٰ مرتبہ اللہ کے انبیاء اور رسولوں کا ہے، پھر ان میں بھی مرتبے کا فرق رکھا ہے: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ﴾ [البقرة: ۲۵۳]
جب انبیاء اور رُسل میں تفاضل ہے تو اسی طرح دیگر لوگوں میں بھی تفاوت ہے۔

نظامِ قدرت:

اسی طرح قوتوں کے اندر بھی تفاوت ہے۔ آپ سو آدمیوں کو کھڑا کریں تو ان میں سے ہر ایک آدمی کی قوت میں فرق ہوگا۔ اللہ نے انسانوں کی دماغی قوتوں میں بھی فرق رکھا ہے، اسی طرح فکری، علمی اور جسمانی قوتوں میں بھی فرق رکھا ہے۔ یہ میرے اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے، یہ کسی بندے کا بنایا ہوا نظام نہیں ہے۔ یہ نظامِ قدرت ہے، اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بدل سکتی۔



حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خصوصیت:

میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں کتنے اہم واقعات پیش آئے۔ پندرہ سو کا لشکر حدیبیہ میں موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تو نہیں فرمایا کہ پندرہ سو میں سے کوئی چلا جائے، بلکہ باقاعدہ مشورہ ہوا کہ قریش مکہ سے بات کرنے کے لیے کس کو بھیجا جائے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مبارک یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جا کر بات کریں، حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا کر فرمایا کہ مکہ والوں نے ہمیں روک دیا ہے، آپ جا کر بات کریں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! میں تو حاضر ہوں، میں تو غلام ہوں۔ آپ مجھے قریش مکہ سے بات کرنے کا حکم دے رہے ہیں، اس سے بڑا کوئی سخت حکم دیں تو بھی میں حاضر ہوں، لیکن بات یہ ہے کہ میرے جانے سے معاملہ حل نہیں ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ کفار کو تو میرے نام سے جلن ہوتی ہے، کفار قریش میرا نام برداشت نہیں کر سکیں گے۔ میں اگر آپ کا پیامبر اور سفیر بن کر جاؤں تو وہ مجھے دیکھتے ہی جل جائیں گے، پھر میرے ساتھ بات کرنے پر وہ کیسے آمادہ ہوں گے؟ اس طرح مذاکرات کامیاب نہیں ہو سکیں گے؟ میرا مشورہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں موزوں حضرت عثمان ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تمام کبار صحابہ موجود تھے، لیکن ان میں سے کسی کا نام نہیں لیا۔

اس وقت کے حالات یہ تھے کہ مسلمان عین جنگ کے دہانہ پر کھڑے ہوئے تھے، کفار قریش بھی اپنی عصبیت و جاہلیت کے اندر آئے ہوئے تھے، بدر میں جو کچھ ان کے ساتھ ہوا، وہ اسے بھولے نہیں تھے، اس کے بعد وہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ اللہ کے نبی آئیں اور عمرہ کریں؟ اس وقت ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو معتدل مزاج ہو، جس کا حکم بھی مانا جاتا ہو، حوصلہ والا بھی ہو، اور ایسا بندہ ہو جس کا قریش مکہ پر احسان بھی ہو، اس کی عظمت ان کے دلوں میں ہو اور ایسے بندے صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے، اس لیے ان کا انتخاب کیا گیا۔

اللہ پاک نے ہر کام میں ہمیشہ درجات رکھے ہیں اور ہر کام کے لیے اللہ نے آدمی معین فرمائے ہیں۔ یہ اللہ کا ایک نظام ہے جو ابتدائے آفرینش سے چلا آرہا ہے اور قیامت تک چلتا رہے گا، دنیا کی کوئی طاقت اس میں ردّ و بدل نہیں کر سکتی۔ یہ بات طے ہے کہ ہر آدمی ہر کام نہیں کر سکتا۔ علم کا کام علم والوں کے ذمہ ہے اور کھیتی باڑی کسانوں کے ذمہ ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک آدمی آپ کا بادشاہ بنے اور وہی ہل بھی چلائے گا۔ ہاں! دنیا میں

کچھ دنوں کے لیے دکھلاوا ہوتا ہے، شعبدہ بازیاں ہوتی ہیں، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔
اسی لیے اللہ کے ساتھ ہمکلامی کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو چنا۔

شوریٰ یا جمہوریت؟

اسی چناؤ یا شوریٰ کو آج کل ہمارے لوگوں نے جمہوریت کا رنگ دے دیا ہے۔ فرق عام لوگوں کا اور اسلام کا یہ ہے کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ جب چننا ہے تو چننے والی اتھارٹی اس کام کے لیے سب سے زیادہ اہل ہو، پھر اسے چناؤ کا اختیار دیا جائے۔ یہ نہیں کہ عام آدمی جو چناؤ کی اہلیت ہی نہیں رکھتا، اس کو چناؤ کا اختیار دے دیا جائے۔ مثال کے طور پر آپ نے ایک شخص کو مدرسے میں استاد رکھنا ہے تو آپ تعلیمی بورڈ سے معلومات لیں گے کہ یہ بندہ استاد بننے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کو لے کر چل پڑے اور میقات پر پہنچے۔ جب اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام فرمایا تو انہوں نے بھی وہ کلام سن لیا۔ موسیٰ علیہ السلام بڑے خوش ہوئے کہ اللہ نے میری درخواست پوری کر دی، اب قوم کا ایمان مزید بڑھ جائے گا، کیونکہ انہوں نے میرے ساتھ آ کر خود اللہ کا کلام سن لیا ہے۔ لیکن خدا کی قدرت دیکھیں کہ قوم پھر ایک ضد میں اَڑ گئی۔ کہنے لگی کہ ہم نے کلام تو سنا ہے، لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ یہ کلام اللہ نے کیا ہے یا کسی اور نے کیا ہے۔ ہم اس وقت تک ایمان نہیں لے آئیں گے جب تک ہم اللہ کو دیکھ نہ لیں اور وہ ہمارے سامنے بیٹھ کر بات نہ کرے۔

چونکہ یہ گستاخی تھی کہ مخلوق اپنے خالق کے بارے میں اتنی جرأت سے مطالبے کرتی رہے، اس لیے یہ مطالبہ کرتے ہی ان پر ایک کڑک، بجلی سی آئی، صاعقہ گرا اور ستر کے ستر آدمی مر گئے۔

موسیٰ علیہ السلام نے پھر گڑگڑانا شروع کر دیا کہ اے رب کریم! آپ تو میری قوم حالات کو جانتے ہیں، واقعی انہوں نے زیادتی کی ہے۔ یہ تو مر گئے ہیں، یہ سارے ان کے سردار تھے۔ اب اگر میں اکیلا واپس جاؤں گا تو وہ کہیں گے کہ میں نے خود ان کو مار ڈالا ہے، وہ مجھ پر الزام لگائیں گے، کیونکہ قوم ایسی ہی ہے۔ جیسا کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات کے بارے میں قوم کو پتہ نہیں تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو دفنا دیا تو کچھ دن گزرنے کے بعد قوم کھڑی ہو گئی اور کہنا شروع کر دیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو خود مارا ہے۔

اُمت محمدیہ اور سابقہ اقوام کے احوال میں مماثلت

آج جب ہم سابقہ اقوام کے احوال پڑھتے ہیں اور پھر روز مرّہ کے واقعات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ایسے لگتا ہے جیسے وہی کیفیت پیدا ہوئی ہوئی ہے۔

بارش کیوں برستی ہے؟

چنانچہ ایک دفعہ بارش ہوئی تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: آج کتنے لوگ ہیں جو اس کے بعد کفر میں بڑھ جائیں گے اور کتنے لوگ ہیں جو ایمان میں بڑھ جائیں گے۔ صحابہ حیران ہوئے اور عرض کیا کہ کیا مطلب؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ کہیں گے کہ بارش اس لیے برسی ہے کہ اب یہ فلاں مہینہ گزر گیا ہے، اب فلاں ستارہ فلاں برج میں آگیا ہے۔ یہ لوگ اس بارش کو ستاروں اور سیاروں تک محدود کریں گے، اس طرح وہ کفر میں بڑھتے چلے جائیں گے۔ اور کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو کہیں گے کہ بارش اللہ کی قدرت سے ہوئی ہے تو وہ ایمان میں بڑھ جائیں گے۔

[صحيح البخاري، حديث: ۸۴۶، باب: يَسْتَقْبِلُ الإِمَامُ النَّاسَ إِذَا سَلَّمَ]

کفر کی عینک:

بارش تو دونوں نے دیکھی ہے، لیکن ایک کی آنکھوں پر کفر کی عینک لگی ہوئی ہے، اس لیے وہ کفر میں بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ مون سون ہوائیں چلتی ہیں، بادل بنتے ہیں اور پھر جب ثقل بڑھتا ہے تو شدتِ حرارت پیدا ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں بادلوں سے بارش برستی ہے۔

مسبب الاسباب پر نظر:

خدا کے بندے! چلو ہم نے تمہاری سائنس کو مان لیا، لیکن یہ تو بتاؤ کہ ان مون سون ہواؤں کو چلانے والا کون ہے؟ گرمی بڑھانے والی طاقت کون سی ہے؟ جب یہ سب کچھ کرنے والا اللہ ہے تو سیدھی بات کرو کہ اللہ کی رحمت سے بارش ہوتی ہے۔ اگر آپ اسباب کی دنیا میں کھو جائیں گے تو ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ مومن اور کافر میں یہی تو فرق ہے کہ کافر ظاہری اسباب میں کھو جاتا ہے اور مومن کی نظر مسبب الاسباب پر لگی ہوتی ہے۔

گوہ کا سوراخ:

میرے آقا ﷺ نے فرمایا تھا کہ اے میری اُمت! پہلی اُمتیں جو گزر چکی ہیں جو جو حرکتیں انہوں نے کی ہیں میری اُمت بھی وہ کام کرے گی، حتیٰ کہ اگر وہ گوہ کے بل میں گھس گئی تھیں تو میری قوم بھی گوہ کے بل میں گھسے گی۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۳۴۵۶، باب: ما ذُکِرَ عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ]

آج آپ دنیا کے احوال پر نظر ڈالیں تو وہی منظر آپ کے سامنے آجائے گا جس کی منظر کشی حضور ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے کی تھی۔

قومِ لوط اور دیگر اقوام کے جرائم سے مماثلت:

❁......پہلی قوموں میں زنا عام تھا، آج زنا عام ہے۔

❁......قومِ لوط میں لواطت کا فعل (مرد کا مرد سے بُرائی کرنا) عام تھا، آج بھی یہ فعل عام ہے۔

❁......قومِ لوط کی یہ عادت تھی کہ وہ یہ بُرائی ایک دوسرے کے سامنے اور ایک مجلس میں کرتے تھے، ایک کمرے میں سب یہ بے حیائی کا فعل سرانجام دیتے تھے، آج بھی ایسے ہو رہا ہے۔

❁......قومِ لوط کے نوجوان لڑکوں میں یہ عادت تھی کہ وہ ایسا لباس پہنتے تھے کہ دور سے لڑکیاں نظر آئیں، یعنی ایسا لباس جو عورتوں کا ہوتا ہے، لڑکیوں کی طرح بال رکھتے تھے، انہی کی طرح سرخیاں لگاتے تھے، ناخنوں پر رنگ کرتے تھے اور اسی انداز میں چلتے تھے۔ آج بھی یہ سارے کام ہو رہے ہیں۔

❁......لوط علیہ السلام کی قوم کے لڑکوں میں یہ عادت بھی تھی کہ انگلیوں پر مہندی لگاتے تھے، چنانچہ آج بھی مرد اپنے ہاتھوں پر مہندی لگاتے ہیں۔

❁......قومِ لوط کے اندر یہ عادت تھی کہ وہ سڑکوں پر بیٹھ جاتے تھے، ایک پیالہ کنکریوں کا بھر کر رکھ لیتے تھے، کوئی آدمی جو بیچارا مسافر گزر رہا ہوتا، وہ اگر نوجوان ہوتا تو ہر آدمی کنکری لے کر پھینکتا تھا، جس آدمی کی کنکری اس کو لگ جاتی تھی تو وہ آدمی اس کے حصے میں آجاتا تھا، یہ (کنکری پھینکنے والا) اس کو پکڑ کر گھر لے جاتا اور اس سے بُرائی کرتا۔ آج ہمارے معاشرے کے آوارہ لوگ سڑکوں پر بیٹھ کر شریفوں کو چھیڑتے ہیں۔

❁......اسی طرح قومِ لوط میں یہ عادت تھی کہ جب کوئی لڑکا گزرتا تو اس کے پیچھے سیٹیاں مارتے تھے۔ اور آج یہ

ہو رہا ہے۔

❁.....اسی طرح ان میں یہ عادت تھی کہ اپنے پیٹ کی ہوا نکالنے کے لیے مقابلہ کرتے تھے کہ تم آواز زیادہ پیدا کرتے ہو یا میں؟ اور آج یہ بُرائی بھی موجود ہے۔

❁.....پہلی اُمتوں کے لوگ اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے زنا کرتے تھے، آج ایسے واقعات ہو رہے ہیں۔

❁.....اسی طرح پہلی اُمتوں میں اپنی ساس سے یعنی اپنی بیوی کی ماں سے زنا کیا جاتا تھا، آج مسلمانوں کے اندر بھی یہ مرض پایا جاتا ہے۔ یہاں تو پہلے ساس سے تعلق بنتا ہے پھر وہ اپنی لڑکی کا رشتہ کرواتی ہے۔

ان کے علاوہ ایک دوسرے پر قتل اور دیگر جھوٹے الزامات عائد کرنا، جھوٹی تہمتیں لگانا، یہ بالکل وہی واقعات سامنے آرہے ہیں کہ اگر آپ آنکھیں بند کر کے دیکھیں تو کبھی قومِ لوط سامنے آئے گی اور کبھی موسیٰ علیہ السلام کی قوم سامنے نظر آئے گی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے پکڑنے والوں سے تیس، پینتیس درہم رشوت لی تھی۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ پیسے لے کر اللہ کے نبی کو پکڑوانا چاہا۔ یہ تو علیحدہ بات ہے کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو اُٹھا لیا اور پکڑوانے والے کی شکل حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسی کر دی۔

عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

میں ایک کتاب میں واقعہ پڑھ رہا تھا۔ ہمارے ایک بزرگ حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں، آپ ''امرتسر'' کے علاقے میں تھے تو ایک مسجد میں نماز پڑھانے کے لیے تشریف لے جاتے۔ اس علاقے کا معزز اور مشہور قسم کا آدمی راستے میں کھڑا ہوتا اور بڑے ادب سے حضرت شاہ جی کو سلام کرتا، حضرت شاہ جی اس کے پاس سے گزر جاتے، لیکن نہ تو اس کے سلام کا جواب دیتے اور نہ ہی انہوں نے کبھی اس کی طرف دیکھا۔ اور ایسا ہر جمعہ کو ہوتا تھا، وہ بھی ہر جمعہ کو آ کر اس راستے پہ کھڑا ہو جاتا جہاں سے حضرت شاہ جی نے گزرنا ہوتا تھا۔ بڑے ادب سے سلام کرتا..... جیسے ہند کے لوگوں کی تہذیب ہے..... ممکن ہے یہ بزرگ دل ہی دل میں سلام کا جواب دیتے ہوں، اس کا جاننے والا تو اللہ ہے۔

ایک دن جب واپس آئے تو شاہ جی کو ساتھیوں نے پکڑ لیا کہ حضرت! ناراضگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، وہ اس علاقے کا معزز آدمی ہے، ''سر'' کا خطاب یافتہ ہے اور علاقے کی اہم ترین شخصیات میں سے ہے، اس کے اخلاق

کا یہ عالم ہے کہ وہ اتنی بے عزتی کے بعد بھی کھڑے ہو کر آپ کو سلام کرتا ہے، مگر آپ جواب بھی نہیں دیتے اور اس کی طرف دیکھتے بھی نہیں ہیں کہ انسان ہے یا جانور ہے؟ آخر آپ کو کیا غصہ ہے؟ حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں بتانا تو نہیں چاہتا تھا، لیکن آپ لوگوں نے مجھے مجبور کر دیا ہے تو سنو:

جب انگریزوں کے خلاف تحریک چل رہی تھی تو اس دور میں انگریز کا کوئی بڑا افسر یا کوئی کلکٹر تھا، اس کا نوجوان لڑکا کسی نے موقع پا کر مار ڈالا اور قاتل چھپ گیا۔ انگریزوں کے اقتدار کا زمانہ تھا، انہوں نے پورے علاقے میں آگ لگا دی، لیکن ان کو قاتل نہ مل سکا۔ اس علاقے کے بڑے بڑے لوگ جو انگریزوں کے خیر خواہ اور ان کے پروردہ تھے، انہوں نے کہا کہ اوپر سے ہماری زبردست انکوائریاں ہو رہی ہیں کہ تمہیں ایک قاتل نہیں ملتا۔ اتنے دنوں میں قاتل ہمیں ہر شکل میں ملنا چاہیے اور جو قاتل کو ڈھونڈ کر دے گا، اسے ہم انعام دیں گے اور خطاب دیں گے۔

یہ بدبخت جو مجھے سلام کر رہا ہوتا ہے، اس کے علاقے کی ایک بوڑھی عورت تھی، اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ یہ بدبخت اس کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ تم اپنے بیٹے کو راضی کر لو کہ وہ قتل کا اقرار کر لے...... اس کا مقصد یہ تھا کہ میں انگریزوں کے ہاں سرخرو ہو جاؤں گا اور جاگیریں حاصل کروں گا...... میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ دو مہینوں کے اندر اندر تمہارے بیٹے کو چھڑا دوں گا۔ بس صرف ظاہری طور پر اقرار کر لے اور گرفتاری دے دے۔ پھر جب آگ ٹھنڈی ہو جائے گی تو میں تمہارے بیٹے کو بچا لوں گا۔ ویسے وہ تمہارے بیٹے کا نام لے رہے ہیں، اگر انہوں نے خود پکڑ لیا تو تم کیا کرو گی؟ یہ اس نے جھوٹا پروگرام بنایا۔ وہ غریب عورت بیچاری بیوہ بھی تھی، اس نے سوچا کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے، اگر انگریز اس کو پکڑ کر لے گئے تو میں کیا کر سکوں گی؟ یہ جو قرآن پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کر رہا ہے کہ میرے بیٹے کو رہا کروا دے گا، بہتر ہے کہ اس کی بات مان لوں۔

چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کو سمجھایا، بیٹا مان گیا۔ اس نے جا کر اس بیٹے کی مخبری کر دی۔ انگریزوں نے اس لڑکے کو پکڑا تو اس نے قتل کا اقرار کر لیا۔ اس آدمی کو القاب اور جاگیریں مل گئیں اور عدالت میں لڑکے پر مقدمہ چل پڑا۔ بڑھیا روزانہ اس کے دروازے پر آتی، دھکے کھاتی، لیکن یہ اس کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ اندر سے جواب ملتا کہ اتنی فرصت نہیں ہے، آج باہر گئے ہوئے ہیں، آج دورے پر گئے ہوئے ہیں، آج اندر میٹنگ ہو رہی ہے، آج بڑے آدمی آئے ہوئے ہیں۔ مہینوں کے بعد جب کبھی ملاقات ہوتی تو کہہ دیتا کہ تم فکر نہ کرو، تمہارے بیٹے کو سزا نہیں ہو گی۔ حضرت شاہ جی فرمانے لگے کہ بالآخر اس لڑکے کو پھانسی ہوئی اور اس کی لاش اس کی

ماں کو ملی۔اس بدبخت کو میں سلام کا جواب کیوں دوں؟

آپ اندازہ کریں کہ اس نے انگریزوں سے القاب اور جاگیروں کے حصول کے لیے کیسے پرفریب طریقے سے لڑکے پر قتل کا الزام لگوایا؟

موسیٰ علیہ السلام پر ہارون علیہ السلام کے قتل کا الزام:

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الزام لگایا کہ تم نے اپنے بھائی کو قتل کیا ہے۔حضرت ہارون علیہ السلام بھی اللہ کے نبی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔خدا کے بندو! حضرت ہارون علیہ السلام ان کے بھائی ہیں اور نبی ہیں۔میں نے تو اللہ سے مانگ مانگ کر بھائی ہارون لیا ہے اور اللہ سے عرض کیا کہ فرعون کے مقابلہ میں مجھے اکیلا نہ بھیجیں، میرا بھائی مجھ سے زیادہ زبان میں فصاحت والا ہے، بلاغت والا ہے۔تو کیا میں اپنے بھائی کو قتل کر سکتا ہوں؟ لیکن انہوں نے کہا کہ آپ نے قتل کیا ہے، آپ نے اکیلے ان کو کیوں دفن کیا ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر الزام:

اسی طرح بعض لوگوں نے یہ مسئلہ بھی گھڑا ہوا ہے کہ بی بی فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کا جنازہ رات کے وقت ہوا۔وہ بھی کہتے ہیں کہ مسئلہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دروازہ گرایا تھا اور اہل بیت پر صحابہ نے......نعوذ باللہ!......اتنا ظلم کیا ہوا تھا کہ ڈر کے مارے ان کو رات کے وقت دفن کیا گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ پر الزام:

ان لوگوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اور خارجیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر الزام لگایا کہ انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خود مارا تھا، اسی لیے تو رات کو ہی دفن کر دیا، کسی کو کانوں کان خبر نہیں لگنے دی۔چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسری شادی کرنا چاہتے تھے اور بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہوتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا تھا کہ شادی نہ کرنا، اس لیے ان کو مار دیا۔

یہ دونوں جھوٹے ہیں۔نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بی بی پر کوئی ظلم کیا اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اہل بیت پر کوئی ظلم کیا۔

وہ تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصیت تھی کہ میرا جنازہ رات کو پڑھیں اور رات ہی میں مجھے دفن کریں، تاکہ دن میں میرا جنازہ کوئی نہ دیکھ سکے۔میں چاہتی ہوں کہ میری میت پر بھی کسی کی نظر نہ پڑے، میں



پردے کے ساتھ اللہ کے ہاں چلی جاؤں۔ وہ تو ایک عظمت کی بات تھی، لیکن دشمن تو ایسے مواقع ضائع نہیں کرتا۔

موسیٰ علیہ السلام کی جان خلاصی:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے درخواست کی: اے اللہ! مجھے ہارون کے قتل کے الزام سے بچائیں۔ اللہ نے فرمایا: قوم کو ان کی قبر پر لے آؤ اور وہاں ان کو کھڑا کرو۔ موسیٰ علیہ السلام قوم کو لے کر ہارون علیہ السلام کی قبر پر آئے، ہارون علیہ السلام کو دوبارہ زندہ کیا گیا، وہ قبر سے اُٹھے اور انہوں نے کہا: بدبختو! مجھے کسی نے نہیں مارا، میں تو اپنی موت مرا ہوں۔ تم یہ کیا جھوٹ الزام میرے بھائی پر لگا رہے ہو؟ تب جا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جان چھوٹی۔

خدا کو دیکھنے کا مطالبہ کرنے والوں کا انجام:

جب بنی اسرائیل کے ستر آدمیوں کو "صاعقہ" نے پکڑا اور وہ مر گئے تو موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: پروردگارِ عالم! آپ نے ان کو مار دیا، ہلاک کر دیا، میری قوم کو تو آپ جانتے ہیں، میں انہیں کیا جواب دوں گا؟

ایک جگہ یوں آتا ہے کہ وہ ستر آدمی مرنے کے قریب ہو گئے۔ لیکن صحیح احادیث اور آیاتِ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ وہ مر گئے۔

بعض حضرات نے جو لکھا ہے کہ ان کو سکتہ ہو گیا تھا...... سکتہ ایک بیماری ہوتی ہے، اس میں بندے کی جسمانی حرکات اور نبض بند ہو جاتی ہے، سانس رُک جاتی ہے، چند لمحات کے لیے وہ کیفیات طاری ہوتی ہیں، ایسے لگتا ہے کہ آدمی مر گیا ہے...... وہ حضرات دلیل دیتے ہیں کہ قرآن میں آتا ہے: ﴿قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ﴾ [الاعراف:۱۵۵] اگر آپ چاہیں تو ان کو ہلاک کر دیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہلاک نہیں ہوئے تھے، بلکہ جب ان پر صاعقہ (بجلی) کی کڑک آئی تو وہ ڈر کے مارے سکتے کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔

یہ بات غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مر گئے تھے۔ کیونکہ قرآن جب اپنی تفسیر خود بیان کر دے تو پھر ایسی باتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ قرآن تو خود کہہ رہا ہے: ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ [البقرۃ:۵۶] قرآن کے اندر لفظ "موت" موجود ہے اور یہ لفظ قرآن میں جہاں بھی استعمال ہوا ہے تو وہاں حقیقی موت مراد ہے۔ جیسے: ﴿كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ [الروم:۵۰] دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ [البقرۃ:۲۵۹] یہاں ﴿مِائَةَ عَامٍ﴾

سے مراد سو سال تک ''حقیقی موت'' ہے۔

جبکہ اصحابِ کہف کے بارے میں ''موت'' کا لفظ نہیں آیا، بلکہ فرمایا: ﴿فَضَرَبْنَا عَلٰٓي اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا﴾ [الکہف:۱۱] ہم نے ان کے کانوں پر پردہ دے دیا اتنی مدت کے لیے، تا کہ کوئی آواز نہ جائے۔ جب آواز ہی نہ جائے تو وہ پریشان نہیں ہوں گے، نیند میں رہیں گے، آرام سے رہیں گے، ہم نے ان پر نیند مسلط کر دی، اور وہ نیند بھی تین سو نو سال کی تھی۔

اس لیے وہاں خود وضاحت فرما دی: ﴿وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۭ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا﴾ [الکہف:۱۸] کیونکہ زندہ آدمی جب سو رہا ہو تو ایک طرف سوتے سوتے جگہ بھی گرم ہو جاتی ہے، بدن بھی گرم ہو جاتا ہے، گرمی کی وجہ سے وہ اُٹھ سکتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے ان کے حالات کے مطابق ان کا انتظام کر دیا کہ کبھی دائیں لٹا دیتے اور کبھی بائیں لٹا دیتے۔ کیونکہ وہ زندہ ہیں، مردہ نہیں ہے۔ اور جہاں ''موت'' کا لفظ ہے وہاں مراد بھی ''موت'' ہی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ [الزمر:۳۰] اے میرے نبی! آپ پر بھی موت آئے گی اور ان سب پر بھی موت آئے گی، یہ حقیقت ہے جو کبھی ٹل نہیں سکتی۔

اس لیے یہاں بھی اللہ نے فرمایا کہ جب ہم نے ان ستر آدمیوں کو موت دی اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

ان ستر افراد نے رؤیتِ باری تعالیٰ کا سوال کیا، یہی سوال موسیٰ علیہ السلام نے بھی کیا تھا، موسیٰ علیہ السلام کو تو کوئی سزا نہیں ملی، پھر ان کو سزا کیوں ملی؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا سوال ادب اور محبت کے پیشِ نظر تھا، ان کو قلبی اشتیاق تھا کہ اللہ نے جیسے مجھ کو کلیم اللہ بنایا ہے، میرے ساتھ کلام فرمایا ہے، اسی طرح مجھے اپنا دیدار بھی کرا دے۔ جبکہ بنی اسرائیل کا یہ سوال گستاخی پر مبنی تھا، چنانچہ انہوں نے تو شرط لگائی تھی کہ ہم آپ پر اس وقت تک ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا ہمارے سامنے نہ ہو۔ گویا کہ انہوں نے سوال کر کے اللہ کے نبی کو جھوٹا سمجھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اعتبار نہ کیا۔ اس وجہ سے ان کو سزا ملی۔

جیسا کہ کفارِ مکہ نے کہا تھا: ہم ایمان نہیں لائیں گے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ فرشتہ بھیجیں، وہ ہمارے سامنے آسمان سے اُترے اور اس کے ہاتھ میں ہمارے نام کا پرچہ لکھا ہوا ہو کہ فلاں بن فلاں! ہم تم کو حکم دیتے ہیں کہ میرے نبی پر ایمان لے آؤ، یا پھر خدا ہمارے سامنے آکر بات کرے۔ یہ ضد، عناد، بے ادبی اور اللہ کے نبی کی مخالفت تھی، اس لیے اللہ کا غضب آ گیا۔ اگر ان کے اندر ادب ہوتا تو وہ یہ کہتے: اے موسیٰ! اللہ نے اتنا کرم فرمایا کہ ہمیں اپنا کلام سنا دیا، اب مہربانی کریں اور اللہ سے دعا کریں کہ اللہ ہمیں دیدار بھی کرا دے۔ تو ان کو یہ سزا نہ ملتی۔

دنیا میں دیدارِ خداوندی ممکن نہیں:

رؤیت باری تعالیٰ آخرت میں حق ہے، لیکن دنیا کے اندر کوئی آنکھ اللہ کو نہیں دیکھ سکتی، کیونکہ انسانی آنکھ فانی چیز ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات باقی ہے، فنا ہونے والی چیز باقی رہنے والی چیز کا مشاہدہ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کو اس دنیا میں نہ اللہ کے ولی دیکھ سکتے ہیں، نہ اللہ کے نبی دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی اللہ کے رسول دیکھ سکتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ﴾ [الشوریٰ:٥١] کسی بندے کو یہ طاقت نہیں کہ میرے ساتھ بغیر حجاب کے کلام کر سکے، بلکہ کلام تو ہوتا ہے تب بھی حجاب ہوتے ہیں یا میں وحی بھیجتا ہوں۔

حقیقی رؤیت:

آخرت میں چونکہ اللہ تعالیٰ ایسی حیات دیں گے کہ جس کے بعد کوئی فنا نہیں، اس زندگی میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو یہ طاقت دیں گے کہ وہ اپنے پروردگار کی زیارت کر سکیں گے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: قیامت والے دن تمہیں رؤیت باری تعالیٰ نصیب ہوگی اور ایسی رؤیت نصیب ہوگی جیسے چودھویں کے چاند کو دیکھنے میں کوئی شک نہیں ہوتا، تم بھی حقیقتاً اپنے رب کو دیکھو گے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٧٤٣٦، باب قول الله تعالى: وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ...]

درجات کے لحاظ سے رؤیت:

آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ مومنین کو یہ رؤیت نصیب فرمائیں گے۔ وہاں مومنین کے مختلف درجات ہوں گے۔ چنانچہ بعض لوگوں کو ہر جمعہ زیارت نصیب ہوگی، بعض کو روزانہ زیارت نصیب ہوگی، بعض لوگوں کو صبح وشام

اللہ کی زیارت نصیب ہوگی اور بعض پر تو یہ پابندی بھی نہیں ہوگی، وہ جب چاہیں گے اپنے اللہ کو دیکھ سکیں گے۔

لیلۃ المعراج میں رؤیت ہوئی یا نہیں؟

حضور اکرم ﷺ کی اللہ تعالیٰ کی زیارت کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم میں دو جماعتیں تھیں۔ بعض صحابہ اس کے قائل ہیں کہ معراج کی رات حضور اکرم ﷺ کو رؤیت نصیب ہوئی ہے۔ جو قائل ہیں وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ معراج میں آسمانوں پر زیارت ہوئی، دنیا کے اندر نہیں ہوئی۔ اور بعض صحابہ اس کے بھی قائل نہیں، وہ کہتے ہیں کہ زیارت ہی نہیں ہوئی۔ کیونکہ جب ہم نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا کہ آپ نے اپنے رب کو دیکھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ایک ایسا نور ہے، کس کی طاقت ہے کہ اس نور کو دیکھ سکے؟

[صحیح مسلم، رقم: ۲۹۱، باب: في قوله عليه السلام: نور أنى أراه]

بہر حال اس کے اندر دو قول ہیں۔ اور جس مسئلہ میں صحابہ کی دو جماعتیں ہو جائیں تو آدمی کی جدھر بھی رائے ہو جائے، وہ الحمد للہ! بچ جاتا ہے، یعنی اس پر اللہ کی طرف سے کسی قسم کی خطا شمار نہیں ہوگی۔ باقی رہی خواب میں زیارت...... تو وہ نیک لوگوں کو بھی ہو جاتی ہے جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ اور دیگر اولیاء اللہ کو حاصل ہوئی۔ (انور)

﴿جَهْرَةً﴾ کی تفسیر:

﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ [البقرة: ۵۵] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿جَهْرَةً﴾ کا معنی ہے: ''عَلَانِيَةً'' یعنی سرعام، کھلم کھلا۔ بنی اسرائیل کا مطالبہ تھا کہ خداوند قدوس بالکل ہمارے سامنے آ کر اپنا دیدار کرائیں اور فرمائیں کہ میں کلام کر رہا ہوں، پھر ہم ایمان لائیں گے اور مانیں گے۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿جَهْرَةً﴾ کا معنی ''عَيَانًا'' ہے کہ بالکل آنکھوں کے سامنے ہوں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۳]

﴿اَلصّٰعِقَةُ﴾ کی تفسیر:

مروان بن الحکم بھی جب منبر مکہ پر خطبہ بیان کر رہے تھے تو انہوں نے ﴿اَلصّٰعِقَةُ﴾ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''صاعقہ'' سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے آسمانوں سے ایک ایسی آواز سنی اور شدتِ آواز کی وجہ سے وہ مر گئے۔

اُمم سابقہ کی ہلاکت کیسے ہوئی؟

اگر آپ قرآن مقدس کا مطالعہ کریں اور تمام اُمم کے احوال اور واقعات پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ اقوام کو کن کن طریقوں سے ہلاک کیا ہے۔ جیسے قومِ عاد ہے، قومِ ثمود ہے، قومِ فرعون ہے، قومِ نوح ہے، یہ سب پیغمبروں کی قومیں ہیں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْبِهِ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۖ وَمِنْهُم مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۖ وَمِنْهُم مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ ۖ وَمِنْهُم مَّنْ أَغْرَقْنَا﴾ [العنکبوت: ۴۰] ہم نے ان سب کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا۔ چنانچہ بعض کو تو ہم نے آسمانوں سے پتھر برسا کر ہلاک کیا، بعض کو اللہ نے اس طرح ہلاک کیا کہ جبرائیل علیہ السلام کو اللہ نے حکم دیا، انہوں نے آ کر ایک زبردست آواز (چیخ) نکالی، وہ اتنی شدید تھی کہ ان کے کانوں کے پردے پھٹ گئے اور وہ مر گئے۔ اللہ نے بعض قوموں کو زمین میں دھنسا دیا، جیسے قارون کو خسف کیا گیا، بعض قوموں کو اللہ نے غرق کیا، جیسے فرعون اور قبطی، جو موسیٰ علیہ السلام کے دشمن تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو پانی میں غرق کر دیا۔

انسان کے چار مادوں کا ثبوت:

اگر آدمی ذرا غور کرے تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے جو انسان بنایا ہے، اس کے اندر بھی عناصر اربعہ پائے جاتے ہیں: چنانچہ اس کے اندر ہوا بھی ہے، پانی بھی ہے، مٹی بھی ہے اور آگ بھی ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ انسان عناصر اربعہ سے مرکب ہے، یعنی چار عناصر کو اللہ نے انسان کے اندر جزوِ اعظم بنایا ہے، ورنہ انسان تو بظاہر نطفہ سے پیدا ہوتا ہے، لیکن وہ ان عناصر اربعہ کا مرکب بھی ہے۔ دیکھیے:

...... کبھی انسان کے ناک سے پانی بہہ رہا ہے، کبھی آنکھ سے پانی بہہ رہا ہے اور آنسو بہہ رہے ہیں، یہ پانی کا مادہ اس کے اندر موجود ہے۔

...... اور اللہ نے انسان کے اندر ہوا رکھی ہے کہ آدمی سانس لیتا ہے، پھونک مارتا ہے تو ہوائیں پیدا ہو رہی ہیں۔

...... اسی طرح آپ نے دیکھا ہوگا کہ انسان کے بدن کے اندر مٹی ہے، انسان جب غسل کرنے کے لیے حمام میں بیٹھتا ہے تو گرمی کی شدت کی وجہ سے اس کے جسم سے پسینے نکلتے ہیں، جس کی وجہ سے مسام کھل جاتے ہیں اور اس کا میل باہر آ جاتا ہے۔ اس قسم کے حمام میں آدمی غسل کرے تو اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ میں واقعی مٹی کا بنا ہوا ہوں،



کیونکہ تولے کے تولے آپ کے بدن کی مٹی کے بھر بھر کر نکلتے ہیں۔

آج کے اس جدید دور میں جو غسل خانے ہوتے ہیں، ان پر بھی ''حمام'' کا لفظ بولا جاتا ہے، حالانکہ یہ ''حمام'' نہیں ہوتے۔ اصل میں حمام، حمیم سے ہے، اس کا مطلب ہوتا ہے: گرم۔ چنانچہ قرآن مجید میں کفار کے بارے میں آتا ہے کہ قیامت کے دن ان کے لیے کوئی ہمدرد نہیں ہوگا اور ان کو آگ میں ڈالا جائے گا اور جہنم کا جلتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔ اسی طرح جہاں جہاں حمیم کا لفظ آئے گا تو اس کے اندر گرمی کا معنیٰ پایا جائے گا۔

اصل میں پہلے زمانے میں حمام بناتے وقت مکان کو اس طریقہ سے بند کر دیا جاتا تھا کہ اندر کی ہوا باہر نہ جائے اور باہر کی ہوا اندر نہ آئے، پھر ان کی دیواروں میں ہلکی ہلکی گرمی پیدا کی جاتی تھی۔ دیواروں کے اندر انگیٹھیاں بنائی ہوتی تھیں، ان کے اندر آگ جلا کے دیواروں کو گرم کیا جاتا تھا۔ اب تو دنیا ترقی کر گئی ہے، پائپ لائن آ گئی، اس کے اندر گرم پانی سرکولیٹ کر لیا جاتا ہے۔

......آگ بھی انسان کے اندر موجود ہے جس کی حرارت سے انسان کا وجود گرم رکھا جاتا ہے۔

دیکھیے! اللہ نے جن چیزوں کو انسان کی بقاء کا سبب بنایا تھا، جب اللہ نے عذاب دینا چاہا تو انہی چیزوں کو انسان کی ہلاکت کا ذریعہ بنا کر بتا دیا کہ جن چیزوں کو میں تمہاری بقاء کا ذریعہ بنایا تھا، میں اس بات پر قادر ہوں کہ انہی چیزوں سے تم کو ہلاک و برباد کر دوں۔ چنانچہ کسی کو پانی کے عذاب میں غرق کر دیا، کسی کے لیے آگ برسا دی، کسی کے لیے پتھر برسا دیئے، کسی کے لیے اللہ نے چیخ بھیج دی، اور کسی کے لیے بجلی کی کڑک آ گئی۔ اللہ تعالیٰ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ (عناصر اربعہ) میری مخلوقات ہیں، چاہوں تو ہوا سے تمہاری زندگی کا کام لوں اور چاہوں تو اس سے تمہاری بربادی کا کام لے لوں۔ چاہوں تو بارشیں بھیج کر تمہاری مردہ زمینوں کو زندہ کر دوں اور اگر میں چاہوں تو بارشیں بھیج کر اور طوفان بنا کر تمہاری فصلوں کو برباد کر دوں۔ یہ ساری چیزیں اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، وہ جو چاہیں کریں اور جو چاہیں وہ حکم دیں: ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۗ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الاعراف: ۵۴]

﴿الصّٰعِقَةُ﴾ کی ایک اور تفسیر:

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿الصّٰعِقَةُ﴾ کا معنیٰ ''آگ'' ہے۔ یعنی ان کے اوپر بجلی گری۔ ﴿وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ﴾ یعنی ایک مر رہا ہے اور دوسرا دیکھ رہا ہے۔ پھر جو مردہ تھے، اللہ پاک نے ان کو زندہ کر دیا اور جو بے ہوش

تھے، وہ ہوش میں آ گئے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۳]

ستر آدمیوں کو مختلف کیفیات کے ساتھ زندہ کیا:

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ ان ستر آدمیوں نے بھی اس بچھڑے کی عبادت کی تھی، اس لیے ان پر بھی موت واقع ہو گئی۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا منظور فرمائی اور ان کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ جب زندہ ہونے لگے تو اللہ نے ان کو زندہ ہونے کی کیفیتیں بھی دکھلا دیں، چنانچہ وہ ایک دوسرے کو زندہ ہوتے وقت دیکھ رہے تھے، تاکہ ان کو بعث بعد الموت کا مسئلہ سمجھ میں آ جائے۔ اس لیے فرمایا: ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۵۶]

ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے جو ان کو موت دی تھی، وہ سزا کے طور پر تھی۔ یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ جن جن لوگوں نے بچھڑے کی عبادت کی ہے، ان کو قتل ہونا چاہیے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ظاہر نہیں ہوئے تھے، لیکن ان کے دل میں بھی بچھڑے کی عبادت کی تمنا تھی، اللہ نے ان کو بھی موت کی سزا دے دی اور اس کے بعد اللہ پاک نے ان کو معاف کر دیا اور ان کو دوبارہ زندہ کیا، تاکہ وہ اپنی مدتِ حیات پوری کر لیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۳]

سامعِ کلامِ خداوندی کی حالت:

محمد بن اسحاق نے روایت کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو وطور پر چالیس دن کا چلہ پورا کرنے کے بعد واپس تشریف لائے تو قوم کو دیکھا کہ ایک بچھڑے کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں، آپ نے اپنے بھائی سے بھی اور سامری سے (جیسا کہ مذکور ہوا) جو فرمایا سو فرمایا۔ جیسا کہ دوسری آیات کے اندر مذکور ہے کہ اپنے بھائی پر بھی غصہ نکالا اور سامری پر بھی غصہ نکالا۔ اس کے بعد جب فارغ ہوئے تو آپ نے بچھڑے کو جلا کر ذرّہ ذرّہ کر دیا اور دریا کے اندر بکھیر دیا۔

اب موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ستر آدمیوں کو چنا جو بہتر تھے اور ان سے فرمایا: اللہ کے پاس چلو اور جو کچھ تم نے کیا ہے، اس سے توبہ کرو۔ اور جو تمہاری باقی برادری کے لوگ ہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ اور انہیں روزہ رکھنے اور اپنے کپڑوں اور بدن کو پاک کرنے کا حکم دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ان ستر آدمیوں کو لے کر طور سیناء کی طرف چلے...... یہ وہ وقت تھا کہ جس وقت کے بارے میں

اللہ نے ان کو حکم دیا تھا، ورنہ موسیٰ علیہ السلام وہاں بغیر اذنِ الٰہی کے نہیں جاتے تھے۔ جب وہ ستر آدمی اس کام کے لیے نکلے جس کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے ان کو حکم دیا تھا تو انہوں نے کہا: اے موسیٰ! اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ ہم اپنے رب کا کلام سنیں۔ فرمایا: اچھا! میں سوال کرتا ہوں۔

جب موسیٰ علیہ السلام طور سیناء پہاڑ کے قریب آئے تو نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اوپر بادل آ گیا اور اس نے سارے پہاڑ کو اپنے سایہ میں لے لیا اور موسیٰ علیہ السلام قریب ہو گئے۔ وہ لوگ بھی اس بادل کے اندر داخل ہو گئے۔ آپ نے اپنی قوم سے فرمایا: اے میری قوم کے ستر آدمیو! تم بھی قریب آتے جاؤ، قریب آتے جاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جب اللہ تعالیٰ کلام فرماتے تھے تو ان کی پیشانی پر ایک ایسا نور، ایسی روشنی ظاہر ہوتی تھی کہ کوئی اس نور کی طرف دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ یہ اللہ کے کلام کا اثر ہوتا تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۳]

کلام خداوندی کی تاثیر:

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ اللہ کا کلام پڑھتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے چہروں پر اس کا اثر ظاہر کر دیتے ہیں، ان کے چہروں کو بھی قرآن کی برکت سے منور فرما دیتے ہیں۔

دنیا میں کتنے سیاہ فام ہوتے ہیں، کتنے ملکوں کے لوگ بالکل سیاہ ہوتے ہیں، لیکن جب وہ صحیح معنوں میں عبادت کرتے ہیں تو ان کے چہرے پُرکشش بن جاتے ہیں، بندے کا دل کرتا ہے کہ اس سے بات کرے۔ جب آدمی ان کے پاس جاتا ہے، ان کی زیارت کرتا ہے، ان کی صحبت میں بیٹھتا ہے اور ان کی باتیں سنتا ہے تو اسے دلی سکون حاصل ہوتا ہے، ان کی مجلس میں بیٹھنے سے اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ تو صدیوں بعد اللہ کا کلام پڑھنے والوں کا حال ہے اور جس کو اللہ نے اپنا کلام خود نصیب فرما دیا ہو تو اس کا کیا عالم ہوگا!!

اس کے برخلاف کافر لوگ کتنے گورے ہوتے ہیں، حتیٰ کہ سفید رنگ کی وجہ سے ان کا لقب بھی ''گورا'' پڑ گیا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کو دیکھو تو ایسے لگتا ہے جیسے ان پر اللہ کی لعنت اور پھٹکار برس رہی ہو، یا ایسے معلوم ہوگا جیسا کہ کسی بندر کا چہرہ ہو، ان کے چہروں میں کوئی کشش اور جاذبیت نہیں ہوتی۔

عبدالہادی دینپوری رحمہ اللہ کے چہرے کی بشاشت:

ہمارے ایک بزرگ اور شیخ تھے حضرت عبدالہادی دین پوری رحمہ اللہ۔ بڑے ہی عابد اور زاہد تھے، اَلْحَمْدُلِلّٰہِ ثُمَّ

الحمدُللہ! انہوں نے ساری زندگی عقیدۂ توحید اور اتباعِ سنت پر گزاری۔ ہر ہر قدم اور ہر ہر بات میں اتباعِ سنت کا خیال رکھتے تھے۔

اتباعِ سنت کا یہ عالم تھا کہ ساری زندگی کچے کمرے میں گزار دی۔ ہزاروں ساتھیوں اور ہزاروں آدمیوں نے کہا کہ آپ کے لیے پکا مکان بنا دیتے ہیں؟ فرمایا: جب فقیر کا گزارا اسی میں ہو جاتا ہے تو پکے مکان بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ جب میرے آقا ﷺ پکے مکان میں نہیں رہے تو میں کیوں رہوں؟ چنانچہ کوئی ساتھی دری لے آتا اور کوئی قالین لے آتا۔ آپ بس گھاس منگوا کر نیچے بچھوا دیتے تھے، یہی ان کا قالین اور بستر تھا اور یہی ان کا مصلّٰی تھا۔

بیماری اتنی تھی کہ دو آدمی چار پائی کے اوپر اُٹھا کر لے آتے تھے اور اس کو صف میں رکھوا دیتے تھے کہ نماز باجماعت پڑھ سکیں۔ ان کو یہ گوارا نہیں تھا کہ میں نماز علیحدہ پڑھوں۔ اس قدر بڑھاپے کی حالت میں موت سے کچھ عرصہ قبل صرف ایک پیالی کے برابر دودھ، چائے اور بسکٹ کے برابر سوکھی روٹی کا ٹکڑا، یہ غذا رہ گئی تھی۔ اس کے باوجود جب چہرے پر نظر ڈالی جاتی تو ایسے لگتا تھا جیسے کسی نوجوان معصوم بچے کا چہرہ ہے، اور چہرے کی بشاشت کو دیکھتے ہوئے محسوس بھی نہیں ہوتا تھا کہ انہیں کوئی بیماری اور تکلیف ہے، یا ان کو کوئی غم اور حزن لاحق ہے۔ حالانکہ دنیا کی ساری بیماریاں ان کو لگی ہوئی تھیں۔

ذکر اللہ کی لذت!!

جب آدمی اللہ کا ذکر کرتا ہے تو اس کی ایک لذت اور ایک روشنی ہوتی ہے۔ ذکر کا ایک مقام ہے جو باتوں سے نہیں سمجھایا جا سکتا۔ مثال کے طور پر میں اگر آپ کو سمجھانا چاہوں کہ یہ پانی بہت میٹھا ہے اور اس کا ذائقہ بہت عمدہ ہے، سبحان اللہ، ماشاء اللہ! اس کی خوشبو بڑی عجیب ہے۔ جب تک آپ چکھیں گے نہیں، آپ کو ذرا سی بھی لذت حاصل نہیں ہوگی۔ اور اگر آپ صرف ایک گھونٹ پی لیں تو ساری لذتوں کا ادراک ہو جائے گا۔

بعض عرب لوگوں کے گھروں سے پانی پیا جائے تو...... سبحان اللہ!...... طبیعت فرحت میں آجاتی ہے۔ کیونکہ وہ لوگ پرانے زمانے کی مٹی کی صراحیوں کو پہلے عود اور لوبان کا دھواں دیتے ہیں، وہ دھواں اس کے اندر چلا جاتا ہے، پھر اس کو رکھ دیتے ہیں، تاکہ دھویں کے اثرات ختم ہو جائیں، پھر اس میں پانی ڈالتے ہیں تو قدرتی طور پر اس میں ایک ذائقہ بنتا ہے، ایک لطیف خوشبو پیدا ہوتی ہے۔ ہر آدمی تو ایسے نہیں کر سکتا۔ یہ تو ان کو پتہ ہے کہ کتنا ہم نے دھواں دینا ہے۔ اگر ہم کریں گے تو کبھی زیادہ دھواں دے بیٹھیں گے، جس سے پانی کا ذائقہ کڑوا محسوس ہوگا اور کبھی

ذائقہ کم ہو جائے گا۔

اسی طرح اللہ کے ذکر کی لذت اللہ والوں سے پوچھیں، کبھی ان کی صحبت میں بیٹھ کر اللہ کا ذکر کریں، پھر پتہ چلے گا کہ اللہ کے ذکر کی کیا برکات ہیں؟ اس کے کیا ثمرات ہیں؟ اور کیا کیا لذات ہیں؟

ذکر کی کثرت کا حکم:

دیکھیں! نماز پانچ وقت فرض ہے اور روزہ سارے سال میں ایک مہینہ فرض ہے، لیکن جب اللہ کے ذکر کے بارے میں حکم آیا تو فرمایا: ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا﴾ [الاحزاب: ۴۱] کہ ایمان والو! اگر میرا ذکر کرنا ہے تو بہت ذکر کرو۔ فرمایا: کھڑے ہو تو میرا ذکر کرو، بیٹھے ہو تو میرا ذکر کرو، نیز فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [آل عمران: ۱۹۱] جو میرے بندے ہیں وہ کھڑے ہیں تو ان کی زبان پر میرا ذکر ہے، رکوع میں ہیں تو میرا ذکر ہے، سجدے میں ہیں تو میرا ذکر ہے، بیٹھے ہوئے ہیں تو میرا ذکر ہے۔ اگر کبھی لیٹتے ہیں اور آسمانوں پر نظر پڑتی ہے تو میری قدرت کے اندر غور و فکر کرتے ہیں۔

بہر حال جب لذت آتی ہے تو اللہ ایک نور پیدا کرتے ہیں: ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ [الفتح: ۲۹] کثرتِ عبادت کی وجہ سے اللہ ان کے چہروں پر ایک نورانیت پیدا کرتے ہیں، پھر ہر آدمی کا دل ان کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ چاہے آدمی ان سے واقف نہ بھی ہو، جانتا نہ بھی ہو کہ کون ہے؟ لیکن طبیعت کرے گی کہ میں اس کے ساتھ ملوں۔

میاں مسعود احمد کا واقعہ:

جن بزرگوں کا میں نے ماقبل میں ذکر کیا، ان کے پوتے ہیں، ''میاں مسعود احمد صاحب'' ان کا نام ہے۔ بالکل نوجوان ہیں...... اللہ ان کو اور زیادہ خدمتِ دین کی توفیق دے...... ہمارے ساتھ ان کے بھائیوں جیسے تعلقات ہیں۔ بچپن میں دادا کی صحبت میں رہے اور انہی سے تربیت حاصل کی۔ ایک مرتبہ حج کے سفر میں تھے تو مدینہ منورہ میں تشریف لائے، نہایت ہی سادہ لباس میں تھے، دیہاتی انداز میں چادر باندھی ہوئی تھی، اوپر کرتہ اور سر پر کپڑے کی ٹوپی تھی۔ لوگوں نے کہا کہ آپ شلوار پہن لیں۔ انہوں نے کہا: شلوار، حضور ﷺ کو بھی پسند تھی، لیکن

آپ ﷺ نے ساری زندگی چادر ہی باندھی ہے، اس لیے میں بھی چادر ہی باندھوں گا۔

انہی کا واقعہ ہے کہ انہوں نے نماز پڑھی تو جو امامِ حرم تھے، نہ وہ ان کو جانتے تھے اور نہ یہ ان کو جانتے ہیں۔ جب نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو وہ سیدھے ان کے پاس آئے اور کہا کہ آپ میرے لیے دعا کریں۔ انہوں نے کہا: حضرت! آپ حرم شریف کے امام ہیں، اتنے بڑے بزرگ ہیں، اللہ نے آپ کو مصلّٰی رسول پر کھڑا کیا ہے، یہ کوئی چھوٹا مرتبہ تو نہیں ہے، پھر بھی آپ مجھ سے دعا کروا رہے ہیں!!...... کوئی آدمی اگر کعبۃ اللہ کے اندر مصلّٰی پر کھڑا ہو یا مدینۃ الرسول میں مصلے پر کھڑا ہو تو یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کے فیصلے ہیں۔ اللہ جن کو چاہے ان کو چن کر امام بنا دے اور جنہیں چاہے آنے بھی نہ دے۔ یہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کے فیصلے ہیں...... خیر امام صاحب نے کہا کہ حضرت! دعا کریں۔ انہوں نے کہا: میں آپ کے پاس چل کر آیا ہوں، اب تو آپ میرے لیے دعا کریں۔ اور جب آپ میرے پاس آئیں گے تو میں بھی آپ کے لیے دعا کروں گا۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ امام صاحب کی ان سے کوئی جان پہچان نہیں تھی، یہ تو پہلی دفعہ حج پر آئے تھے۔ بیچارے عربی زبان بھی نہیں بول سکتے تھے۔ ویسے الحمدللہ! عالم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان وقتوں میں ہمارے علاقوں میں علم پڑھایا جاتا تھا، بولنا نہیں سکھایا جاتا تھا، یعنی لغت پر زور نہیں دیا جاتا تھا۔ ہمارے بزرگ کہتے تھے کہ ان کو عربی پوری پڑھا دو، لیکن ان کو بولنا نہ سکھاؤ۔ اگر یہ عربی بولنا سیکھ گئے تو کمانے کے لیے سب عرب ممالک میں بھاگ جائیں گے، پھر یہاں دین کون پڑھائے گا؟

اس کے اندر بھی حکمتیں تھیں کہ ہم نے تو ان کو مسجد میں ڈالنا ہے، جہاں ان کو سوکھی روٹی ملے اور مختلف بستیوں سے جا کر روٹی اکٹھی کر کے کھائیں اور اللہ کا قرآن پڑھائیں۔ اگر ان کو زبان بھی آ گئی تو یہ باہر کے ملکوں میں نکل جائیں گے اور وہاں جب پیسے ملیں گے تو ادھر کیا کرنے کے لیے آئیں گے؟

آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ جو لوگ ڈگریوں والے بن گئے، ان میں سے کون دیہات میں کام کرنے کے لیے آیا؟ اب آپ کی حکومت ڈاکٹر کی منتیں کرتی ہے کہ مہربانی کرو، دیہات میں کام کرو۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے پھانسی پر لگا دو، لیکن میں دیہات میں نہیں جاؤں گا۔ ڈاکٹری چھوڑ دیتا ہے، مگر دیہات میں نہیں جاتا۔ المیہ تو یہ ہے کہ ان غریبوں کے پاس کون جائے گا؟ وہ کہتے ہیں کہ شہروں میں ہوں، سوسائٹی ہو، بنگلے ہوں، پنکھے ہوں، بجلیاں ہوں،

ایئر کنڈیشنڈ ہوں، شام کو سینما گھر ملے، تفریح ملے۔ ہم دیہات میں جا کر غریبوں مسکینوں کا علاج کیوں کریں؟ غریب تو ان کے نزدیک بندہ بھی نہیں ہوتا، وہ تو ان کے نزدیک جانور ہے، بلکہ جانور کے ساتھ تو کچھ ہمدردی رکھتے ہیں، غریب کے ساتھ اتنی ہمدردی بھی نہیں ہوتی۔ غریب مرتا ہے تو مر جائے، بھوکا پڑا ہے تو پڑا رہے، ملیریا پھیلا ہے تو پھیل جائے، وبا آ گئی ہے تو آ جائے، اندھے ہوتے ہیں تو ہو جائیں، گندا پانی پی رہے ہیں تو پیتے رہیں، کوئی ان کا علاج کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

اس لیے علماء نے فرمایا کہ ان کو زبان نہ سکھلاؤ۔ اگر ان کو زبان سکھلاؤ گے اور بڑی بڑی ڈگریاں دو گے تو پھر یہ دین کا کام نہیں کریں گے۔ جب یہ فارغ ہو کر مؤذن یا امام بنے گا، حافظ، قاری، یا مولوی بنے گا، دس بیس بچوں کو یہ قرآن پڑھا دے گا تو یہ کوئی تھوڑی سعادت تو نہیں ہے کہ اتنے بچے حافظ ہو جائیں۔

بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے ذکر کے اپنے اثرات ہوتے ہیں جو خود بخود چہرے پر اُبھر آتے ہیں، ذاکر شاغل آدمی کے چہرہ گواہی دیتا ہے کہ یہ اللہ کا ذکر کرنے والا آدمی ہے۔ اور جو اللہ کے ذکر سے محروم ہوتا ہے، اس کے چہرے سے نحوست ٹپک رہی ہوتی ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس کا تجربہ کرنا ہو تو ایک دن صبح کو جا کر کسی شراب خانے کے باہر کھڑے ہو جاؤ۔ جو شرابی نکلے، اس کا چہرہ دیکھو، اس کے منہ پر لعنت برس رہی ہوگی۔ اور پھر مسجد کے باہر کھڑے ہو جاؤ، جو لوگ تہجد میں آئے ہوں، جب وہ باہر نکلیں تو غور سے دیکھنا، ان سے چہروں سے رحمت برس رہی ہوگی۔ تم جا کر اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر لو۔

آمدم بر سر مطلب:

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جب اللہ سے ہمکلام ہوتے تھے تو ان کے چہرے پر ایک نور ظاہر ہوتا تھا کہ کسی کو کوئی طاقت نہیں ہوتی تھی کہ کوئی ان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھ سکے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ قریب آ جاؤ تو وہ قریب آ گئے۔ ان کے آگے ایک پردہ آ گیا، گویا وہ دیکھ نہیں رہے۔ جب قوم بھی اس بادل میں داخل ہو گئی تو سجدے میں گر گئی۔ انہوں نے سنا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرما رہے ہیں، اللہ پاک حکم دے رہے

ہیں کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو، اوامر ونواہی بیان ہو رہے ہیں، خود انہوں نے اپنے کانوں سے یہ گفتگو سنی۔ جب اللہ کا کلام ختم ہوا تو اس کے بعد بادل چھٹ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے کہ اب انہوں نے اپنے کانوں سے اللہ کا کلام سن لیا ہے، اب کیا کہتے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ سن تو لیا ہے، لیکن ہم نے دیکھا تو نہیں کہ کون بات کر رہا تھا؟ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ. اس پر ان کو ایک جھٹکا، ایک زلزلہ لگا، اور یہی وہ ''صاعقہ'' تھا جس سے وہ مر گئے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۳، ۹۴]

باقی واقعہ ماقبل میں گزر چکا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اُٹھے اور اپنے پروردگار کے آگے درخواست کی کہ یااللہ! یااللہ! مہربانی فرمائیں۔

امام رازی رحمہ اللہ کی تفسیر اور اس کا ردّ:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام رازی رحمہ اللہ نے ایک اور واقعہ بھی لکھا ہے کہ جب ان لوگوں کو موت کی سزا مل گئی، پھر موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لیے اللہ سے معافی مانگی تو معافی انہیں معافی بھی مل گئی۔ انہوں نے کہا کہ موسیٰ! آپ جو بھی دعا مانگتے ہیں تو اللہ قبول فرما لیتے ہیں اور آپ کی دعا ردّ نہیں ہوتی، آپ مہربانی کر کے دعا مانگیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی نبی بنا دے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی تو وہ سب کے سب نبی بن گئے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قصہ بالکل مَن گھڑت ہے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں صرف تین نبیوں کا ذکر آیا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت یوشع بن نون علیہ السلام۔ ان کے علاوہ کسی اور نبی کا ذکر نہیں ہے، ان کا ذکر نہ قرآن میں ہے، نہ حدیث میں۔ اگر وہ ستر آدمی نبی بن گئے ہوتے تو قرآن مجید یا ذخیرۂ احادیث میں کہیں نہ کہیں ان کا ذکر ضرور ہوتا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۴]

کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر جوتوں سمیت گئے تھے؟

ہمارے لوگ بھی محبت میں آ کر کہتے ہیں کہ دیکھو! موسیٰ علیہ السلام کی بڑی شان ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو رسول بنایا، اللہ نے ان کو نبی بنایا، اللہ نے ان سے کلام فرمایا، لیکن جب موسیٰ علیہ السلام وادیٔ مقدس میں گئے تو اللہ نے حکم دیا: ﴿اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ [طٰہٰ: ۱۲] پہلے اپنے جوتے اُتارو، پھر وادیٔ مقدس میں آؤ۔ موسیٰ علیہ السلام نے جوتے اُتار دیئے۔ کہتے ہیں کہ ہمارے نبی کی شان دیکھو کہ اللہ نے فرمایا: آپ



جوتے نہ اُتاریں، عرش پر بھی جوتوں کے ساتھ آجائیں۔ لوگ جب یہ بات سنتے ہیں تو کہتے ہیں: سبحان اللہ! واقعی یہ عاشق رسول ہے، اس نے حضور ﷺ کے مقام کو سمجھا ہے!!

خدا کے بندے! وہاں تو جوتے اُتارنے کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے، مجھے بتاؤ کہ یہ قرآن مجید کی کس آیت میں ہے کہ حضور ﷺ جوتے پہن کر عرش پر گئے تھے؟ اس کے مقابلے میں تم بھی تو قرآن مجید کی کوئی آیت پڑھو۔ یا کوئی ایسی حدیث مبارک پیش کرو جس میں حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان موجود ہو کہ میں جوتے پہن کر عرش پر گیا تھا!! لیکن یہ بات سننے والا کوئی نہیں!! محبت کی بات ہوتی ہے اور آگے ہماری برادری ہوتی ہے، جو صرف نام کے عاشق ہوتے ہیں۔ اللہ کے بندو! ہمیں بھی قرآن کی ایک آیت پڑھ کو سنادو کہ اس آیت کے مطابق حضور ﷺ عرش پر گئے۔ قرآن مقدس میں تو حضور ﷺ کا سدرۃ المنتہیٰ تک جانا ثابت ہے، اس سے آگے جانے کا تذکرہ قرآن پاک کی کسی آیت میں نہیں۔ بعض روایات میں اس سے آگے جانے کا ذکر ہے، لیکن اللہ کے قرآن میں ذکر نہیں ہے۔

اسی طرح نمازوں کی تخفیف کے بارے میں مسئلہ پر غور کریں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے سے حضور ﷺ درخواست کر رہے ہیں کہ اے اللہ! میری اُمت کو پچاس نمازیں پڑھنے کی معافی دے دے، یہ پچاس نہیں پڑھ سکیں گے۔ اللہ نے پانچ نمازیں معاف فرمادیں۔ پھر درخواست کی، پھر درخواست کی، بار بار درخواست کرتے رہے، حتیٰ کہ پانچ نمازیں باقی رہ گئیں۔ تب اللہ نے فرمایا کہ تیری اُمت پانچ نمازیں پڑھے گی، لیکن پچاس نمازوں کا ثواب دوں گا۔ میرا فیصلہ نہیں بدلتا، فیصلہ وہی پچاس والا ہے، لیکن آپ کی اُمت پر ہم نے مہربانی کردی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ کی اُمت یہ پانچ بھی نہیں پڑھے گی، لہٰذا آپ پھر جا کر درخواست کریں، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اب مجھے رعایت مانگنے سے حیا آتی ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ۳۴۹، بابٌ: كَيفَ فُرِضَتِ الصَّلاةُ فِي الإِسْرَاءِ؟]

جس نبی کو مانگنے سے بھی حیا آتی ہو، جس نبی کے ادب کا یہ عالَم ہو کہ اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَ الصَّلَوَاتُ وَ الطَّيِّبَاتُ، جن کی نیازمندی کا یہ عالَم ہو، جن کے تواضع کا یہ عالَم ہو تو پھر حکم آئے: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ، ان کے بارے میں آپ کہیں گے کہ جوتوں سمیت عرش پہ چلے گئے؟ عجیب بات ہے!!

﴿وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ ۚ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ۝﴾

[البقرۃ:۵۷،۵۸]

اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور تم پر من وسلوی اُتارے، پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں دیں، اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا، بلکہ وہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔ اور جب ہم نے کہا: اس شہر میں داخل ہو جاؤ اور اس میں جہاں سے چاہو بلا روک ٹوک کھاؤ اور دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور کہتے جاؤ: ''بخش دے'' ہم تمہارے قصور معاف کر دیں گے اور نیکی کرنے والوں کو اور بھی زیادہ دیں گے۔

مسلمانوں کی حالتِ زار:

مسلمانو! ذرا ان الفاظ پر اور آج کے مسلمانوں کی حالت پر غور کرو، آج بھی جب کوئی آدمی مسلمانوں کو نماز کے لیے پکارتا ہے، مسجد میں حاضری کے لیے بلاتا ہے، کسی مسلمان کو یہ بتلاتا ہے کہ سود حرام ہے، سود اللہ سے جنگ ہے، اگر کسی آدمی کو کہتا ہے کہ داڑھی رکھ لو، نماز پڑھا کرو تو وہ جواب دیتا ہے کہ جاؤ! جاؤ! میں تمہیں بھی جانتا ہوں اور تمہارے دین اور مذہب کو بھی جانتا ہوں۔ یعنی آج بھی بعینہ وہی الفاظ بولے جاتے ہیں جو بنی اسرائیل نے کہے تھے۔ بس اتنا ہے کہ انہوں نے اپنی زبان سریانی میں کہا تھا اور ہم یہ الفاظ اپنی مقامی زبانوں میں ادا کرتے ہیں، ورنہ کوئی فرق نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے۔

جذبۂ جہاد کا فقدان:

بنی اسرائیل نے جہاد سے انکار کر دیا تھا، آج مسلمانوں پر نظر ڈالو تو ہر قوم جہاد سے گویا انکار کر کے بیٹھی ہوئی ہے، جہاد کا نام تو ہر کوئی لیتا ہے، لیکن عملاً کوئی بھی جہاد کے لیے تیار نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر جہاد کا جذبہ ہوتا تو کیا آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ چند لاکھ یہودی یا چند لاکھ ہندو مسلمانوں کی عصمتوں کے ساتھ کشمیر میں کھیل رہے

ہوتے؟ اگر مسلمانوں کے اندر جہاد کا جذبہ ہوتا تو کیا آج ہماری مسجدوں کو شہید کر دیا جاتا؟ آج اگر مسلمانوں میں جذبۂ جہاد زندہ ہوتا تو مسلمانوں کی ہزاروں عورتوں کی ان کے ماں باپ، بھائی بہن اور ان کے شوہروں کے سامنے ان کی عصمت دری نہ کی جاتی۔

مظلوموں کے ہمدرد:

آپ اندازہ لگائیں! تاریخ کا جو بدترین انسان گزرا ہے، جس کو "ظَالِمُ هٰذِهِ الْأُمَّة" کا لقب ملا ہے، جس کے ہاتھوں اللہ کے نبی کے صحابہ شہید ہوئے ہیں، جسے ہم حجاج بن یوسف کے نام سے جانتے ہیں۔ لیکن جب اسے سندھ کے علاقہ دیبل سے چند بیٹیوں کا خط ملا کہ ہم پر راجہ داہر کی فوجوں نے حملہ کر کے ہماری عصمتیں لوٹی ہیں اور ہم ان کی قید میں ہیں، کیا مسلمان مر گئے ہیں کہ ہماری عزت کی حفاظت کریں؟ اس پر حجاج بن یوسف جیسا ظالم آدمی بھی تڑپ اُٹھا۔ چنانچہ اس نے سولہ سالہ محمد بن قاسم کو یہاں بھجوایا، جو اس کا داماد بھی تھا اور عزیز بھی تھا۔ اور وہ یہ جذبہ لے کر (کہ میں مسلمانوں کی بیٹیوں کی فریاد پر پہنچ رہا ہوں) عرب سے نکلا اور پوری دنیا کو تاخت و تاراج کرتا ہوا اسلام کے جھنڈے گاڑھ دیئے۔

بے حس مسلمان!!

آج کہاں ہیں وہ مسلمان جو مظلوموں کا درد محسوس کرنے والے تھے؟ اب تو بے حسی کا یہ عالم ہے کہ اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ آج مسجد میں اتنے مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا، آج کشمیر میں ہندوؤں نے اتنے مسلمانوں کو زندہ جلا دیا، لیکن زبان پر اِنَّا لِلّٰهِ کے الفاظ بھی نہیں آتے......!! کتنے مسلمان ہیں جو ایسی خبریں پڑھنے کے بعد اگر اور کچھ بھی نہ کر سکیں تو کم از کم اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ہی کہہ دیں؟ آپ بتائیں کہ کتنے مسلمان ہیں جو یہ اخبارات پڑھتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو بہتے ہیں؟ کبھی آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی ٹپکا ہو تو بتائیں؟ کیا آپ اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب ہماری بیٹیوں کے ساتھ یہ حشر کیا جائے گا؟ پھر آپ کو رونا آئے گا، پھر آپ چیخیں گے اور پھر آپ فریاد کریں گے؟ لیکن یاد رکھیں! اس وقت فریاد کرنے کا وقت گزر چکا ہوگا۔

وعدۂ نصرت کی شرط:

آج وہی بنی اسرائیل والے واقعات دہرائے جا رہے ہیں۔ ورنہ اسلام کا یہ وعدہ ہے: ﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ

الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الروم: ۴۷] اگر تم مومن بن جاؤ تو میرا آج بھی وعدہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم تمہیں شکست نہیں دے سکتی: ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران: ۱۳۹] اگر تم مومن بن جاؤ تو سب سے زیادہ سربلند میں تمہیں کروں گا۔ دشمن کے بارے میں تم سمجھتے ہو کہ اسے ٹیکنالوجی کی برتری حاصل ہے، لیکن اگر میرا اللہ چاہے تو یہی بنائے ہوئے ہتھیار اور ایٹم کے ذخائر ان کی تباہی و بربادی کا سبب بنا دے۔ شرط یہ ہے کہ تم مومن بن جاؤ۔

ذلت کا سبب......ترکِ جہاد:

میرے آقا ﷺ نے فرمایا تھا کہ ایک وقت آئے گا، میری اُمت ذلیل ہو جائے گی، ان کا کوئی رعب نہیں رہے گا اور دشمن ان پر اس طرح چڑھ دوڑیں گے جس طرح بھوکے لوگ کھانے پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ صحابہ ؓ نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا اس وقت مسلمان تعداد میں تھوڑے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان تعداد میں تو زیادہ ہوں گے اور اتنی بڑی تعداد ہوگی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے، لیکن وہ جہاد کو چھوڑ بیٹھیں گے، موت کو بُرا سمجھیں گے اور دنیا حاصل کرنے میں لگ جائیں گے۔

[سنن أبی داود، حدیث: ۴۲۹۷، باب: فِي تَدَاعِي الْأُمَمِ عَلَى الْإِسْلَامِ]

پیسہ ہی پیسہ!!

اسی پر غور کر کے اپنے گریبانوں میں جھانکیں کہ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو اپنے بیوی، بچوں، اور اپنے والدین کا ہاتھ بٹاتے ہیں؟ کتنے لوگ ہیں جو اپنے بیوی بچے، اپنا ملک اور گھر بار چھوڑ کر یہاں (غیر ممالک میں) آ پڑے ہیں؟ آخر کیوں؟ پیسے کمانے کے لیے۔ بہت کم لوگ ہیں جو یہاں عبادت کے لیے موجود ہیں، جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے گھر کا روزانہ طواف کر رہے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو اللہ کے قرآن کا ختم پڑھ رہے ہیں، کتنے لوگ ہیں جو مسجد نبوی میں جا کر نمازیں ادا کر رہے ہیں، کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی شکل حضرت محمد ﷺ والی بنالی ہے اور کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اپنا لباس اسلامی بنالیا ہے؟ چند دنیاوی فوائد کے لیے سب کچھ چھوڑ کر یہاں پڑے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف حصولِ دنیا ہے اور اس دنیا کو حاصل کرنے کے لیے ہمارا پیچھے گھر اُجڑ جائے، عزتیں تار تار جائیں، گھر کے اندر تباہیاں ہو جائیں، والدین مر جائیں، ہمیں ان کے جنازے تک نصیب نہیں ہوتے، لیکن پھر بھی

پردیس میں پڑے ہیں۔

اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری اُمت میں دنیا کی محبت بھر جائے گی، وہ موت کو برا سمجھیں گے۔ جب مسلمان موت سے ڈرنے لگے گا تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ پوری دنیا میں ذلیل وخوار ہو جائے گا۔

میری موت مجھ سے ڈرتی ہے!!

ایک دن ایک خیر خواہ آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا: کیا آپ کو موت سے ڈر نہیں لگتا جو آپ دشمنوں کے اندر ہی گھستے چلے جاتے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ مسکرائے اور ایک لطیف جملہ فرمایا کہ ''میری موت بھی مجھ سے ڈرتی ہے تو میں کیوں اس سے ڈروں؟'' اس نے پوچھا: موت آپ سے کیسے ڈرتی ہے؟ فرمایا: مجھے بتاؤ کہ موت وقت سے پہلے آسکتی ہے؟ اس نے کہا: وقت سے پہلے تو نہیں آسکتی، اس کا ایک وقت مقرر ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں جتنا بھی جنگ کے اندر گھستا چلا جاؤں، وہ مجھ سے بھاگتی چلی جائے گی کہ وقت تو آیا نہیں ہے، میں کیسے آسکتی ہوں؟

جی ہاں! جب ایمان اور جذبے سلامت ہوا کرتے تھے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے قیصر و کسریٰ کی طاقتوں کو پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ وہ بے سہارا اور بے اسباب لوگ تھے، لیکن ان کے پاس ایمان تھا۔ آج ہمارے پاس سب کچھ ہے، لیکن ایمان کی دولت نہیں ہے، اللہ کے قرآن سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔

بنی اسرائیل کا جہاد سے انکار:

بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو بڑا سخت جواب دیا۔ بندہ اسے پڑھ کر چونک اُٹھتا ہے۔ لیکن غور کریں کہ کیا آج ہم خود یہی جواب نہیں دیتے؟ انہوں نے بھی کہا تھا کہ جب تک وہ قوم اس بستی کے اندر آباد ہے، ہم ہرگز اس میں داخل نہیں ہوں گے، تم جاؤ اور تمہارا خدا جائے اور ان سے جا کر لڑو، ہم یہاں بیٹھ کر تمہارا انتظار کریں گے۔ اگر تم داخل ہو گئے اور فتح ہوئی تو ہم بھی آجائیں گے۔

موسیٰ علیہ السلام کی بے بسی:

موسیٰ علیہ السلام کے سمجھانے کے باوجود جب قوم بالکل نہ مانی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! آپ کے حکم کی اطاعت کے لیے میرا تو ان پر زور نہیں چلتا، قوم کے احوال کو آپ دیکھ رہے ہیں،

پروردگار عالم! اب میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ میرا زور زیادہ سے زیادہ اپنی جان پر چلتا ہے یا اپنے بھائی کو کہہ سکتا ہوں، باقی تو پوری قوم میرا کہنا ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! تیری قوم نے میرے حکم کا انکار کر دیا ہے، یہ بیت المقدس میں نہیں جانا چاہتے، بلکہ مصر میں جا کر لذتیں اُٹھانا چاہتے ہیں اور یہ عیش و عشرت اور آرام کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں، لہٰذا ہم ان کو سزا دیتے ہیں کہ یہ چالیس سال تک پھرتے رہیں گے، نہ ان کو مصر کا راستہ ملے گا اور نہ ہی کسی اور شہر کا۔

آج ذرا آنکھیں بند کر کے دیکھو کہ مسلمان لذتیں حاصل کرنے کے لیے کہاں کہاں جاتے ہیں؟ کیا وہاں زیارات ہیں؟ یہ جو اتنے مسلمان مکہ اور مدینہ چھوڑ کر باقی ملکوں میں جاتے ہیں، ایمان سے بتلائیں کہ وہاں حرمین شریفین سے زیادہ کوئی عبادت موجود ہے؟ وہاں ان سے زیادہ مقدس مقامات موجود ہیں؟ نہیں، بالکل نہیں۔ بس ان کی چاہت ہوتی ہے کہ اسلامی ملک کی حدود سے باہر نکل جائیں جہاں ہمیں آزادی ملے، عریانی اور فحاشی ملے اور جہاں ہمیں بے حیائی ملے۔ اور اس پر ہم ماسوائے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ آج ہم کہاں گر چکے ہیں۔

وادیٔ تیہ میں چالیس سال:

موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو چالیس سال کے لیے سزا ملی کہ بھٹک رہے ہیں، مصر جاتے ہیں تو ان کو راستہ نہیں ملتا۔ رات بھر سفر کرتے ہیں، جب صبح کو دیکھتے ہیں تو وہیں کے وہیں ہوتے ہیں۔

اسلام کا نعرہ:

ہم نے جب اپنا ملک بنایا تھا تو اسلام کا نعرہ دیا تھا، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا نعرہ دیا گیا تھا۔ آخر کون سی چیز تھی جس نے ہندی، سندھی، پنجابی اور پشتو والوں کو اکٹھا کیا تھا؟ یہی وجہ تھی کہ ہم نے اسلام کا نعرہ دے کر ملک حاصل کیا، لیکن جب ہم نے اسلام سے غداری کی تو آج بنی اسرائیل کی طرح چالیس سال نہیں، بلکہ کئی سالوں سے بھٹک رہے ہیں۔ جہاں سے چلتے ہیں وہیں آجاتے ہیں، کوئی منزل ہماری کنارے نہیں لگ سکتی، کوئی کنارہ ہمارا منزل مقصود کو نہیں چھو سکتا، کوئی کام ہمارا کامیابی سے نہیں چل سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ ہم نے اسلام کے اس کلمۂ شہادت سے غداری کی ہے۔ یاد رکھو! اگر تمہیں آج بھی منزل ملے گی تو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے سہارے سے ملے گی۔



کمزور اور مضبوط بنیاد؟

جب ہم اپنی بنیاد سے مخلص نہیں ہوں گے تو ہماری عمارت کیسے مضبوط ہوگی؟ وہ عمارتیں کبھی نہیں ٹھہرا کرتیں جن کی بنیاد کمزور ہو۔ ایسی عمارتیں کبھی ہواؤں کے جھونکوں سے تباہ ہوجاتی ہیں اور کبھی معمولی زلزلے انہیں ہلا دیا کرتے ہیں، البتہ جن عمارتوں کی بنیادیں زمین کے اندر داخل ہو چکی ہوں، انہیں کوئی طوفان بھی نہیں ہلا سکتا۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے اسلام کو بنیاد کہا ہے: ''بُنِيَ الإِسْلَامُ علی خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' [صحیح بخاری، رقم:۸] اسلام ایک عمارت کی مثل ہے، اس کی بنیاد کلمۂ شہادت ہے۔

گرمی کے ستائے ہوئے:

بنی اسرائیل کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ہم کہاں ہیں؟ اوپر سے صحرا کی گرمی اور اس کی شدت، پینے کے لیے پانی نہیں، کھانے کے لیے کچھ نہیں، بس صحراء میں بھٹک رہے ہیں اور اللہ کے نبی بھی قوم کے ساتھ ہیں۔ جب گرمی نے ستایا، لُو کے تھپیڑے لگے اور صحراء کی ریت جلانے لگی تو اب سب سجدے میں گر گئے اور کہنے لگے: یا اللہ! مہربانی فرمایئے۔

ایمان سے بتلاؤ، آج ہماری یہی کیفیت ہے یا نہیں؟ آج اگر ہمارے اوپر کوئی عذاب آجائے تو کہتے ہیں کہ اذانیں دو، خیراتیں کرو اور بکرے ذبح کرو، تاکہ یہ عذاب ٹل جائے۔ اس وقت اللہ اکبر تمہیں کیوں یاد آگیا؟ تمہیں کیسے نمازیں یاد آگئیں؟

بنی اسرائیل کی رعایت:

اللہ تعالیٰ تو أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْن ہیں، وہ ہماری طرح تو معاملہ نہیں فرماتے، وہ تو اپنی رحمت کا معاملہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: اے موسیٰ! ہمارا فیصلہ تو نہیں بدلے گا، یہ چالیس سال اسی صحراء کے چکر میں رہیں گے، لیکن اگر تمہاری قوم کو رونا آگیا ہے، ندامت آگئی ہے تو ہم ان کی رعایت کرکے ان کے اوپر ایک سایہ کردیتے ہیں، تاکہ یہ دھوپ کی تکلیف سے بچ جائیں۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر ایک ابر کا سایہ کردیا۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/ ۹۴]

بادلوں کا سایہ:

بعض علماء مفسرین فرماتے ہیں: ''غمام'' کا معنی ہوتا ہے ابر، یعنی بادل۔ اور بعض علماء نے فرمایا: بادل دو ہیں، ایک تو وہ بادل ہیں جو ہمارے سامنے آتے ہیں، یہ تو مون سون ہواؤں سے بنتے ہیں جو پانی کو اُٹھا کر اوپر لے جاتی

ہیں اور اللہ کی قدرت سے وہ پانی بادل بنتا ہے۔ اور ایک وہ ابر ہوتا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ [البقرۃ: ۲۱۰] جب قیامت والے دن اللہ تعالیٰ نزول اجلال فرمائیں گے، جب اللہ تبارک وتعالیٰ تخت پر تشریف فرما کر فیصلے فرمائیں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ ابر جس میں اللہ تعالیٰ اپنی شان سے نزول اجلال فرمائیں گے یا جس میں ملائکہ آئیں گے، یہ بادل نہیں ہے، بلکہ اس سے علیحدہ ایک چیز ہے، وہ اللہ کے حکم سے پیدا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے بنی اسرائیل پر جو ''غمام'' بھیجا گیا تھا وہ یہ بادل نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کے اوپر ایک خاص قسم کا سایہ کر دیا گیا تھا۔

چنانچہ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ ابر بالکل سفید تھا، اس کا سایہ نہایت لطیف تھا اور اس کی چھاؤں اتنی مزیدار تھی کہ ان کی تمام تکلیفیں ختم ہو گئیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۴]

مَن وسلویٰ کا انتظام:

اب بنی اسرائیل نے کہا: اے موسیٰ! اللہ نے یہ کرم تو فرما دیا کہ ہم دھوپ کی شدت سے بچ گئے اور ہمیں پانی بھی ملنے لگ گیا، لیکن کھانا بھی تو چاہیے، کیونکہ بندہ کھانے کے بغیر تو زندہ نہیں رہ سکتا...... اسی پیٹ کے جہنم کو بھرنے کے لیے سب کچھ چھوڑ کر بے چارا بھٹک رہا ہے...... اللہ تعالیٰ نے ان پر مَن وسلویٰ اُتارا۔

''مَنّ'' ایک میٹھی چیز تھی اور اس کے دانے ایسے تھے جیسے دھنیے کے دانے ہوتے ہیں، جسے بعض مفسرین ''ترنجبین'' بھی کہتے ہیں۔ اور حکیم بھی جانتے ہیں کہ ''ترنجبین'' ایک چیز ہے، اس کے چھوٹے چھوٹے دانے ہوتے ہیں۔ اب بھی وہ شاید ملتی ہے۔ کسی آدمی کو مالیخولیا یا سوداء ہو جائے تو بعض اطباء اسی دوا کو پیس کر اس مریض کو سنگھاتے ہیں تو اس کو افاقہ ہو جاتا ہے۔ بہر حال وہ میٹھی چیز کے کچھ دانے تھے، اللہ تعالیٰ نے اسے ''ترنجبین'' کا نام دیا ہے، اس کی حقیقت اللہ ہی جانتے ہیں۔ چونکہ قرآن مجید اور احادیث رسول پاک میں اس کی کوئی وضاحت نہیں ہے تو پھر ہمیں اپنی طرف سے کوئی چیز معین کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس کے اُترنے کا یہ عالم ہوتا تھا کہ بنی اسرائیل صبح اُٹھتے تھے تو صبح شبنم کے نازل ہونے کے ساتھ ہی ہر آدمی کے ارد گرد وہ بھی اُترتی تھی، وہیں بیٹھے بیٹھے وہ اسے اُٹھا کر کھا لیتے تھے۔

"سَلْوٰی" ایک پرندے کو کہتے ہیں۔ بعض علماء نے کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ بٹیر تھا، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ وہ بٹیر نہیں تھا، بلکہ بٹیر کے مشابہ کوئی پرندہ تھا۔ بنی اسرائیل ان دانوں کو کھا لیتے اور اس پرندے کو بھون لیتے اور مزے سے کھانا شروع کر دیتے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۚ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۵۷] ہم نے تمہیں حکم دیا کہ ہم نے تمہیں جو پاکیزہ چیزیں دی ہیں، پاکیزہ رزق دیا ہے۔ کھاؤ کہ اس کے لیے محنت اور مزدوری بھی نہ کرنی پڑے، رزق ڈھونڈنے کے لیے بھی نہ جانا پڑے، شکار کے لیے جنگلوں میں بھی نہ پھرنا پڑے، بٹیر پکڑنے کے لیے جال بھی نہ ڈالنے پڑیں، گندم کے فصلوں اور کھیتوں میں جا کر ساری ساری رات بھی نہ جاگنا پڑے، بلکہ اندھیرا ہو اور بٹیر ہر کسی کے ارد گرد بیٹھے ہوں اور ہاتھ سے پکڑتے جائیں اور بھون کر مزے سے کھاتے رہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اتنی نعمتوں کے بعد بھی جب تم نے ہدایت کا راستہ اختیار نہ کیا اور موسیٰ علیہ السلام کی اتباع نہ کی تو یہ تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

آیات کا ارتباط:

مفسر ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مختلف نعمتوں سے نصیحت فرمائی۔ پہلے ان مصائب کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اللہ نے ان کو نجات دی تھی، جیسے فرعون کے مظالم سے اللہ نے ان کو چھڑایا تو اس کا نتیجہ کیا ہے کہ اللہ کا شکر کرو اور اللہ کی طرف لوٹو۔ اب ان آیات میں ان نعمتوں کا تذکرہ فرما رہے ہیں جو خاص بنی اسرائیل پر اللہ نے نازل فرمائیں۔

ویسے تو اللہ کی نعمتیں "لَا تُعَدُّ وَ لَا تُحْصَی" ہیں، لیکن بعض نعمتوں کا اللہ نے ان آیات میں ذکر کیا کہ ان پر سب سے بڑی نعمت یہ بھی ہوئی کہ ہم نے ان پر بادل کا سایہ کر دیا۔

مفسرین کے اقوال:

- ...... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ، حضرت ابی مجلز رحمہ اللہ، حضرت ضحاک رحمہ اللہ اور حضرت سدی رحمہ اللہ نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق ارشاد فرمایا کہ اللہ نے ان کے اوپر بادل کا سایہ کر دیا۔
- ...... حضرت حسن رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل صحراء میں تھے، وہاں کوئی سایہ نہیں تھا،

اللہ تعالیٰ نے سورج کی تپش سے بچانے کے لیے بادل کا انتظام فرما دیا۔

✿.....ابن جریر رحمہ اللہ نے دیگر مفسرین کا بھی قول نقل فرمایا ہے کہ وہ بادل، موجودہ بادل (جو ہم دیکھتے ہیں، اس) سے زیادہ ٹھنڈا اور زیادہ اچھا تھا۔ وہ ایک خاص بادل تھا کہ اس کے ہونے کی وجہ سے ایک سائے کا بھی انتظام ہو گیا اور دوسرا ٹھنڈک کا بھی انتظام ہو گیا تو ان کی پریشانی ختم ہو گئی۔

✿.....حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے بھی اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ "غمام" سے مراد یہ بادل نہیں ہے جو تم دیکھتے ہو، بلکہ یہ خاص "غمام" ہے جس میں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نزول اجلال فرمائیں گے اور یہ "غمام" خاص طور پر ان کے لیے تھا اور کسی کے لیے نہیں تھا۔

✿.....حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب میدانِ بدر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا تھا: ﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ﴾ [آل عمران: ۱۲۴] کہ ہم نے آپ کی نصرت کے لیے آسمانوں سے تین ہزار فرشتے اُتارے ہوئے ہیں۔ وہ فرشتے اس بادل میں تشریف لا رہے تھے۔

✿.....حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب تک بنی اسرائیل اس وادیٔ تیہ میں رہی، وہ بادل ہمیشہ ان پر سایہ فگن رہا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۴، ۹۵]

حضرت العلاء الحضرمی رضی اللہ عنہ کی کرامات:

حضرت العلاء الحضرمی رضی اللہ عنہ کو جب ساتھیوں نے کہا کہ حضرت! آگے تو بہت بڑا دریا ہے اور اس کے بعد یہ عالم ہے کہ اس پر پل بھی نہیں ہے، نہ ہمارے پاس کوئی کشتی ہے اور نہ ہی کوئی بحری بیڑا، اور پھر دوسری طرف دشمن کی طاقت ہے۔ انہوں نے فرمایا: خدا کے بندو! پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ ہم اپنے گھر سے کیوں نکلے ہیں؟ کہنے لگے: اللہ کے دین کے لیے نکلے ہیں۔ حضرت العلاء الحضرمی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ دریا کس کا ہے؟ انہوں نے کہا: اللہ کا ہے۔ تب انہوں نے دعا مانگی، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھی اور دریا میں اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ چنانچہ سارا لشکر دریا پار کر گیا اور دشمن اس منظر کو دیکھ کر بھاگ گیا کہ جو لوگ دریاؤں سے نہیں گھبراتے...... دریا میں ایسے چل رہے ہیں جیسے سڑک پر چل رہے ہوں...... ہم ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟

ایک دفعہ آئے اور کہا کہ ہم ایک ایسے جنگل میں پھنس گئے ہیں کہ اب میلوں تک پانی کا وجود نہیں ہے اور لشکر کے پاس پانی ختم ہو گیا ہے۔ انہوں نے دو رکعت نماز پڑھی اور "يَا عَلِيْمُ يَا عَلِيُّ، يَا حَلِيْمُ يَا عَظِيْمُ يَا إِلٰهَ الْعَالَمِيْنَ!" پڑھ کر دعا مانگی کہ یا اللہ! ہمیں پانی عطا فرما۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ابھی انہوں نے ہاتھ نیچے نہیں کیے تھے کہ پانی کا چشمہ نکل آیا۔

اسی سے آپ اصحابِ رسول اللہ کی شان کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے چن چن کر ہیرے دیئے تھے۔ ایسے خالص ہیرے تھے کہ جن پر آج تک دشمن چیخ رہا ہے، لیکن کوئی الزام نہیں لگا تا۔ آج تک صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت، صداقت، دیانت، امانت، اخلاص، وفاداری اور قربانیوں کا جو منظر ہے، دنیا اس کی کوئی مثال پیش نہیں کر سکی اور نہ کبھی کر سکے گی۔

مَن وسلویٰ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال:

﴿وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى﴾

"اور اُتارا ہم نے تمہارے اوپر مَن اور سلویٰ۔"

مَن اور سلویٰ سے کیا مراد ہے؟

1 ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ "مَنّ" درختوں کے اوپر نازل ہوتا تھا، وہ صبح جا کر وہاں سے لے لیتے تھے اور اس کو کھاتے تھے۔

2 ...... دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ گوند کی قسم کی ایک چیز ہوتی تھی۔

3 ...... حضرت عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "مَنّ" ایک چیز تھی جیسا کہ شبنم گرتی ہے، لیکن وہ ذرا سخت اور گوندھا ہوا ہوتا تھا، اس کے اندر سخت "رِب" ہوتا تھا۔ "رِب" شربت سے زیادہ گاڑھا ہوتا ہے، شربت تو قوام میں آجاتا ہے، لیکن یہ اس سے بھی گاڑھا ہوتا ہے۔ مربہ اور جام کے درمیان میں ایک "رِب" ہوتا ہے جو ایک خاص شربت ہوتا ہے۔ اس قسم کی ایک چیز تھی جو اُن کے لیے اُتاری جاتی تھی۔

4 ...... حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تازہ تازہ انکار کر چکے تھے اور انہیں یہاں تک کہہ چکے تھے: ﴿يٰمُوْسٰى إِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا

قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ [المائدۃ: ۲۴] لیکن جب وادئ تیہ میں کھانے پینے کو کچھ نہ ملا اور تکلیف ہوئی تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آگئے اور کہنے لگے کہ اب ہم یہاں زندہ کیسے رہیں گے؟ ہمارے کھانے کا کیا انتظام ہوگا؟ روٹی کے بغیر کیسے زندہ رہیں گے؟ اللہ پاک نے ان کی غذا کے لیے ''مَنّ'' اُتارا اور ''مَنّ'' زنجبیل کی طرح تھی، جو کہ یہاں مشہور چیز ہے۔ وہ درخت کے اوپر برستا تھا جیسے بارش یا برف گرتی ہے۔ وہ اس کو اُٹھا لیتے تھے۔ وہ چیز ایسی تھی کہ رنگت میں بالکل سفید اور مٹھاس میں شہد سے بھی زیادہ میٹھی تھی۔

۵..... مفسر رحمہ اللہ نے حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا یہ قول بھی نقل فرمایا ہے کہ ''مَنّ'' طلوعِ فجر سے لیکر سورج نکلنے تک اُترتا تھا، یعنی صبح صادق کے وقت وہ گرتا تھا اور سورج نکلنے تک وہ بند ہو جاتا تھا۔ ہر آدمی کو یہ حکم تھا کہ اتنا لے جو اس کو اس دن کے لیے کافی ہو جائے۔ تو ہر آدمی اتنا لے لیتا تھا جتنی اس کی ضرورت ہوتی تھی۔ اگر وہ زیادہ لے لیتا تو وہ ٹھیک نہیں رہتا تھا، خراب ہو جاتا تھا اور اس کے کھانے کے کام نہیں آتا تھا۔ مگر جب جمعہ کا دن ہوتا تھا تو اس دن ان کو حکم ہوتا تھا کہ دو دن کا لے لیں، کیونکہ ہفتے کا دن ان کے لیے حرمت کا دن تھا۔ تو اس دن ان کو اتنی بھی تکلیف نہ کرنی پڑے کہ اپنی غذا کو اُٹھائیں اور غذا کو جمع کریں اور اس کا انتظام کریں۔

۱۱..... حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ''مَنّ'' جو اُن پر اُتارا گیا، وہ ایک قسم کا شراب تھا۔ وہ ایسے تھا جیسے شہد ہوتی ہے، اس کو وہ پانی میں ملا لیتے تھے اور اس کے بعد اس کو پی لیتے تھے۔

۱۲..... حضرت وہب بن منبہ سے پوچھا گیا کہ ''مَنّ'' کس کو کہتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: بالکل پتلی روٹی کے دانے ہوتے ہیں یا ایسے جو چھنی ہوئی چیز ہو۔

۱۳..... اور ایک قول یہ بھی آیا ہے کہ ہمارے زمانے میں جو شہد پائی جاتی ہے، گویا کہ وہ اس ''مَنّ'' کا ایک حصہ ہے، یعنی اس کی لذت اور اس کی مٹھاس اس سے ستر گنا زیادہ اعلیٰ تھی۔

۱۴..... اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ وہ بھی ایک قسم کی شہد تھی۔ اُمیہ بن ابی الصلت کے اشعار میں بھی اس کا تذکرہ ہے:

فرأى اللّٰہ أنّہم بمضیع
لا بذی مزرع و لا مثمورا

فسناها

غَادِيَاتٍ عَلَيْهِمْ

وَ يَرَى مزنهم خَلَايَا وَ خَوْرًا

عَسَلًا نَاطِفًا وَ مَاءً فُرَاتًا

وَ حَلِيبًا ذَا بَهْجَةٍ مَزْمُوْرًا

یعنی وہ ایک ایسی جگہ تھے جہاں ضائع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ نہ وہاں کوئی کھیتی تھی اور نہ کوئی آبادی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے صبح کے وقت میں ایسا انتظام کر دیا، ان خالی جگہوں میں سے ان کے لیے ایسا شہد اُتارا جو بہت پسندیدہ تھا اور ایسا پانی جو ٹھنڈا اور تازہ، اور ایسا دودھ جو رونق والا۔ یا مزمور کا معنی ہے: بالکل صاف۔

تو اس نے بھی کہا کہ ''مَنْ'' ایک عسل کی قسم کا تھا یعنی شہد بہنے والا، ''اَلْحَلِيْبُ الْمَزْمُوْرُ'' صاف دودھ کہ جس کے اندر کسی قسم کی کوئی آمیزش نہ ہو۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام مفسرین کے اقوال تقریباً متقاربۃ المعنی ہیں، لیکن اس کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۵]

بعض علماء نے کہا کہ وہ ''ترنجبین'' کی طرح ایک چیز ہوتی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے دانے ہوتے تھے جیسے دھنیا کا دانہ ہوتا ہے۔ وہ اتنا لذیذ اور اتنا میٹھا تھا کہ اسی کو وہ پانی میں ڈال لیتے تھے اور ان کے لیے وہ خوراک ہو جاتی تھی، جیسے کارن فلاکس وغیرہ چیزیں۔ ان میں سے بعض میں چاولوں کے دانے اور بعض میں گندم کے دانے ہوتے ہیں۔

''مَنْ'' کھانے کا کام دیتی تھی اور ''سلویٰ'' ایک پرندہ تھا۔ بعض نے کہا کہ وہ بٹیر تھا اور بعض نے کہا کہ بٹیر کے مشابہ تھا، بعض نے اور بھی اقوال ذکر کیے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حقیقت تو اللہ جانتے ہیں، بس مقصد اتنا ہے کہ اللہ نے ان کے کھانے اور پینے کا انتظام کر دیا بغیر کسی تکلیف اور محنت کے۔ حتیٰ کہ وہ پرندہ بھی ان کے پاس خود بخود آ جاتا اور وہ ''مَنْ'' ان کے اوپر خود بخود آ کر گر جاتا۔ سایہ بھی اللہ نے بادل کا خود بخود بنا دیا اور کسی محنت کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''مَنْ'' کے بارے میں مشہور بات ہے کہ اگر اس کو ایسے کھایا جائے تو بڑا لذیذ ہوتا ہے، بڑا مزہ دیتا ہے۔ جیسے آپ حلوہ کھا رہے ہوں اگر پانی میں ملا دیا جائے تو بہترین قسم کی شربت بن جاتی ہے اور

اگر اس کو کسی اور چیز میں ڈالا جائے تو اور لذت پیدا کر دیتا ہے۔

لیکن فرمایا: وہ یہ نہیں ہے جو ہم پڑھ رہے ہیں، اس کی حقیقت اللہ جانتا ہے۔ اور میں نے پہلے بھی یہ عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں جو مشہور ہے وہ ''ترنجبین'' ہے اور یہ ''ترنجبین'' طبیب لوگ اس کو پیس کر دماغ کے امراض میں ان لوگوں کے لیے ستعمال کرتے ہیں، جن لوگوں کو مالیخولیا ہو جاتا ہے یا سوداء زیادہ ہو جاتی ہے۔

چونکہ انسان کے اندر مختلف مادے ہیں: بعض میں بلغمی مادہ ہوتا ہے، بعض میں دموی مادہ ہوتا ہے، بعض میں صفراوی مادہ ہوتا ہے اور بعض میں سوداوی مادہ ہوتا ہے۔ جس چیز کا غلبہ ہو جاتا ہے، آدمی پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

چنانچہ اگر سوداوی مادہ کسی پر غالب ہو جائے تو وہ بندہ چھوٹی چھوٹی بات پر لوگوں سے جھگڑنے لگ جاتا ہے، کبھی اپنے آپ کو نقصان پہنچا بیٹھتا ہے، کبھی کوئی چیز اُٹھا کر خود کو مار دیتا ہے، یا پاگلوں کی طرح حرکتیں کرنے لگتا ہے۔

سمجھدار طبیب اس مادے کو کم کرنے کے لیے اس کا علاج کرتے ہیں، تا کہ یہ اعتدال پر آجائے۔ چنانچہ وہ ''ترنجبین'' کو پیس کر سوداء اور مالیخولیا کے مریض کو سنگھاتے ہیں، تا کہ اس کا یہ مرض ٹھیک ہو جائے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۵]

کھمبی کا پانی:

اس پر دلیل دیتے ہوئے مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں ایک روایت نقل کی ہے، حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْکَمْأَۃُ مِنَ الْمَنِّ وَ مَاؤُھَا شِفَاءُ الْعَیْنِ.)) [صحیح بخاری، حدیث: ۴۶۳۹]

''کھمبی بھی من کی ایک قسم ہے اور اس کا پانی آنکھوں کی بیماریوں کے لیے شفاء ہے۔''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کبھی غلط نہیں ہو سکتا اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے بعد کسی اور نسخے کی ضرورت ہے۔ البتہ بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں یہ کھمبی نکلتی ہے تو کبھی کبھار اس جگہ سانپ، بچھو یا کوئی اور زہریلا جانور اپنا زہر چھڑک دیتا ہے، ایسی کھمبی کا پانی اگر کوئی آنکھ میں ڈالے گا تو اس کا نقصان ہو سکتا ہے۔ اس بات کی احتیاط ضرور کریں، ایسا نہ ہو کہ حدیث پر اعتراض کی نوبت آجائے۔ بعض اطباء ایسا کرتے ہیں کہ بارش کے فوراً بعد جو صاف جگہ ہوتی ہے، وہاں سے اس کو اکٹھا کر کے اس کا پانی نکال لیتے ہیں، پھر اسی پانی میں سرمہ گھول لیتے ہیں۔

اثمد سرمہ کی افادیت:

ایک سرمہ وہ ہے جو حضور پاک ﷺ استعمال فرماتے تھے، اس کا نام ''اثمد'' ہے، یہ نسواری رنگ کا ہوتا ہے ہلکا سرخ قسم کا۔ اور جو سرمہ ہم استعمال کرتے ہیں، یہ سیاہ رنگ کا ہوتا ہے۔ آج کل تو لوگ جھوٹ بول کر ہر سرمے کو ''اثمد'' کہہ کر بیچتے ہیں، حالانکہ وہ اثمد نہیں ہوتا۔ ہاں اگر کسی معتبر آدمی کے پاس اثمد سرمہ ہو اور اس کو خود بھی پتہ ہو کہ اثمد کیا ہوتا ہے؟ اس سے خرید لیا جائے۔ پھر آپ زمزم اور کھمبی کا پانی اثمد سرمے میں ڈال کر گھول لیں اور آنکھوں میں ڈالیں تو آنکھوں کی تمام بیماریاں ختم ہو جائیں گی...... ان شاء اللہ!......

اور یہ کوئی مشکل بھی نہیں ہے۔ آپ کو مکہ، مدینہ میں اثمد بھی مل سکتا ہے اور جب بارش ہو جائے تو میدانِ عرفات میں اور ان وادیوں میں بے انتہاء کھمبی پیدا ہوتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ زمزم نعمتِ عظیمہ بھی ہمارے پاس موجود ہے۔

افطاری کی دعوت:

رمضان المبارک کی بات ہے، افطار کے وقت مجھے ایک آدمی نے کہا کہ میرے ساتھ افطاری کریں۔ میں نے کہا: بہت اچھا...... یہاں کے لوگ سارا سال کھجور کی حفاظت کا اہتمام کرتے ہیں، تا کہ رمضان المبارک میں استعمال کریں۔ اور اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ عرب (مکہ اور مدینہ) میں کھجور اور زمزم کی نعمت عام ہے...... چنانچہ اس نے مجھے مدینہ پاک کی عجوہ کھجور کھلائی اور پھر ایک شربت پلایا، جو کہ بہت مزے کا تھا۔ میں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ دودھ، شہد اور زمزم ہے۔

دودھ، شہد اور زمزم سے شفاء:

- ...دودھ کے بارے میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: یہ ایک ایسی نعمت ہے کہ جب کوئی پیش کرے تو انکار نہ کرو۔ [ترمذی، حدیث: ۲۷۹۰، باب: مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ رَدِّ الطِّيبِ]
- ...شہد کے بارے میں اللہ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا کہ اس کے اندر شفاء ہے۔ [النحل: ۶۹]
- ...زمزم کے متعلق حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ زمزم کا پانی غذا کی غذا ہے اور بیماریوں کی شفاء ہے۔ [مسند البزار، حدیث: ۳۹۲۹]
- ...عجوہ کھجور کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس کے سات دانے صبح کے وقت کھا لے گا،

سارا دن اس پر جادو اور کوئی زہر اثر نہیں کرے گا۔[صحیح بخاری، حدیث:۵۴۴۵، بابُ:العَجوَة]

جوانی جیسا بڑھاپا:

وہ آدمی کہنے لگا کہ میرا یہ معمول ہے کہ رمضان میں ان چیزوں کو اکٹھا کر کے شربت بناتا ہوں اور ساتھ کھجور استعمال کرتا ہوں۔ الحمد للہ! سارا سال نہ بیماری میرے قریب آتی ہے اور نہ مجھے کمزوری لاحق ہوتی ہے۔ ڈاکٹر جب مجھے دیکھتے ہیں تو حیران ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم بوڑھے ہو، لیکن تمہارے قلب اور اعصاب کی حرکات ایسے معلوم ہوتی ہیں کہ جیسے سولہ سال کے جوان لڑکے ہو۔

بازاری مشروبات کی حقیقت:

عجوہ کھجور اور اس شربت کا اہتمام کرنا کون سا مشکل کام ہے؟ لیکن ہم سے یہ بھی نہیں ہوتا۔ ہمارا تو حال یہ ہے کہ دکان پر جا کر ایسا شربت ڈھونڈیں گے جو باہر کا بنا ہوا ہو۔ اس میں یقیناً حرام شامل ہوگا، زیادہ نہ بھی ہو تو کم از کم پیشاب یا الکحل کا ایک قطرہ ہی ڈال دیا گیا ہو تو پیچھے کیا رہ جاتا ہے؟ شراب اور پیشاب میں کیا فرق ہے؟ کوئی فرق نہیں۔ شراب کی ماں الکحل ہے جو بچے جنتی ہے، وہ بھی حرام ہے اور وہ بھی حرام ہے۔ جس میں الکحل یا شراب ایک قطرہ ڈالا گیا ہو، وہ شربت ہم افطار کے وقت پی رہے ہوتے ہیں اور یہ دعا پڑھ رہے ہوتے ہیں: ''أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ لَكَ صُمْتُ وَ بِكَ آمَنْتُ'' کیا ہمارا روزہ ہوگا اور کیا ہمیں ثواب ملے گا؟

سگریٹ سے افطاری:

اور بعض شریف لوگوں کو تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ سگریٹ سے افطار کرتے ہیں...... اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ...... روزہ تو رکھ لیا، مگر پھنس گئے کہ سارا دن سگریٹ نہیں پی سکتے۔ پھر وہ افطار ہی سگریٹ پہ کرتے ہیں۔ روزہ چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ اس لیے کہ ان کو یہ ڈر ہوتا ہے کہ اگر روزہ نہیں رکھیں گے تو یہاں کوئی شکایت کر دے گا۔ ان کے پاس تو الحمد للہ! انتظام ہے کہ جو نماز نہ پڑھے یا روزہ نہ رکھے، یہ اس کو چوبیس گھنٹے میں ٹھیک ٹھاک روزہ دار اور نمازی بنا دیتے ہیں۔

ایسے روزے کا کیا فائدہ؟

آپ نے ایسے کافی سارے لوگ دیکھے ہوں گے جو روزہ میں گالیاں دیتے ہیں، ایسے بھی دیکھے ہوں گے جو روزہ

رکھ کر فلم دیکھتے ہیں اور ایسے روزہ دار بھی آپ نے دیکھے ہوں گے جو کہتے ہوں گے کہ یار! روزہ لگ رہا ہے، ذرا ٹیپ ریکارڈر کے اندر کوئی اچھا سا گانا تو لگاؤ۔ بتاؤ ایسے روزے کا کیا فائدہ؟

بھوکا رہنا مقصود نہیں:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی یہ برائیاں نہیں چھوڑتا، اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ [صحیح بخاری، حدیث: ۱۹۰۳]

روزے کا مقصد؟

روزے کا مقصد تو یہ تھا کہ آدمی اپنے نفس کو حرام سے روکے، اپنی جان کو حرام سے روکے، اپنے دماغ کو حرام سے روکے، اپنی قوتِ شہوانیہ کو حرام سے روکے، شراب اور جماع سے روکے۔ جب اللہ نے اپنی بیوی سے جماع حرام کر دیا تو جو آدمی دوسروں کو دیکھتا رہے گا، اس کو روزہ رکھنے سے خاک فائدہ ہوگا؟

آمدم برسر مطلب:

امام بخاری رحمہ اللہ کی نقل کردہ حدیث کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہے، اگر آپ اسی حدیث پر عمل کر لیں تو کسی قسم کے علاج کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

انگریزی تعلیمات سے مرعوبیت:

آج کل انگریز نے ہمیں سبق پڑھا دیا ہے کہ آپ نے سرمہ نہیں پہننا، مرد سرمہ نہیں پہنتے، یہ تو عورتوں کے لیے ہے۔ انگریز نے سرمہ پہننا عیب بنا دیا ہے، مجال ہے کہ کوئی بڑا آدمی سرمہ پہنے، کیونکہ انگریز نے جو منع کیا ہے۔ اور پھر دماغ میں یہ بٹھائی ہے کہ وہ پتھر ہوتا ہے، اس میں سکر ہوتا ہے، اس میں جص ہوتا ہے اور اس میں معدنیات کے اثرات ہوتے ہیں، جس سے آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔

ماضی اور حال کا تقابل:

ایمان سے بتلاؤ! جب تک تمہاری یہ دوائیں نہیں بنی تھیں، جب دنیا میں ہسپتال بھی نہیں بنے تھے، آنکھوں کے معالج نہیں ہوتے تھے، آئی ڈراپس بھی ایجاد نہیں ہوئے تھے، صرف ''سرمہ'' یا پھر ''مصبر'' ہوتا تھا، اس وقت

بیماریاں زیادہ تھیں یا اب زیادہ ہیں؟ جب کبھی آنکھیں گرمی سے اُبل جاتی تھیں تو ٹھنڈے دودھ میں کپاس بھگو کر آنکھوں پر رکھ لیتے تھے، آنکھوں کو ٹھنڈک مل جاتی تھی۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے:

بس دماغ میں ایک بات بٹھائی گئی ہے کہ اگر کوئی مرد سرمہ پہن لے تو گویا اس نے عورتوں کی مشابہت اختیار کر لی۔ اور اگر عورت مردوں جیسا کوئی کام کرے تو کہتے ہیں کہ مساوات ہے، عورت اگر مردوں والی حرکتیں کرے تو کہتے ہیں: وہ بھی تو انسان ہے، مرد اور عورت میں کوئی زیادہ فرق تو نہیں ہے۔

بس یہ کہ ایک کو حمل ہوتا ہے اور ایک کو حمل نہیں ہوتا، ایک کو حیض آتا ہے اور ایک کو حیض نہیں آتا، ایک کو نفاس آتا ہے اور ایک کو نہیں آتا، ایک ماں بنتی ہے اور ایک بیٹا بنتا ہے اور ایک شوہر کہلاتا ہے اور ایک بیوی بنتی ہے۔ ان میں بھی کوئی بڑا فرق نہیں ہے، سب برابر ہے...... اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ...... جب ہمارے دلوں میں اسلام نہیں ہے تو یہی کہتے رہیں گے۔

اجر ضائع نہیں ہوگا:

ہمارا اجر تو اللہ کے ہاں محفوظ ہے، وہ ضائع نہیں ہوتا، ہماری محنت و دعوت ضائع نہیں ہوتی۔ ہمیں تو یہی حکم ہے کہ کوئی مانے یا نہ مانے تم دعوت دیتے رہو، تا کہ قیامت میں کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم تک پیغام نہیں پہنچا تھا۔ انبیاء علیہم السلام دعوت دیتے رہے، مگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کی برادری نے کلمہ نہیں پڑھا، اپنے رشتہ داروں نے کلمہ نہیں پڑھا۔

عجوہ اور کھمبی کی فضیلت:

عجوہ کھجور کے بارے میں مفسر رحمہ اللہ نے جو حدیث بیان فرمائی ہے، یہ حدیث صحیح ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْعَجْوَةُ مِنَ الْجَنَّةِ وَ فِيهَا شِفَاءٌ مِنَ السُّمِّ. وَ الْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَ مَاؤُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ.))

''عجوہ جنت کے میووں میں سے ہے اور اس میں زہر سے شفا ہے اور کھمبی مَن کی ایک قسم ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لیے شفا ہے۔'' [جامع ترمذی، حدیث: ۲۰۶۶، باب: ما جاء في الكمأة والعجوة]

اس میں کوئی شک نہیں کہ عجوہ کھجور جنت سے آئی ہو۔ ہمارے لیے تو مدینہ بھی جنت ہے، لیکن اللہ کے آگے کیا

مشکل ہے، ہوسکتا ہے کہ جب آدم علیہ السلام جنت سے نیچے آئے ہوں تو ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جنت کی چیزیں بھیج دی ہوں۔ بہر حال "مَنّ" ایک نعمت تھی اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔ وَاللهُ أَعْلَمُ!

"مَنّ" کے مشابہ اشیاء:

بنی اسرائیل کے زمانے میں "مَنّ" ایسی چیز تھی جو بلا کاشت اور بغیر کسی محنت کے خود اُترتی تھی اور غذا کا کام دیتی تھی۔ ہمارے زمانے میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی چیزیں زمینوں میں پیدا فرمادی ہیں جنہیں کاشت نہیں کیا جاتا، بلکہ وہ خود بخود نکل آتی ہیں۔ جیسے "كَمْأَة" (کھمبی) ہے، اس کو اُگانے کے لیے کبھی کسی آدمی نے ہل نہیں چلائے، کبھی بیج نہیں بوئے، کبھی محنت نہیں کی اور سردی وگرمی سے کبھی اس کی حفاظت بھی نہیں کی، برسات کے موسم میں صحراء کے اندر وہ نکل آتی ہے۔ جیسے یہ اللہ کی نعمت ہے، ایسے اللہ کی ہزاروں نعمتیں ہیں۔

افریقہ کے جنگلات:

چنانچہ افریقہ کے جنگلات میں ایسے عجیب عجیب درخت ہیں جو پہلے نہ کبھی کسی نے دیکھے تھے اور نہ سوچے تھے۔ ان کے عجیب عجیب فوائد اور منافع ہیں کہ آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پھر ان کے پھل، ان کی شکلیں، ان کے ذائقے اور ان کی لذت بڑی عجیب ہوتی ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ بڑے بڑے ریسرچ سنٹرز مختلف درختوں کے پھلوں پر تجربات کر رہے ہیں اور اس تحقیق میں لگے ہوئے ہیں کہ ان کے اندر کیا کیا چیز ہے کہ جس وجہ سے ان کے اتنے فوائد ہیں۔ جہاں جہاں یہ درخت پائے جاتے ہیں، ان لوگوں نے باقاعدہ ایسے مقامات کو محفوظ کر لیا ہے۔

بلب کی طرح روشن پودا:

اسی طرح ایک پودا پایا جاتا ہے، خدا کی قدرت ہے کہ جب رات ہوتی ہے تو ایسے روشن ہوتا ہے جیسے بجلی کے چھوٹے چھوٹے بلب جل رہے ہوں۔ یہ نہیں کہ معمولی روشنی ہوتی ہے، بلکہ باقاعدہ کافی ساری روشنی ہوتی ہے۔

درختوں کے فوائد پر مشتمل کتاب:

ایک عالم نے کتاب لکھی، "کشف الاسرار فی فوائد الاشجار" اس کتاب کا نام ہے۔ اللہ نے درختوں کے اندر کیا کیا منافع رکھے ہیں؟ اور کون کون سی چیزیں اللہ نے اپنی قدرت سے پیدا فرمائی ہیں؟ اس بارے میں انہوں نے مستقل ایک کتاب لکھی ہے۔ اور مختلف ممالک میں پیدا ہونے والے درختوں اور ان کے فوائد ومنافع سے لوگوں کو

آگاہ کیا ہے۔

رات کی چاندنی:

ایک ایسی بوٹی بھی اس دنیا میں اللہ نے پیدا فرمائی ہے کہ جس کو دور سے دیکھیں تو آپ کو ایسے معلوم ہوگا جیسے زینت کے لیے چھوٹے چھوٹے بلب لگا کر چاندنی بنا دیئے گئے ہوں۔

قدرت کے کرشمے:

اسی طرح بعض اشجار ایسے ہیں...... اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے...... جنہیں کسی نے کاشت تو نہیں کیا، لیکن ان کے پھلوں میں اتنے فوائد ہیں کہ آدمی پڑھ کے حیران ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے ہیں۔ وہ اپنے وسیع خزانوں سے کوئی ایک نعمت اپنے بندوں کے لیے اُتار دیں تو ان کے آگے کیا مشکل ہے۔

آسمان سے دسترخوان کا اُترنا:

پروردگارِ عالَم بارشیں برساتے ہیں، نباتات اور جمادات پیدا فرماتے ہیں، ان کے لیے ایک خاص نعمت کا اُتارنا کون سا مشکل ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آسمان سے کھانا اُترنے کی دعا مانگی تھی: ﴿اَللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ [المائدۃ: ۱۱۴] اللہ تعالیٰ نے آسمان سے دسترخوان اُتار دیا تھا۔ ایسے کئی واقعات ہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنے خاص بندوں کے لیے اپنی طرف سے نعمتوں کا انتظام فرما دیتے ہیں۔

غیبی مدد:

ایسے واقعات بھی تاریخ میں موجود ہیں کہ ایک چھوٹا بچہ غار میں چھوڑ دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے بکری، ہرنی یا اس قسم کے کسی جانور کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ آکر اسے دودھ پلایا کرے۔ اللہ تعالیٰ تو قادر ہیں جو چاہیں اپنی نعمتوں میں سے پیدا فرما دیں۔

اڑھائی پتی بوٹی:

آپ کا جو عرفات کا میدان ہے یا اس کے ساتھ جو وادیاں لگتی ہیں اور طائف کی طرف جاتی ہیں، یہاں پر اللہ کی

قدرت سے ایک خاص بوٹی پیدا ہوتی ہے، وہ بڑی نایاب ہے۔

حضرت شیخ حسین علی رحمہ اللہ واں بھچراں کے علاقے کے تھے۔ بہت بڑے مفسر قرآن تھے، ساری زندگی درسِ قرآن دیتے رہے، عمر بھر اللہ کے قرآن کی نشر و اشاعت میں مصروف رہے۔ آپ کے ملک کے تقریباً بڑے بڑے سب علماء، قرآن پاک میں ان کے شاگرد ہیں۔ وہ ایک مرتبہ حج پر تشریف لائے تو انہوں نے اس بوٹی کا تذکرہ فرمایا۔ یہ چھوٹی سی بوٹی ہوتی ہے، اس کو ''اڑھائی پنی'' کہتے ہیں، دو پن اس کے سالم ہوتے ہیں اور ایک پن آدھا ہوتا ہے۔ قدرت کی شان یہ ہے کہ اگر کسی آدمی کو مل جائے اور آدمی اس کے پتے ہی کھالے تو قوت کے لیے اس سے اعلیٰ کوئی چیز آج تک پیدا ہی نہیں ہوئی۔

زخمی بندر اور اس کا علاج:

ایک آدمی نے ہمیں اپنا ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگا کہ میں جنگل میں سفر کر رہا تھا، میں نے دیکھا کہ ایک جھاڑی میں بندر بری طرح پھنس گیا ہے، وہ اتنی سخت جھاڑی تھی، اس کے کانٹے اتنے تیز تھے کہ وہ بندر کی ٹانگوں اور بدن میں گھس گئے تھے۔ بندر چیخ رہا تھا، مگر نکل نہیں پا رہا تھا۔ پہلے تو میں ڈر گیا کہ یہ اتنا بڑا بندر ہے، اگر میں اس کی مدد کروں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مجھے ہی نقصان پہنچا دے۔ لیکن آخر میں بھی انسان تھا، دل میں خیال آیا کہ ایک جانور کو تڑپتے ہوئے، مرتے ہوئے کیسے دیکھوں؟ چنانچہ میں جا کر اپنی لکڑی کے ذریعے بڑے آرام آرام سے کانٹے نکالے اور بندر کو درخت سے چھڑایا تو وہ نکل گیا۔ اس کے بعد میں بڑا خوش ہو گیا کہ چلو ایک جانور کی جان بچ گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ اس بندر نے ایک بوٹی سے جا کر کچھ پتے توڑے، ان کو چبایا اور پھر انہیں اپنے زخموں پر لگانے بیٹھ گیا۔

دیکھیں! بندر کو بھی اللہ نے اس بات کا علم دیا تھا کہ اگر یہ پتے لگا لو گے تو تمہارے زخم ٹھیک ہو جائیں گے۔



درآمداتِ جنت



حجرِ اسود:

بعض چیزیں حقیقتاً جنت سے اس دنیا میں آئی ہوئی ہیں، جبکہ بعض کو مجازاً جنت کی چیزیں کہا جاتا ہے۔



حجر اسود کا جنت سے ہونا یقینی ہے، اس کے اندر کوئی شبہ نہیں۔ یہ حقیقتاً جنت کے پتھروں میں سے ایک پتھر ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اسے یہاں بھجوایا گیا اور پھر اس کی حفاظت کی گئی۔ جب طوفانِ نوح آیا اور کعبۃ اللہ کی عمارت گر گئی تو یہاں ایک قلعہ بن گیا۔ اس وقت بھی خدا کی قدرت سے جبل ابی قبیس کے اوپر غار کے اندر اس کی حفاظت کی گئی۔ پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی عمارت بنائی تو اس کو اللہ کے حکم سے پہاڑ سے اُٹھا کر یہاں نصب کیا۔

عصائے موسوی:

اسی طرح بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا عصا...... جس کے بارے میں اللہ نے قرآن میں ذکر فرمایا ہے: ﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ⑰ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرٰى ⑱﴾ [طٰہٰ: ۱۷، ۱۸] ...... بھی جنت کی لکڑیوں میں سے ایک لکڑی تھی اور وہ موسیٰ علیہ السلام کو حضرت شعیب علیہ السلام سے ملا تھا۔ جب شعیب علیہ السلام کے گھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قیام فرمایا اور دس سال تک ان کی بکریاں چرانے کا معاہدہ قبول فرمالیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت شعیب علیہ السلام نے حکم دیا کہ گھر کے اندر لکڑیاں پڑی ہیں، ان میں سے کوئی ایک لکڑی اُٹھالو، تاکہ بکریاں لے جانے میں تمہارے لیے آسانی ہو۔ روایت میں آتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام وہ لکڑی خود لے کر آئے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بچی کو حکم دیا کہ اندر سے کوئی عصا اُٹھا کر موسیٰ (علیہ السلام) کو دے دو۔ جب وہ بچی عصا لے کر آئی تو شعیب علیہ السلام نے کہا: یہ تو نہ دو، یہ جا کر رکھ دو، اس کے علاوہ کوئی اور اُٹھا کر دے دو۔ جب اور اُٹھانے کے لیے بھیجا تو وہی عصا واپس آ گیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا: یہ موسیٰ (علیہ السلام) کو نہ دو، اس کے علاوہ کوئی اور دے دو، انہوں نے اس عصا کو پھر لکڑیوں میں ڈال دیا اور موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ کوئی چن لو تو موسیٰ علیہ السلام نے بھی اسی کو چن لیا۔ پھر شعیب علیہ السلام نے فرمایا: یہ وہ عصا ہے جو آدم علیہ السلام سے ہمارے پاس نقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام اس کو جنت سے ساتھ لائے تھے اور پھر اس کے بعد جوں جوں ان کی اولاد آتی گئی، یہ نقل ہوتا گیا، انبیاء علیہم السلام میں چلتے چلتے شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچا، حضرت شعیب علیہ السلام کے بعد وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس جب آیا تو اللہ نے اسے معجزۂ عظیمہ بنا دیا۔

دریائے فرات اور نیل:

روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ دریائے فرات اور دریائے نیل کی اصل بھی جنت سے ہے۔ یہ بھی روایات میں آتا ہے کہ دو دریا (دریائے نیل، دریائے فرات) اور دو نہریں (سیحون، جیحون) ہیں، ان کی اصل بھی جنت سے ہے۔[صحیح مسلم، حدیث:۲۸۳۹]

چونکہ اللہ تعالیٰ جنت اور جہنم کو پیدا فرما چکے ہیں، اس وقت جنت بھی موجود ہے اور جہنم بھی موجود ہے، جنت سے کوئی چشمہ آتا ہے اور ان میں گرتا ہے، ﴿وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝۲۰﴾ [ابراہیم:۲۰] اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی اصل جنت سے ہے۔

یہ تو بعض علماء کا قول ہے کہ یہ حقیقتاً جنت کی چیزیں ہیں۔

جبکہ دیگر بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ نہریں اور دریا حقیقتاً جنت سے نہیں نکالے گئے، بلکہ بطور تشبیہ کے کہا گیا ہے کہ ان کی اصل جنت سے ہے۔ اور تشبیہ کی وجہ یہ ہے کہ ان کا پانی اتنا اچھا ہے جیسا کہ وہ جنت کا پانی ہو۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان میں بہنے والا پانی بھی تو بارش کے ذریعے آسمان سے اُتارا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں اللہ نے حکم دیا تھا کہ آسمانوں کے دروازے کھول کر ان سے پانی برساؤ اور زمینوں کو بھی حکم دیا تھا کہ تم پانی نکالو۔ اور جب آسمان سے پانی برسایا گیا تو گویا یہ پانی جنت سے لایا گیا۔

اس میں کوئی اشکال والی بات ہی نہیں کہ جنت سے کیسے پانی آ رہا ہے؟ جب اللہ آسمانوں سے بارش برسا سکتے ہیں تو وہ اس بات پر بھی قادر ہیں کہ اس میں جنت کا پانی ڈال دیں۔

اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ تشبیہ اور بیان ایک مثال سمجھانے کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ نے اس دنیا میں جو باغات، پھل اور پھول پیدا فرمائے ہیں، یہ تو جنت کے باغات اور پھلوں کے مقابلے میں ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں...... جیسا کہ ہم محاورات میں بھی کہہ دیتے ہیں کہ جی...... ماشاء اللہ!...... آپ نے ایسا باغ لگایا ہے کہ دل خوش ہو گیا، گویا جنت میں آ گئے۔ حالانکہ حقیقی جنت تو اور ہے...... ورنہ حقیقی طور پر یہ نعمتیں جنت میں ملیں گی۔ یہاں تو یہ عارضی اور قابلِ فنا ہیں، یہ تو چند روزہ ہیں، جب دنیا فنا ہو جائے گی تو یہ نعمتیں بھی باقی نہیں رہیں گی۔ اصل نعمتیں عالَمِ آخرت کی نعمتیں ہیں، عالَمِ آخرت کبھی فنا نہیں ہوگا اور اس کی نعمتوں پر بھی زوال نہیں آئے گا۔

عجوہ کھجور:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ عجوہ کھجور جنت سے ہے۔[1] اگر اس کو حقیقت پر محمول کیا جائے تو بھی اللہ کے نزدیک یہ کوئی بعید نہیں ہے۔ یا پھر اس کو مجازاً جنت کا پھل کہا گیا ہو۔ وجہ یہ ہے کہ جس طرح جنت کے پھل نعمت عظیم ہوں گے، اسی طرح عجوہ کھجور بھی نعمتِ عظیمہ ہے۔ مدینہ منورہ کی تو ہر کھجور نعمت ہے۔ جو چیز بھی مدینہ منورہ کی سرزمین میں پیدا ہوتی ہے ہمارے لیے تو وہ نعمت ہی نعمت ہے، لیکن جس چیز کو خود سرکارِ دو عالم ﷺ جنت کی چیز قرار دیں تو اس کے نعمت ہونے میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے؟

کھجور کی بے شمار اقسام:

الحمد للہ! تقریباً چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی یہاں کے لوگ کھجوروں کی اقسام جانتے ہیں، وہ یہ بتلاتے ہیں کہ تقریباً تین سو سے اوپر کھجور کی اقسام ہیں جو اس ملک میں ملتی ہیں اور تقریباً ایک سو بیس سے زیادہ اقسام ہیں جو صرف مدینہ منورہ کے علاقہ میں ملتی ہیں...... ماشاء اللہ!......

کھمبی کی فضیلت:

❁...... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے بعض صحابہ آپس میں بحث فرما رہے تھے اور کہہ رہے تھے: "اَلْكَمْأَةُ جُدَرِيُّ الْأَرْضِ" (کھمبی زمین کی چیچک ہے)۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اَلْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَ مَاؤُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ" (کھمبی "مَن" کی ایک قسم ہے اور اس کا پانی آنکھوں کی بیماریوں کے لیے شفا ہے)۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۰٦۸، باب: ما جاء في الكَمْأةِ والعجوة]

❁...... حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَ فِيْ يَدِهٖ كَمْأَةٌ" (حضور اکرم ﷺ ہمارے تشریف لائے تو آپ کے ہاتھ میں کچھ کھمبیاں تھیں)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "هٰذَا مِنَ الْمَنِّ، وَ مَاؤُهٗ شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ" (یہ مَن کی ایک قسم ہے اور اس کا پانی اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کے لیے شفا بنایا ہے)۔
[مسند أحمد، حدیث: ۱۱۲۳۴]

[1] [سنن الترمذی، حدیث: ۲۰٦۸، باب: ما جاء في الكَمْأةِ والعجوة]

کیا کھمبی شجرۂ خبیثہ ہے؟

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیٹھے آپس میں بحث کررہے تھے کہ وہ کون سا درخت ہے جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِن فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِن قَرَارٍ﴾ [ابراہیم:۲۶] (اور ناپاک کلمے کی مثال ایک خراب درخت کی طرح ہے جسے زمین کے اوپر ہی اوپر سے اُکھاڑ لیا جائے، اس میں ذرا بھی جماؤ نہ ہو)۔ بعض صحابہ کہنے لگے کہ وہ کھمبی ہے، کیونکہ اس کی جڑ نہیں ہوتی۔ بس ایسے زمین پر کھڑی ہوتی ہے، آسانی سے اُکھاڑا جاسکتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سنا تو فرمایا: ''اَلْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَ مَاؤُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ'' (کھمبی تو مَن کا حصہ ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لیے شفا ہے)۔

[مسند احمد بن حنبل، حدیث:۹۴۶۵]

کلمۂ خبیثہ سے مراد؟

کلمۂ خبیثہ سے شرک وکفر پر مبنی اور توحید کے مخالف کلمات مراد ہیں، اس کی مثال ایسا خراب درخت ہے جس کی کوئی مضبوط جڑ نہ ہو، بلکہ وہ خود اُگ آئے، اس میں جماؤ بالکل نہیں ہوتا، تھوڑا سا ہوا کا جھونکا آئے تو وہ گر جاتا ہے۔ اسی طرح مشرکین کے عقائد کی کوئی عقلی یا نقلی بنیاد نہیں ہوتی، جب ایک طرف سے تھوڑی سی آزمائش آتی ہے تو دوسری طرف جھک جاتے ہیں۔

شجرۂ خبیثہ سے مراد؟

''شجرۂ خبیثہ'' سے مراد ''تھوہر کا درخت'' ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ قرآن نے ایک مثال دی ہے، کسی درخت کو معین نہیں کیا، اس لیے ہمیں بھی متعین کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

شجرۂ طیبہ:

اس کے بالمقابل قرآن مقدس میں ایک شجرۂ طیبہ کی مثال بھی ذکر کی گئی ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: ﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ﴾ [ابراہیم:۲۴] کلمہ طیبہ (کلمۂ شہادت) ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ'' کی مثال ایسے ہے جیسے ایک پاکیزہ بہترین درخت ہوتا ہے، اس کی جڑیں زمین میں ہوتی ہیں، وہ مضبوط ہوتا ہے اور اس کی شاخیں آسمان کی طرف بلند ہوتی ہیں، اور وہ اللہ کے

حکم سے لوگوں کو کھانے کے لیے پھل بھی دیتا ہے۔

توحید کی رسی:

جب کوئی آدمی توحید پر استقامت اختیار کر لیتا ہے تو گویا اس نے ایک ایسے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو اس کو کبھی نقصان نہیں پہنچاتا۔ اسی لیے اللہ نے حکم دیا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ [آل عمران: ۱۰۳] اللہ کی رسی کو پکڑو۔ روایات کے مطابق وہ رَسی ''قرآن پاک'' ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تم قرآن پاک کو مضبوطی سے پکڑ لو گے تو یہ تمہیں جنت میں پہنچا دے گا۔

''سلویٰ'' کون سا جانور تھا؟

❁......حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سلویٰ ایک پرندہ تھا جو اللہ نے ان کے لیے بھیجا۔ وہ پرندہ ایسے تھا جیسے بٹیر ہوتا ہے، وہ اس کو کھاتے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۶]

بٹیر کے گوشت کی افادیت:

علم حیوانات کے ماہر علماء نے لکھا ہے کہ بٹیر کا گوشت دلوں کو نرم کرتا ہے، یعنی دل کی شقاوت اور شدت کو نرمی میں تبدیل کرتا ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل کے دلوں میں عجیب شقاوت آ گئی تھی کہ وہ معجزہ دیکھنے کے بعد بھی کفر کر رہے تھے۔ اس لیے ان کو بطور علاج سلویٰ (بٹیر کا گوشت) کھلایا گیا۔

❁......حضرت عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سلویٰ، جنت کے پرندوں میں سے ایک پرندہ تھا، جو چڑے سے بڑا ہوتا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۶]

❁......حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سلویٰ ایک سرخی مائل پرندہ تھا۔ جنوب سے جب ہوا چلتی تو ہوا ان کو اُڑا کر ان کے پاس لے آتی اور وہ پرندوں کو پکڑ لیتے، اور جتنا انہوں نے کھانا ہوتا، اس کو ذبح کر لیتے۔ اگر اس سے زیادہ رکھتے تو وہ گوشت خراب ہو جاتا تھا۔ یعنی ضرورت سے زیادہ محفوظ کرنے کی ان کو اجازت نہیں تھی۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۶، ۹۷]

جائز ذخیرہ اندوزی:

ہماری شریعت میں اس کی اجازت ہے کہ آدمی اپنے گھر میں ہفتے، مہینے یا سال کا خرچ رکھے۔ حضور اکرم ﷺ

بھی اپنی بیویوں کو سال سال کا خرچ اکٹھا دے دیتے تھے، ہر بیوی کو سال بھر کا خرچہ دیا جاتا تھا، لیکن آپ ﷺ کی بیویاں اتنی سخی تھیں کہ وہ ملنے والا نان نفقہ اللہ کے راستے میں خرچ کر دیتی تھیں اور مہینے کے بعد کہتیں کہ ہمارے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ پھر عطا فرماتے اور وہ پھر سخاوت کر دیتیں۔

جاہلانہ توکل:

اس میں بھی اُمت کے لیے ایک سبق تھا کہ آدمی یہ نہ سوچے کہ آج جو کچھ کمایا ہے، وہ کھالو، کل کو دیکھا جائے گا۔ آج کا مسلمان نماز پڑھتا نہیں ہے اور کہتا ہے کہ مجھے اللہ پر بڑا توکل ہے۔ بھئی! جب تمہاری زندگی میں نماز، روزہ نہیں ہے، دین اسلام تو دور کی بات ہے، اس کی شکل تک تمہارے پاس نہیں ہے تو تم متوکل کیسے بن گئے؟ اگر اللہ پر تمہارا یقین ہوتا تو کیا اللہ کا فرض ادا نہ کرتے؟ اگر تمہارا اللہ پر یقین ہوتا تو کیا اللہ کے عذاب سے نہ ڈرتے؟ اللہ تعالیٰ پر یقین ہوتا تو کیا تم اس کے حکم پر نہ چلتے؟ یہ محض جہالت ہوتی ہے کہ شرابی کبابی لوگ بھی کہتے پھرتے ہیں: جی! ہمارا اللہ پر بڑا یقین ہے، اللہ میاں ہمیں دے گا۔

رزق کا ذمہ دار...... صرف اللہ!!

اللہ کے بندے! غذا تو کتے کو بھی مل جاتی ہے۔ یہ کون سی بہادری ہے؟ اللہ نے جو جانور اس دنیا میں پیدا کیے ہیں، کیا وہ ان کو خوراک نہیں دیتا؟ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں: ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ [ہود: ۶] جو بھی زمین پر چلنے والی چیزیں ہیں جو ہم نے پیدا کی ہیں: کیڑے ہیں، حشرات ہیں، جانور ہیں، حلال ہیں، حرام ہیں، سب کو ہم رزق دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو جانور گوشت کھاتے ہیں، ان کو روزانہ گوشت مل جاتا ہے، بعض پرندے مچھلی کھاتے ہیں تو ان کو روزانہ مچھلی مل جاتی ہے، بعض جانور صرف جانور کو مار ڈالتے ہیں اور اس کی اوجھڑی نکال کر کھاتے ہیں، بعض جانور ایک قسم کا گھاس کھاتے ہیں اور کوئی شئے نہیں کھاتے تو اللہ تعالیٰ ان کو وہی گھاس عطا فرما دیتے ہیں۔

پہلے نافرمانی...... پھر سرکشی:

یہ کوئی معقول بات نہیں ہے کہ آدمی شراب پیے اور کہے کہ میرا اللہ پر توکل ہے، چرس پیے اور اور کہے کہ میرا اللہ پر توکل ہے۔ نماز کبھی پڑھی نہیں اور کہتا ہے کہ خدا پر میرا بڑا یقین ہے۔ خاک یقین ہے تمہیں، جب تم خدا کی نماز ہی

نہیں پڑھتے ہو؟ جب تم اللہ کے فرائض کو بھی ادا نہیں کرتے ہو؟ پھر کہتے ہو کہ حضور اکرم ﷺ ہمارے بڑے شَفِیعُ الْمُذْنِبِیْن ہیں، وہ قیامت کے دن ہماری شفاعت کریں گے۔ کیا یہ سرکشی نہیں؟ ایک نافرمانی اور پھر اوپر سے سرکشی......!!!

بدعتی، شفاعت سے محروم:

حضور اکرم ﷺ نے خود فرمایا کہ میں حوضِ کوثر پر کھڑا ہوں گا، میری اُمت کے لوگوں کو فرشتے دھکے دے کر دور ہٹا رہے ہوں گے، حوضِ کوثر پر نہیں آنے دیں گے۔ حضور اکرم ﷺ فرمائیں گے: ان کو آنے دو، یہ تو میرے ہیں۔ فرشتے کہیں گے: یا رسول اللہ! یہ آپ کی اُمت کے وہ لوگ ہیں، جنہوں نے بدعتیں ایجاد کی تھیں۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں کہوں گا: ''سُحْقًا لَهُمْ'' (اللہ ان کو برباد کرے) ان کو میرے آگے سے ہٹاؤ، حوضِ کوثر سے دور لے جاؤ۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۶۵۸۴، باب: فِي الْحَوضِ]

جب حضور اکرم ﷺ ایک بدعتی کو پانی پلانے کے لیے تیار نہیں ہیں تو کیا اس کی شفاعت فرمائیں گے؟ جب ایک بدعتی کو حضور ﷺ اپنے قریب نہیں آنے دیں گے تو قبروں پر سجدے کرنے والوں کے لیے شَفِیْعُ الْمُذْنِبِیْن کیسے ہوں گے؟ حضور ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں، مگر ان کے لیے جن کا ایمان وعقیدہ توحید کے مطابق ہے اور وہ اتباعِ سنت کرنے والے ہیں۔ ہاں! جو آپ کی اُمت کے صحیح العقیدہ گناہگار ہوں گے، لازماً ان کے لیے شفاعت ہوگی اور اللہ تعالیٰ انبیاء کی سفارش قبول فرمائیں گے۔

غفور رحیم...... جبار اور قہار:

اسی طرح یہ کہنا کہ مولوی لوگ ایسے ہی ڈراتے رہتے ہیں، اللہ بڑا غفور ورحیم ہے، وہ بخشنے پہ آئے تو کافروں کو بھی بخش دیتا ہے۔ جی ہاں! اللہ بڑا غفور ورحیم ہے۔ مگر مجھے بتاؤ: جہاں اللہ رحمٰن اور رحیم ہے وہاں قہار نہیں ہے؟ جہاں غفور ہے وہاں ''عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَام'' نہیں ہے؟ جہاں غفور ہے وہاں ''سَرِيْعُ الْحِسَاب'' نہیں ہے؟ جہاں غفور ہے وہاں ''شَدِيْدُ الْعِقَاب'' نہیں ہے؟ جب تم نے غفور ورحیم پڑھا ہے تو یہ بھی پڑھو، تب ایمان بنے گا، جب ایمان بین الخوف والرجاء آئے گا۔ صرف اُمیدیں باندھتے چلے جاؤ اور خدا کا ڈر دل میں نہ ہو تو یہ ایمان نہیں کہلاتا۔ یہ تو جاہلوں والی بات ہے کہ جب ایک آدمی سے کہا جائے کہ نماز پڑھو تو وہ جواب دے کہ دعا کرو، اللہ بڑا غفور رحیم

ہے۔ بھائی! اسی غفور نے تو نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ تمہیں اگر اس غفور کی رحمت اور مغفرت پر یقین ہے تو اس کا حکم بھی مانو۔

مثال سے وضاحت:

تم یہاں ایک آدمی کے پاس نوکری کرتے ہو اور بارہ سو یا دو ہزار یا چار ہزار ریال تمہیں تنخواہ ملتی ہے۔ تم دو چار دن کام کرنے نہ جاؤ، ڈیوٹی نہ کرو۔ اور جو آدمی تمہیں ملے اور کہے کہ تم نوکری پر کیوں نہیں گئے؟ تو تم اس کے جواب میں کہہ دینا کہ میرا کفیل بڑا مہربان ہے، مجھے کام کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ایک ہفتہ تجربہ تو کر کے دیکھو! پھر پتہ چل جائے گا کہ وہ کیسے مہربانی کرتا ہے؟ وہ تو یہاں تمہارے پاؤں بھی نہیں لگنے دے گا اور سیدھا گھر پہنچائے گا، اگلی پچھلی کمائی بھی لے لے گا اور کہے گا کہ جو میرا نقصان ہوا ہے، وہ بھی ادا کرو۔

تم ایک بندے کا حق مارتے ہو تو وہ اتنا ناراض ہو جاتا ہے اور جس خالق و مالک نے تمہیں پیدا کیا ہے، تم ہر لمحہ اس کی نافرمانی کرو اور پھر کہو کہ وہ بڑا غفور ہے تو وہ کتنا ناراض ہوگا؟ اس کے غفور ہونے میں کوئی شک نہیں، لیکن ہم بھی تو کچھ حیا کریں، ہم بھی تو اس کی بندگی اور اطاعت کریں۔ ہاں! بندے ہیں، خطا ہو جاتی ہے، وہ غفور اور رحیم ہے، رحم کا معاملہ فرما دے گا۔ لاکھ ہم نیک بن جائیں، پھر بھی کوئی نہ کوئی خطا تو ہو ہی جائے گی۔ لاکھ ہم صالح بن جائیں، پھر بھی کہیں نہ کہیں بندہ غلطی کر بیٹھتا ہے، لاکھ ہم عابد بن جائیں، پھر بھی کچھ نہ کچھ خطائیں ہمارے اندر موجود ہوں گی۔ واقعی! وہ غفور رحیم ہیں، اپنی رحمت سے معاف فرما دیں گے۔

خوف اور اُمید کے درمیان:

یاد رکھیں! ایمان اسے کہتے ہیں کہ سزا کا ڈر ہو اور رحمت کی اُمید بھی ہو۔ صرف ڈر ہو تب بھی ایمان نہیں بنتا اور صرف اُمیدیں لگانے سے بھی ایمان نہیں بنتا۔ ایمان تب ہوگا جب دونوں چیزوں کو سامنے رکھا جائے گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اور مجھے بھی ایسا ایمان نصیب کرے۔ (آمین)

بٹیر کے ڈھیر:

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمیں کھانے کے لیے گوشت چاہیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ نے فرمایا: ہم ان کو ایسا گوشت دیتے ہیں جو دنیا میں بہت قلیل



پایا جاتا ہے، بہت قیمتی اور نایاب گوشت ہے۔ چنانچہ اللہ نے ہوا کو حکم دیا تو ہوا نے ان کے گھروں کے پاس آ کر بٹیر ایک مربع میل میں بکھیر دیئے، یعنی ایک مربع میل کے اندر غذا ہی غذا ہے اور نیزے اتنا اونچا ڈھیر لگا دیا۔ اور فرمایا کہ اپنی ضرورت کے مطابق لے لو، لیکن انہوں نے ضرورت سے زائد لینا شروع کر دیا۔ جب زیادہ لے لیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ سارے گوشت میں بدبو پڑ گئی اور جو کھانے کے لیے بنایا تھا، وہ بھی خراب ہو گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۷]

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا رزق:

حضرت اسماعیل علیہ السلام جب مکہ میں تشریف لے آئے تو ان کی ابتدائی غذا زمزم کا پانی تھا، اس کے علاوہ حضرت اسماعیل علیہ السلام جنگل سے جو پرندے وغیرہ شکار کر کے لاتے تھے، ان پر گزارہ ہوتا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گھر تشریف لائے تو ان کی بیوی سے پوچھا کہ تمہارا کیسا گزارہ ہو رہا ہے؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بیوی نے کہا کہ ہمارا گزارہ تو بڑا مشکل ہو رہا ہے، صرف پانی ملتا ہے یا پرندے ملتے ہیں، جنہیں بھون بھون کر ہم کھا لیتے ہیں، اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں ملتی۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام ناراض ہوئے کہ یہ عورت تو اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتی ہے۔ [الکامل فی التاریخ ۱/ ۳۴]

ہر حال میں شکر کی تعلیم:

یاد رکھیں! ہمیں اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی دے رہا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ثُمَّ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! گوشت کھلائے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور بھوکا سلائے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، روٹی مل جائے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! لیکن یہ مقام ملنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اللہ ہمیں صابر بنا دے۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ اور ایک نوجوان کا واقعہ:

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں زندگی میں ایک نوجوان سے جتنا شرمندہ ہوا، کسی سے اور اتنا شرمندہ نہیں ہوا۔ مریدوں نے پوچھا: حضرت! وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا: ایک لڑکا جو اٹھتی جوانی کی عمر میں تھا...... بلخ، بخارا کی طرف سے تھا۔ جہاں امام بخاری رحمہ اللہ پیدا ہوئے ہیں، اس سرزمین نے بڑے لوگ پیدا کیے ہیں، اللہ تعالیٰ ان ائمۂ حدیث کی قبور پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے...... میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور کچھ دن رہا اور لنگر میں کھا لیتا۔

میں نے ایک دن اس سے پوچھا: آپ کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! اللہ کا شکر ہے۔ پھر اس نے پوچھا: حضرت! آپ کا کیا حال ہے؟ میں نے کہا: اللہ کا بڑا شکر ہے، مل جاتا ہے تو شکر کرتے ہیں، نہیں ملتا تو صبر کرتے ہیں۔ اس پر وہ نوجوان ہنس پڑا۔ میں نے پوچھا: اللہ کے بندے! ہنستے کیوں ہو؟ اس نے کہا: حضرت! ہمارے علاقے میں کتوں کا بھی یہی حال ہے کہ ملے تو کھالیتے ہیں، نہ ملے تو چپ چاپ سو جاتے ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں حیران ہوا کہ یہ تو بہت مرتبے والا آدمی ہے، میں تو اس کو عام نوجوان سمجھتا رہا۔ پھر میں نے پوچھا: تمہارے ہاں جو اللہ والے لوگ ہیں، ان کا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: ان کو مل جاتا ہے تو دوسروں کو دے دیتے ہیں اور نہ ملے تو شکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے مولا! آپ ہمیں آزمارہے ہیں، ہمیں نہ ملے تب بھی راضی ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا امتیازی وصف:

اللہ نے قرآن مجید میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ وصف بیان فرمایا ہے کہ وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دینے والے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر:۹] (اور ان کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے ان پر تنگ دستی کی حالت گزر رہی ہو)۔

ایک صحابی کا ایثار:

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: یارسول اللہ! میں سخت حاجت مند ہوں، مجھے کچھ کھلوایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھروں میں آدمی بھیجا، لیکن تمام گھروں سے جواب ملا کہ حضور! ہمارے پاس خود کچھ نہیں۔ یہ معلوم کرکے پھر آپ نے اور لوگوں سے کہا: کوئی ہے جو آج کی رات انہیں اپنا مہمان رکھے؟ ایک انصاری اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا: حضور! میں انہیں اپنا مہمان رکھوں گا۔

چنانچہ یہ لے گئے اور اپنی بیوی سے کہا: دیکھو! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں، آج گو ہمیں کچھ بھی کھانے کو نہ ملے، لیکن یہ بھوکے نہ رہیں۔ بیوی نے کہا: آج گھر میں بھی برکت ہے، بچوں کے لیے البتہ کچھ ٹکڑے رکھے ہوئے ہیں۔ فرمایا: دے دو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مہمان ہے، پہلے اس کو کھلا دوں۔ جب میں روٹی رکھ لوں تو تم طریقے سے دیا بجھا دینا، تاکہ مہمان یہ سمجھے کہ ہم کھا رہے ہیں اور دراصل ہم کھائیں گے نہیں۔ وہ بیچارا یہ نہ سمجھے کہ

گھر والے بھوکے ہیں اور میں کچھ ان کو کھانا واپس کروں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ مہمان نے پیٹ بھر کر کھانا کھالیا۔

صبح جب یہ صحابی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو آپ نے فرمایا کہ تمہارے اور تمہاری بیوی کے رات کے عمل سے اللہ تعالیٰ خوش ہوا اور ہنس دیا۔ پھر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

[صحیح بخاری، حدیث: ۴۷۹۸، بابُ قَوْلِ اللَّهِ: وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ...]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عادت مبارک تھی کہ جب تک گھر میں مہمان نہ آتا تو روٹی نہیں کھاتے تھے۔ اتنے مہمان نواز تھے!! اور اگر مہمان نہ ملتا تو گھر سے نکل جاتے، باہر سے گزرنے والے کسی آدمی کو بلا لیتے کہ آپ میرے ساتھ کھانا کھالیں۔ اور اگر وہ بھی نہ ملتا تو گھر والوں سے کہتے کہ آپ کھالیں، میں نہیں کھاتا۔

اللہ کے فرشتے ان کے پاس آئے، انہوں نے سلام کیا، ابراہیم علیہ السلام نے سلام کا جواب دیا، ﴿فَرَاغَ إِلَىٰ أَهْلِهِ﴾ پھر چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گئے، ﴿فَجَاءَ بِعِجْلٍ سَمِينٍ﴾ [الذاریات: ۲۶] اور ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا، تیار کیا، اُٹھا کر مہمانوں کے سامنے رکھ دیا اور فرمایا: کھاؤ۔ انہوں نے کہا: ہم تو نہیں کھاتے۔

''رَاغَ'' کا معنی ہوتا ہے: چپکے سے نکل جانا۔ یعنی ان کو پتہ بھی نہ چلنے دیا کہ میں گھر سے تمہارے لیے کچھ لانے جا رہا ہوں، اس خیال سے کہ کہیں یوں نہ کہہ دیں کہ بیٹھیں بیٹھیں! کیوں تکلیف کر رہے ہیں؟ یہ کریم لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے۔

مہمان نوازی اور مغربی تہذیب:

اصل میں مہمان سے پوچھنا، انگریزی تہذیب کا حصہ ہے، اسلام کی تہذیب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مہمان سامنے بیٹھا ہوتا ہے اور پوچھ رہے ہوتے ہیں کہ آپ ٹھنڈا پئیں گے یا گرم؟ آپ چائے پئیں گے؟ آپ کیا پینا پسند فرمائیں گے؟ شریف مہمان تو یہی کہے گا کہ رہنے دو، تکلیف نہ کرو۔

مہمان نوازی اور اسلامی تہذیب:

اسلام یہ کہتا ہے کہ اگر کوئی آدمی تمہارے گھر میں آیا ہے تو اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ بھی

ضروری نہیں ہے کہ تم کھانے پکاؤ اور دعوتیں کرو، بلکہ جو کچھ گھر میں تیار ہو وہی پیش کر دو۔ چائے کا وقت ہو تو چائے پلا دو، گرمی ہو تو شربت پلا دو، کھانے کا وقت ہے تو کھانا پیش کر دو۔ اور اگر ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہو تو سادہ پانی ہی پلا دو۔ مہمان خود سمجھ جائے گا کہ اس غریب کے گھر میں یہی کچھ تھا۔ اگر اس کے علاوہ اور کوئی چیز ہوتی تو یہ ضرور مجھے پیش کر دیتا۔

آپ اندازہ لگائیں! انگور کا ایک دانہ بھی کوئی چیز ہے!؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس اگر انگور کا ایک دانہ ہوتا اور باہر دروازے پہ کوئی سائل آ جاتا تو وہ انگور کا دانہ اُٹھا کر اُسے دے دیتے تھے کہ ہمارے پاس تو یہی تھا، تم کھا لو۔

نہ تصدیق...... نہ تکذیب:

اسرائیلی روایات کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا تُكَذِّبُوْهُمْ وَ لَا تُصَدِّقُوْهُمْ" کہ جب اہل کتاب تمہارے سامنے کوئی دلیل پیش کریں تو نہ ان کو جھٹلایا کرو اور نہ ہی ان کی تصدیق کیا کرو، بلکہ یہ کہا کرو: ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ...... الآیۃ﴾ [البقرة: ۱۳۶] جو ہم پر اللہ نے اُتارا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے، اور جو اللہ نے تمہارے انبیاء پر اُتارا ہے اس پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ بنی اسرائیل جتنی روایات کریں گے ہم ان کے بارے میں یہی کہیں گے: "لَا نُصَدِّقُ وَ لَا نُكَذِّبُ" (نہ ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ ہی تکذیب کرتے ہیں)۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۴۴۸۵، باب: قُوْلُوْا آمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا]

اسرائیلی روایات کا حکم:

علماء نے ایک قاعدہ بیان کیا ہے کہ جو بات آپ کو تورات یا انجیل میں ملے، اگر وہ قرآن اور حدیث مبارک کے مطابق ہو تو آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر لو۔ اور اگر وہ قول اللہ کے قرآن یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے خلاف ہو تو اس کو چھوڑ دو۔ کیونکہ جب ایک قول اللہ کے قرآن اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے خلاف ہے تو وہ کبھی سچا نہیں ہو سکتا۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں: یا تو اس میں تحریف کی گئی ہو گی یا پھر وہ منسوخ ہو گا، اس لیے ہم اس کو ردّ کر دیں گے۔ اور اگر ایسا قول ملا ہے جو قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تصدیق یا تکذیب نہیں کرتا، یعنی محض ایک فائدہ ہے معلومات کا، نہ ہمارے موافق ہے اور نہ ہمارے مخالف ہے تو اس کے بارے میں قاعدہ یہی ہے: "لَا نُصَدِّقُهُمْ وَ لَا نُكَذِّبُهُمْ" ہم کہہ دیں گے کہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ البتہ کتابوں میں اسے نقل کر دیں گے،

تا کہ پڑھنے والے کو ایک طرح کا فائدہ حاصل ہو جائے۔

تاریخی معلومات سے علماء کو فائدہ حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علماء و مفسرین اسرائیلی روایات کو اپنی کتابوں میں افادہ اور استفادہ کی غرض سے لکھ دیتے ہیں، لیکن ان پر سو فیصد اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

بنی اسرائیل کی اکثر روایات مَن گھڑت ہوتی ہیں۔ انہی کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے: ﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا...... الآية﴾ [النساء: ۴۶] لہٰذا جو لوگ اللہ کی کتابوں اور اس کے کلمات کو بدل ڈالیں، ان کے موارد، مفہوم اور معانی کو تبدیل کر دیں، ان کے کسی قول پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت سدی رحمہ اللہ کا یہ بھی قول ہے کہ سلویٰ پرندے چونکہ اللہ نے ان کے لیے خصوصی طور پر بھیجے تھے تو وہ بھی ایسے تھے کہ ان کے قریب آ جاتے، وہ دیکھتے کہ اگر موٹا تازہ ہے تو اس کو پکڑ کر ذبح کر دیتے اور اگر کمزور ہوتا تو اس کو چھوڑ دیتے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۷]

روزہ توڑنا گوارا نہیں:

ایک صحابی کا واقعہ پڑھ رہا تھا کہ میدانِ جنگ میں زخمی ہو کر گرے ہوئے تھے اور اُٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ ایک اور صحابی ان کے پاس پہنچے اور پوچھا: پانی وغیرہ چاہیے؟ انہوں نے کہا: ایک تو میری یہ تمنا پوری کر دو کہ مجھے پکڑ کر دشمن کے قریب کر دو، تا کہ لیٹے لیٹے دشمن کو ماروں، اور دوسری یہ کہ اگر تمہارے پاس پانی ہے تو میری ڈھال میں رکھ دو، میں اس وقت روزے کے ساتھ ہوں، اگر افطار تک اللہ نے زندہ رکھا تو اسی سے افطار کر لوں گا۔

دیکھیے! اس جان کنی کی حالت میں بھی وہ صحابی روزہ نہیں توڑ رہے ہیں، بلکہ افطاری کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔

حقوق العباد کی اہمیت:

ایک آدمی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی عورت کا تذکرہ کیا کہ وہ بہت نفلیں پڑھتی ہے، تہجد پڑھتی ہے، اشراق پڑھتی ہے، اوابین پڑھتی ہے، تلاوتِ قرآن کرتی ہے اور بڑی عابدہ، زاہدہ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ بتلاؤ کہ اس کا ہمسائیوں کے ساتھ سلوک کیسا ہے؟ صحابی نے عرض کیا: حضور! اس کے ہمسائے تو سب ناراض ہیں، کسی کو گالی دیتی ہے اور کسی سے لڑتی جھگڑتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے لیے جہنم ہے۔ اس کو نوافل پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اسی طرح ایک دوسری عورت کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ تو صرف فرض نماز اور سنتِ مؤکدہ پڑھتی ہے، کوئی نفل نماز نہیں پڑھتی اور نفلی روزہ بھی نہیں رکھتی، صرف رمضان کے (فرض) روزے رکھتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: اس کا ہمسائی عورتوں کے ساتھ تعلق کیسا ہے؟ صحابی نے عرض کیا: ماشاء اللہ! بڑے اچھے تعلقات ہیں، کسی کے پاس آٹا نہیں ہوتا تو اس کے ہاں آٹا بھیج دیتی ہے، لسی ہو تو وہ بھیج دیتی ہے، دہی ہو تو وہ بھیج دیتی ہے، کسی کے پاس نمک نہ ہو تو وہ بھیج دیتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ جنتی عورت ہے۔

[مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۴۹۹۲، بَابُ: الشَّفَقَةِ وَالرَّحْمَةِ عَلَى الْخَلْقِ]

خاوند کو ناراض کرنے والی عورت کے بارے میں وعید:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایک عورت ساری رات مصلّے پر کھڑی ہے، تہجد پڑھ رہی ہے۔ خاوند نے بلایا کہ میرے پاس آؤ۔ خاوند کی خواہش تھی، لیکن اس نے کہا کہ میں نفل پڑھ رہی ہوں۔ خاوند نے بلایا کہ میری تمنا ہے تو کہا کہ میں ابھی نماز سے فارغ ہوتی ہوں، نماز پڑھ رہی ہوں۔ ایسی عورت کے بارے میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر خاوند ناراض ہو کر لیٹ گیا تو اللہ کے فرشتے اس عورت پر لعنت کرتے ہیں۔ تمہارے ذمہ پہلے خاوند کی اطاعت تھی، نفل پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟

[صحیح البخاري، حدیث: ۳۲۳۷، بَابُ: إِذَا قَالَ أَحَدُكُمْ: آمِينَ وَالمَلاَئِكَةُ...]

نفلی روزہ کے لیے خاوند سے اجازت لینا:

اس لیے شریعت نے پابند کر دیا کہ کوئی عورت نفلی روزہ نہیں رکھ سکتی، جب تک کہ اپنے خاوند سے اجازت نہ لے کہ میں کل روزہ رکھ لوں؟ یا اگر وہ جانتی ہے کہ میرا خاوند بڑی قوت والا ہے، اس کو کسی نہ کسی وقت دن میں بھی خواہش ہو جاتی ہے تو وہ عورت روزہ نہ رکھے۔

امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی عدالت میں بیوی کا مقدمہ:

حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دربار میں ایک خاوند نے بیوی کے خلاف مقدمہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ امیر المؤمنین! یہ میری بیوی ہے، میرے نکاح کو ٹھیک چھ ماہ گزرے ہیں اور بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ لازمی بات ہے ......نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ!...... یہ عورت میرے نکاح سے پہلے حاملہ تھی، اس نے مجھ سے حمل چھپایا...... کیونکہ کسی

کو دو تین ماہ کے حمل کا پتہ نہیں لگتا، حمل چار مہینے کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ کافی مہینے تک تو پیٹ ظاہر نہیں ہوتا...... انہوں نے کہا کہ حضرت! انہوں نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے اور یہ میرا بچہ نہیں ہے، بلکہ یہ زنا سے پیدا ہوا ہے۔ مہربانی کریں اور میری عورت کو سزا دیں۔

عورت سے پوچھا گیا تو اس نے کہا: امیر المؤمنین! میرا اللہ جانتا ہے، میں ہر قسم کی قسم کھا سکتی ہوں کہ میں نے تو زندگی میں کبھی زنا نہیں کیا، یہ بچہ اسی کا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اتنی مختصری مدت میں بچہ پیدا ہو؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس بات پر عزم کرلیا کہ عورت کو سزا دی جائے۔ اتفاقاً حضرت علی کو اس مسئلے کے لیے بلایا گیا اور مشورہ لیا...... یہ تو شوریٰ تھی، ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ [شوریٰ: ۳۸] کہ جب کوئی مشکل پیش آجائے تو مشورہ کرو۔ اور مشورہ کس سے کرو؟......

بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ جب آئے تو انہوں نے سارا قصہ سنا، خاوند کی باتیں سنیں، عورت کی باتیں سنیں، ان کے جوابات سنے اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے سنی اور پھر انہوں نے کہا کہ اس عورت کو بالکل سزا نہ دیں۔ یہ عورت بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے، یہ بچہ اسی مرد کا ہے۔ یہ خاوند بیچارا غلط فہمی کے اندر مبتلا ہے، کیونکہ اس کے دماغ میں ایک بات بیٹھی ہوئی ہے کہ نو مہینے سے پہلے بچہ پیدا نہیں ہوتا اور بچہ چھ مہینے میں پیدا ہوگیا۔ اس وجہ سے وہ بیچارا اپنی بیوی پر شک کررہا ہے، حالانکہ قرآن کھول کر پڑھ لو، قرآن کہتا ہے: ﴿وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً...... الآية﴾ [الاحقاف: ۱۵] کہ حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہے۔ اور دوسری جگہ قرآن میں ارشاد فرمایا: ﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ۖ لِمَنْ أَرَادَ أَن يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ [البقرۃ: ۲۳۳] کہ جو بچوں کو دودھ پلانا چاہیں تو دو سال تک پلائیں۔ ایک طرف آتا ہے کہ حمل سے لے کر دودھ چھڑانے تک تیس مہینے ہوتے ہیں اور دوسری طرف قرآن میں آتا ہے کہ دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے اور وہ چوبیس مہینے ہوتے ہیں۔ تیس سے چوبیس نکالو تو باقی چھ مہینے بچ گئے۔ لہٰذا حمل چھ مہینے کا ہوسکتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب سنا تو فرمایا: یہ تو بالکل ٹھیک ہے، یہ تو اللہ کے قرآن کا مسئلہ ہے۔ اور ان کو کہا کہ جاؤ، عورت ٹھیک کہہ رہی ہے، سچی ہے، چھ ماہ کا بچہ ہوسکتا ہے۔ تو یہ مشورہ اور معاملہ ہوتا تھا۔

[تفسیر القرطبی: ۱۶/۱۹۳، سورۃ الاحقاف: الآیۃ: ۱۵]

وادئ تیہ میں بنی اسرائیل کا قدرتی لباس:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میدانِ تیہ کے اندران کے لیے ایسے کپڑے پیدا فرما دیئے جو پھٹتے بھی نہیں تھے اور میلے بھی نہیں ہوتے تھے، یعنی ان پر کوئی میل بھی نہیں چڑھتی تھی۔

علامہ کسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سلویٰ واحد ہے اور اس کی جمع سلاوی ہے۔

﴿كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ [البقرۃ: ۵۷] اللہ تعالیٰ کا یہ حکم کہ میرے پاکیزہ رزق سے کھاؤ۔ یہ اباحت کا حکم ہے تو جب بھوک لگے، ضرورت ہو تو کھاؤ اور اللہ پاک نے جو تمہیں رزق دیا ہے، اس کا شکر بھی ادا کرو، لیکن ان لوگوں نے ظلم کیا، اتنی نشانیاں اور اتنے معجزات دیکھنے کے بعد بھی اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباعِ کامل:

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب آپ بنی اسرائیل کے حالات پڑھتے ہیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ساری کائنات سے افضل اصحاب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ ہمیشہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔ ان کو بڑی بڑی تکلیفیں آئیں، لیکن انہوں نے کبھی اپنے پیغمبر کو تکلیف نہیں دی کہ یارسول اللہ! ہمارے لیے دعا کرو کہ ہمیں پانی ملے، ہمارے لیے دعا کرو کہ ہمیں کھانا ملے، ہمارے لیے دعا کرو کہ بادل کا سایہ ہو جائے، انہوں نے کبھی ایسی باتیں نہیں کیں۔

ہاں! کبھی ایسا ہوا کہ بالکل جب انتہاء کی بھوک کی وجہ سے حد سے زیادہ کمزور ہو گئے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اپنی تکلیف پیش کی تو سب تھوڑا تھوڑا اکٹھا کیا گیا، جو اتنا ہو گیا کہ جتنی جگہ میں بکری بیٹھتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی۔ اس کے بعد فرمایا کہ ہر آدمی برتن بھرے، سب کے برتن اس کھانے سے بھر گئے۔ اور ایسا بھی ہوا کہ پانی کی قلت ہو گئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی، دعا کے فوراً بعد برساتیں ہو گئیں، انہوں نے پانی بھر لیے۔ اب جب صحابہ رضی اللہ عنہم وہاں سے نکلے تو جہاں پر لشکر تھا، وہیں بادل برسا تھا، اس کے علاوہ نہیں برسا تھا۔

ایسے معجزات ہوتے تھے، لیکن اس کے باوجود بھی صحابہ رضی اللہ عنہم ایسا نہیں کرتے تھے جیسے بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا، بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کامل اتباع کرتے تھے۔

﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ [البقرة:٥٩]

''پھر ظالموں نے دوسرا لفظ بدل دیا، اس کے علاوہ جو اُن سے کہا گیا تھا، پھر ظالموں پر ہم نے آسمان سے عذاب اُتارا، اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔''

بنی اسرائیل کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی:

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کا دوسرا واقعہ بیان فرمارہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں ان کو حکم فرمایا تھا کہ تم بیت المقدس میں داخل ہو جاؤ۔ جب تم داخل ہو گئے تو اللہ کی نصرتِ خاصہ تمہارے ساتھ ہوگی۔ لیکن بنی اسرائیل نے حسبِ عادت نافرمانی کی، انکار کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو جواب دے دیا کہ ہم اس میں داخل نہیں ہوتے، کیونکہ اس علاقے میں بہت بڑی جبار اور قوت والی قوم آباد ہے اور ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

موسیٰ علیہ السلام نے انہیں بے حد سمجھایا کہ فتح، شکست، قوت و طاقت پر نہیں ہوتی، یہ ظاہری اسباب ہیں، اصل فتح تو اللہ کے حکم سے ہوتی ہے: ﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ [آل عمران:١٢٦] اللہ چاہے تو ابابیلوں کے ذریعے سے ابرہہ کے لشکر اور بڑے بڑے ہاتھیوں کو مروا دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تم یہ کہہ رہے ہو۔ یہ میرے اللہ کا حکم ہے، آپ میرے ساتھ چلیں۔ لیکن انہوں نے کہا: بالکل نہیں، ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ [المائدة:٢٤] تم جاؤ اور تمہارا خدا جائے، جا کر لڑو، ہم تو نہیں جاتے۔ اس انکار پر ان کو سزا ملی کہ وادیٔ تیہ کے میدان میں چالیس سال تک بھٹکتے رہے۔

پھر جب گڑگڑائے، روئے تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے درخواستیں کیں۔ اللہ تعالیٰ نے پھر ان پر اپنی نعمتیں نازل فرمادیں اور اس چالیس سال کے عرصہ کے دوران حضرت ہارون علیہ السلام وادیٔ تیہ میں فوت ہو گئے۔

پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی وفات آگئی تو اب قوم کا شیرازہ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے سپرد ہوا اور وہ بھی اللہ کے نبی ہیں اور شریعتِ تورات کے تابع ہیں۔ یوشع بن نون علیہ السلام نے قوم کو سمجھایا کہ اللہ کے بندو! کچھ عقل سے



کام لو، اللہ نے جو حکم دیا اور موسیٰ علیہ السلام نے آپ لوگوں سے کہا اور تم نے نہ مانا تو چالیس سال تک تم وادئ تیہ میں بھٹکتے رہے ہو۔ یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابر کا سایہ بھی کر دیا اور کھانے کا انتظام بھی کر دیا، ورنہ صحراء میں بھٹکتے بھٹکتے مر جاتے۔ اب تم اللہ کے حکم پر کیوں نہیں چلتے اور اللہ کے حکم کے مطابق تم بیت المقدس میں داخل کیوں نہیں ہوتے؟ اب قوم تیار ہوگئی۔

یہ اللہ کی قدرت ہے کہ جب انکار کرنے پر آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی عظیم الشان شخصیت کا انکار کر دیا اور ماننے پر آئے تو جو موسیٰ علیہ السلام کے تابع نبی تھے، ان کی مان لی۔ کہنے لگے: ٹھیک ہے، ہم تیار ہیں۔ چلو اب پوری قوم تیار ہوگئی۔ ان کو حکم ملا کہ بیت المقدس میں داخل ہوں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۸]

﴿قَرْيَةٌ﴾ کی تفسیر:

یہاں لفظ ﴿قَرْيَةٌ﴾ ہے۔ لفظ ﴿قَرْيَةٌ﴾ کا اطلاق عموماً بستی پر، لیکن کبھی کبھی شہر پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ اسی آیت میں ہے۔ یہاں ﴿هٰذِهِ الْقَرْيَةَ﴾ سے مراد کوئی بستی نہیں، بلکہ "بیت المقدس" ہے جو بڑا قدیمی شہر ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے یہ شہر ہے، لیکن اس پر "قریہ" کا اطلاق ہوا۔

اسی طرح جب آپ قرآن مقدس میں یوسف علیہ السلام کا قصہ پڑھیں گے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی آئے اور یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی بنیامین کو روک لیا اور باقی بھائیوں کو واپس جانا پڑا تو ان کے بھائیوں میں سے جو بڑا یہودا تھا، اس نے بھی یہی کہا کہ تم لوگ جاؤ، میں تو نہیں جاؤں گا، میں تو یہیں بیٹھا رہوں گا۔ چونکہ میں نے اپنے ابا سے وعدہ کیا تھا کہ بنیامین کو واپس لے کر آؤں گا، اب ہم اس کو لے کر نہیں جا سکتے تو میں والد کے پاس جھوٹ بول کر کیسے جاؤں؟ میں جھوٹا ہوں، میرا قصور کوئی نہیں۔ اب جب والد آپ سے پوچھیں کہ بنیامین کیوں نہیں آیا تو تم جواب دینا: ﴿وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ﴾ [یوسف: ۸۲] کہ ابا جان! اگر آپ کو ہمارا اعتبار نہیں ہے تو آپ بستی والوں سے پوچھ لیں، جہاں ہم گئے۔

تو اب مصر کوئی بستی تو نہیں تھی، مصر تو ایک بڑا شہر ہے، اس کی ایک تاریخ ہے: ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ﴾ [البقرۃ: ۶۱] اگر دنیا کے اندر تہذیب دیکھی جائے تو چند تہذیبیں چل

رہی ہیں، جیسے تہذیب فارس ان کی تہذیب قدیم تہذیب ہے اور اسی طرح تہذیب یونان ہے اور تہذیب مصر ہے۔ یہ دنیا کے اندر بہت قدیم تہذیبیں ہیں اور پھر تہذیب اسلام آئی جس نے آ کر پوری دنیا کے اندر انقلاب برپا کر دیا، تمام دنیا کی تہذیبوں کو بھی ختم کر ڈالا اور تمام دنیا کے طور طریقوں کو بھی مٹا ڈالا اور دنیا کے اندر طریقۂ اسلام نافذ ہوا، ورنہ تہذیب مصر قدیم تہذیب ہے۔

بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں داخل ہونے کا حکم:

بہر حال بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ بستی میں داخل ہو جاؤ اور کھاؤ پیو، تمہیں اجازت ہے اور جہاں سے چاہو، کھاؤ پیو۔ اور خدا کی قدرت ہے کہ بیت المقدس اور شام کے علاقے کی ظاہری برکات بھی ہیں اور باطنی برکات بھی ہیں کہ وہاں کا موسم، زیتون، انجیر، پھل اور باغات دیکھیں تو آدمی کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بڑا بڑا انجیر، زیتون ہوگا اور ایسے ہوگا جیسے اس سے شیرہ بہہ رہا ہو۔ اس لیے اللہ نے قرآن پاک میں فرمایا کہ ہم اپنے نبی پاک کو جو مسجد حرام سے ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ①﴾ [الاسراء:۱] جس کے اردگرد میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں، اپنے نبی کو ہم دکھانا چاہتے تھے، ظاہری برکتیں بھی اور باطنی برکتیں بھی کہ وہاں اللہ کے ہزاروں نبی پیدا ہوئے اور اتنا بڑا مقام ہے کہ جہاں سے میرے پاک نبی ﷺ کو معراج ہوا، اتنا بڑا مقام ہے کہ جس کو قبلہ بنایا گیا۔ اللہ پاک سے دعا کریں کہ اللہ مسجد اقصیٰ پھر مسلمانوں کے قبضہ میں دے دیں۔

اصل بات یاد رکھو کہ اللہ بڑا بے نیاز ذات ہے، دنیا میں تو بادشاہ ہوتے ہیں، اگر ان کے ساتھ آپ کوئی نافرمانی کریں، ان کی حکم عدولی کریں تو وہ کہتے ہیں کہ چلو اس کو دفع کرو، اس کی ہمیں کیا ضرورت ہے؟ یعنی اگر آدمی اپنے بادشاہ، سردار، وڈیرے کی کوئی بات نہ مانے تو وہ کہتے ہیں کہ چھوڑو اس کو، ہم نے اس کے لیے فائدے کے لیے کہا تھا، نہیں مانتا تو دفع ہو جائے، ہمارا کیا بگاڑے گا؟ اور اللہ تو ملک الاملاک ہے، وہ تو بادشاہوں کا بادشاہ ہے، وہ مالک الملک ہے، جب ہم اس کی نافرمانی کرتے ہیں تو وہ بھی کہتا ہے کہ دفع ہو جائیں، اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں چھین لیتا ہے۔

مسلمانوں کی تباہ حالی:

جب ہم اس کے نافرمان بن جاتے ہیں تو پھر ہمارے لیے تباہی و بربادی آ جاتی ہے، معاصی پھیل جاتے ہیں،



معاشرے میں جرائم بے انتہاء ہوجاتے ہیں، زنا عام ہوجاتا ہے، عریانی، فحاشی عام ہوجاتی ہے۔ آپ تاریخ اُٹھا کر عقل سلیم کے ساتھ تدبر اور تفکر کریں کہ سارے عالم اسلام پر نظر ڈالیں کہ جہاں جہاں اللہ کا عذاب ٹوٹا ہے۔ بے حیائی کے دور میں جو عورتیں ہیں ان سے تو شیطان شرماتا ہے، اس لیے قرآن نے کہا کہ شیطان کا مکر کمزور ہوتا ہے اور عورتوں کا مکر بڑا مضبوط ہوتا ہے: ﴿فَقَاتِلُوٓا أَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيفًا﴾ [النساء:۷۶] کہ شیطان کا مکر ضعیف ہوتا ہے، وہ میرے نیک بندوں پر نہیں چلتا، لیکن جب عورتوں کے مکر کا ذکر آیا تو فرمایا: ﴿إِنَّهُ مِن كَيْدِكُنَّ ۖ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ﴾ [یوسف:۲۸] عورتوں کا مکر ایسا خطرناک ہے کہ یہ بڑے بڑے کو الٹ ڈالتا ہے۔

ایسے بربادی نہیں آتی، بربادی ہمارے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے: ﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ [البقرۃ:۱۳۴] ہم ایسے کسی قوم کو نہیں پکڑتے، اللہ نے فرمایا: ﴿فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِن كَانُوٓا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ [التوبہ:۷۰] اور فرمایا: ہم نے قوم نوح کو پکڑا: ﴿فَأَخَذَهُمُ الطُّوفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُونَ﴾ [العنکبوت:۱۴] ہم نے ان کو اس حال میں پکڑا کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، حد سے نکل چکے تھے۔ اس لیے قوم لوط کے بارے میں فرمایا کہ ملائکہ نے آکر کہا: ﴿إِنَّا مُهْلِكُوٓا أَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۖ إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوا ظٰلِمِينَ﴾ [العنکبوت:۳۱] ہم اس بستی کو برباد کرنے کے لیے جارہے ہیں، کیونکہ اس کے رہنے والے ظالم ہیں، حد سے بڑھنے والے ہیں۔

اللہ کبھی کسی قوم کو برباد نہیں کرتے جب تک وہ اپنی بربادی کے اسباب خود پیدا نہ کریں۔ اللہ کا نظام فطرت ہے، اس لیے اللہ نے فرمایا: ﴿مَّا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيمًا﴾ [النساء:۱۴۷] میرے بندو! اگر تم شکر گزار بن جاؤ، ایمان والے بن جاؤ تو میں تمہیں عذاب دے کر کیا کروں گا؟ تمہیں عذاب دینے میں مجھے کون سا فائدہ ہے؟ اور اللہ تو ارحم الراحمین ہیں۔

آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے بیٹے کو کبھی کوئی آدمی تھپڑ مارے تو کیا آپ برداشت کرتے ہیں؟ بلکہ آپ تو ڈنڈا لے کر بھاگ پڑتے ہیں، مولوی ہو چاہے عالم ہو، اس وقت کچھ یاد نہیں رہتا، پگڑی کہیں پڑی ہوگی، جوتی کہیں پڑی ہوگی، مولانا ڈنڈا ہاتھ میں لے کر نکلیں گے اور کہیں گے کہ وہ کون ہے جس نے میرے بیٹے کو مارا ہے؟ مولوی صاحب کو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ کس حال میں کھڑا ہوں؟ لیکن اسی بچے کو کبھی تم خود رسیاں باندھ کر

مارتے ہو کہ سکول نہیں جاتا۔ اللہ بھی اپنے بندوں کو کبھی عذاب نہیں دیتے، جب حد سے بڑھ جاتے ہیں تو پھر قہر کا کوڑا برساتے ہیں، اللہ اپنے بندوں کو کبھی عذاب نہیں دیتے۔ اگر بندہ رو پڑے، معافی مانگ لے، اللہ کے دروازے پر آ جائے، اللہ معاف کر دیتے ہیں۔ اللہ فرماتے ہیں: میرا بندہ ہے، انسان ہے، غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن جب بندے اپنی بے حیائی پر اُڑ جاتے ہیں تو اللہ کے قہر آتے ہیں، اللہ کے عذاب کا کوڑا برسایا جاتا ہے، پھر اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

نمازِ شکر:

تو اللہ نے فرمایا: بستی میں داخل ہو جاؤ اور کھاؤ پیو، مزے کرو۔ اتنا عرصہ تم وادئ تیہ میں رہے، وہاں تمہیں من و سلویٰ ملتا رہا، اب بیت المقدس میں تمہیں ہر چیز ملے گی۔ ''رَغَدًا'' کا معنی ہے کھلا، وسیع، رچتا بستا ہوا کھاؤ پیو۔

اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ جو آٹھ رکعتیں تھیں، یہ ضحیٰ (چاشت) کی نماز ہے۔ ایک اشراق کی نماز ہوتی ہے، جو سورج نکلنے کے بعد (جب سورج چڑھ گیا تو) پڑھی جاتی ہے۔ اور چاشت کا وقت جب دھوپ زیادہ تیز ہو جائے۔ جیسا کہ عرب مثال دیتے ہیں کہ اونٹ کے بچوں کے پاؤں کو گرمی لگنے لگ جائے، وہ وقت چاشت کا ہوتا ہے (یعنی نو، دس بجے) اور بعض صحابہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے چاشت کی نماز نہیں پڑھی، بلکہ آٹھ رکعات اللہ کے شکر میں پڑھیں کہ میرے مولا! تیرا شکر ہے کہ آج مکہ فتح ہو گیا۔

اسی لیے روایات میں موجود ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جب کسریٰ کو فتح کیا اور بادشاہ کے محل میں داخل ہوئے تو آپ نے بھی کھڑے ہو کر آٹھ رکعتیں اللہ کے شکر میں پڑھیں۔ اس لیے حکم ہے کہ اگر اللہ کوئی نعمت دے تو جھک جاؤ۔ آپ نے دیکھا نہیں ہے کہ جس درخت پر پھل لگا ہوتا ہے تو جھکا ہوتا ہے اور جس درخت کی شاخوں پر پھل نہ ہو تو وہ اکڑ کر کھڑا ہوتا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۹]

اسی لیے آپ تجربہ کر لیں کہ جو برتن خالی ہو تو وہ بہت بجتا ہے، برتن بھرا ہوا ہو تو کم آواز کرتا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو وہ بڑا شور کریں گے کہ ہمارے باپ کے تو دس مربع شلجم کے باغ تھے۔ شلجم کے باغ پتہ نہیں کیسے ہوتے ہیں؟ اور کہے گا کہ ہماری وہاں اتنی بڑی کوٹھیاں ہیں، اگرچہ وہاں رہنے کے لیے ایک جھونپڑی بھی نہ ہو۔ اور جو آدمی بھرا ہوا ہوگا، یہاں بھی بھرا ہوا ہوگا، وہ کہے گا کہ اللہ کا شکر ہے وہاں بھی اللہ نے دیا

اور یہاں بھی الحمد للہ! اللہ تعالیٰ دے رہے ہیں۔

غزوۂ احزاب کا مختصر تذکرہ:

دیکھیں! ساری کفر کی طاقتوں نے مدینہ منورہ میں جا کر گھیرا ڈال دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے سر سجدے میں ڈالا اور کہا: میرے اللہ! آج کفر کی ساری جماعتیں مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے اکٹھی ہوگئی ہیں، ہماری مدد فرما اور ان جماعتوں کو شکست دے دے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ خدا کی شان ہے! جب ہم صبح کی نماز کے لیے اُٹھے تو دیکھتے ہیں کہ سامنے نہ دشمن ہے، نہ ان کا کوئی خیمہ ہے اور نہ فوج ہے۔ ہم حیران ہوگئے۔ اللہ نے رات کو ہوا کو حکم دیا، ہوا چلی اور ان سب کو اُٹھا کر پھینک دیا۔

یاد رکھو! جب تم مسلمان بن جاتے ہو تو اللہ کا وعدہ ہے: ﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ [آل عمران: ۱۳۹] تم سربلند رہو گے، شرط یہ ہے کہ تم مومن بن جاؤ، ایمان والے بن جاؤ۔ اگر تمہارے اندر ایمان آجائے تو ہوائیں بھی میری ہیں، فضائیں بھی میری ہیں، آسمان و زمین بھی میرے ہیں، میں جس کو حکم جہاں چاہوں دے دوں۔ اس لیے اللہ کے نبی ﷺ نے دعا مانگی:

((اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ، سَرِيعَ الْحِسَابِ، اَللّٰهُمَّ اهْزِمِ الْأَحْزَابَ، اَللّٰهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَ زَلْزِلْهُمْ))

[صحیح البخاری، حدیث: ۲۹۳۳ باب: الدُّعَاءِ عَلَى الْمُشْرِكِينَ بِالْهَزِيمَةِ...]

میرے پروردگارِ عالم! آج مدینے کے خلاف پورے احزاب، پوری جماعتیں مقابلہ کے لیے جمع ہیں، ہم خندق کھود کر دفاعی پوزیشن میں ہیں، تاکہ دشمن کا دفاع کر سکیں، ان سے لڑنے کی ہماری طاقت نہیں، آپ ہماری مدد فرمائیں۔ اللہ نے فرمایا: میرے مدنی! گھبراتے کیوں ہو؟ سر سجدے سے اُٹھاؤ اور دیکھو دشمن کدھر ہے؟ ایک صحابی کہتے ہیں کہ اللہ نے ایسی ہوا چلائی کہ گھوڑے، خیمے، بندے سب اُڑ گئے اور جب ہوش آیا تو آنکھوں میں مٹی پڑی ہوئی ہے، ان کو کچھ نظر نہیں آتا۔

ستر ہزار اسرائیلی ہلاک ہوگئے:

﴿فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ﴾ [البقرۃ: ۵۹] انہوں نے وہ لفظ بدل ڈالا جو ہم نے ان کو کہا تھا۔ ہم نے کہا تھا کہ جب بیت المقدس کے دروازے سے داخل ہونا تو ''حِطَّةٌ'' کہنا۔ اور انہوں نے کہا: ''حِنْطَةٌ''

یعنی گندم کا دانہ۔ انہوں نے...... نعوذ باللہ!...... اللہ کے ساتھ ایک تمسخر کیا کہ اللہ کے حکم کو مذاق میں بدل دیا کہ میں تو معافی نہیں چاہیے، ہمیں گندم چاہیے۔ پھر نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے آسمانوں سے ان پر عذاب نازل کر دیا کہ تم خدا کے حکم کا مذاق اُڑاتے ہو۔ لیکن وہ عذاب ان پر اُترا جنہوں نے یہ ظلم کیا تھا، زیادتی کی تھی، استہزاء کیا تھا، صرف ان پر عذاب آیا۔ اور وہ عذاب یہ تھا کہ اللہ نے ان پر طاعون کی بیماری مسلط کردی، ایک گھنٹہ میں ستر ہزار بندہ مر گیا۔

﴿رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ رجز، ''عذاب'' کو کہتے ہیں، کیونکہ عذاب بھی بندے مار دیتا ہے۔ اور وہ عذاب ہم نے بنی اسرائیل پر اس لیے اُتارا کہ وہ ہماری حدود سے نکلنے والے تھے کہ جب ہم نے کوئی حکم دیا تو اس کو توڑ ڈالا یا بدل ڈالا تو ہم نے بھی عذاب میں پکڑ لیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۹، ۱۰۰]

قریہ سے کون سا شہر مراد ہے؟

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زیادہ اولیٰ اور اصح یہ ہے کہ ﴿قَرْيَةَ﴾ سے مراد ''بیت المقدس'' ہے، جیسا کہ سدی، ربیع بن انس، قتادہ، ابو مسلم اصفہانی اور ان کے علاوہ دیگر مفسرین نے اس بات پر نص کیا ہے کہ ﴿قَرْيَةَ﴾ سے مراد بیت المقدس ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: بعض علماء فرماتے ہیں کہ ﴿قَرْيَةَ﴾ سے مراد ''اریحا'' ہے۔ جب وہ مصر سے نکلے تھے تو ان کا ارادہ بیت المقدس کو جانے کا تھا اور ''اریحا'' ان کے راستے میں بھی نہیں آتا۔ اس لیے یہ قول بعید ہے۔ اور بعض نے کہا کہ قریہ سے مراد مصر ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول اس قول سے بھی زیادہ بعید ہے۔ اس کو امام رازی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ لیکن صحیح اور راجح قول مفسرین کے نزدیک یہی ہے کہ قریہ سے مراد بیت المقدس ہے، اللہ نے اس میں ان کو داخل ہونے کا حکم دیا۔

جب یہ چالیس سال کے بعد میدانِ تیہ سے نکلے، حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی اور بیت المقدس فتح ہوا تو جمعہ کا دن تھا اور سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ اس وقت قاعدہ یہ تھا کہ اگر جمعہ کے دن کا سورج ڈوب جاتا تو لڑائی بند ہو جاتی تھی۔ یوشع بن نون نے اللہ سے بھی دعا کی اور سورج کو بھی مخاطب ہو کر فرمایا کہ تُو بھی اللہ کی مخلوق ہے اور میں بھی اللہ کی مخلوق ہوں اور میں اللہ کے حکم سے جہاد کے لیے نکلا ہوں اور تُو بھی اللہ کے حکم سے گردش کر رہا ہے، ٹھہر جا۔ تو اللہ نے سورج کو روک دیا، حتیٰ کہ فتح ہو گئی۔

اللہ نے فرمایا کہ اس شہر کے دروازے میں جب داخل ہوں تو اللہ کے لیے سجدۂ شکر کرو کہ اللہ پاک نے مہربانی فرمائی کہ ایک تو بیت المقدس جو تمہارے آباء کی میراث تھی، اللہ نے واپس دلا دی، دوسرا اللہ نے فتح ونصرت عطا فرمائی، اور تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں میدانِ تیہ میں مزید بھٹکنے سے بچالیا۔

ان نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ ان پر شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہونا۔ یا سجدہ کا معنی یہ تھا کہ اللہ کے آگے تواضع اختیار کرو اور متواضع ہو کر اللہ کی نعمتوں کو یاد کرتے ہوئے بیت المقدس کے اندر داخل ہوں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۸، ۹۹]

شہر میں جھک کر داخل ہونے کا حکم:

امام نووی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول مبارک نقل فرمایا کہ اللہ نے حکم دیا کہ جب دروازے سے داخل ہوں تو اس حال میں جیسے رکوع کی حالت ہوتی ہے۔ نماز میں رکوع وسجود ہیں، رکوع کی علیحدہ کیفیت ہے اور سجدے کی علیحدہ کیفیت ہے، لیکن کبھی لفظ رکوع اور سجود بولا جاتا ہے اور اس سے مراد مطلق نماز ہوتی ہے کہ نماز پڑھا کرو۔ اور کبھی لفظ رکوع اور سجود سے مراد تواضع ہوتی ہے کہ اللہ کے لیے تواضع کرو، اللہ کے لیے جھک جاؤ، غرور وتکبر نہ کرو۔ لہٰذا سجدہ سے مراد حقیقی سجدہ نہیں ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ رکوع کے عالم میں جھک کر اللہ کے حکم کے مطابق بیت المقدس کے اندر داخل ہو۔ ایک بڑا دروازہ ہوتا ہے اور ایک اس کے اندر چھوٹا دروازہ ہوتا ہے۔ تو چھوٹے دروازے سے آدمی گزرے تو لازماً جھک کر گزرے گا اور بڑے دروازے کو کھول دو تو سیدھا گزرے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول مبارک یہ بھی ہے کہ تم چھوٹے دروازے سے داخل ہو اور تواضع کے ساتھ داخل ہو، گردن اکڑا کر تکبر کے ساتھ داخل نہ ہو۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کو حکم دیا گیا کہ جب داخل ہوں تو سجدہ کر کے داخل ہوں۔ لیکن رازی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ قول بعید ہے۔

بعض نے فرمایا کہ یہاں لفظ تو سجدے کا ہے، لیکن حقیقی حکم یہ ہے کہ تواضع اختیار کرو۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آدمی سجدے کے بل چلتا رہے۔ اس لیے انہوں نے فرمایا کہ تواضع مراد ہے۔

حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ اس دروازے کا رخ ایسے تھا کہ جھکیں تو قبلہ کی طرف رخ ہوتا تھا۔



حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت مجاہد رحمہ اللہ، حضرت سدی رحمہ اللہ، حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس دروازے کا نام بھی "باب حطة" تھا کہ جس سے گناہ معاف ہوں گے۔ جیسے اللہ نے فرمایا تھا: ﴿وَقُولُوا حِطَّةٌ﴾ کہ تواضع بھی کرو اور زبان پر بھی استغفار ہو کہ یا اللہ! ہماری خطائیں معاف کر، ہمارے گناہ معاف کر، ہماری غلطیاں معاف کر، لیکن بنی اسرائیل ایک طرف سے داخل ہوئے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت یہ بھی ہے، فرمایا کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ تواضع کر کے داخل ہوں، لیکن وہ اس طرح داخل ہوئے کہ سر کو اونچا کیے ہوئے تھے اور اللہ کے حکم کی مخالفت کی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ تواضع کے ساتھ داخل ہوں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۹۹]

اب سجدۂ تعظیمی کسی کے لیے جائز نہیں:

یہاں کوئی مسجد نہیں تھی، بلکہ ایک دروازے سے گزرنا تھا۔ تو پھر کیا یہ دروازہ قبلہ کی طرف تھا کہ آدمی سجدہ قبلہ کی طرف کرے۔ اس لیے اتنے سارے اقوال میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔ بات صرف اتنی تھی کہ ان کو حکم ملا کہ تم تواضع اختیار کرو۔ لیکن بعض باطل فرقے، کیونکہ ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ملائکہ نے سجدہ کیا، جیسے یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے اور ان کے والدین نے سجدہ کیا۔ بھائی بیت المقدس میں داخل ہوتے ہوئے بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ سجدہ کرو۔ اس سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ جب نبی کا سجدہ جائز ہے، آدم علیہ السلام کا سجدہ جائز ہے، فتح کرنے کے بعد بیت المقدس میں داخل ہوتے وقت سجدہ جائز ہے تو ہم بھی جب اللہ کے اولیاء کی قبروں پر داخل ہوتے ہیں تو ہم بھی سجدہ کرتے ہیں۔ مقصد تو وہی تواضع ہے، ہم بھی تو عاجزی کر رہے ہیں، اظہارِ عجز کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ان بزرگ بندوں کا احترام کر رہے ہیں۔

اصل میں یہ ساری باتیں صحیح نہیں ہیں۔ ایک بات یاد رکھیں کہ اگر ملائکہ نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تو کس کے حکم سے کیا ہے؟ اللہ نے حکم دیا کہ ﴿اسْجُدُوا لِآدَمَ﴾ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین نے سجدہ کیا تو اللہ کے حکم سے کیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب دیکھا تھا کہ ﴿إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ۝﴾ [یوسف: ۴] اور انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے۔

اس لیے آپ دیکھیں کہ جب وہ سجدہ ہوا تو انہوں نے فوراً یہ کہا: ﴿وَقَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ﴾

اے ابا جان! یہ دیکھیں وہ تاویل نکل آئی جو میں نے خواب دیکھا تھا: ﴿قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا﴾ [یوسف:۱۰۰] میرے رب نے میرے خواب کو سچا کر دیا۔ وہ تو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، ہر بندے کا خواب غلط ہوسکتا ہے، اللہ کے نبی کا خواب کبھی غلط نہیں ہوسکتا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں۔ انبیاء کی اتنی بڑی شان ہوتی ہے کہ ان کی نیند کے عالم میں بھی شیطان تسلط نہیں کرسکتا، اللہ نے ان کو اس سے محفوظ رکھا ہے، اللہ نے ان کو معصوم بنایا ہے۔ اس لیے اللہ کے جتنے پیغمبر ہیں ان کا خواب ایسے ہے جیسے اللہ کی وحی ہو۔

ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔ اگر آج آپ خواب دیکھ لیں کہ بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں تو کیا ذبح کریں گے؟ کوئی عالم فتویٰ دے گا کہ خواب کے مطابق جا کر بیٹے کو ذبح کر دو؟ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے پیغمبر ہیں، ان کا خواب ایسے ہے جیسے اللہ کا حکم اور وحی ہو۔ ان کا خواب کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔ اس لیے جب انہوں نے کہا: ﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ إِنِّيٓ أَرٰى فِي الْمَنَامِ﴾ اے میرے بیٹے! میں نے خواب دیکھا ہے: ﴿أَنِّيٓ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى﴾ لیکن اسماعیل علیہ السلام نے جواب دیا: ﴿قَالَ يٰٓأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِيٓ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِينَ ﴿١٠٢﴾﴾ [الصافات:۱۰۲] اے ابا جان! آپ کر گزرو جو اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے۔ کیونکہ نبی کا خواب تو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔

اس لیے اگر کوئی آدمی استدلال کرے کہ جب یوسف علیہ السلام کو سجدہ جائز ہے تو قبر کو سجدہ جائز ہے، آدم علیہ السلام کو سجدہ جائز ہے تو اس کے بیٹوں کو بھی سجدہ جائز ہے، اگر انبیاء کو سجدہ جائز ہے تو اللہ کے اولیاء کو بھی جائز ہے۔ یہ غلط بات ہے۔ جہاں جہاں سجدہ ہوا ہے وہاں اللہ کا حکم ہے۔

یہاں ﴿وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٨﴾﴾ [البقرة:۵۸] اللہ نے حکم دیا کہ اس بستی کے اندر داخل ہو جاؤ اور ساتھ حکم دیا: ﴿وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ کہ جب تم دروازے سے داخل ہو تو شکر کا سجدہ کرو، تواضع اختیار کرو۔ تو یہ اللہ کا حکم ہے اور ہم جو سجدے سے منع کرتے ہیں وہ بھی اللہ کا حکم ہے: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۚ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿٣٧﴾﴾ [فصلت:۳۷] میرے نبی! اپنی اُمت کو بتلا دیں کہ سورج، چاند، ہر چمکنے والی چیز، اونچی، نیچی چیز کو سجدہ جائز نہیں، سجدہ صرف اللہ کے لیے ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سجدۂ رسول ﷺ کی ممانعت:

اب بعض حضرات فرق کرتے ہیں کہ عبادت کا سجدہ اور ہوتا ہے اور تعظیم کا سجدہ اور ہوتا ہے۔ یہ غلط بات ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کی خدمت میں آ کر خود عرض کیا کہ یا رسول اللہ! دنیا کے بادشاہوں کے پاس جب لوگ جاتے ہیں تو ان کو سجدہ کرتے ہیں، آپ تو ہمارے دنیا کے بھی بادشاہ ہیں اور آخرت کے بھی، آپ تو رحمۃ للعالمین ہیں اور آپ تو صرف دنیا میں سردار نہیں، بلکہ آخرت میں بھی تمام انبیاء کے سردار ہیں، آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں...... صحابہ رضی اللہ عنہم نے تعظیم کا سجدہ پوچھا تھا یا عبادت کا سجدہ پوچھا تھا؟ تعظیم کا سجدہ پوچھا تھا کہ لوگ بادشاہوں کی تعظیم کرتے ہیں...... حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: خبردار! اگر کسی کو سجدے کی اجازت ہوتی تو میں عورت کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، لیکن اللہ کے سوا کسی کو سجدے کی اجازت نہیں ہے۔

[سنن أبي داود، حديث: ٢١٤٠، بابٌ فِي حَقِّ الزَّوْجِ عَلَى الْمَرْأَةِ]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ ﷺ کے سامنے کھڑے ہونے کی ممانعت:

صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ جب تشریف لے آتے تھے تو ہم کھڑے ہو جاتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے منع فرمادیا کہ خبردار! میرے آنے پر کھڑے نہ ہوا کریں، ایسے نہ کیا کریں جیسے عجمی لوگ کرتے ہیں کہ سردار آ گیا تو کھڑے ہو گئے، سردار کھڑا ہو گیا تو ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئے، سردار بیٹھ گیا تو ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ فرمایا: ایسا ہرگز نہ کرو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ حضور ﷺ آ رہے ہوتے اور ہمارا دل کرتا کہ ہم استقبال کے لیے کھڑے ہوں، لیکن ہم ڈر جاتے تھے کہ ہمارے کھڑے ہونے کو حضور اکرم ﷺ پسند نہیں فرمائیں گے، ہمارا مقصد تو تعظیم ہے، لہٰذا ہم بیٹھے رہتے اور حضور اکرم ﷺ ہمارے اندر آ کر بلا تکلف بیٹھ جاتے۔

[سنن الترمذي، حديث: ٢٧٥٤، مسند أحمد، حديث: ١٢٥٢٦]

لہٰذا ہمیشہ یاد رکھیں کہ سجدہ چاہے تعظیم کا ہو چاہے وہ عبادت کا ہو، جائز نہیں۔ عبادت بھی تو تعظیم ہوتی ہے۔ جب آدمی اللہ کی عبادت کرتا ہے تو دل میں عظمت پیدا ہو جاتی ہے تو عبادت کرے گا۔ اگر دل میں اللہ کی عظمت ہی نہ ہو تو عبادت کا کیا معنی ہے؟ اس لیے رکوع کے اندر وظیفہ بھی عظمت کا ہے: ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ'' پاک ہے میرے رب کی ذات! جس کی صفت عظیم ہے، جو عظمتوں کا مالک ہے، جو سراپا عظمت ہے اور جس سے بڑا عظیم کوئی نہیں۔ اس کے بعد جا کر سجدے میں گرتا ہے اور کہتا ہے: ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى'' پاک ہے میرے رب کی ذات! جس کی

صفت جہت علو ہے، جو اعلیٰ ہے، جو عالی ہے، جس کے اوپر کوئی نہیں ہے، جس سے اول کوئی نہیں ہے، جس کے بعد کوئی نہیں ہے اور اے میرے اللہ! تیری بلندیوں کی انتہاء کوئی نہیں اور میری پستی کی انتہاء کوئی نہیں۔ میں نے اپنے چہرے کو مٹی میں ڈال کر تیرے آگے درخواست پیش کر دی ہے۔ پہلے وہ یہ تسبیح کہتا ہے اور اس کے بعد تشہد میں بیٹھتا ہے اور پھر حضور ﷺ پر درود بھیجتا ہے اور اس کے بعد دعائیں کرتا ہے۔

فتوحات پر بھی تواضع فرمانا:

حضور اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ فتح دیتے تو آپ پر تواضع کا غلبہ ہو جاتا۔ جیسے آپ نے جب مکہ فتح کیا اور آپ ﷺ جب مکہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے گردن جھکالی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی گردن اونٹنی کو لگ رہی تھی اور پھر حضور اکرم ﷺ نے آٹھ رکعات نماز ادا کی، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اسی کو صحابہ نے ہمیشہ کے لیے لازم پکڑا کہ جب بھی کوئی ملک فتح ہوتا تھا تو شکرانے کے نوافل پڑھتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کسریٰ کے محل میں داخل ہوئے تو انہوں نے بھی آٹھ رکعات نماز ادا کی۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۹]

﴿قُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ کی تفسیر:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ﴿حِطَّةٌ﴾ کا معنی ہے کہ تم استغفار کرو کہ اے اللہ! ہمارے گناہ بخش دے، ہمارے گناہ گرا دے۔ تو مطلب یہ ہے کہ استغفار کرتے ہوئے داخل ہو اور دوسری روایت میں ہے کہ اس کا معنی یہ ہے، یہ امر حق ہے جو اللہ نے تم کو کہا ہے، اس کو پورا کرو۔

حضرت عکرمہ نے کہا ہے: ﴿حِطَّةٌ﴾ کا معنی یہ ہے کہ جب تم داخل ہو تو سجدہ بھی کرو اور کلمہ طیبہ بھی پڑھتے رہو۔

امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک آدمی کو خط لکھا کہ ﴿قُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ کا کیا ترجمہ ہے؟ انہوں نے لکھا کہ اللہ نے حکم دیا تھا کہ تم اپنے گناہوں کا بھی اقرار کرتے جاؤ کہ اے اللہ! ہم گناہ گار ہیں، ہم سے خطا ہوئی، اگر ہم پہلے آپ کے حکم کو تسلیم کر لیتے تو چالیس سال پہلے بیت المقدس میں داخل ہو جاتے، لیکن ہم نے انکار کیا تو ہمیں سزا ملی۔

حضرت حسن رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اے پروردگار عالم! ہم سے ہمارے گناہوں کو گرا دے۔ ﴿وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۵۸] اللہ نے حکم دیا



کہ اگر تم لوگوں نے اس طرح عمل کیا جس طرح اللہ نے حکم دیا ہے تو اللہ پاک کا وعدہ ہے کہ تمہارے گناہ معاف کر دیں گے، تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے، اللہ تعالیٰ اور بھی نعمتیں اپنی رحمت سے زیادہ عطا فرمائیں گے۔
[تفسیر ابن کثیر: ۱/۹۸]

ایک کافر کا تلوار سونتنے کا واقعہ:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے تھے کہ ایک دیہاتی چھپتے چھپتے آیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار مبارک جو درخت سے لٹکی ہوئی تھی، اس کو کھینچ کر ننگا کیا، اتنے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی تو اس نے کہا: ''مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّي؟'' بتلاؤ کون ہے جو تمہیں میری تلوار سے بچائے؟......اب صحابہ بڑے دور تھے، وہ دوڑتے بھی تو دشمن تلوار کا وار کر دیتا۔ تلوار مارنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی بہادری کے ساتھ تین بار فرمایا: ''اَللّٰہُ!'' میرا اللہ مجھے بچائے گا۔ کافر ڈرا، ہاتھ کانپا اور تلوار گر گئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُٹھالی اور فرمایا: ''مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّي؟'' اب بتلاؤ تمہیں کون بچائے گا؟ اس نے کہا: اب مجھے کون بچائے گا؟ وہی جو آپ کا خالق ہے، آپ تو سخی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ۔

[صحيح البخاري، حديث: ۴۱۳۵، بَابُ: غَزْوَةِ ذَاتِ الرِّقَاعِ]

حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بدلہ بھی لے سکتے تھے، کیونکہ وہ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا چاہتا تھا، لیکن اللہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بچا لیا۔

اس لیے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی جان کا بدلہ نہیں لیا۔ کسی نے اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچائی تو آپ نے معاف کر دیا۔ دین کے معاملہ میں نرمی نہیں فرمائی، صحابہ کے معاملہ میں نرمی نہیں فرمائی، اسلام کے معاملہ میں نرمی نہیں فرمائی، لیکن کسی نے اگر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ذاتی نقصان پہنچایا تو اس کو معاف کر دیا۔ دیکھا نہیں کہ ایک ظالم نے زہر دے دیا، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنا بدلہ میں نہیں لیتا۔ البتہ صحابہ شہید ہوئے تو ان کا بدلہ لیا گیا۔

اس لیے یہ اصل بہادری ہوتی ہے کہ اللہ تمہیں غلبہ دے دے، اللہ قوت دے دے اور دشمن ذلیل ہو کر تیرے سامنے آجائے تو پھر کہے کہ جاؤ تجھے چھوڑ دیا، جاؤ کوئی بدلہ نہیں لیتے، تم سے خدا بدلہ لے گا تو اس سے بڑا بدلہ کوئی نہیں۔ یہ اتنا بڑا بدلہ ہے کہ اگر حیا والا دشمن ہو تو ساری زندگی سر نہیں اُٹھا سکے گا، لیکن حیا نہ بھی ہو تب بھی اللہ بدلہ

لینے پر قادر ہیں۔

صلوٰۃِ چاشت:

اس لیے فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ مکہ میں ''ثنية العليا'' کی جانب سے داخل ہوئے اور اس کے بعد آپ ﷺ نے آٹھ رکعات نماز پڑھی۔ بعض نے کہا کہ وہ چاشت کی نماز تھی اور بعض نے کہا کہ یہ فتح کی خوشی کی نماز تھی۔ اس لیے بعض علماء نے فرمایا کہ ہر بادشاہ اور ہر امیر کو چاہیے کہ جب اللہ اس کو کسی شہر میں فتح عطا فرمائیں تو وہ بھی آٹھ رکعتیں پڑھیں، جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کسریٰ کو فتح کیا تو آپ نے بھی آٹھ رکعتیں نماز پڑھی۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ وہ آٹھ رکعتیں کیسے پڑھی جائیں؟ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ دو دو رکعتوں پر سلام پھیرتا جائے، چار دوگانے پڑھے گا تو آٹھ ہو جائیں گی۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ پڑھتا جائے اور آٹھ کے بعد ایک ہی دفعہ التحیات پڑھے اور سلام پھیرے۔

لیکن یاد رکھیں کہ افضل یہ ہے کہ اگر دن میں کوئی نماز ہو تو دو دو رکعت پڑھی جائیں، زیادہ ثواب ہے۔ اور رات کی نماز ہو تو چار چار رکعت اگر ملا کر پڑھی جائے تو زیادہ ثواب ہے۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ جب تہجد پڑھتے تھے تو صحیح حدیث مبارک کے اندر آتا ہے کہ آپ ﷺ تہجد کی آٹھ رکعتیں پڑھتے تھے۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ چار چار رکعتیں پڑھتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: صحابی! تم یہ نہ پوچھو کہ وہ نماز کیسے ہوتی تھی؟ وہ تو محمد عربی ﷺ کی نماز تھی کہ کتنی لمبی قراءت تھی، کتنا لمبا رکوع تھا، کتنا لمبا سجدہ تھا اور کتنا حسن تھا اس نماز کے اندر؟

[صحيح البخاري، حديث:۱۱۴۷]

اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ اگر اللہ آپ کو رات کو توفیق دے تو چار چار رکعتیں اکٹھی پڑھیں، دن کو اگر نوافل پڑھنے کی توفیق دے تو دو دو رکعت پڑھیں۔ ویسے اکٹھا پڑھنا بھی جائز ہے۔

بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمیاں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ جب بیت المقدس میں داخل ہوں تو تواضع اور عاجزی سے داخل ہوں، لیکن وہ گھسٹ گھسٹ کر داخل ہونے لگے۔ اور اللہ نے حکم دیا کہ ﴿حِطَّةٌ﴾ کہتے ہوئے داخل ہونا، لیکن وہ کہنے لگے: ''حَبَّةٌ فِي شَعْرَةٍ، حَبَّةٌ فِي شَعْرَةٍ''...... کیونکہ جب آدمی کے

دماغ میں سرکشی اور انکار آجائے تو وہ اللہ کے حکم کو صحیح طریقہ سے نہیں مانتا۔ جیسے آج کل بھی لوگ شعائر اسلام کا مذاق بناتے ہیں۔ جب اللہ کسی قوم سے ناراض ہوتے ہیں تو وہ قوم اللہ کے حکم کا مذاق بناتی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے کہ کفار کو "شجرۃ الزقوم" سے کھلایا جائے گا تو ابوجہل نے کہا: اچھا! زقوم تو یہ ہے کہ مکھن میں شہد ملاؤ۔ تو وہ زقوم ہوتا ہے۔ تو وہ اپنی نوکرانی کو کہتا تھا: "زَقِّمِینَا" کہ مکھن اور شہد لے آؤ۔ اس کے ساتھی آ کر بیٹھ جاتے تو وہ "تَزَقَّمُوْا" کہہ کر مذاق اُڑاتے تھے۔ ان کا مقصد اللہ کے قرآن، اللہ کے حکم کا مذاق اور تمسخر اُڑانا تھا۔

[روح البیان: ۷/۴۶۵، الصافات: الآیۃ: ۶۴]

رَاعِنَا اور رَاعِیْنَا میں فرق:

حضور اکرم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے یہودی کہتے تھے: "رَاعِیْنَا" ہمارے چرواہے۔ حالانکہ لفظ "رَاعِنَا" تھا کہ ذرا توجہ کرو۔ تو وہ اس کو کھینچ کر کہہ دیتے تھے: "رَاعِیْنَا" یہ تو ہمارا چرواہا ہے اور کہتا ہے کہ میں نبی ہوں، کیسے مان لیں؟

یہ کافروں کی پرانی عادت ہے کہ جن لوگوں پر اللہ کا غضب آتا ہے وہ اللہ کے الفاظ، اللہ کے احکام، اللہ کے اوامر کو بدل دیتے ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ پاک ہمیں اپنے دین پر قائم رکھے۔

﴿وَإِذِ اسْتَسْقٰى مُوسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۶۰]

"اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا: اپنے عصا کو پتھر پر ماریں تو اس سے بارہ چشمے بہہ نکلے، ہر قوم نے اپنے گھاٹ کو پہچان لیا۔ اللہ کی روزی سے کھاؤ اور پیو اور ملک میں فساد نہ مچاتے پھرو۔"

بنی اسرائیل سے خطاب کا طرز:

ان آیات میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے۔ اور ان میں یہ بات تھی کہ وہ پڑھی لکھی قوم تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں بہت ساری آیاتِ مبارکہ میں اہل کتاب کے ساتھ کچھ رعایات فرمائی ہیں، جیسا کہ قرآن مقدس کے اندر یہ بات موجود ہے کہ اگر اہل کتاب کوئی جانور ذبح کریں تو وہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے۔ اسی



طرح قرآن مقدس نے یہ بھی اجازت دی ہے کہ اگر کوئی مسلمان بحالتِ مجبوری کسی کتابیہ یعنی اہل کتاب کی عورت سے نکاح کرنا چاہے تو جائز ہے۔ اسی طرح اللہ نے قرآن مقدس میں یہ بھی ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ [العنکبوت: ۴۶] کہ اہل کتاب سے اگر کوئی بات ہو تو ان سے ایسا جھگڑا نہ کرو، ایسی سخت گوئی نہ کرو جو مشرکین کے ساتھ کی جاتی تھی۔ اگر ان سے کبھی مجادلہ ہو تو احسن طریق سے ہو، یعنی ان کو اسلام کی دعوت دی جائے اور بڑے احسن انداز میں بات کی جائے۔ اور اگر اہل کتاب کوئی ایسی بات بھی کریں تو ان کے جواب میں سختی کی بجائے نرمی کی جائے۔ تو ان ساری آیاتِ مبارکہ میں انہی بنی اسرائیل سے خطاب ہے جو اہل کتاب ہیں۔

منافقین اور کافروں کے خطاب میں وجہ فرق:

بعض مستشرقین یا ہندو ذہنیت رکھنے والے لوگ یا سوشلسٹ قسم کے جو نوجوان ہوتے ہیں، وہ ان باتوں سے بڑے عجیب قسم کے تاثرات پھیلاتے ہیں کہ جب ہندو بھی کافر ہے، ابوجہل بھی کافر ہے، کعب بن اشرف بھی کافر ہے، مشرکین میں سے اگر مشرک ہے وہ بھی کافر ہے، اور یہود بنی اسرائیل میں سے کوئی ہے تو بھی کافر ہے، لیکن بعض کافروں سے اسلام نرمی برت رہا ہے اور بعض کافروں سے سختی برت رہا ہے۔ تو اسلام کے خلاف یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب مشرکین مکہ کی باری آتی ہے تو قرآن ان کو مخاطب کرتا ہے: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝﴾ [الکافرون: ۱، ۲] اسی طرح قرآن پاک نے مکہ کے بعض مشرکوں کے بارے میں اتنے سخت الفاظ بھی استعمال فرمائے ہیں: ﴿عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝﴾ [القلم: ۱۳] کہ سرکش وغیرہ۔ اور اہل کتاب کے بارے میں یہ رعایت کیوں کی جارہی ہے؟

دراصل یہ اعتراضات محض اپنے دماغوں کی اختراعات ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ورنہ ایک بڑی واضح بات ہے جس کے اندر کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ آدمی کا مخاطب اگر جاہل ہو تو خطاب علیحدہ ہوتا ہے اور عالم ہو تو خطاب علیحدہ ہوتا ہے، یعنی اگر آپ اپنے ملک میں جائیں اور کسی اَن پڑھ آدمی سے آپ کا واسطہ پڑ جائے، جاہل آدمی سے آپ کا واسطہ پڑ جائے، آپ اسی کے مزاج کے مطابق جب تک بات نہیں کریں گے تو تب تک وہ بات سمجھ نہیں سکیں گے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ معراج کا جلسہ تھا اور شاہ جی پنجاب کے کسی ایسے

علاقے میں تقریر فرما رہے تھے جہاں ٹھیٹ قسم کے یعنی بالکل غیر تعلیم یافتہ، دیہاتوں کا دور دراز علاقہ تھا، جہاں پڑھے لکھے لوگوں کی کوئی نسبت بھی نہیں تھی، یعنی سو میں سے کوئی ایک پڑھا ہوا ہو۔ پنجابی زبان بولنے والے تھے، اس کے علاوہ نہ اُردو سمجھتے تھے اور نہ ان کے پاس کوئی تعلیم تھی اور آگے اتنا بڑا خطیب کھڑا ہے جو ہندو پاک کا مایہ ناز خطیب تھا، زبان جس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوتی تھی اور جو فصاحت و بلاغت میں اپنا مقام رکھتے تھے۔

حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ معراج کا جلسہ تھا۔ حضور اکرم ﷺ کے معراج کا بیان تھا تو جیسے مجھے اللہ نے توفیق عطا فرمائی، میں نے حضور اکرم ﷺ کا معراج بیان کیا کہ ایک رات کے بعض حصے میں اللہ پاک نے اتنے بڑے عجائبات دکھلائے کہ رات بھی ختم نہ ہو، یعنی مکہ مکرمہ سے بیت المقدس کا سفر، پھر سات آسمانوں کا سفر، پھر سدرۃ المنتہیٰ تک کا سفر، انبیاء سے ملاقات، اللہ کے دربار میں نمازوں کی بخشش کے لیے بار بار حاضری اور پھر واپس آنا کہ رات کا حصہ بھی نہ گزرے تو اس پر میں بات کر رہا تھا کہ اللہ کا نظام ہے۔ جب حضور اکرم ﷺ کی سواری چلی تو اللہ نے زمین و آسمان کی گردش کو روک دیا، اللہ نے ہر چیز کو روک دیا کہ میرے نبی کے معراج کی گھڑی ہے۔

فرماتے ہیں کہ میں اس انداز میں بیان کر رہا تھا تو اب میں نے دیکھا کہ لوگوں میں کوئی جذبہ، شوق، کوئی تجسس اور ان کے چہروں پر کوئی خوشی نہیں کہ میری بات سمجھ رہے ہوں۔ تو میں نے اندازہ لگایا کہ کوئی بات ضرور ہے! یا تو یہ سارے کا سارا مجمع میرا مخالف ہے یا پھر ان کو میری بات سمجھ نہیں آرہی کہ میں اُردو میں بات کر رہا تھا اور سامنے ٹھیٹ پنجابی بولنے والا۔ اور اُردو بھی جو دہلی اور لکھنو کی ڈھلی ہوئی زبان ہو، عام اُردو بھی نہیں تھی۔ تو میں نے اندازہ لگایا کہ ان کو میری بات سمجھ نہیں آرہی۔ تو میں نے پنجابی کی طرف رخ موڑا کہ میں جو بات کہہ رہا ہوں کوئی تہاڈے پلّے آندی پئی اے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔

شاہ جی کہتے ہیں کہ فوراً میرے دماغ میں آیا اور میں نے کہا: جب میرا نبی اوپر گیا، ''تیرے لونگ دا پیا لشکارا تے ہالیاں نے ہل ڈک لیے'' تو ان کے نعرے لگ گئے۔ ان کو سمجھ آگئی کہ بخاری کیا کہنا چاہتا ہے۔ تو لوگ واہ واہ کرنے لگے اور نعرے پر نعرہ، اور شاہ جی زندہ باد اور پتہ نہیں کیا کچھ ہو گیا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ جب بات ان کو سمجھ میں آنے لگی تو وہ بیچارے بات کریں گے۔

لوگوں کی سمجھ کے مطابق بات کرو:

جب جاہل سے بات کی جائے تو اس کی عقل کے مطابق بات کی جاتی ہے اور جب ایک پڑھے لکھے سے بات کی

جائے تو اس کی عقل کے مطابق کی جاتی ہے۔ اور شریعت کا یہی حکم ہے: "كَلِّمُوا النَّاسَ عَلَى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ"[1] کہ تمہارے سامنے جو مخاطب ہوتے ہیں تو بات ایسے انداز میں کرو کہ کم از کم ان کے پلے میں بھی کوئی نہ کوئی بات پڑ جایا کرے۔

اب لازمی بات ہے کہ مشرکین مکہ جاہل تھے، ان کے پاس نہ کتاب ہے اور نہ علم ہے، نہ ان کے پاس کوئی دین ہے اور نہ کوئی مسئلہ ہے، وہ خالص مشرک تھے، بت پرست تھے، اپنی زندگی بتوں کی عبادت میں گزارنے والے تھے، شراب، ڈاکے، قتل، خونریزیوں میں زندگی گزارنے والے تھے، تو ایسی قوم کو تو اسی انداز میں جھنجھوڑنا تھا۔ اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو سامنے کی بات ہے کہ وہ اہل کتاب ہیں، ان کے پاس پڑھے لکھے لوگ ہیں، علماء ہیں۔ پھر ان مشرکین کے پاس تو کوئی اصل نہیں ہے، یہودیوں کے پاس تو اصل ہے کہ وہ خدا کو مانتے ہیں، اپنے نبی کو مانتے ہیں، آخرت کو مانتے ہیں اور وہ اللہ کی اُتاری ہوئی کتاب تورات کے بارے میں ایمان رکھتے ہیں۔ ان کی اصل ہے اور مشرکین کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں تھی۔

یاد رکھیں کہ جب آدمی کے درمیان میں مثلاً: دس نمبروں کا جھگڑا ہو اور دس نمبر تیرے میرے ایک ہی نہ ہوں تو آپس میں صلح ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر دس نمبروں میں چار یا پانچ نمبر ایسے ہیں کہ ان پر میری اور آپ کی گفتگو کا اتفاق ہوسکتا ہے تو باقی پانچ پر صلح ہونے کا امکان ہوسکتا ہے۔ اور جہاں دس پر ہی بات نہ ہوسکتی ہو تو کہاں صلح ہوگی؟

اہل کتاب کو اس لیے کہا گیا: ﴿يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَاجُّوْنَ فِيْٓ إِبْرٰهِيْمَ وَمَآ أُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْإِنْجِيْلُ إِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ [آل عمران:٦٥] اے اہل کتاب! آؤ تمہارے اور ہمارے درمیان توحید کا مسئلہ مشترک ہے، تم خدا کو مانتے ہو اور ہم بھی خدا کو مانتے ہیں، تم بھی بتوں کی عبادت نہیں کرتے اور ہم بھی بتوں کی عبادت نہیں کرتے اور تم بھی لات وعزیٰ کو نہیں مانتے اور ہم بھی لات وعزیٰ کو نہیں مانتے تو اس بات پر آؤ، ہم آپس میں بیٹھ کر بات کریں۔

اہل کتاب کا ذبیحہ کیوں حلال کیا گیا؟ ذبیحہ کے اندر ایک قاعدہ کلیہ یاد رکھ لو: ﴿فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ﴾ [الانعام:١١٨] جس جانور پر ذبح کرنے کے وقت اللہ کا نام لیا جائے وہ جانور حلال

[1] [الآداب الشرعیۃ: ١/٣٤٩]

ہوجاتا ہے، ﴿وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ......الآية﴾[الانعام:۱۲۱] اور جس جانور پر ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لیا جائے تو وہ جانور حرام ہوجاتا ہے۔

ذبیحہ کیوں حلال اور میتہ کیوں حرام؟

وہ کیا ہے کہ نام لینے سے کیوں حلال ہوجاتا ہے اور نام نہ لینے سے کیوں حرام ہوجاتا ہے؟ اس پر غور کریں۔ وجہ یہ ہے کہ موت وحیات دینے والا اللہ ہے تو جب جانور کو ہم ذبح کررہے ہوتے ہیں تو گویا ظاہری طور پر اسباب کی حد تک، مجاز کی حد تک اس جانور کی زندگی کو ہم ختم کررہے ہوتے ہیں اور اسے ہم موت دے رہے ہوتے ہیں، حالانکہ اس کا مالک حقیقی اللہ ہے۔ جب ہم نے اللہ کا نام لے لیا تو یقین ہوگیا کہ اصل موت دینے والا تو مولا ہے، میرے ہاتھ میں تو بس عارضی طور پر چھری ہے تو میں تو عارضی طور پر ایک اسباب کی حد تک چلا رہا ہوں، ورنہ حقیقت میں مالک تو اللہ ہے۔ جب اس نے یہ اعتراف کیا تو اسی مالک کے نام پر اس جانور کو موت آئی تو حلال ہوگیا۔ تو جب اللہ کا نام نہ لیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ ایک قسم کا شرک آیا کہ اگر خدا مار سکتا ہے تو میں بھی مار سکتا ہوں۔ کیا ضرورت ہے کہ اللہ کا نام لوں؟ اور نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جانور حرام ہوگیا۔

کیونکہ بعض کفار اعتراض کرتے تھے کہ اگر جانور خود مرجائے تو وہ مسلمانوں کے نزدیک حرام ہے اور اگر جانور کو یہ خود ذبح کرکے ماردیں تو وہ حلال ہے۔ جو خدا مار ڈالے وہ ان کے نزدیک حرام ہوجاتا ہے اور جو بندہ مار ڈالے وہ ان کے نزدیک حلال ہوجاتا ہے۔ کیونکہ جو جانور مرگیا ہے، اس کو آخر اللہ نے مارا ہے، کسی بندے نے تو نہیں مارا ہے۔ اس میں بھی وجہ یہ ہے کہ مرنے کے وقت اس پر اللہ کا نام لینے والا کوئی نہیں تھا، اس لیے وہ حرام ہوگیا ہے اور یہ اس لیے حلال کیا گیا کہ ہم نے نہیں مارا، ہم نے تو کہا: بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ ﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ ۚ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۝﴾[الانعام:۱۶۲، ۱۶۳]

یہود ونصاریٰ عورتوں سے شادی کیوں جائز ہے؟

ہمیشہ یاد رکھیں کہ اہل کتاب کا ذبیحہ بھی اللہ کے نام پر تھا اور اہل کتاب کی اگر کوئی عورت گھر میں آئے وہ اللہ کو بھی مانتی ہوگی۔ اور ہمارے نبی کو نہ مانے، لیکن اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانتی ہوگی یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتی ہوگی اور آنے کے بعد مسلمانوں کی زبان سے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی شان میں وہ اچھی باتیں سنے گی

کہ یہ مسلمان تو ان کو مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول تھے، کلیم اللہ تھے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ نے باتیں کیں اور اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بڑے بڑے معجزات عطا فرمائے تو وہ سوچے گی کہ یہ تو ہمارے مذہب کے قریب ہیں۔ اور اگر وہ نصرانی لڑکی ہے تو عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں مدح وثنا سنے گی تو اس کا اسلام کے قریب آجانا ممکن ہے۔ لیکن جو مشرک ہے، جس کا توحید پر بھی جھگڑا، قیامت میں بھی جھگڑا ہے، کوئی ایک نمبر بھی نہیں ہے جس پر ہماری آپس میں صلح ہو سکے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ ان کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرو جو معاملہ کسی دوسرے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

ایک ہے متفق طور پر کفر کا فتویٰ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں، وہ یہودی ہو یا نصرانی ہو، جب تک ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ نہ پڑھیں، وہ کافر ہیں۔ اس لیے کہ جب ہم ان کے نبیوں کو مانتے ہیں اور وہ ہمارے نبی کو نہ مانیں تو ایک نبی کا انکار گویا تمام انبیاء کا انکار ہے۔ اس لیے ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں، لیکن ان کے ساتھ نرمی سے معاملہ کیا جائے گا، ان کے ساتھ بات عالمانہ انداز میں کی جائے گی۔ اس لیے اب آپ دیکھیں کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود ہیں یہ تو اس وقت بھی موجود نہیں تھے جب موسیٰ علیہ السلام کا دور تھا، اللہ نے فرمایا:

﴿يَبَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ ٱذۡكُرُواْ نِعۡمَتِيَ ٱلَّتِيٓ أَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَأَنِّي فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى ٱلۡعَٰلَمِينَ﴾ [البقرۃ:۴۷] اے عبداللہ کے بیٹو! اے یعقوب کے بیٹو! میرے چنے ہوئے انسان کی اولاد! میری نعمتوں کو یاد کرو۔

اسی طرح اللہ نے ان کی تفصیلات قرآن میں فرمایا کہ ہم نے تم پر نبوت کا دروازہ کھول دیا کہ چار ہزار نبی تم میں پیدا کیے، ہم نے تم پر یہ نعمت کی کہ تمہیں اس زمانے کے لوگوں سے افضل بنا دیا، ہم نے تم پر نعمت کی کہ تم میں بادشاہ پیدا کیے، ہم نے نعمت کی کہ تم میں ایسا پیغمبر بھیجا جس کے ساتھ اللہ نے خود کلام فرمایا۔ اور فرمایا: میری نعمتیں یاد کرو کہ میں نے تمہیں دشمن کے عذاب سے چھڑایا، فرعون کے عذاب سے چھڑایا، وہ تمہارے لڑکوں کو قتل کر دیتا تھا، تمہاری بچیوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ اس کے بعد کہ اس دشمن کو تمہارے سامنے دریا میں غرق کر دیا اور تم کو دریا سے نکالا۔ ان تمام نعمتوں کی تفصیل آپ پہلے پڑھ چکے ہیں، آخر میں آپ نے پڑھا کہ اللہ نے حکم دیا کہ تم بیت المقدس میں داخل ہو جاؤ اور قوم عمالقہ کے ساتھ مقابلہ کرو، ان کے خلاف جہاد کرو۔ اور یہ بھی ہمارا وعدہ تھا کہ جہاد کرو گے تو نصرت وفتح تمہاری ہوگی۔

جب بھی انبیاء علیہم السلام کو جہاد کا حکم ملتا ہے تو فتح بھی ملتی ہے:

اور ایک قاعدہ یاد رکھو کہ جس پیغمبر کو اللہ نے جہاد کا حکم دیا ہو کہ فلاں کفار کے ساتھ مقابلہ کرو تو یاد رکھو کہ اللہ پھر اس نبی کی حفاظت فرماتے ہیں، وہ نبی شہید نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے حکم دیا اور پھر نبی شہید ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مدد تو نہ آئی کہ اللہ نے اپنے نبی کو خود حکم دیا کہ مقابلہ کرو، اور جب نبی مقابلہ پر جائے تو خود قتل ہو جائے۔ اس لیے اس نبی کو جس کو جہاد کا حکم دیا گیا ہو، اس کو کبھی کوئی کافر تکلیف نہیں پہنچا سکتا، اللہ تعالیٰ کی نصرت اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور جن جن انبیاء کو جہاد کا حکم اپنے زمانہ میں نہیں ملا، ان میں سے بعض اپنی قوم کے ہاتھوں شہید ہوئے ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو مراتب علیا پر یہ درجہ بھی عطا فرمادیں کہ اللہ کے راستے میں جامِ شہادت نوش کر گئے، جیسا کہ قرآن میں آتا ہے: ﴿وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ [البقرۃ:٦١] کہ لوگوں نے انبیاء کو ناحق یعنی ناکردہ گناہوں میں قتل کر ڈالا۔

تو یہ قاعدہ اور سنۃ اللہ ہے جب اللہ حکم دیں گے تو اللہ مدد بھی کریں گے: ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾ [غافر:٥١] تحقیق پکی بات ہے کہ ہم اپنے رسولوں کی مدد کرتے ہیں، ہم ان کی اعانت کرتے ہیں، اور جب اللہ کی مدد شامل حال ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت مقابلہ نہیں کر سکتی۔

لیکن اللہ نے فرمایا: اے بنی اسرائیل! تم یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے تمہیں جہاد کی دعوت دی تو تم اکڑ گئے، تم نے کہا کہ ہم بیت المقدس میں داخل نہیں ہوتے، اس کے اندر تو بڑی جبار قوم ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ کی مدد کا وعدہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ پتہ نہیں مدد میں دیر لگ جائے اور ہم مارے جائیں۔ اور اتنی سخت بات کہہ دی: ﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ [المائدۃ:٢٤] تم اور تمہارا رب جا کر قتال کرو۔ اس حکم کی نافرمانی کی پاداش میں ہم نے تمہیں میدانِ تیہ میں رکھا کہ اگر تم میرے نبی کا حکم نہیں مانتے ہو تو بھٹکتے رہو۔

یاد رکھو کہ جو قومیں اللہ اور اس کے رسول کا انکار کرتی ہیں وہ بھٹکتی رہتی ہیں، وہ کبھی منزل مقصود کو نہیں پا سکتیں۔ منزل مقصود کے ملنے کا راستہ یہی ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول کے راستے پر آجائیں۔

معمولی غلطی پر بڑا نقصان:

اس بات کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مقدس جماعت کوئی نہیں۔ نہ ہوئی ہے اور نہ پیدا ہو گی۔ صحابہ آسمانِ

نبوت کے چمکتے ہوئے تارے ہیں۔ صحابہ میرے اللہ کے نبی کے پیارے ہیں، صحابہ وہ ہیں جن کو اللہ نے اپنے نبی کے لیے چن لیا۔ لیکن انہوں نے بھی جب ایک غلطی کی جنگ احد کے موقع پر تو مسلمانوں کو شکست ہوگئی اور شکست بھی فتح ہونے کے بعد ہوئی، یعنی فتح ہو چکی تھی، کفر ہار گیا تھا، کفر کی طاقت کی کمر ٹوٹ چکی تھی اور کفر بھاگ رہا تھا، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے چند افراد سے اجتہادی خطا ہوگئی کہ انہوں نے سمجھا کہ اس درے پر قائم رہنے کا اس وقت تک حکم تھا جب تک ہمیں خطرہ ہو۔ اب تو دشمن بھاگ گیا، اب ہم کیوں کھڑے رہیں؟ تو خالد بن ولید نے پہاڑ کے پیچھے سے حملہ کیا اور مسلمانوں کی فتح، شکست میں بدل گئی اور اس جنگ میں ستر صحابہ شہید ہوئے۔ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی عزیز شہید ہوئے، صحابہ کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے گئے اور میرے پاک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ مبارک میں خود کا کنارہ گھس گیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اونچی جگہ کھڑے تھے اور آپ نیچے بیٹھے اور پیچھے کو گرے تو کافروں نے اعلان کردیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شہید ہوگئے۔ اتنی بڑی شکست ہوگئی۔ وجہ یہ تھی کہ صرف ایک بات میں غلطی ہوگئی۔

اور جو نبی کا کوئی کہنا بھی نہ مانے، انہیں کامیابی کیسے مل سکتی ہے؟ جن کے قول میں بھی نافرمانی ہے اور فعل میں بھی نافرمانی ہے، جو اللہ کے دشمن کے گرویدہ ہیں، اللہ کے نام لینے والوں کے دشمن ہیں، ان کو کامیابی کیسے مل سکتی ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل نے انکار کیا تو ان کو سزا کیا ملی کہ اللہ نے فرمایا کہ چالیس سال تک اسی صحراء میں بھٹکتے رہو، لیکن پھر اللہ نے تم پر اپنی نعمتیں کیں کہ تمہارے کھانے پینے اور سائے کا انتظام کردیا اور تمہارے کپڑوں کا انتظام کردیا۔ پھر ان کو یاد دلایا کہ تمہیں حکم دیا گیا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ تو تواضع کرو، نیازمندی کرو۔ آدمی کو اگر اللہ تعالیٰ کبھی کامیاب کردے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ تکبر کرے، بلکہ اس کو چاہیے کہ زیادہ جھک جائے۔

صلوٰۃ الاستسقاء میں اختلاف کی حیثیت:

یاد رکھیں کہ یہ جھگڑے نہیں ہوتے، صرف علمی باریکیاں ہوتی ہیں، ائمہ کرام کے فہم میں اختلاف ہوتا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ بعض لوگ...... جن کو ائمہ اربعہ سے عناد ہے وہ...... چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر بہانے نکال کر ائمہ کی برائیاں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ باقی ائمہ کے نزدیک استسقاء کے لیے نماز پڑھنا ہی ضروری ہے کہ امام آ کر نمازِ استسقاء پڑھائے، خطبہ دے اور لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائے اور لمبی لمبی

دعائیں کرے اور اپنی چادر کو بدلے اور قول خیر کرے کہ اللہ تعالیٰ موسم کو بدل ڈالے۔ دعا کی جائے اور اس کے لیے نماز ضروری ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک نماز ضروری نہیں آئی، یعنی واجب کے درجہ میں نہیں ہے، سنت تو ان کے نزدیک بھی ہے۔ یہ نہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ استسقاء کی نماز کے مخالف ہیں۔ جیسے لکھ دیتے ہیں کہ دیکھو جی! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مخالف ہے۔ اللہ معاف فرمائے۔ اس لیے اس کی بجائے استسقاء کی دعا نہیں مانگی جا سکتی۔ بلکہ فرماتے ہیں کہ یہ دعا بغیر نماز کے بھی ہوتی ہے۔

جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں خطبہ پڑھ رہے تھے کہ ایک صحابی نے کھڑے ہو کر کہا کہ حضور! مہربانی کریں۔ بارشیں نہیں ہو رہیں، ہمارے تو مال برباد ہو گئے اور بچے ہلاک ہو رہے ہیں، لسی، دودھ، مکھن نہیں ملتا اور مال دودھ کہاں سے لائے؟ ان کو چارا نہیں ملتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہیں خطبہ میں کھڑے کھڑے دعا کی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جب ہم نماز پڑھ کر نکلے تو بارش شروع ہو گئی۔

[صحیح البخاري، حدیث: ١٠١٨، بَابُ مَا قِيلَ: إِنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم لَمْ يُحَوِّلْ رِدَاءَهُ فِي الِاسْتِسْقَاءِ...]

اس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی علیحدہ نماز نہیں پڑھی۔ تو یہ صحیح حدیث ہے۔ تو امام صاحب رحمہ اللہ صرف اتنا فرماتے ہیں کہ نماز پڑھو، الحمدللہ! یہ نماز بھی سنت سے ثابت ہے، سنت ہے، لیکن اگر امام نے نماز کے بغیر خطبہ میں کھڑے ہو کر دعا کر دی تو یہ بھی استسقاء ہے۔

پتھر پر عصا مارنے سے پانی کا نکلنا:

اس آیت مبارک سے معلوم ہوتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے اللہ تعالیٰ سے پانی طلب فرمایا تو یہاں کسی نماز کا ذکر نہیں، صرف پانی مانگنے کا ذکر ہے۔ اور قرآن کے الفاظ پر غور کریں: ﴿وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝﴾ [البقرة: ٦٠] تو معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ پانی خاص اپنی قوم کے لیے مانگا تھا۔

ایک استسقاء یہ ہوتا ہے کہ آدمی بارشیں مانگتا ہے تو اللہ آسمانوں سے بارش برساتے ہیں، اس سے مسلمانوں، کافروں، فاسق و فاجر سب کو نفع ہوتا ہے۔ ایک ہے خاص کسی قوم کے لیے پانی مانگا جائے۔ تو وہاں اللہ کا نظام یہ

ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی زمین سے عطا فرمادیتے ہیں اور چاہتے ہیں تو کبھی کبھی ایک محدود علاقے میں بارش برسا دیتے ہیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام کو حکم ملا کہ پتھر پر اپنا عصا مارو۔ اللہ نے جب حکم دیا تو مطلب یہ تھا کہ جو بھی پتھر پڑا ہو۔ کیونکہ یہ مصر اور شام کے درمیان کے علاقے ہیں اور ان علاقوں میں ویسے بھی پہاڑ موجود ہیں۔ لیکن بعض مفسرین نے فرمایا کہ اللہ نے ایک خاص پتھر کے بارے میں حکم دیا، البتہ قرآن نے اس کی کوئی تعیین نہیں کی۔ آیت سے یہ بات بھی سمجھ آئی کہ وہ پتھر بڑا ضرور تھا، کیونکہ ایک پتھر چھوٹا سا ہو اور اس میں بارہ چشمے ہوں تو وہاں آدمی پانی بھرنے کے لیے کھڑا بھی نہیں ہوسکتا تو ہر قبیلہ کے لیے جب چشمے علیحدہ علیحدہ جاری کردیئے گئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا راستہ الگ الگ ہے اور اس کا راستہ الگ ہے۔

﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ یہاں لفظ ''ف'' استعمال کیا گیا ہے، اور ''ف'' کا استعمال ''تعقیب مع الوصل'' کے لیے ہوتا ہے، یعنی جونہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر عصا مارا تو فوراً بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ یہ نہیں کہ اس میں کئی دن لگے، کئی گھنٹے یا سال لگے۔ جیسا کہ حکم ہے: ''إِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا'' (جب امام تکبیر کہے تو تم تکبیر کہہ دو)۔

پانی تھوڑا تھوڑا نکلا یا چشموں کی صورت میں؟

﴿فَانْفَجَرَتْ﴾ کا معنی ہوتا ہے کثرت کے ساتھ کسی چیز کا بہہ نکلنا۔ لیکن دوسری جگہ قرآن کہتا ہے: ﴿فَانْبَجَسَتْ﴾ اس کا معنی ہوتا ہے تھوڑا تھوڑا پانی کا رِسنا۔ اب دونوں لفظوں میں ایک قسم کا تعارض ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ کوئی تعارض نہیں ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا مارا تو پہلی کیفیت یہ تھی کہ تھوڑا تھوڑا پانی رسنا شروع ہوا اور کچھ دیر کے بعد وہ بڑھتا گیا۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ وقت کے احوال کا تقاضا ہے کہ یہ بھی اللہ کی شان تھی کہ جب وہ پانی لینے کے لیے آتے تو پانی پورے جوش سے نکل پڑتا اور جب وہ پانی نہ بھرتے تو تھوڑا تھوڑا رستا رہتا، تاکہ اللہ کی نعمت ضائع نہ ہوجائے۔ اس لیے کہیں فرمایا: ﴿فَانْبَجَسَتْ﴾ اور کہیں فرمایا: ﴿فَانْفَجَرَتْ﴾

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھیں۔ ایک تو پتھر سے پانی کا نکلنا معجزہ ہے اور پھر پانی کا بارہ چشمے بننا بھی معجزہ ہے اور اس پانی کا میٹھا ہونا بھی معجزہ۔ اور اس پانی کے لیے کوئی کھدائی نہیں، صرف عصا مارا وہ بھی پتھر پر۔

حالانکہ لکڑی پتھر پر مارو تو لکڑی ٹوٹ جاتی ہے اور پتھر نہیں ٹوٹتا۔ لیکن یہاں معجزہ ہے کہ لکڑی نہیں ٹوٹی، بلکہ پتھر سے پانی پھوٹ پڑا۔

﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ﴾ ان کے پینے کی جگہ، یعنی بارہ چشمے تھے اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے تو ہر ہر قبیلہ نے اپنی ایک ایک جگہ مقرر کر لی کہ یہاں سے تم بھرو گے اور یہاں سے تم، تا کہ لڑائی جھگڑا اور اختلاف نہ ہو۔

زمزم کا چشمہ:

یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے چاہے تو پتھروں سے پانی جاری کر دے۔ یہ جو زمزم ہے، یہ بھی پتھریلا مقام ہے۔ وہاں دیکھیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ملا کہ اپنا عصا ماریں اور یہاں عصا بھی نہیں ہے، حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے پاؤں ہلا رہے ہیں اور وہاں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مانگا اور یہاں مانگنے والا بھی کوئی نہیں ہے، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی نہیں مانگا۔ کیونکہ ابھی بچپنا ہے، صرف ان کی اماں دوڑ لگا رہی ہیں کہ پانی تلاش کروں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا حال مانگنے سے بھی زیادہ قوی ہے۔ ایک آدمی مانگ تو لیتا ہے اور ایک مانگنے کے قابل بھی نہیں ہوتا۔

آپ نے کبھی دیکھا کہ ہو کہ بیمار ہے اور زبان بند ہو گئی ہو، اب وہ بیچارا آنسو بہا رہا ہوتا ہے۔ اندر تو مانگ رہا ہوتا ہے زبان نہیں ہلا سکتا۔ اسماعیل علیہ السلام چونکہ چھوٹے بچے تھے، مانگ بھی نہیں سکتے تھے، لیکن پیاس کی شدت کا یہ عالم ہے کہ پاؤں اسی پتھر پر رگڑ رہے ہیں، اللہ نے فرمایا: جبرائیل! اس جگہ پر پَر مارو جہاں اسماعیل کے پاؤں لگے ہیں اور اسی جگہ وہی چشمہ نکلے۔ وہیں سے چشمہ پھوٹ پڑا۔

حضرت ایوب علیہ السلام کے لیے چشمہ:

اسی طرح حضرت ایوب علیہ السلام نے جب اپنے پروردگار سے مانگا: پروردگار عالم! مجھے جو تکلیف پہنچی ہے اب اس تکلیف نے مجھے بے انتہاء عاجز کر دیا ہے، آپ رحم کرنے والے ہیں رحم فرمائیں۔ تو اللہ نے حکم دیا: اے ایوب! جس جگہ تم بیٹھے ہو اس جگہ اپنا پاؤں مارو، اسی جگہ پانی نکلے گا، غسل بھی کر لو اور اسی پانی کو پی بھی لو، اس میں ہر بیماری کا علاج ہے۔

تو اللہ نے وہاں سے بھی زمین سے پانی نکالا جہاں حضرت ایوب علیہ السلام کا پاؤں لگا اور وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا لگا تو پانی جاری ہوا اور یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا پاؤں لگا، چشمہ جاری ہو گیا۔

آپ ﷺ کے ہاتھوں سے جاری پانی کے معجزات:

ایک دفعہ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! پانی نہیں ہے، پینے کے لیے نہیں ہے اور وضو کے لیے بھی نہیں ہے...... اس زمانہ میں بڑے بڑے پیالے ہوتے تھے جس کو عربی میں "کاس" کہتے ہیں۔ اب تو انگریز کی تہذیب یہی ہے کہ ہر آدمی اپنے گلاس میں پانی پیے، تاکہ کبھی اکٹھے نہ ہوسکیں، ہمیشہ علیحدہ علیحدہ رہیں۔ پینا بھی علیحدہ، کھانا بھی علیحدہ، پلیٹ بھی ہر کسی کی علیحدہ، اور چمچہ، چھری کانٹا بھی علیحدہ، حمام بھی علیحدہ، بیڈروم بھی علیحدہ، یہ تفریق ہے۔ اور اسلام کہتا ہے کہ ملاؤ۔ نماز بھی ایک، مسجد بھی ایک، جمعہ بھی ایک، عیدین بھی ایک، حج بھی ایک، اور ایک ہی دسترخوان، ایک ہی برتن میں بیٹھ کر کھاؤ۔ پتہ نہیں کس کے ہاتھ میں اللہ برکت دے...... صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: پیالہ لے آؤ۔ ہم پیالہ لے آئے تو فرمایا: جن جن کے پاس پانی ہو وہ بھی لے آؤ۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ کسی کے پاس جتنا کچھ تھا، سارا پانی اکٹھا کیا۔ حضور ﷺ نے اس پانی کو اس پیالہ میں ڈال دیا۔ حضور ﷺ نے ہاتھ رکھا تو اللہ نے انگلیوں سے چشمہ جاری کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی شان ہے جس چیز سے چاہیں عطا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پی بھی لو اور بھر بھی لو، جتنا مرضی آئے۔

[المعجم الاوسط، حدیث: ۴۲۱۵، المعجم الکبیر، حدیث: ۱۲۵۶۰]

اور کبھی انگلیوں کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ مشکیزے اوپر باندھے ہوئے ہیں، عورت بیٹھی ہوئی ہے، کافرہ عورت ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بی بی! میرے صحابہ کے پاس پانی نہیں ہے، انہیں پانی کی ضرورت ہے، اگر اجازت دو تو ہم تمہارے پانی کو استعمال کریں۔ لیکن اللہ ہمیں دے گا، سبب یہ پانی ہوگا۔ عورت کیا جواب دیتی؟ چپ کھڑی ہے۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، اجازت ہے۔ وہ ڈر رہی تھی کہ اتنا بڑا لشکر ہے۔ بہرحال حضور اکرم ﷺ نے پانی نکالا اور پڑھا اور پڑھنے کے بعد اس کے اندر اپنا لعابِ دہن بھی ڈالا اور اس پانی کو پھر مشکیزہ میں ڈال دیا اور مشکیزہ کا منہ باندھ دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کو دوسرے حصہ سے کھول دو اور سارے لشکر والے پانی بھر دو۔ وہ عورت کہتی ہے کہ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہوں کہ سارا لشکر پانی پی بھی گیا اور برتن بھی بھر لیے اور میرا مشکیزہ اسی طرح ہے، اس میں بھی پانی کی کوئی کمی نہیں ہوئی۔ تو یہ بھی پیغمبروں کے معجزے ہوتے ہیں!! اللہ کے ان پر کروڑوں صلوٰۃ وسلام ہوں۔ [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۱۹۸۹۸]

تفسیر:

﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ﴾ اس کے بعد اللہ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کھاؤ پیو اور اشارہ کیا کہ ویسے تو سارا اللہ کا رزق ہے جو بھی ملتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ لیکن چونکہ تمہیں بغیر محنت کے مل رہا ہے، تم نے گھر نہیں بنایا، ہم نے بادل کا سایہ کر دیا، تم نے پانی کی تکلیف کا اظہار کیا تو ہم نے بارہ چشمے جاری کر دیئے، تم نے کھانے کے لیے مانگا تو ہم نے تم پر مَن وسلویٰ اُتار دیا۔ تو یہ تو خاص اللہ کے رزق میں سے رزق ہے جو تمہیں دیا گیا ہے۔

﴿وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ﴾ اور نہ بنو تم شور اور فساد مچانے والوں میں سے۔ یعنی زمین میں ظلم نہ کرو، فساد نہ کرو اور جرائم نہ کرو۔ کیونکہ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو زمین میں فساد ہوتا ہے، اگر مسلمان یا تمام مخلوق اللہ کے حکم پر چلے تو فساد نہیں ہوگا۔ اس لیے فرمایا کہ کھاؤ پیو۔ اور اس سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ اللہ جو بندے کا رزق دے، اس میں سے کھائے پیے، استعمال کرے، لیکن شرط یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے، حدود سے نہ نکلے اور تکبر و فساد نہ کرے۔

ایک ظالم جاگیردار کا واقعہ:

مجھے یاد ہے۔ میں بالکل چھوٹا سا تھا۔ میری عمر آٹھ سال کے قریب تھی۔ ہمارے بہاولپور میں ایک بہت بڑا امیر کبیر، زمیندار اور بڑا جاگیردار آدمی تھا۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ اس سے...... نعوذ باللہ!...... کوئی ایسا ظلم نہیں چھوٹا تھا جس نے غریبوں پر نہ ڈھایا ہو۔ غریبوں کی جائیدادیں ختم، غریبوں کے گھر میں اگر کوئی خوبصورت بچی ہے تو وہ ختم۔

والد صاحب نے اسے کئی دفعہ تقریروں میں جھنجھوڑا۔ وہ روزانہ دھمکیاں بھیجے اور پیغام بھیجے کہ مولوی صاحب! آپ ایسا نہ کریں، آپ میرے خلاف تقریریں کرتے ہیں، آپ میری طاقت کو نہیں جانتے کہ میں کیا ہوں!!؟ تمہارے جیسے مولوی کو اگر میں نے یوں مسل دیا تو کہیں ملو گے بھی نہیں، تمہارا تو وجود بھی نہیں ملے گا۔ تم غریب مولوی ہو، تم نے کیا ہم جاگیرداروں اور وڈیروں کا مقابلہ کرنا ہے؟ والد صاحب اپنے حق کی دعوت پر قائم رہے اور فرمایا: میں تو خیر کچھ نہیں ہوں، لیکن جس خدا کی میں دعوت دیتا ہوں وہ بہت بڑا ہے۔

چند دنوں کے اندر انقلاب آیا، نواب صاحب اس سے ناراض ہوئے اور اس کو نکال دیا اور اس کے بعد وہ بیماریوں کا مرقع ہوگیا۔ جائیدادیں بک گئیں۔ تو اس نے والد صاحب کے پاس آدمی بھیجے کہ خدا کے لیے مولانا!

مجھے معاف کردیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہم گئے تو اس نے کہا تھا کہ اس سے بڑا کوئی عذاب ہے کہ اس طرح پڑا ہوا ہوں؟ اور گھر والے پانی بھی نہیں ڈالتے۔ مانگتا رہتا ہوں، کبھی نوکر کو رحم آجاتا ہے تو پانی ڈال دیا۔ کیونکہ پیسہ تھا، دولت تھی، کوئی بیٹا مری میں بیٹھا ہوا ہے اور کوئی باہر بیٹھا ہوا ہے اور کوئی سیر پر گیا ہوا ہے اور کوئی بیٹی کسی محل میں ہے اور کوئی بیٹی کسی محل میں ہے اور میں پڑا ہوں۔ والد صاحب نے فرمایا کہ تم تو مولویوں کو مسلنا چاہتے تھے۔ اب دیکھو کہ تمہارا کیا حال ہے!؟ اس نے کہا: اسی لیے بلایا ہے کہ مجھے معاف کردو۔ دنیا تو گزر گئی، لیکن آخرت تو برباد نہ ہو۔ اب میں بستر سے اُٹھتا تو نہیں ہوں، لیکن کم از کم میری قبر کا مسئلہ حل ہو جائے۔ والد صاحب نے فرمایا: وہ تو تب حل ہوگا جب لوگوں کے حقوق واپس کروگے۔ جس کو لُوٹا ہے ان کو دو، جن سے چھینا ہے ان کو واپس کرو۔ حقوق العباد تو اللہ بھی معاف نہیں کرتے۔

اس لیے آدمی یہ نہ سمجھے کہ میرے پاس نعمتیں ہیں، میرے پاس دولت ہے۔ جو خدا دینے پر قادر ہے وہ لینے پر بھی قادر ہے۔ جو خداوند قدوس جب ہم رات کو سوئیں اور صبح کو امیر بنا دے...... ماشاء اللہ!...... وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ رات کو سوئیں اور صبح کو بھکاری بنا دے۔

علماء کی توہین کرنے والے کا عبرتناک انجام:

ایک دفعہ آپ کے ملک میں ایک آدمی نے کہا کہ میرا دل کرتا ہے کہ ان سب مولویوں کو کشتی میں ڈال کو سب کو سمندر میں غرق کردوں۔ اللہ نے اس کو ایسا غرق کیا کہ آج اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ آنکھوں سے ہم نے دیکھا کہ علماء کی بے عزتی کرکے سڑکوں پر پھینکوا دیا گیا۔ نتیجہ کیا نکلا کہ اللہ نے اسے ایسی موت دی کہ اُٹھانے والے بھی کوئی نہیں تھے۔

اللہ کی تقدیر بڑی زبردست ہے، ہر وقت اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ یہ نہ کہو کہ میں مولوی ہوں، میں عالم ہوں، میں بزرگ ہوں، میں اچھا ہوں، کوئی پتہ نہیں کہ کس خطا پر خدا پکڑے؟ کس غلطی پر خدا پکڑے؟ ہر وقت اللہ سے ڈرو۔ اگر کوئی ایسا کلمہ زبان سے نکل جائے تو معافی مانگو: یا اللہ! میں بندہ ہوں، انسان ہوں، میرے منہ سے گندی بات نکل گئی ہے، مجھے معاف فرما دے۔ میرے منہ سے تکبر اور غرور کا کلمہ نکل گیا ہے، مجھے بخش دے۔ تو اللہ معافی دے دیتے ہیں۔ لیکن اگر آدمی اکڑ جائے تو فرمایا: ہم اس کو عبرت بنا دیتے ہیں، ہم ایسا نمونہ بنا دیتے ہیں کہ

قیامت تک تاریخوں میں لکھا جائے کہ کیا حشر ہوا۔

بارہ چشموں والے پتھر کی کیفیات:

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مفسرین نے اس آیت پر بڑی تفصیل سے کلام فرمایا اور واقعات ذکر فرمائے ہیں، جیسا کہ مختصر حصہ حدیث مبارک کا ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ کی نعمتیں یہ تھیں کہ ان کے پاس ایک مربع پتھر تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اس پتھر پر اپنا عصا ماریں، ﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ تو اس پتھر سے بارہ چشمے بہہ نکلے، ہر طرف میں تین تین چشمے تھے، تاکہ بارہ قبیلے ہر قبیلہ اپنے اپنے چشمے سے لے لے اور ہر قبیلہ کو اس کا چشمہ بتادیا گیا، اس سے پانی پیتے تھے۔

ایک حدیث مبارک کا یہ ایک حصہ، ایک ٹکڑا ہے جس کو امام نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم نے فی حدیث الفتون میں جو بڑی طویل حدیث ہے، ذکر کیا ہے۔ حضرت عطیہ العوفی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو اُن کو پتھر دیا تھا، اس کی شکل بیل کے سر جیسی تھی اور بیل کے اوپر اس کو رکھتے تھے اور بیل ہی اس کو اُٹھاتا تھا۔ جب کسی منزل پر پہنچتے تو اس پتھر کو رکھ دیتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام عصا مارتے تو پانی جاری ہوجاتا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ان کو یہ پتھر عطا ہوا۔

علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ اس سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہانے کے وقت اپنے کپڑے رکھے تھے۔ جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ اس پتھر کو اُٹھالیں، کیونکہ اس میں قدرتِ خداوندی ہے اور آپ کے لیے معجزہ بھی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کو اپنی ٹوکری میں رکھ لیا۔

عثمان بن عطاء الخراسانی اپنے والد عطاء الخراسانی سے روایت فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے بنی اسرائیل کو پتھر دیا، وہ پتھر اُٹھانا اور رکھنا حضرت ہارون علیہ السلام کی ذمہ داری تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پر عصا مارتے تو اللہ پاک اس سے پانی جاری فرمادیتے تھے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ پتھر جبل طور کا ایک پتھر تھا، اس کو وہ اُٹھا کر ساتھ رکھتے تھے اور اسی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ نعمت عطا فرمائی تھی۔

یہ سارے واقعات روایات میں ملتے ہیں، بعض کتب مقدسہ سے منقول ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ اصول کی بات فرماتے ہیں اور زیادہ تفصیلوں میں نہیں جاتے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۰، البقرۃ: الآیۃ: ۶۰]

اس پتھر سے پانی کے چشمے پھوٹنے میں جہاں بنی اسرائیل کی ضرورت پوری ہوئی تھی وہاں اس سے ان کو لطیف تنبیہ بھی ہو گئی تھی کہ تم نے ایک گائے کا بچھڑا بنایا تھا اور اس میں مٹی ڈالی جو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے پاؤں کی تھی اور اس سے آواز پیدا ہوئی تو تم نے خدا بنالیا۔ ہم تمہیں بیل کے سر کی شکل کا پتھر دیتے ہیں جو بارہ قبیلوں کے لاکھوں آدمیوں کو پانی پلا رہا ہے، تو کیا یہ بھی خدا ہو گیا؟

تو یہ ایک قسم کی تنبیہ بھی ہے اور اس میں ابتلاء وامتحان بھی ہوتا ہے کہ ایسی شکل اگر کسی کو نظر آجائے تو ایمان والا آدمی تو محفوظ رہتا ہے، جس کا ایمان متزلزل ہو وہ ان واقعات کو دیکھ کر گمراہ ہو جاتا ہے۔

من گھڑت قصہ اور اس کی تردید:

جب ہم غارِ ثور پر جاتے ہیں تو وہاں پر ایک عورت کی شکل کا پتھر ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک کافر تھا جو حضور اکرم ﷺ کو نقصان پہنچانے کے لیے چھپا بیٹھا تھا، اللہ نے اس کو پتھر بنا دیا۔

آپ خود دیکھ لیں کہ یہ کوئی واقعہ نہیں ہے۔ جب ہجرت کا واقعہ قرآن میں موجود ہے، سارا واقعہ حدیث مبارک میں موجود ہے، یعنی حضور اکرم ﷺ کا اپنے گھر سے چلنا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر جانا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خواب عرض کرنا، آپ کا اونٹنی مبارک لینا اور رات کو گھر سے نکلنا اور غارِ ثور پر چڑھنا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضور اکرم ﷺ کو کندھوں پر اُٹھانا، عنکبوت کا جال ڈالنا، کبوتر کا بیٹھ جانا، سانپ کا ڈس لینا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے غلام کا آکر خبر پہنچانا، وہاں تین راتیں گزارنا اور وہاں سے چلنا یہ سب واقعہ صحیح احادیث میں موجود ہے، لیکن اس پتھر والی بات رہ گئی۔ اللہ پاک کے رسول نے اس کو ذکر نہیں کیا۔ اس لیے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ہندوؤں کا ''گاؤ ماتا'' کی پوجا کرنا:

اب دیکھیں کہ بنی اسرائیل نے چونکہ ایک بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ بچھڑا گائے سے پیدا ہوتا ہے تو ہندوؤں کو بھی موقع ملا کہ ہاں! بچھڑا ایسا تھا تو بچھڑے کی ماں تو بڑی پہنچی ہوئی ہو گی، لہٰذا انہوں نے بھی گاؤ ماتا کی پوجا شروع کر دی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے عصا دیا تھا کہ عصا پھینکو تو وہ سانپ بن جاتا تھا۔ اور سانپ بھی ایسا خطرناک کہ فرعون جیسے بادشاہ نے جو دیکھا تو کتابوں میں آتا ہے کہ وہ ایسا دوڑا کہ چلّانے لگا کہ خدا کے لیے مجھے اس سے بچاؤ۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ستر دفعہ اس کو لیٹرین میں جانا پڑا ڈر کے مارے۔ جب اتنا بڑا سانپ منہ کھولے بیٹھا ہو کہ پورے محل کو نگل جائے۔ تو ہندوؤں نے سانپ کو بھی خدا بنایا ہوا ہے، ''ناگ دیوتا'' ان کے نزدیک ہے۔

دولت مندوں کے گھروں کی چمک دمک:

اللہ نے جنت کے نمونے بیان کیے کہ ایسے باغ ہوں گے، ایسی نہریں بہتی ہوں گی، ایسی اس میں حوریں ہوں گی، ایسے غلمان ہوں گے، اس میں سونے چاندی کے برتن ہوں گے، اس کے اندر دیباج کی، کمخواب کی رضائیاں، تکیے اور کپڑے ہوں گے۔ جن کے پاس دولت آ جاتی ہے تو ان کے ڈنر سیٹ، ٹی سیٹ، واٹر سیٹ بھی سونے کے ہوتے ہیں، ٹیبلوں کے کنارے پر بھی سونا لگا ہوا ہوتا ہے اور گھروں کے نیچے باقاعدہ نہریں بہہ رہی ہیں، باغات لگائے ہوئے ہیں، گھروں میں سوئمنگ پول لگائے ہوئے ہیں۔ جو قرآن میں پڑھا ہے، جنت کی نقل کر رہے ہیں۔

عقیدے کا فساد:

اصل میں یہ سب میرے اللہ کا امتحان ہے کہ ایک ایسی چیز کا اللہ تعالیٰ نمونہ دکھا دیتے ہیں اور بندوں کو امتحان میں ڈال دیتے ہیں۔ جو ایمان والا ہے وہ سمجھتا ہے کہ لکڑی ہے اور لکڑی کچھ نہیں، سانپ بن جاتا ہے تو اصل میں موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں بھی کچھ نہیں، یہ تو اللہ کا حکم تھا۔ لکڑی لکڑی ہے، موسیٰ موسیٰ ہے، خدا خدا ہے، معجزہ معجزہ ہے اور قدرت قدرت ہے اور وہ اپنے ایمان کو مضبوط سمجھتا ہے۔

اور جو بیچارے ڈگمگاتے یقین والے ہوتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بادشاہو! سب کچھ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو دے دیا، طور والی رات موسیٰ علیہ السلام کو سب کچھ مل گیا، تمام علم بھی مل گیا، تمام قوتیں بھی مل گئیں، تمام طاقتیں بھی مل گئیں، عصا اور ید بیضاء بھی مل گیا۔ ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر نبی کو مختار بنا دیا۔ وہ بھٹک گئے۔ بعد کی آنے والی نسلوں نے یوں کہا کہ سانپ سے اللہ نے کام لیا تو کام اپنوں سے لیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سانپ بھی کوئی چھوٹا خدا ضرور ہے...... معاذ اللہ! ...... تو انہوں نے ''ناگ دیوتا'' بنا لیا۔ انہوں نے سنا کہ سامری نے بچھڑا بنایا تھا تو انہوں نے ''گاؤ ماتا'' بنا لی۔ کسی نے پڑھا کہ پہلے لوگوں نے لات، عزیٰ، منات بنایا تھا تو انہوں نے کہا: ہم بھی بزرگ، پیر بنا لیتے ہیں۔ پنجاب کا علیحدہ، سرحد کا علیحدہ، سندھ کا علیحدہ، کراچی کا علیحدہ، بلوچستان کا علیحدہ، اوپر کا علیحدہ اور نیچے کا علیحدہ۔

اور اگر سندھی کو تکلیف ہو تو ملتان میں شفا ملتی ہے، اس کو اپنے سندھ والے پیر کوئی فائدہ نہیں دیتے۔ ایمان سے جا کر دیکھ لیں کہ سارے پیدل بغیر جوتے پہنے ہوئے جاتے ہیں۔ پیدل حضرت بہاؤ الحق کی مزار پر جائیں گے، کیونکہ تکلیفیں دور کرنے کے لیے وہاں جاتے ہیں۔ اور اگر پنجاب والوں کو تکلیف ہو تو وہ شہباز قلندر آئیں گے، مقامی پیر بھی اپنے مقامی لوگوں کو علاج نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ نافرمان ہے۔ دوڑتے دوسری جگہ جاتے ہیں، پھر دوسرا پیر دھوکہ کھا جاتا ہے کہ شریف آدمی پیدل آیا ہے، چلو مہربانی کر دو۔

عجیب ایک چکر ہے۔ کہیں جناب صحابہ کی قبریں بنائی ہوئی ہیں۔ اگر پوچھیں کہ اس کی کوئی سند ہے؟ تو کہتے ہیں کہ ہمارے بڑے کہتے تھے کہ صحابی ہے۔ بھائی! صحابی کو تو تیرہ سو سال ہو گئے اور تمہارے بزرگوں کو تو سو سال ہوئے۔ سو سال والے بندے کو تیرہ سو سال پہلے والا بندہ کیسے مل گیا؟ اس پر پوجا ہو رہی ہے۔ اور یہ غازی کی مزار ہے اس پر بھی پوجا ہے۔ ''سیف الملوک'' سنتے ہوئے ایمان تاہ ہو جاتا ہے، ''ہیر رانجھا'' سنتے ہوئے ایمان تاہ ہو جاتا ہے، قرآن شریف کا کہا جائے تو کہتے ہیں کہ ہم گناہگار لوگ ہیں، کیا ہم سننے کے قابل ہیں؟ بات تو ٹھیک ہے مسلمان سنیں گے، یہ بیچارے کیوں سنیں گے؟ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ دعا کرو اللہ مسلمانوں کو ہدایت دے۔

یاد رکھو کہ اللہ کی قدرت ہے۔ اولیاء برحق ہیں لیکن خدا کے سب محتاج ہیں، نفع و نقصان کا کوئی مالک نہیں ہے سوائے میرے اللہ کے، تمام انبیاء کو پیدا کرنے والا میرا اللہ ہے، تمام اولیاء کو پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ اور پھر وہ ولی کیسے بنے؟ مقامِ ولایت پر کیسے پہنچے کہ وہ خدا کے فرمانبردار بن گئے، خدا کے اطاعت گزار بن گئے، خدا کے حکم پر چلنے والے بن گئے، ساری دنیا کو اللہ کے لیے چھوڑ دیا، اللہ نے ان کو ولایت کا مقام عطا فرما دیا۔

ان کے مرنے کے بعد ہم نے ان کو مشکل کشا اور حاجت روا بنا لیا، ہم نے ان کی نذر و نیاز چڑھانا شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے۔

فاسد عقیدہ لوگوں کی حرکتیں:

عجیب عجیب حالات ہوتے ہیں۔ ڈاکو جب ڈاکہ مارنے کے لیے جاتے ہیں تو وہ بھی اپنے پیر کی مزار پر منت ماننے کے لیے جاتے ہیں، پیر جی! میری مدد کرنا، ڈاکے پر جا رہے ہیں، واپسی پر سائیں کی نذر چڑھائیں گے۔ پیر ان کی بھی مدد کرتا ہے۔ معاذ اللہ! ان ڈاکوؤں کو اچھی سامی مل جاتی ہے۔ زانی زنا کے لیے جاتا ہے، بدبخت وہ بھی مزار پر کھڑا ہے کہ سائیں مہربانی کرو، معشوق کو ملاؤ، تساں ہر کنیں کو ملیندے ہو، اساں جدا تھے ودے ہیں، یعنی

پیر اب زنا والوں کو بھی......معاذ اللہ!......ملاتے ہیں۔

توبہ کرو، اللہ کے دروازے پر توبہ کرو، اللہ پاک کے ولیوں کو بدنام نہ کرو، ورنہ قیامت کے دن انہی ولیوں نے مدعی بن کر تمہیں جہنم میں ڈلوانا ہے۔ ولی، ولی ہوتا ہے: ﴿أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [یونس: ۶۲] یہ نہیں کہ تم ان کی قبروں پر جا کر غلط قسم کی باتیں کرو، ان کی قبروں پر تم سرکس لگاؤ، ان کی قبروں پر تم تھیٹر لگاؤ، ان کی قبروں پر تم چکلے کھلواؤ، ان کی قبروں پر......نعوذ باللہ!......تم جوئے کے اڈے لگوا دو۔ قیامت کا دن جب ہوگا پھر پتہ چلے گا، جب اولیاء اللہ کا ہاتھ ہوگا اور تیری گردن ہوگی۔

اولیاء اللہ کی شان:

ہمارے ذمہ یہ تھا کہ ہم اولیاء اللہ کی قبروں پر قرآن کے درس کھولتے، حدیثِ رسول کے درس کھولتے، ان کی زندگیوں سے لوگوں کو تعلیم دلواتے کہ وہ دین پہنچانے کے لیے کہاں سے چلے تھے، کہاں پہنچے؟ حضرت معین الدین رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بہاؤ الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ، سب عرب سے چلے اور دین کو پہنچاتے پہنچاتے ساری زندگیاں گزار دیں اور جہاں اللہ نے چاہا موت آ گئی۔ اللہ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ انہوں نے قدم قدم پر اسلام پھیلایا اور ہم نے ان کے نام پر قدم قدم پر کفر اور شرک پھیلایا۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو فیصلے ہوں گے۔ تو اس کا پہلے حل ہے کہ توبہ کرو، اللہ کے دروازے پر لوٹ جاؤ۔

اس پتھر کی مزید تفصیل:

بعض کہتے ہیں کہ وہ پتھر سنگ مرمر کی طرح تھا، اس کا جسم ایک ہاتھ مربع تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی شکل ایسے تھی جیسے انسان کا سر ہوتا ہے۔ اور بعض علماء نے کہا کہ وہ جنت میں سے تھا اور دس ہاتھ لمبا تھا، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کا قد بھی دس ہاتھ تھا۔ بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے آگے دو شاخیں تھیں جو رات کو روشن ہو جاتی تھیں اور اس پتھر کو گدھے پر رکھا جاتا تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰۰، البقرۃ: الآیۃ: ۶۰]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے براق کے متعلق:

اس لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض ہندوؤں کے جو خدا بنے ہوئے ہیں تو ان کے چار چار سر ہیں، آٹھ ٹانگیں ہیں، آٹھ ہاتھ ہیں، کسی کا ایک سر ادھر ہے اور کسی کا ایک سر اُدھر ہے۔ کوئی ایسے بنائے ہوئے ہیں کہ اوپر کا حصہ

عورت کا ہے اور نیچے کا حصہ مرد کا ہے، اوپر کا حصہ مرد کا ہے تو نیچے کا حصہ عورت کا ہے۔ ایسے آپ نے ہندوؤں کے بت سنے ہوں گے۔ مسلمانوں نے تو نہیں بنائے!!

ایمان سے بتلاؤ یہ جو ہمارے ہاں حضور اکرم علیہ السلام کی براق کی صورت فوٹو بکتا ہے اس کی بھی اوپر شکل عورت اور نیچے گھوڑے کی ہے۔ تو آپ کا کیا خیال ہے کہ جب حضور اکرم علیہ السلام براق پر جارہے تھے تو کون چھپا ہوا تھا جس نے فوٹو لیا تھا؟ پورے مکہ والوں کو تو پتہ ہی نہیں چلا۔ کیونکہ حضور اکرم علیہ السلام رات کو گئے تھے۔ کسی کو پتہ نہیں چلا کہ حضور کب گئے اور کب واپس آئے؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلمان ہو چکے تھے اور سب سے قریبی ساتھی تھے ان کو بھی پتہ نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمان ہو چکے تھے ان کو بھی پتہ نہیں، دشمنوں کو بھی پتہ نہیں اور دوستوں کو بھی پتہ نہیں، تو یہ فوٹو بنانے والا کہاں سے ملا تھا جس نے فوٹو بنا لیا؟ اور وہ بھی ایسا کہ اوپر انسان اور نیچے گھوڑے کی شکل تھی۔ اور انسان......اللہ معاف فرمائے......مرد کی شکل نہیں بنائی۔

ایمان سے بتلائیں کہ یہ محبت ہے یا حضور اکرم علیہ السلام کی توہین اور ان سے دشمنی ہے؟ اللہ کے نبی جن کی ساری زندگی غیر محرم عورت پر نظر ہی نہیں پڑی، حضور اکرم علیہ السلام کا کسی غیر محرم عورت کے ہاتھ کو ہاتھ بھی نہیں لگا، میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی عورت اسلام لانے کے لیے آئی تو پردے کے اندر تھی اور تم نے براق کی ایسی شکل بنائی جو عورت کی ہو، کیا قیامت میں خدا کو کوئی جواب نہیں دو گے؟ کیا قبر میں نہیں جاؤ گے؟ لوگ اس فوٹو کو خرید رہے ہیں اور گھر میں لگا رہے ہیں کہ برکت ہوگی۔ برکت کیا ہوگی، بلکہ اللہ کا عذاب ٹوٹے گا، نبی کی توہین کر رہے ہو۔

اللہ کے بندو! براق کا معنی یہ ہے کہ جب بجلی چمکتی ہے تو تم دیکھ سکتے ہو؟ کیا تمہارے اندر طاقت ہے، وہ تمہیں اندھا کر کے نہ رکھ دے۔ وہ تو اللہ نے جنت کی سواری بھیجی تھی، جن جن صحابہ نے احادیث میں اس کا ذکر کیا ہے وہ انہوں نے تشبیہ دی کہ وہ ایک ایسا جانور تھا کہ گھوڑے سے چھوٹا تھا، گدھے سے بڑا تھا اور ایسے تھا جیسے خچر ہوتا ہے۔ اور وہ ایسا تھا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا کہ اس کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جہاں نظر پڑتی تھی وہیں قدم پڑتا تھا۔ اور سب سے تیز رفتار چیز روشنی ہے، تقریباً ایک ہزار میل ایک سیکنڈ کے اندر طے کر لیتی ہے، جیسے آنکھوں کی روشنی ہے جہاں نظر پڑتی ہے وہاں پہنچ جاتی ہے۔ اللہ نے اس سواری کو ایسا ہی بنا دیا تھا کہ دیکھیں! آپ گھوڑے پر جا رہے ہوں، آگے چڑھائی آ جائے تو سوار کو گھوڑے کو پکڑنا پڑتا ہے۔ فرمایا کہ اس براق کے وہاں اگلے پاؤں چھوٹے ہو جاتے تھے اور پیچھے والے پاؤں اونچے ہو جاتے تھے، اگر ڈھلوان آتی تھی تو اسی طرح اللہ تعالیٰ اس

کے پاؤں کو اونچا نیچا کر دیتے تھے، تا کہ حضور اکرم ﷺ کے آرام میں ذرا خلل نہ آئے۔

اور اس براق کو لانے والے حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے، دیکھنے والے جبرائیل علیہ السلام تھے، یا حضور پاک ﷺ تھے یا ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر تھے یا اللہ کے فرشتے تھے۔ بندوں میں سے کوئی نہیں تھا۔ یہ بھی روایات کے اندر آ گیا کہ جب حضور اکرم ﷺ آنے لگے تو براق نے شوخی کی، جیسا کہ جانور سواری کے وقت شوخی کر رہا ہے تو جبرائیل علیہ السلام نے اس کو جھڑکا اور کہا کہ خبردار! آج تجھے پتہ ہے کہ تیرا سوار وہ ہے کہ جس کے مقابلہ پر اللہ نے دھرتی پر کوئی بندہ پیدا نہیں کیا، آج وہ سوار تجھ پر سوار ہونے والا ہے اور تُو شوخی کر رہی ہے!؟ [کنز العمال، حدیث: ۳۱۸۵۲]

اور میرے مولویوں نے یہ نکال لیا کہ "براق دیکھ کر دھمال کھیڈن لگ پئی، براق وی دھمال کھیڈ دی ودی اے"، یہ براق کی سنت پر چلتے ہیں، نبی ﷺ کی سنت پر نہیں۔ انہوں نے اپنا رقص نکال لیا کہ براق رقص کرنے لگ گیا تھا۔

حضور ﷺ پہاڑ پر چڑھے تھے، پہاڑ نے رقص شروع کر دیا تھا تو ہم کیسے رقص نہ کریں؟ خدا کے بندو! جب پہاڑ نے رقص کیا تو حضور ﷺ ناراض ہوئے کہ خوش ہوئے تھے؟ (حدیث) حضور ﷺ پہاڑ پر کھڑے تھے، پہاڑ ہلا۔ یہ بالکل صحیح حدیث ہے کہ حضور ﷺ پہاڑ پر کھڑے ہیں اور زلزلہ آیا تو حضور ﷺ نے غصہ میں آ کر پاؤں مارا اور فرمایا: اے پہاڑ! جم جاؤ، مت چلو کہ تمہارے اوپر کوئی نہیں ہے، مگر اللہ کا نبی ہے، صدیق ہے اور دو شہید ہیں۔ یعنی حضور ﷺ نے خوشخبری دے دو کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) شہید ہوں گے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٣٦٨٦، بَابُ: مَنَاقِبِ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ...]

پہاڑ نے رقص کیا تو حضور ﷺ نے پاؤں مارا۔ اگر تم رقص کرو گے تو حضور ﷺ تمہیں بھی جوتے ماریں گے۔ اگر رقص کرنے سے حضور ﷺ کو خوشی ہوتی، دھمال کھیلنے سے حضور ﷺ کو خوشی ہوتی تو سب سے پہلے صحابہ ڈالتے۔

علماء کے جلسوں میں ایسی نعتیں پڑھی جانے لگیں جو گانوں کی طرز پر بنائی جاتی ہیں...... اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ...... یعنی جو گانے کنجریاں گاتی ہیں، میراثی گاتے ہیں، ان طرزوں پر محمد مصطفیٰ ﷺ کی نعت کہی جاتی ہے۔ جس کی مدح کرنے والا خود رب العالمین ہو۔

بہرحال اس براق کو تو کسی نے نہیں دیکھا اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس براق پر بٹھایا گیا اور مجھے اس پر

بٹھایا گیا اور بیت المقدس پہنچے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اس براق کو صخرہ پتھر سے باندھا۔ اور یہ بھی حدیث مبارک میں موجود ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پتھر پر انگلی رکھی تو اس میں سوراخ ہو گیا...... وہاں ان کو کسی ڈرل مشین کی ضرورت نہیں پڑی...... اور وہیں براق کو باندھ دیا۔

اپنے پیغمبر کے ذریعہ سبق دیا کہ یہ نہ کہنا کہ ہم بڑے متوکل ہیں۔ اپنے جانور کو رسے سے باندھو اور پھر اللہ پر توکل کرو۔ ورنہ کیا براق حضرت جبرائیل علیہ السلام سے بھاگ جاتا؟ نہیں! بلکہ ایک سبق دیا گیا کہ اسبابِ دنیا پر عمل کرو، محنت کرو، تجارت کرو، کام کرو اور مانگو اللہ سے۔ یہ توکل نہیں ہوتا کہ تم اسبابِ دنیا کو چھوڑ دو۔

نعلین مبارک کی تصویر پر قرآن کی تحریر:

تمہارے پاس حضور ﷺ کے جوتے کی تصویر ہے یا نہیں ہے؟ اس نعل کی تصویر میں قرآن لکھا ہوا ہے یا کہ نہیں لکھا ہوا ہے؟ کیا حضور ﷺ نے اللہ کے قرآن کو یہی عزت دی تھی کہ آپ جوتے میں لکھواتے تھے؟ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پتہ نہیں ان لوگوں نے مرنا بھی ہے کہ نہیں مرنا؟ انہوں نے اللہ کے دربار میں جانا بھی ہے کہ نہیں جانا؟ اللہ کے دربار میں پیش ہونا بھی ہے کہ نہیں ہونا؟ یہ بخشے ہوئے ہیں، پتہ نہیں ان کو کیا بلا ہے؟ خدا کے بندے! حضور ﷺ کے نعلین مبارک کی صورت بن گئی، اس کے بعد اس میں سورۃ یٰسین لکھ دی اور سورتیں لکھ دیں اور وہ تصویر باقاعدہ بک رہی ہے اور مسلمانوں نے گھر میں لگائی ہوئی ہے کہ یہ حضور ﷺ کی نعل شریف ہے، اندر قرآن، اللہ کا کلام لکھا ہوا ہے اور وہ بھی جوتے میں!!

حضور ﷺ کا جوتا ہمارے لیے ساری دنیا کے تاجوں سے بڑھ کر ہے، لیکن کیا اللہ کے کلام کی یہ توہین نہیں کہ اس کو نبی کے جوتے میں لکھا جائے؟ ہمارے لیے زیادہ سربلند ہے، حضور کے پاؤں کی مٹی بھی مل جائے تو ہم اپنی آنکھوں کا سرمہ بنالیں۔ لیکن وہ نبی، جو نبی تب بنا جب قرآن اُترا تو محمد رسول اللہ ﷺ بنا، کیا اس نبی نے قرآن کو اپنے جوتے میں لکھوالیا تھا؟ اور مسلمان ایسی تصویریں گھروں میں لگاتے ہیں اور بڑے خوش ہو کر دیکھتے ہیں......

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ...... دعا کرو کہ اللہ انہیں ہدایت دے، اللہ ہمیں ہدایت دے۔

اگرچہ ان کا مقصد محبت ہے، لیکن وہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ مقصود ان کا محبت ہے، لیکن گاڑی پٹڑی سے اُتر گئی ہے، راستے سے اُتر گئی ہے۔ چاہتے وہ بھی یہی ہیں کہ ہم حضور ﷺ سے محبت کریں، لیکن وہ طریقہ غلط ہے۔ طریقہ وہ

کامیاب ہوگا جو ابوبکر و عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم نے سمجھایا، وہ طریقہ کامیاب ہوگا جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے سمجھایا، وہ طریقہ کامیاب ہوگا جو اللہ کے قرآن نے سمجھایا: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [آل عمران: ۳۱] اللہ کے نبی کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو اگر تم محبت چاہتے ہو، ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ [النور: ۵۴]، ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴾ [النساء: ۸۰]، ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر: ۷]

دعا کریں اللہ ہمیں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور نافرمانیوں سے ہمیں بچائے۔

پتھر کی مزید تفسیر:

ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ جنت کا پتھر تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت سے اُتارا تو اس کو آدم علیہ السلام ہی ساتھ لائے تھے اور ان کے بعد جیسے جیسے پیغمبر آتے گئے تو وہ پتھر ان کو بطور میراث منتقل ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ وہ پتھر حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچا۔ اور عصا بھی دراصل آدم علیہ السلام جنت سے لائے تھے تو جب موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس تشریف لائے اور ان کے گھر میں رہے اور دس سال تک ان کی بکریاں چراتے رہے اور ان کی بچی سے شادی ہوئی تو حضرت شعیب علیہ السلام نے وہ لکڑی بھی اور وہ پتھر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کر دیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۰]

پتھر کی تعیین میں علماء کے مختلف اقوال کیوں؟

اس کی ایک حکمت یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر مستشرقین یا اعدائے دین اور اعدائے اسلام میں سے کوئی ایک بحث میں پیدا کر دے کہ اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ ایک پتھر تھا، اس کے بارے میں یہ تو بتلایا نہیں کہ وہ پتھر کون سا تھا؟ تو اس کے لیے مفسرین ہمارے افادہ اور استفادہ کے لیے یہ بحثیں ذکر کر دیتے ہیں کہ ہم ان کو یہ جواب دے سکیں کہ ایسی بات نہیں ہے، بلکہ اس پتھر پر تو علماء بڑی بحثیں کر چکے ہیں، بڑی تفصیل موجود ہے، یہ قول بھی ہے اور یہ قول بھی ہے، ورنہ ان کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باقی جنت سے پتھر کا آنا کوئی بعید نہیں ہے۔ جیسے حجر اسود جنت کا پتھر ہے۔ تو اگر اللہ تعالیٰ جنت کے پتھروں میں سے اسے بھیج سکتے ہیں اور اسی طرح مقامِ ابراہیم کے بارے میں آیا: ﴿فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ڬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا...... الآيۃ﴾ [آل عمران: ۹۷] وہ بھی ایک

پتھر ہے اور اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو آسمانوں سے اُتارا تو جو چیزیں قیامت تک پیش آنے والی تھیں، وہ تو اللہ کے علم میں تھیں۔ لہٰذا ان کے حالات اور ضروریات کے مطابق جن چیزوں کی آگے ضرورت پڑنی تھی، وہ ساتھ اُتار دیں۔ تو یہ کوئی مشکل مسئلہ تو نہیں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے آگے تو کوئی ایسی بات نہیں ہے جس میں کوئی مشکل ہو، ﴿وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝﴾ [ابراہیم:۲۰] اللہ تعالیٰ اگر اپنے نبی کو اُٹھا کر جنت کی سیر کرا سکتے ہیں تو زمین پر جنت کی چیزیں بھی بھیج سکتے ہیں۔ بہر حال یہ سب اقوال ہیں۔ اللہ کے قرآن نے ایک جامع لفظ اختیار فرمایا ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ پتھر وراثت میں ملتا آیا۔ اور یہ بات یاد رکھیں کہ وراثتِ نبی میں وہ پتھر مل رہا ہے جو جنت سے آیا تھا، ورنہ انبیاء علیہم السلام کی میراث نہیں ہوتی۔ انبیاء علیہم السلام کی پہلے تو جائیداد نہیں ہوتی۔ اگر جائیداد ہو تو اللہ کے انبیاء علیہم السلام اس کو خیرات کر دیتے ہیں کہ ہماری تمام چیزیں اللہ کے راستہ میں صدقہ ہیں۔ جب خیرات ہو گئی تو بات ہی ختم ہو گئی۔

انبیاء علیہم السلام کی میراث نہیں ہوتی:

اور پھر اللہ نے نبی اور غیر نبی میں فرق رکھا ہے۔ اگر عام اُمتی کی بھی میراث ہو اور نبی کی بھی میراث ہو تو پہچان میں کیا فرق رہا؟

اور پھر دیکھیں کہ عام اُمتی چاہے وہ اللہ کا ولی ہے، سید ہے، قطب ہے، اَبدال ہے، غوث ہے، صحابی ہے، تابعی ہے، کتنے بڑے مرتبے پر پہنچ جائے، فوت ہو جائے اور اس کی عورت بیوہ ہو جائے تو وہ دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ وہ پوری امت کی مائیں ہیں۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات ہوتی ہیں، انبیاء کی میراث نہیں ہوتی۔

بعض لوگ انہی چیزوں کو لے کر کہتے ہیں کہ دیکھو آدم علیہ السلام کی لکڑی بھی میراث میں چلتی رہی تو بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک کیوں نہیں ملا؟ تو اس لکڑی کا فائدہ صرف موسیٰ علیہ السلام کی اولاد کو تو نہیں ہوا، بلکہ اس کا فائدہ تو پوری بنی اسرائیل کو ہوا۔ اس پتھر کے پانی کا فائدہ بھی پورے بنی اسرائیل کو ہوا۔ تو انبیاء کے علم کا فائدہ بھی امت کو پہنچتا ہے۔ ان کی جائیداد میراث نہیں ہوتی اور نہ ان کی جائیدادیں تقسیم کی جاتی ہیں کہ ان کے وارث لڑتے رہیں، انبیاء کی جائیدادوں پر جھگڑے ہوتے رہیں۔

اور پھر اگر اللہ نبی کی اولاد کو وارث بنائے جیسے ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ باپ کے پاس بڑا پیسہ ہو اور اولاد پر بڑی سختی کر رہا ہو تو جب اولاد علیحدہ ہو کر دوستوں میں بیٹھتی ہے تو کہتی ہے کہ یار! دعا کرو، میرا باپ تو سانپ بن کر بیٹھا ہوا ہے، مرنے کا نام نہیں لیتا، مرے، جان چھوٹے، تاکہ مجھے جائیداد ملے۔ اگر باپ کی صحت کے بارے میں پوچھا جائے تو کہتا ہے کہ وہ تو پہلے سے ٹھیک ہو رہا ہے، وہ نہیں مرتا، وہ ہمارے بعد ہی مرے گا، ہماری جائیداد وہ نہیں چھوڑنے والا!! اب اگر خدانخواستہ نبی کی بھی جائیداد ہو اور ان کے خاندان میں کوئی ایسی تمنا کر بیٹھے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ انبیاء کی موت کی...... نعوذ باللہ!...... تمنا کر بیٹھے تو اس کا ایمان ہی ختم ہو جائے گا۔ اس لیے اللہ اپنے نبیوں کی وراثت رکھتے ہی نہیں۔

یہ جو میراث نقل ہو رہی ہے، یہ جنت کی چیز ہے اور جنت ایک ایسی چیز ہے: ﴿يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ﴾ یہ تو ہم سب مومن وارث ہیں: ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۝ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝﴾ [المؤمنون: ۱۰،۱۱] کیونکہ وہ بابا آدم کی جگہ ہے۔ جب حلالی اولاد اپنے باپ کی جگہ میں پہنچے گی تو وہ حقیقی وارث ہوگی۔ اس لیے جنت کی نعمتوں سے ایسے حوالے نکالنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ جنت کی نعمتیں ہیں۔ دعا کریں اللہ پاک ہر مسلمان کو نصیب فرمائے۔

ننگ ظاہر کرنے کا گناہ:

(حدیث) حضور ﷺ کی حدیث ہے کہ جو آدمی اپنا ننگ کسی کو دکھلائے، دکھلانے والا بھی لعنتی ہے اور دیکھنے والا بھی لعنتی ہے، "لَعَنَ اللّٰهُ النَّاظِرَ وَالْمَنْظُوْرَ إِلَيْهِ"[1] اور لعنت ایسی چیز ہے جو شیطان پر آتی تھی۔ اللہ نے جو شیطان کو پہلی سزا دی ہے، وہ یہی تھی: ﴿وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ۝﴾ [ص:۷۸] کہ تم پر میری لعنت ہے قیامت تک۔ جو آدمی شیطان کی برادری بن جائے تو اس سے بڑی کوئی سزا ہو سکتی ہے؟ کہ شیطان کو بھی لعنت ملے اور ہمیں بھی لعنت ملے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ تو یہ اتنا بڑا جرم ہے! انسان کو چاہیے کہ جب غسل کرے تو ستر ڈھانپے۔ علماء نے لکھا ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ غسل کے وقت احتیاط کرے، حمام کا دروازہ بند کرے، کیونکہ کبھی کبھی کسی کی نظر بد بھی لگ جاتی ہے۔ کبھی آدمی خوبصورت ہوتا ہے، اچھا جسم ہے، اچھی باڈی ہے، اس بیچارے نے کپڑے اُتارے تو کسی نے کہا کہ کمال ہے تو اس کا خاتمہ ہو گیا۔

[1] [مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۳۱۲۵، باب: النظر إلى المخطوبة وبيان العورات، الفصل الثالث]

نظر بد کا اثر اور علاج:

حضور ﷺ جب حج پر تشریف لا رہے تھے تو ذوالحلیفہ جو مدینہ منورہ کا میقات ہے، وہاں ایک صحابی نے غسل کرنے کے لیے کپڑے اُتارے۔ دوسرے نے دیکھا تو اس نے کہا کہ کمال ہے، یہ تو سونے کا بنا ہوا بدن ہے۔ تو وہ بیچارا وہیں گر گیا۔ حضور ﷺ کو خبر دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تُو نے اپنے بھائی کو مار ڈالا ہے۔ جلدی کرو پانی لے آؤ۔ حضور ﷺ نے اسے حکم دیا کہ جلدی کرو وضو بھی کرو اور غسل بھی کرو (جس کی نظر لگی تھی) اس نے غسل کیا اور پانی کو ایک برتن میں اکٹھا کر کے اس کے اوپر ڈالا گیا جس کو نظر لگی تھی تو وہ فوراً ٹھیک ہو گیا۔

[سنن ابن ماجه، حديث: ٣٥٠٩، باب: العَيْنُ]

اگر کسی کو نظر لگ جائے اور اس کو پتہ ہو کہ اس کی نظر لگی ہے تو اسے فوراً کہے کہ تم وضو کرو۔ اس کو برتن میں وضو کروا کر غسل کراؤ اور وہ پانی اس آدمی پر ڈال دو جس کو نظر لگی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فوراً شفا عطا فرماتے ہیں۔ اگر تمہیں پتہ ہو کہ اس آدمی کی نظر لگتی ہے تو اس کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ جب وہ دور سے آرہا ہو تو فوراً پڑھ لیا: ''مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ'' اور اس کی طرف اشارہ کر دیں تو یہ پڑھنے سے اس کی نظر نہیں لگتی۔ کبھی کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ باپ کی نظر بیٹے کو لگ جاتی ہے، ماں کی نظر خود اپنی اولاد کو لگ جاتی ہے، کوئی کلمہ ایسا نکل گیا کہ نظر لگ گئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''اَلْعَيْنُ حَقٌّ'' نظر کا لگنا حق ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٥٧٤٠، باب: العَيْنُ حَقٌّ]

نظر کے بارے میں آتا ہے کہ نظر ایسی چیز ہے جو زندہ انسان کو قبر میں اُتار دیتی ہے اور جانور کو دیگچے میں پہنچا دیتی ہے۔[1] اس لیے بہر حال چھپ کر نہانے میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ ایسی باتوں سے محفوظ رہیں گے۔

دوسرا یہ بھی حکم ہے کہ ناف سے لیکر گھٹنوں تک مرد کو اپنا جسم چھپانا ضروری ہے۔ بعض لوگ احرام باندھتے ہیں تو ناف سے نیچے چادر باندھ لیتے ہیں، (نعوذ باللہ!) احرام کی حالت میں وہ لعنت لے رہے ہوتے ہیں۔ ناف تک کا چھپانا بھی ضروری ہے، یعنی آپ احرام باندھیں تو چادر ایسے انداز میں باندھیں کہ ناف بھی چھپ جائے۔ بہر حال اگر کبھی کھلے میدان کے اندر نہانا پڑے تو اتنا کپڑا ضرور باندھ لیا جائے کہ کسی آدمی کی نظر نہ پڑے۔ ایسا کپڑا بھی غسل کے لیے استعمال نہ کیا جائے کہ پانی پڑے تو بدن نظر آرہا ہو اور دماغ میں یہ سمجھ رہا ہو کہ میں کپڑا باندھا ہوا



[1] [كنز العمال، حديث: ١٧٦٦٠، الفصل الثاني: في العَيْنِ]

ہے تو یہ بات بڑی غلط ہوتی ہے، اس لیے احتیاط کی جائے۔

موسیٰ علیہ السلام بہت حیاء دار تھے:

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے شرمیلے تھے، بڑے باحیا تھے، بڑے چھپنے والے تھے اور جب کبھی آپ کو غسل کی ضرورت ہوتی تو دور پہاڑوں میں نکل جاتے، تاکہ اپنی قوم، برادری سے دور چلے جائیں۔ اور دریا کے کنارے غسل کر کے واپس تشریف لے آتے تھے۔ اب قوم عجیب تھی۔ اس نے کہا: یہ اس لیے چھپتا ہے، یہ اگر مرد ہوتا تو سامنے نہاتا، اگر کو بیاری کوئی نہ ہوتی تو یہ سامنے کیوں نہیں نہاتا؟ یہ اس لیے چھپتا پھرتا ہے کہ اس کو برص بیماری ہے۔ اب دشمن کا کیا ہے جب دشمنی پر آجائے تو عیب لگانے میں کوئی دیر تو نہیں لگتی۔

ایک دن موسیٰ علیہ السلام دریا کے کنارے پر نہا رہے تھے اور آپ نے اپنے کپڑے اک پتھر پر اُتار کر رکھے اور آپ غسل فرمانے لگے، پانی میں مشغول ہوئے۔ جونہی غسل سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ پتھر کپڑے لے کر بھاگا جارہا ہے۔ اب موسیٰ علیہ السلام گھبرا گئے کہ میرے کپڑے پتھر لے کر جارہا ہے اور دوسرے میرے پاس کپڑے نہیں ہیں تو موسیٰ علیہ السلام غصے میں اس پتھر کے پیچھے دوڑے ''ثَوْبِيْ يَا حَجَرُ! ثَوْبِيْ يَا حَجَرُ!'' او پتھر! میرے کپڑے رکھ، کہاں تو بھاگ رہا ہے؟ اب موسیٰ علیہ السلام بھی غصہ میں بھول گئے کہ میں کہاں بھاگ رہا ہوں تو بھاگتے بھاگتے وہ الزام لگانے والے لوگ جس جگہ بیٹھے تھے وہیں آکر وہ پتھر کھڑا ہو تو موسیٰ علیہ السلام بھی وہیں آکر رُکے۔ اب موسیٰ علیہ السلام نے آکر کپڑے اُٹھائے تو قوم نے دیکھا کہ ان کے اندر تو کوئی عیب نہیں ہے۔

اس لیے قرآن نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا ۚ وَكَانَ عِنْدَ اللَّهِ وَجِيهًا﴾ [الاحزاب:٦٩] اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ کیا کرو جس سے انبیاء کو تکلیف پہنچے، ان کی شان میں کمی آئے۔ دیکھو! موسیٰ علیہ السلام پر ان ظالموں نے کیسا الزام لگایا؟ لیکن اللہ نے ان کو پاک صاف کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے ہاں بڑے مرتبے والے تھے۔

بہرحال وہ پتھر ان الزام لگانے والوں کے درمیان آکر رک گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے اس پتھر کو بھی عصا مارا تھا کہ تم میرے کپڑے لے کر کیوں بھاگے ہو؟ اس پتھر پر بھی اس مار کا نشان پڑ گیا اور اس پتھر نے تین یا چار یا پانچ بار سسکیاں بھی لی تھیں۔ یہ خدا کی قدرت ہے، قدرت کا نظام ہے۔

[صحيح البخاري، حديث:٢٧٨، باب: مَنِ اغْتَسَلَ عُرْيَانًا وَحْدَهُ فِي الْخَلْوَةِ...]

مقامِ ابراہیم علیہ السلام والا پتھر:

مثلاً دیکھیں کہ مقامِ ابراہیم پر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تو اس پتھر پر ان کے پاؤں کے نشانات پڑ گئے۔

ایک آدمی میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ یہ جو مقامِ ابراہیم پر نشان ہے، یہ تو بڑا چھوٹا ہے، کیا ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں بالکل چھوٹے تھے؟ اب وہ آدمی پیمائش کر رہا ہے۔ خدا کے بندے! پہلے تو یہ دیکھو کہ ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعہ کو گزرے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟ تقریباً ساڑھے چار ہزار سال گزر گئے ہیں تو اس مدت کے بعد اب انہوں نے اس کے اوپر شیشہ چڑھا دیا ہماری قوم کی بدعت سے بچنے کے لیے، کیونکہ ہماری قوم بدعت کے اندر اتنی آگے گزر گئی ہے کہ پتھر ملے تو سلام، قبر ملے تو سلام، مقامِ ابراہیم کے اندر فوٹو ڈال دیتے ہیں کہ یہ میرا فوٹو ہے خیال رکھنا، میرے فوٹو کو پہچان لو، تاکہ قیامت کے دن میری سفارش کر سکو۔ یہ ہمارے عقیدوں کا حال ہے۔ اب تو خیر انہوں نے بلور چڑھا دیا۔ وگرنہ یہ پتھر تھا، باہر رکھا رہتا تھا اور اللہ کے کعبہ کے دروازے کے بالکل قریب تھا، سیلاب آیا تو یہ پیچھے چلا گیا، پھر اسی جگہ آیا اس پر بھی کئی انقلاب گزرے، بھرتے بھرتے بھر گیا۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ پورے کا پورا پاؤں اندر دھنس گیا ہو۔ مقصد تو یہ تھا کہ کچھ نشان قائم ہو جائے ایک علامت کے طور پر۔ اب یہ ضروری تو نہیں کہ عین اندر پاؤں دھنس جاتا اور انگلیوں کے نشان ہوتے اور ہمیں پتہ لگتا کہ پاؤں آپ کا آٹھ نمبر کا تھا یا نو نمبر کا تھا۔ ہماری قوم تو پاؤں کی پیمائش کر رہی ہے، ہماری قوم تو...... ماشاء اللہ!...... بڑی حضرت ہے۔

تمام انبیاء علیہم السلام کے جبے، دستار، تلواریں مبارک یہ لے گئے، مکہ مدینہ میں کوئی چیز نہیں، سب اُٹھا کر یہ اپنے ملک میں لے گئے۔ کوئی کہے گا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ مبارک ہے اور یہ دستار مبارک ہے اور ایسے ریشمی کپڑوں کی دستار ہے کہ پوری زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ریشمی کپڑا پہنا ہی نہیں تھا۔ آپ نے فرمایا: ریشم مرد کے لیے حرام ہے (اور ان کے پاس خالص ریشم کی دستار ہے) پھر باقاعدہ حدیث مبارک میں موجود ہے کہ چھ ہاتھ سے زیادہ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پگڑی مبارک نہیں ہوتی تھی اور اس دستار کو ہمارے ہاں جو رکھی ہوئی ہے کھولا جائے تو بارہ ہاتھ لمبی ہے۔ یہ حدیث محل نظر ہے، غالباً بارہ ہاتھ کا بھی ثبوت ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا جتنا مال تھا وہ یہ لے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جتنا مال تھا وہ ہماری برادری لے گئی۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہمارے کام کی چیز ہے، ہم اس کا جلوس نکالیں گے۔ ایمان سے کہیں! میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں، آپ کعبہ شریف میں ہیں، سچی بات کریں! اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوتے کے نیچے کی مٹی آپ کو مل جائے تو کیا آپ مجھے دیں گے؟ آپ کا دل گوارا کرے گا؟ آدمی اپنی جان دے دے گا، لیکن وہ مٹی نہیں دے گا۔ وہ کہے گا کہ یہ میرے محبوب کی چیز ہے، تمہیں کیسے دے دوں؟ تم میرا سارا خاندان لے لو، لیکن میں یہ نہیں دے سکتا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقیدت:

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جب موت آئی تو آپ نے وصیت فرمائی کہ یہ دو چادریں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہیں اور فرمایا کہ یہ چادریں میں نے چھپا کر رکھی ہوئی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ناخن مبارک بھی چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ مجھے غسل دینے کے بعد انہی چادروں کے اندر کفن دینا اور یہ ناخن بھی میرے ساتھ قبر میں دفن کر دینا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میرے پاس نشانیاں ہیں، میں ان کو کبھی نہیں چھوڑتا، نہ زندگی میں اور نہ موت میں۔ تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی چیز کسی کے پاس تھی تو کیا اس نے کہا کہ تم لے جاؤ؟

حضوا کرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک خط کی قدر:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک خط مبارک جو آپ نے ایک بادشاہ کو لکھا تھا اور وہ خط چلتا آیا اور چلتا آیا تو جب اس پر غربت کا عالم آیا، جس کے پاس یہ خط تھا کم از کم پچاس یا بیس ڈالر میں اس خط کو اپنی غربت کے زمانہ میں فروخت کیا۔ تو وہ ایک چھوٹا سا خط تھا اور ہمارے پاس ساری چیزیں موجود ہیں اور جہاں بھی جاؤ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بال مبارک موجود ہیں۔ اللہ کے بندے! صحابہ میں بال تقسیم ہوئے تو کیا صحابہ چھوڑ گئے؟ وہ تو ان کے محبوب کی محبوب چیز تھی، وہ اس کو اپنی زندگی میں ساتھ لے گئے اور موت کے وقت بھی ساتھ رکھتے تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے تو اپنی ٹوپی کے اندر سلوا لیے تھے کہ مجھ سے علیحدہ بھی نہ ہوں تو ان کو جب ایسی چیزیں محبوب تھیں تو کون اپنے محبوب کی چیز کسی کو دے گا؟ اور پھر وہ چیز بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔ جس چیز کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم س نسبت ہو جائے اس کی کتنی قیمت ہو جاتی ہے!!

آپ نے دیکھا نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے جس باغ میں کھجوریں لگائی تھیں، ہمارے

مسلمانوں نے ان کھجوروں کو جھپٹا مار مار کر ساری کھجوریں ہی ختم کر دیں۔

حضور اکرم ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ:

اگر ہمیں حضور ﷺ سے محبت ہے تو یاد رکھیں! حضور ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ اللہ کا قرآن ہے جو گھر گھر میں موجود ہے۔ اس سے بڑا معجزہ محمد مصطفیٰ ﷺ کو ملا ہی نہیں ہے، یہ قیامت تک قائم رہے گا اور میرے مدنی کی نبوت بھی قیامت تک قائم رہے گی۔ ساری دنیا کے معجزے ختم ہو گئے، وہ پتھر بھی نہ رہا، وہ عصا بھی نہ رہا، حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی جو پہاڑ سے نکلی تھی وہ بھی ختم ہو گئی، عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے بھی ختم ہو گئے، ہر پیغمبر کے معجزے ختم ہو گئے، لیکن میرے مدنی کی نہ نبوت ختم ہو گی اور نہ معجزہ قیامت تک ختم ہو گا۔ آپ کی نبوت و رسالت بھی قیامت تک، آپ کا دین بھی قیامت تک، آپ کی شریعت بھی قیامت تک اور اللہ نے آپ کو جو قرآن معجزہ عطا فرمایا، وہ بھی قیامت تک ہے۔ آپ بتلائیں اس کے علاوہ کوئی اور معجزہ ہے؟

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورۃ اعراف میں بھی موسیٰ علیہ السلام کا قوم کے ساتھ یہ قصہ موجود ہے، لیکن فرق اتنا ہے کہ سورۃ اعراف مکی سورتوں میں سے ہے اور سورۃ البقرۃ مدنی سورتوں میں سے ہے۔

سورۃ اعراف اور سورۃ البقرۃ میں فرقِ تخاطب:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورۃ اعراف میں صیغہ غائب کا آیا ہے اور سورۃ مدنی کے اندر خطاب ہے، کیونکہ مدینہ کے اندر یہود موجود ہے، اس لیے ان کو خطاب کیا جا رہا ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک سیاق سورۃ اعراف کا ہے اور ایک سیاق سورۃ البقرۃ کا ہے۔ اس میں دس وجہ سے فرق آتا ہے۔ ان میں سے بعض لفظی ہیں اور بعض معنوی ہیں۔ اگر کسی نے یہ دیکھنا ہو تو زمخشری نے اپنی تفسیر کے اندر وہ سوال بھی ذکر کیے اور ان کے جواب بھی وہاں دیئے ہیں...... وَاللّٰهُ تَبَارَكَ أَعْلَمُ......

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۰، ۱۰۱، البقرۃ: الآیۃ: ۶۰]

﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾﴾ [البقرۃ:٦١]

اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کریں گے، پس آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا مانگیں کہ وہ ہمارے لیے نکال دے جو کچھ زمین سے اُگتا ہے، ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز وغیرہ۔ کیا تم اس چیز کو بدلنا چاہتے ہو جو ادنیٰ ہے اس کی جگہ جو بہتر ہے؟ کسی شہر میں اُترو تو جو تم مانگتے ہو تمہیں ملے گا۔ اور ان پر ذلت اور محتاجی لازم کر دی گئی اور وہ اللہ کا غصہ لے کر لوٹے۔ یہ اس لیے ہوا کہ وہ اللہ کے احکام کو نہیں مانتے تھے اور پیغمبروں کا ناحق خون کرتے تھے۔ یہ اس لیے تھا کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے گزر جاتے تھے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اِعراض، جحود اور کفرانِ نعمت کے بارے میں ذکر فرمایا ہے۔

بنی اسرائیل کا زمینی خوراک کا مطالبہ:

اتنی نعمتوں کے بعد بنی اسرائیل نے پھر کیا کیا؟ اللہ نے فرمایا: یاد کرو کہ جب تم نے کہا تھا: اے موسیٰ! ہم ہرگز صبر نہیں کر سکتے ایک قسم کے طعام پر۔ اب ان کے الفاظ میں غور کریں جو اللہ نے نقل فرمائے ہیں۔ یعنی یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ اے موسیٰ! اللہ سے عرض کریں کہ ہمیں اور قسم کا طعام ملے۔ لیکن کہا: ہم سے ایک ہی کھانے پر صبر نہیں ہو سکتا کہ ایک قسم کا کھانا کھاتے رہیں۔ حالانکہ یہ محبوب ترین کھانا ہے، جس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

آج بھی آپ دیکھیں کہ بنی اسرائیل کے واقعہ کو ہزاروں سال بیت گئے، اب بھی دنیا ترقی اور اتنی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ پرندوں کا گوشت آدمی کے لیے زیادہ مفید ہے اور پرندوں کی غذا سب سے زیادہ محبوب غذا سمجھی جاتی ہے، ورنہ بعض گوشتوں کے اندر دسامت ہوتی ہے، بعض گوشتوں کے اندر ثقل ہے، بعض گوشتوں کو

نظامِ معدہ برداشت نہیں کرسکتا، بعض گوشت گردوں پر اثر ڈالتے ہیں اور بعض کے اندر چربی زیادہ ہوتی ہے وہ کولیسٹرول زیادہ پیدا کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل نے "لَنْ" کے ساتھ نفی کی کہ ﴿لَنْ نَّصْبِرَ﴾ جو نفی تاکید کے لیے ہوتی ہے کہ ہم ہرگز نہیں برداشت کریں گے کہ ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے رہیں۔

قدرتی چیزوں کے استعمال کا صحیح طریقہ:

خدا کی قدرت ہے کہ آج دنیا کی طب اس بات پر اتفاق کرتی ہے کہ اللہ کی جو بنائی ہوئی چیزیں ہیں وہ نقصان نہیں کرتیں بشرطیکہ ہم ان کو اسی شکل میں استعمال کریں۔ نقصان تب ہوتا ہے جب ہم اپنے مرچ مصالحے ڈالتے ہیں، جب ہم مرکب بناتے ہیں، انگاروں پر پکا کر کھاتے ہیں۔ کبھی گوشت نقصان نہیں دے گا، لیکن جب ہم نے اس میں گھی ڈالا، زعفران ڈالا، دار چینیاں ڈالیں، ہری مرچیں ڈالیں، کالی مرچیں ڈالیں، پھر پیلی مرچیں ڈالیں، پھر سبز مرچیں ڈالیں، تو وہ ایک قسم کا زہر بن گیا۔ وہ گوشت نہیں رہتا، بلکہ وہ تو ایک مرکب ہے جیسے حکیم صاحب نے کوئی نسخہ تیار کیا ہو، ہمارے لیے جوارش بنائی ہو۔

آپ دیکھ لیں کہ جتنے پھل ہیں ان کے نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھل آپ کھائیں، کبھی نقصان نہیں ہوگا۔ اور اللہ نے قدرتی طور پر ہر بندے میں تھرموسٹیٹ لگا دیا ہے کہ آپ پھل اس سے زیادہ مقدار سے نہیں کھا سکتے۔ آپ کا کتنا ہی محبوب ترین پھل ہو، آپ کھانا شروع کریں، ایک حد آجائے گی اور آپ کہیں گے کہ بس ہے۔ اللہ نے خود انتظام کر دیا ہے، بندہ ضرورت سے زیادہ کھا ہی نہیں سکتا۔ ہر آدمی کی چونکہ ضرورت مختلف ہے، لہٰذا خوراک مختلف ہے۔ ایک آدمی ایک پرتگال کھا کر سیراب ہو جاتا ہے اور دوسرا آدمی دس کلو بھی کھا سکتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے جتنی چیزیں بنائی ہیں، اگر ہم قدرت کی چیزوں کو اسی سادگی میں استعمال کریں تو بالکل نقصان نہیں ہے۔ ہم خود ان کو مرکبات میں بدلتے ہیں، کیونکہ ہمارا بھی تو ایک غذا پر گزارا نہیں ہوتا۔

حرام کی بجائے حلال بیوی پر گزارہ:

اسی لیے دیکھا ہے کہ گھر میں چاند سی خوبصورت بیوی بھی ہو تو بھی باہر گھومتا پھرے گا، کیونکہ بیچارا ایک بیوی پر کیسے گزارا کرے؟ اللہ نے گھر میں حلال کی بیوی دی ہو، شریف بھی ہو، خوبصورت بھی ہو، عزت کرنے والی بھی ہو، وفادار بھی ہو، لیکن کتے کی طرح گلیاں چاٹتا پھرے گا۔ اسی طرح یہ بیچارا ایک کھانے پر کیسے گزارا کرے؟ اس کو بھی

تو ٹیسٹ چینج کرنا ہوتا ہے۔ اور بیوی ذائقہ بدل لے تو کہتے ہیں کہ اس کو طلاق دیتے ہیں، اس کو قتل کرتے ہیں، میری بیوی نے اتنی جرأت کی کہ میرے حکم کے بغیر گھر سے باہر نکل گئی۔ تم جو سارا دن باہر پھرتے ہو اور لوگوں کی عورتوں کو تاڑتے ہو تو تمہاری بیوی کیوں نہ کرے؟ جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔ گندم سے گندم پیدا ہوگی، جو سے جو پیدا ہوگا۔ اگر تمہیں اللہ نے چلنے پھرنے کے لیے ٹانگیں دی ہیں تو اس کو بھی ٹانگیں دی ہیں، تمہارے پاس دو آنکھیں ہیں تو اس کے پاس بھی دو آنکھیں ہیں، تم اپنی بیوی سے وفادار رہو گے تو وہ بھی تمہاری وفادار رہے گی اور تم کبھی غیر پر نظر ڈالو گے تو وہ بھی غیر پر نظر ڈالے گی۔

تفسیر:

''بقل'' ساگ کو کہتے ہیں اور ''قثاء'' ککڑی کو کہتے ہیں، ''فُوم'' سے مراد لہسن ہے۔ بعض نے کہا کہ اس سے مراد ''گندم'' ہے۔ ﴿وَعَدَسِهَا﴾ دال، ﴿وَبَصَلِهَا﴾ اور وصل پیاز۔ یہ چیزیں جو زمین سے اُگتی ہیں، یہودیوں نے کہا کہ ان سے ہمیں عطا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی شان دیکھو کہ مانگا ان اسرائیلیوں نے تھا، یہ چیزیں ہمارے گلے بھی پڑ گئیں۔ اگر وہ نہ مانگتے تو شاید اللہ ہمیں بھی پھلوں سے رزق عطا فرما دیتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا:

آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو اپنی اولاد کے لیے دعا مانگی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام اپنے بچوں کو چھوڑ کر گئے تھے کہ ﴿وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ﴾ [ابراہیم: ۳۷] اب نبی کی دعا میں دیکھو کہ کتنی جان ہے اور کتنی شان ہے۔ اللہ کا پیغمبر کہتا ہے کہ میرے اللہ! میں اپنے بچوں کو ایسی جگہ چھوڑ کر جا رہا ہوں ﴿بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ﴾ ایسی وادی میں جہاں کوئی زراعت نہیں، پانی نہیں، کوئی چیز نہیں اُگتی۔ پہلے ان کے کھانے کے لیے نہیں کہا، بلکہ پہلے کہا: ﴿رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ میرا اللہ! ان کو یہاں اس لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ یہ تیرے گھر کے قریب ہیں اور جہاں اللہ کا گھر ہو وہاں نمازیں ہوتی ہیں۔ یہ تو نہیں کہ مسجد بنا دو اور نماز نہ پڑھو، مسجد پر سونا لگا دو اور مسجد میں کوئی بھی داخل نہ ہو۔ ﴿رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ اے میرے رب! تا کہ تیری نماز کو قائم رکھ سکیں۔ اور اس کے بعد مانگا کہ مولا! چونکہ یہ اکیلے ہیں ﴿فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ﴾ میرے اللہ! نمازوں کے لیے بھی تو جماعت کی ضرورت ہوتی ہے، آبادی ہوگی تو تیرے گھر میں جماعت ہوگی، ان لوگوں کے دلوں کو میرے

بچوں کی طرف پھیر دے۔ یہ نبی کی دعا ہے۔ آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی: ﴿وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ﴾ میرے اللہ! میرے بچوں کو رزق اور پھل عطا فرما۔

اب دیکھیں کہ خدا کی شان ہے! پیغمبر نے یہ نہیں فرمایا کہ ان کو ککڑی عطا فرما، بصل عطا فرما، فوم عطا فرما، کوئی گندم، جو پیدا فرما دے، بلکہ کہا: پھلوں سے رزق عطا فرما۔ اگر زمین سے پھل اُگ سکتے ہیں تو باقی بھی ساری چیزیں اُگ سکتی ہیں اور پھل اعلیٰ زمینوں میں ہوتا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی کہ اس زمین میں خصوصی برکتیں عطا فرما۔ اسی ضمن میں پیغمبر نے سب کچھ مانگ لیا کہ اللہ میاں! آپ تو جانتے ہیں کہ پھل بھوک کے لیے نہیں کھائے جاتے، پھل تو لذت کے لیے کھائے جاتے ہیں تو پہلے کھانا ملے گا تو بعد میں پھل لذت کے لیے کھائیں گے تو پھل مانگ کر گویا سب کچھ مانگ لیا۔

اب بھی آپ دیکھیں کہ دعوتیں ہوتی ہیں تو پہلے کھانے لگائیں گے، سب کچھ لگنے کے بعد کہیں گے کہ فروٹ لاؤ۔ سب سے آخر میں پھل ہوتا ہے کہ وہ لذت کے لیے کھانا ہے تو اس لیے پیغمبر نے ایک ایسی جامع دعا مانگی ہے کہ اللہ! میرے بچوں کو پھل عطا فرما، یعنی اس سے پہلے جو آپ نے دینا ہے ﴿وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ﴾ [ابراہیم: ۳۷] پھر یہ بھی بتلا دیا کہ تا کہ میرے اللہ! یہ تیرا شکر ادا کر سکیں، تیری نعمتوں کا حق ادا کر سکیں۔ اور پھر ساتھ یہ بھی درخواست کر دی: ﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَي اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ﴾ [ابراہیم: ۳۸] میرے اللہ! میری ظاہری دعا کو جیسے تُو جانتا ہے دل کے اندر جو کچھ ہے وہ بھی تیرے سامنے ہے، ہر چیز تیرے سامنے ہے، یہ نہیں کہ زبان پر کچھ ہے اور اندر کچھ ہے۔ میرا ظاہر و باطن تیرے آگے ہے۔ لیکن یہاں بنی اسرائیل کیا کہہ رہے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پسندیدہ غذائیں:

جیسا کہ حدیث مبارک میں موجود ہے کہ میرے مدنی سرکار کو ککڑی بہت پسند تھی۔ ایک کھیرا ہوتا ہے اور ایک ککڑی، ہلکے سبز رنگ کی اور تھوڑی لمبی ہوتی ہے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ بے حد پسند تھی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب غذا کھجور اور ککڑی تھی۔ بلکہ ایک صحابی آئے تو بہت کمزور تھے، بالکل نحیف تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اس کو کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: حضور! یہ کمزور ہے، یہ موٹا نہیں ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایسا کرو کہ کھجور اور ککڑی لے لو، ان دونوں کو ملا کر کھاتا رہے تو یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے کھائے تو وہ چند دنوں میں ٹھیک ہو گیا، موٹا

ہوگیا اور اس کا وزن وغیرہ سب برابر ہوگیا۔

اسی طرح حضور پاک ﷺ کو شہد اور دودھ بہت پسند تھا، یعنی کبھی شہد اور دودھ ملا لیتے اور کبھی دودھ ویسے نوش فرما لیتے، اور کبھی اگر گرمیاں زیادہ ہوتیں تو حضور ﷺ دودھ میں پانی ملا لیتے، جس کو دودھ کی لسی کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی رواج ہوتا ہے۔ ایک دہی والی لسی ہوتی ہے اور ایک دودھ والی لسی ہوتی ہے، ہمارے ہاں عام بنتی ہے۔ تو یہ حضور ﷺ کی بڑی محبوب غذاؤں میں ہیں۔ اسی طرح حضور ﷺ کو بٹیر کا گوشت بھی بہت پسند تھا۔ اسی طرح بکرے کے چوڑے کا گوشت (جس کو دستی بھی کہتے ہیں) بڑا محبوب تھا، یعنی بعض چیزیں میرے آقا ﷺ کو مرغوب تھیں، جیسے خوشبو حضور ﷺ کو بہت پسند تھی۔ اور اس زمانہ میں مشک اور گلاب، عود اور عنبر یہ چار خوشبوئیں جو میرے آقا ﷺ کے زمانہ میں استعمال ہوتی تھیں۔

حضور ﷺ کو یہ چیزیں بہت محبوب تھیں۔ تو یہ خدا کی نعمتیں ہیں، لیکن بات یہ ہے کہ ایک اعلیٰ نعمت کو چھوڑ کر ادنیٰ مانگے تو یہ ناشکری ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ یہ نعمتیں نہیں ہیں، بلکہ ان کو تو ساری دنیا استعمال کر رہی ہے، اس کو ساری دنیا کھا رہی ہے، ساری دنیا ان سے فائدہ اُٹھا رہی ہے۔

بہر حال جب انہوں نے اللہ کی اعلیٰ نعمت کو چھوڑ کر مذکورہ بالا نعمتیں ''بقل'' مانگا...... ویسے ہر عام سبزی کو بھی ''بقل'' کہتے ہیں اور ساگ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور ''بصل'' پیاز کو کہتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: ﴿أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ﴾ ایک گھٹیا چیز کو مانگ رہے ہو اس کے بدلہ میں جو بہتر ہے، یعنی اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کو مانگ رہے ہو؟ اس کے بعد فرمایا: ﴿اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ﴾ اگر ایسی بات ہے تو تم کسی شہر میں اُتر و وہاں ہر چیز تمہیں ملے گی۔

''ھبوط'' کا معنی ہوتا ہے: ''اوپر سے نیچے اُترنا'' اور ''صعود'' کا معنی ہوتا ہے: ''نیچے سے اوپر کی طرف چڑھنا''۔ یہاں معنی یہ ہے کہ اگر آدمی سفر میں ہو تو گویا وہ سواری پر ہے اور جب آدمی واپس کسی گھر میں آتا ہے تو گویا اب وہ سواری سے اُترا ہے، یعنی جو سفر میں ہے گویا وہ ہر وقت چڑھا ہوا ہے، جب سفر ختم ہو گیا، گھر آ گیا تو گویا ابھی اُترا ہے۔ اس لیے بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا: ﴿اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ﴾ مفسرین کرام نے فرمایا کہ اس لفظ میں ایک عجیب اشارہ ہے کہ جیسے سوار نیچے اُترتا ہے اسی طرح اگر آدمی اعلیٰ مرتبہ سے نیچے گر جائے تو وہ بھی اوپر سے نیچے آیا ہے۔

تفسیر:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اصل بات یہ ہے کہ ان پر جب اللہ کی نعمتیں آئیں تو وہ اور زیادہ اکڑ گئے، بجائے اس کے کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرتے، انہوں نے کفرانِ نعمت کیا اور تکبر کیا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بقل، بصل، عدس اور قثاء سب چیزیں معروف ہیں اور فوم کے معنی میں اختلاف ہے۔ مفسرین کے نزدیک کیونکہ بعض قرّاء نے اس کو "فاء" کی بجائے "ثاء" کے ساتھ "وَ ثُومِهَا" پڑھا ہے۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "ثوم" اصل میں قدیم لغت کا لفظ ہے جب وہ محاورات کے اندر کہا جاتا تھا: "فُوْمُوْا لَنَا" تو معنی یہ ہوتا تھا کہ ہمارے لیے روٹی پکاؤ، تو اس لیے علماء نے "فوم" سے گندم کا معنی لے لیا ہے۔

حضرت ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہی بات ٹھیک ہے، کیونکہ بعض حروف مبدلہ ہوتے ہیں کہ "ثاء" کے ساتھ بھی آتے ہیں اور "فاء" کے ساتھ بھی آتے ہیں، جیسے "عاثور، عافور" ثاء کے ساتھ بھی اور فاء کے ساتھ بھی آ گیا، اسی طرح "مغاثیر، مغافیر"۔ تو ان میں یہ تبادلہ ہوتا ہے کہ کبھی "ثاء" پڑھی جاتی ہے اور کبھی "فاء" پڑھی جاتی ہے، کیونکہ "ثاء" اور "فاء" کا مخرج بھی قریب ہے۔ لہٰذا یہ لغت عرب میں بہت پایا جاتا ہے، کئی مقامات پر یہ حروف قربِ مخرج کی بناء پر ایک دوسرے کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ "فوم" سے مراد گندم ہے جس کو آج کل آپ "حِنطَة" یا "گیہوں" کہتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۱، البقرۃ: الآیۃ: ۶۱]

"فوم" کی تفسیر ابن عباس:

ایک روایت کے اندر یہ بھی آیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا: اس سے مراد گندم ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کیا تُو نے اُحیصہ بن الجلاح کا قول نہیں سنا؟

قَدْ كُنْتُ أَغْنَى النَّاسِ شَخْصًا وَاحِدًا
وَ رَدَّ الْمَدِيْنَةَ عَنْ زِرَاعَةِ فُوْمِ

"میں بہت بڑا صاحبِ یسر ہوں اس وجہ سے کہ میں گندم کی زراعت کرتا تھا۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ "فُوم" بنی ہاشم کی لغت میں "گندم" کو کہتے ہیں۔

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ نے بھی فرمایا کہ "فُوم" سے مراد گندم ہے۔ ابن درید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فوم گندم کے بے کو کہتے ہیں۔

حضرت علامہ قرطبی رحمہ اللہ، حضرت عطاء رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ "فُوم" سے مراد ہر وہ دانہ ہے جس سے روٹی پکائی جائے (چاہے گندم ہو، چاہے جو ہو، چاہے باجرہ ہو، جن چیزوں سے بھی روٹی پکتی ہے اس پر "فُوم" کا اطلاق ہوتا ہے)۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ "فُوم" چنے کو کہتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی ایک قول نقل کیا ہے کہ ہر وہ دانے دار چیز جو کھائی جاتی ہے، اس پر "فُوم" کا اطلاق ہوتا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۱، البقرۃ: الآیۃ: ۶۱]

﴿قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ﴾ اس کے اندر ان کے لیے تقریع ہے، توبیخ ہے، جھڑک ہے، زجر ہے کہ یہ کیا کر رہے ہو کہ تم ایک اعلیٰ طعام کو چھوڑ کر ادنیٰ چیزیں اس کے بدلے میں مانگ رہے ہو؟

﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا﴾ حضرت ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کو اسی طرح پڑھا جائے گا، کیونکہ تمام مصاحف میں اسی طرح ہے۔ ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا﴾ بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ اُترو کسی شہر میں۔ مصر شہر کو کہتے ہیں اور شہر کی کوئی تعیین نہیں تھی، جس شہر میں تم چلے جاؤ، یہ سبزیاں وغیرہ تم کو وہاں بھی مل جائیں گی۔

﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا﴾ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں بغیر اجراء کے ہے۔

حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ اور حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ اس مصر سے مراد وہ مصر ہے جس میں فرعون کی بادشاہی تھی۔ چاہے اس کو "مِصْرًا" پڑھیں یا "مِصْر" پڑھیں، دونوں سے مراد فرعون کا مصر ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے جو نعمتیں مانگیں، اللہ نے عطا فرما دیں۔ جب بادل مانگا تو بادل عطا فرما دیا، کھانا مانگا تو من وسلویٰ عطا فرما دیا، پانی مانگا تو بارہ چشمے عطا فرما دیئے، لیکن جب یہ سوال کیا تو اس کے بدلے میں کوئی جواب بھی نہیں آیا، اس لیے کہ یہ سوال، سوال نہیں تھا، بلکہ تکبر تھا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۱، البقرۃ: الآیۃ: ۶۱]

﴿وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۚ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ۗ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾﴾ [البقرۃ: ۶۱]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ﴾ یہ ایسے ہے جیسے کسی کے اوپر خیمہ لگا دیا جائے تو جو کچھ خیمہ کے اندر ہوتا ہے اس کے چاروں طرف آ جاتا ہے۔ اس لیے شرعی طور پر بھی اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے اندر بھی ذلت ان پر لازم کر دی گئی، یعنی وہ جہاں بھی رہیں گے، کسی حال میں بھی ہوں گے، ذلت اور دناءت ان سے علیحدہ نہیں ہوگی۔ اگر چند دنوں کے لیے کسی طرح ان کو قوت حاصل بھی ہو تو وہ ان کی اپنی نہیں ہوتی، بلکہ دراصل کسی کے سائے کے نیچے ہوتی ہے، جب وہ سایہ ہٹے تو اس کے بعد پھر ان پر ذلت آ گئی۔

اس لیے آپ بخت نصر کی تاریخ پڑھ کر دیکھیں، اسی طرح ہٹلر نے یہودیوں کے ساتھ کیا کیا، وہ تاریخ پڑھ کر دیکھیں اور اسی طرح فرعون کے زمانہ میں ان پر کتنی ذلت آئی، پھر موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں کتنی ذلت آئی کہ ستر ہزار بنی اسرائیل طاعون کی بیماری میں ایک دن میں مر گئے۔ اور اس کے بعد ان پر کتنی بڑی ذلت آئی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری توبہ قبول کروں گا جب ایک دوسرے کو قتل کرو گے۔ تو ایک دن کے اندر ستر ہزار بنی اسرائیل قتل ہوئے۔ اس لیے یہودی کتنا ہی سرمایہ دار کیوں نہ ہو جائے اس کی شکل اور عمل سے ہر وقت معلوم ہوگا کہ بھوکا ہے۔

جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی سائل بن جائے، یعنی مانگتا ہو، منہ سے سوال کرتا ہو تو اس کی پیشانی پر فقر لکھ دیا جاتا ہے۔ چاہے وہ کروڑوں پتی بن جائے لیکن ہمیشہ وہ مانگتا رہے گا اور معلوم ہوگا کہ یہ ہر وقت بھوکا ہے۔ یہ ذلت ہو سکتی ہے۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "ذلت" سے مراد "جزیہ" ہے کہ دیکھیں کہ جب وہ مدینہ میں رہے تو ان کو جزیہ دینا پڑا، بلادِ عرب میں رہے تو جزیہ دینا پڑا، اب بھی جہاں رہتے ہیں دوسروں کو جزیہ دے کر ہی رہنا پڑتا ہے۔

عبدالرزاق نے معمر سے اور انہوں نے حضرت حسن رحمہ اللہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے نقل فرمایا ہے کہ ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ اس حال میں رہیں گے کہ وہ مسلمانوں کو جزیہ عطا کریں گے، اپنے ہاتھ سے ذلیل اور عاجز ہو کر دیں گے۔

حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان کو ذلیل کیا۔ ان کا کوئی شرف نہیں، کوئی مقام اور عزت نہیں اور اللہ نے ان کو ہمیشہ مسلمانوں کے قدموں کے نیچے کر دیا، ذلیل کر دیا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہم بھی تو مسلمان بنیں۔ جب ہم مسلمان نہ بنیں اور ہمارے اعمال سے کافر اور یہودی بھی شرمائیں تو یہودی کیسے ذلیل ہوں؟

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۲، البقرۃ: الآیۃ: ۶۱]

بنی اسرائیل کی ذلت کیوں آئی؟

یہ یاد رکھیں کہ ان پر ذلت کیوں آئی تھی؟ کہ انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تھی، انبیاء کو قتل کیا تھا، اللہ کے احکامات وآیات کے منکر ہو گئے تھے۔ اور جو توہین و ناشکری کریں گے ان کی تکلیفیں ہمیشہ کے لیے بڑھتی چلی جائیں گی۔ باقی ایمان اور کفر کا معاملہ رہا تو اس کی سزائیں آخرت میں ہوں گی کہ جو مومن ہے اللہ کی رحمت سے کسی نہ کسی طرح جنت میں آجائے گا اور جو کافر ہے وہ ہمیشہ جہنم میں جلے گا۔

﴿وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جیسے کوئی چیز خرید لیں تو اس کی ملکیت لازمی طور پر ثابت ہو گئی تو ان پر بھی اللہ کا غضب لازم ہو گیا، یعنی لوٹ آئے اللہ کے غضب کے ساتھ۔ ''بَاءَ يَبُوْءُ'' کا معنی ہوتا ہے: ''اِنْصَرَفُوْا''۔ جیسے قرآن میں دوسری جگہ بھی ہے: ﴿اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ﴾ [المائدۃ:۲۹] حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے نے اپنے بھائی سے کہا تھا کہ اگر تم مجھے قتل کرو تو بھی میں تمہیں قتل نہیں کرتا، میں چاہتا ہوں کہ میرا گناہ بھی اور اپنا گناہ بھی تم خود لے لو، میں گناہ نہیں لینا چاہتا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خلاصہ یہ نکلا کہ وہ اس حال میں لوٹے کہ ان پر اللہ کا غضب ہو گیا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ [البقرۃ:۶۱] اللہ نے فرمایا کہ ہم نے یہودیوں کو یہ سزا کیوں دی؟ ہم نے ان پر یہ دناءت اور مسکنت کیوں نازل فرمائی؟ اس لیے کہ انہوں نے ہماری آیات سے کفر کیا، انہوں نے تکبر کیا اور جو دین والے تھے ان کی توہین کی اور ہم نے ان پر ذلت اس لیے نازل کی کہ انہوں نے میرے نبیوں کی اور ان کی اتباع کرنے والے، صحابہ، تابعین، علماء کی اہانت کی، ان کو قتل کیا تو کفر وانکار کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر اللہ کا غضب ٹوٹ پڑا۔

بعض فرقوں میں مسلمانوں کے درمیان منافرت کی تعلیم:

آپ دیکھیں کہ آج صحابہ رضی اللہ عنہم سے مقدس کوئی جماعت نہیں، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالیاں دی جاتی ہیں اور ایک دو تین یا چار نہیں، بلکہ ہزاروں کتابیں لکھ کر، کتابوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام پر تبرا کیا جاتا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم کو......نعوذ باللہ!......منافق اور مرتد کہا جاتا ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لاکھوں صحابہ میں سے صرف تین کے بارے میں لکھا جاتا ہے کہ وہ مسلمان تھے، باقی......نعوذ باللہ!......سب مرتد ہو گئے۔ اور یہ کرنے والے وہ لوگ ہیں جو

کہتے ہیں کہ ہم بڑے مومن ہیں۔ جب سب صحابہ رضی اللہ عنہم کو نہ بخشا جائے، حضور ﷺ کی نبوت کے اوپر ڈاکہ ڈالا جائے اور حدیث کا کھلا انکار کر دیا جائے کہ حضور ﷺ کی حدیث کے محفوظ ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اڑھائی سو سال کے بعد تک لوگوں کو حضور ﷺ کی باتیں کہاں یاد تھیں؟ یہ تو حدیثیں لوگوں نے خود بنائی ہیں۔

اسی طرح دیکھیں کہ جو جماعتیں دین کا کام کر رہی ہیں، اپنے بستر ے خود اُٹھاتی ہیں اور تبلیغ کر رہی ہیں، ان کو گالیاں دی جاتی ہیں، کسی مسجد میں جائیں تو لوگ کہتے ہیں کہ مسجد کو دھو ڈالو، کافر آ گئے۔ حضور اکرم ﷺ نے کافروں کے آنے پر بھی کبھی مسجد نہیں دھلوائی، یہ مسلمانوں کے لیے دھلواتے ہیں۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں عیسائی آئے تو حضور ﷺ نے فرمایا: ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرا دو۔ یہ کسی حدیث میں نہیں ہے کہ جب وہ چلے گئے تو حضور ﷺ نے فرمایا ہو کہ مسجد کو دھو ڈالو۔ کئی کافر قید ہو کر آتے تھے تو حضور ﷺ فرماتے تھے کہ مسجد کے ستون کے ساتھ کافر کو باندھ دو، وہ بندھا رہتا تھا، جب چھوڑ دیا تو کبھی نہیں فرمایا کہ ڈول لے آؤ، یہاں کافر کھڑا تھا۔ لیکن تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ یہ حشر ہوتا ہے کہ دین کے نام لینے والے چلے جائیں گے، آپ سے کچھ نہیں لیتے، لیکن وہ کہتے ہیں: باہر پڑے رہو، سردی میں پڑے رہو، تم مسجد میں نہیں رہ سکتے، تم مسلمان نہیں ہو۔ اگر مسلمان نہیں ہیں تو کیا وہ گرنتھ لے کر پھر رہے ہیں؟ وید کی تبلیغ کرتے ہیں؟ ان کے پاس تورات ہوتی ہے، انجیل ہوتی ہے یا کوئی اور کتاب ہوتی ہے جس کا وہ نام لیتے ہیں؟ تمہارا دماغ نہیں ملتا نہ ملے، کافر تو نہ کہو۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ''اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَ غَمْطُ النَّاسِ''[1] تکبر یہی ہوتا ہے کہ حق کا انکار کرے اور لوگوں کی عزت کو چھپائے۔ اللہ کے حق کو پورا نہ کرے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرگوشی کرنے سے میں کنارہ کش نہیں ہوتا تھا، نہ اس چیز سے نہ اس چیز سے۔ ایک دن میں آپ ﷺ کی خدمت میں آیا تو آپ ﷺ کی خدمت میں مالک بن مرارہ الرھاوی بیٹھے تھے تو ان کی میں نے آخری بات سنی جو حضور پاک ﷺ سے کہہ رہے تھے کہ یا رسول اللہ! آپ جانتے ہیں کہ اللہ پاک نے مجھے بڑا جمال دیا ہے، خوبصورتی دی ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ میں کسی سے کم نہ رہوں، بلکہ میں ہر چیز سے اعلیٰ ہوں اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ لوگوں کے جوتے کے دو تسموں کے اندر بھی میں نہ گروں، میں تو جوتے میں

---

[1] [صحیح مسلم، حدیث: ۱۴۷]



بھی فخر کرنا چاہتا ہوں، لباس میں فخر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ فخر نہیں ہوتا، فخر یہ ہوتا ہے کہ حق کو چھپا دے اور لوگوں کی توہین کرے۔ اگر تم اچھا کپڑا، اچھا جوتا نہ پہنو تو تم بھی اللہ کی ناشکری کر رہے ہو۔
[مسند احمد بن حنبل:۴۰۵۸]

حضور ﷺ نے تو فرمایا کہ منہ کے اندر بصل کی بدبو ہو تو مسجد میں نہ آؤ۔[1] اور جس کے پورے بدن سے بدبو آ رہی ہو تو اس کے لیے بطریق اولیٰ مسجد میں آنے کی ممانعت ہوگی۔ لیکن کون ہے جو ان باتوں کو سنتا ہے؟

تفسیر:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ حال ہو گیا تھا کہ تین تین سو نبیوں کو ایک دن میں قتل کر دیتے تھے اور پھر شام کو اپنی دکانیں بھی کھولتے تھے اور بازار میں بھی بیٹھتے تھے جیسا کہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ قَتَلَهُ نَبِيٌّ أَوْ قَتَلَ نَبِيًّا وَ إِمَامُ ضَلَالَةٍ وَ مُمَثِّلٌ مِنَ الْمُمَثِّلِينَ'' [کنز العمال:۹۳۶۶] سب سے زیادہ عذاب اس شخص کو ہوگا جس کو نبی نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہو (کیونکہ وہ بڑا کافر ہوگا جس کو نبی اپنے ہاتھ سے قتل کرے، ورنہ ہر نبی اپنی اُمت پر مہربان ہوتا ہے) یا اس کو زیادہ سخت عذاب ہوگا جس نے اللہ کے کسی نبی کو قتل کیا ہو۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ ان آدمیوں کو سخت عذاب ہوگا جو بدعت، ضلالت اور گمراہی کے امام بن جاتے ہیں، ایسی بدعتیں نکالتے ہیں کہ ساری دنیا بدعتوں میں پڑی ہوئی ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو تصویریں بناتے ہیں۔

﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ﴾ ان کو یہ سزا اس لیے ملی کہ وہ عصیان کرنے والے تھے۔ ''عصیان'' کہتے ہیں کہ اللہ نے جن کاموں سے روکا ہے، ان کو کرنا۔ ''يَعْتَدُوْنَ'' کا معنی ہے: حد سے تجاوز کرنا، یعنی خدا کی نافرمانیوں والے کام بھی کرنا اور حد سے بھی نکل جانا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت کا عذاب رکھا ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۶۲]

[1] [صحیح البخاری، حدیث:۸۵۵]

> بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور عیسائی اور صابئین جو بھی (ان میں سے) اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لایا اور نیک کام کیے تو ان کے لیے ان کا اجر و ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک قاعدہ، کلیہ، ایک اصول ذکر فرمایا ہے جو قیامت تک کے لیے تمام اللہ کی مخلوق کے لیے ہے۔ اگر وہ اس پر عمل کریں تو ان کے لیے باعثِ ہدایت اور باعثِ نجات وشفا ہے۔

مسلمانوں کے پاس دنیا میں عظیم نعمتیں:

اس لیے کسی مفسر نے ایک بڑی عجیب بات لکھی تھی! انہوں نے کہا کہ اللہ نے سورۃ الرحمٰن میں جو نعمتوں کا ذکر کیا ہے، اگر مسلمان ایک ایک نعمت پر غور کرے تو اللہ نے وہ سب نعمتیں عالم اسلام کو دی ہیں۔ آج بھی اگر آپ عالم اسلام پر نظر ڈالیں، مسلمانوں کے عدد پر نظر ڈالیں، الحمدللہ! عدد کے لحاظ سے بھی مسلمان ایک بہت بڑی قوت ہیں اور اسی طرح اگر اقتصادیات پر نظر ڈالیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمان ملکوں کو دولت سے مالا مال کیا ہوا ہے، کہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے خزائن میں سے کسی ملک کو سونا عطا فرما دیا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی ملک میں اپنے خزانہ غیب سے تیل کے انتظامات فرما دیئے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی ملک کو سمندر عطا فرما دیا۔

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ کے چار فرقے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ایمان والوں کا ذکر آیا، ﴿وَالَّذِیْنَ هَادُوْا﴾ یہودیوں کا ذکر آیا، ﴿وَالنَّصٰرٰی﴾ نصرانیوں کا ذکر آیا، ﴿وَالصّٰبِئِیْنَ﴾ صابیوں کا ذکر آیا ہے۔ ان چار کا ذکر قرآن پاک نے کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حضور ﷺ تشریف لائے تو اس وقت دنیا میں یہ چاروں فرقے موجود تھے۔

﴿وَالصّٰبِئِیْنَ﴾ کا مصداق:

﴿وَالصّٰبِئِیْنَ﴾ سے کون لوگ مراد ہیں؟ تو اس بارے میں علماء کرام نے متعدد اقوال ذکر کیے ہیں۔ ایک قول یہ ذکر کیا ہے کہ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو سورج اور ستاروں کی پوجا کرتے تھے اور جو لوگ نمازیں بھی پڑھتے تھے، لیکن سورج نکلنے کے وقت سورج کی طرف رخ کر کے وہ یہ سمجھتے تھے کہ بڑا عالم اور مدبر افلاک اور مدبر سماوات والارض سورج ہے، سب کچھ نفع نقصان اسی کے اندر ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہودیت اور مجوسیت کا نام ''صابی'' ہے۔ اور بعض لوگوں نے کہا کہ یہ وہ لوگ تھے جو نصرانیت سے نکل گئے اور ایک نیا دین اختیار کیا۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو یہودیت سے نکل گئے اور ایک نیا دین اختیار کیا۔ اب وہ نیا دین کیا تھا؟ بعض لوگوں نے تو سورج کی پوجا شروع کر دی، بعض لوگوں نے ستاروں کی پوجا شروع کر دی۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱۰۳/۱، ۱۰۴، البقرۃ: الآیۃ: ۶۲]

''صابی'' کا ایک اور معنی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی مسلمان ہونے والے کو ''صابی'' کہتے تھے، یعنی جو نئے دین پر چلے وہ ''صابی'' ہے، چاہے وہ حق کا راستہ ہو یا باطل کا راستہ ہو۔ ﴿وَالصّٰبِئِيْنَ﴾ کے لفظ کا معنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عوام کے نزدیک یہی تھا، اس لیے بعض نئے مسلمان ہونے والوں نے اپنے آپ کو ''صابی'' کہہ ڈالا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ قرآن ایک جامع کتاب ہے، ایک لفظ بول کر قیامت تک جتنی چیزیں پیدا ہوں گی اس میں سب کا ذکر آ گیا۔ یہودیت و نصرانیت کا ذکر کیا اور آگے ایک لفظ کہہ دیا صابئین کہ جو لوگ بھی نئے نئے فرقے بنانے والے ہیں، وہ سب مراد ہیں۔

یورپ میں آج ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو شیطان کی پوجا کرتے ہیں، ان کی پارٹی کا نام بھی ''شیطان پارٹی'' ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سارا نظام شیطان چلا رہا ہے، انہوں نے باقاعدہ شیطان کا مجسمہ بنا رکھا ہے اور باقاعدہ شیطان کی عبادت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شیطان راضی ہو جائے تو سارے کام منٹوں میں ہو جاتے ہیں۔ وہ باقاعدہ شیطان کی عبادت کرتے ہیں۔ آج بھی ہند و پاک میں ایسے مندر پائے جاتے ہیں کہ جہاں مرد و عورت کے خاص اعضاء کی پوجا کی جاتی ہے، ان کی تصویریں لگائی ہوئی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان پیدا تو ان دو چیزوں سے ہی ہوتا ہے، اگر یہ دو چیزیں نہ ہوتیں تو آدمی کہاں سے پیدا ہوتا؟ تو انہوں نے ان چیزوں کو خدا بنایا ہوا ہے۔

ایمان کی اصل تفسیر:

مذکورہ آیت مبارک میں ﴿آمَنُوْا﴾ دو دفعہ آیا ہے تو بعض حضرات نے اس کے دو ترجمے کیے ہیں: ایک ترجمہ تو یہ ہے کہ جو لوگ اپنے اپنے نبیوں پر ایمان لے آئے اور سابقہ زمانے کے انبیاء پر بھی، اور اس کے بعد آنے والے



انبیاء پر بھی یا جنہوں نے یہودیت اختیار کی اور موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے، یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے یا ان پر تو ایمان نہیں لے آئے مجوسی تھے یا ستارہ پرست تھے، میرے نبی! ان کو بتلا دو کہ اگر نجات چاہتے ہو تو نجات اس وقت ملے گی جب صحیح معنوں میں اللہ پر ایمان لاؤ اور آخرت پر ایمان لاؤ، پھر نجات ملے گی۔ وگرنہ اگر پہلے ایمان پر رہو تو یہ فائدہ نہیں پہنچائے گا، کیونکہ وہ تو حضور مصطفیٰ ﷺ پر ایمان ہی نہیں لے آیا۔

اور بعض علماء نے یوں ترجمہ کیا ہے کہ میرے مدنی! جن لوگوں نے ظاہری ایمان کے دعوے کیے کہ ہم مسلمان ہیں، ہم ایمان والے ہیں لیکن ان کے اندر ایمان نہیں ہے صرف زبانی کلامی دعویٰ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم یہودیت کے طریقے پر ہیں، لیکن انہوں نے تورات کو بدل ڈالا تو یہودیت پر بھی قائم نہ رہے اور جو نصرانیت کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنالیا اور تثلیث کا عقیدہ اختیار کرلیا اور وہ لوگ جنہوں نے آتش پرستی کی یا ستارہ پرستی کی، نیا دین پیدا کیا، یہ جب تک سچے اور پکے معنی میں، اندر، باہر سے ایمان نہیں لے آئیں گے اس وقت تک نجات نہیں مل سکتی۔

تو اب نجات ملنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لائے۔ دو چیزوں کا ذکر کیا گیا اور باقی ساری چیزوں کا ذکر نہیں کیا گیا، حالانکہ ایک آدمی اللہ کو بھی مانے اور آخرت کو بھی مانے اور حضور ﷺ کو نہ مانے تو مسلمان نہیں ہوسکتا، اگر حضور ﷺ کی ختم نبوت کو نہ مانے تو مسلمان نہیں ہوسکتا، اللہ کے قرآن کو اللہ کی کتاب نہ مانے تو مسلمان نہیں ہوسکتا اور قرآن کو ناقص یا زائد مانے تو مسلمان نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ اول اور آخر ذکر کردو تو درمیان والی چیز خود بخود آگئی۔

جیسے فرمایا: ﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾ [الرحمٰن:١٧] اور کہیں فرمایا: ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ﴾ [المعارج:٤٠] اس کا یہ معنی تو نہیں ہوتا کہ صرف مشرق، مغرب اللہ کے لیے ہے اور درمیان شمال وجنوب کسی اور کا ہے، بلکہ وہ بھی اللہ کے لیے ہے اور شمال جنوب بھی اللہ کے لیے ہے۔ تو یہاں بھی ایسے ہے، کیونکہ حکم ہے کہ آخرت پر ایمان لائیں تو کیا ہم آخرت دیکھ رہے ہیں؟ آخرت کے بارے میں ہمیں خبر کس نے دی ہے؟ اللہ کے نبی نے خبر دی ہے تو نبی پر ایمان ہوگا تو آخرت پر بھی ایمان ہوگا۔ اللہ کے نبی کو خبر ملائکہ نے دی جو وحی لے آئے، لہٰذا ملائکہ پر ایمان ہوگا تو وحی پر بھی ایمان ہوگا۔

ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ضروری ہے:

اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کیا: یارسول اللہ! باہر کے لوگ جب آتے ہیں اور آپ کے کپڑے مبارک بوسیدہ ہوتے ہیں، قمیص میں پیوند لگے ہوتے ہیں، چادر مبارک میں بھی ٹانکے لگے ہوتے ہیں اور نیچے بچھانے کے لیے بھی ٹاٹ ہے، ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے لیے کوئی اعلیٰ لباس بنوا دیا جائے، کم از کم ایک دو جوڑے رکھ لیے جائیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا کہہ رہے ہو؟ اللہ کا فرشتہ جس نے صور کو پھونکنا ہے اس نے صور اپنے منہ میں لیا ہوا ہے اور نظر اُٹھا کر او پر انتظار میں ہے کہ کب حکم ہوتا ہے اور صور پھونک دوں۔ تو قیامت جب آنے والی ہے تو ہم لباس میں وقت کیوں ضائع کریں؟ ہم کپڑوں میں وقت کیوں ضائع کریں؟ آخرت کے لیے تیاری کیوں نہ کریں؟

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [البقرة:٦٢]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صرف ایمان لفظی، زبانی کلامی کافی نہیں ہے، بلکہ عمل صالح بھی ہو۔ قرآن میں جہاں ایمان کا ذکر آئے گا وہاں عمل صالح کا ذکر آئے گا۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا﴾ [الکہف:١٠٧] اور ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا﴾ [مریم:٩٦] اور یہاں فرمایا: ﴿مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾

دنیا حقیر ہے:

اسی لیے ایک حدیث مبارک میں آیا کہ اللہ کے ہاں اگر اس دنیا کی کوئی قیمت اور قدر و منزلت ہوتی تو اللہ کبھی اپنے دشمنوں کو نہ دیتا۔[1] کیونکہ یہ تو اتنی گندی چیز ہے سارا مدار آخرت پر ہے اور یہ ہماری غلطی ہے کہ ہم دنیا کی کامیابیوں کو دیکھتے ہیں اور ہم آخرت پر نظر نہیں ڈالتے۔

بعض اللہ کے پیارے بندے ہوتے ہیں اور وہ دنیا میں اتنے غریب اور فقر و فاقہ والے ہوتے ہیں کہ کہیں رشتہ مانگیں تو ان کو کوئی رشتہ بھی نہ دے، کسی کو جا کر سفارش کریں کوئی ان کی سفارش بھی نہ مانے، کسی کو کوئی بات کہیں

[1] [سنن الترمذی، حدیث:٢٣٢٠، بابُ ما جاءَ في هوانِ الدُّنيا على اللهِ عزَّ وجلَّ]



تو وہ بھی ان کی بات نہ مانے، اور لباس ان کے غریبانہ ہوتے ہیں اور ان کے بال بکھرے ہوئے ہوتے ہیں نہ وقت پر کنگھی ہے اور نہ وقت پر تیل ہے اور نہ وقت پر چیزیں میسر ہیں، لیکن فرمایا کہ اللہ کے ہاں روئے زمین پر یہ بہتریں بندے ہوتے ہیں۔[1] اور فرمایا: ان کا اللہ کے ہاں اتنا بڑا مقام ہوتا ہے اگر اللہ پر کوئی قسم کھالیں، کہ اللہ کی قسم! اللہ یہ کام کردیں گے تو اللہ ان کے ناز پورا کردیتا ہے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۶۲۲، باب: فَضْلِ الضُّعَفَاءِ وَالْخَامِلِينَ]

نیک مومن میت کی پکار:

اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ جب مومن کی میت ہوتی ہے تو وہ کہتی ہے: ''عَجِّلُونِي، عَجِّلُونِي'' مجھے جلدی لے چلو، مجھے جلدی لے چلو، کیوں دیر کررہے ہو مجھے نہلانے میں؟ کیوں دیر کررہے ہو مجھے قبر میں پہنچانے میں؟ مجھے جلدی میرے گھر میں پہنچادو۔

اسی لیے روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ جو اللہ کے پیارے کا جنازہ ہے تو دیکھو گے کہ وہ ایسے جاتا ہے کہ دوڑ کر بھی جاؤ تو جنازہ نہیں ملتا۔ آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ یہاں جنازہ اُٹھتا ہے، مختلف لوگ اُٹھانے والے ہوتے ہیں، سب اپنے بیٹے اور بھائی تو نہیں ہوتے، ہر آدمی کو موقع ملا تو اس نے کندھا دے دیا تو بعض جنازے ایسے تیزی سے نکلتے ہیں کہ بندہ ان کو نہیں پہنچ سکتا۔ پیچھے بھاگ کر ان کو پکڑنا پڑتا ہے اور بعض ایسے ثقیل ہوجاتے ہیں کہ اُٹھاؤ تو اُٹھتا نہیں، ایسے معلوم ہوتا ہے کہ سفر بھی نہیں کٹتا۔

تو احادیث مبارک میں آتا ہے کہ جب مومن کا جنازہ ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ مجھے جلدی گھر لے جاؤ، اور کافر کا جنازہ ہو تو وہ کہتا ہے کہ مجھے کہاں لے کر جارہے ہو؟ میں کہاں جارہا ہوں؟ کیونکہ اس کو پتہ ہے کہ آگے جو کچھ میرے سامنے آنے والا ہے۔ تو فرمایا کہ ہم ان کے لیے پھر فرشتے بھیجتے ہیں وہ آکر ان کو مبارک دیتے ہیں جو ایمان والے ہوتے ہیں۔

[صحيح البخاري، حديث: ١٣١٦، باب: قَوْلِ الْمَيِّتِ وَهُوَ عَلَى الْجِنَازَةِ: قَدِّمُونِي]

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا واقعہ:

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! اسلام لانے سے پہلے میں کچھ لوگوں کے ساتھ رہتا تھا، بڑے عبادت گزار تھے، بڑے اللہ کی یاد میں اور نمازوں میں

---

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۶۴۴۷، باب: فَضْلِ الْفَقْرِ]

وقت گزارنے والے تھے۔

وجہ یہ تھی کہ حضرت سلمان فارسی کے اسلام لانے سے پہلے ان کے دل میں جب جذبہ آیا تو نصاریٰ کا ایک بہت بڑا راہب تھا اس کی خدمت میں چلے گئے تھے اور اس کی خدمت میں رہتے تھے۔ وہ جب مرنے لگا تو اس نے وصیت کی کہ میرا آخری وقت آ گیا تو تم فلاں ایک راہب موجود ہے، تم اس کے پاس چلے جاؤ۔ پھر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اس کے پاس بھی کافی عرصہ زندگی گزاری اور جب اس کے بھی مرنے کا وقت آیا تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ میں کہاں جاؤں؟ تم مر رہے ہو تو کسی عالم کی جگہ تو بتلاؤ کہ میں وہاں جا کر اپنی زندگی گزاروں؟ تو اس نے کہا کہ اے سلمان! اب روئے زمین پر کوئی صحیح معنوں میں اللہ کی عبادت والا بندہ نہیں رہا، اب کوئی صحیح معنوں میں دین عیسیٰ (علیہ السلام) پر قائم نہیں رہ گیا۔ لوگوں نے عقائد بدل ڈالے ہیں، لہٰذا میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اگر تمہیں موقع ملے تو اب ہر بات کو چھوڑ دو۔ ایک جگہ ہے جو ''یثرب'' کہلاتی ہے، حجاز کی سرزمین کے اندر ہے، وہاں چلے جاؤ۔ وہاں ایک نبی آئے گا جس کا نام محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا، وہاں جا کر اس پیغمبر پر ایمان لاؤ اور اس کی اتباع کرو، اگر کامیابی چاہتے ہو۔

[المعجم الكبير للطبراني، حديث:٦٠٦٥]

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اس وجہ سے مدینہ منورہ آئے تھے تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ان لوگوں کے ساتھ میں رہا ہوں، وہ اسلام کا نام نہیں لیتے تھے، لیکن نمازیں پڑھتے تھے، عبادت کرتے تھے، اللہ کو مانتے تھے۔

تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ میرے مدنی! آپ ان کو سمجھا دیں کہ جو یہودی ہے یا نصرانی ہے یا کوئی ہے، جو بھی اللہ پر عقیدے میں پکا ہے، اپنے وقت کے نبی کا غلام ہے تو وہ کامیاب ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ وہ نصرانی ہو تو اس کو جنت نہ ملے۔ اگر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک ان کے دین پر قائم رہا اور نبی آخر الزمان کے آنے سے پہلے وہ وفات پا گیا تو ضرور جنت ملے گی، لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت آ گئی تو پہلے والے سارے دین ختم ہو گئے، پہلے والے دین منسوخ ہو گئے، پہلی شریعتیں ختم ہو گئیں تو اب ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھیں، لیکن اپنے اپنے زمانہ میں انہوں نے اگر اپنے نبی کے دین پر زندگی گزاری تو کامیاب ہیں۔

حضرت سلمان فارسی بیٹھے ہوئے تھے اور حضور پاک ﷺ سے باتیں کر رہے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں کچھ ایسے لوگوں کے پاس رہا ہوں، وہ نمازیں بھی پڑھتے تھے، وہ روزہ بھی رکھتے تھے اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتلاتے تھے کہ ایک نبی پیدا ہوں گے، جن کا نام محمد مصطفیٰ ہوگا اور وہ آپ پر ایمان بھی رکھتے تھے تو ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟ تو اس روایت میں یہ آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یاد رکھو! کہ اگر ایک آدمی موسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم تھا اور تورات پر عمل کرتا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آگئے تو وہ اسی تورات پر قائم رہا، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلمہ نہیں پڑھا تو کافر ہو کر مر گیا۔ جب عیسیٰ علیہ السلام آگئے اور اب ان کی نبوت پر ایمان لانا ضروری تھا۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر عمل پیرا تھا اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا زمانہ آگیا، لیکن وہ تو کہے کہ میں موسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم ہوں، وہ بھی اللہ کے نبی تھے، یا وہ یہ دعویٰ کرے کہ میں عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم ہوں، وہ بھی اللہ کے نبی تھے اور میں اللہ کو بھی مانتا ہوں اور آخرت کو بھی مانتا ہوں، عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مانتا ہوں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ بھی جہنمی ہے، کیونکہ اس نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو تسلیم نہیں کیا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰۳، التوحید لابن مندہ، حدیث: ۱۵۱]

علماء نے لکھا ہے کہ اگر ایک عالم اپنے علم پر عمل نہ کرے تو وہ علم سے محروم ہو جاتا ہے۔

اسی طرح حدیث میں آتا ہے: ''مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ'' [تفسیر البیضاوی: ۲/ ۸۲، النساء: الآیۃ: ۶۷] (جو عالم علم پڑھے اور اس پر عمل کرے اللہ اس کو ایسا علم عطا کرتے ہیں جو وہ جانتا بھی نہیں ہوتا)۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٨٢﴾﴾ [البقرۃ: ۲۸۲] تم تقویٰ اختیار کرو، پھر اللہ تمہیں علم نصیب کریں گے۔ تو جتنا آدمی پرہیزگاری اختیار کرے گا، تقویٰ اختیار کرے گا اتنا علم دین کے حصول میں آسانی ہوگی اور اللہ سینے کو کھولتے چلے جائیں گے اور اللہ کا دین سمجھ آتا چلا جائے گا۔

نام کے اسلامی ملک کا واقعہ:

آپ یقین کریں کہ مجھے ایک دوست نے سنایا کہ ایک اسلامی ملک کی بات ہے کہ وہ وہاں ایک ہوٹل میں گیا تو ٹیبل بھرے ہوئے تھے اور بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی، اتنا رش تھا۔ بڑی مشکل سے مجھے جگہ ملی اور میں جا کر بیٹھا تو گھڑی دیکھی تو مغرب کا وقت تھا۔ میں نے ویٹر کو بلایا کہ مغرب کا وقت ہو گیا ہے، میں نے نماز پڑھنی ہے۔ تو اس نے کہا کہ نماز کیا ہوتی ہے؟ میں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ تو اس نے کہا: مسلمان ہوں۔ میں نے کہا کہ یہاں کوئی مسجد ہے؟

تو اس نے کہا: ہم نے تو نہیں دیکھی۔ میں نے کہا کہ تم میرے حال پر اتنی مہربانی کر دو کہ کوئی ایسی جگہ ہے کہ جہاں میں وضو کر لوں؟ تو اس نے کہا کہ یہ ٹائلٹ بنے ہوئے ہیں...... اب وہاں کوئی ٹونٹی تو نہیں ہے، نہ ڈبہ ہے، نہ گلاس ہے، نہ وہاں لوٹا ہے۔ انگریزی ماحول میں لوٹا رکھا جائے تو کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی دیہاتی ہے۔ تو وہاں کاغذ پر گزارا ہوتا ہے یا وہ ایک گلاس پلاسٹک کا رکھ لیتے ہیں، اس کے اندر شیو کے آلات ہوتے ہیں، ضرورت پڑنے پر اسی کے اندر پانی ڈال کر گزارا کر لیا۔ یہ غیر مسلم شعار کی باتیں ہیں، اللہ نے ہم کو محفوظ رکھا ہے۔...... میں نے اس کو کہا کہ کوئی اور جگہ بتاؤ تو اس نے کہا کہ یہ جو ہمارے ساتھ باغ ہے تو اس میں پانی کے نل لگے ہوئے ہیں۔

میں نے وہاں جا کر وضو کر لیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے پاس عربی رومال تھا، میں نے ایک آدمی سے پوچھا اور سمت کا کچھ اندازہ بھی لگایا اور وہیں رومال بچھایا اور نماز شروع کر دی۔ میں نے نماز پڑھ لی، میں نے کہا کہ اللہ کا فرض تو نہ جائے، لیکن ان میں سے ایک انسان بھی نہیں اُٹھا جس نے نماز پڑھی ہو، سینکڑوں ٹیبل جہاں بھرے ہوئے ہیں کم از کم چار پانچ سو آدمی جہاں بیٹھا ہوا ہو ان میں سے ایک آدمی بھی نہیں اُٹھا جس نے نماز پڑھی ہو۔

پھر وہ کہنے لگا کہ میں نماز پڑھ کر اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا تو اس ہوٹل کا جو منیجر تھا وہ آیا اور اس نے مجھے کہا کہ میں نے آج آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں، لیکن چھبیس سال سے ہمارے گھر میں کسی نے نماز نہیں پڑھی۔ تم میرے اوپر اتنا احسان کرو کہ اب اس کے بعد کوئی اور نماز ہے یا ختم ہو گئی ہیں؟ تو میں نے کہا کہ عشاء کی نماز ہے۔ اس نے کہا کہ وہ نماز میرے گھر میں پڑھ لو، کم از کم میں یہ تو ڈائری میں لکھ لوں گا کہ میرے گھر میں کسی مسلمان نے نماز پڑھی تھی۔ تو میں نے کہا: میرے نماز پڑھنے سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟ جب چھبیس سال سے تم نے نماز نہیں پڑھی۔ اس نے کہا کہ چلو میرے گھر میں اللہ کا نام تو لیا جائے گا۔ اتنی بات اگر تم مان لو تو تمہاری مہربانی ہے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، کھانا کھا لوں۔ اس منیجر نے کہا کہ یہاں ہم کھانے کا بڑا خیال کرتے ہیں، بڑی احتیاط کرتے ہیں۔ عام طور پر جو ہمارے پاس گوشت ہوتا ہے بالکل خالص ہوتا ہے، کرنٹ سے ذبح ہوتا ہے، بالکل حلال ہوتا ہے۔ آپ ڈریں نہ، ہے وہ کرنٹ والا، لیکن جو آدمی جانور کو کرنٹ دیتا ہے وہ ''اللہ اکبر'' پڑھتا ہے، لہٰذا ہمارا گوشت تو خالص حلال ہے۔ باقی ہمارے برتن بھی بالکل پاک صاف ہیں، ہم نے اپنے کک (باورچی) کو ہدایت کی ہوئی ہے کہ خنزیر علیحدہ برتن میں پکایا کرو اور باقی گوشت دوسرے برتن میں پکایا کر، البتہ وہاں چمچ ایک ہوتا

ہے وہ کبھی اِدھر لگ گیا اور کبھی اُدھر لگ گیا۔

تفسیر:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اسی طرح علی بن ابی طلحہ سے ایک روایت ہے کہ اس آیت کے بعد پھر یہ آیت مبارک نازل ہوئی: ﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٨٥﴾﴾ [آل عمران: ۸۵]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا پہلا قول دیکھا جائے یا علی بن ابی طلحہ کا تو آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے، لہٰذا سارے کلام کا خلاصہ یہ نکلا کہ وہ تمام لوگ جن کے پاس جو اللہ نے اپنا نبی بھیجا اور وہ ان کی شریعت پر کاربند رہے اور ان کی اتباع کی، وہ کامیاب ہو گئے۔ اب جب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کا زمانہ آ گیا تو اب وہی لوگ دنیا و آخرت میں کامیاب ہوں گے جنہوں نے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کی اور قرآن اور دین اسلام پر عمل کیا۔ تو اب اگر کوئی آدمی یہ دماغ میں رکھے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے کے بعد میں عیسیٰ علیہ السلام یا موسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم رہوں اور نجات ملے تو اس کو نجات نہیں ملے گی۔ کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بشارت دی کہ ہمارے بعد ایک نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ آئیں گے، تم ان پر ایمان لانا تو آپ پر ایمان نہ لانے والے نے اپنے نبی کی بات بھی نہ مانی۔ یہ ایسے ہے کہ ایک حکومت نے ایک حکم جاری کیا پچھلے سال، نئے سال میں آ کر انہوں نے ایک نیا قانون، نیا حکم جاری کر کے پچھلے قانون کو ختم کر دیا تو اب ہر کسی کو جدید حکم کی پیروی کرنی ہوگی۔ اب اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ جب پہلا حکم موجود ہے اور وہ بھی حکومت نے جاری کیا تھا، میں تو اسی کو پکڑے ہوئے ہوں تو سب اس کو یہ کہیں گے کہ جب حکومت نے اس کو ختم کر دیا ہے، اس کو کالعدم اور منسوخ کر دیا ہے، اب ایک نیا حکم آ گیا ہے، اب تمہیں اس پر چلنا ہوگا۔

تو بعینہٖ اسی طرح جتنی شریعتیں آئی ہیں، اپنے اپنے زمانہ میں سب حق پر تھیں، لیکن جب ان کا زمانہ گزر گیا اور نئی شریعت آ گئی تو اب اس پر عمل کرنا ضروری ہے اور جب سب سے آخر میں شریعت محمد مدنی ﷺ آئی تو تمام ادیان ختم ہو گئے۔ ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾﴾ [التوبة: ۳۳] اور اس کے بعد اللہ نے فیصلہ فرما دیا: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ [آل عمران: ۱۹] اور فیصلہ فرما دیا: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ [المائدہ: ۳] اور فیصلہ فرما دیا:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٨٥﴾﴾ [آل عمران: ۸۵]

اس کی ایک بڑی واضح مثال ہے کہ حضور ﷺ مجلس مبارک میں موجود تھے۔ صحابہ کرام اور خلفاء راشدین بھی موجود تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسی آدمی نے تورات کے کچھ پرانے کاغذات دیئے جن پر تورات لکھی ہوئی تھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات کے مطالعہ میں مشغول ہو گئے اور حضور اکرم ﷺ کو سنانے لگے کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے تو حضور ﷺ کا چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہوتا گیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جلدی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اشارہ کیا کہ کیا کر رہے ہو؟ اللہ کے بندے! تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ حضور ﷺ کے چہرہ مبارک پر جلال ہے؟...... کیونکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی راز دانِ نبوت تھے، حضور ﷺ کے اشارات کو سمجھنے والے تھے، حضور ﷺ کا غصہ دیکھ کر فوراً سمجھ گئے کہ جلال کی وجہ حضرت عمر کا تورات کو پڑھنا ہے...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب تورات سے سر اُٹھا کر حضور ﷺ کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ وہاں تو جلال ہی جلال ہے، حضور ﷺ ناراض ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً عرض کیا کہ یارسول اللہ! ''رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ نَّبِيًّا وَّ رَسُوْلًا'' ہمارے آقا! ہم نے الحمد للہ! اپنے رب کی ربوبیت کا اقرار کیا ہے، دین اسلام کو دین سمجھ کر قبول کیا ہے اور آپ کی ذات مبارک کی نبوت و رسالت پر میرا کامل مکمل ایمان ہے۔ تو حضور ﷺ کا غصہ کم ہوا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے عمر! تمہیں یہ پتہ نہیں ہے کہ اگر آج موسیٰ علیہ السلام صاحبِ تورات خود بھی موجود ہوتے تو وہ میری پیروی کرتے اور میری شریعت پر چلتے اور تم شریعتِ اسلام کے ہوتے ہوئے تورات کو دیکھ رہے ہو؟ اس میں پوری اُمت کے لیے تنبیہ تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تورات اور کتب سابقہ میں اُلجھ جائیں۔

[مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۱۹۴، بابُ: الاعتِصَام بالکتاب وَالسُّنَّۃ]

اور یہی وجہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے آسمانوں پر اُٹھا لیا ہے، وہ زندہ آسمانوں پر موجود ہیں۔ قیامت سے پہلے وہ آسمانوں سے اُتریں گے اور وہ خود صاحبِ شریعت پیغمبر اور رسول ہونے کے باوجود شریعتِ محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع کریں گے۔

تو کسی اور جھوٹے ظلی، بروزی نبی کی نبوت کیسے چل سکتی ہے؟ جب یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ اگر اللہ سابقہ انبیاء کو بھی زندہ فرما دیں تو وہ حضور ﷺ کی پیروی کریں گے تو آج اگر کوئی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والا دعویٰ کرے اور پھر وہ اس کے اندر تاویلات سے کام لے کہ میری نبوت اصلی نہیں ہے، بلکہ ظلی ہے، میری نبوت بروزی ہے یا میری

نبوت اطاعتِ مدنی کی وجہ سے ہے تو ان باتوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ پاک نے تو نبوت کا دروازہ ہی بند کر دیا ہے۔ حضور ﷺ تمام انبیاء کے خاتم ہیں، اب نبوت قیامت تک صرف ہمارے آقا، سرکارِ مدینہ، حبیب کبریاء، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہو گی۔ تو لہٰذا ایک بات واضح ہو گئی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اصول بھی یاد رکھ لیں۔

قبولیتِ عمل کے لیے چند اصول:

جیسے قرآن نے ایک بات واضح کر دی ہے کہ جو لوگ ظاہراً ایمان لائے یا ایمان لائے سابقہ نبیوں پر اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی یا نصرانیت اختیار کی یا کوئی اور دین اختیار کیا تو فرمایا: نجات صرف ان کو ملے گی جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لائیں، حضور ﷺ کی شریعت پر ایمان لائیں اور اچھے اعمال کریں۔ اور اسی طرح حضور ﷺ نے بھی ایک اصول بیان فرما دیا، اگر اس اصول کو سامنے رکھ لیں تو تمام جھگڑے ختم ہو جائیں۔

حضور ﷺ نے دو لفظوں میں دین کا خلاصہ بیان فرمایا ہے کہ اے میری اُمت! یاد رکھو! اللہ کے ہاں کوئی عمل قبول ہی نہیں ہو گا جب تک اس میں دو شرطیں نہیں ہوں گی:

- ......پہلی شرط یہ ہے کہ جو بھی عمل کرو، وہ خالص اللہ کی رضا کے لیے کرو۔ اگر اللہ کے سوا تم نے اس میں کسی کو شریک بنا لیا تو عمل قبول نہیں ہو گا۔
- ......اور دوسری شرط عمل کے مقبول ہونے کی یہ ہے کہ وہ عمل عین موافق ہو اس شریعت کے جو شریعت حضرت محمد رسول اللہ ﷺ لائے ہیں۔ اگر حضور ﷺ کے عمل کے موافق نہیں تو عمل مردود ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ادبِ حدیث:

دیکھیں جو حضور ﷺ کے غلام ہیں ان کی سوچ کتنی بڑی ہوتی ہے۔ ایک آدمی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا۔ امام مالک امام دار الہجرت ہیں اور یہ عاشق محمد مصطفیٰ ہیں، جن کے عشق کا یہ عالم تھا کہ حضور ﷺ کی حدیث مبارک پڑھا رہے تھے اور بچھو پشت پر چڑھ گیا، اس نے سات ڈنک مارے۔ آپ کا چہرہ سیاہ ہوتا گیا، لیکن درسِ حدیث بند نہیں کیا اور اپنی نشست کو بھی نہیں بدلا۔ جب سبق ختم ہو گیا تو فرمایا: ذرا کپڑا اُٹھا کر تو دیکھو کس چیز نے مجھے کاٹا ہے؟ جب دیکھا کہ وہاں تو بچھو بیٹھا ہے تو اس کو مارا، جبکہ وہ سات مقامات پر ڈنک لگا چکا تھا۔ تو شاگردوں

نے عرض کیا کہ حضرت! آپ نے یہ کیا کیا ہے؟ اگر پہلی دفعہ بھی جلدی سے جھٹک دیتے تو باقی زہر سے تو بچ جاتے۔
آپ نے فرمایا کہ میں نبی پاک ﷺ کی حدیث پڑھا رہا تھا، مجھے ہلتے ہوئے حیا آتی تھی۔

حضور پاک ﷺ سے عشق کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی آدمی دروازے پر سوال کرنے کے لیے آتا تو غلام کو بھیجتے کہ پوچھو کیا بات ہے؟ تو وہ کہتا کہ میں نے کوئی مسئلہ پوچھنا ہے تو فرماتے کہ اس سے پوچھ لیا کرو کہ مسئلہ حدیث مبارک کا ہے یا فقہ کا ہے یا عام کوئی دنیوی بات ہے۔ اگر وہ کہتا کہ میں نے حدیث شریف سمجھنی ہے تو امام مالک فرماتے کہ اس سے کہو کہ وہ میرے مقامِ درس پر چلے، میں ابھی آتا ہوں۔ تو امام صاحب باقاعدہ تیاری فرماتے، پگڑی مبارک سر پر رکھتے، خوشبو لگاتے اور تیار ہو کر مسند پر بیٹھتے تھے۔ پھر کہتے تھے کہ اب حضور ﷺ کی حدیث پوچھو۔ فرماتے کہ کھڑے کھڑے حضور ﷺ کی حدیث بتا دوں، یہ ادب کے خلاف ہے اور حضور ﷺ کی حدیث بتلاؤں اور ننگے سر بیٹھا ہوں، یہ ادب کے خلاف ہے۔

اب تو ہم نے خلافِ سنت نمازیں بھی...... ماشاء اللہ!...... شروع کر دی ہیں اور اپنے عقل سے اس کو دین بھی سمجھا ہوا ہے، حالانکہ یہ مسئلہ نہیں سمجھا کہ کپڑا نہ ہو تو سر ننگے نماز جائز ہے۔ کون کہتا ہے کہ ناجائز ہے؟ جیسے صحابہ کے پاس کپڑا نہیں ہوتا تھا، غریب لوگ تھے، دو وقت کی روٹی مشکل سے ہوتی تھی تو کہاں سے وہ کپڑے اور ٹوپیاں لے آتے؟ کسی بے چارے کے پاس تو دو چادریں بھی نہیں ہوتی تھیں، ایک چادر باندھے ہوئے کھڑے ہوتے تھے۔ تو ایک ہے کپڑے کا نہ ہونا اور ایک ہے کہ عمداً کپڑا سر پر نہ رکھنا کہ ہمارے فیشن میں فرق نہ آئے، یہ کہاں حکم لکھا ہوا ہے؟ حالانکہ اللہ کے قرآن نص قطعی میں ہے: ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ [الاعراف: ۳۱] اللہ نے حکم دیا کہ نماز کے لیے آؤ تو تیاری کر کے آؤ، کیونکہ اللہ کے دربار میں حاضر ہو رہے ہو۔ تم اگر کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں جاتے ہو تو تیار ہو کر جاتے ہو اور اپنے کسی بزرگ کو ملنے کے لیے جاتے ہو تو تیار ہو کر جاتے ہو، لیکن اللہ کی دربار میں جیسے مرضی آئے چل پڑو؟

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو اتنا ادب اور احترام تھا کہ میں حضور ﷺ کی حدیث مبارک کیسے پڑھوں؟ جبکہ میرے سر پر پگڑی نہ ہو۔ جن لوگوں نے ادب کیا ہے انہی کو اللہ نے مرتبے بھی دیئے ہیں۔ یہ ہمیشہ یاد رکھنا کہ بے ادب ہمیشہ محروم ہوئے ہیں جیسا کہ فارسی کا محاورہ ہے: ''بادب بانصیب، بے ادب بے نصیب''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خطبہ کا واقعہ:

حضرت عمر نے ایک دفعہ خطبہ میں صحابہ سے پوچھا کہ میں اگر اللہ کے قرآن یا حضور اکرم ﷺ کے راستے سے ہٹ جاؤں تو تم کیا کرو گے؟......اندازہ کرو کہ ایسا آدمی جس کے مشورے کے مطابق اللہ نے عرش سے قرآن اُتارا، وہ پوچھ رہے ہیں کہ پھر تم میری بات مانو گے یا نہیں مانو گے؟ تو ایک بدو بیٹھا ہوا تھا، وہ سب سے پہلے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ عمر! بات سنو، تم محمد کے طریقے سے ہٹو گے تو تلوار سے تیری گردن توڑ دوں گا۔ حضرت عمر نے کہا کہ الحمد للہ! اللہ! تیرا شکر ہے کہ مجھے سیدھا چلانے والے موجود ہیں۔ اللہ! تیرا شکر ہے کہ لوگ مجھے بھٹکنے نہیں دیں گے۔

اور ادھر ہم کیا کہتے ہیں کہ بڑا بزرگ ہے، اسی میں تو ہم مرتے ہیں، اسی لیے ہم گمراہ ہوتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے جو فرمایا ہے، سائیں دا پتر ہے، ایویں تاں نئیں آکھ گئے، اے کوئی راز دی گل اے جو بابے کو سمجھ نئیں آندی پئی۔ خدا کے بندے! چودہ سو سال میں وہ بات نہ صحابہ کو سمجھ میں آئی، نہ تابعین کو سمجھ آئی اور نہ تبع تابعین کو سمجھ آئی اور نہ محدثین کو سمجھ آئی اور نہ ائمہ فقہاء کو کو سمجھ آئی اور نہ ائمہ مفسرین کو سمجھ آئی اور آج بزرگ سائیں نوں سمجھ آ گئی۔ بھلا شریعت بھی کوئی راز ہے اور ہم اس راز کو حل نہیں کر سکے؟ یعنی کیا عقیدہ بھی راز ہے......!؟

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ دین کو بگاڑنے میں سب سے بڑا ہاتھ بُرے پیروں اور بُرے مولویوں کا ہے۔ ان لوگوں نے دین کو رُسوا کر دیا، اسلام کو رُسوا کر دیا اور مذہب کو رُسوا کر دیا۔ لوگوں کے دلوں سے عظمتِ قرآن، عظمتِ حدیث اور عظمتِ اسلام کو ختم کر دیا۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب ضرورت کے وقت مولوی کے لیے جائز ہے تو پھر میرے لیے بھی جائز ہے۔ اگر یہ دو طبقے ٹھیک ہو جائیں تو ساری دنیا کی اصلاح ہو جائے گی۔

یہود کی وجہ تسمیہ:

بعض علماء نے فرمایا کہ یہود کو یہود اس لیے کہتے ہیں کہ قرآن میں آیا ہے: ﴿إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ﴾ [الاعراف:۱۵۶] حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ ہم توبہ کرتے ہیں، رجوع کرتے ہیں تیری طرف۔ چونکہ یہودیوں نے بھی توبہ کی تھی اور توبہ کو تہود کہتے ہیں، اس لیے انہوں نے توبہ میں اپنے آپ قتل کر ڈالا تھا۔ اتنی بڑی توبہ تھی، اس وجہ سے ان کو یہود کہا گیا۔

اور بعض علماء کہتے ہیں کہ یہود کو اس لیے یہود کہا گیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے کا نام ''یہودا'' تھا،

یہ اس کی طرف منسوب ہیں، اس لیے یہ یہود کہلاتے ہیں۔

اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ یہ ''الھوادۃ'' سے ہے جس کا معنی آپس میں محبت کرنا ہے۔ آپس میں یہ قومی طور پر بڑی محبت کرتے ہیں۔ آج بھی ان کے اندر قومیت کا اثر باقی ہے، اب بھی موجودہ دور میں وہی لوگ یہودی ہیں جو ان کی نسل سے آ رہے ہیں اور کوئی آدمی یہودیت میں داخل نہیں ہوسکتا اور کسی آدمی کو یہودیت کا مرتبہ دینے کے لیے وہ تیار نہیں ہوتے۔

ابو عمرو بن العلاء رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہودیوں کو یہود اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی عادت تھی کہ جب یہ تورات پڑھتے تھے تو ہلتے تھے (اور اب بھی ہلتے ہیں) اس لیے ان کو یہود کہا گیا کہ ہود کا معنی ہوتا ہے تحرک۔

اس لیے قرآن پڑھتے ہوئے ہمارے ہاں جو لوگ ہلتے رہتے ہیں، بعض علماء اس کو بڑی سختی سے منع کرتے ہیں کہ یہ تو یہود کی عادت تھی، بلکہ آدمی آرام اور سکون سے بیٹھے جیسا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کہتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک پڑھتے یا ہم حضور مبارک صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضر ہوتے تو ہماری کیفیت ایسی ہوتی تھی کہ گویا ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پرندہ ایسی چیز ہے کہ ذرا سی بھی ٹہنی ہل جائے تو اُڑ جاتے ہیں یعنی گویا کہ ہم ایسے بیٹھتے تھے جیسے بے جان پتھر ہوں کہ کوئی حرکت نہیں ہو رہی اور سکون و ادب اور آرام کے ساتھ بیٹھے تھے۔

بہر حال اگر دیکھا جائے تو یہ سارے اقوال صحیح ہیں، کیونکہ ان کی توبہ بھی اتنی مشقت کے بعد قبول ہوئی، یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ اور وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، یہ نسبت بھی ٹھیک ہے۔ اسی طرح تورات پڑھتے ہوئے وہ ہلتے تھے، یہ نسبت بھی ان کی طرف ٹھیک ہے۔ اور پھر یعقوب کی اولاد میں ان کے بڑے بیٹے کا نام یہودا تھا، اس کی طرف یہودی منسوب ہوئے تو یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ یہ سارے اقوال اور ساری صفات ایک قوم میں جمع ہوسکتی ہیں، لہٰذا ان میں کوئی تعارض یا تضاد نہیں ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰۳، البقرۃ، الآیۃ: ۶۲]

آسمانی شریعتوں میں نسخ اور تبدیلی کیوں؟

شبہ: لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ بعض دشمنانِ اسلام شبہ ڈالتے ہیں...... اللہ تعالیٰ معاف کرے اور اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو شبہات سے بچائے کہ دنیا میں تو قانون بدلتے رہتے ہیں، مثلاً ایک دفعہ پارلیمنٹ قانون بناتی ہے اور دو

سال کے بعد اس قانون کو منسوخ کرنا پڑ جاتا ہے یا اس کے اندر و بدل کرنا پڑ جاتا ہے، کیونکہ وہ قانون بنانے والے انسان ہیں اور ان کو پتہ نہیں ہوتا کہ پانچ سال کے بعد حالات کیا رخ اختیار کریں گے؟..... تو وہ کہتے ہیں کہ جب مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارا اللہ علام الغیوب ہے، عالم الغیب ہے اور ہمارے خدا کو ذرّے ذرّے کا علم ہے، قیامت تک جو حالات پیش آئیں گے اس کا بھی علم ہے تو پھر اللہ پاک نے شریعتیں کیوں بدل ڈالیں؟ ایسی شریعت کیوں نہیں بنا دی کہ اس کو بدلنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی؟ تو ہر پیغمبر کے زمانہ میں شریعت بدلتی رہی۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اور شریعت تھی، عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اور شریعت تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور شریعت ہے۔ تو بعض لوگ دین میں، انبیاء کی شریعتوں میں اس قسم کے شبہات پیدا کرتے ہیں اور ہماری نوجوان نسل بہت جلدی متاثر ہو جاتی ہے، کیونکہ ان کے ذہن میں پہلے سے دین کا مطالعہ نہیں ہوتا۔

جواب: پہلی بات تو یہ سمجھو کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک شریعت اسلام ایک ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک جو بنیاد اور اساسی اصول ہے وہ ایک ہے۔ تمام انبیاء کی قرآن میں دعوت کھول کر پڑھیں، سب کی ایک ہی دعوت توحید ہے، اللہ کی وحدانیت، ربوبیت، اُلوہیت، اسماء وصفات ایک ہے، تمام نبی ایک ہی دعوت دیتے نظر آئیں گے۔

تو اصولِ توحید ایک ہیں، تمام انبیاء علیہم السلام دعوت دیں گے کہ نبوت و رسالت پر ایمان ضروری ہے۔ ان کے نزدیک ہر مسئلہ ایک ہے۔ تمام انبیاء نے بتلایا کہ اللہ نے جتنے نبی اور رسول بھیجے ہیں سب بشر ہیں، اولادِ آدم ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ تمام انبیاء نے قوم کو درس دیا کہ یہ دنیا فانی ہے اور اس کے بعد ایک اصل دار آئے گا دارِ آخرت، قیامت ہے، حشر ہے، نشر ہے، حساب و کتاب ہے، جزا ہے اور جنت وجہنم ہے، کوئی اختلاف بھی نہیں ہے۔ تو ہمیشہ یاد رکھیں کہ بنیادی مسائل میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کم وبیش نبی کی دعوت ایک ہے، کوئی اس میں اختلاف نہیں ہے، البتہ جو اختلافات آئے ہیں وہ فروعات میں آئے ہیں۔ اور فروعی مسائل میں اختلاف ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہی رحمت ہے۔ یہ تو بندوں پر اس کا احسان ہے کہ اگر فروعی مسائل میں اللہ تعالیٰ ایک حکم جاری کر دیتے تو نوح علیہ السلام کے زمانہ میں جو لوگوں کے پاس طاقت تھی وہ تمہارے پاس کہاں ہے؟

اسی سے اندازہ کر لیں کہ آپ سے پہلے جو آپ کے والدین تھے یا آپ کے دادا تھے ان کی جو قوتیں اور طاقتیں تھیں، ہمتیں تھیں، وہ سب تمہارے پاس ہیں؟ اور جو تمہارے پاس ہے وہ تمہاری نوجوان نسل کے پاس نہیں

ہے۔ تو یہ تبدیل کرنا...... معاذ اللہ!...... اس لیے نہیں ہے کہ اللہ کو علم نہیں تھا، بلکہ یہ ایسے ہے کہ جیسے ایک مریض ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور ڈاکٹر اس کے لیے ایک نسخہ تجویز کرتا ہے اور اس کو کہتا ہے کہ پانچ دن کے بعد آؤ۔ پانچ دن کے بعد ڈاکٹر پھر چیک اپ کرتا ہے اور اس کا نسخہ بدل دیتا ہے تو اب کوئی بیوقوف ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ ڈاکٹر نے نسخہ کیوں بدل دیا؟ وہی پہلا نسخہ دے دیتے، اسی سے مریض ٹھیک ہو رہا تھا، لیکن یہ بات کہنا جہالت ہوگئی۔ جو سمجھدار ہوگا وہ کہے گا کہ اب چونکہ مریض میں تبدیلی آگئی ہے تو دوا میں بھی تبدیلی ضروری ہے۔ تو اس لیے اللہ نے فروعی مسائل میں تبدیلیاں رکھیں۔

آج سے ہزار سال پہلے کی قوموں کی تاریخ پڑھیں۔ ان کی قوتیں الگ، ان کی طاقتیں الگ، ان کی ہمتیں الگ، ان کے دماغ الگ، ان کی صلاحیتیں الگ تھیں، ان کا ماحول الگ تھا۔ اس کے بعد آٹھ سو سال، پھر چھ سو سال دیکھتے چلے جائیں کہ جوں جوں بندوں کی مرض کی حالت بدلتی گئی، اللہ اپنی شریعتوں میں تبدیلی فرماتے گئے۔ یہ تو کمال رحمت ہے، یہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا عین عدل اور انصاف ہے۔ اور اب دیکھیں کہ جب ارتقائی طور پر اُمتیں ارتقاء کو پہنچ گئیں تو اللہ نے ایک شریعت دے دی جو قیامت تک کے لیے ہے، اس کے بعد کوئی شریعت نہیں ہے۔

جیسے آپ بچپن میں کتنی بڑی قمیص پہنتے ہیں؟ جب چار ماہ کا ہو جائے، دو سال کا ہو جائے، پھر تین سال کا ہے، لیکن جب آپ پچیس سال کے ہوتے ہیں تو اس کی ایک ہی پیمائش ہے کیا؟ وہ آخر تک چلتی جائے گی۔ تو یہ تو حالات کے مطابق اللہ نے ہم پر رحم کیا ہے۔ یہ جہالت ہے کہ کوئی آدمی اللہ کے علم پر اعتراض کرے۔

ائمہ کرام کا اجتہاد:

جس طرح آج بھی بعض لوگ شبہات ڈالتے ہیں کہ چار امام کیسے ہو گئے؟ کبھی تو جھگڑا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کچھ کہتے ہیں اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کچھ کہتے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کچھ کہتے ہیں۔ دیکھیں! ان کے اندر اختلاف ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو جھگڑا نہ ہوتا۔ یہ بھی ائمہ کرام کی بے ادبی، تنقید ہے۔ اور ان کی شان میں کوئی ایسا غلط لفظ استعمال کرنا، یہ سب سے بڑی جہالت کی دلیل ہے۔ تمام ائمہ کرام کے اندر بھی اصول کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جتنے مسئلے منصوص ہیں، ان کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جو قرآن سے ثابت ہو گئے یا ''علی لسان رسول اللہ ﷺ'' ثابت ہو گئے، یعنی بالکل حضور پاک ﷺ سے کھلی ہوئی بات واضح ہوگئی، اس میں کسی امام کا اختلاف نہیں ہے۔

یادرکھیں! ان ائمہ کرام کے اندر بھی اختلاف وہاں پیدا ہوا جہاں حضور پاک ﷺ کے دو فرمان آ گئے۔ اب ان دو فرمانوں کی تاریخ کیسے ہے؟ پہلے کون سا ہے اور بعد میں کون سا ہے؟ پھر فقہاء نے اس پر بحث کی۔ ناسخ، منسوخ کو ڈھونڈا، دونوں حکم اپنی جگہ پر برقرار رکھے گئے اور ان میں اعلیٰ، افضل، غیر افضل کا فرق کر دیا گیا کہ اس پر عمل کرو گے تو بہت زیادہ ثواب ہے اور اگر اس پر عمل کرو تو اس میں بھی ثواب ہے۔ دونوں جائز ہیں۔ یا ایسے مسائل جو قرآن یا احادیث مبارک سے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے تعامل سے، اجماع امت سے نہ نکلے اور امت کو ایک نیا مسئلہ پیش آ گیا تو اب فطری بات ہے کہ جب مسئلہ نیا پیش آ جائے تو کیا کریں گے؟

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا مسئلہ:

مثال کے طور پر بے بی ٹیوب کا نیا مسئلہ پیش آ گیا کہ وہ سرنج کے ذریعے مادہ منویہ لے لیتے ہیں اور اس کو ایک ٹیوب میں رکھتے ہیں یا مادہ منویہ لے کر اس کو ایک عورت کے رحم کے اندر داخل کر دیتے ہیں۔ اب یہ کام نہ حضور ﷺ کے زمانہ میں ہوا اور نہ صحابہ کے زمانہ میں ہوا تو یہ مسئلہ آپ امت کو کیسے سمجھائیں گے؟ کیونکہ یہ مسئلہ تو اب پیش آیا ہے۔

اسی طرح جو آج کل پوری دنیا میں بینکوں کے جھگڑے چل رہے ہیں، یہ حضور ﷺ کے زمانہ میں تو نہیں تھے۔ وہاں تو ربوا کی ایک ہی صورت تھی کہ جو بڑے بڑے یہودی تھے یا بڑے بڑے مشرکین مکہ تھے یا پیسے والے لوگ تھے وہ غریبوں کو پیسے دیتے تھے اور اس پر سود لیتے تھے، لیکن یہ صورت پیدا نہیں ہوئی کہ جس طرح ساہوکار سود لیتا تھا۔ اگر غریب بھی پیسے رکھ لے تو بینک اس کو بھی سود دیتا ہے، یہ صورت تو اس وقت پیش ہی نہیں آئی تھی۔

اسی طریقے سے مثلاً: چاند پر جانے کے مسائل ہیں۔ اسی طریقے سے اگر ایک آدمی زخمی ہو گیا ہے تو ہم اس کو بلڈ دے رہے ہیں، خون دے رہے ہیں اور پتہ نہیں ہے کہ خون مسلمان کا ہے یا کافر کا۔

اسی طریقے سے آج اگر کسی کا ہارٹ کا آپریشن ہو، اس کی سرجری کی جائے تو اس کے والوز ہوتے ہیں، اگر والوز بند ہوتے ہیں تو ان کو تبدیل کیا جاتا ہے۔ اب وہ والوز سؤر کے بھی ملتے ہیں، گائے کے بھی ملتے ہیں، پلاسٹک کے بھی ملتے ہیں اور سب سے مہنگے پلاسٹک والے ہیں اور سب سے سستے خنزیر والے ہوتے ہیں، کیونکہ ان کے ملک میں خنزیر عام ہے، وہ تو روزانہ کاٹا جاتا ہے تو اس کے والوز نکال لیتے ہیں۔ تو اب ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا کہ خنزیر

نجس العین ہے، اس کا کوئی جز و چھوٹا سا جسم کے اندر رکھیں تو اس کا کیا حکم ہے؟

اب اس کے مطابق آپ مجھے کوئی چیز پڑھ کر سنائیں کہ فلاں جگہ یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے۔ حدیث مبارک میں مسئلہ آ گیا کہ مکھی مر گئی اور ہمارے کسی برتن میں پانی میں پڑ گئی تو حکم ہے کہ اس کو پانی میں ڈبا کر باہر نکال دو، کیونکہ اس کے ایک پر میں شفا ہوتی ہے اور جس پر میں شفا ہوتی ہے وہ پر پانی سے بچاتی ہے، اس لیے اس کو ڈبا دو، تا کہ پانی مین شفا والا پر ڈوب جائے۔[1] لیکن اگر جھینگر پڑ گیا، بچھو پڑ گیا یا مچھر پڑ گیا تو کیا حکم ہے؟ اور کتنے جانور اُڑنے والے ہیں جن کا نام نہیں آتا، سب کا نام ہم کہاں سے ڈھونڈیں گے؟ ان میں سے کوئی مر گیا۔

پھر ایسے مسائل میں ائمہ کرام قرآن وسنت کی روشنی میں اجتہاد کرتے ہیں اور پھر ان کو قرآن وسنت کے مطابق اللہ نے انشراحِ صدر دیا ہوا ہوتا ہے۔ مثلاً:

وہ مسئلے کی تحقیق کرتے ہیں کہ زنا کیوں حرام ہے؟ کہ کسی غیر مرد کا نطفہ کسی عورت میں ڈالا جا رہا ہے۔ اب وہ اگر مرد کے ذریعے ڈالا جائے تب بھی حرام ہے اور اگر سرنج کے ذریعے ڈالا جائے تب بھی حرام ہے۔ اب انہوں نے اس سے مسئلہ نکال لیا۔ مسئلہ وہی ہے کہ جس کی اصل قرآن میں موجود ہے کہ زنا حرام ہے۔ اسی طرح حکم ہے کوئی آدمی کسی دوسرے کے درخت کو پانی نہ لگائے کہ عورت اپنے خاوند سے حاملہ ہے اور زانی زنا کر رہا ہے، یعنی وہ بھی پانی لگا رہا ہے کسی دوسرے کے درخت کو، اس سے علماء نے مسئلہ نکال لیا کہ یہ بات غلط ہے کہ غیر خاوند کے نطفہ کو عورت کے اندر ڈالا جائے، بے بی ٹیوب کے ذریعے یا سرنج کے ذریعے۔ ہاں اگر مرد بے چارا ضعیف ہے، لیکن اسی کا مادہ منویہ، اس کے جراثیم درست ہیں، حمل تو ٹھہر سکتا ہے، لیکن وہ بیچارا مریض ہے، کمزور ہے، وہ اپنی طاقت سے وہاں پانی نہیں پہنچا سکتا تو اگر اسی کا مادہ لے کر اس کی عورت میں ڈالا جائے تو یہ ٹھیک ہے، زنا نہ ہوا۔ لیکن اگر ہم نے کسی غیر کا نطفہ لے کر اس کے اندر ٹھہرایا تو وہ دوسرے کا بیٹا ہے اور اس کو زبردستی ہم میاں بیوی کا وارث بنا رہے ہیں، حالانکہ وہ ان کا نطفہ ہی نہیں ہے، وہ نطفہ ہی حرام ہے۔ تو یہ مسئلہ اسی سے نکالا گیا ہے، لیکن قرآن وسنت کی روشنی میں ان کا اجتہاد کرنا پڑا۔

اسی طریقے سے انہوں نے مسئلہ نکال لیا کہ جس جانور میں بہنے والا خون نہیں ہوتا، جیسے مکھی ہے۔ جس کے بارے میں حکم ہے کہ اس کو غوطہ دے کر پھینک دو۔ اسی طرح اگر چھوٹے چھوٹے جانور کھانے پینے کی چیزوں میں

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۳۳۲۰، باب: إِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ فِي شَرَابِ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْمِسْهُ...]

پڑ جائیں تو یہ چیزیں حرام نہیں ہوں گی، کیونکہ مکھی سے جب حرام نہیں ہوں گی تو ان اشیاء سے بھی حرام نہیں ہو رہی ہیں۔ تو اسی فرمانِ رسول پر انہوں نے قیاس کیا ہے، اپنی طرف سے کوئی بات نہیں نکالی ہے۔

اور اسی طرح سے جب انہوں نے کہا کہ ربوا حرام ہے تو انہوں نے کہا: بالکل حرام ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: سود دینے والا اور سود لینے والا، سود کی گواہی دینے والا، سود کا معاملہ لکھنے والا اور اس میں اعانت کرنے والا، سب پر اللہ کی لعنت ہے۔[1] تو انہوں نے کہا کہ اگر یہ دونوں طرف بھی ہو تب بھی لعنت ہے، کیونکہ جب دینے والا بھی برابر اور لینے والا بھی برابر ہے، گواہی دینے والا تو کچھ بھی نہیں لے رہا ہے، اس کے پلّے میں تو کوئی پیسہ نہیں جا رہا ہے، نہ مدعی کی طرف سے اور نہ مدعی علیہ کی طرف سے، نہ بینک کی طرف سے اور نہ اس سائل کی طرف سے، لیکن سب پر اللہ کی لعنت ہے تو اس سے نتیجہ نکل آیا کہ سود کسی شکل میں بھی حلال نہیں ہو سکتا، چاہے ہم اس کی کتنی صورتیں بناتے چلے جائیں کہ ہم بھی دیتے ہیں، وہ بھی ہمیں دیتے ہیں اور جناب یہ ہے کہ ہر بینک کی پرسنٹیج مختلف ہوتی ہے، بعض سات پرسنٹ دیتے ہیں، بعض ساڑھے سات پرسنٹ دیتے ہیں، بعض پندرہ بھی دیتے ہیں اور بعض دنیا کے بینک ایسے بھی ہیں جو پچیس پرسنٹ بھی دیتے ہیں اور اگلے دن مجھے ایک آدمی بتلا رہا تھا کہ کون سا اسلامی ملک ہے وہاں شرح سود ستر پرسنٹ ہے۔

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ ائمہ میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔ اللہ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی محنتوں کو قبول فرمائے۔ اگر وہ یہ محنت نہ کرتے تو آج ہم اندھیروں میں بھٹکتے رہتے، ایک ایک مسئلہ ڈھونڈنے کے لیے ہماری داڑھیاں سفید ہو جاتیں، لیکن وہ مسئلہ نہ ملتا۔ یہ ان کی محنتیں ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو جزا عطا فرمائے۔

اب دیکھیں کہ اگر حضور پاک ﷺ کی ایک حدیث ڈھونڈنی ہو ہم کہیں کہ حضور ﷺ کی ایک حدیث مبارک ہے جس میں تلوار پر سونا چڑھانے کا ذکر آیا ہے تو ڈھونڈو کہاں ہے؟ تو ہے کوئی مائی کا لال جو ڈھونڈ لیتا تو اللہ امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی اور امام نسائی وغیرہ پر کروڑوں رحمتیں کرے، انہوں نے ہمارے لیے کتنی آسانی کر دی کہ ان کی کتابوں میں کتاب الجہاد کھولو اور اس حدیث کو دیکھ لو۔

اسی طرح ہم کہیں کہ حضور پاک ﷺ کی ایک حدیث پاک ہے کہ جب آخر زمانے میں جھگڑے ہو جائیں اور

[1] [صحیح مسلم، حدیث: ۱۵۹۸، باب: لعنِ آکلِ الرِّبا وَمُوکِلِہ]

جب بڑے فساد ہو جائیں، انتشار ہو جائے اور ایسے حالات ہو جائیں تو مسلمان کو چاہیے کہ وہ بالکل علیحدہ بیٹھ جائے، اپنا دروازہ بند کر دے، اپنی تلوار توڑ ڈالے اور چپ کر کے بیٹھ جائے۔ اللہ کے فرائض پورے کرتا رہے اور کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہو۔ تو اب ہم اگر اس حدیث کو ڈھونڈنا چاہتے تو کوئی مائی کا لال ہے جو ڈھونڈ کر دکھاتا؟ اللہ تعالیٰ ان ائمہ محدثین پر رحمت کرے جنہوں نے احادیث کو مبوب و مفصل جمع کر دیا، انہوں نے لکھ دیا ہے، "کتاب الفتن" کھولو تو ایک منٹ میں حدیث نکل آئے گی۔

اچھا آدمی مرجائے تو ہم اس کو دفن کیسے کریں؟ کفن کیسے دیں؟ جنازہ کیسے پڑھائیں؟ قبر میں کیسے رکھیں؟ قبر کیسے بنائیں؟ اور رخ کس طرف کریں؟ بھائی! اس میں حضور ﷺ کا فرمان کہاں کہاں ہے؟ کوئی مائی کا لال ہے جو اس کو ڈھونڈتا؟ ان ائمہ محدثین کی برکتیں ہیں کہ ہم کہیں گے کہ فوراً "کتاب الجنائز" کھولو اور ایک منٹ میں حدیث نکل آئے گی، ورنہ یہ "کتاب الإیمان، کتاب الطهارة، کتاب الفتن، کتاب الجهاد، کتاب الجنائز" کیا یہ حضور ﷺ مرتب فرما گئے ہیں کہ اسی طرح کتابیں لکھا کرو؟ تو جن لوگوں نے اس طرح لکھا ہے کیا انہوں نے حضور ﷺ کی مخالفت کی ہے اور بدعت کی ہے؟ اب حضور ﷺ نے نہیں فرمایا تو انہوں نے کیوں لکھا؟ یہ تو کومن سینس کی بات ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ "عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ، تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ"[1] (تم پر میری سنت لازم ہے اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت۔ اس کو تھام لو اور داڑھ کے ساتھ مضبوطی سے پکڑ لو۔) تو اب ہم حضور کی سنت کو واضح کریں گے تو کوئی اس کو پکڑے گا تو جب حضور کی سنت ہمیں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے تو ہم اس کو کیسے پکڑیں گے؟ تو جن لوگوں نے حضور ﷺ کی سنت کے باب علیحدہ علیحدہ باندھ دیئے ہیں کہ نماز کا مسئلہ دیکھنا ہو تو کتاب الصلوٰۃ دیکھ لو، پاکی پلیدی کے مسائل دیکھنے ہوں، مذی، ودی کیا ہے؟ پیشاب کیا ہے؟ غسل کیا ہے؟ جنابت کیا ہے؟ کتاب الطہارۃ دیکھ لو۔ ہمارے پاس کوئی چار سو بکریاں اور پچاس بھیڑیں اور ڈیڑھ سو گائے اور دو سو اونٹ ہیں تو ہم زکوٰۃ کیسے دیں؟ کون سا مشکل مسئلہ ہے؟ باب الزکوٰۃ نکالو تو ایک منٹ میں مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ یہ سارا کام جسے ائمہ محدثین نے کیا کہ حضور اکرم ﷺ کی احادیث کو ترتیب دے دیں۔ جیسے امام ابوحنیفہ کی فقہ کے مسائل پڑھے تو کتنی بڑی بات امام اعمش نے کہی تھی کہ ایسے معلوم ہوتا ہے

[1] [سنن أبي داود، حديث: ٤٦٠٧، باب في لزوم السنة]

کہ ہم تو ایسے ہیں کہ جیسے میڈیکل سٹور والا دواؤں کو ترتیب پر لگا دیتا ہے، اصل طبیب اور حکم تو تم فقیہ لوگ ہو جو مریض کی مرض ڈھونڈ کر دوا نکال کر دیتے ہو۔ اتنی ترتیب سے دوائیں رکھی ہوئی ہیں کہ پچاس آدمی بھی نسخے والے آجائیں تو ایک منٹ میں وہ ڈھونڈ کر دے دے گا اور آپ مجھے کھڑا کر دیں تو آدمی شیشیاں توڑ ڈالیں گے اور ایک مریض پر تین گھنٹے لگا دیں گے۔ تجربہ کرلو، اگر نہ مانتا ہو۔ کوئی انگریزی پڑھا لکھا لے جاؤ اور اس کو کہو کہ تم بھی تو پڑھے لکھے ہو، کہتے ہیں کہ ہم خود ہر چیز سمجھ سکتے ہیں، اس کو ایک ڈاکٹر کی پرچی دے دو۔ پہلے تو اس سے ڈاکٹر کی پرچی پڑھی نہیں جائے گی۔ ڈاکٹر صاحبان بھی ایک ایسی قوم ہیں کہ ان کے اپنے میڈیکل ورڈز ہوتے ہیں جو کسی کا باپ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اگر وہ ایس پی لکھ دیں تو ہم سمجھیں گے کہ ایس پی پولیس کے افسر کو کہتے ہیں، ڈاکٹر کہے گا میں نے سیرپ لکھا ہے، وہ ٹی این لکھ دے تو ہم کہیں گے کہ اس سے جو ہمارے بڑے بڑے سیکرٹری ہیں وہ مراد ہوں گے، لیکن ڈاکٹر کہے گا کہ اس سے ننکچر مراد ہے۔ اس لیے یاد رکھو کہ جو آدمی ائمہ کرام کی مخالفت کرتا ہے وہ دور جہالت میں پڑا ہوا ہے۔

اتباعِ سنت پر ایک صحابیؓ رسول کا واقعہ:

ایک صحابی جنگ کے میدان میں اور عورت بھی میدانِ جنگ میں آگئے اور صحابی نے کہا: تیرے ساتھ میں نکاح کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ میں نے سنا ہے کہ تم بیوہ عورت ہو، عدت بھی گزار چکی ہو۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ تو صحابیؓ رسول نے کہا کہ ایک بات یہ بھی سن لو کہ کل میں شہید بھی ہو جاؤں گا، لیکن نکاح ضرور کرنا ہے۔ تمہاری مرضی ہے، نکاح کرو یا نہ کرو۔ کیونکہ میں جنگ میں ہوں اور مجھے اپنے اللہ پر ایمان ہے کہ میں کل شہید ہو جاؤں گا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ محمد مدنی ﷺ کی سنت نکاح پر عمل ہو جائے۔ یہ نہ ہو کہ کل میں قیامت کے دن پکڑا جاؤں کہ نکاح میرا طریقہ تھا، تم نے کیوں اس پر عمل نہیں کیا؟ صرف میں نے حضور ﷺ کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ آگے بھی ایمان والی عورت تھی، اس نے کہا کہ شاید میرے بھی مقدر میں یہی لکھا ہے، چھ پہلے شہید ہو گئے ہیں، ساتویں تم سہی۔ میں راضی ہوں نکاح پڑھو۔ نکاح ہو گیا اور صحابی صبح شہید ہو گئے۔

اب تم لوگ اس کو کیا کہو گے کہ عورت کو بس مرد کی خواہش تھی اور مرد کو عورت کی خواہش تھی۔ اگر عورت کو مرد کی خواہش ہوتی تو وہ تیرے میرے جیسا بزدل ڈھونڈتی جو بے غیرت گھر میں بیٹھا رہتا، نہ گھر سے باہر نکلتا اور نہ مرتا، وہ نکھٹو ڈھونڈتی جو صرف سگریٹ پر زور رکھتا ہو، تاکہ وہ اس کو خوش رکھے۔ وہ تو ایسا بیوقوف ڈھونڈتی، نہ کہ اس کو جو

کل شہید ہو جائے۔ اگر مرد کو بھی عورت کی کوئی تمنا ہوتی تو کہتا کہ جنگ تو کرلو، زندگی باقی رہ گئی، مدینہ پاک واپس خیریت سے پہنچ گئے تو شادی کرلیں گے، اگر ویسے شہید ہو گئے تو بھلا ایک رات کے لیے شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کہ خاوند کے مرجانے پر چار ماہ دس دن عدت بھی گزارنی پڑے۔ لیکن دونوں کا مقصد اتباع رسول اللہ تھا کہ حضور ﷺ کا حکم ہے "اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي" (نکاح میرا طریقہ ہے) جو نکاح سے انکار کرے، اس کا محمد مدنی کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔[2] لیکن آج تو ہم صرف نام کے مسلمان رہ گئے۔ جیسے احادیث میں آتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا، اسلام نام کا رہ جائے گا اور قرآن صرف کتابوں میں لکھا ہوا رہ جائے گا، عمل کرنے والے نہیں ہوں گے۔[3] اور آج وہی زمانہ ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں، ﴿وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ﴾ [سبا:۱۳]

نصاریٰ کی وجہ تسمیہ:

"نصاریٰ" کو "نصاریٰ" اس لیے کہا گیا کہ وہ ایک دوسرے کی بہت مدد کرتے تھے، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں نصرت کرتے تھے، اس وجہ سے ان کو نصاریٰ کیا گیا۔ اسی لیے "انصار" بھی کہا گیا۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ﴾ کون ہے جو میری اللہ کے راستے میں مدد کرے؟ ﴿قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ﴾ [الصف:۱۴] تو ان کو بھی "انصار" کہا گیا۔

دوسرا قول یہ بھی ہے کہ نصرانیوں کو نصاریٰ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ایک جگہ تھی جس کا نام "ناصرہ" تھا، وہ اس جگہ کے رہنے والے تھے، اس لیے ان کو نصاریٰ کہا جاتا ہے۔ اسی قول کو حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے بھی نقل کیا اور حضرت ابن جریج رحمہ اللہ نے بھی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح کا ایک قول مبارک منقول ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نصاریٰ، نصرانی کی جمع ہے، جیسا کہ نشاویٰ نشوان کی جمع ہے اور سکاریٰ سکران کی جمع ہے اور عورت کو بھی نصرانہ کہتے ہیں، جیسا کہ کسی شاعر نے بھی اس کو کہا تھا: "نصرانة لم تحنف"

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۳، البقرۃ: الآیۃ: ۶۲]

حضور اکرم ﷺ اقوام عالم کے نبی ہیں:

جب اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو خاتم النبیین بنا کر بھیجا اور آپ کو تمام بنی آدم کے لیے اور تمام مخلوقات کے

---

[1] [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۱۸۴۶، باب: ما جاء في فضل النكاح]
[2] [صحیح البخاری، حدیث: ۵۰۶۳، باب: الترغيب في النكاح]
[3] [شعب الایمان، حدیث: ۱۷۶۳]

لیے رسول بنا کر بھیجا۔ جیسا کہ آپ متعدد آیات کے اندر پڑھ چکے ہیں کہ ہمارے آقا، سرکارِ مدینہ کی نبوت کسی ایک علاقہ کے لیے نہیں ہے، جیسا کہ پہلے انبیاء علیہم السلام آتے تھے۔ قومِ لوط میں علیحدہ نبی، قومِ شعیب علیہ السلام میں علیحدہ نبی، قومِ ثمود میں علیحدہ نبی، قومِ نوح میں علیحدہ نبی، لیکن جب خاتم الانبیاء، افضل الانبیاء کی باری آئی تو آپ کو اللہ نے تمام انسانوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا۔ اسی لیے کئی مقام پر آیا ہے: ﴿قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ [الاعراف:۱۵۸] یہاں ''النَّاس'' کے ساتھ خطاب کیا گیا اور اسی طرح آیا ہے: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ [سبا:۲۸] اور اسی طرح اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [الانبیاء:۱۰۷] کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے گورا، کالا، عرب، عجم، انس وجن تمام کے لیے نبی بنا کر بھیجا ہے اور اس کے بعد وضاحت فرما دی کہ ''إِنَّ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ لَا رَسُوْلَ بَعْدِيْ وَلَا نَبِيَّ'' (رسالت اور نبوت ختم ہوگئی۔ اب میری نبوت کے بعد نہ کسی کی نبوت ہوگی اور نہ رسالت ہوگی)۔ اب قیامت تک کے لیے نبوت و رسالت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوگی۔

[سنن الترمذي، حديث: ۲۲۷۲، بَابُ: ذَهَبَتِ النُّبُوَّةُ وَبَقِيَتِ الْمُبَشِّرَاتُ]

اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے القابات:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو ''مؤمن ومسلمہ'' کا لقب ملا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ ایمان لانے والے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہیں، یعنی قیامت میں ایسے بھی پیغمبر ہوں گے جن کے ساتھ دس آدمی ہوں گے، ایسے بھی پیغمبر ہوں گے جن کے ساتھ کوئی بھی نہیں ہوگا اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت آئے گی تو بہت بڑی اُمت ہوگی، لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت آئے گی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی حیران ہوجائیں گے۔[1]

اور دوسرا قول یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو ''مومن'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ جہاں وہ اپنے پاک نبی پر ایمان لاتے ہیں، وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں پر بھی ایمان لاتے ہیں۔ تو کثرتِ ایمان کی وجہ سے ان کو ''مومن'' کہا گیا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰۳، البقرۃ: الآیۃ: ۶۲]

اور اسلام کا معنی ہے استسلام۔ تو اسلام کا معنی یہ ہوا کہ بندہ اپنے آپ کو اللہ اور اللہ کے رسول کے سپرد کرے کہ

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۵۷۵۲، بَابُ: مَنْ لَمْ يَرْقِ]

جو اللہ کا حکم ہے بس ٹھیک ہے۔ اس لیے مسلمان کا معنی ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو پورا سپرد کر دینے، سونپ دینے والا۔

ایمان و اسلام میں فرق:

بعض علمی تحقیقات ہوتی ہیں کہ "مَا الْإِيمَانُ، مَا الْإِسْلَامُ؟" یہ لفظ ایک دوسرے کے معنی میں ہوتا ہے، یعنی اس کو مسلمان بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کو مومن بھی کہہ سکتے ہیں۔ تو استعمال میں یہ لفظ مترادف ہیں، ایک دوسرے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

﴿وَالصّٰبِئِیْنَ﴾ کا مصداق:

بعض لوگوں نے بھی فرمایا ہے کہ ﴿وَالصّٰبِئِیْنَ﴾ اہل کتاب کا ایک فرقہ ہے۔ اس لیے امام ابو اسحاق رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اگر یہ اہل کتاب ہیں تو ان کا ذبیحہ کھانا حلال ہوگا اور ان کی لڑکیوں سے نکاح بھی جائز ہوگا۔

بعض نے کہا کہ وہ ایک ایسی قوم ہے جو ملائکہ کی عبادت کرتی ہے، یعنی وہ اپنے عقل سے ملائکہ کی تصویریں اور تمثیل بنا لیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ...... نعوذ باللہ!...... یہ ہمارے چھوٹے چھوٹے خدا ہیں۔ اور انہوں نے کہا: صابئین قبلہ کی طرف نماز بھی پڑھتے ہیں اور پانچ نمازیں بھی پڑھتے ہیں تو زیاد نے ارادہ کیا کہ ان پر سے جزیہ معاف کر دوں، لیکن بعد میں ان کو پتہ چلا کہ یہ تو ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں، یہ تو مشرک ہیں۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ صابئین کا فرقہ عراق کے اندر ایک مقام ہے وہاں یہ رہنے والے تھے اور یہ تمام انبیاء کو مانتے تھے۔ وہ ہر سال میں تیس دن کے روزے رکھتے تھے اور جانب یمن نماز بھی پڑھتے تھے۔

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ ﴿وَالصّٰبِئِیْنَ﴾ کس کو کہتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: صابی ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو اللہ کو مانتا ہو، توحید کا اقرار کرتا ہو، لیکن کسی شریعت و دین پر عمل نہ کرتا ہو اور کفر بھی نہ کرتا ہو۔

عبدالرحمن بن زید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ دین والے تھے، موصل میں رہتے تھے اور صرف توحید کا اقرار کرتے تھے لیکن نہ کسی کتاب پر ایمان رکھتے تھے، نہ کسی نبی پر اور کسی شریعت پر۔ یہی وجہ تھی کہ مکہ کے کافروں میں سے جب کوئی اسلام لاتا تو اس کو کہتے کہ یہ بھی "صابی" ہو گئے، کیونکہ وہ سنتے تھے کہ یہ بھی لا الٰہ الا اللہ پڑھتے ہیں جیسے صابئین لا الٰہ الا اللہ کا کلمہ پڑھتے تھے۔

خلیل نے کہا ہے کہ ان صابئین کا دین ایسے تھا جیسے نصاریٰ کا دین ہے، لیکن ان کا عقیدہ یہ تھا کہ قبلہ جنوب کی

طرف ہوتا ہے۔ وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم نوح علیہ السلام کے دین پر ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ یہ یہود اور مجوس کی طرح ملے جلے قسم کے لوگ ہیں، کچھ یہودیت سے نکلے اور کچھ مجوسیت سے نکلے۔ ان کا ذبیحہ نہیں کھانا چاہئے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کرنا چاہیے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان تمام اقوال کو اگر سامنے رکھا جائے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ توحید کے ماننے والے تھے، لیکن ان میں یہ بیماری تھی کہ وہ ستاروں کو مانتے تھے، یعنی ستارہ پرست قوم تھی کہ فلاں ستارہ فلاں برج میں چلا گیا اور فلاں ستارہ فلاں برج میں چلا گیا۔ جیسے آج مسلمانوں میں بھی یہ ہے کہ خدا کا کلمہ بھی پڑھتے ہیں اور باقاعدہ ہفتہ وار رسالوں میں چھپتا ہے کہ تمہارا برج اسد ہے، تمہارا برج کون سا ہے؟ تمہارا شمس ہے، قوسِ قزح ہے، تمہارے لیے یہ ہفتہ کیسے ہوگا؟

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صابئین وہ قوم تھی جو ستاروں کی عبادت کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہی ستارے ہمارا قبلہ ہیں اور یہی ہماری دعاؤں کا ذریعہ ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ خدا پر تو ہمارا ایمان ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے سارے اختیارات ان تاروں کو دے دیئے ہیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جیسے ابراہیم علیہ السلام کی قوم "کشرانیین" کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ اب سارا امر اور تفویض تاروں کے پاس ہے، اب تمام نظامِ عالم کے چلانے والے ہی سیارات ہیں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر غور کریں تو سب سے بہتر قول وہ ہے جو حضرت مجاہد رحمہ اللہ اور وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم تھی جو نہ یہود کے دین پر تھی، نہ نصاریٰ کے دین پر اور نہ ہی مجوس و مشرکین کے دین پر تھی۔ وہ اپنے اپنے خیال میں بس ایک دین پر جمع ہوتے تھے، ان کا کوئی مقرر دین و شریعت نہیں تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ صابی وہ لوگ ہیں جن کے پاس کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی، یعنی وہ کلمہ تو پڑھتے رہے، اللہ کی توحید کا اقرار تو کرتے رہے، لیکن ان کے پاس کسی کی نبوت نہیں پہنچی، کیونکہ ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ۝﴾ [بنی اسرائیل: ۱۵] تو صابی کا اصل معنی یہ ہے کہ جو دینوں کو چھوڑ کر نکل جائے اور بغیر دین کے اپنا طریقہ بنائے، یعنی یہودیت کو چھوڑ کر نکل گیا تو صابی ہے، نصرانیت کو چھوڑ کر نکل گیا تو صابی ہے، مجوسیت کو یا مشرکین کو چھوڑ کر نکل گیا، ان سب پر صابی کا اطلاق ہوگا۔

باقی امام صاحب رحمہ اللہ نے جو فتویٰ دیا ہے تو امام صاحب رحمہ اللہ کا فتویٰ ان صابی لوگوں کے بارے میں ہے جو

اہل کتاب ہیں، یعنی وہ اگر کسی کتاب پر قائم ہیں تو ان اہل کتاب کے بارے میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے اجازت دی ہے کہ ان کا ذبیحہ بھی حلال ہوتا ہے اور اہل کتاب کی لڑکی سے نکاح بھی جائز ہوتا ہے۔ وَ اللّٰهُ تَعَالٰی أَعْلَمُ وَ عِلْمُهٗ أَتَمُّ. [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰۴، البقرۃ: الآیۃ: ۶۲]

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ؕ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخٰسِرِينَ ۝﴾ [البقرۃ: ۶۳، ۶۴]

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر طور پہاڑ کو اُٹھایا کہ جو کتاب ہم نے تمہیں دی ہے، قوت کے ساتھ پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے یاد رکھو، تاکہ تم بچ جاؤ۔ پھر تم اس عہد کے بعد پھر گئے۔ پس اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور تباہ ہو جاتے۔

صورتِ واقعہ:

ان آیات میں پھر بنی اسرائیل کو خطاب ہوا کہ یاد کرو وہ وقت کہ جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور ہم نے تمہارے اوپر طور پہاڑ کو اُٹھایا، حکم دیا کہ پکڑو جو حکم ہم نے تم کو دیئے ہیں تورات میں قوت اور طاقت سے، صحیح نیت سے اور اس کو یاد کرو، پڑھو اور عمل کرو جو اس کے اندر ہے، تاکہ ہو جاؤ تم بھی اللہ سے ڈرنے والوں میں سے۔ پھر تم پھر گئے اس کے بعد، پھر تم نے منہ موڑا اس عہد کے بعد۔ اگر اللہ کا فضل اور اللہ کی رحمت شاملِ حال نہ ہوتی تو تم ہمیشہ خسارے والوں میں ہو جاتے۔

''میثاق'' کا معنی ہوتا ہے: پختہ عقد، پکا عہد۔ دراصل بنی اسرائیل نے خود یہ مطالبہ کیا تھا کہ اللہ سے دعا کریں کہ اللہ پاک ہمیں کوئی شریعت و کتاب عطا فرمائیں۔ ہم آپ کا حکم تو مانتے ہیں، لیکن ہمارے پاس کوئی دستور و قانون نہیں ہے، ہم بے آئین، بے دستور قوم ہیں۔ کوئی ایسی جامع کتاب ہو جس میں ہر چیز واضح ہو اور ہم اس پر عمل کریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے بندو! میں اللہ کا نبی ہوں، جو اللہ حکم دیتا ہے میں وہ پہنچا دیتا ہوں۔ انہوں نے کہا: وہ تو ٹھیک ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر باقاعدہ ایک کامل مکمل کتاب ہو اور اس میں تمام

احکام و مسائل واضح لکھے ہوئے ہوں تو بڑی آسانی ہوگی اور ہم اس پر عمل کریں گے۔

موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و فضل سے موسیٰ علیہ السلام کی دعا منظور فرمالی اور حکم دیا کہ جبل طور پر آجاؤ اور وہاں تیس دن ورات روزہ رکھو، تنہائی میں بیٹھ کر عبادت کرو، تاکہ تم کتاب کا تحمل کرنے کے لیے پہلے تیار ہو جاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام جبل طور پر اللہ کی عبادت کے لیے تشریف لے گئے۔ جب تیس دن پورے ہو گئے تو اللہ نے حکم دے دیا کہ دس دن مزید پورے کرو ﴿فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِۦٓ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً﴾ [الاعراف:۱۴۲] تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس راتیں پوری کیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے کامل، مکمل کتاب تورات عطا فرمائی۔

تورات ایک ہی دفعہ پوری مکمل لکھی ہوئی دی گئی اور تورات بھی اللہ کی ایک عظیم کتاب تھی جو ایک جامع، مانع، کامل، مکمل شریعت اور اس زمانہ کے حالات کے مطابق تھی۔ جب بنی اسرائیل کو تورات مل گئی تو انہوں نے کہا کہ تورات ہمیں مل گئی ہے، اللہ کی کتاب ہے اور اللہ نے آپ سے کلام فرمایا ہے۔ ہم بھی سننا چاہتے ہیں کہ اللہ ہم سے بھی کلام کرے، ہم سے بھی بات کرے، کم از کم ہم سن تو لیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم ہے کہ یہ میری کتاب ہے۔ تو ستر آدمی کو لے کر گئے تو انہوں نے اللہ کا کلام بھی سن لیا۔ اس کے بعد پھر اکڑ گئے ﴿لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى ٱللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ ٱلصَّٰعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ﴾ [البقرۃ:۵۵] تو انہوں نے جب یہ گستاخی کی تو اللہ کا حکم ہوا اور بجلی گری تو سب کے سب ختم ہو گئے۔

اب موسیٰ علیہ السلام سجدے میں گر گئے کہ اے اللہ! یہ پوری بنی اسرائیل کے منتخب لوگ تھے، انہوں نے واقعی غلطی کی، زیادتی کی، گستاخی کی۔ اگر یہ لوگ مر گئے تو میرے لئے بڑی مشکلات ہو جائیں گی۔ آپ مہربانی فرمائیں تو اللہ نے ان کو پھر زندہ کر دیا۔ ﴿ثُمَّ بَعَثْنَٰكُم مِّنۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ [البقرۃ:۵۶] اب وہ تورات لے کر واپس آگئے، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تم نے خود مانگی تھی، اب تم اس کتاب تورات پر عمل کرو۔ کہنے لگے: یہ تو بڑا مشکل ہے، اس کے حکم تو بہت سخت ہیں، ہم سے تو اس پر عمل نہیں ہوسکتا۔ جیسے آج کل بعض مسلمان کہتے ہیں کہ قرآن کے احکام سخت ہیں کہ انسان کا ہاتھ کاٹ دو، یہ جنگل کا قانون ہے۔ اگر ایک آدمی نے غلطی کی، اس سے زنا ہو گیا تو وہ آخر انسان ہے، اس کی اتنی بڑی سخت سزا ہے کہ اس کے لیے گڑھا کھود کر اس میں اس کو پتھر مار مار کر ہلاک کردو۔ یہ تو بڑا مشکل مسئلہ ہے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا زہر کھانے کا واقعہ:

حضرت خالد بن ولید رحمہ اللہ نے جب پورے روم کو فتح کر لیا اور روم کا ایک بڑا کرنل تھا جو ان کی فوج کی کمان کر

رہا تھا، وہ بھی قید ہو کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قید میں آ گیا۔ چونکہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اسلام کے عظیم سپاہی تھے، بطل اسلام تھے؛ انہوں نے اس قیدی کو جنگی اصولوں کے مطابق آرام سے رکھا، اپنے خیمے کے ساتھ اس کو خیمہ دیا اور اس کا خیال رکھتے۔

ایک رات حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھا تھا، اس نے کہا: اے خالد! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں کہ آپ فاتح ہیں، میں آپ کا قیدی ہوں، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے اور جنگوں میں فتح و شکست ہوتی رہتی ہے، لیکن جس بے جگری اور جس بہادری اور جس جنگی تکنیک سے تم نے جنگ لڑی ہے، میرے دل میں تمہارا احترام اتنا بڑھ گیا ہے کہ جس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ تم مسلمانوں کے عظیم ہیرو ہو اور میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ میرے علاقے میں ایک خطرناک زہر ہوتی ہے اور یہ اپنے دشمنوں کو کسی طرح کھانے میں، چائے میں، شربت میں ملا کر دے دیتے ہیں اور آدمی ہلاک ہو جاتا ہے۔ میرا علاقہ اس معاملہ میں بڑا خطرناک ہے، لہٰذا خیال رکھنا کہ کبھی میرے ملک کے کسی آدمی کے ہاتھ سے کھانے پینے والی چیز نہ لینا۔ اپنے لوگوں کے ہاتھ سے کھانا، میں نہیں چاہتا کہ میرے محسن کو کوئی خبیث زہر دے کر مار ڈالے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ وہ زہر کیا بلا ہوتی ہے؟ اس نے کہا کہ بس ایک معمولی سا پاؤڈر ہے، اس کا ایک قطرہ بھی اندر چلا جائے تو آدمی مر جاتا ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ وہ تمہارے پاس بھی ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں! میرے پاس بھی ہے اور اپنی انگوٹھی کے اوپر سے نگینہ نکالا تو نیچے سے وہ پاؤڈر نکل آیا۔ اس نے کہا کہ ہمارا ہر بڑا افسر اس زہر کو اپنے پاس رکھتا ہے کہ اگر ہم قید ہو جائیں اور بچنے کی کوئی امید نہ رہے اور اس سٹیج پر پہنچ جائیں کہ ہمیں راز اُگلنے پڑیں تو ہم زہر کھا کر مر جاتے ہیں، تاکہ اپنے ملک کے راز نہ نکالیں تو وہ زہر میرے پاس بھی ہے۔ آپ نے پوچھا کہ کتنے سے آدمی مر جاتا ہے؟ اس نے کہا کہ ایک قطرہ کھا لے تو مر جاتا ہے۔ یہ جو میری انگوٹھی میں ہے، اس سے کئی آدمی مر سکتے ہیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پانی ساتھ رکھا ہوا تھا اور اس انگوٹھی کو لے کر سارا زہر منہ میں ڈال دیا اور کہا کہ ''بِاسْمِ اللّٰهِ رَبِّ الْأَرْضِ وَالسَّمَاءِ، بِاسْمِ اللّٰهِ الَّذِي لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ دَاءٌ'' اب وہ جرنیل دیکھ رہا ہے کہ ابھی گرے اور ابھی مرے، لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ٹھیک ٹھاک کھڑے ہیں۔ اس کرنل نے پوچھا کہ یہ تم نے کیا پڑھا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا ہوا ہے کہ ہر چیز سے پہلے یہ پڑھ لو تو کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ میں نے اس کو پڑھ لیا ہے تو نقصان ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارا زہر ہمارا کیا کرے گا؟ جس خدا نے اس زہر کو پیدا کیا

ہے، اس خدا سے تو میں نے پناہ مانگی ہے کہ اس ذات کے نام کے ساتھ میں پناہ پکڑ رہا ہوں، جس کا نام آ جائے تو دنیا کی کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی، وہ سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے۔ میں شوق سے پی رہا ہوں یا اپنے ایمان اور یقین کو بڑھانے کے لیے پی رہا ہوں۔[معرفۃ الصحابۃ لابی نعیم، حدیث: ۲۳۹۴، خَالِدُ بْنُ الْوَلِيدِ الْمَخْزُومِيُّ...]

جب آدمی اس مقام پر ہو جائے کہ جہاں زہر اثر نہ کرے، جہاں دریاؤں پر گھوڑے دوڑا دیں تو دریاؤں پر سڑکیں بن جائیں، وہاں ہمیں کیا ضرورت ہوگی کہ ہم سود لیں؟۔ سود کے بغیر ہم کیسے زندہ رہیں گے؟ ربوا کے بغیر ہم کیسے زندہ رہیں گے؟ یہ بالکل وہی حال ہے جو بنی اسرائیل کا تھا۔ آج ہمارا حال وہی ہو چکا ہے، بلکہ ہم ......نعوذ باللہ!......ان سے بھی گر گئے ہیں۔

طور پہاڑ کو بنی اسرائیل پر کھڑا کرنے کا واقعہ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: تم نے تو خود کتاب مانگی تھی، اب اللہ نے کتاب دی ہے تو تم انکار کر رہے ہو۔ انہوں نے کہا: کیا کریں، اس پر تو عمل نہیں ہو سکتا؟ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے عرض کیا کہ انہوں نے خود کتاب مانگی تھی، اب یہ لوگ تو پھر گئے ہیں۔ اللہ نے حکم دیا: اے جبرائیل! جبل طور کو اُٹھا کر ان کے اوپر کھڑا کرو۔ جبرائیل علیہ السلام نے پہاڑ اُٹھا کر قوم بنی اسرائیل پر کھڑا کر دیا۔ اب جب انہوں نے پہاڑ کو دیکھا تو کہا کہ یہ کیا ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر نہیں مانو گے تو یہ تمہارے اوپر آ رہا ہے۔ اب سب سجدے میں گر گئے اور اوپر دیکھ رہے ہیں کہ قریب ہے یا دور ہے؟ کہنے لگے: ہم مانتے ہیں، مہربانی کرو۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تورات پر عمل کرنا بڑا مشکل ہے!؟ انہوں نے کہا: مرنے سے تو بہتر ہے۔ یہ جو اوپر سے پہاڑ گرے اور ہم سارے ایک منٹ میں مر جائیں تو اس سے تو اس تورات پر عمل کرنا بہتر ہے۔ اسی واقعہ کو ان آیات کے اندر بیان کیا گیا ہے۔

پہاڑ حقیقتاً کھڑا ہو گیا تھا:

بعض اُردو کی تفسیر لکھنے والے علماء نے غلطی کی، اللہ ان کی اور ہماری غلطیوں کو معاف فرمائے۔ ﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ کہ پہاڑ طور کو ان کے اوپر لا کر کھڑا کرنا، یہ حقیقت نہیں تھی، بلکہ یہ ایسے ہے کہ ان کے اوپر مثالی طور پر ایک پہاڑ، ایک سایہ بادلوں کی طرح کھڑا کر دیا جائے اور انہیں ڈرایا جائے کہ اگر نہیں مانو گے تو یہ تمہارے اوپر گر جائے گا، وگرنہ حقیقتاً وہ جبل طور نہیں تھا۔



ان مفسرین کو یہ مغالطہ اس لیے لگا کہ اللہ نے دوسری سورت میں ارشاد فرمایا: ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ......... الآیۃ﴾ [الاعراف:۱۷۱] ''وَاقِعٌۢ بِهِمْ'' کہ جب ہم نے پہاڑ کو ان کے اوپر کھڑا کر دیا، وہ ایسا تھا کہ گویا ان کے اوپر خیمہ سایہ کیے ہوئے ہے۔ ان کو ایک یہ مغالطہ لگا کہ ''كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ'' گویا کہ وہ ایک سائبان ہے، لہٰذا وہ حقیقت نہیں۔ اور دوسرا ان کو یہ مغالطہ لگا ﴿وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ﴾ اور انہیں گمان ہوا کہ یہ ہم پر گرنے والا ہے۔ یہ بھی ان کا خیال اور گمان تھا، حقیقت نہیں تھی۔ اور تیسری غلطی ان سے یہ ہوئی کہ انہوں نے قرآن میں پڑھا ہے کہ ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ڐ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ [البقرۃ:۲۵۶] دین میں کوئی زبردستی نہیں کہ آدمی تلوار اٹھالے کہ کلمہ پڑھتے ہو یا ماردوں؟ اس لیے انہوں نے کہا کہ یہ جو اوپر پہاڑ حقیقتاً کھڑا کر دیا جائے اور کہا جائے کہ مانو، نہیں تو پہاڑ گراتے ہیں۔ یہ تو اکراہ و جبر ہو گیا، جبکہ اسلام میں جبر نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان کو غلطی لگی اور کہا کہ حقیقتاً اس پہاڑ کو اٹھایا نہیں گیا تھا، بلکہ ایسا انتظام کر دیا کہ قوم یوں سمجھے کہ پہاڑ ہم پر گر پڑے گا، حقیقتاً پہاڑ ان پر نہیں گر رہا تھا اور نہ پہاڑ ان کے اوپر تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام یا دین میں جبر نہیں، یعنی کافر کو ہم زبردستی کلمہ پڑھوائیں، اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی کہ کافر پر ہم ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جائیں کہ کلمہ پڑھو، اس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ دلائل موجود ہیں، عقل کے ساتھ وہ خود سمجھ لیں۔ لیکن اگر مسلمان ہونے کے بعد پھر وہ انکار کرے تو اس کو اسلام پر قائم رکھنے کے لیے جبر ہوگا۔ یہاں بھی بنی اسرائیل اب مسلمان تو نہیں ہو رہے تھے کہ اللہ نے پہاڑ کھڑا کر دیا کہ ایمان لاتے ہو تو ٹھیک ہے، وگرنہ ہم پہاڑ گراتے ہیں: وہ پہلے سے تو مسلمان تھے اور انہوں نے تورات خود مانگی تھی، لیکن مانگنے کے بعد عمل نہیں کر رہے تھے۔ جیسے آج کوئی مسلمان دین پر عمل نہ کرے، شراب پیے تو اس کو کوڑے ماریں گے، زنا کرے تو رجم کریں گے، یہ اکراہ نہیں ہے۔ دین میں اکراہ علیحدہ چیز ہے اور دین کو قبول کرنے کے بعد حکم نہ ماننا علیحدہ چیز ہے۔ جیسے آپ کسی کالج میں داخلہ لینا چاہتے ہیں تو وہ کہتے ہیں: داخلہ لیں یا نہ لیں، یہ آپ کی مرضی ہے، لیکن جب آپ نے داخلہ لے لیا، فارم بھر دیا اور ان کے قوانین کو قبول کر لیا تو اب ان قوانین کی پابندی کرنا تمہارے ذمہ لازمی ہے۔ کیا اسلام نے کبھی یہ مطالبہ کیا ہے کہ یہودی، نصرانی زنا کر رہے ہیں، ان کو بھی پکڑ کر رجم کر دو؟ اسلام نے یہ سزا ان کے لیے رکھی ہے جس نے قرآن کو مان لیا ہے۔ تو اب جرم پر سزا قبول کرو۔

دوسرا ان مفسرین کو یہ مغالطہ لگا کہ ﴿كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ﴾ گویا کہ وہ ایک سائبان تھا۔ یہ مثال تب ہوتی جب ''رَفَعْنَا بِهٖ'' ہوتا۔ جب ''رَفَعَ'' بھی موجود اور ''نَا'' سے اس کی نسبت بھی اللہ کی طرف ہے اور لفظ ''فَوْقَ'' بھی ہے تو خود سمجھ آرہا ہے کہ وہ پہاڑ کا اُٹھایا جانا حقیقی تھا، مثال نہیں تھی، کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہو رہا تھا۔ اس لیے قرآن نے فرمایا: ﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾۔

باقی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنا بڑا پہاڑ اُٹھایا کیسے گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اُٹھانے والا بندہ نہیں تھا، وہ تو جبرائیل علیہ السلام تھے، ان کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ انہوں نے لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں اُٹھائیں اور آسمانوں تک لے گئے تو ایک پہاڑ کو اُٹھانا کون سا مسئلہ تھا۔

اگر یہ مثال ہوتی تو ﴿فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [البقرۃ: ٦٤] تو فضل اور رحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہ حقیقتاً پہاڑ تھا۔ اللہ نے فرمایا: اگر میرا فضل نہ ہوتا اور میری رحمت نہ ہوتی، میں تمہاری توبہ منظور نہ کرلیتا تو پہاڑ تمہارے اوپر گرجاتا اور تم کفر کی حالت میں مرجاتے، لیکن میں نے پھر بھی رحمت کی کہ پہاڑ ہٹا لیا اور تمہاری توبہ قبول کرلی۔

اسلام پر عمل کو قربِ قیامت مشکل سمجھا جائے گا:

اسی لیے میرے آقا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ایک وقت آئے گا، میری امت کے لوگ کلمہ بھی میرا پڑھنے والے ہوں گے، قرآن کی تلاوت بھی کریں گے، لیکن قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا۔

[صحيح البخاري، حديث: ٦٩٣١، باب: قتل الخوارج والملحدين]

اسی طرح حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ ان کا قبلہ معاملات کے اندر عورتیں بن جائیں گی، ان کا دین ان کے دینار بن جائیں گے، ان کے جو بڑے بڑے سردار ہیں وہ شریر ہوں گے اور ان پر جو حاکم ہوں گے وہ ظالم ہوں گے، ان پر ظلم کرنے والے ہوں گے۔ اور حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ پیسہ ان کا سب سے بڑا مرکز توجہ بن جائے گا کہ پیسہ کمانا چاہیے، چاہے حرام سے ملے، چاہے منشیات اور ہیروئن بیچ کر ملے، لوگوں کے معصوم بچے قتل کر کے اور اغواء کر کے ملے۔ فرمایا: جب یہ وقت آجائے گا تو پھر قبر میں دفن ہوجانا زندہ ہونے سے بہتر ہوگا۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ جب تمہارے غنی بخیل بن جائیں، یعنی تمہارے پیسے والے لوگ بخیل بن

جائیں، اگر وہ چاہیں تو اپنے الیکشن میں کروڑوں روپے خرچ کر دیں، لیکن ان کے ڈیرے پر مسجد ویران پڑی ہوئی ہوگی، مسجد میں کبھی دس روپے بھی نہیں لگا سکتے۔ وہ اگر چاہیں تو اربوں روپے خرچ کر دیں، لیکن انہوں نے کبھی اپنے محلے میں بیوہ عورت کو وظیفہ نہیں دیا، کبھی کسی یتیم کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا، کبھی کسی غریب کے گھر آ کر عید کے دن بھی کھانا نہیں پہنچایا کہ ان کا کم از کم عید کا دن اچھا گزر جائے۔ میرے آقا ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے اغنیاء بخلاء بن جائیں، جب تمہارے حاکم برے لوگ بن جائیں اور جب تمہارے علماء حق کہنا چھوڑ دیں، بلکہ وہ بھی دنیا کی رو میں بہہ جائیں، اور وہ بھی چلتے چلتے اسی رنگ میں رنگ جائیں، صرف عوام کو دھوکہ دینے کے لیے ایک چادر لپیٹ لیں اور اسلام کو ڈھال بنانا شروع کر دیں تو فرمایا کہ جب وہ وقت آ جائے تو آدمی کا مرجانا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

قربِ قیامت اسلام کا نام باقی رہے گا:

اور اس طرح میرے آقا ﷺ نے فرمایا کہ قربِ قیامت اسلام باقی نہیں رہے گا، مگر نام کا، جب نام پوچھو گے کہ کون ہو؟ تو کہے گا کہ میں تو...... ماشاء اللہ...... مسلمان ہوں۔ اس سے پوچھیں کہ نماز پڑھتے ہو؟ تو کہے گا کہ نہیں۔ روزہ رکھتے ہو؟ تو کہے گا کہ کبھی کبھی رکھ لیتا ہوں۔ عید کی نماز پڑھتے ہو؟ ہاں! موقع مل جائے تو پڑھ لیتے ہیں۔ اچھا عید کی رکعتوں اور جنازے میں کیا فرق ہے؟ تو جواب دے گا کہ جیسے لوگ پڑھتے ہیں تو ہم بھی پڑھ لیتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ اسلام کا صرف نام باقی رہ جائے گا۔ اور قرآن باقی نہیں رہے گا، مگر کتابوں میں لکھا ہوا ہوگا کہ سونے کے پانی سے قرآن کو لکھیں گے، چاندی کے پانی سے قرآن کو لکھیں گے، سونے کی تاروں سے قرآن کو لکھا جائے گا اور کروڑوں روپے خرچ کیے جائیں گے، لیکن قرآن پر عمل کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

[مشکاۃ المصابیح، حدیث:۲۷۶، کِتَابُ العِلْمِ، اَلفَصلُ الثَّالِث]

قرآن کی فریاد:

اسی لیے حدیث پاک میں آتا ہے، حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت والے دن اللہ کا قرآن اللہ کی بارگاہ میں استغاثہ پیش کرے گا: ﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا﴾ [الفرقان:۳۰] کہ اے پروردگار عالم! یہی تیرے بندے ہیں جنہوں نے مجھے اپنے گھروں سے نکال دیا تھا، مجھے اونچے طاقوں پر سجا دیا تھا، کبھی میں دھو دھو کر پلایا جاتا تھا اور کبھی میں میت پر پھرایا جاتا تھا اور کبھی میں قسموں اور حلفوں کے

لیے بازاروں میں منگوا کر سروں پر اُٹھایا جاتا تھا، لیکن مجھ پر عمل کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائیں گے: تُو میرا کلام ہے، تُو میری کتاب ہے، تُو میرا قرآن ہے۔ جس نے تمہیں چھوڑا ہے، آج اس کی سزا جہنم ہے۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے حق میں فیصلہ فرمادیں گے۔

دعا کرو قیامت والے دن قرآن ہماری سفارش کرنے والا بنے، قرآن ہم پر دعویٰ کرنے والا نہ بن جائے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے کمالات:

ان آیات میں اللہ پاک نے بنی اسرائیل کے ایک اور واقعہ کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت اور حکومت کا زمانہ تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے بڑی شان والے پیغمبر اور بادشاہ بھی تھے۔ اللہ نے جتنے نبی بھیجے بعض کو نبوت کے ساتھ بادشاہی بھی عطا فرمائی، جن میں حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، ان کو نبوت بھی ملی اور تخت بھی ملا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے خود اختیار دیا۔ اللہ نے فرمایا: جبرائیل! میرے نبی سے جا کر پوچھو کہ کیا پسند کرتے ہو کہ ہم نبوت و رسالت کے ساتھ تمہیں بادشاہ بھی بنادیں یا تم یہ چاہتے ہو کہ رسالت و نبوت کے ساتھ صرف اللہ کے شکر گزار بندے بنو؟ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے تخت و حکومت نہیں چاہیے، میں تو خدا کا شکر گزار بندہ بننے پر راضی ہوں۔ مجھے صرف نبوت و رسالت کا جو مقام ملا ہے، وہ بہت بڑا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خود اپنی منشاء سے اختیار فرمایا، ہمارے آقا سردار دو جہاں نے، افضل الانبیاء نے فقر کو اختیار کیا اور ہم دنیا میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی دنیا قبول فرمالیتے تو پتہ نہیں کہ اُمت کا کیا حال ہو جاتا؟

اس لیے حضرت سیدنا داؤد علیہ السلام کو اللہ نے سب سے بڑا معجزہ یہ دیا تھا کہ ان کو ایسی آواز عطا فرمائی اور آپ کی زبان مبارک میں ایسا اثر رکھا تھا کہ جب آپ زبور کی تلاوت فرماتے تھے تو پرندے اُڑتے ہوئے رُک جاتے تھے، دریاؤں کی موجیں تھم جاتی تھیں اور جب آپ اللہ کا ذکر شروع کرتے تو پہاڑ بھی آپ کے ساتھ ذکر میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی آواز میں ایسی تاثیر رکھی کہ پتھر بھی موم ہو جاتے، دریا اپنی روانی کو بھول جاتے، پرندے اپنی اُڑان کو بھول کر کھڑے ہو جاتے، جب تک حضرت پڑھتے رہتے، پرندے اوپر سایہ کر کے کھڑے ہوتے۔

[روح البیان: ۱/۳۹۲، البقرۃ: الآیۃ: ۲۵۱]



اللہ نے ان کو دوسرا معجزہ یہ عطا فرمایا تھا: ﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ؕ یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَالطَّیْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ﴾ [سبا:١٠] کہ اللہ نے ان کے ہاتھ میں لوہے کو نرم کر دیا۔ ہم لوہے کو آگ میں ڈال کر نرم کرتے ہیں، لیکن داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں اللہ نے لوہا ایسا نرم کر دیا کہ جہاں سے پکڑتے، اس کو موڑ دیتے اور جہاں سے چاہتے اس کو توڑ دیتے اور جہاں چاہتے جوڑ دیتے تھے اور جنگ میں جو زرہ پہنی جاتی ہے، اس کے موجد حضرت داؤد علیہ السلام ہیں، کیونکہ پہلے زمانے میں تلواروں، نیزوں اور تیروں سے جنگ ہوتی تھی تو زرہیں بنتی تھیں، کڑے لگا لگا کر قمیص بنائی جاتی تھی اور وہ پہن لی جاتی تھی، تا کہ سینہ تیرے لگنے سے محفوظ ہو جائے۔

جیسے آج کل بلٹ پروف جیکٹ ہوتے ہیں۔ یہ اندر سے پہن لیتے ہیں، تا کہ خدانخواستہ کوئی دشمن گولی مارے تو گولی اثر نہ کرے۔ بہر حال جیسے جیسے دنیا میں چیزیں ایجاد ہوتی جا رہی ہیں، اسی طرح کے توڑ بھی بنتے جا رہے ہیں۔ اس زمانہ میں زرہ استعمال ہوتی تھی، سب سے پہلے زرہ بنانے والے حضرت داؤد علیہ السلام ہیں۔

جیسا کہ سب سے پہلے لکڑی کا کام کرنے والے حضرت نوح علیہ السلام ہیں کہ جنہوں نے کشتی بنائی۔ اور دیکھ لو! دنیا ہزار ترقی کر لے، ہزار علوم کے عروج پر پہنچ جائے، لیکن آج اگر آپ بحری جہاز بناتے ہیں تو آپ کو شکل وہی رکھنی پڑتی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام نے رکھی تھی، یعنی اس کا انداز وہی ہوگا، چاہے چھوٹی بنائیں یا بڑی بنائیں۔ اب آپ چاہے اس کا نام جہاز رکھ دیں کہ بڑے بڑے جہاز بنا کر اندر انجن لگالیں، لیکن آپ مجبور ہیں کہ آپ اس کے علاوہ شکل نہیں بنا سکتے۔

اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام نے جو زرہ بنائی تھی، آج آپ جتنی چاہیں بلٹ پروف جیکٹس بنالیں، لیکن جیسے زرہ سینے پر پہنی جاتی تھی، شکل وہی رہے گی۔

اسی طرح حضور ﷺ کے زمانہ میں سر پر ''خود'' پہنی جاتی تھی، آج بھی اسی طرح وہ ''خود'' پہنی جاتی ہے۔ آپ اس کی شکلیں لاکھ بدلتے رہیں، لیکن انداز وہی ہے جو ابتداء میں اللہ کے پیغمبروں نے اختیار کیا تھا۔

تو یہ واقعہ جو آپ اس آیت میں پڑھ رہے ہیں، حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے کا ہے۔

﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِی السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕیْنَ﴾ [البقرۃ:٦٥]

''اور تم خوب جان چکے ہو تم میں سے جنہوں نے ہفتہ کے دن زیادتی کی تھی، ہم نے ان سے کہا تھا کہ ذلیل ہونے والے بندر بن جاؤ۔''



ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار کی ممانعت:

اس دور میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ تم ہفتے میں جب چاہو مچھلی کا شکار کرسکتے ہو، لیکن ''یوم السبت'' یعنی ہفتے کا دن چونکہ عبادت کا دن ہے اور آدمی اگر شکار میں کھو جائے تو وہ عبادت نہیں کرسکتا، لہٰذا ''سبت'' والے دن شکار بند ہے، آگے پیچھے ایام میں شکار کرو، مچھلی پکڑو اور دریاؤں سے فائدہ اُٹھاؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو بتلا دیا کہ ہفتے والے دن شکار نہیں کھیلنا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، اللہ کا حکم ہوگیا ہے۔

اب جب کچھ دن گزرے تو انہوں نے کہا کہ عجیب بات ہے! اللہ کو کیا منظور ہے کہ ہفتے والے دن شکار نہ کرو؟ آخر کیا وجہ ہے؟...... کیونکہ ان کے دماغ میں اپنی آزادی کلبلائی کہ ہر آدمی اپنی رائے میں آزاد ہے، جو چاہے کرے۔ یہ کیا پابندی ہوگئی کہ اس دن شکار کرو اور اس دن نہ کرو۔ ہم کیسے یہ پابندیاں قبول کرلیں؟ اب اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو آزمائش میں ڈالا...... اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہوئی کہ اللہ نے مچھلیوں کو حکم دے دیا کہ جب ہفتے کا دن آئے تو سطح سمندر پر آجاؤ اور باقی دن تم دریا کی تہہ میں رہو۔ اب جب بنی اسرائیل ہفتے کے دن آتے تو ان کا بڑا جی للچاتا کہ دیکھو! آج تو مچھلیاں بھی بہت ساری ہیں اور باقی دنوں میں تو مچھلیاں ہمیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔

اب انہوں نے ایک حیلہ نکالا کہ جو نہریں بہتی تھیں، ان کے قریب چھوٹی چھوٹی ندیاں اور نالے بنالیے اور آگے بڑے بڑے حوض بنادیئے اور ایک آدمی کو بٹھادیتے کہ جب وہ پانی اور مچھلیاں اس حوض میں بھر جائیں تو تم اس کو ایک پتھر رکھ کر بند کردو۔ لہٰذا ہفتے والے دن حوض میں مچھلیاں بھر جاتیں اور اتوار کو جاکر وہ پکڑ لیتے کہ ہفتے والے دن تو شکار نہیں کیا، ہم نے تو اتوار کو جاکر شکار کیا ہے۔ بنی اسرائیل نے اللہ کے قانون کو توڑنے کا ایک راستہ بنادیا۔

آج کل دولتمندوں کا ظلم:

جیسے آج بڑے آدمی، جتنے بڑے سرمایہ دار ہیں، جتنے بڑے جاگیردار ہیں، وہ کہتے ہیں کہ واقعی زنا تو حرام ہے، لیکن نکاح کرنا تو جائز ہے۔ چنانچہ لڑکی کو بلایا اور اپنے دو نوکر بھی بٹھالیے اور مفت کی روٹیاں توڑنے والے مولوی کو بلاکر کہتے ہیں کہ مہربانی فرمائیں، یہ لڑکی ہے اور ہم نے نکاح کرنا ہے، کیونکہ حضرت ہم زنا سے ڈرتے ہیں، زنا حرام ہے، جہنم کی سزا ملتی ہے تو اس مولوی نے نکاح پڑھادیا۔ یہ نہیں پوچھا کہ لڑکی کون ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟ اس کا

باپ کہاں ہے؟ اس کا ولی کہاں ہے؟ اس کا وارث کہاں ہے؟ اور یہ کس کے حکم سے نکاح ہو رہا ہے؟ کون نکاح کرنے والا ہے؟ حق المہر کیا ہے؟ شرائط کون کون سی ہیں؟ بس نکاح پڑھا دیا اور کہا کہ حضرت! مبارک ہو۔ اس ظالم نے پندرہ بیس دن اس بچی پر ظلم کیا اور اس کے بعد اس کو چھوڑ دیا۔ اور اس کے بعد ایک اور بچی آگئی تو مولوی صاحب پھر نکاح پڑھنے کے لئے آگئے، کیونکہ مولوی صاحب کو تو ہر نکاح پر پیسہ ملتا ہے، وہ کیوں انکار کرے؟ اس لئے مولوی صاحبان کبھی یہ بھی نہیں دیکھتے کہ قادیانیوں کا نکاح پڑھ رہے ہیں، کس کا نکاح کس وجوہ کی بناء پر پڑھ رہے ہیں؟ خدا کے بندو! پہلے اس سے اس کا عقیدہ تو پوچھو کہ تمہارا عقیدہ کیا ہے؟ جب اگلا آدمی ہی مسلمان نہ ہو تو نکاح پڑھنے کا کیا معنی ہے؟

بنی اسرائیل تین حصوں میں منقسم ہوگئی:

بنی اسرائیل کے تین حصے ہوگئے: ایک حصہ ایسا جو اُن کو کہتا کہ ایسا نہ کرو، اللہ کے حکم کو مذاق نہ بناؤ، اللہ کی نافرمانی نہ کرو، لیکن وہ نہ مانتے۔ اور ایک جماعت ایسی تھی جو کہتے کہ چھوڑو، یہ مانتے تو ویسے بھی نہیں، اس لئے تم اپنا کام کرو۔ جیسے آج کل بعض لوگ بڑے نیک ہوجاتے ہیں کہ چھوڑو قوم مانتی تو نہیں ہے، بس اپنی نماز روزے کی فکر کرو۔ حالانکہ یہ کوئی نیکی نہیں ہوتی کہ اگر قوم نہ مانے تو تم نہ روکو۔ علماء نے لکھا ہے کہ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہیں۔ اگر وہ نہیں مانتے تو نہ مانے۔ یہ نہیں کہ ہم بھی خاموش ہو کر بیٹھ جائیں اور حق کا کلمہ چھوڑ دیں۔ اگر لوگوں نے اللہ کے دین کو چھوڑا ہے تو ہم بھی اگر اللہ کے دین کو چھوڑ دیں تو فرق کیا رہ جائے گا؟

بعض بنی اسرائیل کی شکلیں مسخ کر دی گئیں:

تو اب بنو اسرائیل کی قوم تین حصوں میں منقسم ہوگئی۔ بہر حال یہ ہوتا رہا اور جب قوم اپنی بے حیائی کی بالکل انتہاء پر پہنچ گئی تو اللہ نے فرمایا: ﴿كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾ [البقرة: ٦٥] سب بندر بن جاؤ۔ تو جب وہ شام کو سوئے تو انسان تھے اور صبح کو جب اُٹھے تو بندر بنے ہوئے تھے۔ مرد بندر بن گئے اور عورتیں بندریاں بن گئیں۔

اس کے بعد مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ تین دن تک اسی بندر کی حالت میں رہے اور تین دن کے بعد اللہ کا عذاب آیا اور سارے کے سارے مر گئے، ختم ہوگئے، اس کے بعد پھر ان کی نسل نہیں چلی۔

اس لئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان بندر کیسے بن گیا؟ بھائی! تم تو ڈارون کا نظریہ مانتے ہو کہ پہلے انسان بندر

تھا، پھر ترقی کرتے کرتے انسان بن گیا۔ اگر بندر ترقی کرتے کرتے انسان بن جاتا ہے تو پھر تنزلی کرتے کرتے بندر بھی تو بن سکتا ہے۔ اگر تم ڈارون کے کہنے پر بندر کو انسان بنا سکتے ہو تو کیا ہم اللہ کا فرمان چھوڑ دیں؟ اللہ نے ہی انسانوں کو بندر بنا دیا اور: ﴿وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ﴾ [ابراہیم: ۲۰] اللہ تبارک وتعالیٰ کے آگے یہ بات کوئی مشکل نہیں ہے، وہ چاہیں تو انسانوں کو حیوان بنا دیں، وہ چاہیں تو حیوانوں کو انسان بنا دیں۔ اس چیز کو ''مسخ'' کہتے ہیں، یعنی شکل کا بدل جانا۔

مسخ کی تین قسمیں:

علماء نے لکھا ہے کہ مسخ تین قسم پر ہے: ایک تو مسخ حقیقی ہوتی ہے کہ گوشت تھا، لیکن اللہ کے عذاب سے پتھر بن گیا، یہ حقیقی مسخ ہے۔ اسی طرح گوشت پوست کا انسان دریا میں داخل ہوا تو انسان تھا، جب غرق ہوا تو انسان تھا، ڈوب رہا تھا تو انسان تھا اور ڈوبنے کے بعد جب اللہ نے اس کی لاش کو باہر پھینکا تو وہ پتھر کی لاش بن گئی۔ یہ مسخ حقیقی ہے۔

اور دوسرا مسخ صوری کہ شکل بدل گئی کہ پہلے انسان کی شکل تھی، اب بندر کی شکل بن گئی۔ اس میں عقل اور سمجھ موجود ہے، اس کے اندر انسانی ادراک اور سمجھ کی ساری قوتیں موجود ہیں، لیکن اس کی شکل تبدیل ہوگئی ہے، یہ مسخ صوری ہے۔

تیسری قسم مسخ معنوی ہے کہ آدمی کی شکل بھی انسان کی ہے، صورت بھی انسان کی ہے، لیکن اس کے عمل ایسے ہو گئے ہیں جیسے حیوانوں والے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ کوئی درندہ انسان کو دیکھے تو اس کو چیر پھاڑ کر جاتا ہے، اسی طرح یہ بھی انسانوں کو قتل کر ڈالتا ہے، یہ بھی انسانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کروا دیتا ہے۔ کتنے ایسے انسان ہیں جنہیں انسانوں کو قتل کرنے میں لذت ملتی ہے، جو انسانوں کے خون بہانے میں خوش ہوتے ہیں، انسانوں کے قتل کے اندر انہیں بڑی آسائشیں ملتی ہیں، ان کو ذہنی تسکین ملتی ہے۔

تو بنی اسرائیل کا مسخ صوری تھا، ان کی شکلیں بندر اور بندریوں کی بنا ڈالیں، لیکن ان کی عقل اسی طرح قائم رہی۔ اس لیے قرآن پاک نے اگلی آیات میں جو صیغے استعمال فرمائے، اس میں عقل والوں کے لیے جمع کا صیغہ ''خٰسِئِيْنَ'' آیا ہے، ''یاء'' اور ''نون'' کے ساتھ جمع ذوی العقول کے لیے ہوتی ہے۔ اور اسی طرح جب اللہ نے حکم دیا: ﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ﴾ [البقرۃ: ٦٥] اس کے اندر بھی وہ حکم ہے جو ذوی العقول کو دیا جاتا ہے کہ

ذلیل وخوار ہو کر بندر ہو جاؤ۔

"نَكَالًا" اس کا معنی ہے: عذاب، عبرت اور تماشہ کہ ان سے آگے والی بستیاں، ان سے پیچھے والی بستیاں، آنے والے لوگ اور گزرنے والے لوگ سب کے لیے ہم نے ان کو عذاب کا نمونہ بنا دیا۔ اور اس عذاب دینے کا مقصد ہے: ﴿هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ﴾ [آل عمران: ۱۳۸] کہ جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں وہ ان واقعات سے عبرت پکڑیں، ان واقعات سے نصیحت پکڑیں اور کبھی ایسا کام نہ کریں جو اللہ کی نافرمانی والا ہو۔

تو ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی اسرائیل کی بدعملی، عہد شکنی، اللہ کے قوانین کو توڑنے کے حیلے اور بہانے اور پھر ان کا انجام کار بتلا کر اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ کو تنبیہ کی ہے کہ وہ ایسا نہ کریں۔

اللہ سے کیے گئے خاص اور عام عہد

ایک عہد وہ ہے جو تمام دنیا سے تھا، عالم اَرواح کے اندر لیا گیا۔ ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِينَ﴾ [الاعراف: ۱۷۲] سب نے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا تھا کہ آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ بعض عہد ہیں جو خاص ہیں۔ جیسا کہ تمام انبیاء سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے عہد لیا تھا کہ آپ میرے پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بشارت کرتے رہیں اور اعلان کرتے رہیں اور ان کے آنے کے بارے میں اپنی اپنی امتوں کو خبر کرتے رہیں۔

اسی طرح جب بنی اسرائیل نے مطالبہ کیا تھا کہ اے اللہ! ہمیں کتاب اور ایسی جامع دستاویز دیں کہ اس پر ہم عمل کریں۔ تو اللہ نے ان سے عہد لیا اور جب ان کو تورات مل گئی تو وہ یہ عہد بھول گئے۔

ان واقعات کے اعادہ کا مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ حضور ﷺ کے زمانے میں تو موجود نہیں، لیکن جو موجود تھے، ان کو بتلایا جا رہا ہے کہ تمہارے آباء واجداد نے بھی ایسا کیا اور ہلاک ہوئے۔ تم ایسا نہ کرو کہ حضور ﷺ کے ساتھ عہد کرتے ہو اور پھر توڑ دیتے ہو۔ تم بھی اپنے باپ، دادا کے طریقوں پر نہ چلو۔ اسی طرح اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ہدایت کی گئی کہ تم بھی بنی اسرائیل کی طرح نہ کرنا۔

اللہ کی کتاب پڑھنے کے اثرات:

تو اللہ نے حکم فرمایا کہ ہم نے تم کو جو کتاب دی ہے، اس کو طاقت کے ساتھ پکڑو، یعنی اس پر عمل کرو۔ یہ نہیں کہ

کتاب کو طاقت کے ساتھ پکڑلو، سینے سے لگالو، لیکن عمل نہ کرو۔ اور جو کچھ کتاب کے اندر ہے، اس کو بار بار یاد کرتے رہو، پڑھتے رہو، تاکہ تم بھی ڈرنے والوں میں سے ہوجاؤ۔ کیونکہ جب اللہ کی کتاب پڑھی جاتی ہے، اللہ کا قرآن پڑھا جاتا ہے تو اس کا دل پر ایک خاص اثر ہوتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے رحمت نازل ہوتی ہے، دل میں خشوع وخضوع پیدا ہوتا ہے اور آدمی ڈرنے والوں میں شامل ہوتا ہے۔

طور پہاڑ:

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس پہاڑ سے مراد ''طور'' پہاڑ تھا۔ وہ اُٹھا کران کے سروں کے اوپر کھڑا کردیا گیا تھا۔ جبل طور مشہور پہاڑ ہے اور اس پہاڑ کو اللہ نے بڑا شرف بخشا ہے، اسی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے اور اسی مقام پر اللہ سے انہوں نے کلام فرمایا اور یہی وہ مقام ہے جہاں پر اللہ نے اپنی خصوصی تجلی فرمائی اور یہی وہ مقام ہے جہاں پر اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو معجزات عطا فرمائے اور یہ وہی مقام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی چالیس راتیں عبادت کی اور یہی وہ مقام ہے جہاں وہ اپنی قوم کے سرداروں کو لے کر آئے تھے اور اسی پہاڑ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُٹھا کران پر کھڑا کردیا اور جب انہوں نے معافی مانگ لی اور اقرار کرلیا تو پہاڑ پھر اپنی جگہ پر آگیا۔

کیا طور پہاڑ سرمہ بن گیا؟

بعض لوگوں نے یہ لکھ دیا کہ یہ سرمہ جو ہم استعمال کرتے ہیں، یہ سرمہ اس جبل طور کا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تھی: ﴿رَبِّ أَرِنِيٓ أَنظُرْ إِلَيْكَ﴾ کہ پروردگار عالم! میں دیکھنا چاہتا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَن تَرَىٰنِي وَلَٰكِنِ ٱنظُرْ إِلَى ٱلْجَبَلِ فَإِنِ ٱسْتَقَرَّ مَكَانَهُۥ فَسَوْفَ تَرَىٰنِي﴾ کہ تم اس پہاڑ کے اوپر دیکھو۔ اگر یہ پہاڑ میری تجلی برداشت کرسکتا ہے تو پھر ایک انسان بھی برداشت کرسکتا ہے اور اگر اتنی صلب، طاقت والا پہاڑ متحمل نہیں ہوسکتا تو پھر ایک عاجز انسان کیسے متحمل ہوسکتا ہے؟ تو قرآن کہتا ہے: ﴿فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُۥ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُۥ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ أَفَاقَ قَالَ سُبْحَٰنَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا۠ أَوَّلُ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۝١٤٣﴾ [الاعراف: ۱۴۳] اللہ پاک نے جب اس پہاڑ پر تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کردیا اور اس کے بعد موسیٰ بھی بے ہوش ہوکر گر گئے۔ تو اس لیے بعض لوگوں نے سرمہ کا مسئلہ نکال لیا۔ حالانکہ سرمہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اس پورے پہاڑ کو



ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ پہاڑ کے کسی حصہ پر یہ واقعہ پیش آیا۔ پہاڑ تو بڑے لمبے ہوتے ہیں، بڑے طویل ہوتے ہیں، بعض پہاڑوں کے سینکڑوں میلوں تک سلسلے پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ تو اسی طرح اب بھی دنیا میں طور سینا موجود ہے، وہ علاقہ موجود ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ وہ سرمہ بن گیا تھا اور ہم جو سرمہ پہنتے ہیں، اسی پہاڑ کا حصہ ہے۔ یہ بالکل جھوٹی روایات ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ نے جب تجلی فرمائی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ کتنا حصہ ریزہ ریزہ ہو گیا؟ دایاں، بایاں، خلف، قدام، یہ قرآن نے ذکر نہیں فرمایا۔ صرف یہ ارشاد فرما دیا: ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا﴾ [الاعراف: ۱۴۳]

اور فرمایا: ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ﴾ [الاعراف: ۱۷۱] کہ اس کوہِ طور کو ان کے اوپر اُٹھایا گیا تو جب وہ سرمہ بن گیا تھا تو پھر اس جبل طور کو اُٹھائے جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس لیے ہمیشہ یہ بات یاد رکھیں کہ آدمی اللہ کے قرآن میں کبھی جسارت نہ کرے، یعنی آدمی کبھی یہ نہ کرے کہ اپنی عقل وفکر کی سطح پر اللہ کے قرآن میں قطعاً کوئی بات کہے۔ اللہ کے قرآن کے ہم پابند ہیں کہ جو ہمیں حضور پاک ﷺ نے پڑھایا ہے اور سمجھایا ہے، اس سے ہم اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتے، کیونکہ قرآن نازل بھی حضور ﷺ پر ہوا۔ اور اللہ نے میرے مدنی پاک کے سینے میں جمع فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے ہی قرآن کی تفسیر حضور ﷺ کو پڑھائی اور حضور ﷺ نے صحابہ کو پڑھائی۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ جیسے جیسے مسئلے پیش آتے گئے، جدید علماء کرام ان سے استنباط کرتے گئے، لیکن اسی قرآن کے حکم کی روشنی میں کہ قرآن کا کوئی حکم نہیں ٹوٹے گا، اصل حکم برقرار رہے گا، اس کی بنیادی حیثیت برقرار رہے گی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

اسی سے اگر بعض مسائل سمجھے گئے تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک آدمی نے سوال کیا کہ اے علی! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ حضور ﷺ نے آپ کو کوئی خاص چیز لکھ کر دی تھی اور وہ آپ نے اپنے پاس رکھی ہوئی ہے اور کسی پر آپ ظاہر بھی نہیں فرماتے۔ وہ کیا چیز ہے؟ تو اسی بات کو ان لوگوں نے لیا ہے کہ وہ حضور پاک ﷺ کی وصیت تھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وصی رسول اللہ ہیں کہ آپ ﷺ نے وصیت فرما دی کہ میرے بعد تم خلیفہ ہو اور جو تم پر ایمان نہیں لائے گا تو اس کا میرے اوپر بھی کوئی ایمان نہیں ہے۔ تو یہ وصیت نامہ لکھا ہوا حضرت

علی رضی اللہ عنہ کے پاس تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو چھپا کر تلوار کے نیام کے اندر رکھا ہوا تھا لیکن آپ کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت ان کے پاس موجود تھی۔

تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی سوال کیا گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کوئی ایسی خاص چیز عطا فرمائی ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کے بندے! ہمیں اللہ کے پاک نبی نے کوئی ایسی خاص چیز عطا نہیں فرمائی ہے۔ یہ دیکھو کہ جو کاغذ میرے پاس ہے، اس میں زکوٰۃ کے احکام لکھے ہوئے ہیں کہ اونٹوں کی کتنی زکوٰۃ ہے؟ اور بکریوں کی کتنی زکوٰۃ ہے؟ بیل اور گائے میں کتنی زکوٰۃ ہے؟ تاکہ میں وہ بھول نہ جاؤں۔ ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ قرآن سب نے پڑھا ہے، لیکن اللہ نے فہم کسی کو زیادہ دیا ہے، ورنہ اللہ کے قرآن کے سوا ہمارے پاس کچھ نہیں ہے اور کوئی وصیت نہیں ہے۔ [صحیح البخاری، حدیث ۱۱۱، باب: كِتَابَةِ الْعِلْمِ]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی تردید فرمائی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی فرمادیا کہ ہاں! مگر سمجھ، وہ سب کو مختلف دی ہے کہ سو یا پچاس طالب العلم ہوتے ہیں، لیکن ان میں ایک طالب العلم ہے جو ماشاء اللہ! زیادہ ذکی ہے، اس کو اللہ پاک نے زیادہ قرآن کی سمجھ عطا فرمائی ہے۔ اسی طرح ہر دور میں ہر محدث، ہر مفسر کے پاس، ہر عالم کے پاس جب ان کے شاگرد آتے تھے تو جو طالب العلم ان میں بہت زیادہ ذکی اور ذہین ہوتے ہیں تو استاد ان شاگردوں پر فخر کرتے ہیں کہ فلاں میرا طالب ہے، میرے پاس پڑھا ہے۔ تو استاد اس کی فہم پر فخر کرتا ہے۔

تو بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمیں کوئی وصیت وغیرہ نہیں دی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی فرمادیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں کوئی وصیت نہیں ہے اور نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ پر کوئی وصیت پیش کی اور نہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر کوئی وصیت پیش کی، نہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر کوئی وصیت پیش کی۔ چلو یہ لوگ بہانہ بناتے ہیں کہ اس وقت ڈر تھا کہ تقیہ کرتے رہے اور چھپاتے رہے، لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خود خلیفہ بن گئے تو اس وقت لوگوں کو دکھا دیتے کہ میرے پاس وصیت تھی، میں تو ڈرتا تھا کہ میں کیا کروں، میں مسلمانوں کو لڑانا نہیں چاہتا تھا، اس لئے میں نے ظاہر نہیں کی تھی۔

چودہ سو سال کے بعد ان لوگوں نے وہ وصیت پڑھ لی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے پاس نہیں ہے۔ اب کیا کریں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سچا مانیں یا چودھویں صدی کے ایک ذاکر کو سچا مانیں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو ہم سچا مانیں یا چودھویں صدی کے ذاکر کو سچا مانیں؟



ایصالِ ثواب کا مسنون طریقہ:

وعلیکم السلام کا معنی دعا ہے۔ہم جو آپس میں السلام علیکم کہتے ہیں، یہ بھی دعا ہے کہ تم پر اللہ کی طرف سے سلامتی ہو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکات ہوں۔تو جب ہم قبرستان میں بھی کہتے ہیں: السلام علیکم کہ ان پر بھی اللہ کی طرف سے سلامتی اور رحمتیں نازل ہوں۔

اسی طرح صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رات کو دیکھا کہ حضور ﷺ میرے حجرے میں نہیں ہیں تو میں آپ کو ڈھونڈتے ہوئے چل نکلی۔ میں نے آکر دیکھا کہ آپ ﷺ جنت البقیع کے قبرستان میں ہیں اور ان کے لیے دعا کررہے ہیں۔بی بی صاحبہ فرماتی ہیں کہ میں بھی پیچھے چھپ کر کھڑی ہوگئی اور آمین، آمین کہہ کر حضور ﷺ کی دعا میں شریک ہوگئی۔اگر دعا منع ہوتی تو حضور پاک ﷺ قبرستان میں کھڑے ہوکر دعا نہ فرماتے۔

[صحیح مسلم، حدیث:۹۷۴]

اسی طرح حضور پاک ﷺ نے حکم دیا ہے کہ جب کسی مردے کو قبر میں دفن کرلو اور مٹی اوپر ڈال دو تو فرمایا کہ یہی وقت ہے بندے سے سوال وجواب کا۔تم اپنے بھائی کے لیے دعا مانگو، اللہ تعالیٰ اس کو سوال وجواب میں ثابت قدم رکھے۔

لہٰذا دعا مانگنا منع نہیں ہے۔لیکن یہ جو ہمارے ہاں رواج ہے کہ جب بڑا آدمی مرگیا تو حافظ کرائے پر بٹھادیئے، ختم پڑھ رہے ہیں۔اور غریب مرجائے تو اس کو غسل دینے والا، جنازہ پڑھنے والا بھی کوئی نہیں، جنازے کو کندھا دینے والا بھی کوئی نہیں۔بڑا آدمی مرجائے، چاہے ڈاکے میں مرجائے، چاہے قاتل ہونے کی وجہ سے پھانسی چڑھ جائے یا زنا میں مرجائے تو اس کے لیے ہزاروں آدمی جنازے پر آئے ہوئے ہیں۔

یہ جو ہم نے رواج بنائے ہوئے ہیں کہ اچھا اب قبرستان میں چھولے لے کر آؤ، ان گندم لے کر آؤ، اب مٹھائیاں لے کر آؤ، وہاں تقسیم کریں گے اور وہاں پتاشے لے کر آؤ، وہاں ڈالیں گے، یہ ساری بدعات ہیں۔باقی آپ دعا کریں، آپ خیرات کریں، روزانہ اپنے گھر میں خیرات کرو۔تمہارے والدین فوت ہوگئے، ان کے لیے مسجد بنادو، ان کے لیے کوئی مدرسہ بنادو، ان کے لیے کوئی یتیم خانہ کھول دو اور ان کے لیے کوئی پانی کے مستقل کنویں لگوادو کہ جب تک وہ مسجدیں، مدرسے اور کنویں چلتے رہیں گے تو اس وقت تک تیرے باپ دادا کو ثواب

پہنچتا رہے گا۔ خیرات سے کوئی منع نہیں کرتا۔

افضل الایام کون سا دن ہے؟

جتنی اُمتیں گزری ہیں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک دن مقرر فرمایا۔ جیسے یہودیوں کے لیے ''یوم السبت'' یعنی ہفتہ کا دن تھا، عیسائیوں کے لیے ''یوم الأحد'' یعنی اتوار کا دن تھا اور اللہ تعالیٰ نے اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لیے ''یوم الجمعة'' کا دن مقرر فرمایا۔ اسی طرح حضور ﷺ نے ایک حدیث مبارک میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جمعہ کا دن خاص طور پر اللہ نے میری اُمت کے لیے محفوظ کر کے رکھ دیا تھا۔ یہودیوں نے ''سبت'' کو اختیار کیا تو ان کو ''سبت'' کی تعظیم کا حکم دیا گیا اور نصاریٰ نے ''یوم الأحد'' کو اختیار کیا تو انہیں اس دن کی تعظیم کا حکم دیا گیا، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک ایسا دن جو ''أفضل الأيام'' ہے، اس کو اُمتِ محمدیہ ﷺ کے لیے باقی رکھا۔

جمعہ کے دن کی فضیلت:

اور اسی طرح احادیث مبارکہ میں آتا ہے: ''سَيِّدُ الْأَيَّامِ يَوْمُ الْجُمُعَةِ، فِيهِ خُلِقَ آدَمُ، وَفِيهِ أُدْخِلَ الْجَنَّةَ''[1] اللہ تبارک وتعالیٰ نے جمعہ کے دن ہی حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور جمعہ کے دن کی آخری چند گھڑیاں جب باقی تھیں تو اس وقت حضرت آدم علیہ السلام میں رُوح پھونکی گئی اور وہ زندہ ہو گئے اور مکمل انسان بنے۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کو جنت میں داخلے کا حکم اسی جمعہ کے دن ملا اور اسی طرح آسمان سے دنیا کی طرف اُترنے کا حکم بھی جمعہ کے دن ہوا۔ اور اسی طرح فرمایا گیا کہ قیامت جب قائم ہوگی تو وہ بھی جمعہ کا دن ہوگا۔

اس لئے اس دن کے بڑے فضائل وخصائل ہیں۔ چونکہ سب سے افضل اُمت حضور ﷺ کی اُمت تھی، اس اُمت کو کعبہ بھی اللہ نے افضل عطا فرمایا، کتاب بھی افضل عطا فرمائی، شریعت بھی افضل عطا فرمائی، نبی اور رسول بھی افضل عطا فرمایا اور چھٹی کا دن بھی سب سے افضل عطا فرمایا۔

سزا ایسی کہ ظاہراً بندر اور باطناً انسان:

تو اب یہودیوں نے ''سبت'' کے دن شکار کرنے کے لیے حیلہ نکالا کہ بعض لوگ کنڈیاں اور رسیاں ڈال دیتے کہ مچھلیاں تو ان میں پھنس جائیں، لیکن ہفتے کو نہیں پکڑیں گے، بلکہ جب رات ہو جائے گی تو جا کر پکڑ لیں گے۔

---

[1] [شعب الایمان، حدیث: ۲۷۱۰]



پھر وہ مچھلی پکاتے تو خوشبو دور تک جاتی، ارد گرد کے لوگ پوچھتے کہ آپ نے مچھلی کہاں سے لی؟ وہ ان کو بتاتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ بات اتنی پھیلی کہ ممانعت کے دن مچھلی بازاروں میں فروخت ہونے لگی۔

اللہ نے ان کو سزا بھی ایسی دی کہ شکل تو بندر کی تھی، لیکن وہ حقیقتاً تو بندر نہیں بنے تھے۔ چونکہ انہوں نے بھی تو اسی طرح اللہ کے حکم کو توڑا تھا کہ بظاہر وہ یہ کر رہے تھے کہ ہم تو خدا کے حکم کو نہیں توڑنا چاہتے، ہمیں تو اللہ نے منع فرمایا ہے کہ ''سبت'' کے دن میں شکار نہ کرو، ہم تو اتوار کی رات میں شکار کرتے ہیں، ''سبت'' کو شکار نہیں کرتے، ہم اللہ کے حکم کو مان رہے ہیں۔ تو اللہ نے ان کو سزا بھی یہی دی کہ ظاہری طور پر بندر بنا دیا اور باطنی طور پر انسان رہے۔ اس لیے ان کی شکلیں تبدیل ہو گئیں۔

اب بعض لوگ ...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ!...... مستشرقین اور خاص طور پر یہودی لابیاں جتنی ہیں یا جتنی نصرانی لابیاں ہیں اور ان کے پروردہ لوگ قرآن کی آیات میں اشتباہات پیدا کرتے ہیں کہ دیکھو! یہ کہتے ہیں کہ ان کو کہا: بندر بن جاؤ تو وہ بندر بن گئے۔ یہ کیسے ہے؟ یہ تو ایسے ہے جیسے بس کسی کو ڈانٹ دیا جائے کہ تم تو بندر ہو۔ جیسے کوئی آدمی اپنے شاگرد کو کہتا ہے کہ تمہیں اتنا عرصہ ہو گیا ہے، تم انسان نہیں بنے، تم گدھے کے گدھے رہ گئے ہو۔ تو وہ کہتے ہیں کہ یہ ضروری تو نہیں ہوتا کہ وہ گدھا ہو، حالانکہ وہ انسان کی حقیقت میں ہوتا ہے، لیکن اس کے اعمال گدھوں کے مشابہ ہو جاتے ہیں، اس لیے اس کو کہہ دیا جاتا ہے کہ اتنا عرصہ ہم نے تمہیں انسان بنانے کی کوشش کی ہے، لیکن تم اسی طرح گدھے کے گدھے ہی رہے۔ جیسے عام طور پر آدمی محاورات میں کہتا ہے کہ اتنا بڑا اونٹ جتنا قد نکال لیا ہے، لیکن ابھی تمہیں پیشاب کرنے کا طریقہ بھی نہیں آتا ہے۔ تو انہوں نے کہا یہ محاوراتی باتیں ہیں، کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مگر اللہ کے ہاں کیا مشکل ہے۔

اس سے بعض لوگ جنہوں نے قرآن کے ترجمے لکھے ہیں اور تفسیریں لکھی ہیں، اس میں وہ بھی بے چارے دھوکہ کھا گئے ہیں کہ طور پہاڑ کو ان پر حقیقتاً کھڑا نہیں کیا گیا تھا، بلکہ گویا ایسا سماں بنا دیا گیا کہ وہ یہ سمجھیں کہ طور اوپر آ پڑے گا، لیکن حقیقتاً وہ پہاڑ نہیں کھڑا کیا گیا تھا۔

یہ سب جہالت کے کرشمے ہیں، اللہ کے قرآن وحدیث کا علم نہ ہونے کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ وگرنہ وہاں بھی جب ''رَفَعَ'' کا صلہ ''اِلٰی'' آ جائے تو حقیقی رفع مراد ہوتا ہے، مثالی یا مجازی رفع مراد نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشادِ

باری تعالیٰ ہے: ﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۚ وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يَبُورُ ﴿١٠﴾﴾ [فاطر:۱۰] اور اسی طرح فرمایا: ﴿وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ﴿١٥٧﴾ بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿١٥٨﴾﴾ [النساء:۱۵۷،۱۵۸] اور اسی طرح اللہ پاک نے واضح فرمادیا: ﴿بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ﴾ اور پھر جب رفع بھی معلوم ہوا اور نزول بھی معلوم ہو تو پھر نزول کے مقابلہ پر جب رفع ہو تو وہاں رفع حقیقی مراد ہوتا ہے، یعنی جب آقائے نامدار، خاتم الانبیاء ﷺ نے فرمادیا کہ عیسیٰ علیہ السلام دمشق شہر کی جامع مسجد کے مشرقی منار پر اُتریں گے تو نزول تب ہوگا جب صعود ہو، رفع ہو، جب رفع ہی نہ ہو تو نزول کا کوئی معنی ہی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے یہ پہاڑ بھی بنواسرائیل کے سروں پر حقیقتاً کھڑا کیا گیا اور ان کو حقیقتاً بندر بنادیا گیا اور پھر وہ تین دن تک زندہ رہے اور اس کے بعد مرگئے۔

شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نزدیک انسان کی حیثیتیں:

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کا واقعہ لکھا ہے کہ (چونکہ حضور ﷺ کی اُمت پر مسخ اور خسف کا مجموعی عذاب نہیں آئے گا، معنوی طور پر مسخ موجود ہے) بعض لوگ بظاہر انسان ہیں، لیکن اندر سے وہ بندر ہیں۔ بظاہر انسان ہیں، لیکن اندر سے وہ ریچھ ہیں۔ بظاہر انسان ہیں، لیکن اندر سے درندے بن چکے ہیں۔ مسخ معنوی کی شکلیں موجود ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ جس کو چاہتے ہیں، اس کو اس بندے کی اصلیت دکھا بھی دیتے ہیں۔

بچی کو زندہ درگور کرنے کا واقعہ:

ایک دفعہ خاتم الانبیاء ﷺ نے ایک صحابی سے حال پوچھا تو انہوں نے کہا کہ حضور! ہم آپ کو کیا حالات سنائیں، زمانہ کفر میں یہ عالم تھا کہ ہم اپنی بچیوں کو زندہ درگور کردیتے تھے۔ میں اپنی بچی کو جب دفن کرنے کے لیے لے گیا اور میں اس کے لیے جب گڑھا کھود رہا تھا اور لڑکی کو کنارہ پر بٹھایا ہوا تھا، اس غریب کو تو پتہ نہیں تھا کہ یہ مجھے دفن کرے گا یا پتہ تھا، مگر ڈر کے مارے سہمی ہوئی تھی۔ حضور! جب میں وہ مٹی کدال سے نکال رہا تھا، مٹی میرے منہ پر پڑی تو بچی نے اپنی دوپٹے سے میرا چہرہ صاف کیا کہ میرے باپ کے منہ پر مٹی نہ پڑے۔ حضور ﷺ رو پڑے اور فرمایا: پھر بھی تجھے رحم نہیں آیا؟ اس پر بھی تجھے اپنی بیٹی پر رحم نہیں آیا اور تم نے اس کو زندہ دفن کردیا؟ میرے قریب سے اُٹھ جاؤ۔

سخت دل کو نرم کرنے کا طریقہ:

اسی طرح ایک صحابی حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ حضور! مجھے اپنے بچوں پر پیار ہی نہیں آتا کہ میں اپنے بچوں سے پیار کروں۔ ہر وقت ان کو ڈانٹتا رہتا ہوں، لیکن ان سے محبت نہیں کر سکتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا! تمہارا دل اتنا پتھر ہو چکا ہے۔ تو آپ ﷺ نے علاج بتا دیا کہ یتیم بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو، اللہ تعالیٰ تیرے دل کو نرم کر دیں گے۔

[مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۵۰۰۱، بابُ: الشَّفَقَةِ وَالرَّحْمَةِ...]

اسی طرح آج کل جو ہمارا نیا معاشرہ ہے، جسے لوگ آج کل مہذب معاشرہ اور ترقی یافتہ معاشرہ کہتے ہیں کہ جس میں ایک انسان کی بیوی دوسرے آدمی کے پاس جا رہی ہے اور اس کی بیوی اس کے ساتھ جا رہی ہے اور بعض کے کلب ہیں جہاں (گاڑیوں) کی چابیاں ڈبوں میں ڈال دیتے ہیں اور اندھیرے میں اس کو ہلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چابی اٹھالو۔ جس کی چابی جس کے ہاتھ میں آگئی تو وہ اس آدمی کی گاڑی اور اس کی بیوی لے کر چلا جائے گا۔ کیا یہ کسی انسان سے متصور ہو سکتا ہے کہ اپنے سامنے دوسرے کی بیوی کو لے آئے اور اس کی بیوی دوسرا لے جائے اور دوسرے کی بیوی یہ لے جائے؟

﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۶۶]
پھر ہم نے اس واقعہ کو ان لوگوں کے لیے جو وہاں تھے اور جو پیچھے آنے والے تھے، عبرت، اور ڈرنے والوں کے لیے نصیحت بنا دیا۔

یہاں مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ "وَ تَحَيَّلُوْا" (انہوں نے حیلہ کیا)۔ حیلہ کے مسئلے میں لوگ بطور خاص امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کی فقہ پر چلنے والوں کو زیادہ مورد طعن قرار دیتے ہیں کہ یہ لوگ حیلے کرتے ہیں، وہ لوگ اکثر مسائل میں حیلے سے کام لیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک حیلہ ہوتا ہے کہ اللہ کے قانون کو توڑا جائے۔ یہ حیلہ قرآن کے بھی خلاف ہے، سنت کے بھی خلاف ہے، اللہ کے رسول کے فرمان کے خلاف بھی ہے، جیسا کہ بنو اسرائیل نے خدا کے قانون کو توڑنے کے لیے حیلہ کیا۔ اب ایسا حیلہ کرنا ہی تمام ائمہ محدثین، فقہاء اور امام

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حرام ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ حیلہ کرتے ہیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا حیلہ:

حضرت ایوب علیہ السلام جب بیمار تھے اور آپ کو تکلیف تھی تو ان کی بیوی کو راستے میں ایک بزرگ کی شکل میں شیطان ملا (شیطان بھی بڑی بڑی شکلیں بنالیتا ہے، خیال کیا کرو) اور سلام کیا کہ بیٹی! کیا حال ہے؟ کیوں پریشان ہے؟ اس نے کہا: حضرت ایوب علیہ السلام کو تکلیف ہے اور میں محنت مزدوری کر کے اتنی روٹی لے جاتی ہوں کہ جس سے میاں بیوی کا گزارا ہو جائے، یا ہم بادشاہ تھے تو آج ہمیں مزدوری کر کے روٹی کھانی پڑتی ہے، اس لئے پریشان ہیں۔

شیطان نے کہا کہ کوئی مسئلہ ہی نہیں، آپ تو ایسے پریشان ہیں، آپ ہم اللہ والوں کے دروازے پر آتی نہیں ہیں۔ اس نے کہا کہ کیا کریں؟ شیطان نے کہا: حارث کے نام کی منت مان لو کہ میرے خاوند کو شفاء ہو جائے، وہ ٹھیک ہو جائے تو میں حارث کے نام پر اتنی منت مانوں گی۔ جیسے آپ نذر نیاز حسین مانتے ہیں تو بیوی صاحبہ نے کہا کہ ہم منت کس بات کی مان لیں؟ ہمارے گھر میں روٹی کھانے کو نہیں ہے اور تم کہتے ہو کہ منت مان لو؟ شیطان نے کہا کہ یہ بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں، اللہ والوں کو تو پیسوں کی ضرورت نہیں ہوتی، ان کو تو تمہاری محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ منت مان لو، چاہے کوئی چھوٹی سی چیز ہو، ایک گندم کا دانہ، اور نہ ملے تو ایک مکھی پکڑ کر اس کے نام کی مار ڈالو۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ اللہ والوں کو تو تم پر مہربانی کرنے کا ایک بہانہ چاہیے۔

بی بی صاحب بڑی خوش ہو گئیں۔ واپس آ کر حضرت ایوب علیہ السلام کو بتلایا کہ آج مجھے ایک بزرگ مل گئے تھے، انہوں نے کہا کہ حارث کی منت مان لو۔ حضرت ایوب علیہ السلام جلال میں آ گئے...... وہ تو سمجھ گئے، کیونکہ آخر نبی تھے...... انہوں نے کہا: جانتی ہو کہ حارث کس کا نام ہے؟ بی بی صاحبہ نے کہا: نہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا: وہ شیطان بدبخت تھا، جو ہمیں اللہ کا نام چھوڑ کر غیر اللہ کی منت ماننے کو کہہ رہا تھا، اور تم نے نبی کی بیوی ہو کر ایسی بات کی ہے۔ مجھے خدا کی قسم ہے! اگر اللہ نے مجھے شفا دی تو میں سو کوڑے تمہاری پیٹھ پر ماروں گا کہ تم نبی کے گھر میں آ کر غیروں کی منت کے مشورے دیتی ہو!؟ میں اللہ کا نبی ہوں اور میری بیوی کہتی ہے کہ غیر کی منت مان لو اور وہ بھی شیطان کی منت مان لوں۔ اب بیوی ڈری، اس نے کہا کہ مجھے کیا پتہ کہ وہ کون تھا، میں نے تو اس کی شکل دیکھ کر

دھوکہ کھایا ہے۔ اب حضرت ایوب علیہ السلام نے بھی تو قسم کھالی کہ واللہ! مجھے اللہ کی قسم ہے کہ تیری پشت پر سو کوڑے ماروں گا۔

اب اس کے بعد حضرت ایوب علیہ السلام نے اللہ کے آگے فریاد کی تو اللہ کے حکم سے آپ کو شفاء ہو گئی، اولاد واپس مل گئی، ملک واپس مل گیا، تخت واپس مل گیا اور آپ نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم نے میرے ساتھ بڑی وفا کی ہے، لیکن میں اللہ کا نبی ہوں، اللہ کی قسم نہیں توڑ سکتا، تمہاری پشت پر کوڑے مارنے ہیں...... آگے بھی تو حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی تھی۔ اگر آپ کی اور ہماری بیوی ہوتی تو پہلے شوہر کی کمر پر کوڑے مار دیتی ان شاء اللہ۔ اگر اس کو کوڑے نہ ملتے تو چپل تو ہیں، خاوند کو سیدھا کر دیتی ہیں، اس لئے آپ نے دیکھا ہے کہ بڑی بڑی ایڑی رکھتی ہیں...... بہر حال وہ تو نبی کی بیوی تھی، اس نے کہا: "آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا" اگر اللہ کے نبی کی بات پوری ہوتی ہے تو میری پشت حاضر ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام تیار ہوئے تو اللہ نے حکم اُتار دیا: ﴿وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهِ وَلَا تَحْنَثْ ۗ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا ۚ نِّعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾ [ص: ۴۴] اے میرے نبی! تمہاری قسم بھی ٹھیک ہے، تم بھی نہیں توڑ سکتے، لیکن تمہاری بیوی بھی میری بڑی عابدہ بندی ہے، جس نے ساری زندگی تیری خدمت میں گزار دی، اس کی پشت پر کوڑے ہم بھی برداشت نہیں کرتے۔ آپ ایسا کریں کہ کھجور کا گوشہ منگوالیں، جس پر سو لکڑی ہوں۔ آپ اس کو ایک دفعہ ماریں تو قسم پوری ہو گئی۔ تم اپنی قسم میں حانث نہیں ہو گے اور مسئلہ حل ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت ایوب علیہ السلام نے کھجور کا ایک خوشہ منگوایا جس میں سو لکڑیاں تھیں، اس کو ایک دفعہ مارلیا تو قسم پوری ہو گی۔

اب یہ حیلہ ہے، یہ کس نے سکھلایا ہے؟ اللہ نے سکھلایا ہے کہ کہاں سو کوڑے اور کہاں خوشے کی سو لکڑیاں، لیکن سو کا عدد پورا ہو گیا تو بات ختم ہو گئی۔ اللہ نے اپنے نبی کی قسم بھی پوری کر دی اور اس صابرہ بیوی کو بچالیا۔ یہ حیلہ ہے، لیکن یہ اسلام پر عمل کرنے کے لئے ہے، اللہ کے فرمان کو توڑنے کے لیے نہیں ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ:

اسی طرح قرآن پاک میں دیکھیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا کاسہ زبردستی اپنے بھائیوں کی گندم میں چھپا دیا اور جب بھائی جانے لگے تو کہا کہ ٹھہر جاؤ قافلے والو! تمہارے پاس ہماری چوری ہے۔ انہوں نے کہا: ﴿وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ﴾ (ہم چور نہیں ہیں)۔ انہوں نے کہا کہ زیادہ بات نہ کرو، ہم تمہاری تلاشی لیں گے۔ اگر ہمارے بادشاہ کا

پیمانہ تمہارے پاس ملے تو تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا کہ اگر ہمارے مل میں وہ مل جائے اور جس کے مال میں وہ تمہیں ملے، وہ تمہارا نوکر رہے گا۔ ہماری شریعت میں یہی حکم ہے۔

اب جب تلاشی لی گئی تو بنیامین کی بوری سے وہ پیالہ نکل آیا۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو! یہ پیالہ نکل آیا ہے۔ انہوں نے کہا: اب بنیامین کو لے جاتے ہیں، کیونکہ تمہارا فیصلہ ہے کہ جس کے مال سے برتن نکلے گا، وہ آدمی یہاں رہے گا۔ اللہ نے خود قرآن میں فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ﴾ [یوسف:۷۶] ہم نے یوسف کو خود یہ ترکیب سمجھائی کہ بھائی کو روکنے کے لیے ایسا کرو، تاکہ دوسروں کو یہ محسوس نہ ہو کہ بادشاہ نے زبردستی بھائی چھین لیا ہے، کیونکہ یوسف علیہ السلام بھی بادشاہ تھے، بھائی کو زبردستی ان سے لے سکتے تھے اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام خود بھی مظلوم تھے اور ان کے بھائی بھی مظلوم تھے۔ ان لوگوں نے انہیں کنویں میں ڈالا تھا، وہ زبردستی کر سکتے تھے، لیکن کہا کہ بات بھی رہ جائے اور بھائی بھی بھائی کو مل جائے۔ تو اللہ نے فرمایا: یہ طریقے ہم نے خود سکھلائے، یہ راستے ہم نے سے خود سکھلا دیئے۔

تو اس لیے یاد رکھیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہوں یا بعض ائمہ کرام جو حیلہ کے جواز کے قائل ہیں، اس سے مراد وہ حیلے ہیں جو اسلام کے قانون کو توڑنے کا ذریعہ نہ بنیں۔

آج رات جنت میں سوؤں تو طلاق:

کتابوں میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے بیٹھے بیٹھے قسم کھالی کہ اگر آج رات میں جنت میں نہ سوؤں تو میری بیوی کو طلاقیں ہیں...... بعض ایسے بے وقوف ہوتے ہیں کہ غصہ کسی پر آجائے، لیکن طلاق بیوی کو دے دیتے ہیں، باہر لڑائی ہو جائے تو باہر سے گرم ہو کر آئیں تو وہ ساری گرمی بیوی پر نکال دیتے ہیں...... جب اس آدمی کو تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا اور غصہ ختم ہوا تو اس نے کہا کہ عجیب بات ہے، میں کیسے جنت میں سو جاؤں گا؟ اب بیوی بھی گئی اور جنت بھی گئی۔ اب تو دونوں جنتیں گئیں۔ تو اب مولویوں کے پاس بھاگو۔ مشکل وقت میں بے چارے مولوی یاد آتے ہیں، مثلاً حلال، حرام میں پھنس جائیں، کوئی بندہ مرجائے، کوئی پیدا ہو جائے، پھر یہ غریب کام آتے ہیں۔

بہرصورت جب اس بندے کے دماغ میں طلاق کا خوف سمایا تو اب وہ مولوی کے پاس بھاگا۔ یہ لوگ بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں کہ حضرت! جب میں نے طلاق دی تو میں بڑے غصے میں تھا، مجھے بڑا جوش تھا۔ وہ سمجھتے ہیں

کہ اس طرح میں طلاق سے بچ جاؤں گا۔ بھلا شریف آدمی! کوئی پیار میں بھی طلاق دیتا ہے؟ طلاق جب بھی کوئی دے گا تو وہ غصہ میں ہی دے گا۔ محبت میں بھی کسی نے طلاق دی ہے؟ یہ کون سی بات ہوئی کہ تم غصہ میں تھے تو طلاق نہیں ہوئی؟

حضور ﷺ نے فرمایا:

((ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ، وَ هَزْلُهُنَّ جِدٌّ: النِّكَاحُ، وَ الطَّلَاقُ، وَ الرَّجْعَةُ.))

''تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی حقیقت بھی حقیقت ہے اور مذاق بھی حقیقت ہے: نکاح، طلاق اور رجوع۔''

[جامع ترمذی، حدیث: ۱۱۴۸، باب: مَا جَاءَ فِي الْجِدِّ وَالْهَزْلِ...]

مذاق میں نکاح کر لینا، مذاق میں طلاق دے دینا، مذاق میں طلاق رجعی کے بعد رجوع کر لینا۔ یعنی اگر کوئی ہنسی خوشی سے ایسے کہہ دے کہ آج تو میرا مذاق کرنے کا موڈ ہو رہا ہے کہ بیوی کو طلاق دیتا ہوں تو وہ شرعی طور پر طلاق ہو جاتی ہے۔ اللہ فرماتے ہیں: میں نے ایک عورت کو، ایجاب وقبول کے کلمے میں تیرے لئے حلال کر کے تیری بیوی بنا دیا ہے، تم ایسے کلمے استعمال کر کے اس کی عزت سے کھیلنا چاہتے ہو؟ اب اگر تم کھیل بھی رہے ہو تو وہ حقیقت ہے، تمہیں سزا ملنی چاہئے، اس لیے وہ طلاق ہو گئی، تا کہ آئندہ تیری زبان پر ایسے الفاظ کبھی نہ آئیں۔ تم ایک انسان کی زندگی سے کھیلتے ہو جس کو اللہ نے تیرے لیے حلال کر دیا ہے۔ مذاق کے اور بھی تو طریقے ہو سکتے ہیں، گالی دے دو، اس کو علیحدہ کمرے میں بٹھا دو، ماں باپ کے گھر بھیج دو۔ یہ تو نہیں ہے کہ تمہارے منہ سے ہر وقت طلاق کے سوا کوئی لفظ بھی نہ نکلے۔ نمک زیادہ تو طلاق، وقت پر کپڑے نہیں دھوئے تو طلاق، صبح کو ایک طلاق، شام کو ایک طلاق کہ مہینے میں اوسطاً ایک ہزار طلاق ہو جائے۔ یہ کوئی انسان کا کام ہے۔

اب بہر حال وہ آدمی ایک مولوی صاحب کے پاس پہنچے کہ میرے منہ سے یہ بات نکل گئی تو اب میں کیا کروں؟ انہوں نے کہا کہ ایک راستہ ہے کہ اگر آج تم کسی طرح مدینہ منورہ پہنچ جاؤ اور وہاں جا کر حضور ﷺ کے روضہ مبارک سے لے کر منبر تک کا جو ٹکڑا ہے، وہاں ایک منٹ کے لیے لیٹ جاؤ تو کوئی طلاق نہیں ہو گی۔ کیونکہ تمہاری قسم پوری ہو گئی کہ تم جنت میں لیٹ گئے، چونکہ وہ بھی جنت ہے۔ حضور ﷺ نے خود فرمایا: ''مَا بَيْنَ بَيْتِي وَ مِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِن رِيَاضِ الْجَنَّةِ'' میرے گھر سے لے کر منبر تک کا ٹکڑا جنت کا ٹکڑا ہے۔ اس نے کہا کہ مولوی صاحب!

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۱۹۵، باب فَضْلِ مَا بَيْنَ الْقَبْرِ وَالْمِنْبَرِ]

بات تو تمہاری ٹھیک ہے، لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب میں مدینے پہنچ جاؤں۔ تو آج رات کیسے پہنچ جاؤں؟ مولوی صاحب نے کہا کہ پھر اور کوئی حل نہیں ہے۔

وہ آدمی حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی خدمت میں بھاگتا ہوا آیا اور اپنی مشکل سامنے رکھی کہ حضرت! میں نے ایسے کہہ دیا ہے تو اس کا کوئی حل ہے؟ حضرت امام صاحب نے فرمایا: تمہارے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے؟ اس نے کہا کہ باپ تو مر گیا ہے، لیکن بوڑھی ماں زندہ ہے۔ فرمایا: اس کے قدموں میں جا کر لیٹ جاؤ تو تمہاری قسم پوری ہوگئی، کیونکہ یہ بھی اللہ نے فرمایا ہے کہ جنت ماں باپ کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے تو تم جنت میں لیٹ گئے۔

یہ وہ حیلے ہوتے ہیں کہ اس سے بیوی بھی بچ گئی اور شریعت کے خلاف بھی نہ ہوا۔ یہ وہ حیلے ہیں جو انسان کو اسلام پر قائم رکھیں، اسلام سے نکالیں نہیں۔ اس کو راستہ دے دو، ایسا نہ ہو کہ وہ بے چارا اسلام سے نکل جائے۔ ان کو شریعت نے جائز رکھا ہے جو حیلے اسلام کے قانون کو توڑنے کا ذریعہ بنیں، وہ سب کے نزدیک حرام ہیں۔ قرآن وسنت پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اور مجھے بھی توفیق دے۔

بندر بننے والوں کے واقعہ کی تفصیل:

جن لوگوں نے ''سبت'' (ہفتہ) کے دن تجاوز کیا اور اللہ کی حدود سے نکل گئے اور اللہ تعالیٰ فرمانبرداری کے بجائے مخالفت کی۔ جیسے اس واقعہ کا اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ میں بھی ذکر فرمایا ہے، لیکن یہاں اجمال ہے اور سورۃ الاعراف کے اندر یہ مفصل واقعہ موجود ہے۔

﴿وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ [الاعراف: ۱۶۳]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پَیر:

ایک دفعہ میرے پاس ایک آدمی آیا۔ اس نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پَیر لگا ہوا ہے۔ بھائی! کہاں لگا ہوا ہے؟ اس نے کہا: حرم شریف کے اندر ایک جگہ ہے، آپ چوری چوری آئیں، میں آپ کو دکھاؤں گا۔ کسی کو پتہ نہ لگے۔ میں نے اس کو کہا: پہلے یہ بتلاؤ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پَیر کو تم کیسے پہچانتے ہو؟ کیا تم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا تھا؟ اس نے کہا: نہیں دیکھا۔ میں نے پوچھا: کیا اس جگہ لکھا ہوا ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پَیر ہے؟ کہتا ہے کہ لکھا ہوا بھی

نہیں ہے۔ میں نے کہا: تم کہتے ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پیر (پاؤں) ہے اور کوئی کہہ دے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پیر ہے اور تیسرا آدمی کہہ دے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پیر ہے اور چوتھا آدمی کہہ دے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا پیر ہے تو پھر کیسے ثابت کریں گے کہ کس کا پیر ہے؟ جس کی جس سے محبت ہے، وہ اسی کا نام لے لے۔ کوئی دلیل ہے؟ کہنے لگا: دلیل تو کوئی نہیں، لیکن بس مولا علی کا پاؤں ہے۔

اب اس کا کوئی علاج تو نہیں ہے۔ خیر وہاں گئے تو کوئی پاؤں نہیں، وہ ایک سنگ مرمر کا پتھر ہوتا ہے، اس کے اندر بعض چیزیں قابلِ غور ہوتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ دریا بہہ رہا ہے اور بعض جگہ معلوم ہوتا ہے کہ درخت بنا ہوا ہے۔ یہ تو قدرتی طور پر اس کے اندر ہوتا ہے تو ایسا نشان تھا تو اس نے کہہ دیا کہ بس پاؤں ہے۔ میں نے اسے کہا کہ میں نے تمہاری ایک بات مان لی کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پاؤں ہے، ٹھیک ہے، تم سچے ہو بس۔ اب میں نے کہا کہ ذرا اس کی پیمائش کرو کہ یہ کتنا لمبا ہے؟ کہنے لگا: کس لیے؟ میں نے کہا: پاؤں بناؤ تو قد خود بخود نکل آئے گا۔ یہ تو سولہ انچ سے بھی لمبا ہے، تم کوئی ڈھیلے مولوی کے پاس تو نہیں گئے تھے کہ وہ دیکھتے ہوئے ڈر جاتا ہے، مان جاتا ہے۔ میں تو اللہ کو ماننے والا آدمی ہوں، پتھروں کو ماننے والا آدمی نہیں ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قد مبارک کتنا تھا؟ کیونکہ اگر آدمی کا قد پانچ فٹ اور پانچ انچ ہو تو اس کا پاؤں زیادہ سے زیادہ کتنا لمبا ہو سکتا ہے؟ عقل کی بات کرو کہ یا تو مجھے عقل سے سمجھاؤ یا کسی دلیل سے سمجھاؤ یا مجھے وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لکھا ہوا دکھاؤ۔ کہنے لگا کہ بس میں نے اندازۃً کہہ دیا۔ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تو نہیں دیکھا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قد کتنا لمبا تھا۔ میں نے کہا: پھر تُو نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پاؤں کیسے دیکھ لیا؟ جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تم نے دیکھا بھی نہیں تھا اور تمہیں یہ بھی پتہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کس عمر میں مکہ چھوڑ گئے تھے؟ کہنے لگا: کوئی پتہ نہیں ہے، ویسے میرے خیال میں دس بارہ سال کی عمر میں چھوڑ کر گئے تھے۔ میں نے پوچھا: دس بارہ سال کے بچے کا پاؤں کتنا ہوتا ہے؟ اور حج پر بھی میں نے اسے کہا: مجھے ایک اور بات بتلاؤ کہ یہ جس پتھر پر پاؤں آ گیا ہے، آپ کو پتہ ہے کہ یہ موجودہ زمانے کے پتھر ہیں؟ یہ تو کوئی اصلی پتھر ہے نہیں، یہ تو آرٹیفیشل ہے، اس میں کاربن ڈالا ہی نہیں گیا، وائٹ رکھا گیا ہے، تاکہ ٹھنڈا رہے۔ یہ تو بتایا گیا ہے کہ حقیقی پتھر نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے زمانے میں ابھی بنا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تو چودہ سو سال گزر گئے ہیں تو اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پاؤں کیسے آ گیا ہے؟

اب وہ ٹھنڈا ہو گیا اور کہنے لگا کہ بات تو ٹھیک ہے۔ میں نے کہا: تم لوگ اسی طرح عقیدوں کو برباد کر دیتے ہو،



کوئی نئی چیز نظر آ گئی تو دھوکے میں آ جاتے ہو۔ کسی نے کہا: پتھر میں تصویر ہے اور کسی نے کہا کہ چاند میں تصویر ہے اور کسی نے کہا: سورج میں تصویر ہے، کسی نے کہا کہ دیوار میں تصویر ہے اور کسی نے کہا: رات ایک بزرگ میرے گھر میں آئے تھے۔

یہ ایسے خیالات ہوتے ہیں جن خیالات میں آدمی سوتا ہے کبھی وہی خیالات متشکل ہو جاتے ہیں، وہی چیزیں ہمیں خواب میں نظر آ جاتی ہیں، بعض چیزیں ہمارے لاشعور میں محفوظ ہوتی ہیں، جب ہم ان کو دہراتے ہیں تو وہ لاشعور سے نکل کر شعور میں آ جاتی ہیں اور لوگ پھر ان سے غلط قسم کے اعتقادات بنانے شروع کر دیتے ہیں۔

اصحابِ کہف کا غار:

حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک جماعت جب جہاد کرتے کرتے اصحابِ کہف کے علاقے میں پہنچ گئی تو حضرت معاویہ کے دل میں بھی خیال آیا اور انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تیاری کریں اور اس غار کو ڈھونڈیں، کہیں وہ غار انہی پہاڑوں میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا: اے امیر! ایسا نہ کریں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب اپنے پاک پیغمبر کو خبر دی ہے کہ اگر تم اس غار تک پہنچ جاؤ گے اور تم دیکھو گے تو تمہارا دل خوف اور رعب سے بھر جائے گا تو پھر اس کو کیسے دیکھا جا سکتا ہے؟ اس لیے اس کو بلا وجہ ڈھونڈھنے کی ضرورت کیا ہے؟ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کے بندے! یہ تو اس زمانے کا واقعہ نقل فرمایا ہے کہ اگر کوئی ان کو اس زمانے میں دیکھتا تو اس کے دلوں میں خوف اور رعب ڈال دیا جاتا، تاکہ کوئی اندر جا کر ان کو نقصان نہ پہنچائے۔ اب تو وہ زمانہ بھی گزر گیا اور وقت بھی گزر گیا اور اس وقت تو وہ سو رہے تھے، اب تو ان پر حقیقی موت آ گئی ہے تو ہمیں دیکھنے میں کیا حرج ہے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ جس چیز کو اللہ نے پردہ دیا ہے تو اس کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بہر حال صحابہ کو شوق تھا، صحابہ چلے گئے، ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ایک غار کے قریب گئے۔ وہاں جا کر ذہنی طور پر کچھ خیال گزرا کہ یہی غار ہے۔ جب اس غار کے قریب پہنچے تو ایک ایسی اندھیری اور طوفان آیا کہ ان سب کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں تو وہ جلدی جلدی اس پہاڑ سے بھی نیچے آ گئے اور اتنے ڈر گئے کہ کافی دیر تک ان پر خوف مسلط رہا۔ انہوں نے آ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ ہمارے ساتھ تو یہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت ابن

عباس نے صحیح کہا تھا کہ ہم کو نہیں ڈھونڈنا چاہیے تھا۔ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے پردے میں رکھا ہے تو ہم بلاوجہ اس کو کیوں ڈھونڈیں؟

﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خٰسِئِينَ﴾ [البقرة:٦٥]

اللہ نے ان کو حکم دیا کہ بندر ذلیل و خوار ہو کر بن جاؤ۔

مسخ کا معنیٰ:

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو مسخ کر ڈالا تھا اور صورتاً وہ بندر نہیں بنائے گئے، بلکہ ان کے دلوں کی یہ کیفیت ہو گئی جیسے حیوانوں کے دل اور خیالات ہوتے ہیں۔ تو حضرت مجاہد رحمہ اللہ مسخ معنوی کے قائل تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا...... الآية﴾ [الجمعة:٥] کہ جن لوگوں کو ہم نے تورات کا علم دیا تھا، انہوں نے اس علم پر عمل نہیں کیا تو ان کی مثال ایسے ہے جیسے گدھا ہوتا ہے۔

(حدیث) اور دوسری نشانی ہے کہ میرے پاک نبی نے فرمایا: "مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" جب عالم علم حاصل کرے اور اس پر عمل کرے تو اللہ اس کو ایسا علم دیتے ہیں کہ وہ جانتا بھی نہیں۔ یعنی اپنے علم پر عمل کرنے سے اللہ اس کے سینے کو کھول دیتے ہیں، اللہ اس کو انشراحِ صدر عطا فرماتے ہیں، اللہ اس کو قرآن و حدیث کی ایسی فہم عطا فرمادیتے ہیں کہ عام آدمی اس بات کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔

اسی طرح دیکھیں کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے سورۃ البقرۃ ۱۲ سال میں پڑھی ہے۔ حالانکہ وہ عرب تھے، ان کے لئے پڑھنا کون سا مشکل تھا؟ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کے ایک ایک حرف پر عمل کیا ہے، ایسا نہیں کہ زبان سے پڑھی اور چلے گئے۔

[تفسير القرطبي: ١٥٢/١، سورة البقرة، تحت: الكلام في نزولها وفضلها...]

جیسا کہ ایک مثال مشہور ہے کہ ایک مولوی صاحب کتاب پڑھ رہے تھے تو ایک داڑھی والے بزرگ آئے تو پڑھانے والے ڈر گئے کہ یہ کوئی بڑا عالم آگیا ہے۔ درس بند کیا اور طالبوں سے کہا کہ حضرت کے لئے پانی لاؤ، لسی لاؤ، یہ لاؤ اور وہ لاؤ اور حضرت کو بٹھاؤ اور طالب سب کے سب حضرت کی خدمت کے لئے بھاگ پڑے تو ان

[1] [تفسير البيضاوي: ٢/ ٨٢، النساء، الآية: ٦٧]

مولوی صاحب نے پوچھا کہ حضرت! آپ کا اسم گرامی کیا ہے؟ اس نے کہا: مولبی جوسف۔ استاد نے طالب علموں کو کہا کہ سبق پڑھو، یہ تو جوسف ہے۔ جو آدمی اپنا نام نہیں جانتا تو وہ کتنا بڑا عالم ہوگا۔

حقیقتاً بندر بنائے گئے تھے:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات ٹھیک ہے اور سند پکی ہے کہ یہ قول حضرت مجاہد کا ہے، لیکن ان کا قول ظاہر قرآن کے بھی خلاف ہے اور سیاق و سباق کے بھی خلاف ہے۔ اللہ نے فرمایا: ﴿قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۭ أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٦٠﴾﴾ [المائدۃ: ٦٠] جب اللہ نے غضب کیا، جب اللہ نے لعنت کی تو اس کا معنی کیا ہوا کہ بس ان کے دل بندر کی طرح ہو گئے تھے؟ یہ بات قرآن کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ جن لوگوں پر اللہ نے غضب کیا، اللہ نے لعنت کی تو اللہ نے فرمایا کہ ان کو بندر بنا دیا، ان کو خنزیر بنا دیا اور سب سے آخری درجہ ان لوگوں کا یہ ہے کہ اپنے سوا غیروں کی عبادت کرنے والا بنا دیا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کے جو نوجوان تھے، ان کو اللہ نے بندر بنا دیا اور جو اُن میں زیادہ بوڑھے تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے خنزیر کی شکل دے دی، کیونکہ جب بوڑھا آدمی جرم کرتا ہے تو اللہ کا جلال زیادہ غضب میں آتا ہے۔ اس لیے حدیث پاک میں آتا ہے کہ سب سے بُرا شخص وہ ہے جو بوڑھا ہو جائے، لیکن پھر بھی زنا نہ چھوڑے۔ اس لیے حکم ہے کہ جب بال سفید آنے لگ جائیں تو اب تو تجھے ڈرانے والا تیرے چہرے پر آ گیا، اب تو شرم کر کہ بال سفید ہو گئے اور اب بھی تُو نہیں بدلا، اب بھی تیرے اندر جرائم وہی ہیں۔

اسی طرح شیبان النحوی نے بھی کہا ہے کہ اللہ نے حکم دیا: ﴿كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ﴾ تو وہ حقیقتاً بندر بن گئے اور بندر بن کر ایک دوسرے پر بندروں والی آوازیں نکالنے لگے اور اسی طرح خنزیروں والی آواز بھی نکالنے لگے اور اس کے بعد فرمایا کہ پہلے وہ مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں، لیکن اللہ نے ان کو حقیقتاً بدل ڈالا، ان کا چہرہ مسخ ہو گیا اور ان کی صورتیں حقیقتاً تبدیل ہو گئیں اور بندر بن گئے۔

حضرت عطاء الخراسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے بستی والوں کو حکم دیا: ﴿كُوْنُوْا قِرَدَةً﴾ تو سب کے سب بندر بن گئے۔ اب جب قوم والے گئے تو دیکھا کہ وہ سارے بندر بن چکے ہیں تو وہ ان کو کہتے: او بدبختو! ہم نے تمہیں

نہیں کہا تھا کہ اللہ کی نافرمانی نہ کرو۔ تو اب سزا مل گئی ہے؟ تو وہ سر ہلاتے کہ ہاں تم نے روکا تو تھا، لیکن ہم نے نہ مانا۔ وہ نام لے لے کر کہتے تھے کہ یا فلان! یا فلان! یا فلان! ہم نے تمہیں نہیں روکا تھا کہ خدا کے حکم کی مخالفت نہ کرو۔ اب تو انجام دیکھ لیا؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے جب ان کو مسخ کر کے بندر بنا دیا تو وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہے، بلکہ تین دن کے بعد سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ تین دن سے زیادہ مسخ شدہ قوموں کو نہیں رکھا جاتا۔ وہ ان عذاب کے دنوں میں نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں اور نہ ان کی آگے نسل بڑھائی جاتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ ہمارے ہاں بندر، خنزیر پائے جاتے ہیں، یہ تو وہ حیوان ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے۔ چھ دنوں کے اندر ساری چیزوں کو پیدا کیا، البتہ مسخ شدہ جو قوم تھی، اس کو اللہ نے تین دن کے بعد ہلاک و برباد کر دیا تھا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ ''قِرَدَةً'' کا معنی ہے کہ ذلیل وخوار ہو جاؤ۔ لیکن راجح قول پہلے والا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱۰۵/۱، البقرۃ: الآیۃ: ۶۵]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کو بھی چھٹی کے لئے جمعہ کا دن دیا تھا، لیکن انہوں نے جمعہ کا دن قبول نہ کیا اور ''سبت'' (ہفتے کا دن) قبول کیا۔ اب جب اللہ پاک نے فرمایا کہ تمہارے لیے جمعہ ہے تو انہوں نے کہا نہیں، ہم ''سبت'' لیں گے۔ انہوں نے مخالفت کی تو اللہ نے ان کو امتحان میں ڈال دیا۔ اللہ نے اس دن میں ان پر ان چیزوں کو حرام کر دیا، جو باقی دنوں میں حلال تھیں، وہ ایک ایسی بستی میں تھے جو ''ایلہ'' اور ''طور'' کے درمیان میں ہے، اس بستی کا نام ''مدین'' تھا۔ کیونکہ حدیث پاک میں آتا ہے، میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم برائی کو روکنے سے رُک جاؤ گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جب عذاب آئے گا تو تم بھی اس عذاب میں کچلے جاؤ گے اور تمہارا شمار بھی انہی میں سے ہوگا، چاہے تم نے وہ گناہ نہ بھی کیا ہو۔

یہود نے ہفتہ کا دن مانگا، کیونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جب مخلوقات کو پیدا فرمایا تو جمعہ کے دن تمام مخلوقات مکمل ہو گئیں۔ اسی وجہ سے کہتے تھے کہ چھٹی کا دن ''سبت'' ہوگا۔ تو اس لیے وہ کہتے تھے کہ ''سبت'' زیادہ بہتر ہے، کیونکہ یہ ایک ایسا دن ہے کہ کوئی کام نہیں، کیونکہ ''أحد'' سے کام شروع ہوا اور جمعہ کو جا کر کام ختم ہوا۔ تو جیسے تورات انہوں نے خود مانگی تھی اور پھر خود کہا کہ ہم سے عمل نہیں ہوتا، اسی طرح ''یوم السبت'' بھی خود مانگا۔ جب اللہ نے دے دیا تو کہا کہ نہیں، یہ ہمارے لئے بڑا مشکل ہے، کیونکہ ''سبت'' کے

دن ہی مچھلیاں ملتی ہیں اور دوسرے دنوں میں مچھلیاں نہیں ملتیں۔

آدمی جو چیز مانگ کر حاصل کرے تو اس پر اللہ تعالیٰ امتحان لیتے ہیں، اس لئے حدیث میں حکم ہے کہ اگر قاضی کا عہدہ ہو یا اور کوئی عہدہ ہو تو اس کو طلب نہ کرو۔ اس کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اگر اللہ کو منظور ہے اور اللہ نے تمہیں کچھ بنادیا ہے تو اللہ تمہاری مدد کریں گے۔ اور اگر تم اس کو خود حاصل کرو گے تو اللہ امتحان میں ڈال دیں گے اور تم مشکل میں آجاؤ گے۔

[صحیح البخاري، حدیث:٧١٤٦، باب: مَن لم يَسأَلِ الإمارةَ...]

﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ﴾ [البقرۃ:٦٥] اور آیت: ﴿وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ﴾ [الاعراف:١٦٣] حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں بستی سے مراد ''ایلہ'' کی بستی ہے اور یہی بستی ہے جو دریا کے کنارے پر واقع تھی۔

ان کے علماء نے ان کو روکا کہ تمہاری ہلاکت ہو، اللہ کے حکم کو نہ توڑو۔ تم کیا کر رہے ہو؟ خدا نے تمہیں منع کیا ہے، تم یہ کام نہ کرو۔ لیکن وہ علماء کی بات نہیں سنتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم نے تو اتوار کے دن شکار کیا ہے، ہفتے کے دن تو شکار ہی نہیں کیا۔ ان کو علماء اور فقہاء نے سمجھایا کہ ایسے حیلے بہانے نہ کرو، یہ باتیں اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ تم شکار ہفتے کے دن کرتے ہو اور تم پکڑتے اتوار کے دن ہو۔ یہ باتیں کر کے تم اللہ کے قانون کو نہ توڑو۔

علماء نے ایک تاریخی واقعہ لکھا ہے۔ اس کی حقیقت تو بہر حال اللہ جانتے ہیں کہ ایک بزرگ دریا کے کنارے بیٹھے وضو فرما رہے تھے اور جب انہوں نے پانی میں ہاتھ ڈالا تو وہاں کنارے پر ایک بچھو ڈوب رہا تھا، اس نے فوراً ڈس دیا تو بزرگ نے دیکھا کہ بچھو ہے، اگر میں اس کو نہ نکالوں تو یہ ڈوب جائے گا۔ اس کو نکالنے کے لیے ہاتھ دیں، لیکن وہ پھر ڈنک مار دے تو وہ تکلیف سے چھوڑ دیں تو وہ پھر گر جائے۔ اس کے بعد انہوں نے اس کو نکالنے کے لیے پھر ہاتھ دیا تو وہاں ایک آدمی گزرا۔ اس نے کہا کہ مولوی صاحب پاگل تو نہیں ہو گئے، جب وہ تمہیں بار بار ڈس رہا ہے تو وہ کیا تمہاری بات مانے گا؟ تم کیوں خواہ مخواہ ہاتھ دے رہے ہو۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ جب وہ بری عادت نہیں چھوڑتا تو ہم اچھی عادت کیوں چھوڑ دیں؟

بہر حال جب بنی اسرائیل نے انکار کر دیا اور علماء کی بات نہ مانی تو اب جو لوگ اچھے مسلمان اور بات ماننے والے تھے، انہوں نے نہ ماننے والوں کو کہا کہ ہم تو تمہارے ساتھ نہیں رہتے، لہٰذا شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر دو۔ تو شہر کے

درمیان میں ایک دیوار دے دی کہ نہ ماننے والے ایک طرف رہیں اور ماننے والے دوسری طرف رہیں۔ اور دو دروازے لگا دیئے کہ مسلمان اس دروازے سے گزرا کریں اور وہ اس دروازے سے گزرا کریں، لیکن ایک دوسرے کے دروازے سے گزرتے رہتے تھے، کوئی دشمنی تو تھی نہیں، البتہ ان کو نصیحت کی گئی، لیکن انہوں نے بات نہ مانی۔

تو ایک دن ایسا ہوا کہ جب مسلمان ان کے دروازے کی طرف گزرے تو دیکھا کہ دروازہ بند ہے۔ انہوں نے کہا کہ عجیب بات ہے آج دروازہ کیوں بند ہے!؟ تو مسلمان دیوار پر جا کر اندر کو دے، تاکہ دیکھیں کہ آج کسی نے دروازہ کیوں نہیں کھولا؟ تو دیکھا کہ وہ تو بندر بن چکے ہیں اور ایک دوسرے پر بندروں کی طرح اُچھل رہے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو چکا تھا۔ قرآن میں ہے: ﴿فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕیْنَ﴾ [الاعراف:۱۶۶] جس چیز سے انہیں روکا گیا تھا، جب انہوں نے سرکشی کی تو اللہ نے بھی حکم دے دیا کہ ذلیل بندر بن جاؤ۔ حضرت داؤد نے بھی ان پر لعنت کی کہ لعنتی قوم ہو کہ نہ نبیوں کی مانتے، نہ علماء کی مانتے ہو اور نہ فقہاء کی مانتے ہو۔ اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے بھی اس قوم پر لعنت بھیجی:

﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾ [البقرۃ:۶۶] تو اس کے اندر "" کی "ھا" ضمیر کس کی طرف لوٹ رہی ہے؟ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ ضمیر "قِرَدَةً" کی طرف راجع ہے کہ ان کو ہم نے بندر بنا دیا، تاکہ وہ عبرت بنیں۔ اور بعض نے کہا کہ "حِیتَان" کی طرف راجع ہے کہ اللہ نے مچھلیوں کو ابتلاء بنا دیا۔ اور بعض نے کہا کہ "ھا" ضمیر عذاب کی طرف راجع ہے کہ دیکھو! ہمارا عذاب کیسے آیا؟ ہم نے ان کو کیسے عبرت کا نشان بنا دیا، آگے والوں کے لیے بھی اور پیچھے والوں کے لیے بھی۔ اور بعض نے فرمایا کہ ضمیر بستی کی طرف راجع ہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح قول یہی ہے کہ ضمیر بستی کی طرف راجع ہے۔ کیونکہ عذاب بھی بستی والوں پر آیا اور مسخ بھی بستی والوں پر آیا، اللہ کی عقوبت بھی بستی والوں پر آئی۔ لہٰذا ضمیر کا رجوع بستی کی طرف ہے، اللہ نے اس بستی والوں پر عذاب کیا، کیونکہ انہوں نے تجاوز کیا تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۶، ۱۰۷، البقرۃ: الآیۃ: ۶۵]

"نَكَالًا" کا معنی ہے عذاب۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو ایسی سزا دی کہ وہ دنیا کے لئے عبرت بن گئے۔

﴿لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ سے یا آگے اور پیچھے والی بستیاں مراد ہیں یا ان سے آگے آنے والے لوگ اور پیچھے والے لوگ مراد ہیں کہ وہ اس سے عبرت پکڑیں۔

حضرت اسماعیل بن ابی خالد، حضرت قتادہ اور حضرت عطیہ العوفی فرماتے ہیں: ﴿بَیْنَ یَدَیْهَا﴾ سے مراد وہ لوگ

ہیں جو پہلے گزر گئے یا بعد والے۔

حضرت ابو العالیہ، حضرت ربیع اور حضرت عطیہ فرماتے ہیں کہ ﴿وَمَا خَلْفَهَا﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو بنی اسرائیل کے بعد بچ گئے، تاکہ وہ عبرت پکڑیں کہ کہیں وہ ان عمل نہ کریں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے تو عبرت ٹھیک ہے، لیکن جو پہلے گزر ہیں ان کے لئے یہ عبرت کیسے ہوسکتی ہے؟ لہٰذا یہ بات ٹھیک ہے کہ جو بستیاں سامنے تھیں یا جو بستیاں پیچھے تھیں کہ دائیں بائیں آگے پیچھے آباد تھیں، ان سب کے لئے عبرت کا ایک نمونہ بن گیا، تاکہ اللہ کی نافرمانی نہ کریں۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی یہ کہے کہ یہ ایک تصور ہے کہ اس طرح کہہ دیا جاتا ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ راجح قول پہلا یعنی مکان والا ہے۔ ﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ان کے اگلے پچھلے گناہوں کی وجہ سے ان کو عبرت بناڈالا گیا۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کے اندر تین قول نقل کیے ہیں:

1..... پہلا قول یہ ہے کہ بستی والے جو اُن سے پہلے تھے، اللہ نے علم دیا تھا کہ اس طرح کا ایک واقعہ گزر چکا ہے۔

2..... دوسرا قول یہ ہے کہ اس وقت جو بستیاں آگے پیچھے موجود تھیں ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے عبرت بنادیا۔

3..... تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی جو انہوں نے گناہ کئے تھے اور یہ جو گناہ کیا تھا، اللہ نے ان سب گناہوں میں پکڑ کر ان کو عبرت کا نشان بنادیا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰۷، البقرۃ: الآیۃ: ۶۵]

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖٓ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ أَنْ أَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۭ قَالَ إِنَّهٗ يَقُوْلُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ إِنَّهٗ يَقُوْلُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ إِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۭ وَإِنَّآ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝ قَالَ إِنَّهٗ يَقُوْلُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۭ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۭ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝﴾

[البقرۃ: ۶۷ تا ۷۱]

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو، وہ کہنے لگے: کیا تُو ہم سے مذاق کرتا ہے؟ فرمایا: اللہ کی پناہ کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ کہنے لگے: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر کہ وہ ہمیں بتادے کہ وہ گائے کیسی ہے؟ کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے نہ بوڑھی اور نہ بن بیاہی، بڑھاپے اور جوانی کے درمیان میں ہے، اب کر ڈالو جو تمہیں حکم ملا ہے۔ کہنے لگے: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر کہ وہ ہمیں بتادے کہ اس کا رنگ کیسا ہے؟ کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے زرد، تیز رنگ ہے اس کا، دیکھنے والوں کو بھاتی ہے۔ بولے: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر وہ ہمیں بتائے کہ وہ کس قسم میں ہے، کیونکہ اس گائے میں ہمیں شبہ پڑا ہے اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پالیں گے۔ کہا: وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے، محنت والی نہیں کہ زمین کو جوتتی ہو یا کھیتی کو پانی دیتی ہو، بے عیب ہے، اس میں کوئی داغ نہیں۔ کہنے لگے: اب تُو نے پوری بات کہہ دی ہے۔ پھر اس کو ذبح کیا اور وہ لگتے نہ تھے کہ ایسا کریں گے۔

اس آیت مبارک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک اور واقعہ اور اللہ کے حکم پر ان کا ردِ عمل ذکر فرمایا ہے۔ ان آیات کے مخاطب بھی بنی اسرائیل (یہودی) ہیں۔

اہل کتاب کی نسبت:

اللہ تعالیٰ کی کتاب تورات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُتاری گئی، اگر یہودی اس پر صحیح معنی میں عمل پیرا ہوں اور انجیل جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اُتاری گئی، اگر عیسائی اس پر صحیح معنی میں عمل پیرا ہوں تو ان کو "اہل کتاب" کہلانے کا حق ہے۔

ایک نسبت ہوتی ہے جیسے الحمدللہ! ہم اپنی نسبت قرآن و حدیث کی طرف کرتے ہیں، اپنی نسبت اہلسنت و الجماعت کی طرف کرتے ہیں، لیکن کتنے لوگ ہیں جو صحیح معنوں میں اہلسنت والجماعت کے طریقے پر قائم ہیں۔ وہ نسبت تو باقی رہتی ہے۔ آج کل جو نصاریٰ موجود ہیں، وہ اکثر تثلیث کے قائل ہیں اور ان کی اکثریت بالکل لامذہب ہے، ان کا مذہب سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ اور یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ سابقہ زمانہ میں کلیسا اور سائنس آپس میں ٹکرا گئی، یعنی جو لوگ راہب یا نصاریٰ کے بڑے بڑے پادری تھے اور ان کے مقابلہ میں وہ لوگ تھے جو سائنس کی ترقی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے جب اپنے اپنے نظریات پیش کیے تو ان کا آپس میں ایک ٹکراؤ پیدا ہو گیا۔ نتیجہ نکلا کہ مذہب اور ان کے درمیان ایک خلیج حائل ہو گئی۔ جب تک ان کلیسا والوں کا زور رہا، ان کے ہاتھ

میں طاقت اور قوت رہی، انہوں نے بھی سائنسدانوں کو پھانسیوں پر لٹکوایا اور ان کو سزائیں دلوائیں، ان کے ہاتھ کٹوا دیئے اور ان کی آنکھیں نکلوا دیں اور ہر وہ آدمی جو سائنسی ترقی میں یا دنیوی ترقی میں پڑتا تو اس پر کفر کے فتوے صادر کر دیتے۔ اور اس کے بعد جب نئی ٹیکنالوجی کا دور آیا تو اس کا نتیجہ بھی یہ ہوا کہ انہوں نے مذہب والوں کو ذلیل کرنا شروع کر دیا، انہوں نے بھی تو آخر اپنا انتقام لینا تھا۔

اسلام دنیاوی ترقی کا مخالف نہیں:

دراصل یہی وہ وجہ ہے کہ جو آج بھی یہود و نصاریٰ کے دماغ میں ہے کہ جو صحیح معنی کے اندر مسلمان ہیں، ان سے وہ نفرت کرتے ہیں کہ سابقہ اثرات ان کے دماغوں میں موجود ہیں، ورنہ الحمد للہ! اسلام نہ سائنس کی ترقی سے الرجک ہے اور نہ اسلام سائنسی ترقی کا معارض و مخالف ہے اور نہ اسلام نے کوئی تفریق کھینچی ہے کہ جو دین والا ہے، وہ دنیا کا کام ہی نہ کرے، بلکہ اسلام نے تو رہبانیت کی مکمل نفی کی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معاشرے سے کاٹ لے، دنیا سے کاٹ لے اور اپنے آپ کو علیحدہ کر کے غاروں میں اور معبد خانوں میں بند کر دے، اسلام تو اس کا مخالف ہے۔ بلکہ اسلام کی جو عظیم عبادت گاہ اللہ کا کعبہ ہے، اس کے اندر جب آپ سب سے عظیم عبادت طواف کرتے ہیں تو اس کی جو عظیم دعا ہے، اس میں بھی اللہ نے سب کچھ دیا ہے کہ ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [البقرۃ:۲۰۱] اس میں اللہ نے ہمیں دنیا کی بھلائیاں بھی مانگنے کا حکم دیا اور آخرت کی بھلائیاں بھی مانگنے کا حکم دیا ہے۔ اسلام تو صرف یہ تقاضا اور مطالبہ کرتا ہے کہ تم دنیا میں نہ کھو جاؤ اور اللہ کو نہ بھولو۔ اسلام تو یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اگر دنیا ملے تو حلال، حرام کی تمیز کرو۔ اسلام تو ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اگر انسان کو اپنی جبلی خواہش کے مطابق لذات کی بھی ضرورت ہے، مطعومات اور ماکولات کی بھی ضرورت ہے، ملبوسات اور منکوحات کی بھی ضرورت ہے تو اسلام یہ پابندی لگاتا ہے کہ تم کھاؤ اور پیو جو چاہتے ہو، صرف اسراف نہ کرو اور حلال حرام کا فرق کرو۔ اسلام یہ پابندی نہیں لگاتا کہ آپ اعلیٰ لباس نہ پہنیں، بلکہ اسلام تو حکم دیتا ہے کہ اگر جمعہ کا دن ہے تو آپ غسل کریں اور نیا لباس پہنیں، اگر نیا نہ ہو تو کم از کم دھلا ہوا پہنو، اسلام حکم دیتا ہے کہ خوشبو لگائیں، نظافت اختیار کریں کہ انسان کے لباس سے، بدن سے، منہ سے، بغلوں سے، ہاتھ پاؤں کی انگلیوں سے، یعنی کہیں سے بھی بدبو نہیں پھوٹنی چاہئے۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ تجارت کریں کہ سب سے پہلے میرے پیارے نبی

خاتم الانبیاء، حبیب کبریاء نے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال لے کر تجارت کر کے اُمت کو نمونہ پیش کیا۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ کھیتی باڑی کریں کہ ہمارے ابا آدم علیہ السلام نے کھیتی باڑی کی تھی۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ صنعتکاری اختیار کریں کہ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی بنائی، حضرت داؤد علیہ السلام نے زرہ بنائی۔ اسی طرح بعض انبیاء نے کپڑے سینے کا کام کیا۔ اسلام مزدور کی عظمت کو بلند کرتا ہے کہ اللہ کے نبی نے مزدوری لے کر بکریاں چرائیں۔ کیا اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اتنے پیسے نہیں بھجوا سکتے تھے کہ ان کو مزدوری نہ کرنی پڑے؟ آج لوگ مکہ میں کمانے آتے ہیں، ان کو پیسہ مل جاتا ہے اور اللہ کے نبی کے لئے کوئی کمی تو نہیں تھی۔ اُمت کو ایک تعلیم دینی تھی کہ کل کو کوئی عامل اور مزدوری کرنے والا اپنی مزدوری کو گھٹیا نہ سمجھے، مزدوری کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت فرمائی۔ سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ میں کپڑے کی تجارت کی اور آپ کبھی کبھی اپنے کندھے پر چادریں لے کر بھی بیچتے تھے۔ تو اسلام کا تو دراصل سائنس اور ترقی سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔

اسی طرح جتنے نظریات، آسمان و زمین کے بارے میں، شمس و قمر کے بارے میں، سیارات و برج کے بارے میں ہیں، اسلام تو کسی سائنس سے نہیں ٹکراتا، ہاں! البتہ اسلام اتنا درس ضرور دیتا ہے کہ تم ایسی چیزوں میں تدبر، غور و فکر کرو کہ جس سے بندوں کو فائدہ پہنچے، بے فائدہ اپنی محنتوں کو، اپنی قابلیتوں کو، اپنی دولتوں کو ضائع نہ کرو۔ لیکن مشکل وہی ہے کہ کلیسا اور مذہب کی جو جنگ تھی، آج تک جدید لوگوں کے دماغوں میں موجود ہے۔ اس لیے مذہب کا آدمی جہاں بھی ہوگا، وہ اس کو کچلنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے دماغوں کے اندر خطرہ موجود ہے کہ اگر کہیں پھر مذہب والے آئے تو پتہ نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا کریں؟ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ اسلام تو سلامتی کا درس دیتا ہے، ایمان، امن کا سبق پڑھاتا ہے، اسلام تو دعوت دیتا ہے کہ آگے بڑھیں اور اللہ کی زمین سے فائدہ اُٹھائیں۔ اسلام دعوت دیتا ہے کہ ہم نے شمس و قمر اور نجوم سب مسخر کر دیئے ہیں، تم ان سے فائدہ اُٹھاؤ، یہ تمہارے لیے علامات اور ہدایت ہیں، یہ تمہیں راستہ بتلاتے ہیں، تمہاری سمت متعین کرتے ہیں، تمہیں اوقات بتلاتے ہیں، ان کے بارے میں تو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں خود دعوت دی ہے۔

سورۃ البقرۃ کی وجہ تسمیہ:

ان آیات میں گائے ذبح کرنے کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔ اس سورت کا نام جو سورۃ البقرۃ ہے، وہ بھی اس واقعہ

کی وجہ سے ہے۔

عموماً جھگڑے کا سبب دولت ہے یا عورت:

اگر آپ تحقیق کریں تو ہر جھگڑے کے پسِ منظر میں یا دولت ہوگی یا عورت ہوگی، اس کے علاوہ اور کوئی فتنہ کا ذریعہ نہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ دولت ہے یا عورت ہے۔ بنی اسرائیل کے لوگوں کا قصہ ہے کہ ایک دولت مند کو اس کے بھتیجے نے قتل کر دیا۔ اس کے بھتیجے کے دماغ میں آیا کہ یہ دولت مجھے مل جائے۔

یہ دولت ایسی بری چیز ہے کہ ہر آدمی اس کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور یہ ایسی بد بخت ہے کہ اس کو جتنا حاصل کرنے پر زور لگاؤ تو اتنا اور دور ہوتی ہے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا کہ دولت کی بنیاد سونا ہوتا ہے۔ تمام دنیا کی کرنسی اور سرمایہ کی مقدار سونے پر ہے، اور سونے کا نام عربی میں ''ذھب'' ہے، اس کا مادہ ''ذَھَبَ یَذْھَبُ'' ہے کہ جانے والا اور یہ کبھی کسی کے پاس ٹکتا بھی نہیں ہے۔ اور اسی طرح ایک شاعر نے ایک بڑی عجیب بات کی۔ اس نے کہا کہ آپ ساری دنیا کے پیسوں پر نظر ڈالیں تو اس کے ہمیشہ دو رخ ہوں گے۔ پوری دنیا میں آج تک کوئی پیسہ، کوئی درہم، کوئی اشرفی، کوئی کرنسی، کوئی ڈالر، کوئی پونڈ، کوئی روپیہ ایسا بنا ہی نہیں کہ دونوں طرف اس کی ایک شکل ہو۔ تو اس شاعر نے کہا کہ اس سے بڑی دلیل منافقت کی کیا ہو سکتی ہے کہ جس کے دو منہ ہوں، منافق کے بھی دو چہرے ہوتے ہیں، ظاہری کچھ اور اندر سے کچھ ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک نے منافق کی تعریف کی ہے: ﴿مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا﴾ [النساء: ۱۴۳] کہ منافق ہمیشہ دو کشتیوں پر پاؤں رکھتا ہے، نہ ادھر ہے اور نہ اُدھر۔ دونوں کشتیوں پر کھڑا ہے کہ یہ تیرنے لگی تو ادھر آ جاؤں گا اور وہ تیرنے لگی تو اُدھر چلا جاؤں گا۔ اللہ کی مہربانی یہ ہوتی ہے کہ دونوں کشتیاں ڈوب جاتی ہیں اور وہ ڈوب جاتا ہے۔ تو دولت کے معنی یہی ہے کہ یہ تو جانے والی چیز ہے۔ سب سے بڑی چیز ''ذھب'' ہے، وہ ''ذَھَبَ'' جانے سے ہے۔ اور ''فِضَّۃ'' تفضض سے ہے۔

اس دولت کی لالچ میں آ کر بھتیجے نے سوچا کہ چچا کی دولت پر کیسے قبضہ کروں؟ کیونکہ اس کی زندگی میں قبضہ بڑا مشکل ہے، کیونکہ جب تک آدمی زندہ ہے، وہ اپنی جائیداد کیسے چھوڑ دے گا؟

وحی کے ذریعے قاتل نہ بتلانا حکمت ہے:

اللہ کی شان ہے کہ اگر چاہتے تو موسیٰ علیہ السلام کو خبر کر دیتے کہ اس کا قاتل فلاں ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے

یہاں بھی نہیں بتلایا اور ہارون علیہ السلام کی موت میں بھی نہیں بتلایا۔ وجہ یہ تھی کہ اگر ہم نے وحی کے ذریعہ خبر کر دی تو یہ قوم تو پہلے موسیٰ علیہ السلام کا انکار کر رہی ہے، تکذیب کر رہی ہے، تورات کو جھٹلا رہی ہے تو اب کون سی بات مان لے گی؟ بلکہ مزید یہ کفر میں اکڑ جائے گی، اس لیے وحی کے ذریعے خبر دینے کی ضرورت نہیں۔ ہارون علیہ السلام جب فوت ہو گئے تو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الزام لگا دیا کہ ہارون علیہ السلام کے قاتل تم ہو، آپ نے انہیں قتل کر دیا ہے اور انہیں دفن کر دیا ہے۔ چونکہ وہ ہم سے زیادہ ملے ہوئے تھے، ہمارے ساتھ زیادہ مہربانی کرتے تھے تو تمہیں یہ بات پسند نہیں تھی تو تم نے اپنے بھائی کو مار ڈالا ہے۔ وہاں بھی اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے ذریعے یہ حکم دیا کہ اپنے بھائی کی میت پر آجاؤ اور قبر پر آ کر کھڑے ہو جاؤ، اس سے کہو: "قُمْ بِإِذْنِ اللّٰهِ" تو ہم تمہارے بھائی کو زندہ کر دیتے ہیں۔ جب قیامت میں ہم نے ساری مخلوق کو زندگی دینی ہے تو ایک پیغمبر کو یا ایک فرد کو دوبارہ اُٹھا دینا کون سا مشکل مسئلہ ہے؟ موسیٰ علیہ السلام قبر پر کھڑے ہوئے، بنی اسرائیل کو بھی لے آئے، حضرت ہارون علیہ السلام اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور کہا کہ عقل کی بات کرو، میں اپنی موت سے مرا ہوں، مجھے موسیٰ علیہ السلام نے نہیں مارا۔ تو اب وہ چپ ہو گئے۔

چند علمی لطیفے:

میں نے ایک دفعہ پاسپورٹ پڑھا کہ اس پر "حامل" لکھا ہوا ہوتا ہے، ان کو یہ پتہ نہیں ہے کہ حامل، حمل والی عورت کو کہتے ہیں، جس کے پیٹ میں بچہ ہو یا بڑا۔ میں نے کئی دوستوں سے کہا کہ کم از کم یہ بات کہیں پہنچاؤ جن کے ہاتھ میں ہو۔ کم از کم مذاق تو نہ بناؤ کہ ہر ایک کے پاسپورٹ میں تم نے حمل والی عورت لکھ دیا ہے، وہ کم از کم ترجمہ تو ٹھیک کر دے۔ جب لوگ پڑھتے ہوں گے تو کتنا ہنستے ہوں گے کہ ان کے بارہ کروڑ آدمیوں میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کو عربی آتی ہو۔ کتنے لوگ ہماری بے عزتی کریں گے، لیکن کوئی سنتا نہیں ہے۔ اور ہماری کون سنتا ہے؟ ہمارا تو حق ہے کہ لوگوں کو حق کی بات بتلا دیں، اب اس آگے والے کی مرضی ہے۔

اور دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ اسی میں آپ آگے پڑھیں۔ پتہ نہیں ان کو کون سا عربی مترجم ملا تھا کہ اگر سال کے بعد تجدید نہ کیا گیا تو ختم ہو جائے گا۔ وہاں عربی کا جو ترجمہ کیا ہے، یہ لکھا ہے کہ اگر تجدید کرایا گیا پانچ سال کے بعد تو یہ ختم ہو جائے گا۔ اب اگر اتنا بڑا جاہلانہ ترجمہ ہو تو آدمی کیا کرے؟ بہر حال یہ جانیں اور ان کا کام جانے۔ اللہ نے ہمیں محفوظ رکھا ہے اور آگے بھی محفوظ رکھے، لیکن حق کی بات بتلانا تو فرض ہے کہ بتلاؤ، تاکہ کسی کی تضحیک نہ ہو اور

کوئی پڑھیں تو کم از کم نہ ہنسیں، حالانکہ مشکل بھی کوئی نہیں تھی کہ اگر تم کو ترجمہ والا کوئی نہیں ملا تھا تو دو چار عرب ملکوں کے پاسپورٹ سامنے رکھ لیتے اور اس کی نقل کر لیتے۔ کون سا یہ مشکل مسئلہ تھا جو تم سے حل نہیں ہو سکا۔ لیکن کسی نے ادھر غور ہی نہیں کیا اور غور کرتے بھی نہیں ہیں، حالانکہ کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اگر مجھے عربی نہیں آتی تو دوسروں کے لکھے ہوئے کاغذ ہوتے ہیں، وہی لکھ لیا۔ چونکہ ہمارے ہاں لکھا ہوتا ہے حامل ہذا روانہ ہے تو اسی طرح حامل کو پاسپورٹ کے اندر ہم ڈھونڈھ کر لے آئے، جیسے ہم نے مزاح کو مذاق بنا دیا۔

جیسے خط میں لکھتے ہیں کہ ''اگر آپ نے میرا یہ کام کیا تو میں آپ کا بڑا مشکور ہوں گا'' حالانکہ یہ غلط لفظ ہے، کیونکہ ''مشکور'' کا معنی ہوتا ہے کہ تم میرے شکر گزار بنو، یعنی کام بھی تم نے کیا ہے اور شکر گزار بھی تم بنو۔ اصل میں تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ آپ نے میرے ساتھ مہربانی کی تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا، میں آپ کا شکریہ ادا کروں گا، یہ نہیں کہ مشکور بھی میں ہوں گا۔ لیکن ہمارے ہاں یہ لفظ چلتا ہے اور ہر پڑھا لکھا آدمی ماشاء اللہ! یہی لکھتا ہے۔

اور آپ نے اکثر دیکھا اور سنا ہوگا کہ آپ کو ہم سے کیا ناراضگی ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ اصل لفظ ہے ''ناراضی''، پتہ نہیں ''گی'' انہوں نے کہاں سے لگا دیا ہے۔ یہ الفاظ کے آگے پیچھے تھوڑی سے دُم لگا دیتے ہیں۔ بہرحال کوئی ایک غلطی نہیں ہے کہ میں جس کا رونا روؤں۔ میں نے ایک دفعہ ان اغلاط پر تیس ورق لکھے تھے، بہرحال میں نے لکھ کر اس کو رکھ دیا کہ تمہاری اس بات کو کس نے سننا ہے، اس نقار خانہ میں ایک طوطی کا شور کون سنے گا؟ تو میں نے اپنے آپ کو کہا کہ چھوڑو اور اس محنت کو رہنے دو، جو جیسے چل رہا ہے، اس کو چلنے دو۔ کسی نے ہماری ماننی تو نہیں ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً﴾ تنوین تھی، کوئی تخصیص نہیں تھی۔ نکرہ تھا کہ کسی گائے کو ذبح کر کے گوشت کا ٹکڑا لگا دیتے تو مسئلہ حل ہو جاتا۔ لیکن انہوں نے پوچھنا شروع کیا، جس کی وجہ سے ان پر سختی آئی۔

اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اپنی جانوں پر خود سختی نہ کیا کرو۔ جو شریعت کا حکم ہے بس اس کو پورا کر دو۔ ایسا نہ کرو جیسا کہ بنی اسرائیل نے اپنی جانوں پر سختی تو اللہ نے بھی ان کو مشقت میں ڈال دیا۔

واقعہ قتل:

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے یہ واقعہ اس طرح بیان فرمایا عبیدہ السلمانی کے ذریعہ سے کہ بنی اسرائیل کے اندر ایک شخص عقیم تھا یعنی بانجھ تھا، اس کی اولاد کوئی نہیں تھی، بعض روایات میں اس کا نام ''عامیل'' تھا۔ لیکن بہت بڑا مالدار

تھا، اس کے بھائی کا بیٹا یعنی اس کا بھتیجا اس کا وارث تھا تو اس نے مال حاصل کرنے کے لیے اس کو قتل کر دیا اور اس کو رات کو اُٹھا کر ایک آدمی کے دروازے پر ڈال دیا اور صبح کو اس آدمی پر دعویٰ کیا کہ اس نے قتل کیا ہے، لیکن انہوں نے کہا کہ ہم نے قتل نہیں کیا۔ حتیٰ کہ دونوں جانب سے آدمیوں نے ہتھیار اُٹھا لیے اور ایک دوسرے سے لڑائی کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور بات بڑھ گئی تو ان میں جو لوگ صاحب الرائے اور صاحب العقل تھے، انہوں نے کہا کہ خدا کے بندے! تم کیوں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو؟ ایک آدمی کے قتل کا مقدمہ ہے، اب اگر تم لڑائی کرو گے تو تم سے اور آدمی قتل ہو جائیں گے۔ جبکہ اللہ کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام تمہارے اندر موجود ہیں، یہ واقعہ اللہ کے نبی کے سامنے رکھو۔ اس کے بعد وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور آکر یہ سارا واقعہ ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے یہ حکم کیا ہے کہ تم گائے ذبح کرو۔

جنتی اور جہنمی لوگوں کے نام کی کتابیں:

اس طرح ایک روایت مبارک میں آتا ہے کہ آقائے نامدار، خاتم الانبیاء، حبیب کبریاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں...... کتاب سے مراد یہ نہیں ہے جو ہمارے ہاں ایک تصور ہے۔ عربی میں کتاب، لکھے ہوئے کاغذ کو کہتے ہیں...... تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ یہ دو کتابیں کیا ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: ہم کیا جانتے ہیں؟ جب تک آپ ہمیں نہ بتلائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دائیں ہاتھ میں جو کتاب ہے، اس میں ان لوگوں کے نام ہیں جن کو اللہ نے جنت ہی کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ جو بائیں ہاتھ میں نام ہیں، ان کو اللہ نے پیدا ہی جہنم کے لیے کیا ہے۔

[سنن الترمذي، حديث: ٢١٤١، باب: ما جاء أن الله كتب كتابا...]

جیسا کہ قرآن میں اللہ نے فرمایا کہ ہم نے جہنم کے لیے کتنی مخلوق پیدا کی ہے اور جنوں میں بھی پیدا کیے ہیں اور انسانوں میں بھی پیدا کیے ہیں۔ تو اس لیے اصل معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، کیونکہ وہ مالک ہے اور مالک اپنی ملک میں جیسے چاہے تصرف کرے اور جو چاہے تصرف کرے۔

منکر تقدیر فرقہ کا ردّ:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس ایک باطل فرقے قدریہ کے ایک آدمی نے آکر سوال کیا کہ آپ جو تقدیر

کا مسئلہ بیان فرماتے ہیں کہ جس کے لیے اللہ نے ہدایت لکھی ہے، وہ ہدایت پر رہے گا اور اگر اللہ نے گمراہی لکھی ہے تو وہ گمراہی پر رہے گا۔ تو پھر بندے کا کیا قصور ہے؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ پہلے یہ بتلاؤ کہ اللہ پاک جو یہ تصرف فرما رہے ہیں، اپنے ملک میں کر رہے ہیں یا تمہارے ملک میں کر رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ اپنے ملک میں کر رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر تمہیں پوچھنے کا کیا مطلب ہے؟ جو چیز کسی کی ملک میں ہے، اس کی مرضی ہے۔ آپ کے دو ملازم ہوتے ہیں، آپ ایک کو کہتے ہیں کہ یہ کام کرو اور دوسرے کو کہتے ہیں کہ یہ کام کرو۔ تو کسی تیسرے آدمی کو کیا حق ہے کہ آپ سے آکر کہے کہ آپ نے اس کو اس ڈیوٹی پر کیوں لگایا اور اس کو ڈیوٹی پر کیوں نہیں لگایا؟ تو وہ کہے گا کہ میرے ملازم ہیں، میرے نوکر ہیں، میں جو مناسب سمجھوں گا، اس کو ڈیوٹی دوں گا۔

بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کے لیے گائے خود امتحان بن گئی:

اب دیکھیں! اس واقعہ میں بڑی عظیم آزمائش ہے کہ پہلے یہ قوم بچھڑے کی عبادت کر چکی تھی، اب اس قوم کے لیے امتحان بھی ایک گائے کو بنا دیا گیا۔ اور یہ ان کے لیے ایک سبق بنا کہ جو خدا ہوتا ہے، وہ ذبح ہونے کے قابل نہیں ہوتا، لیکن اس کے ساتھ ان کے دماغ میں ایک اُلجھن بھی پیدا ہو سکتی تھی کہ گائے کی وجہ سے مقتول زندہ ہو گیا ہے تو اس لیے دراصل اس میں آزمائش تھی کہ جو ایمان والے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے حکم کی تعمیل کرو اور بات ختم ہو گئی۔

مفسرین رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ نے ان کو حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو تو اگر وہ کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو بات ختم ہو جاتی، لیکن ان لوگوں نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے ان لوگوں کے اوپر سختی زیادہ بڑھا دی۔

لیلۃ القدر والی عظیم دعا:

اس لیے ہمیشہ اللہ سے معافی مانگا کریں۔ ''اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي'' [ابن ماجہ، ترمذی، احمد] یہ بڑی عظیم دعا ہے، بڑی جامع دعا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے خود پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ! اگر مجھے لیلۃ القدر نصیب ہو جائے تو میں اللہ سے کیا دعا مانگوں؟...... اور آپ لوگ لیلۃ القدر کی فضیلت بھی جانتے ہیں کہ ایک ہزار مہینوں کی



عبادت سے زیادہ بہتر ہے اور پھر پوچھنے والی محبوبہ محبوب خدا ہیں اور بتلانے والے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں...... آپ نے فرمایا: اے عائشہ! جب تمہیں ایسا موقع ملے تو اللہ سے معافی کا سوال کرو اور یوں کہو: ''اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي'' یا اللہ! میں تجھ سے معافی چاہتی ہوں۔ جب اللہ سے معافی مل گئی تو سارے کام ہو گئے۔ جب مالک نے معاف کر دیا تو بات ختم ہو گئی۔

[ترمذي، حديث: ۳۵۱۳، ابن ماجه، حديث: ۳۸۵۰، باب: الدُّعَاءِ بِالْعَفْوِ...]

اس لیے فرمایا کہ آدمی ہر وقت اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا رہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں صحت و عافیت اور معافی عطا فرمائے۔ اور صحت کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ صرف جسمانی صحت ہو، بلکہ روحانی بھی صحت ہو، اللہ تعالیٰ شرک کی بیماریوں سے بچائے، جتنے امراضِ روحانیہ یا جسمانیہ ہیں، ان تمام امراض سے نجات عطا فرمائے اور ہمیں معافی عطا فرمادے۔

قاتل کے لوگ ٹال مٹول کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال پر سوال کرتے رہے کہ کیسی گائے ہو؟ جس کو ذبح کریں تو مقتول زندہ ہو کر بتائے گا کہ مجھے کس نے قتل کیا ہے؟ تو ان کے سامنے اس گائے کی صفات بیان ہوتی گئیں۔

بنی اسرائیل کی گائے کی قیمت:

یہاں تک کہ صرف ایک آدمی کے پاس ان صفات والی ایک گائے تھی۔ اس نے کہا کہ میں اپنی گائے کسی صورت میں نہیں بیچتا، کیونکہ اس کو پتہ چل گیا اور اس کے ہاتھ میں طاقت آ گئی کہ گائے ایک ہے، انہوں نے لینی ہے تو میری مرضی ہے، میں جتنے پیسے مانگوں۔ اور کہا کہ ایک شرط پر گائے دوں گا کہ اس کو ذبح کرنے کے بعد اس کا چمڑا سونے کا بھر کر مجھے دو گے۔ انہوں نے منظور کر لیا۔

اسماعیلی فرقہ:

آپ خود اندازہ کریں کہ ایک گائے کے چمڑے میں کتنا سونا آیا ہوگا!؟ تمہارے ملک کے اندر بھی ایسی قوم ہے جو اپنے امام کو سونے سے تولتے ہیں (اسماعیلی فرقہ) اور اس کے بعد چاندی میں وزن کرتے ہیں، اس کے بعد سفید سونے میں وزن کیا اور پھر وہ سونا اسی امام کو دیتے ہیں اور امام اتنا پہنچا ہوا ہے ماشاء اللہ کہ اس نے زندگی میں کبھی نماز نہیں پڑھی، اعلیٰ قسم کی شراب پیتا ہے، تمام دنیا میں اس کے جواء کھیلنے کے لئے اڈے ہیں، لیکن امام ہے۔

اس مذہب کے عقیدے والوں کا یہ عالم ہے ان کی لڑکی لڑکے کا نکاح نہیں ہوتا، جب تک کہ امام نہ آئیں۔ سال میں ایک دفعہ دورے پر اس ملک میں ان کا امام آتا ہے تو نکاح کا انداز بھی عجیب ہوتا ہے۔ وہ تو جو پڑھتا ہے خدا جانے کیا پڑھتا ہے، اس کے بعد دلہنیں راستے پر لیٹ جاتی ہیں اور اپنے بال بچھا دیتی ہیں، ان کے بالوں کے اوپر امام صاحب قدم اُٹھاتے ہوئے گزر جاتے ہیں، جب ان کے بالوں کے اوپر قدم آ گیا تو بات پکی ہو گئی۔

اپنے عبادت خانوں کو وہ مسجد نہیں کہتے، بلکہ جماعت خانے کہلاتے ہیں، ان کے اوپر پہرا ہوتا ہے، ان کے مسلک کے علاوہ کوئی آدمی جماعت خانہ میں نہیں جا سکتا۔ حالانکہ جب عبادت کی جگہ ہے تو ہر کسی کو آنے دیں۔ جیسے الحمدللہ! یہ کعبہ اللہ کا گھر ہے، یہاں کسی پر پابندی نہیں، چاہے شافعی ہے، مالکی ہے، حنبلی ہے، اہلحدیث ہے، کوئی بھی آ جائے۔ لیکن اسماعیلیوں کے جماعت خانے بند ہیں، کوئی دوسرا آدمی ان کے اندر نہیں جا سکتا۔

ان کے مذہب کی کوئی کتاب آپ کو ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی۔ ویسے میرے پاس تو ہیں۔ بات کا مقصد یہ ہے کہ عام نہیں ملے گی۔ ہم نے تو ان کا کوئی دوست ڈھونڈ لیا کہ ہم تمہاری کتابیں دیکھنا چاہتے ہیں تو ان کتابوں کے اندر ان کے باپ، دادا، پردادا کے فوٹو ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ بہرحال میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہر پڑھا لکھا آدمی اپنے اتنے علم کے باوجود اس کو امام مانتا ہے۔

اسی طرح کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ امام غار میں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے، بارہ سو سال سے اس غار میں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد ان کے بعد آئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ...... اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں فرمائیں...... وہ تو چوتھے خلیفہ ہیں، آپ کی شہادت ہوئی تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ آئے، پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ آئے، پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ آئے۔ دعا کریں اللہ سب کو ہدایت عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ سب کو سیدھی بات سمجھنے کی توفیق دے، صراطِ مستقیم پر چلائے، وگرنہ ہماری طاقت نہیں ہے۔

اسی لیے جب مومن جنت میں پہنچیں گے تو کہیں گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ﴾ [الاعراف: ۴۳] اللہ تیرا شکر ہے تُو نے ہمیں جنت کا راستہ دکھلایا، اگر تُو نہ دکھلاتا تو ہم کبھی جنت میں نہ پہنچ پاتے۔ جب نماز پڑھیں گے تو کہیں گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اور جب دعا کریں گے تو حمد کریں گے اور جب جنت میں جائیں گے تو تب بھی حمد کریں گے۔ پانی پئیں گے، کھانا کھائیں گے تو حمد کریں گے، کپڑا پہنیں گے تو کہیں گے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَسَانَا'' حمام سے باہر نکلیں گے تو کہیں گے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَذْهَبَ عَنِّي

الْأَذَى وَ عَافَانِي'' یا اللہ! تیرا شکر ہے تُو نے اس گندگی سے محفوظ رکھا اور نکال دیا۔ اگر یہ بند ہو جائے اور پیٹ سے نہ نکلے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اس لیے آدمی ہر حال میں اپنے اللہ سے پناہ مانگے، اللہ کا شکر کرے، اللہ سے معافی مانگے، تب بچ سکتا ہے۔

بہر حال بنی اسرائیل قیمت دینے کے لیے تیار ہو گئی۔ یہ فرق آج اللہ کے لیے یہ دماغ سے نکال دو کہ یہ وہابی ہے یا فلاں ہے، اس بات کو دماغ سے نکال دو۔ ہم سب کلمہ پڑھتے ہیں۔ ایمان سے بتائیں کہ بعض مزارات کے دروازے سونے کے بنے ہوئے ہیں یا نہیں بنے ہوئے؟ اور ان کے گنبدوں کے اوپر جو کلس ہوتے ہیں وہ سونے کے لگائے گئے، اندر سونے کے پانی سے کام کیے گئے، یہ سب کچھ مزارات پر لگانے سے کیا فائدہ ہوا؟ اللہ کا ولی جس کی قبر کو اللہ نے جنت کا باغ بنا دیا ہے تو کیا وہ تمہارے اس سونے چاندی کا محتاج ہے؟ اگر خدانہ کرے، خدانہ کرے کوئی گناہ گار ہے اور قبر میں پکڑا گیا، اس کی قبر کے اوپر سونا چاندی لگا دیں تو اس کو کوئی فائدہ ہے؟ میرے پاک نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ قبر دو قسم کی ہوگی: ''إِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ أَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ''[1] یا جنت کے باغوں میں سے باغ کا ٹکڑا ہوگی یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہوگی۔

میرے پاک نبی ﷺ نے فرمادیا: میری بیٹی فاطمہ! اگر کوئی مال ضرورت ہے تو وہ مجھ سے مانگ لو، قبر میں محمد (ﷺ) نہیں چھڑوائے گا۔ اگر اللہ کا نبی اپنی بیٹی سے یہ کہے کہ تیرے عمل کام آئیں گے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٢٧٥٣، باب: وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ...]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وصیت کی کہ میری یہ دو پرانی چادریں ہیں، ان کو دھو ڈالو اور ان میں مجھے کفن دینا۔ عرض کیا گیا: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ خلیفۂ رسول اللہ ہیں، خلیفۃ المسلمین، امیر المومنین ہیں اور محسن اسلام ہیں، آپ کے لیے کیا نئے کپڑے کی دو چادریں نہیں مل سکتیں؟ اب تو اللہ کی رحمت ہے اور اسلام کے پاس بڑی طاقت ہے۔ آپ نے فرمایا: بیٹی عائشہ! نئے کپڑوں کی زندہ آدمی کو زیادہ ضرورت ہے، اُمتِ مصطفیٰ ﷺ کے کسی غریب کو نئی چادریں دے دو، اس کا سال گزر جائے گا۔ مردہ آدمی کو نئے، پُرانے سے کیا تعلق ہے؟ اگر اللہ نے معاف کر دیا تو یہ پُرانی چادریں کافی ہیں اور اگر معاف نہ کیا تو کیا نئی چادریں مجھے چھڑائیں گی؟

[كنز العمال، حديث: ٣٥٧١٨، وَفَاتُهُ (أَبِي بَكْرٍ) رضي الله عنه]

[1] [سنن الترمذي، حديث: ٢٤٦٠]

کتنے شہید ہوتے ہیں جو جل جاتے ہیں یا ٹینکوں کے نیچے آجاتے ہیں، بموں سے اُڑ جاتے ہیں، ان کے وجود کا ذرہ بھی نہیں ملتا، لیکن وہ جنتوں میں ہیں۔ اللہ پاک نے ان کی ارواح کو جنتوں میں رکھا ہوا ہے اور وہ جنتوں کے اندر سیر کر رہے ہیں، رزق بھی کھا رہے ہیں اور اللہ فرما رہے کہ میرے ان شہیدوں کو مردہ بھی نہ کہو، حالانکہ ہمیں ان کی لاش بھی نہیں ملی، کسی نے جنازہ بھی نہیں پڑھا، خدا فرماتا ہے: تمہیں پتہ نہ ہو، لیکن میں تو جانتا ہوں۔ میرے راستہ میں شہید ہوا ہے، وہ جنت میں ہے۔ لیکن ہم بزرگوں کی مزارات پر سونا چاندی لگا رہے ہیں۔ اگر کوئی آدمی سمجھائے تو کہتے ہیں کہ دیکھیں! یہ وہابی اللہ والوں کے منکر ہیں، اللہ کے اولیاء کو نہیں مانتے، ان کو ولیوں کے روضے سے تکلیف ہوتی ہے۔ خدا کے بندے! روضے سے تکلیف نہیں ہوتی، بلکہ تمہارے غیر شرعی کاموں سے تکلیف ہوتی ہے۔ اگر یہ باتیں دین میں شامل ہوتیں، دین کا حصہ ہوتیں تو کم از کم ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے مزار سب سے پہلے بنتے۔ اس لیے دین کو سمجھا کرو اور اللہ سے دعا کرو کہ اللہ ہمیں ہدایت دے۔ کتنے قبرستان ایسے ہیں، اللہ جانتے ہیں ان میں کتنے اللہ کے اولیاء ہیں، کتنے اللہ کے مقبول ترین بندے ہیں، لیکن ان قبروں پر جانے والا کوئی نہیں۔ جہاں کوئی رونق نہیں ہے، اس پر کوئی فاتحہ پڑھنے والا نہیں ہے، ان پر ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَادَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ اِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ'' کہنے والا نہیں ہے، ان کے لئے کوئی دعائے مغفرت کرنے والا نہیں ہے، لیکن جہاں رونق ہے وہاں ہم کھڑے ہیں، وہ رونق چاہے قبر پر ہو یا لکڑی کے تعزیے پر ہو، ہم وہاں کھڑے ہیں۔ پہلے زمانے میں لوگ روضے پر جاتے تھے اور تعزیہ ایسا روضہ ہے جو ہمارے پاس چل کر آتا ہے۔ دعا مانگو کہ اللہ ہدایت دے اور ان کو صراطِ مستقیم نظر آجائے۔

بنی اسرائیل کے مقتول کا قصہ:

بہر حال بنی اسرائیل نے گائے کو ذبح کر کے اس کا ٹکڑا مردے کو لگایا تو وہ زندہ ہو گیا۔ اس سے پوچھا کہ تجھ کو کس نے قتل کیا؟ اس نے کہا کہ مجھے میرے بھتیجے نے قتل کیا ہے۔ یہ کہنے کے بعد وہ دوبارہ مر گیا تو انہوں نے قاتل کو پکڑ لیا اور وہ مال سے بھی محروم ہو گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۸، البقرۃ: الآیۃ: ۶۷، ذِکْرُ بَسْطِ الْقِصَّۃِ]

اس لئے آج تک یہ مسئلہ چلا آرہا ہے کہ قاتل وارث نہیں بنتا ہے، جیسے مسلمان کا کافر وارث نہیں بنتا۔

﴿لَا فَارِضٌ﴾ یعنی بوڑھی نہ ہو، ﴿وَلَا بِکْرٌ﴾ اور چھوٹی بھی نہ ہو، ﴿عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِکَ﴾ متوسط ادھیڑ عمر ہو۔

﴿صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا﴾ زرد رنگ کی گائے ہو، اور اس کا رنگ بالکل صاف ہو۔ ﴿تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ﴾ دیکھنے والوں کو بھلی لگے۔ ﴿لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ﴾ ایسی گائے نہ ہو کہ جس کو محنت اور مشقت نے کمزور کر دیا ہو، یعنی ہل چلانے، پانی نکالنے والی نہ ہو۔ ﴿مُسَلَّمَةٌ﴾ جس کے اندر کسی قسم کا عیب بھی نہ ہو، یعنی لنگڑی، اندھی، کانی نہ ہو۔ ﴿لَّا شِيَةَ فِيْهَا﴾ بعض نے کہا کہ اس کے اندر کوئی سفیدی کا ٹکڑا بھی نہ ہو، ایک رنگ ہو۔ ﴿اِنْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ اگر وہ قوم ان شاء اللہ نہ کہتی تو ساری زندگی ڈھونڈتے رہتے، لیکن وہ گائے نہ ملتی۔ جب انہوں نے اللہ کا نام لیا تو ان کا راستہ آسان ہو گیا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ اس قسم کی گائے ایک بڑھیا کے پاس تھی اور اس بڑھیا کے یتیم بچے تھے، وہی ان کی نگرانی کرنے والے تھے۔ جب اس بڑھیا کو پتہ چلا کہ اس گائے کے علاوہ ان کا کام نہیں بنتا تو اس نے قیمت بڑھانی شروع کر دی، تاکہ میرے غریب بچوں کو بھلا ہو جائے۔ قوم موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں آئی کہ ہم نے گائے تو ڈھونڈ نکالی ہے، لیکن وہ بڑھیا بہت زیادہ قیمت مانگتی ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ نے تو تمہیں ایک گائے کا حکم دیا تھا، لیکن تم خود اپنے اوپر سختی کرتے گئے، اب اس کے علاوہ کوئی حل نہیں کہ اس کو راضی کرو اور اس سے گائے خریدو۔ انہوں نے اس سے خرید کر گائے کو ذبح کیا۔ اس کی ایک ہڈی لے کر مقتول کو لگائی تو اللہ نے اس کی روح لوٹا دی تو اس نے اپنا قاتل بتلا دیا۔

حضرت محمد بن جریر رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ قصہ اس طرح نقل فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک بوڑھا آدمی تھا، وہ بہت مال رکھتا تھا اور اس کے بھائی کی اولاد غریب تھی، ان کے پاس مال نہیں تھا اور اس بوڑھے کی بھی کوئی اولاد نہیں تھی، اس کے وہ بھتیجے ہی اس کے وارث تھے۔ انہوں نے یہ تمنا کی کہ ہمارا چچا مر جائے، تاکہ ہم اس کے مال کے وارث بنیں۔ جب اس بوڑھے پر زندگی دراز ہو گئی اور موت کو دیر ہو گئی تو شیطان نے ان لڑکوں کے دماغ میں یہ بات ڈال دی کہ تم اپنے چچا کو قتل کر دو اور اس کے مال کے جلدی وارث بن جاؤ اور جس شہر کے تم نہیں ہو، وہاں اپنے چچا کی لاش ڈال کر اس کی دیت کے حقدار بھی بن جاؤ، تمہیں دونوں طرف فائدہ ہو جائے گا۔

وہاں دو شہر تھے، ایک شہر میں یہ رہتے تھے اور دوسرا شہر علیحدہ تھا۔ اور ان کا رواج تھا کہ کوئی آدمی قتل ہو گیا اور قتل ہونے کے بعد اس کی لاش دو شہروں کے درمیان پڑی ہوئی مل گئی تو پیمائش کرو، جس بستی کو اس مقتول کی لاش

سے زیادہ قربت ہو، وہ بستی والے دیت ادا کریں۔ یہ ان کا آپس میں قانون بنا ہوا تھا۔

جب ان کے دماغ میں شیطان نے یہ بات مزین کر دی اور کافی دیر ہوگئی ان کے چچا پر موت نہ آئی تو انہوں نے اپنے چچا کو قتل کر دیا اور اس کے بعد دوسرے شہر کے بڑے دروازہ پر ڈال دیا۔ جب صبح ہوئی تو مقتول کے بھتیجے اس بستی اور شہر والوں کے پاس مدعی بن کر آ گئے کہ ہمارے چچا کی لاش تمہارے دروازے پر ملی ہے، لہٰذا تم ہمیں دیت ادا کرو۔ اس شہر والوں نے کہا کہ ہم قسم کھاتے ہیں کہ نہ تو ہم نے قتل کیا ہے اور نہ ہم جانتے ہیں کہ قاتل کون ہے اور نہ ہم نے اپنے شہر کا دروازہ کھولا ہے۔ لاش باہر پڑی ہوئی ہے تو ہم نے کیسے قتل کیا ہے؟

اس کے بعد وہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے کہ ہم نے تو اپنے چچا کی لاش ان کے دروازے پر پائی ہے اور انہوں نے قسم کھالی ہے کہ ہم نے نہیں کیا اور نہ ہم نے دروازہ کھولا ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جرائیل علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی دے کر اُتارا۔ اللہ نے فرمایا کہ آپ ان کو حکم کریں کہ ایک گائے کو ذبح کریں اور اس کے گوشت کا ٹکڑا اس مقتول کو لگائیں۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ آدمی بہت سارا مال رکھتا تھا اور اس کی ایک لڑکی تھی، اس کے بھتیجے نے آکر رشتہ مانگا تو اس نے کہا کہ تم غریب ہو، میں تم کو رشتہ نہیں دیتا۔ اس وجہ سے اس جوان کو غصہ آیا، اس نے کہا کہ میں اپنے چچا کو قتل کر دوں گا اور اس کا مال بھی لے لوں گا اور پھر جب میرے چچا کی بیٹی اکیلی ہوگی تو مجبوراً مجھ سے شادی بھی کرے گی، میں اس سے نکاح کر دوں گا اور پھر چچا کا مدعی بن کر دیت کے پیسے بھی لے لوں گا۔

قبائل بنو اسرائیل میں تاجروں کا ایک وفد مال بیچنے کے لئے آیا اور یہ لڑکا اپنے چچا کے پاس آیا اور کہنے لگا: تم مہربانی کرو، میرے ساتھ چلو، میں ان سے کچھ سامان خریدتا ہوں۔ تم بڑے آدمی ہو، تم کو دیکھ کر مجھے بھی سامان مل جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ اس کے ذریعے میں تجارت کر لوں اور مجھے بھی پیسہ جائے۔ وہ ساتھ چل پڑا۔ جب وہ قبیلے میں پہنچے تو اس نوجوان نے چچا کو قتل کر دیا اور گھر واپس آ گیا۔

جب صبح ہوئی تو وہ بہانہ بنا کر اس کا پتہ کرنے کے لئے گیا کہ میرا چچا کہاں ہے؟ گویا کہ اس کو پتہ ہی نہیں ہے، حالانکہ خود قتل کر چکا تھا۔ جب اس قبیلے میں پہنچا تو دیکھا کہ لوگ اکٹھے ہیں، کہنے لگا کہ تم نے میرے چچا کو قتل کر ڈالا ہے، دیت ادا کرو۔ اس کے بعد رونا شروع کر دیا اور مٹی اُٹھا کر اپنے سر میں ڈالتا اور کہتا کہ ہائے! میرا چچا مر گیا،

ہائے! میرا چچا قتل ہو گیا، میں تو بالکل یتیم ہو گیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۰۸، ۱۰۹، البقرۃ: الآیۃ: ۶۷، ذکر بسط القصۃ]

شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کے ذمہ دار:

تو عام عادت یہی ہے کہ جو لوگ زیادہ شور کرتے ہیں اصل قاتل وہی ہوتے ہیں، جیسے قاتلینِ حسین۔ اور یہ بات نہیں کہ میں الزاماً ان پر کہہ رہا ہوں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو انہی لوگوں نے خط لکھے تھے، ان کے مخالفوں نے تو نہیں لکھے تھے کہ آپ آجائیں، ہم آپ کی بیعت کریں گے، یزید کی بیعت توڑ دیں گے، ہم یزید کو امیر المومنین ماننے پر تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ اڑھائی سو خط لکھا اور وہ خط بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔

جب اتنے زیادہ خطوط آگئے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جو مکہ میں بڑی شان والے صحابہ اور تابعین موجود تھے، ان سے مشورہ کیا کہ میں کیا کروں؟ ان سب نے مشورہ دیا کہ آپ مہربانی کر کے مکہ نہ چھوڑیں۔ تمام صحابہ اور تابعین نے یہ رائے دی کہ آپ اہل بیت رسول ہیں، نواسۂ رسول ہیں اور یہ جو کوفے کے لوگ آپ کو خط لکھ رہے ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے، کوفے والے لوگ مکار، غدار ہیں، ان کے خطوط کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

جب تمام لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مکہ نہ چھوڑنے کا مشورہ دیا تو حضرت حسین نے فرمایا: تم ٹھیک مشورہ دیتے ہو، تم میری محبت کی وجہ سے کہتے ہو کہ میں مکہ سے باہر نہ جاؤں کہ کہیں میرے ساتھ دھوکہ نہ ہو جائے، لیکن اللہ نے مجھے قیامت میں پکڑ لیا کہ اڑھائی سو خطوط لکھ کر تمہیں بلایا کہ ہم آپ کی بیعت کریں گے تو میں کیا جواب دوں گا؟ تو ان کے خطوط لکھنے پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ آمادہ ہوئے تو ان کو مشورہ دیا گیا کہ آپ خود نہ جائیں، بلکہ ایک وفد بھیج دیں۔ ان کے ساتھ دیکھیں کیا معاملہ ہوتا ہے؟ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت مسلم بن عقیل رحمہ اللہ اور ان کے فرزندان کو بھیجا۔ جب وہ پہنچے تو سب لوگوں نے ان کی بیعت کر لی۔

انہوں نے اطلاع بھیجی کہ حضرت! یہاں تو ساری مخلوق آپ کا انتظار کر رہی ہے، ایک رات میں اتنے ہزار لوگوں نے میری بیعت کی ہے۔ جب وہ اطلاع حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ملی تو آپ مکہ سے چل پڑے۔ ادھر انہوں نے حضرت مسلم بن عقیل رحمہ اللہ اور ان کے فرزندوں کو قتل کر دیا۔ اصل بلانے والے، دعوت دینے والے اور تفرقہ ڈالنے والے یہی تھے، قتل کرنے کے اسباب مہیا کرنے والے بھی یہی تھے۔ ٹھیک ہے کہ قاتل شمر بن گیا، ابن زیاد بن گیا، لیکن قتل کا اصل ذریعہ بننے والے یہی تھے۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ میں بیٹھے رہتے تو دنیا کی کوئی طاقت آکر



ان کو قتل نہیں کر سکتی تھی۔

تتمہ واقعہ مقتول:

موسیٰ علیہ السلام کے پاس جب مقدمہ پہنچا تو آپ نے فرمایا: دیت تو ادا کرنی ہوگی۔ انہوں نے عرض کیا کہ اے موسیٰ! آپ اللہ کے رسول ہیں، مہربانی کریں، اللہ سے دعا مانگیں، اللہ ہماری مشکل حل کرے، قاتل کا پتہ چل جائے اور اسی کو پکڑا جائے۔ اس آدمی کی دیت ادا کرنا ہمارے لیے کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے، ہم تو پورے شہر والے لوگ ہیں، اگر دو دو روپے بھی چندہ کریں تو دیت ادا ہو جائے گی، لیکن ساری زندگی ہم پر طعنہ تو رہے گا کہ ایک بوڑھے آدمی کو بلا وجہ انہوں نے قتل کر دیا تھا۔ اس لیے آپ اللہ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس قضیہ کا حل فرمائیں اور جو صحیح قاتل ہے، وہ واضح ہو جائے۔ اللہ پاک نے فرمایا:

﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۷۲]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ نے حکم دیا ہے کہ گائے ذبح کرو۔ وہ کہنے لگے کہ حضرت! ہم تو قاتل کے بارے میں پوچھتے ہیں اور آپ ہمیں کہتے ہیں کہ گائے ذبح کرو۔ گائے ذبح کرنے کا بھلا قاتل سے کیا تعلق ہے؟ آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں کہ میں ان لوگوں میں سے ہو جاؤں جو جہالت کرنے والے ہیں، یعنی استہزاء کرنا تو جاہلوں کا کام ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ اس بات کو پیش کر دیتے جو اُن کو حکم ملا تھا اور گائے ذبح کر دیتے تو وہ گائے ان کے لئے کافی ہو جاتی، یعنی کوئی گائے بھی ذبح کر دیتے، کیونکہ "بقرۃ" نکرہ تنوین کے ساتھ تھا کہ کوئی سی گائے ذبح کر لو، لیکن ان بدبختوں نے اپنے اوپر خود سختی کر لی۔ اس لئے شریعت کا حکم ہے کہ جو کام اللہ پاک حکم فرما دیں، بس آدمی اس کو اپنی طاقت کے مطابق ادا کر دے، اس کی باریکیوں میں نہ پڑے۔ اگر باریکیوں میں پڑے گا تو لازمی بات ہے کہ سختی ہوگی۔

مفسرین رحمہم اللہ فرماتے ہیں: "فَارِضٌ" کا معنی ہے کہ ایسی بوڑھی گائے جو بالکل ولادت کے قابل نہ رہے۔ "بِكْرٌ" اس جانور کو کہتے ہیں کہ جس جانور کا ایک بچہ ہو، یعنی جانور ابھی بالکل جوان ہو۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ "عوانٌ" اس کو کہتے ہیں کہ جو آدمی عمر کو پہنچ چکی ہو، یعنی اس کی اولاد بھی ہو اور اس کی اولاد کی بھی اولاد ہو چکی ہو۔ بنی اسرائیل

گائے کا رنگ پوچھنے لگے تو فرمایا: زرد کھلا ہوا رنگ ہو، دیکھنے والوں کو اچھا لگے۔ ایسی گائے تلاش کرنے لگے تو ان کو ایسی گائے نہ ملی۔

اس زمانے میں ایک لڑکا تھا جو اپنے والدین کا بڑا فرمانبردار تھا۔ ایک دن اس کے والد سوئے ہوئے تھے اور سیف (الماری) کی چابیاں باپ کے سرہانے تھیں۔ ایک تاجر جو موتی بیچ رہا تھا، وہ گزرا، اس نے کہا کہ یہ موتی ہیں، میں ان کو ستر ہزار میں بیچتا ہوں، کیا تم خریدو گے؟ اس نے کہا کہ میں خریدنے کے لئے تیار ہوں، لیکن میرا باپ سویا ہوا ہے اور چابی ان کے سرہانے کے نیچے ہے، جب وہ اُٹھیں گے تو الماری کھول کر پیسے نکالیں گے۔ تاجر نے کہا: مجھے جلدی ہے۔ لڑکے نے کہا: تم ٹھہر جاؤ، ستر ہزار کا اسی ہزار دوں گا۔ تاجر نے کہا کہ نہیں، مجھے بڑی جلدی ہے، تم خریدتے ہو تو باپ کو اُٹھا دو، میں تمہیں ساٹھ ہزار میں دیتا ہوں۔ اس نے کہا: میں باپ کی نیند نہیں خراب کرتا۔ تاجر نے کہا: اچھا پچاس ہزار دے دو۔ اس طرح کرتے کرتے اس نے کہا: مجھے تیس ہزار دے دو۔ اب ستر ہزار والا سودا تیس ہزار روپے میں مل رہا ہے صرف اتنی دیر میں۔ لیکن اس نے کہا: میں باپ کو نہیں اُٹھاتا۔ تم ٹھہر جاؤ، میرا باپ نیند سے اُٹھے گا، میں تمہیں اسی کی بجائے لاکھ دے دوں گا، لیکن میں اپنے باپ کی نیند نہیں خراب کرنا چاہتا۔ میرا والد سویا ہوا ہے، میں اپنے باپ کو کیوں پریشان کروں؟ اس نے کہا: مجھے جلدی ہے۔ تو لڑکے نے کہا: میں سودا چھوڑ سکتا ہوں، لیکن اپنے باپ کے آرام میں خلل نہیں ڈال سکتا۔ بہرحال وہ چلا گیا، سودا نہ ہو سکا۔

اللہ تعالیٰ نے والدین کی فرمانبرداری کے صلہ میں یہ گائے جو اس کے پاس تھی، تو بنی اسرائیل وہ گائے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کے دروازے پر آ گئے کہ ہمیں یہ گائے چاہیے۔ اللہ نے اس کو یوں بدلہ دیا کہ اگر تم نے اپنے والدین کی فرمانبرداری کی ہے تو میرے خزانے میں کون سی کمی ہے۔

ایک نافرمان بیٹے کا واقعہ:

ایک بہت بڑے عالم تھے، اپنے بیٹے پر ناراض تھے، کیونکہ وہ نافرمان تھا۔ باپ بڑے متقی، بڑے پرہیزگار، بڑی عظمت والے تھے، لیکن خدا کی شان کہ بیٹا نافرمان ہے۔ نافرمانی میں اتنی حد کر دی کہ ایک چور کے ساتھ اس کی دوستی تھی۔ اس چور نے سامان چرایا اور لڑکے نے وہ بریف کیس لے کر اپنے گھر میں رکھ دیا۔ اور پولیس کو اطلاع دے دی کہ میرا باپ جس کو اتنا بڑا عالم سمجھتے ہو وہ تو چوروں کا مال گھر میں رکھتا ہے...... اس سے بڑی کوئی دشمنی ہو سکتی ہے کہ بیٹا اپنے باپ پر چوری کا الزام لگا کر پولیس کو رپورٹ کر دے!؟...... بہرحال پولیس نے آ کر ان

کے گھر کو گھیر لیا...... میرے والد صاحب کو انہوں نے خود یہ واقعہ سنایا...... جب پولیس آئی تو میں نے دروازے پر آ کر پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ کے گھر میں چوری کا مال ہے اور یہ خانہ تلاشی کے وارنٹ ہیں، ہم نے تلاشی لینی ہے۔ عالم نے کہا کہ اتنی اجازت دے دو کہ میں اپنی عورتوں کو ایک طرف پردے میں کر دوں۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ فرماتے ہیں: میں تو حیران ہو گیا کہ میرے گھر میں چوری کا مال؟ پھر کہا کہ یا اللہ! اس داڑھی کو اس عمر میں رُسوا نہ کرنا کہ ساری زندگی تیرا قرآن وحدیث پڑھاتا رہا، منہ کالا تو نہ کروں۔ اس کے بعد میں نے ان کو کہا: آ جاؤ۔ سارا گھر انہوں نے چھان مارا، لیکن وہ صندوق ان کو نظر نہ آیا۔ ڈھونڈتے رہے، لیکن نہ ملا، کیونکہ اللہ والوں کی اللہ مدد کرتے ہیں۔

بزرگ کا مقولہ ''اللہ کا فضل ہو گیا'' واقعہ:

ہمارے بھی ایک بزرگ تھے۔ فوت ہو گئے۔ وہ ہر بات میں کہتے تھے کہ ''اللہ کا فضل ہو گیا''۔ صبح تہجد کی نماز کے لئے وہ اُٹھے اور تہجد شروع کرنے کا ارادہ کیا تو چور اندر آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ تم کون ہو؟ چور جانتے تھے کہ حضرت کے پاس ایک چھوٹی سی صندوق ہے جس کے اندر طالبوں کے پیسے ہوتے تھے، اس کو اُٹھانے کے لیے آئے تھے۔ چوروں نے کہا کہ زیادہ بات نہ کرنا، ہم نے صندوق اُٹھانی ہے اور اس سے پیسے لینے ہیں اور چپ کر کے چلے جائیں گے۔ اگر زیادہ بات کرو گے تو ایک ڈنڈا ماریں گے اور تمہارا کام ہو جائے گا۔ بزرگ نے کہا کہ میں اپنی تہجد پڑھتا ہوں، اللہ کے فضل سے تم پیسے نہیں لے جا سکتے۔ ویسے میں اپنی نماز پڑھتا ہوں، اللہ کے فضل سے تم لے جاؤ۔ انہوں نے اپنی نماز شروع کر دی۔ چور اس تالے کو توڑ رہے ہیں اور زور لگا رہے ہیں، مگر تالا کھلتا نہیں ہے، حالانکہ کمزور سا تالا تھا۔ حضرت نے دو رکعت پڑھ کر پوچھا کہ کھل گیا؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ فرمایا: اللہ کے فضل سے تم مال نہیں اُٹھا سکتے ہو، ویسے تمہاری مرضی ہے تم پھر کوشش کرو، میں نماز پڑھتا ہوں۔ وہ چور صبح تک زور لگاتے رہے، حتیٰ کہ بھاگ گئے۔

صبح جب حضرت نماز کے لئے آئے تو کہنے لگے: اللہ کے فضل سے اللہ کا غضب ہو گیا۔ رات چور آ گئے تھے اور طالبوں کا مال لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے ان کو کہا کہ اللہ کے فضل سے تم لے کر نہیں جا سکتے۔ انہوں نے زور بڑا لگایا، لیکن نہیں لے جا سکے۔ اللہ کے فضل سے میں نے ان کو پہچان بھی لیا، لیکن اللہ کے فضل سے بتاؤں گا بھی نہیں۔

وہ فوت ہو گئے ہیں، بہت بڑے اللہ والے تھے، ساری زندگی قرآن وحدیث پڑھاتے ہوئے گزر گئی۔

ان کے تقویٰ کا یہ عالم تھا (میرے استاد کے استاد تھے) اس زمانے میں مٹی کے دیئے بنے ہوتے تھے، ان میں تیل ڈال کر کپاس کا فیتہ بنا کر اس میں رکھ دیتے تھے، اگر کوئی آتا تو حضرت فرماتے کہ میرے ملنے کے لیے آئے ہو یا مدرسے کے کام کے لیے؟ اگر آنے والا کہتا کہ آپ سے ملنے آیا ہوں تو فرماتے: میں یہ دیا بجھا دوں، کیونکہ یہ مدرسے کے پیسے سے جل رہا ہے۔ اس کی روشنی میں اگر تم سے بات کروں تو قیامت میں کیا جواب دوں گا؟

بہر حال وہ عالم فرمانے لگے کہ پولیس والے آئے اور تلاشی لی۔ ان کو سامان نہ ملا تو چلے گئے۔ حضرت جب غصہ میں آئے تو آ کر عاق نامہ لکھا کہ میں اپنے بیٹے کو جائیداد سے محروم کرتا ہوں، عاق کرتا ہوں اور علماء سے اس پر دستخط لئے۔ اس ضمن میں والد صاحب بھی دستخط کرانے کے لئے آئے۔ آپ پڑھ لیں اور دستخط کر دیں۔ جب میرے ساتھ اتنی زیادتی کی ہے تو میں کیا کروں؟ میں ایسی اولاد کو عاق کرنا چاہتا ہوں۔

والد صاحب کو سارا واقعہ سنایا تو والد صاحب نے فرمایا: گزارش یہ ہے کہ علماء نے دستخط کر دیئے ہیں، لیکن میں دستخط نہیں کرتا۔ انہوں نے پوچھا: کیا بات ہے؟ والد صاحب نے فرمایا: یہ بچہ آپ کے گھر میں اور آپ کے نطفہ سے پیدا ہوا ہے۔ کہنے لگے کہ یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ والد صاحب نے فرمایا: پھر اس کو معاف کر دو۔ اللہ نے ہمارے کتنے بڑے گناہ معاف کر دیئے ہیں، تم بھی اس کو معاف کر دو، وگرنہ ہمیشہ کے لئے برباد ہو جائے گا اور نسل تیری ختم ہو جائے گی۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ وہ ناراض ہو کر چلے گئے۔

کچھ عرصہ کے بعد آئے۔ والد صاحب کو مٹھائی دی اور کہا کہ آپ نے مجھے بڑا اچھا مشورہ دیا تھا۔ میرا بیٹا ملک چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں چلا گیا تھا۔ میں یہاں سے گیا اور اس کے بیوی، بچوں کے لیے کپڑے بھی لے گیا اور اس کو معاف بھی کر دیا۔ اب الحمدللہ! بیٹا واپس بھی آ گیا ہے، وہ عالم بھی بن گیا ہے اور فلاں جگہ پر قرآن وحدیث کا درس دے رہا ہے۔ والد صاحب نے فرمایا: اگر تم اس کو اس وقت محروم کر دیتے تو وہ اور باغی ہو جاتا اور دین چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ فرمایا: اسی لیے تو آیا ہوں کہ آپ کو مٹھائی کھلاؤں کہ میرا بیٹا ٹھیک ہو گیا ہے۔

اس لیے اپنی اولاد کو بددعا کبھی نہ دینا، کچھ بھی ہو جائے، ان کو بددعا نہ دو اور ان کو عاق بھی نہ کرو، انہیں دل سے معاف کر دو کہ اولاد بری ہے، جیسے ہے، میں اس کو اللہ کے معاف کرتا ہوں۔ اے اللہ! ان کو صالح بنا دے۔ تُو دلوں کو پھیرنے والا ہے، تُو قادر ہے، ان کے دلوں کو پھیر دے اور ان کو ہمارا فرمانبردار بنا دے، اطاعت گزار بنا دے۔ ان کو شرارت کی بجائے شرافت نصیب فرما دے۔ بے حیائی کے بجائے حیاء نصیب فرما دے۔ ان کے تمام امراض دور

کر دے۔ دعا کرتے رہو کہ رحمت کی گھڑی لگ جائے گی اور اللہ کی رحمت سے معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔

اس کو کہا کہ ہمارے ساتھ اس گائے کا سودا کرو۔ اس لڑکے نے کہا: نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے پاس اس کو لے کر آئے اور کہا کہ ہم نے اس لڑکے کو بڑے پیسے دیے ہیں، لیکن یہ گائے نہیں دیتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ان کو گائے کیوں نہیں دیتے؟ اس نے کہا کہ آپ کا حکم علیحدہ بات ہے، باقی وہ میرا مال ہے اور میری مرضی ہے کہ میں بیچوں یا نہ بیچوں۔ آپ نے فرمایا: تم نے بالکل سچ کہا، تمہارا مال ہے اور تمہارا حق ہے تم چاہو بیچ دو، چاہو نہ بیچو۔ موسیٰ نے ان لوگوں کو کہا کہ تم اس کو راضی کرو۔ اس لڑکے نے کہا کہ اگر تم نے مجھ کو راضی کرنا ہے تو مجھے اس کے برابر سونا وزن کر کے دیں تو وہ دس گنا سونے پر راضی ہوا۔ اس گائے کو لے لیا اور اس کو ذبح کر کے دو کندھوں کے درمیان ٹکڑے کو کاٹ کر مردے پر لگایا تو وہ زندہ ہو گیا اور اس نے بتلایا کہ مجھے میرے بھتیجے نے قتل کیا ہے۔ اس کو پکڑا گیا اور اس کو قتل کیا گیا۔

اور ایک دوسری روایت میں کچھ حضرات نے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ اس میں باتیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ جب ایک قبیلے نے دیکھا کہ بنو اسرائیل کے لوگ زیادہ شرارت کرنے لگے ہیں۔ انہوں نے اپنا علیحدہ ایک شہر بسایا۔ جب شام ہوتی تو کہتے کہ اندر آ جاؤ۔ شام کو گیٹ بند کر دیتے اور جب صبح ہوتی تو ان کا سردار خود جا کر دروازہ کھلواتا۔ اس بھتیجے نے چچا کو قتل کر کے اس کی نعش اسی شہر کے دروازے کے پاس ڈال دی۔ صبح کو جب سردار نے دروازہ کھلوانے کے لیے دیکھا کہ کوئی نہیں تو دروازہ کھلوایا۔

مفسر فرماتے ہیں کہ یہ جو واقعہ نقل کیا ہے، بعض عبیدہ کی روایات میں سے ہے اور بعض ابوالعالیہ کی روایات سے ہے اور بعض سدی کی روایات سے ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کس روایت میں قصہ زیادہ ہے اور کسی میں کم ہے اور کسی میں تفصیل ہے، کسی میں ابہام ہے اور کسی میں اجمال ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ یہ جتنا واقعہ ہم نے بیان کیا ہے، یہ کتب بنی اسرائیل سے لیا گیا ہے۔ جس کو کتابوں میں نقل کرنا تو جائز ہے، لیکن ہم اس کی تصدیق بھی نہیں کریں گے اور تکذیب بھی نہیں کریں گے، کیونکہ ہم صرف اتنا لیں گے جو اللہ کے قرآن کے مطابق ہے۔ اگر اللہ کے قرآن کے خلاف ہے تو ہم اس کو چھوڑ دیں گے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۰۹، ۱۱۰، البقرۃ: الآیۃ: ٦٧، ذِكْرُ بَسْطِ الْقِصَّةِ]

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بنو اسرائیل کی سرکشی اور ان کے کثرتِ سوال کے بارے میں خبر دی ہے کہ بلا وجہ اپنے پیغمبر سے سوال کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے بلا وجہ اپنے نفسوں پر خود تنگی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر

تنگی بڑھادی۔

مصیبت کو اپنی زبان سے نہ مانگو:

قاعدہ ہے کہ جب بندے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ معافی عطا فرماتے ہیں۔ روایات میں آیا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل جانے کے بعد تکلیف ہوئی تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے اس جیل کی زندگی سے نجات عطا فرمائیں، رہائی عطا فرمائیں۔ جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے اللہ نے پیغام دیا کہ آپ نے ہی تو کہا تھا: ﴿رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ﴾ [یوسف:۳۳] کہ یہ عورتیں مجھے جس طرف بلا رہی ہیں، اس سے زیادہ بہتر ہے کہ آپ مجھے جیل بھیج دیں۔ مجھے جیل منظور ہے، لیکن ان عورتوں کی بات ماننا منظور نہیں ہے۔ اس وقت جیل تم نے خود مانگی تھی تو ہم نے آپ کو مانگی ہوئی چیز دے دی ہے۔ اگر اس وقت تم یہ دعا مانگ لیتے کہ اے اللہ! مجھے عورتوں کے مکر سے بھی بچا اور جیل سے بھی بچا تو ہم دونوں سے بچا لیتے، ہمارے لیے تو کوئی مشکل نہیں تھا۔

[أدب الدنیا والدین، ص:۳۱۶، ۳۱۷]

اس لیے آدمی زبان سے کبھی ایسے الفاظ نہ کہے، زبان سے ایسے پیچیدہ سوالات کرنے کی کوشش نہ کرے کہ جس کا نتیجہ سختی کی صورت میں برآمد ہو۔

حدود میں احتیاط:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وعظ میں ارشاد فرمایا: اگر خدانخواستہ اپنے گھر میں یا کسی عورت کو زنا کرتے ہوئے دیکھے تو ضروری ہے کہ چار گواہ ہوں اور ان چار گواہوں کی شہادت ایسی ہونی چاہیے کہ اس عمل کو اپنی آنکھوں سے دخول کرتے ہوئے دیکھیں۔ یہ نہیں کہ ایک کمرے میں مرد و عورت کھڑے تھے تو اس پر حد جاری ہو جائے۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ ان کو تادیباً تو سزا دی جائے گی کہ ایک غیر محرم عورت کسی دوسرے کے کمرے میں کیوں پائی گئی؟ یا وہ غلط قسم کی باتیں کرتے ہوئے پائے گئے، لیکن ان پر حد جاری نہیں ہوگی۔ حد اس وقت جاری ہوتی ہے جب چار گواہ ایسی بات دیکھیں۔

اس لیے کبھی بھی ایسی بات زبان سے نہیں نکالنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ کبھی قرآن پاک کا کوئی حکم سنے اور فوراً ...... نعوذ باللہ! ...... اعتراض کر دے کہ یہ بات سمجھ نہیں آتی اور یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ دراصل اللہ تعالیٰ یہ چاہتے

نہیں ہیں کہ اس کے بندوں کو پتھر مار مار کر مارا جائے۔ وہ یہ چاہتے نہیں کہ لوگ فرضی قصے بنالیں اور ایک دوسرے پر حدود اللہ کا اجراء کردیں۔ اللہ نے جہاں سزا سخت رکھی ہے وہاں ثبوت اس سے بھی زیادہ سخت رکھا ہے کہ کروڑوں لاکھوں میں کوئی ایک آدھا قصہ ثابت ہوگا، وہ نمونہ بن جائے گا اور دنیا خود بخود ڈر جائے گی۔

جیسے ہمارے ہاں...... اللہ معاف فرمائے...... لوگ سر پر قرآن رکھ کر جھوٹی گواہی دے دیتے ہیں۔ آپ کسی کو پانچ سو روپے دے دیں اور جو مرضی آئے، گواہی دلوائیں۔ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ہمارے جتنے پولیس اسٹیشن ہیں، ان سب نے اپنے ٹاؤٹ رکھے ہوئے ہوتے ہیں، جو بھی کبھی وقوعہ ہوگا تو وہ اس کی گواہی لکھ دیں گے، ان کو پتہ ہے کہ ہمارا ٹاؤٹ ہے، جو ہم لکھ دیں گے، اس کی گواہی دے دے گا۔ حالانکہ اس گواہ کا نہ اس علاقے سے کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ اس گواہ کو اس واقعے کا کوئی پتہ ہوتا ہے۔ صرف پولیس نے اپنے اعتماد پر جو بندے رکھے ہوئے ہیں، ان کی گواہی خود بخود لکھ دیتے ہیں کہ یہ واقعہ یوں ہوا ہے۔ اور وہ بے ایمان عدالتوں کے اندر آکر کہتے ہیں کہ میری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ اللہ کو اپنے بندوں کا پتہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں میرے بندوں کے ایمان کا کیا مقام ہے، اس کے بعد تابعین میں ان کے ایمان کا کیا مقام ہے، اور اسی طرح جب قیامت تک دور چلا جائے گا تو ان کے ایمان کا کیا مقام ہوگا۔ اس لئے اللہ ایسا جامع قانون بناتے ہیں جو ہر دور میں کارگر ہو۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ سزا بہت کم ہو، لیکن ایسی ہو کہ پھر دنیا کے لئے نمونہ اور عبرت بن جائے۔ اس لئے حدود میں اگر تھوڑا سا شبہ بھی ہو جائے تو ساقط ہو جاتی ہیں۔

واقعہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک آدمی نے گواہی دی کہ میں نے اس حالت میں دیکھا ہے کہ عورت نیچے لیٹی ہوئی تھی اور مرد اس کے اوپر لیٹا ہوا تھا اور عورت کی ٹانگیں اوپر یوں کھڑی تھیں جیسے گدھے کے کان کھڑے ہوتے ہیں اور دونوں کی سانس اُکھڑی ہوئی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا: دخول دیکھا تھا؟ اس نے کہا: نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تک یہ گواہی نہ ملے تو حد جاری نہیں ہوگی۔

اسی طریقے سے کسی کو کہا جائے کہ قمار (جوا) حرام ہے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں جوا اور قسم کا تھا، اب ہم تو مشینوں سے کھیلتے ہیں، مشینیں فیصلہ کرتی ہیں۔ اس زمانے میں کمپیوٹر ہی نہیں تھا تو یہ جوا نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں جو خنزیر تھا، وہ اب نہیں ہے۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں جو کتا حرام تھا،

اب وہ کتاب ہی نہیں۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں جو چیزیں حرام تھیں، وہ اب تو نہیں ہیں۔ یہ اللہ کے قرآن میں اور اللہ کے احکام میں ایسے سوال پیدا کرنے سے اللہ کی طرف سے عذاب آتا ہے۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کو حکم دیا ہے کہ عمرہ کرو کہ میقات پر آ کر دو رکعت پڑھو، نیت کرو، احرام باندھو اور لبیک کہتے ہوئے کعبہ پاک میں آ جاؤ، طواف کرو، دو رکعت پڑھو، صفا اور مروہ کی سعی کرو، بال منڈاؤ اور احرام کھول دو، بس عمرہ پورا ہو گیا۔ اب آدمی کہے کہ میں جب عمرہ کے لیے آؤں تو حرم کے کس دروازے سے داخل ہوں؟ اپنے لیے وہ پریشانی پیدا کر رہا ہے۔ مثلاً وہ دوپہر کو آیا، دھوپ کا وقت ہے، "باب العمرہ" سے آیا اور ان کو کہا گیا کہ آپ نے "باب السلام" سے داخل ہونا ہے تو اب اس بے چارے نے سامان سر پر رکھا ہوا ہے اور بچوں کو لے کر دھوپ میں جا رہا ہے۔ حالانکہ اسلام نے کوئی پابندی نہیں لگائی۔

وہ تو ایک واقعہ ہے کہ جب حضور ﷺ داخل ہوئے تھے تو کس دروازے سے داخل ہوئے تھے؟ کوئی ضروری تو نہیں کہ ہم اسی جگہ سے داخل ہوں۔ جس جانب سے آ رہے ہو، اس میں داخل ہو جاؤ۔ جہاں سے بھی اللہ نے موقع دیا ہے داخل ہو جاؤ۔ اپنے آپ کو ایک پریشانی میں ہم نے خود ڈالا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم نے نیت کرنی ہے، وہ کیسے کریں؟ میرا کندھا حجر اسود کے کونے کے بالکل برابر ہو۔ یہ برابر کرتے کرتے اٹھارہ آدمی گر جاتے ہیں اور وہ ڈٹ کر کھڑا ہوا کندھا برابر کر رہا ہے، پیچھے والے اس کو آگے دھکا دے رہے ہیں، وہ پھر واپس آ جاتا ہے کہ کندھا تو برابر نہیں ہوا ہے۔ جب میں اشارہ کروں تو میرے ہاتھ کیسے ہوں؟ انگلیاں بند ہوں یا کھلی ہوں؟ انگوٹھا کدھر ہو؟ ہاتھ اوپر ہو یا نیچے ہو؟ اس طرح کھڑا ہے۔ خدا کے بندے! حجر اسود سے شروع کرنا ہے، ادھر اُدھر ہاتھ ہو گیا تو کیا بات ہو گئی؟ مطلب تو یہ ہے کہ اس سے پہلے شروع نہ کرو اور اس کے بعد شروع نہ کرو۔ باقی رہا اشارہ تو وہ بوسے کے قائم مقام ہے۔ دو ہاتھوں سے کرو گے تو الحمدللہ! اور اگر ایک ہاتھ سے کر دو گے تو الحمدللہ! پہلی دفعہ کر دیا یا آخری دفعہ کر دیا۔ درمیان میں بھول گیا، تب بھی کوئی بات نہیں، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

جب اسلام نے ہمیں پریشانیوں میں نہیں ڈالا تو ہم اپنے آپ کو پریشانیوں میں کیوں ڈالیں؟ بعض بے چارے ایک قسم کی چادر چھ، سات گز لمبی لیتے ہیں، اسی کو آدھا نیچے باندھتے ہیں اور اسی کو آدھا اوپر باندھتے ہیں، کسی نے بکسوا لگایا ہے اور کسی نے پن لگائی ہوئی ہے کہ اگر میرا احرام نیچے گر گیا تو عمرہ بھاگ جائے گا۔ یہ سب ہم نے اپنے لیے خود مشکلات پیدا کی ہیں۔

بعض آجاتے ہیں کہ یہ مسئلہ بتلائیں کہ جب ہم احرام باندھیں تو اس میں گرہ لگائیں یا نہ لگائیں۔ خدا کے بندے! چادر ہے، جیسے مرضی آئے باندھ لو۔ دو چادریں باندھنی ہیں، ایک اوپر باندھنی ہے اور نیچے باندھنی ہے، ہاتھ سے باندھ لو۔ گرہ لگادو یا رسی اوپر ڈال دو، جیسے مرضی آئے کرلو۔ بعض آدمی چادر ایسے باندھتے ہیں کہ جب صفا ومروہ پر دوڑتے ہیں تو آدھے ننگے ہوجاتے ہیں، کیونکہ وہ چادر ایسے باندھ رہا ہے کہ چادر کو گرہ نہ لگے۔ جب گرہ نہیں لگے گی تو آخر وہ کھلے گی۔

یہ وہ چیزیں ہیں کہ ہم اسلام کے اندر خود اپنے لیے مصیبتیں اور مشقتیں پیدا کرتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرائض، واجبات، سنتیں سکھا دیئے تو اب آپ مستحبات پر بھی عمل کرنے کی کوشش کریں۔ ہر چیز آہستہ آہستہ آسان ہوتی چلی جائے گی، ہر چیز آپ کو سمجھ آتی چلی جائے گی۔ اب جب آپ دوبارہ عمرہ کریں گے تو غور کریں کہ میری کوئی سنت تو نہیں چھوٹ گئی، میرا کوئی مستحب امر تو نہیں چھوٹ گیا۔ اگر فرائض اور واجبات پورے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

حجر اسود کو بوسہ دیتے وقت خوشبو لگانے کا حکم:

بعض لوگ آکر کہتے ہیں کہ اگر ہم نے حجر اسود کو ہاتھ لگادیا تو بکری پڑ جائے گی، کیونکہ اس کے اوپر خوشبو لگی ہوئی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر تمہیں خوشبو لگی ہوئی نظر آرہی ہے کہ کسی نے تازہ عطر لگایا ہے اور تم نے ہاتھ لگایا تو ہاتھ کو عطر لگ جائے گا تو تم ہاتھ نہ لگاؤ۔ اور اگر ویسے خوشبو آرہی ہے، اور وہاں تو سارا دن لوگ خوشبو لگاتے ہیں اور وہ خوشبوئیں ہمیشہ رہتی ہیں۔ اگر بفرض محال خوشبو لگ بھی جائے تو دھوڈالو، کیونکہ آپ نے خود تو لگائی نہیں ہے۔

کئی آدمی مسئلہ پوچھنے آجاتے ہیں کہ میں نے احرام باندھا ہوا تھا اور عرفات میں ایک کیڑا جارہا تھا تو کیا کروں؟ ویسے لوگوں کے سو بکرے جاتے ہیں، ادھر اس کو کیڑے کی فکر لگی ہوئی ہے۔ عمرہ کرنے حرام کے پیسے سے آیا ہوگا اور کیڑے کا مسئلہ پوچھ رہا ہے۔ کتنا اس نے جھوٹ بولا ہوگا اور فارم بھرتے ہوئے اس نے کتنی قسمیں کھائی ہوں گی، اس نے ڈالر لیتے ہوئے کتنے جھوٹ بولے ہوں گے، لیکن کیڑے کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ مر گیا ہے تو مر گیا۔ کچھ نہیں ہوتا۔ ایذاء دینے والی شئے ہے، مر گئی تو مر گئی۔

کیا حرم میں اب بھی شکار ہے؟

مسئلہ یہ ہے کہ احرام میں شکار نہ کھیلو تو کیا کیڑوں مکوڑوں کا کوئی شکار کھیلتا ہے؟ وہ تو ہے شکار، نہ کھیلو۔ اور اگر



آپ اپنا بکرا لے گئے، مرغے لے گئے اور خود ذبح کئے تو کوئی حرام نہیں ہے۔ یہ بھی اس زمانے کے مسئلے تھے کہ جس زمانہ میں یہ جگہ جنگل تھی اور شکار ملتے تھے، اب تو بندے ملتے ہیں، شکار تو نہیں ملتے۔ اب تو اس مسئلے سے ڈرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میری اتنی عمر گزر گئی ہے، مجھے تو بھی شکار نہیں ملا، آپ کو کہیں ملا ہو تو ملا ہو۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کوفی کا واقعہ:

مسجد الحرام کے اندر بیٹھے ہوئے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک آدمی نے مسئلہ پوچھا کہ حضرت! آپ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں، آپ میرا ایک مسئلہ حل فرمائیں کہ میں احرام میں تھا، ایک مچھر مجھ پر آ کر بیٹھا، میں نے اس کو مارا تو اس کا خون لگ گیا ہے۔ آپ نے اس کو غور سے دیکھا اور پوچھا: کہاں سے آئے ہو؟ اس نے کہا: میں کوفہ سے آیا ہوں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خون کر کے اس کو پرواہ نہیں اور یہاں مچھر کا مسئلہ پوچھنے کے لئے آیا ہے، بڑے شریف لوگ ہیں۔ خدا کے بندے! کچھ بھی نہیں ہوتا، مچھر کا خون لگ گیا، مکھی کا خون لگ گیا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

ہر مسئلے کا جواب ضروری نہیں:

حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے ایک مجلس میں سو مسئلے پوچھے گئے۔ آپ ہر مسئلے کے بعد فرماتے: "لَا أَعْلَمُ" (میں نہیں جانتا، کسی اور سے پوچھو)۔

جو آدمی کہہ دے کہ مجھے نہیں آتا، یہ عالم کی دلیل ہے۔ اور جو ہر مسئلہ بتا تا رہے، یہ جاہل کا کام ہے۔ ہر مسئلہ ذہن میں کیسے مستحضر ہو سکتا ہے؟ انسان ہے کوئی کمپیوٹر تو نہیں ہے۔ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جو ہم روزانہ پوچھے جاتے ہیں، وہ ہمیں یاد ہو جاتے ہیں، کیونکہ مسئلے کو بار بار پھیرا دیا گیا تو یاد ہو گیا اور دماغ میں بیٹھ گیا۔

حضرت ابن جریج روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کو حکم دیا گیا کہ کوئی گائے ذبح کر لو۔ لیکن ان لوگوں نے اپنے نفسوں پر خود سختی کی تو اللہ نے ان پر سختی کر دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اللہ کی قسم ہے، اگر وہ استثناء نہ کرتے، یعنی لفظ "ان شاء اللہ" نہ کہتے تو قیامت تک ان کو یہ مقصد حاصل نہ ہو سکتا۔ یہ تو جب ان کے منہ سے نکلا: ﴿وَإِنَّآ إِن شَآءَ ٱللَّهُ لَمُهْتَدُونَ﴾ [البقرة: ۷۰] تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مشکل حل کر دی۔

[الدر المنثور: ۱۸۸/۱، البقرة: الآیة: ۷۰]

آپ ان کو کہہ دیں کہ ایسی گائے ہو جو بالکل بوڑھی بھی نہ ہو اور بالکل جوان بھی نہ ہو۔ کیونکہ درمیانی عمر کے جانور کا نمو پورا ہو چکا ہوتا ہے۔ قوت، طاقت اور حسن کے اندر، جیسے جب انسان کی تیس سال کی عمر ہو تو عین شباب ہوتا ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ایسی گائے جس کا بچہ اور بچے کا بچہ بھی ہو چکا ہو۔

حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گائے سے مراد جنگلی گائے تھی، جسے ہم نیل گائے کہتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک قول یہ بھی نقل کیا گیا کہ جو آدمی زرد رنگ کا جوتا پہنے تو ہمیشہ اللہ پاک اس کو خوشی میں رکھے گا، جب تک وہ پہنے رکھے گا۔ لیکن اس کی سند کے بارے میں پتہ نہیں ہے کہ سند صحیح ہے یا نہیں۔ چونکہ اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک کے بارے میں بھی ضرور آتا۔ حالانکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی زرد رنگ کا جوتا پابندی کے ساتھ نہیں پہنا۔ عام طور پر مراکش کے لوگ پیلے رنگ کا جوتا پہنتے ہیں۔ دراصل بعض روایات کی نسبت کر دی جاتی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، لیکن حقیقتاً وہ قول ان کی ذات تک نہیں پہنچتا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس کے پاؤں یعنی کھر صفراء ہوں۔

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ اس کے سینگ اور کھر زرد رنگ کے ہونے چاہئیں۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ سیاہ رنگ کی گائے ہو۔ لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے۔

دیکھنے میں سیاہی مائل نظر آئے، جیسے ہمارے ہاں گندم کے کھیت یا گنے کے کھیت ہوتے ہیں۔ اگر بہت زیادہ سبز ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ سیاہی کی طرف مائل ہیں۔ یہاں بھی اصل معنی یہی تھا کہ زرد رنگ ہو، لیکن اتنا گہرا زرد ہو کہ سیاہ نظر آئے۔ اور تورات کے اندر سرخ رنگ کی گائے کا ذکر ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ نقل کرنے میں غلطی ہوئی ہے، کیونکہ جب قرآن ''صفراء'' کہہ رہا ہے تو تورات اس کے مخالف نہیں ہو سکتی، اتنا گہرا زرد ہو کہ دور سے سرخی کی طرف مائل نظر آئے۔ واللہ اعلم۔

﴿مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا﴾ ایک رنگ کی ہو، اس کے اندر دوسرے رنگ کے داغ نہ ہوں اور کسی قسم کا کوئی عیب نہ ہو۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اتنے بیانات اور اتنے سوالات و جوابات کے بعد انہوں نے محنت و مشقت کے بعد اس کو ذبح کیا۔ اس کے اندر ان کی مذمت کا بیان ہے، کیونکہ یہ بلا وجہ ان کی سرکشی تھی کہ گائے کیسی ہو؟ اس کا رنگ کیسا ہو؟ فلاں کیسا ہو؟ ان کے اسئلہ اور اجوبہ سے نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ وہ ذبح کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ اتنی بڑی قیمت ادا



کر کے ذبح کرنا بڑا مشکل تھا، لیکن ذبح کر ڈالا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پیسوں کے زیادہ ہونے والی بات تو کسی روایت سے ثابت نہیں ہے، البتہ بنی اسرائیل کی کتابوں سے یہ قصے نقل کئے گئے ہیں، جن کے صحیح ہونے کا ہمیں یقین نہیں ہے۔

یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ اس کی قیمت صرف تین دینار تھی۔ اس قول کی سند حضرت عکرمہ رحمہ اللہ تک بہت اچھی ہے۔ حضرت عکرمہ رحمہ اللہ نے بھی لازماً یہ اہل کتاب سے نقل کیا ہوگا۔ باقی جو قصے ہیں کہ اتنی اور اتنی قیمت تھی۔ جب یہ واقعات ہوتے ہیں تو کچھ لوگ خود قصے کو بڑھا دیتے ہیں اور اس کے اندر اپنی طرف سے عجیب عجیب باتوں کے اضافے کرتے رہتے ہیں۔ ایک نے اضافہ کیا، پھر دوسرے نے اضافہ کیا، پھر تیسرے نے اضافہ کیا، اس طرح بات بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی، حقیقت اس بات کی کچھ بھی نہیں ہوتی۔

بعض نے فرمایا: وہ اس لئے بھی ذبح نہیں کر رہے تھے، کیونکہ وہ کہہ چکے تھے کہ ہم قاتل نہیں ہیں۔ اگر ہماری جماعت کا کوئی آدمی قاتل نکل آیا تو ہم کتنے شرمندہ اور ذلیل ہوں گے۔ اس لیے سوال بڑھاتے رہو، نہ گائے ملے گی اور نہ ذبح کریں گے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۰، ۱۱۱]

حیوان میں بیع سلم:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان آیات سے جمہور نے یہ مسئلہ لے لیا کہ بیع سلم حیوان کے اندر جائز ہے۔

لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام ثوری رحمہ اللہ کے نزدیک حیوان میں بیع سلم جائز نہیں، کیونکہ حیوان کے احوال کو ضبط کرنا بڑا مشکل ہے۔ حیوان کے اندر بڑی قسمیں ہوتی ہیں، ان کو ضبط کرنا مشکل ہے۔ مثلاً دُبلا، فربہ ہونا وغیرہ۔ اور اس مسئلے کے اندر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیحدہ نہیں ہیں، بلکہ صحابہ میں سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ، عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۱]

﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾﴾ [البقرۃ: ۷۲، ۷۳]

اور جب تم نے ایک شخص کو مار ڈالا تھا، پھر ایک دوسرے پر دھرنے لگے اور اللہ نے ظاہر کرنا تھا جو تم چھپا رہے تھے۔ پھر ہم نے کہا: اس مردہ کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو، اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ تمہیں اپنی قدرت کے نمونے دکھاتا ہے، تاکہ تم غور کرو۔

اس آیت کو مؤخر کیوں کیا گیا؟

یہ آیاتِ مبارکہ سابقہ واقعہ کا تتمہ ہیں۔ اس بات کو پہلے ہونا چاہیے تھا۔ مفسرین کرام نے فرمایا: اس تقدیم و تاخیر میں ایک حکمت ہے، کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے، مخلوق کا کلام نہیں ہے، فصاحت و بلاغت میں دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اگر ترتیب سے بیان کیا جاتا تو وہ قصہ کا انداز ہو جاتا ہے، جیسے تاریخ کے قصص اور کہانیاں ہوتی ہیں، ان کی ترتیب ہوتی ہے اور قرآن قصے، کہانیوں کی کتاب نہیں ہے، قرآن کا مقصد غافل قوتوں کو جھنجھوڑنا اور جگانا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس لئے اس واقعہ کو مقدم و مؤخر بیان کیا کہ ان کو غفلت سے نکالا جائے اور ہر آیت کا ایک علیحدہ فائدہ حاصل ہو۔

علماء نے ایک جواب یہ بھی عطا فرمایا ہے کہ قرآن پاک ایک دفعہ نہیں اُترا، بلکہ تیئس سال کی مدت میں تھوڑا تھوڑا اُترا۔ آیات آیات، سورتیں سورتیں ہو کر نازل ہوئیں، جیسے جیسے بندوں کے اندر سوال و احتیاج پیدا ہوا، ویسے ان پر آیات نازل ہو گئیں۔

جب مدینہ منورہ میں بنی اسرائیل نے اپنی بڑائی کا اظہار کیا کہ ہم اہل کتاب اور اہل علم ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ فرمائی کہ تم موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے ہو، تمہارے تو باپ دادا کا بھی یہی حال تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام زندہ تھے۔

اس لئے کبھی آیات میں تقدیم اور کبھی تاخیر، کبھی واقعہ، قصہ کا ایک ٹکڑا اور کبھی دوسرا ٹکڑا اور کبھی تیسرا ٹکڑا ذکر کیا۔

اس آیت کے اندر لفظ ''نَفْسًا'' سے اشارہ ہے کہ تم نے ایک محترم شخص کو قتل کیا۔ جیسے تنوین کبھی قلت کا فائدہ دیتی ہے اور کبھی عظمت کا فائدہ دیتی ہے کہ ایک صاحب مال آدمی تھا اور اس کو قتل کرنے والا بھتیجا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو چچا والد ہوتا ہے، ''اَلْعَمُّ صِنْوُ أَبِيهِ'' چچا باپ کی طرح ہوتا ہے، جیسے باپ کا مقام ہے اسی طرح چچا کا مقام ہے تو ضروری تھا کہ چچا کی تم حفاظت کرتے، اس کی خدمت کرتے، نہ کہ اس کو قتل کر ڈالتے۔ پھر تم نے قتل کرنے کے بعد چھپانے کی کوشش کی، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ جس چیز کو تم چھپا رہے ہو، اس کو ظاہر کریں۔ آدمی چاہے سات دروازے بند کر کے گناہ کرے، گناہ چھپتا نہیں، آخر ظاہر ہو جاتا ہے۔

متأخرین علماء نے لکھا ہے کہ خاص طور پر کسی انسان کو قتل کرنا کبھی نہیں چھپتا، دیر سویر ضرور ظاہر ہو جاتا ہے، کیونکہ انسان کی حرمت اتنی بڑی ہے۔ اللہ کے پاک پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ کے کعبہ سے بھی انسان کی حرمت زیادہ ہے۔ جب اتنی بڑی باعظمت چیز کو کوئی قتل کر ڈالے تو یہ چیز چھپتی نہیں۔ سال یا اس سے زیادہ عرصہ کے بعد حقیقت کھل کر رہتی ہے، جیسے کسی شاعر نے کہا:

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر
لہو پکارے گا آستیں کا

لہو ایک دن بولتا ہے اس کو کھولنے کے لئے۔ یہاں ایک عجیب انداز ہے اللہ نے اس قتل کو کھولنے کے لیے اپنی قدرت کا ایک نرالا انداز دکھلایا۔ فرمایا: ﴿اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ (لگاؤ اس کو اس کا ٹکڑا)۔

گائے کا گوشت کا کونسا حصہ مردے کو لگایا گیا؟

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کی زبان کا ٹکڑا لگا دو۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس کی دم کا ٹکڑا لگاؤ، کیونکہ ہر چیز گل جاتی ہے، لیکن سرین کی ہڈی باقی رہتی ہے۔ قرآن پاک نے کوئی معین نہیں کیا کہ وہ ٹکڑا کون سا تھا۔ جب ٹکڑے کو لگایا گیا تو وہ مقتول کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا: میرا قاتل میرا بھتیجا ہے۔ یہ کہتے ہی وہ مر گیا۔ اللہ نے فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ [البقرة: ۷۳] اے جاہلو! اللہ تبارک وتعالیٰ اسی طرح مردوں کو زندہ فرما دیں گے جیسے یہ مردہ تمہارے سامنے زندہ ہو گیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سارے مردوں کو کھڑا کر دیں گے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۲]

ایک مردہ گائے کا ٹکڑا ایک مردہ انسان کو لگایا جائے اور وہ بول پڑے اور جہاں ہم نے اپنا ایک عظیم فرشتہ مقرر کیا ہے کہ صور میں پھونکے گا تو تمام ارواح دوڑ کر اپنے اپنے جسد میں پہنچ جائیں گی۔ اس وقت تمہارا زندہ کرنا کون سا مشکل ہے۔

لیکن بعض علماء نے ایک عجیب مثال لکھی ہے کہ گھوڑا، گدھا، خچر، گائے بھینس ان کو باندھ کر کھڑا کر دو۔ جب ان کے سامنے انسان کھاتا، پیتا، چلتا پھرتا ہے، اُٹھتا بیٹھتا ہے تو انسانی حرکتوں کو جانور عجیب انداز سے دیکھتے ہیں کہ یہ کیا کر رہا ہے، کیونکہ شعور حیوانی شعور انسانی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہاں جزو حیوانی سے جزو انسانی کو زندہ کر دیا۔ حالانکہ حیوان، حیوان ہوتا ہے اور انسان، انسان ہوتا ہے۔ انسان تو اشرف مخلوقات ہے۔ حیوان،



انسان کے عقل وشعور کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس سے ہم نے ایک مردہ کو زندہ کر دیا۔

مشکل واقعات میں خدا کی قدرت کا اظہار:

(واقعہ) ایک بات یہ بھی سمجھ لیں کہ جہاں جہاں تاریخ کے واقعات گزرے ہیں کہ مشکل واقعات پیش آئے تو میرے اللہ کی قدرتیں عجیب عجیب رنگ میں پیش آئیں، کیونکہ کمال قدرت اللہ کے ہاتھ میں ہے، تمام صفاتِ کمال و جلال سے متصف اللہ کی ذات ہے۔

(واقعہ) جب بی بی مریم علیہا السلام پر پوری قوم نے الزام لگا دیا کہ بغیر شادی اور نکاح کے بیٹا ہو گیا تو ...... نعوذ باللہ ...... لازمی بات ہے کہ یہ اولاد ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ تم بھی جھولے میں ہو، چند دن کے بچے ہو، جو عام عادت میں کبھی بولنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اللہ نے حکم دیا کہ تم بولو۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام بول پڑے اور فرمایا: ﴿إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ۖ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا﴾ [مریم: ۳۰] جب ایک بچہ اس طرح بول پڑا کہ بڑے سے بڑا عقل والا بھی اس طرح بات نہ کر سکے کہ کیا کہہ رہے ہو، میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ کا نبی ہوں، میں برکتوں والا ہوں، میرا وجود اللہ نے سراپا برکت بنا دیا ہے، تم کیا کر رہے ہو؟ تو اللہ نے کیسے بی بی مریم علیہا السلام کی صداقت، ان کی صفائی اور ان کی عصمت کو بیان کیا۔

(واقعہ) اسی طرح جب یوسف علیہ السلام کی عصمت کا وقت آیا، وہاں بھی ایک بچہ بول پڑا۔ اس نے کہا کہ عزیز مصر! تم تو بڑے وزیر ہو بڑے حاکم ہو، رات دن تمہارے سامنے قضایا اور جھگڑے آتے ہیں، اتنی عقل بھی نہیں رکھتے ہو، زلیخا اور یوسف علیہ السلام کا کرتہ دیکھ لو، موقع پر تم آ چکے ہو، دونوں کو کوئی لمبا چوڑا وقت تو نہیں ملا کہ وہ اپنا لباس بدل ڈالیں۔ اس لیے دیکھ لو کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص آگے سے پھٹی ہے یا پیچھے سے؟ اگر یوسف علیہ السلام کی قمیص آگے سے پھٹی ہے تو ...... نعوذ باللہ! ...... یوسف علیہ السلام کوشش کر رہے ہوں گے اور زلیخا کو پکڑنے کے لیے آگے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے اور وہ ان کو ٹالنے کی کوشش کر رہی ہوگی تو صاف ظاہر ہے قمیص آگے سے پھٹے گی۔ اور اگر یوسف علیہ السلام بھاگ رہے ہیں اور وہ پکڑ رہی ہے تو قمیص پیچھے سے پھٹے گی، یہ واضح بات ہے۔ جب قمیص پر نظر ڈالی تو یوسف علیہ السلام کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی تھی تو اس نے زلیخا سے کہا: واقعی یہ تمہارا مکر ہے اور عورتوں کا مکر بہت بڑا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ کرتی بھی خود ہیں اور الزام بھی خود لگاتی ہیں۔



(واقعہ) ایک عورت کو پیسے دے کر اس بات پر تیار کیا کہ جب موسیٰ علیہ السلام تقریر کے لیے خطبہ دیں تو تم کھڑے ہو کر الزام لگاؤ کہ......نعوذ باللہ!......موسیٰ (علیہ السلام) نے میرے ساتھ برا فعل کیا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے خطاب فرمایا تو خدا کی شان ہے کہ آپ زنا کی مذمت بیان فرما رہے تھے کہ اگر زانی محصن یعنی شادی شدہ ہو تو اس کی سزا رجم ہے، سنگسار کر دیا جائے گا۔ اتنے میں قارون کھڑا ہو گیا اور کہا کہ یہ سزا تو بڑی سخت ہے، لیکن اگر خدا نہ کرے، آپ سے بھی یہ جرم ہو جائے تو آپ کو بھی یہی سزا ملے گی؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: بالکل، اللہ کا قانون کسی کے لیے نہیں بدلتا، یہ کوئی بندوں کا قانون تو نہیں ہے کہ بڑا آدمی اس میں شبہ پیدا کر کے اور گواہوں کو توڑ موڑ کر چھوٹ جائے اور غریب بے چارا بغیر جرم کے بھی پڑا رہے۔

ایک اخبار کے اندر میں پڑھ رہا تھا کہ ایک صوبے کی جیلوں کے اندر کئی ہزار آدمی کئی سالوں سے جیل میں پڑے ہیں جن کا جرم بھی کوئی نہیں ہے، انہیں آج عدالت کے سامنے بھی نہیں لایا گیا کہ اس بے چارے کا جرم کیا ہے۔ بعض لوگ ایسے جرائم میں پکڑے گئے کہ جس جرم کے ثابت ہونے کے بعد اس کی سزا چھ ماہ بنتی ہے، لیکن وہ پانچ سال سے جیل میں پڑا ہوا ہے، ابھی تک فیصلہ نہیں ہو رہا۔ اب اس غریب کو کون پوچھے گا اور کون اس کا مقدمہ چلائے گا، کون اس کا وکیل کرے گا اور کیس نکالے گا؟

اس وجہ سے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ کے قانون کے اندر لچک پیدا ہونے کا کوئی سوال بھی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ تو عورت کھڑی ہو گئی اور کہا کہ دیکھو! یہ بچہ موسیٰ (علیہ السلام) کا ہے، موسیٰ علیہ السلام کو بھی جلال اور غصہ آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ میرا اللہ! اب یہ دشمن اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ تیرے نبی پر لوگوں میں کھڑے ہو کر اتنی بڑی تہمت لگائیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے اس عورت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: بتاؤ۔ اب عورت نے بھی کہا کہ قارون نے پیسے دیئے تھے۔

(واقعہ) فرعون کی لڑکی کی ایک خادمہ تھی جو اس کے بال بنایا کرتی تھی، اس کے ہاتھ سے ایک دن کنگھی گری اور اس کی زبان سے ایسا لفظ نکل گیا جس سے فرعون کی بیٹی کو شبہ ہو گیا۔ اس نے کہا: اچھا! تم فرعون کو خدا نہیں مانتی ہو؟ اس عورت نے کہا: میرا خدا تو خدا ہے، یہ تو بندہ ہے۔ بہر حال لمبا چوڑا واقعہ ہے۔

(واقعہ) اسی طرح اصحاب الاخدود کا واقعہ ہے کہ جب ایک عورت کو آگ میں ڈالنے کی باری آئی تو اس عورت کا ایک چھوٹا بچہ بھی تھا۔ اب لازمی بات ہے اور فطرتِ انسانی ہے کہ عورت کو جب آگ کی طرف لے جا رہے تھے تو اس کے پاؤں کانپ رہے، اس کا بچہ بول پڑا: ماں! گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ پانچ منٹ کی آگ ہے

اور آگے تو جنت ہی جنت ہے، فکر نہ کرو اور آگ میں چھلانگ لگاؤ۔ وہاں بھی اللہ پاک کی قدرت سے ایک چھوٹا بچہ بول پڑا۔

معجزاتِ رسول اکرم ﷺ:

اور کبھی کبھی پتھر بول پڑتے ہیں۔ حضور ﷺ کے ہاتھوں میں کنکریوں نے کلمہ پڑھ لیا، انہوں نے گواہی دی کہ یہ اللہ کے سچے نبی ہیں۔ صحیح مسلم شریف کے اندر واقعہ موجود ہے کہ مکہ میں اس پتھر کو اچھی طرح پہچانتا ہوں، میں ابھی نبی نہیں بنا تھا، یعنی ابھی نبوت بھی نہیں ملی تھی، مگر میں جب وہاں سے گزرتا تھا تو وہ پتھر مجھے سلام کہتا تھا۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۲۷۷]

ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب ہم حضور ﷺ کے ساتھ کبھی کبھی باہر جاتے تھے تو جس پتھر سے گزرتے، وہ سلام کہتا تھا اور جس درخت سے گزرتے، وہ بھی سلام کہتا تھا۔

[کنز العمال، حدیث: ۳۵۴۳۶]

اور اسی طرح صحیح احادیث کے اندر موجود ہے، میرے آقا، سرکارِ مدینہ ﷺ کو قضائے حاجت کے لیے ایک جگہ کی ضرورت تھی...... چونکہ حضور ﷺ بڑے شرمیلے اور سراپا حیا تھے اور میدان بالکل دور تک کھلا تھا، کوئی آڑ کی جگہ نہیں تھی کہ وہاں اوٹ میں بیٹھ کر قضائے حاجت کرلیں...... آپ نے ایک صحابی سے فرمایا: وہ دور کھجور کے دو درخت کھڑے ہیں، انہیں جا کر میرا سلام کہو اور ان کو کہو کہ وہ میرے پاس آجائیں۔ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے ان سے جا کر سلام کہا تو وہ اسی طرح چلتے ہوئے آئے جس طرح آدمی چل کر آتا ہے اور آ کر مل کر کھڑے ہو گئے۔ حضور ﷺ نے ان کی اوٹ میں بیٹھ کر فارغ ہو کر ان کو حکم دیا کہ چلے جاؤ تو وہ چلے گئے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۳۰۱۲]

کھجور کی لکڑی کے رونے کا معجزہ:

اسی طرح حضور ﷺ جب مسجد نبوی میں ابتدائے اسلام میں خطبہ دیتے تھے، اس وقت کھجوروں کے ستون تھے اور کھجوروں کی چھڑیاں چھت ڈالی گئی تھیں۔ آپ کے لیے جو منبر بنایا گیا، وہ کھجور کا ایک تنا تھا، اس سے آپ ٹیک لگا کر کھڑے ہو جاتے اور خطبہ فرماتے تھے۔ ایک عورت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا: یا رسول اللہ! میرے پاس جو غلام ہے، وہ لکڑی کا کام جانتا ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے کوئی منبر بنوا لوں، تاکہ آپ آرام سے اس کے اوپر بیٹھ سکیں۔ حضور ﷺ نے اجازت دے دی۔ اس نے تین قدم کا ایک منبر



بنایا، تاکہ حضور ﷺ اس پر بیٹھنا چاہیں تو بیٹھ جائیں اور اگر اس پر کھڑے ہونا چاہیں تو کھڑے ہو جائیں۔ منبر جمعہ والے دن لا کر رکھ دیا گیا۔ حضور ﷺ نے اس پر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا اور کھجور کے ستون سے ٹیک نہ لگائی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ اس ستون نے رونا شروع کر دیا۔ لکڑی کا ستون رو رہا ہے، جیسے کوئی بچہ ماں باپ کے فراق وجدائی میں روتا ہے۔ حضور ﷺ اُترے اور اس ستون کو گلے لگایا اور تسلی دی تو اس کا رونا اور بلبلانا ختم ہوا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۹۱۸، باب: الخطبۃ علی المنبر]

بے جان اشیاء کو نطق دینے کے واقعات:

آپ ﷺ نے اُحد پہاڑ کے متعلق ارشاد فرمایا: یہ وہ پہاڑ ہے جس کو ہم محبوب رکھتے ہیں اور وہ بھی ہم سے محبت کرتا ہے۔ اب پہاڑ کیسے محبت کرتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس میں ادراک اور شعور پیدا نہ کرے۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۴۰۸۳]

صحیح حدیث مبارک کے اندر ہے کہ حضور ﷺ، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بعض روایات میں ہے کہ جبل اُحد پر تھے تو پہاڑ میں زلزلہ آیا اور اضطراب پیدا ہوا۔ حضور ﷺ نے اس پر اپنا پاؤں مارا اور فرمایا: "اُسْکُنْ" (ٹھہر جاؤ)۔ تمہارے اوپر کوئی نہیں، مگر ایک اللہ کا نبی ہے، ایک صدیق ہے اور ایک شہید ہے۔ پہاڑ نے سمجھ لیا اور چپ ہو گیا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۳۶۸۶، باب: مناقب عمر بن الخطاب...]

اللہ تعالیٰ اپنی کمال قدرت کے نمونے دکھاتے ہیں۔ چاہتے ہیں تو آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرما دیتے ہیں، بی بی حواء علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا فرما دیتے ہیں اور چاہتے ہیں تو ملائکہ کو نور سے پیدا فرما دیتے ہیں، چاہتے ہیں تو جنوں کو آگ سے پیدا فرما دیتے ہیں، چاہتے ہیں تو بنو آدم کے توالد وتناسل کو نطفہ منی سے پیدا فرما دیتے ہیں اور کبھی چاہیں گے تو اتنی بڑی مخلوق کو اپنے حکم "کُنْ" سے پیدا فرما دیں گے، جیسے تخلیق میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت کا اظہار فرمایا ہے۔ اگر ساری دنیا مٹی سے پیدا ہوتی تو دشمنانِ اسلام، فلاسفہ یونان، اور جو لوگ عقلیات کی دنیا سے باہر نہیں نکلتے تو وہ کہتے کہ مٹی کے اندر ایک مادہ ہے، اسی سے ہر چیز پیدا ہوتی ہے۔ اللہ نے فرمایا: میں چاہتا ہوں تو مٹی سے بھی پیدا کرتا ہوں اور میں چاہتا ہوں تو آگ سے بھی پیدا کرتا ہوں، حالانکہ آگ کا کام جلانا ہے، لیکن اللہ نے جنوں کو آگ سے پیدا کر دیا، نور کا کام روشن کرنا ہے، لیکن اللہ نے ملائکہ کو نور سے پیدا فرما دیا۔ ایک نطفہ حقیر، مادہ منویہ ہے، پانی کے چند قطرے ہیں، "ماء مھین" ہے، اس سے اللہ نے اتنی

بڑی مخلوق پیدا فرمادی۔

موت کے مختلف انداز:

جیسے تخلیق کے اسباب مختلف ہیں، اسی طرح موت کے اسباب بھی مختلف ہیں۔ کسی کو بیماری سے موت آگئی، کسی کو دل کے صدمے سے موت آگئی، کسی کو چوٹ لگنے سے موت آگئی، کسی کو زہر سے موت آگئی، کسی کو خسف سے موت آگئی اور کسی کو مسخ سے موت آگئی۔ پھر موت کے مراحل مختلف ہیں تو پھر جلانے کے مراحل بھی مختلف۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کہیں تو مُردوں کو یوں جلایا (زندہ کیا) کہ مردے پر کھڑے ہوجاؤ اور کہو: ''قُمْ بِإِذْنِ اللهِ'' تو مردہ کھڑا ہوگیا۔ یہ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے معجزہ دیا تھا۔ اور کہیں اللہ نے یہ انتظام عجیب فرمادیا کہ ایک آدمی قتل ہو کر مرجاتا ہے، اس کے قاتل کی تلاش ہے اور اس کے لئے کئی قدرت کے ذرائع ہوسکتے تھے، وہ قاتل خود بول پڑتا کہ میں قاتل ہوں۔

قیامت میں بھی ایسا واقعہ ہوگا کہ جب گواہ آجائیں گے، جب اللہ کے نبی گواہیاں دے دیں گے، لیکن منکرین پھر بھی نہیں مانیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے ملائکہ سے فرمائیں گے: ﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓي اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [یٰس:٦٥] آج کے دن ان کی زبانوں پر مہر لگادو، ان کے منہ بند کردو۔ ان کے ہاتھوں کو ہم حکم دیں گے کہ بولو، گواہی دو۔ ان کے پاؤں کو حکم دیں گے کہ بولو، گواہی دو۔ جو کچھ تم نے دنیا میں کیا تھا، بولو۔ اب ہاتھ بول رہے ہیں، پاؤں بول رہے ہیں، ران بول رہی ہے اور جبڑے بول رہے ہیں، ہر چیز گواہی دے رہی ہے۔ آدمی ہکا بکا کھڑا ہے کہ میرے اعضاء میرے خلاف ہوگئے، دوسروں کی گواہی کا تو میں نے انکار کردیا، اب ان کا کیا کروں۔ اب کافر حیران ہوں گے اور غصہ سے جھنجھلا اٹھیں گے اور کہیں گے: ﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ [فصلت:٢١] اے ہمارے اعضاء! دنیا میں ہم نے تمہیں لذتیں دیں، مزے کرائے اور آج تم ہی ہمارے خلاف گواہی دے رہو؟ تم نے کیوں ہم پر گواہی دی ہے؟ چمڑے کہیں گے: اے بدبخت! کیا کہہ رہے ہو؟ جس اللہ نے زبان اور پتھروں کو بلوادیا، اس نے ہمیں حکم دیا تو ہماری کیا طاقت ہے کہ ہم نہ بولیں؟ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے کمال قدرت کے نظارے دکھلاتے ہیں کہ ہم چاہیں تو تمہاری زبان سے گواہی لے لیں، ہم چاہیں تو تیرے پاؤں بول پڑیں، ہم چاہیں تو تیرے ہاتھ بول پڑیں، ہم چاہیں تو پتھر بول پڑیں، ہم چاہیں تو ایک

مردہ گائے کا ٹکڑا انسان کو لگاؤ تو وہ زندہ ہو جائے۔

زہر آلود گوشت حضور اکرم ﷺ کے سامنے بول پڑا:

اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے اندر بڑے بڑے عجائب اور بڑی بڑی حکمتیں رکھی ہیں۔اس کے اندر ایک اور بھی تنبیہ کی گئی ہے۔علماء نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل فخر کرتے تھے کہ ہم اہل کتاب ہیں، ہم اہل علم ہیں، ہمارے اندر احبار ورہبان ہیں اور ہم صاحب تورات ہیں۔اللہ نے فرمایا کہ تمہارے آباؤ اجداد جو اتنے بڑے علم کے دعویدار ہیں، ایک قاتل کو تلاش نہ کر سکے اور ہم نے چاہا تو ایک مردہ جانور سے تلاش کر دیا۔اللہ کی کمال قدرت دیکھیں! کبھی خود گوشت بول پڑتا ہے اور کبھی گوشت سے وہ مردہ بول پڑتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ جب غزوۂ خیبر پر گئے تو ایک یہودیہ عورت نے بکرے کے چوڑے میں زہر ملا کر اور بھون کو حضور ﷺ کی خدمت میں بھیج دیا۔حضور ﷺ نے وہ لقمہ اُٹھایا تو وہ گوشت بول پڑا کہ حضور! مجھے استعمال نہ کریں، میرے اندر تو زہر ہے۔جب یہودیہ کو پکڑا گیا اور اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا آپ کو کس نے بتلایا؟ فرمایا: یہ گوشت بول رہا ہے۔

[صحيح البخاري، حديث:٥٧٧٧، باب ما يذكر في سم النبي ﷺ]

دراصل دکھانا یہ ہوتا ہے کہ غافل لوگ سمجھ جائیں، ہر چیز کا مالک اللہ ہے، قدرتِ کاملہ اللہ کو حاصل ہے، تمام احیاء و اماتت کی قدرت اللہ کو ہے۔

﴿فَادّٰرَءۡتُمۡ﴾ کا معنی وتفسیر:

﴿فَادّٰرَءۡتُمۡ﴾ کا معنی ہے: ''اِخۡتَلَفۡتُمۡ'' یعنی اس میں تم نے جھگڑا کیا اور ایک دوسرے پر الزام دھرا۔ ﴿فَادّٰرَءۡتُمۡ﴾ کی تفسیر امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی ''اِخۡتَلَفۡتُمۡ'' سے کی ہے اور حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے اس کا معنی ''اِخۡتَصَمۡتُمۡ فِيهَا'' سے کیا ہے کہ تم نے اس میں جھگڑا کیا۔

حضرت ابن جریج رحمہ اللہ نے فرمایا کہ کچھ کہتے تھے: تم نے قتل کیا۔دوسرے کہتے: نہیں، تم لوگوں نے قتل کیا۔اصل میں یہ تفسیری الفاظ ہیں، ہر انسان جب تفسیر بیان کرتا ہے تو فطری بات ہے کہ وہ الفاظ اپنے ہی استعمال کرے گا۔
اس لیے بعض نے فرمایا: ''اِخۡتَلَفۡتُمۡ'' کہ تم نے اختلاف کیا۔اور بعض نے فرمایا: ''اِخۡتَصَمۡتُمۡ'' کہ تم نے جھگڑا

کیا۔ بعض نے دوسرا معنی کیا۔ بات ایک ہی بنتی ہے، اس میں کوئی تضاد نہیں ہے، صرف ہر انسان کے تفسیری الفاظ کی ادائیگی علیحدہ ہے۔

﴿وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۷۲] حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو کچھ تم چھپاتے ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ظاہر کرنے والے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ علیم بذات الصدور ہیں، اس کے سامنے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ چاہے انسان اس کو کتنا چھپانا چاہے، انسان اس کو دل میں رکھے، دماغ میں رکھے، افکار میں رکھے، وہ اللہ کے آگے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۲، البقرۃ: الآیۃ: ۷۲]

بھلائی اور برائی کبھی پوشیدہ نہیں رہتی:

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حبیب بن رافع رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ کوئی آدمی اگر سات گھروں کے اندر چھپ کر بھی بھلائی کا کام کرے تو اللہ اس کو ظاہر کردیتے ہیں۔ اور کوئی آدمی برائی کا کام سات گھروں کے اندر چھپ کر کرے تو وہ بھی ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ اس کی تصدیق کے لیے انہوں نے اس آیت مبارکہ کو پڑھا۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی آدمی نے بھلائی کی اور کسی کو پتہ نہ چلا، یعنی عام اصولی طور پر قاعدہ یہ ہے کہ جو آدمی اچھائی کرتا ہے، وہ بھی ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ اور جو برائی کرتا ہے، وہ بھی ظاہر ہو کر رہتی ہے۔
اور بعض علماء نے فرمایا کہ اس کا ترجمہ یوں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اگر چاہیں تو اس کو ظاہر فرما دیتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۲، البقرۃ: الآیۃ: ۷۲]

گوشت کا کون سا حصہ مردہ کو لگایا گیا؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے اس گائے کے تلاش کرنے میں چالیس سال محنت کی اور چالیس سال کے بعد ان کو اس قسم کی گائے ایک آدمی کے پاس ملی اور وہ اس کو کہتے کہ اتنی رقم لے لو اور اتنی رقم لے لو۔ اس نے کہا: نہیں۔ حتیٰ کہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کا چمڑا مجھے اشرفیوں سے بھر کر دے دو، پھر میں گائے دوں گا۔ انہوں نے قیمت ادا کی اور اس گائے کو ذبح کر کے اس کا ٹکڑا مردے کو لگایا تو وہ مقتول کھڑا ہوا کہ اس کی رگوں سے خون بہہ رہا تھا، جیسے قتل کے وقت تھا۔ اور اس نے بتایا۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ ہڈی جو حلقوم کے قریب ہوتی ہے، اس کو لگائی گئی تو وہ بول پڑا اور بعض روایات کے اندر ہے کہ انہوں نے گوشت کا کچھ حصہ مقتول کو لگایا۔

حضرت معمر نے حضرت قتادہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے ران کے حصے کا گوشت لگایا تو وہ کھڑا ہو گیا اور کہا کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے گائے کی ران کے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر لگایا تو وہ کھڑا ہو گیا اور بتلایا کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے۔

حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دو کندھوں کے درمیان جو گوشت کا ٹکڑا ہے، وہ لگایا تو وہ زندہ ہو گیا۔ اس سے پوچھا گیا کہ تمہیں کس نے قتل کیا ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے میرے بھائی کے بیٹے نے قتل کیا ہے۔

ایک روایت کے اندر یہ آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ تم اس گائے کی ہڈی کا کوئی ٹکڑا لے کر اس مردے کو لگاؤ۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۲، البقرۃ: الآیۃ: ۷۲]

اسرائیلی روایات کا حکم:

پہلے کئی دفعہ عرض کر دیا ہے کہ یہ ساری روایات اسرائیلیہ ہیں۔ ویسے علماء کے نزدیک یہ بات متفق علیہ ہے کہ اسرائیلی روایات کو نقل کرنا جائز ہے، ان کو کتابوں میں نقل کیا جائے گا، تاکہ ہماری معلومات میں کچھ اضافہ ہو جائے، لیکن ان کے بارے میں یہ بھی پکی بات ہے کہ ہم ان کی نہ تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب کر سکتے ہیں۔

بعض علماء کرام نے ایک اچھی تفصیل بیان فرمائی کہ اگر ہمیں اسرائیلی کتابوں میں کوئی روایت ملتی ہے، اب ہم اس کو دیکھیں گے کہ وہ روایت اللہ کے احکام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اس کو قبول کر لیں گے، کیونکہ اس کی تصدیق قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ اور کتب اسرائیلیہ کی جو روایت مخالف قرآن و سنت ہے، اس کو ہم رد کر دیں گے۔ اور جو کتب اسرائیلیہ کی روایت ہے کہ اس میں نہ مخالفت ہے اور نہ موافقت ہے تو ایسی روایات ہم صرف معلومات کے لیے لیں گے، لیکن اس پر ہم سو فیصدی اعتماد نہیں کر سکیں گے۔ تصدیق اس لیے نہیں کر سکتے کہ خدانہ کرے، وہ روایت جھوٹی ہو اور ہمیں اس کی کوئی سند بھی معلوم نہیں، اور تکذیب اس لیے نہیں کر سکتے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کی کوئی آیت ہو تو ہم اللہ کے حکم کی تکذیب کر بیٹھیں۔

حضرت عبدالرحمن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ اس گائے کے بعض ٹکڑے اس مردے کو لگائے گئے۔

اور بعض نے کہا کہ ریڑھ کی ہڈی کا آخری مہرہ لگایا گیا۔ اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ زندہ فرمائیں گے مردہ کو۔ اسی طرح کا معنی یہ نہیں ہے کہ گائے ذبح ہوگی، اس کے گوشت کے ٹکڑے آئیں گے اور مُردوں کو لگائے جائیں گے، بلکہ معنی یہ ہے کہ جو خداوند کریم اس مُردہ کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے، تمام مردہ مخلوق کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔ اس لیے ایک تشبیہ دی گئی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ دنیا کے اندر کچھ ایسے واقعات دکھلا دیتے ہیں کہ انسانوں کو عقلی طور پر اعتراض باقی نہ رہے کہ جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہوجائیں گے تو ہم دوبارہ کیسے زندہ ہوں گے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۲، البقرۃ: الآیۃ: ۷۲]

سورۃ بقرۃ میں پانچ مقامات پر اِحیائے موتی کا بیان:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورۃ البقرۃ کے اندر اللہ نے پانچ جگہ پر احیاء موتی کا مسئلہ ذکر فرمایا ہے:

- ......﴿ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۵۶] جب ستر آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر گئے تھے اور ان پر بھی موت آگئی تو اس کے بعد ہم نے تم کو دوبارہ زندہ کیا۔
- ......دوسرا قصہ یہ ہے۔
- ......اور تیسرا ان لوگوں کا قصہ ہے جو اپنی حویلیوں سے نکلے اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے، ان پر بھی موت آگئی۔
- ......اور وہ قصہ جو بستی پر گزرے جو مُردہ ہو چکی تھی۔
- ......اور اللہ پاک نے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا ہے۔

وہ پانچوں قصے اسی سورت کے اندر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمادی کہ جیسے ہم ایک مُردے کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہیں، اسی طرح تمام مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسے واقعات میں اپنے بندوں کو تنبیہ کی ہے وہ مسئلہ معاد کو بھی سمجھ لیں۔

مُردوں کو زندہ کرنے کی مثال:

حضرت ابورزین العقیلی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر پوچھا کہ یارسول اللہ! اللہ مُردوں کو کیسے زندہ فرمائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا کبھی ایسی بستی پر گزر ہوا ہے جو اُجڑ گئی ہو اور ویران ہوگئی ہو؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں جی۔ آپ نے فرمایا: پھر کبھی وہاں سے گزرے بھی ہو کہ وہاں آبادی ہے، سبزہ نکل آیا ہے؟ انہوں

نے عرض کیا: ہاں، حضور! ایسا بھی ہوا ہے، کئی دفعہ ہم گزرے ہیں، زمین خالی پڑی ہے، بارشیں ہو جاتی ہیں اور پھر گزرتے ہیں تو سبزے نکل آتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ'' اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ قادر ہیں کہ مُردہ زمین کو زندہ کر کے اس سے سبزہ اُگا لیتے ہیں تو ''كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى'' ان مُردہ انسانوں کو بھی دوبارہ اُگا لیں گے۔ ان کے آگے کیا مشکل ہے؟ اس نے کہا: ہاں! یہ بات ٹھیک ہے۔

[مسند أحمد بن حنبل، حدیث: ۱۶۱۹۳، ۱۶۱۹۴]

امام مالک رحمہ اللہ نے اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط فرمایا ہے کہ مرنے کے بعد جب کوئی آدمی زندہ ہو کر کہے تو اس کی بات سچی ہوگی، اس لیے کہ وہ عالم برزخ کا مشاہدہ کر چکا ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اب قبر میں جانے کے بعد، موت کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی جھوٹ بولے۔ جیسے اس واقعہ کے اندر ہے کہ مقتول کو مارا گیا، اللہ تعالیٰ نے اس کو زندہ کیا تو اس نے کہا کہ فلاں نے مجھے قتل کیا ہے۔ چنانچہ اسی کی بات پر فیصلہ کیا گیا اور اس سے گواہ نہیں مانگے گئے کہ تم گواہ لے آؤ۔ واقعی اس نے تمہیں مارا تھا یا نہیں مارا تھا؟ اس کے استنباط کا فائدہ یہ ہے کہ عام طور پر تو قتل تب تک ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ گواہ نہ ملیں۔ اور شواہد اور آلۂ قتل یہ چیزیں اعانت کرتی ہیں، اصل ثبوت تو گواہوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۳]

ایک یہودی کا سر کچلنے کا واقعہ:

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک یہودی نے ایک لڑکی کو اس طرح قتل کیا کہ اس کے سر کو پتھر پر رکھ کر اس کے سر پر پتھر مارا۔ ابھی اس لڑکی کے اندر جان موجود تھی، کچھ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ اس سے پوچھا کہ تمہیں کس نے مارا؟ کیا فلاں نے مارا؟ جب اس یہودی کا نام آیا تو اس نے کہا کہ ہاں! مجھے اس یہودی نے مارا ہے۔ اس یہودی کو پکڑا گیا تو اس نے حضور پاک ﷺ کے سامنے اقرار کر لیا کہ واقعی میں نے مارا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کا سر بھی اسی طرح پتھر پر رکھواور اس کے سر پر پتھر مار کر اسی طرح اس کا سر کچل ڈالو، جیسے اس نے کیا تھا۔ چنانچہ اس کو وہی سزا دی گئی۔ [صحیح البخاري، حدیث: ۵۲۹۵ بَابُ: الإِشَارَةِ فِي الطَّلَاقِ وَالأُمُوْرِ]

لیکن جمہور کہتے ہیں کہ اور شواہد بھی ہوں۔ باقی اس واقعہ کو امام مالک رحمہ اللہ حجت بنا رہے ہیں، وہ تو معجزہ ہے، نبی موجود ہے اور اللہ کے حکم سے یہ کیا گیا۔ اسی طرح جب اس لڑکی کو کہا گیا کہ فلاں یہودی نے مارا ہے؟ اس یہودی نے بھی پکڑے جانے کے بعد اعتراف کر لیا کہ میں نے کیا ہے۔ اس لیے جمہور کہتے ہیں کہ صرف مقتول کا کہہ دینا

کافی نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ دیگر شواہد بھی دیکھے جائیں گے کہ اس بات پر وہ دلالت کر رہے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: 1/113]

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٧٤﴾﴾ [البقرۃ: 74]

پھر اس سب کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی سخت، اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہیں جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور ان میں ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکلتا ہے اور ان میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں، اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔

آیت کا ماقبل سے ربط:

اس آیت کے اندر بھی بنی اسرائیل کا ذکر ہے۔ قرآن پاک میں کسی بھی واقعہ کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے عبرت پکڑنی چاہیے اور موعظت حاصل کرنی چاہیے۔ ان تمام واقعات کے بعد جو آپ پڑھ چکے ہیں، بنو اسرائیل کو چاہیے تھا کہ اللہ کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتے، ان کی فرمانبرداری کرتے اور ان کی اتباع کرتے، لیکن وہ اور زیادہ اکڑ گئے اور زیادہ نافرمانیوں اور گناہوں کی زندگی میں پڑ گئے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی توحید کے راستے سے ہٹ گئے تو ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ ان کی ان کیفیات کا ذکر فرما رہے ہیں کہ اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے اور یہ ایسے ہو گئے جیسے پتھر یا اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پتھر سے تشبیہ دی ہے، حالانکہ لوہا، تانبا، پیتل اور بھی ایسی دھاتیں موجود ہیں جو بہت سخت ہیں، ان سے بھی تشبیہ دی جا سکتی تھی۔ اور لوہا وغیرہ ایسی دھاتیں ہیں جو پتھروں کو بھی توڑ ڈالتی ہیں، لیکن اللہ نے ان کے دلوں کو پتھر کے ساتھ تشبیہ اس لیے دی کہ تانبا، لوہا، پیتل کو اگر آگ پر رکھا جائے تو پگھل جاتا ہے، لیکن پتھر ایک ایسی چیز ہے جو پگھلتا نہیں ہے۔ اس میں اشارہ کیا گیا کہ تمہارے دل ایسے سخت ہو گئے ہیں کہ تمہارے سامنے تخویف بھی آئی، تمہارے سامنے ترہیب بھی آئی، تمہارے سامنے اللہ کے عذاب بھی آئے، تمہاری

اپنی قوم بنی اسرائیل میں سے ستر ہزار بندوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسخ کر کے بندر اور خنزیر کی شکل بنا دیا اور وہ تین دن تک زندہ رہے اور اس کے بعد مر گئے۔ اتنا بڑا عذاب دیکھنے کے باوجود بھی تمہارے دل نہیں پگھلے۔

یاد رکھیں! اصل صلاح دل کی صلاح ہے اور اصل بگاڑ دلوں کا بگاڑ ہے۔ اگر دل ٹھیک ہو جائیں تو سارا جسد خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہے اور اگر دل بگڑ جائیں تو سارا بدن خود بخود بگڑ جاتا ہے۔ اس لیے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بدن میں ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ جب وہ ٹھیک ہو جاتا ہے تو سارا بدن ٹھیک ہو جاتا ہے، جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے، خبردار وہ دل ہے۔[1] حضور ﷺ نے اسی لیے رات دن یہ دعائیں مانگیں: ''اَللّٰهُمَّ يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ! ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰى دِيْنِكَ'' اے میرے اللہ! دلوں کا مالک تُو ہے، مہربانی فرما کر انہیں دین پر ثابت قدم فرما دے۔

[سنن الترمذي، حديث: ٢١٤٠، باب: ما جاء أنّ القلوب بين أصبعي...]

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ ''ذٰلِكَ'' سے اشارہ ہے کہ جو واقعات آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں، جو آیات و معجزات آپ دیکھ چکے ہیں، ﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ ان کو دیکھ کر بھی ان کے دل پتھر ہو چکے ہیں یا پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو چکے ہیں، اس لیے حدیث پاک میں بڑی مختصر دعا آئی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ دعا مانگا کرو: ''اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْقَسْوَةِ وَ الْغَفْلَةِ'' اے اللہ! ہمیں بدبختی اور غفلت سے پناہ عطا فرما کہ ہمارے دل سخت ہو جائیں یا ہمارے دلوں پر شقاوت کا زنگ لگ جائے، ہم تجھ سے پناہ مانگتے ہیں۔

[المعجم الصغير، حديث: ٣١٦]

پتھروں کی اقسام:

اللہ تعالیٰ نے یہاں پتھروں کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی قسم:

اللہ نے فرمایا: بعض پتھر ایسے ہیں کہ جن سے نہریں بہہ رہی ہیں، چشمے جاری ہو جاتے ہیں اور وہ نہریں نکل نکل کر دنیا سیراب کر رہی ہیں۔ علماء نے فرمایا کہ اللہ نے یہ ان علماء کی مثال دی ہے جو علماء راسخین ہوتے ہیں، جو اپنے علم پر عمل کرنے والے ہیں، قرآن و سنت پر چلنے والے ہیں، جن کو اللہ نے قرآن میں ''رَاسِخُوْنَ'' لقب دیا ہے:

[1] [صحيح البخاري، حديث ٥٢، باب: فضل من استبرأ لدينه]

﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ [آل عمران: ۷]

بعض وہ ہوتے ہیں جو علماء کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں، علماء کی شکل وصورت بنا لیتے ہیں، وہ علم سے بھی دور ہوتے ہیں اور عمل سے بھی دور ہوتے ہیں، فقط انہوں نے لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے ایک شکل بنائی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کی مثال قرآن دیتا ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ [الجمعۃ: ۵] جیسے ایک گدھا ہو اور اس کے اوپر آپ کتابیں لاد دیں۔ اس لیے اگر کوئی عالم ایسا ہے جس کا مطالعہ بھی ہے، جس کی وسعتِ نظر بھی ہے، مطالعہ کی عادت بھی ہے، لیکن عمل نہیں ہے تو اس کی مثال گدھے کی ہے، جیسے اس کے اوپر کتابیں لاد دی جائیں۔

تو علماء راسخین کی مثال اس پتھر کی سی ہے جس سے چشمے اور نہریں پھوٹتی ہیں اور پوری دنیا کو سیراب کرتی ہیں۔ اس لیے آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً خلفائے راشدین کے علم پر نظر ڈالیں، تابعین محدثین، فقہاء اُمت کے علم پر نظر ڈالیں، آپ ذرا آنکھیں بند کر کے غور کریں کہ کتنے لوگ اس عالم میں ہیں جو فقط امام بخاری رحمہ اللہ، امام مسلم رحمہ اللہ، امام نسائی رحمہ اللہ اور امام ترمذی رحمہ اللہ کی محنت سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں؟ اور پورے عالم اسلام میں کتنے لوگ ہیں جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی فقہ اور مسائل سے استفادہ کر رہے ہیں تو ان کے علم کی بھی اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا میں نہریں جاری کر دی ہیں کہ جہاں جاؤ ان کے علم کی نہریں بہہ رہی ہیں اور علم حاصل کرنے والے علم حاصل کر رہے ہیں۔

دوسری قسم:

اس قسم کے پتھر کی مثال ایسے ہے کہ ان سے نہریں تو نہیں نکلتیں، لیکن ان کے اندر سے پانی تھوڑا رستا رہتا ہے، کوئی چشمہ بھی نہیں بن رہا، کوئی نہر بھی نہیں بن رہی، لیکن کچھ نہ کچھ پانی نکل رہا ہے۔

علماء نے فرمایا کہ یہ علماء ربانیین کی مثال ہے، جو صحیح عالم ہیں، لیکن ان کے علم سے لوگوں کو زیادہ فائدہ نہ پہنچ سکا۔ بڑے بڑے عالم ہیں ماشاء اللہ! لیکن دیہاتوں کے اندر زندگی گزر گئی، کوئی ان سے فائدہ حاصل نہ کر سکا، ان کو کوئی جان بھی نہ پایا کہ اتنا بڑا عالم یہاں رہتا ہے۔

حضرت ہالیجوی رحمہ اللہ کا علم:

آپ اندازہ فرمائیں کہ حضرت بنوری صاحب جیسے آدمی جنہوں نے ترمذی شریف کی شرح لکھی ہے، انہوں نے

اور بھی بہت کتابیں لکھی ہیں، ساری زندگی جن کی حدیث پڑھانے میں گزر گئی، جب وہ ہالیجوی کے پاس سندھ کے علاقہ میں تشریف لے گئے تو سندھ کے اندر بالکل ایک قصبہ سا ہے، غیر معروف سی جگہ ہے، وہاں حضرت ہالیجوی رہتے تھے......اب تو وہ وفات پا گئے، اب ان کی اولاد ہے......تو حضرت یوسف بنوری، حضرت حماد اللہ ہالیجوی کی خدمت میں آئے۔ حضرت یوسف بنوری فرماتے ہیں کہ ایک حدیث پر حضرت درس دے رہے تھے تو حضرت بنوری جیسا عالم فرماتا ہے کہ میں نے جب حضرت ہالیجوی کی اس حدیث مبارک پر تقریر سنی تو مجھ کو پتہ لگا کہ میں عالم تو عالم میں کتنا بڑا جاہل ہوں، اس دن مجھ پر اپنا جہل کھلا اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ اتنا بڑا عالم سندھ کی اس چھوٹی سی بستی میں موجود ہے۔

اسی طرح سندھ کے اندر حضرت عمر نوح گھعرے ہیں، بہت بڑی شخصیت تھے، جنہوں نے سب سے پہلے قرآن کی تفسیر سندھی زبان میں لکھی، یعنی اتنا بڑا اعزاز ان کو ملا۔ میں نے جب اس علاقہ کو دیکھا تو ایک قصبہ تھا۔ تو اتنے بڑے بڑے لوگ دیہاتوں میں بیٹھے رہے اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلا۔

اسی طرح حضرت حبیب اللہ گمانوی رحمہ اللہ اور بڑے بڑے علماء سندھ میں، بلوچستان میں، قبائل میں، پہاڑوں میں اور ایسے ایسے مقامات پر بیٹھے رہے جن بے چاروں کے بارے میں لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلا کہ کتنا بڑا عالم ہے۔ جب کوئی عالم وہاں گیا اور ان سے بات سنی تو پتہ چلا، لیکن ان کا فیض دنیا میں نہ پھیلا۔

تو بعض علماء ایسے ہوتے ہیں کہ اندر سے علم سے بھرے ہوتے ہیں، لیکن ان کا فیض نہیں پھیل سکتا، وہ بھی علماء ربانیین ہیں۔ ان کی مثال بھی ایسے ہے جیسے پتھر سے پانی رس رہا ہے، ان کا علم تو رس رہا ہے، لیکن وہ نہریں بن کر نہیں بہہ رہا کہ پوری دنیا میں پہنچ جائے اور لوگوں کو سیراب کر ڈالے۔

یہ اللہ کی شان ہوتی ہے۔ پوری دنیا میں آپ چلے جائیں، ہر جگہ قاری عبدالباسط کا قرآن آپ کو سنائی دے گا، بلادِ کفر میں بھی چلے جائیں، اللہ نے اس سے کام لے لیا، جبکہ اس سے بڑے بڑے قاری موجود تھے، بڑے بڑے اساتذہ موجود تھے، بلکہ بڑے بڑے قراء تو کہتے ہیں کہ قراءت کے فن سے وہ غلط پڑھتا ہے، یعنی بعض لوگ اس کی قراءت پر بھی اعتراض کرتے تھے۔ میں اعتراض نہیں کر رہا، (نعوذ باللہ) میں خود قاری نہیں ہوں، مجھے خود قراءت کا فن نہیں آتا، میرے لئے تو تمام قاری واجب الاحترام ہیں، جو بھی قرآن کی خدمت کر رہا ہے ہمارے لیے واجب الاحترام ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ نے کسی سے نہروں کا کام لیا ہے اور کسی سے کام لیا کہ پانی پتھر

سے رِس رہا ہے، پانی اس کے اندر بھرا ہوا ہے۔

تیسری قسم:

اور بعض پتھر ایسے ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر جاتے ہیں۔ علماء نے فرمایا: یہ مثال ہے ان عابد، زاہد لوگوں کی ہے جو عبادت، زہد میں لگے ہوئے ہیں، حرام چھوڑا ہوا ہے، حلال کا رزق اختیار کیے ہوئے ہیں، اپنے اپنے مقام پر بیٹھے ہوئے ہیں، رات دن سر سجدے میں پڑا ہوا ہے۔

اور بعض علماء نے فرمایا: یہ تشبیہ ایک اور طرح سے بھی ہے کہ بعض پتھر ایسے ہیں جن سے نہریں بہہ نکلتی ہیں، یعنی بعض علماء ایسے ہیں جو خوف سے اتنا روتے ہیں کہ ان کی آنکھیں ایسے بہہ رہی ہوتی ہیں جیسے نہریں بہہ رہی ہوں۔ اس لیے حضرت نوح علیہ السلام کا لقب "نوح" اس لیے پڑ گیا تھا کہ روتے روتے ان کے رخساروں پر آنسوؤں سے جھریاں پڑ گئی تھیں، کثرتِ بکاء کی وجہ سے ان کا لقب نوح پڑ گیا، وگرنہ یہ ان کا نام نہیں تھا۔

تیسری مثال: ان کی یہ ہے کہ بعض ایسے پتھر ہوتے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر جاتے ہیں۔ ان کی مثال ایسے ہے کہ میرے ڈر کی وجہ سے رونے کی شکل بنائے ہوئے ہیں، آنسو نہیں بہہ رہے، لیکن رو رہا ہے، کوشش کر رہا ہے، گڑگڑا رہا ہے اور تواضع کر رہا ہے، لیکن آنسو نہیں بہہ رہے۔

تو علماء نے فرمایا کہ اللہ نے پتھروں کی تین اقسام بیان کر کے دراصل اپنے بندوں کی قسمیں ذکر فرمائی ہیں۔

ان آیات کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۷۴] بنی اسرائیل! تم یہ نہ سمجھو کہ جیسے تم اللہ سے غافل ہو گئے ہو، اللہ کی یاد کو چھوڑ بیٹھے ہو، لیکن اللہ تم سے غافل نہیں ہے، اللہ جانتے ہیں جو کچھ تم کر رہے ہو۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہیں اس کا بدلہ ملے گا۔ اچھے اعمال کرو گے تو تمہیں بدلہ بھی اچھا ملے گا اور بُرے اعمال کرو گے تو تمہیں بدلہ بھی اسی طرح کا ملے گا: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾ [الزلزال: ۷، ۸]

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۳، البقرۃ: الآیۃ: ۷۴]

پتھر کی مثال دینے کی وجہ:

علماء فرماتے ہیں کہ پتھر سے مثال اس لیے دی گئی کہ پتھر تو جمادات میں سے ہے، اس کے اندر تو کوئی عقل و شعور نہیں ہے، اس میں قساوتِ قلبِ انسانیہ کا ذکر آیا اور اس کو پتھر سے تشبیہ دی گئی، کیونکہ حیوانات میں تو کچھ نہ کچھ

ادراک وشعور ہوتا ہے، لیکن جمادات میں وہ بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے جمادات کی پوجا کا جب وقت آیا، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں آیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ابا جان سے فرمایا: ﴿يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْئًا﴾ [مریم: ۴۲] اے میرے ابا جان! آپ ایسی چیز کی کیوں عبادت کرتے ہیں جو سنتے نہیں، دیکھتے نہیں، جو کچھ نفع نہیں پہنچا سکتے؟ تو علماء نے فرمایا: پھر پتھر سے کیوں مثال دی گئی؟

مفسرین کرام نے جواب دیا ہے کہ پہلی بات تو یہ یاد رکھو کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ پتھر میں کچھ شعور نہیں۔ پتھر کے اندر بھی ادراک اور شعور ہے، کیونکہ اللہ نے قرآن پاک میں واضح فرما دیا: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ﴾ تمام آسمان اور زمینیں اور جو کچھ ان کے اندر ہے، سب میری تسبیح بیان کررہے ہیں۔ اور اللہ نے فرمایا: ﴿وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ۗ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا﴾ [بنی اسرائیل: ۴۴] کوئی ایسی چیز نہیں جو میری پاکی بیان نہ کرے، میری تسبیح بیان نہ کرے، میری تنزیہ بیان نہ کرے، لیکن تم ان تسبیحوں کو سمجھ نہیں سکتے۔ تو ہر چیز کے اندر پتھر بھی آگیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں فرمادیا ہے کہ ہم نے داؤد علیہ السلام کے لیے پتھر، پہاڑ تابع اور مسخر کردیئے تھے اور ان کے لیے لوہا بھی مسخر کردیا تھا۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کا ذکر کرتے تو پہاڑ بھی ساتھ ذکر میں مشغول ہوجاتے تھے، وہ بھی باقاعدہ جواب دیتے تھے، لہٰذا پتھروں میں بھی ادراک موجود ہے، جیسا کہ جبل اُحد کا واقعہ بھی ماقبل میں گزر چکا ہے۔ صحیح مسلم شریف کی حدیث کے اندر موجود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”إِنِّي لَأَعْرِفُ حَجَرًا بِمَكَّةَ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ أُبْعَثَ، إِنِّي لَأَعْرِفُهُ الْآنَ“ [صحیح مسلم، رقم: ۲۲۷۷] مکہ مکرمہ میں ایک پتھر ہے جس کو میں پہچانتا ہوں، ابھی مجھے نبوت بھی نہیں ملی تھی اور میں جب اس پتھر کے قریب سے گزرتا تھا تو وہ مجھ پر سلام کہتا تھا۔

اسی سے بھی ہمارے حضرات مسئلہ نکالتے ہیں کہ دیکھو! حدیث کے اندر لفظ ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم گزرتے تھے تو وہ پتھر سلام کہتا تھا: ”اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُحَمَّدُ!“۔ اور اسی طرح حدیث ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں ہوتے تو کسی پتھر پر گزرتے، کسی درخت پر گزرتے تو وہ آپ پر سلام کہتا تھا۔ [کنز العمال، حدیث: ۳۵۴۳۶]

اب یہ کہتے ہیں کہ جب پتھر ”اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُحَمَّدُ!“ پڑھتے ہیں اور ہم پڑھتے ہیں تو وہابیوں کو کیوں تکلیف ہوتی ہے؟ اللہ کے بندے! مجھے یہ بتلائیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اس پتھر پر گزرتے تھے تو پتھر سلام قریب سے

پڑھتا تھا یا دور سے پڑھتا تھا؟ تو جب تم بھی روضے پر جاؤ تو پڑھو، حضور ﷺ کے سامنے جاؤ تو پڑھو۔ حضور ﷺ کے سامنے صلوٰۃ وسلام پڑھنے پر کسی کوئی اعتراض نہیں ہے، کوئی دنیا کا عقل مند آدمی اعتراض نہیں کرسکتا۔ حضور ﷺ جب سامنے ہوں تو کوئی صلوٰۃ وسلام نہ پڑھے۔ کوئی دنیا میں ایسا بندہ ہوسکتا ہے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن مسئلہ اتنا ہے کہ کیا غائب طور پر ندا بحرف "یا" جائز ہے یا نہیں؟ وہ تو مسئلہ ہی ایسا ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کا معجزہ دکھا دیا کہ جب پتھر کے قریب آئے تو پتھر نے سلام عرض کیا، اکثر پتھروں نے نہیں بھی پڑھا۔ یہ تو میرے پاک نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کے معجزات ہیں۔ "صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ عَلٰى آلِهٖ وَ أَصْحَابِهٖ وَ سَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا."

یہ آیات ہمارے لیے سبق ہیں:

ان ساری آیاتِ مبارکہ سے ہمیں یہ سبق ملا کہ کہیں تمہارے دل تو ایسے نہیں ہو گئے جیسے پتھر ہوں کہ وہ شقاوت، قساوت اور غفلت میں آکر ایسے بن گئے ہوں، جیسے پتھر ہے کہ نہ ان پر تخویف اثر کرے، نہ ترہیب اثر کرے، نہ اللہ کا قرآن اثر کرے اور نہ فرمانِ رسول اثر کرے۔

گناہوں سے دل سخت ہو جاتے ہیں:

علماء نے لکھا ہے کہ دل سخت اس وقت ہوتے ہیں جب آدمی اللہ کی یاد سے دور ہو جاتا ہے، جب اللہ کا ذکر چھوٹ جائے اور معاصی میں آدمی منہمک ہو جائے۔ نماز چھوٹ گئی اور اللہ کا ذکر چھوٹ گیا، تلاوتِ قرآن چھوٹ گئی، غفلت جب آتی گئی تو آدمی گناہوں میں بڑھتا گیا، معصیت میں بڑھتا گیا تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دل سخت ہو جاتے ہیں۔

اس لیے حضور ﷺ نے ایک مثال دی، آپ ﷺ نے فرمایا: جب آدمی پہلا گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، (یہ گناہوں کی سیاہی ہے، اللہ سے دعا کریں کہ اللہ پاک معاف فرما دے، اللہ ہمارے دلوں کو بھی محفوظ فرمائے اور ہر مسلمان کے دل کو بھی محفوظ فرمائے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب وہ دوسرا گناہ کرتا ہے تو دوسرا نقطہ لگ جاتا ہے، جب تیسرا گناہ کرتا ہے تو تیسرا نقطہ لگ جاتا ہے، پھر گناہ کرتے کرتے اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور پھر اس پر نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۳۳۳۴، باب: ومن سورۃ: وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ]

دوسری حدیث پاک میں حضور ﷺ نے فرمایا: اگر بندے سے گناہ ہو گیا (ہر آدمی سے گناہ ہوتا ہے، ہم سب

گناہ گار ہیں ماسوا انبیاء علیہم السلام کے) لیکن وہ ڈر رہا ہے، ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں، لرز رہا ہے، خوف لاحق ہو گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ میرے اوپر پہاڑ گر پڑا ہے، یہ ایمان کی علامت ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ٦٣٠٨، باب: التوبة]

جیسے ایک رات میں باہر گیا ہوا تھا تو رات کو بارہ بجے کے قریب واپس آیا۔ سڑک پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا ہے۔ جب میں گاڑی سے اُترا تو میرے پاس دوڑ کر آیا اور کہنے لگا کہ میں نو بجے سے یہاں بیٹھا ہوں۔ میں نے پوچھا: اللہ کے بندے! کیوں بیٹھے ہو؟ ٹیلی فون کر لیتے، پوچھ لیتے، ٹائم مقرر کر لیتے تو تکلیف نہ ہوتی۔ اس نے کہا کہ میں نے ایک بات کی ہے، اس بات کے ڈر مجھے آرام نہیں آ رہا۔ میں نے اس آدمی کی آنکھیں دیکھیں تو اس کی آنکھیں سرخ معلوم ہوتی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دو دن سے سویا نہیں ہے، پریشان ہے۔ بہر حال الحمد للہ! کوئی ایسی بات بھی نہیں تھی۔ اس نے مسئلہ پوچھا اور میں نے اس کو سمجھا دیا تو وہ چلا گیا۔

تو یہ علامتِ ایمان ہے کہ کوئی چھوٹی سی بھی غلطی ہو تو نیند اور چین نہیں ہے، بھاگ رہا ہے اور پوچھ رہا ہے کہ میں کیا کروں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ایمان کی علامت ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب وہ مرتبہ آجائے کہ گناہ کرو اور یوں محسوس ہو جیسے ناک پر مکھی بیٹھی تھی، اُڑا دی تو سمجھ لو کہ اب ایمان اندر نہیں ہے۔[1] جب وہ اسٹیج آجائے کہ اپنے گناہوں پر فخر بھی کرنے لگ جاؤ کہ میں نے اتنے ڈاکے ڈالے اور اتنے قتل کر دیئے اور ہم نے اتنی لڑکیاں اغوا کر ڈالیں اور ہم نے اتنا نشہ بیچا اور ہم نے ایسے اسمگلنگ کی تو جب یہ مقام آجائے تو سمجھو کہ اب دلوں پر مہریں لگ گئی ہیں۔

گناہوں کا علاج:

اس لیے ہم سب اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور احتساب کریں۔ اس کا علاج ذکر اللہ ہے۔ سب سے پہلے تو آدمی گناہوں سے توبہ کرے، کیونکہ توبہ ایک ایسی چیز ہے کہ اگر ستر سال آدمی گناہوں میں پڑا رہے، ستر سال زنا، شراب، بے حیائی میں ڈوبا رہے اور ایک دفعہ اللہ کے دروازے پر گر جائے اور سچے دل سے توبہ کرے، اللہ فرماتے ہیں: اے میرے بندے! میں تیرے سارے گناہ بخشنے پر تیار ہوں۔ آنا تیرا کام ہے اور بخشنا میرا کام ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ خوش ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ملائکہ کو بلا کر فرماتے ہیں: دیکھو! میرا بندہ ستر سال

---

[1] [صحيح البخاري، حديث: ٦٣٠٨، باب: التوبة]

نافرمان رہ گیا، لیکن آج میرے دروازے پر گر گیا، اس کو پتہ چل گیا ہے کہ میرا بھی مالک ہے جو مجھے معافی دے دے گا۔ تو تم گواہ ہو جاؤ، اس کے پچھلے سارے گناہ میں نے معاف کر دیئے ہیں۔ [مسند احمد، حدیث: ۷۹۴۸]

حدیث میں آتا ہے: "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ" جب آدمی سچی توبہ کر لے تو گویا گناہ رہ ہی نہیں گئے، مٹ گئے، ختم ہو گئے۔ [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۴۲۵۰، بابُ ذِکْرِ التَّوْبَةِ]

اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی مرد یا عورت گناہ میں مبتلا تھا، اس نے توبہ کر لی تو اب اس کو اس گناہ کا طعنہ نہ دو۔ پھر یہ نہ کہنا کہ چھوڑو تم شرابی تھے، ایسے تھے اور ایسے تھے۔ ایسا نہ کرو، جب اس نے توبہ کر لی ہے تو مالک الملک نے جب اس کا پچھلا کھاتہ معاف کر دیا ہے تو تم کون ہو اعتراض کرنے والے۔

دوسرا علاج یہ ہے کہ کثرت سے اللہ کا ذکر کرو۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ جو گھر خالی ہوتا ہے وہاں جن ڈیرا لگا لیتے ہیں، اگر دل اللہ کی یاد سے خالی ہے تو شیطان ڈیرا لگا لیتا ہے اور جب تم اللہ کو یاد کرتے ہو تو شیطان تم سے بھاگ جاتا ہے۔ اور نماز بھی اللہ کی یاد اور اللہ کا ذکر ہے، قرآن بھی اللہ کا ذکر ہے، طواف بھی اللہ کا ذکر ہے۔ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے تسبیح، درود شریف، ذکر کلمہ جو تمہیں یاد ہے وہ کثرت سے پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے غفلت اور قساوت سے پناہ مانگتے رہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت سے تمام معاملات ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ بڑے بڑے کبائر کا جو ذکر کیا ہے، ان سے بچے۔ اور انسان خطا کار ہے، انسان سے خطائیں ہو جاتی ہیں تو فوراً توبہ کرے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اور کچھ بھی نہ ہو سکے تو چپ رہے۔ چپ رہنا، یہ بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے کہ اپنی زبان کو محفوظ رکھ لیا، تم نے اپنی زبان کو بلا وجہ کسی گناہ میں نہیں اُلجھایا۔ یہ بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے۔

حضرت عوفی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر کے اندر فرماتے ہیں کہ جب اس مقتول کو اس گائے کا ٹکڑا لگایا گیا تو وہ مقتول اُٹھ کر بیٹھ گیا، ایسے زندہ ہو گیا جیسے بالکل کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم کو کس نے قتل کیا؟ اس نے کہا کہ مجھے میرے بھائی کے لڑکوں نے قتل کیا۔ اس کے بعد وہ مر گیا، اس کی روح قبض کر لی گئی۔ جب وہ یہ کہہ کر مر گیا تو اس کے بھتیجے کہنے لگے کہ یہ جھوٹ بولتا ہے، ہم نے تو اس کو قتل نہیں کیا ہے۔

اتنی بڑی بات کہ مردہ زندہ ہو کر ایک بات کرے اور اس کے بعد بھی وہ کہیں کہ ہم نہیں مانتے ہیں۔ تو آدمی جب جہالت و بدبختی کی انتہاء پر پہنچ جاتا ہے تو پھر یہی حال ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے کہ آپ اس کو جتنا ہدایت

کریں، وہ کہے گا کہ ہم بس جہاں چل رہے ہیں، ٹھیک ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ دلوں کے اندر نرمی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ان کے دل سخت ہو گئے جیسے پتھر یا پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔

مفسر رحمہ اللہ نے اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ادراک تو رکھا ہے۔ ہر چیز کے اندر ادراک تو موجود ہے، یہی وجہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور پر اپنی تجلی ڈالی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلی کو برداشت نہ کر سکا۔ اس طرح دنیا کے اندر جتنی بھی چیزیں ہیں، ہر چیز کے اندر اللہ نے ادارک وشعور اس کی حیثیت کے مطابق رکھا ہے، بعض چیزوں کا شعور ہمیں نظر آ جاتا ہے اور بعض چیزوں کا ہمیں نظر نہیں آتا۔ مفسر رحمہ اللہ اس پر دلیل کے لیے قرآن پاک کی دوسری آیت نقل فرما رہے ہیں: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۚ وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۗ إِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا﴾ [بنی اسرائیل: ۴۴] ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں اللہ کی تسبیح بیان کر رہی ہیں اور ان دونوں کے اندر کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اس کی تسبیح اور حمد بیان نہیں کر رہی، لیکن تم ان کی تسبیحات کو سمجھ نہیں سکتے، اللہ پاک ہی علم والے اور بخشش والے ہیں۔ معنیٰ یہ ہے کہ وہ ذات پاک کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی تسبیح بیان کر رہا ہے، لیکن یہ چند کروڑ یا چند لاکھ کا فرید بخت اس کا جو انکار کر رہے ہیں تو اللہ ان کو عذاب کیوں نہیں دیتے؟ فرمایا: وہ بخشنے والے ہیں، وہ علم والے ہیں، وہ اپنے بندوں کو آخر وقت تک مہلت دے دیتے ہیں۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ تو یہ فرماتے تھے کہ جس پتھر سے بھی چشمہ نکلے یا جس پتھر سے بھی پانی بہتا ہو یا جو پتھر بھی پہاڑ کی چوٹی سے گرتے ہیں، یہ سب اللہ کی خشیت، ہیبت وجلال اور عظمت کا اثر ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں خود بیان فرمایا ہے۔ بعض پتھر بھی تمہارے دلوں سے نرم ہیں، تمہارے دل ان پتھروں سے سخت ہیں۔ پتھر بھی کبھی نرم ہو جاتے ہیں، لیکن تم اللہ کا قرآن سننے کے بعد بھی نرم نہیں ہوتے، تم معجزات دیکھنے کے بعد بھی نرم نہیں ہوتے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی آیات اور نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی نرم نہیں ہوتے۔

ابو علی جبائی نے اپنی تفسیر کے اندر لکھا ہے: ﴿وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ ''هُوَ سُقُوْطُ الْبَرَدِ مِنَ السَّحَابِ'' جب بادلوں سے اولے برستے ہیں، یہ اللہ کی ہیبت اور عظمت کا اعتراف ہے۔

قاضی باقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ترجمہ بعید ہے۔ کیونکہ اولے برسنا علیحدہ چیز ہے اور پتھر کا پھٹ کر اس سے پانی نکلنا علیحدہ چیز ہے۔ اس لیے مفسر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ قول صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ ابو علی جبائی معتزلی ہے۔ اس نے

پتھر کے اس احساس کا انکار کر کے اولوں کے گرنے کی بعید از کار تاویل کردی ہے۔ (انور)

ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ اس سے مراد کثرتِ بکاء ہے اور اس کی مثال جو تھوڑا رونے والے ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں کہ ان کے دلوں کے اندر تو خشیت موجود ہے، لیکن آنکھوں سے آنسو نہیں بہتے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۳، البقرۃ: الآیۃ: ۷۴]

علماء نے لکھا ہے کہ آدمی کے آنسو نہ نکلیں تو یہ بھی دل کی سختی کی علامت ہے۔ دلوں میں نرمی آتی ہے تو آدمی کو رونا بھی آتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے دربار میں گڑگڑانا بھی آتا ہے اور آنسو بھی بہتے ہیں اور اللہ کے راستے میں اللہ کے خوف سے جو آنسو بہتے ہیں، اللہ کے ہاں اتنی عظیم قیمت رکھتے ہیں کہ ایک حدیث مبارک کے اندر آتا ہے کہ جب آدمی کے آنسو بہنے لگ جائیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے کو جہنم سے پانچ سو سال کے فاصلے تک دور کردو، میرے ڈر سے میرا بندہ رو رہا ہے، میں تو رحم کرنے والا ہوں، میں تو رحمت کرنے والا ہوں، پھر میں اپنے بندے کو کیسے نہ معاف کروں؟

اگر اللہ کے دربار میں مثلاً رونا نہ آئے، جیسے بعض لوگوں کو رونا نہیں آتا تو ان کے لیے بھی حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہیں رونا نہ آئے تو رونے کی کیفیت بنالو، رونے کی شکل بنالو، گڑگڑاؤ، عاجزی کرو، ایسے محسوس ہو کہ یہ رو رہا ہے۔[1] کیونکہ رونا تو ہمارے بس میں نہیں ہے، جب تک دل نرم نہ ہوں۔ لیکن آدمی وہ ہیئت بنا کر کوشش کرے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب اللہ کے بندے اللہ کے دروازے پر رونا شروع کرتے ہیں تو وہ خالی نہیں لوٹاتا۔

پتھروں کا رونا حقیقی ہے یا مجازی؟

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ حقیقت نہیں ہے، بلکہ مجازی معنی مراد ہے، یعنی پتھر کی ایک مثال دی گئی ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ میں ہے کہ ایک بستی سے گزرے تو دیکھا کہ ایک دیوار ہے، قریب ہے کہ وہ گر جائے۔ تو اس دیوار کی طرف گرنے کے ارادہ کی نسبت کردی گئی۔ اسی طرح یہاں بھی بطور مجاز پتھروں کی طرف اسناد کردی گئی۔

لیکن مفسرین فرماتے ہیں کہ مجازی معنی وہاں مراد لیا جاتا ہے جہاں حقیقی معنی مراد نہ لیا جا سکتا ہو۔ ہمیں یہاں مجازی معنی مراد لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ تعالیٰ پتھروں کے اندر ایسی صفتیں پیدا فرما دیتے ہیں۔ پتھروں نے

[1] [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۴۱۹۶، باب: الحزن والبکاء]



حضور ﷺ پر سلام پیش کیا، پتھروں نے کلمہ شہادت پڑھا، جانوروں نے آ کر حضور ﷺ کو شکایت پیش کی کہ ہمارا مالک ہم سے زیادہ کام لیتا ہے۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ حج کے موقع پر ہم خود دیکھ رہے تھے کہ جب آپ ﷺ نے قربانی فرمائی تھی، اونٹ خود بڑھ بڑھ کر آگے آتے تھے کہ ہم حضور ﷺ کے ہاتھ سے ذبح ہو جائیں۔ ایسی چیزیں اللہ تبارک وتعالیٰ جانوروں میں بھی پیدا فرما دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ پتھروں میں بھی پیدا فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴾ [الاحزاب: ۷۲]

اور صحیح روایت کے اندر ہے کہ احد پہاڑ ہمیں محبوب رکھتا ہے اور ہم اس کو محبوب رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ کو جبل اُحد سے بڑی محبت تھی۔[1] اس لیے حضور ﷺ جب سفر سے تشریف لے آتے، دور سے جب یہ پہاڑ نظر آتا تو حضور ﷺ اپنی اونٹنی کو بھگاتے تھے، اونٹنی سے کہتے: جلدی کرو، جلدی کرو، ایسا پہاڑ آ رہا ہے جس میں محبوب رکھتا ہوں اور وہ ہمیں محبوب رکھتا ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ۲۸۹۳، باب: مَنْ غَزَا بِصَبِيٍّ لِلْخِدْمَةِ]

اور پھر اسی محبوب پہاڑ کے دامن میں حضور ﷺ کے پیارے چچا سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ، حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور ستر صحابہ دفن ہیں۔

ایک حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی بیٹی کہتی ہیں کہ ہماری خواہش تھی کہ اپنے شہداء کو جنت البقیع میں لے آئیں اور انہوں نے ارادہ بھی کر لیا اور اس پر عمل کر لیا۔ جب حضور ﷺ کو خبر ملی تو فرمایا: خبردار! ان کو اسی مقام پر لوٹاؤ جہاں وہ شہید ہوئے ہیں، کیونکہ وہ بڑی عظیم جگہ ہے۔

تو یہ پہاڑ محبت تب کرے گا جب اس کے اندر ادراک وشعور ہو۔ وہ سمجھے کہ محمد عربی کون ہے؟ جب وہ سمجھتا نہ ہو تو محبت کیسے کرے گا؟

اسی طرح صحیح مسلم کے اندر بھی یہ روایت موجود ہے، فرمایا: ''إِنِّي لَأَعْرِفُ حَجَرًا بِمَكَّةَ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ أُبْعَثَ، إِنِّي لَأَعْرِفُهُ الْآنَ'' (مجھے ابھی نبوت نہیں ملی تھی، مکہ کے اندر ایک پتھر کو پہچانتا ہوں کہ جب میں گزرتا تھا تو

[1] [صحيح البخاري، حديث: ۴۰۸۳، باب: أُحُدٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ]



وہ پتھر مجھ پر سلام پڑھتا تھا)۔[صحیح مسلم، حدیث:۲۲۷۷]

اور اسی طرح حدیث مبارک کے اندر آتا ہے کہ جو آدمی ایمان اور یقین کے ساتھ حجر اسود کو بوسہ دے گا یا ہاتھ لگائے گا تو قیامت میں وہ گواہی دے کہ یا اللہ! اس نے مجھے بوسہ دیا تھا۔

[سنن الترمذي، حديث:۹۶۱، باب: ما جاء في الحجر الأسود]

اس لئے پتھروں کا بولنا، ان کا کلام کرنا، پتھروں کا سلام پیش کرنا، اللہ کے پاک پیغمبر کے دربار میں بات کرنا، یہ ساری باتیں دلالت کرتی ہیں کہ پتھروں کے اندر بھی ادراک اور ایک قسم کی حیات ہے جو ہمیں بظاہر سمجھ نہیں آتی۔ کیونکہ ہم لوگ تو جاہل ہیں اور ہمارا علم اتنا وسیع نہیں، ویسے جن لوگوں کو پتھروں کی شناس ہوتی ہے وہ جب پتھر خریدتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ یہ پتھر زندہ ہے اور یہ پتھر مردہ ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے اندر ایک قسم کا پانی ہوتا ہے، ان کے اندر بھی ایک قسم کی حیات ہے اور ایک موت ہے۔

پتھروں میں خاصیات:

اسی سے تو لوگ گمراہ ہو گئے اور انہوں نے پتھروں کو بھگوان بنانا شروع کر دیا۔ یہ نہ سمجھے کہ جو ان کا خالق و مالک ہے اس کو بھول جاؤ گے تو کیا فائدہ ہوگا؟ ان کے اندر اللہ نے یہ نفع و نقصان رکھے ہیں۔ یہ نہیں کہ یہ نفع نقصان کے مالک ہیں۔ اسی سے لوگوں کے اعتقادات خراب ہو جاتے ہیں کہ فلاں پتھر میں نے پہنا تو مجھے خوشحال کر دے گا اور فلاں پتھر پہنا تو وہ مجھے برباد کر دے گا۔ اب اس کے نزدیک برباد کرنے والا اور نصیب کھولنے والا پتھر بن گیا تو یہ توحید کی بجائے شرک میں مبتلا ہو گیا، حالانکہ مسلمان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ نفع و نقصان کا مالک اللہ ہے۔

اللہ نے اگر اس کے اندر فائدہ رکھا ہے تو وہ جانے، اور نہیں رکھا تو وہ مالک ہے، وہ جانے اور اس کا کام جانے۔ ہمارے تو نفع و نقصان کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ورنہ ہر چیز کے اندر خصائص ہیں، جیسے بعض جانوروں کا گوشت گرم ہے اور بعض جانوروں کا گوشت معتدل ہوتا ہے اور بعض جانوروں کا گوشت بادی ہوتا ہے، بعض کا گوشت ہاضم ہوتا ہے۔ آپ کوئی گوشت کھائیں، اگر چربی ہے تو وہ کولیسٹرول پیدا کرے گا۔ اس لئے یہ اللہ نے خواص رکھے ہوتے ہیں، لیکن کوئی نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوتا۔ نفع و نقصان کا مالک تو صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ جس پتھر کو میرے پاک پیغمبر نے چوما ہو، اس کا کوئی اور پتھر مقابلہ نہیں کر سکتا اور اُمت اس کو بوسہ دے رہی ہے۔

اور روافض اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ہم اس پتھر کو کیوں چوم رہے ہیں؟ کیونکہ اس کو اللہ کے نبیوں نے بوسہ



دیا ہے اور ہمارے آقا ﷺ نے بوسہ دیا ہے، لیکن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جن کے ساتھ میرے حضور ﷺ کی پوری زندگی گزر گئی، کیا ان کے ایمان میں خلل ہے؟ خود وہ عقل کریں، غور کریں اور سوچیں کہ وہ کہاں بھٹک رہے ہیں؟ جن صحابہ کو حضور ﷺ نے اپنے سینے سے لگا لیا ہو، جن صحابہ کے ہاتھ میں میرے مدنی نے اپنا ہاتھ دے دیا ہو اور جس صحابی کے بارے میں میرا مدنی کہے کہ ساری دنیا کے میں نے احسان اُتار دیئے، لیکن ابوبکر کے احسان نہیں اُتار سکا[1] تو ان کے ایمان میں اگر کوئی شک کرے تو یہی کہا جائے گا کہ ان کے دل پتھر ہو گئے۔ مسئلہ سمجھ نہیں آ رہا۔

حجرِ اسود:

حجرِ اسود اتنی شان والا پتھر ہے کہ جب یہ آیا تو اس کے اندر اتنی روشنی تھی کہ جہاں جہاں تک اس کی شعاعیں پہنچیں وہاں تک اللہ نے اپنا حرم بنالیا۔ بعض روایات کے اندر ہے کہ یہ چمکتا تھا، لیکن گناہوں نے اس کے اندر سیاہی کا اثر ڈال دیا۔ اتنی شان والا پتھر ہونے کے باوجود کتنی دفعہ ٹوٹا اور کتنی بار دشمن اُٹھا کر لے گئے، لیکن اپنے نفع نقصان کا مالک نہیں ہے۔ جب طوفانِ نوح آیا تو طوفان میں بہہ گیا اور کتنی مدتوں تک جبل ابی قبیس کے غار کے اندر رہ گیا۔ پھر ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ حجرِ اسود کو کعبہ میں لگاؤ۔ انہوں نے عرض کیا: اللہ میاں! حجرِ اسود کہاں ہے؟ اللہ نے فرمایا: اس کو ڈھونڈو۔ عرض کیا: اللہ میاں! کیسے ڈھونڈیں؟ مجھے کیا پتہ کہ حجرِ اسود کون سا ہے؟ اور اسی طرح یمن کا ایک ظالم بادشاہ آیا اور اس کو توڑ کر یمن کے پہاڑوں اور پتھروں میں پھینک دیا، پھر قریش مکہ گئے اور تلاش کر کے لے آئے۔ اسی طرح ایک اور ظالم آیا، اس کو اُٹھایا اور اسے اپنے ملک میں پھینک دیا تو افغانستان کی طرف سے ایک مسلمان بادشاہ اُٹھا، اس نے اس کو چھڑایا۔ جو حجرِ اسود اپنی حفاظت بھی نہ کر سکا، وہ ہمارے نفع و نقصان کا مالک کیسے بنے گا؟ اس لیے اپنے عقیدوں کو ٹھیک رکھو اور یہی مسلمان کا مقام ہوتا ہے کہ کافر بھٹک جاتا ہے اور مومن صراطِ مستقیم پر کھڑا رہتا ہے اور کہتا ہے: تمہاری بڑی شان ہے اور تمہاری بڑی صفتیں ہیں، لیکن نفع نقصان کا مالک میرا خدا ہے۔

اگر نقصان کا مالک پتھر ہوتا تو حجرِ اسود ہوتا یا کعبہ شریف کی دیواروں میں جو پتھر لگا ہوا ہے، اس کے اندر نقصان ہوتا، یا مقامِ ابراہیم کے پتھر کے اندر نفع نقصان ہوتا، یا طورِ سیناء کے پہاڑ میں ہوتا، یا اس صخرہ میں ہوتا جہاں تمام انبیاء علیہم السلام نے آکر اپنے جانور باندھے اور حضور ﷺ کی براق بھی باندھی گئی، لیکن کوئی نفع و نقصان کا مالک نہیں

---

[1] جامع الاصول فی احادیث الرسول، حدیث: ۶۴۰۵

ہے، نفع نقصان کا مالک صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ اگر اللہ نے کسی چیز کو عزت دی ہے تو ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا'' اور کسی چیز میں اللہ نے فائدہ رکھا ہے تو ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا'' اور کسی چیز میں فائدہ نہیں رکھا تو ''آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا''۔ ہر چیز کا مالک اور مختار، حاجت روا اور مشکل کشا صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں۔ یہی فرق ہے جہاں آدمی آ کر پھنستا ہے، چنانچہ بعض لوگ پتھروں کو خدا بنا لیتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے۔

﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا﴾ علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، اتنا بڑا شرف بخشا ہے کہ اس کی سب سے بڑی فرماں بردار مخلوق ملائکہ ہیں، ان کو بھی اللہ نے آدم علیہ السلام کے سجدے کا حکم دیا اور آدم علیہ السلام کو مسجود الملائکہ بنایا اور اللہ تعالیٰ نے خلافت فی الارض کے لئے حضرت آدم علیہ السلام اور اولادِ آدم کو منتخب فرمایا، فرشتوں کو زمین کی خلافت کے لئے منتخب نہیں فرمایا۔

ان تمام چیزوں کو دیکھنے کے بعد اندازہ لگائیں کہ انسان کا کتنا بڑا مقام ہے!! چونکہ اعلیٰ مخلوقات تین تھیں: انسان، جنات اور فرشتے۔ پھر اللہ نے جتنے نبی اور رسول بھیجے، سب اولادِ آدم ہیں، اس لیے انسان اشرف المخلوقات ہے، جس کے بارے میں اللہ نے قسم کھا کر فرمایا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝﴾ [التین: ۴] ہمیں قسم ہے! تحقیق پکی بات ہے کہ ہم نے انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ ہیئت پر پیدا فرمایا۔

اور علماء نے لکھا ہے کہ جب ہم لوگ دو ضرب دو، چار کہا کرتے تھے اور قلم، تختی اور ہندسوں سے ضرب تقسیم کرتے تھے تو غلطیاں ہماری حدود کی تھیں، لیکن اب جبکہ کمپیوٹرائزڈ نظام آ گیا، اب وہ غلطی کرے گا تو غلطی اسی کے مطابق ہوگی۔ ایک ہندسہ پر بھی اگر ہاتھ غلط ٹچ کر گیا تو سمجھ لیں کہ اربوں کا چکر ہو گیا۔ وہاں سینکڑوں کا حساب نہیں بگڑے گا۔

اس لئے انسان جب انسان بننے پر آیا تو مسجود الملائکہ بن گیا، انسان جب اپنے مقامِ انسانیت اور مقامِ عبودیت پر پورا اُترا تو ایک لاکھ چوبیس ہزار رسول اور نبی ان میں آئے، انسان جب انسانیت کے معراج کو پہنچا تو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں سامنے آیا اور جب انسان گر گیا تو ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝﴾ [التین: ۵] پھر اس کے گرنے کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں، اس کو پہلی زمین پر بھی جگہ نہیں ملتی، دوسری اور تیسری پر بھی نہیں، بلکہ اسفل سافلین میں گرتا ہے۔ اور جب اوپر جاتا ہے تو علیین کو چھوتا ہے اور جب نیچے جاتا ہے تو سجین اور اسفل سافلین میں جا پہنچتا ہے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بھی یہی ارشاد فرمایا ہے: اے بنی اسرائیل! تمہارے دل اتنے سخت



ہو گئے کہ پتھروں کی بھی تمہارے دلوں کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ایسے واقعات کا ذکر فرما کر غافل بندوں کو جھنجھوڑتے اور جگاتے ہیں کہ کہیں تم بھی بنی اسرائیل کی طرح نہ بن جانا کہ اپنے پاک نبی کے معجزات دیکھو، دلائل دیکھو اور پھر اعتراض کرنے لگو۔ اور اللہ کے نبی کے فرمان میں اگر اور مگر، چونکہ، چنانچہ نکالنے لگ جاؤ، جیسا کہ بنی اسرائیل کو حکم ملا تھا کہ ایک گائے ذبح کرو، لیکن وہ سوال کرنے لگ گئے کہ کیسی ہو؟ اس کا رنگ کیا ہو؟ عمر کتنی ہو؟ قد کیسا ہو؟ تو تم ایسا نہ کر بیٹھنا۔

آج اللہ نہ کرے، اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ پر جو افضل اُمت ہے، ان اعمال پر پہنچی ہوئی ہے جس طرح اُمم سابقہ تھیں۔ وہ اللہ کے قانون میں حجتیں نکالتے تھے، آج بھی لوگوں کو جب اللہ کے قوانین کے بارے میں بتلایا جاتا ہے تو وہ بھی حجتیں نکالتے ہیں۔ جب ان کو کہا جاتا ہے کہ سود حرام ہے، کسی بھی شکل میں حرام ہے اور اللہ نے اپنے رسول کے ذریعے ایک قاعدہ کلیہ بیان فرما دیا کہ ہر وہ قرض جو زیادت کو کھینچے یا ہر وہ معاملہ جس میں زیادت کی شرط لگائی جائے، وہ سود ہے۔ حتیٰ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنے نبی کو ایک خاص حکم دیا: ﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝﴾ [المدثر: ۶] آپ کے لئے حرام ہے، آپ کبھی ایسا نہ کریں کہ کسی آدمی کو ہدیہ دیں اور پھر تمنا کریں کہ وہ مجھے زیادہ ہدیہ دے۔ جیسا کہ بڑے آدمی کے پاس کوئی خوبصورت چیز بنا کر لے جاتے ہیں کہ میں نے اس پر ایک ہزار ریال خرچ کیا ہے، اگر وہ اس سے خوش ہو جائے گا تو مجھے پانچ ہزار ریال دے گا۔ تو اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو منع فرمایا کہ آپ کے لئے تو یہ حرام ہے کہ آپ کسی پر احسان کریں اور پھر یہ تمنا کریں کہ مجھے زیادہ دے، یہ آپ کی شان کے لائق بھی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ کوئی ربو نہیں، لیکن ایک زیادتی بنتی ہے کہ دینے والے کی نیت یہ ہے کہ ہدیہ کے بعد مجھے زیادہ ملے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی پاک کے لیے یہ حرام کر دیا، لیکن اُمت کے لئے یہ فرما دیا کہ اگر تم ایسا کرو گے، تمہیں گناہ تو نہیں ہوگا، لیکن تمہیں ثواب بھی کوئی نہیں ہوگا۔ جو تم اللہ کے لیے دو گے، اسی پر اجر وثواب ہوگا اور جو تم لوگوں کو اس لیے ہدیہ دو گے کہ وہ تمہیں اس کے بدلے میں زیادہ ہدیہ دیں گے، اس پر تمہیں گناہ تو نہیں ہوگا، لیکن فائدہ بھی نہیں ہوگا، کیونکہ تمہاری نیت زیادہ لینے کی ہے۔ اللہ نے اتنا واضح فرما دیا۔

سود کی حرمت:

اور حضور اکرم ﷺ نے اتنا واضح فرما دیا کہ سود کا معاملہ لکھنے والا، سود لینے والا، دینے والا، سود کے معاملہ کی



گواہی دینے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔

[صحیح مسلم، حدیث:۱۵۹۸، بَابُ لَعْنِ آكِلِ الرِّبَا وَمُؤْكِلِهِ]

علماء کرام تو اتنی احتیاط فرماتے تھے کہ اگر کوئی بلڈنگ جس میں سودی کاروبار ہوتا ہے، اس کے سائے کے نیچے بھی نہیں بیٹھتے تھے کہ کہیں اللہ کے عذاب کا ہم شکار نہ ہو جائیں۔ آج اگر لوگوں کو کہا جائے کہ سود حرام ہے تو کہتے ہیں: ٹھیک ہے، لیکن سود کے بغیر معاملات کیسے چلیں گے؟ ہماری ترقی رُک جائے گی، اسلام اتنا پابند کر دینے والا مذہب ہے کہ یہ چاہتا نہیں کہ مسلمان ترقی کرے اور مسلمان تو اس وقت ترقی کرے گا جب ہم باہر کے ملکوں سے معاملات کریں گے، ان سے سود لیں گے اور سود پر قرضے لیں گے اور ہم اپنے ملک میں کام کریں گے تو یہاں ترقی ہوگی۔ حالانکہ عقل کے اندھے کو بھی سمجھ آتا ہے کہ ایک آدمی مثلاً لون پر فیکٹری لگاتا ہے، اس نے اسی کے اوپر پچاس لاکھ قرض لے کر لگایا، بینک کو چھ پرسنٹ سود مل گیا، کارخانہ لگ گیا۔ جس دن سے قرضہ منظور ہوا اس دن سے سود لگنا شروع ہو گیا، کارخانہ بنتے بناتے ہمیں پانچ سال لگ گئے۔ صرف بجلی کا کنکشن نہ ملے تو فیکٹری کھڑی ہے، اگر گیس سے چلتی ہے تو گیس کا کنکشن نہ ملے تب بھی کھڑی ہے یا اس کے کچھ پارٹس ہم نے باہر سے منگوانے تھے، اس میں کوئی گڑبڑ ہوگئی اور وہ نہیں آرہے۔ اب پانچ سال بعد جب فیکٹری چلنے کی پوزیشن میں آئے گی تو آپ حساب تقسیم کریں کہ پچاس لاکھ والا قرضہ کہاں پہنچا ہوا ہوگا؟

اس کے مقابلہ میں اللہ نے ایک آدمی کو توفیق دی ہے، اس نے پچاس لاکھ اپنی جیب سے نکال کر فیکٹری لگالی۔ یا ایک آدمی کے پاس پیسہ نہیں تھا، لیکن اللہ نے عقل دی تھی، اس نے ایک کمیٹی بنا کر اعلان کر دیا کہ میں فیکٹری لگانا چاہتا ہوں، اس نے ایک ایک لاکھ کے پچاس حصے رکھ دیئے کہ جب نفع ہوگا تو ان پچاس پر تقسیم کر دیں گے، نقصان ہوگا تب بھی ان پچاس پر تقسیم کر دیں گے۔

یہ ایک موٹی بات ہے اور عقل کے اندھے کو بھی یہ بات سمجھ آسکتی ہے کہ جب تم اپنے پیسے اور بغیر سودی کاروبار کے فیکٹری چلاؤ گے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ اور اگر سودی قرضے سے لگاؤ گے تو سود لیتے رہو گے اور دیتے رہو گے، لیکن قرضہ سے کبھی نہیں نکلو گے۔ جب حساب کرو گے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ آمدنی ایک کروڑ، خرچ سوا کروڑ اور قرضہ پچیس لاکھ ہے۔

اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اگر تم میرا کہا مان لو تو میرا وعدہ ہے: ﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم



﴿بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [الاعراف:۹۶] میں آسمانوں اور زمینوں کے خزانوں کو تمہارے لئے کھول دوں گا، تمہیں قرضہ لینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

اُصولی بات یہ ہے کہ جب دنیا کا کوئی ملک اپنے بنائے ہوئے قانون کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تو تم کیوں اللہ کے قانون کو چھوڑتے ہو؟ لیکن تم اس میں حیل و حجت کرتے ہو۔ اگر حکم دیا جاتا ہے کہ زانی کو رجم کرو تو کہتے ہیں: قرآن پاک میں تو رجم کا حکم نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن چیزوں کا قرآن میں ذکر نہ ہو تو ان کا قصہ ختم ہوجائے گا؟ کیا تم نے اللہ کے قرآن کو انسائیکلو پیڈیا سمجھا ہوا ہے کہ اس کے انڈیکس دیئے ہوئے ہوتے۔ اللہ کا قرآن تو ایک جامع دستور ہے، اس نے ایک آرڈر دیا ہے: ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ [الحشر:۷] جو میرا پیغمبر کہتا ہے، وہ میرا حکم ہے۔ تو جب خود حضور اکرم ﷺ نے رجم کیا تو اس میں اگر چہ، چونکہ، چنانچہ کا کیا مطلب ہے؟ اسلام کا قانون جیسے کتاب اللہ ہے، اسی طرح سنت رسول اللہ بھی ہے۔ جب قرآن میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم آیا تو کہنے لگے کہ یہ تو جنگل کا قانون ہے اور کسی نے کہا: ہاتھ نہیں کاٹیں گے، بلکہ اُنگلیاں کاٹیں گے۔

ان باتوں کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل نے اللہ کے حکم کے اندر حیلے اور بہانے تراشے تھے اور کہا تھا: ﴿ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا﴾ تو کیا ہمارا وہی حال نہیں ہے کہ اللہ کے قانون کے اندر ہم بھی اپنی عقل کے تابع آکر کہہ دیتے ہیں کہ ٹھیک ہے، مولوی کہتے ہیں، لیکن یہ عقل میں یہ بات نہیں بیٹھتی، یعنی......معاذ اللہ!...... ہماری عقل اتنی بلند ہے کہ اللہ کے قانون کی غلطیاں نکال لیتی ہے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ میری عقل کا خالق و مالک کون ہے؟ وہ چاہے تو مجھے پاگل کردے، میری عقل بھی چھین لے تو پھر میں کس سے فیصلے کروں گا؟

اس لئے قرآن نے ہمارے سامنے بنی اسرائیل کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ایسا نہیں کرنا۔ نہیں تو تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہوجائیں گے، پھر لاکھ اللہ کے قرآن پڑھواتے رہو اور محلوں میں شبینے پڑھواتے رہو اور ایک ایک رات میں ختم پڑھواتے رہو، لیکن عمل نہیں کروگے۔ جب شادی ہو تو دلہا دلہن کو قرآن کے سائے میں گزاریں گے، جب وہ عمل نہیں کریں گے تو وہ اوپر سے لعنت بھیج رہا ہے۔ اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میری امت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جن پر قرآن لعنت کرے گا۔ [تفسیر روح المعانی، سورۃ: فاطر، آیۃ:۲۹]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک جس نے نماز بھی نہیں پڑھی، ان کا نکاح بھی ختم ہوجاتا ہے۔ تو قصہ ہی ختم

ہوگیا، نکاح کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی، شام کو رخصتی ہو، عشاء کی نماز نہ پڑھی تو کافر، اور فجر کی نہ پڑھی تب بھی کافر، دونوں میں سے ایک نے نماز نہ پڑھی تو ایک کافر ہوگیا تو نکاح نہ رہا۔ کیونکہ کافر اور مسلمان کا تو نکاح نہیں رہتا ہے۔ اس لئے یہ سارے حالات ہمارے سامنے رکھے گئے۔ یہ مسئلہ صرف امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک ہے۔

اُمتِ محمدیہ میں بھی سابقہ قوموں جیسے اعمال:

حضور اکرم ﷺ نے جو فرمایا تھا، وہ سچ ثابت ہو رہا ہے یا نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میری اُمت اتم بھی وہ عمل کرو گے جو تم سے پہلوں نے کئے تھے۔ اور فرمایا: اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھس گئے تھے تو تم بھی اس میں گھسو گے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۳۴۵۶، باب: مَا ذُكِرَ عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ]

قومِ لوط میں لڑکوں (کے ساتھ لواطت) کی بیماری تھی، آج بھی یہ بیماری اس اُمت میں موجود ہے۔ قومِ لوط کے اندر یہ عادت تھی کہ لڑکے عورتوں کی طرح کا لباس پہنتے تھے اور بال بناتے تھے اور عورتوں کی طرح لہک لہک کر چلتے تھے اور آج یہ بیماری اس اُمت میں موجود ہے۔ اور قومِ لوط کے اندر یہی عادت تھی کہ راستے میں بیٹھ جاتے تھے، جب کوئی گزرنے والا گزرتا تو لوگ اس کے اوپر سیٹیاں بجاتے تھے، آج ہمارے نوجوان بھی ایسا کرتے ہیں۔ قومِ لوط کے اندر یہ عادت تھی کہ کنکریوں سے بھرے ہوئے پیالے رکھے ہوتے، کوئی آدمی گزرتا تو ان کے اوپر کنکریاں پھینکتے تھے جس پر اس کی کنکری پڑ جائے تو وہ اس کو پکڑ کر لے جاتا اور اس کے ساتھ بدفعلی کرتا اور کہتا کہ میری کنکری اس کو لگ گئی تو یہ میرے قرعے میں آگیا، آج اس کے ساتھ میں نے برائی کرنی ہے۔ کیا اس اُمت میں اب کلبوں کے اندر چابیوں کے تبادلے ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے؟ اللہ کے حرم ہے بیٹھ کر بتلاتے ہوئے شرم آتی ہے۔

واقعہ:

ایک بہت بڑے آدمی کی بیگم صاحبہ کلب میں رات گزارتی رہی...... میں ان کا نام نہیں لے سکتا، کیونکہ نام لیا جائے تو غیبت ہوتی ہے۔ اصل مقصد تو عبرت ہوتی ہے، کوئی ذاتی اعتراض نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ واقعہ اخباروں کے اندر بھی آگیا...... جب وہ رات کلب میں گزار کر نشے کی حالت میں گھر آتی تو ڈرائیور کو بھیج کر کہتی کہ میری شلوار وہاں رہ گئی ہے، وہ لے آؤ...... وہ مسلمان کی بیوی تھی، یہ نہ سوچیں کہ کسی ہندو یا سکھ کی بیوی تھی...... پھر آگے دیکھیں کہ جب ڈرائیور وہاں گیا اور چوکیدار سے کنٹیکٹ کیا تو اس نے کہا کہ بیگم صاحبہ سے اس شلوار کا رنگ پوچھو، یہاں تو

کئی شلواریں پڑی ہیں۔

یہ اُمت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بیٹیوں کی کمائی ہے۔ اسی طرح پہلی اُمتوں میں سوتیلی ماؤں سے زنا ہوا اور آج اس دور میں حقیقی ماؤں سے زنا ہو رہے ہیں، حقیقی بہنوں اور بیٹیوں سے زنا ہو رہے ہیں۔

ایک دفعہ کسی شریف آدمی نے مجھے چٹ بھیجی کہ آپ کے درس میں دو آدمی بیٹھے ہیں، وہ حافظ قرآن بھی ہیں اور قرآن کا درس باقاعدگی سے سنتے ہیں، لیکن رات کو ان کے گھروں میں ننگی فلمیں بھی چلتی ہیں اور اپنی عورتوں سے بھی پیشہ کرواتے ہیں۔ آپ بتلائیں یہ کیسے مسلمان ہیں؟ جب ہمیں کعبہ کا اتنا حیا نہیں، حرم کا اتنا حیا نہیں، حضور اکرم ﷺ کے روضے کے باہر کھڑے ہو کر لوگ سگریٹ پیتے ہیں، کعبہ کے طواف کے دوران جیب میں سگریٹ کی ڈبیاں آپ نے ڈالی ہوئی ہیں، اس حجر اسود پر عورت حجر اسود کو بوسہ دے رہی ہے اور مرد اس کو چھیڑ رہا ہے اور وہ پکڑا گیا اور اس کے کپڑوں پر مادہ منویہ پایا گیا تو کیا خیال ہے کہ اس کے بعد بھی ہم مسلمان ہیں؟ لیکن اس کے باوجود مسئلہ پوچھتے ہیں، مسئلہ تو تب پوچھیں گے جب ہمارے اندر اسلام ہو۔

آپ خود دیکھیں کہ کتنے لوگ ہیں جو نماز کے وقت نماز نہیں پڑھتے۔ کتنے لوگوں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ملتزم سے چمٹ کر چہرے کو رگڑ رہے ہوں گے، بارش آجائے تو میزاب رحمت کے نیچے مر جاتے ہیں، لیکن وہی چہرہ ہے اور داڑھی کنارہے ہیں۔ ان کو ذرہ بھر احساس نہیں ہوتا کہ ہم سنت محمد مصطفیٰ ﷺ چھوڑ کر کعبہ کی دیوار کو بھی گواہ بنا رہے ہیں۔ کم از کم کچھ تو ادب کرو، اور ڈرو کہ دور کھڑے ہو جاؤ کہ اے اللہ! میں کہاں اس قابل ہوں کہ اپنا چہرہ تیرے کعبہ کو لگاؤں؟ میں نے تو آپ کے نبی ﷺ کی سنت کو ختم کیا ہوا ہے۔

کتنے لوگ ہیں جو عمرہ کرنے آتے ہیں، لیکن ان کو عمرہ کرنے کا پتہ نہیں ہے اور کتنے لوگ جو احرام باندھے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کو یہ بھی پتہ نہیں کہ ناف کے اوپر باندھنا ہے یا اس کے نیچے باندھنا ہے۔ کتنے بندے ہیں جو آپ کو صفا و مروہ پر دوڑتے ہوئے نظر آئیں گے، لیکن ان کو پتہ بھی نہیں کہ صفا کیا ہے اور مروہ کیا ہے؟ کتنے پُرانے مکے میں رہنے والوں کو میں نے دیکھا اور ماشاء اللہ! روزانہ طواف کرتے ہوئے دیکھا، لیکن کوئی دوست آجائے تو طواف کے درمیان اس کو ملتے ہوئے جا رہے ہیں، یہ کون سا طواف ہے کہ تم نے سینہ بھی پھیر لیا اور رُخ بھی پھیر لیا؟ لیکن پھر بھی مسئلے کا پتہ نہیں ہے کہ جہاں سے میں نے چھوڑا ہے، اس سے ایک قدم پیچھے دوبارہ شروع کروں، لیکن ایسے ہی آگے چلے جا رہے ہیں۔ آپ نماز کے حکم میں ہیں، صرف طواف میں بولنے کی اجازت ہے اور بولنا بھی اس

وقت جب کوئی شریعت کا مسئلہ ہو یا کوئی دین کی بات ہو۔ یہ نہیں کہ تم طواف کے دوران ہاتھ میں ہاتھ ڈالو اور گپیں ہانکتے رہو۔

بولنے کا تو یہ مطلب ہے کہ پہلے نماز میں بولنے کی اجازت تھی، لوگ سلام کا جواب بھی دیتے تھے، لیکن اللہ نے منع کر دیا۔ اب نماز میں بولنا منع ہے، طواف میں بولنا جائز ہے۔ لیکن شریعت کا مسئلہ ہے، لیکن ہم طواف میں گپیں ہانک رہے ہوتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی آدمی مسجد میں آ کر کسی چیز کا اعلان کرے تو تم کہو: "لَا رَدَّ اللّٰهُ عَلَيْكَ" اللہ تیری وہ چیز واپس نہ کرے۔ ان مسجدوں کو تم نے اعلان کا اڈا بنالیا ہے، کیا تمہارے پاس کوئی اور اعلان کا ذریعہ نہیں ہے؟[1]

دلوں کی سختی حقیقی تھی یا مجازی؟

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ بعض علماء نے فرمایا: یہ بطور مجاز کے ہے۔ جیسے مجازی طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ تم انسان نہیں، تم تو کوئی پتھر ہو۔ لیکن راجح قول یہ ہے کہ مجاز نہیں، بلکہ حقیقت ہے کہ اللہ نے پتھروں میں شعور رکھا ہے۔ اگر پتھروں میں ادراک اور شعور نہ ہوتا تو اللہ کیوں فرماتے کہ ہر چیز میری تسبیح کر رہی ہے؟

"أو" کا اصل استعمال "شک" کے لئے ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے، پھر یہاں "أو" کیوں لایا گیا ہے؟ ﴿اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ بعض علماء فرماتے ہیں کہ "أو" تخییر کے لئے ہے، یعنی وہ پتھر کی طرح ہے یا پتھر سے زیادہ سخت ہے، جیسا کہ محاورہ میں کہا جاتا ہے: "جَالِسِ الْحَسَنَ أَوِ ابْنَ سِيْرِيْنَ" تم چاہو تو حضرت حسن کے پاس بیٹھ کر سبق حاصل کر و یا ابن سیرین کے پاس بیٹھ کر فائدہ حاصل کرو۔

اسی طرح امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے، لیکن انہوں نے ایک قول اور بھی نقل کیا ہے کہ کبھی "أو" کا استعمال ابہام کے لیے ہوتا ہے اور وہ ابہام مخاطب کے اعتبار سے ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے آگے تو کوئی چیز بھی چھپی ہوئی نہیں ہے۔ جیسا کہ محاوراتِ عرب میں کہتے ہیں: "أَكَلْتُ الْخُبْزَ أَوِ التَّمْرَ" (پتہ نہیں میں نے روٹی کھائی ہے یا کھجور کھائی ہے) حالانکہ اس کو پتہ ہوتا ہے، لیکن کہنے کے لئے ہے یہ کہہ دیتے ہیں۔



[1] [سنن الترمذی، حدیث: ۱۳۲۱، سنن ابن ماجہ، حدیث: ۷۶۷، باب: النَّهْيِ عَنْ إِنْشَادِ الضَّوَالِّ فِي الْمَسَاجِدِ]



اور بعض علماء نے فرمایا: ''أو'' اس طرح استعمال ہوا ہے: ''كُلْ حُلْوًا أَوْ حَامِضًا'' چاہو تو تم میٹھا کھاؤ یا کھٹا کھاؤ، یعنی ان دو سے باہر نہ جاؤ۔ تو یہاں معنی یہ ہوگا کہ تمہارے دل یا تو پتھر کی طرح سخت ہیں یا پتھر سے بھی زیادہ سخت۔ یعنی ان دوقسموں سے باہر نہیں ہیں۔ ابن حجر فرماتے ہیں: اگر ہم یہ دو حالتیں لے لیں تو ترجمہ یہ ہوگا کہ بعض کے دل تو ایسے ہیں جیسے پتھر اور بعض کے دل ان سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ١١٣/١، ١١٤، البقرة: الآية: ٧٤]

جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ ملائکہ نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ اے اللہ! پتھر تو بڑی سخت چیز ہے، اس سے بھی کوئی سخت چیز ہے؟ فرمایا: ہاں! لوہا اس کو بھی توڑ دیتا ہے۔ انہوں نے پھر پوچھا: اے اللہ! لوہے سے بھی کوئی سخت چیز ہے؟ اللہ نے فرمایا: ہاں! آگ ہے جو لوہے کو بھی پگھلا دیتی ہے۔ فرشتوں نے عرض کی: آگ سے بھی کوئی سخت چیز ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں! پانی ہے جو آگ کو بھی بجھا دیتا ہے۔ انہوں نے عرض کیا: پانی سے بھی کوئی سخت چیز ہے؟ فرمایا: ہوا، پانی کو بھی خشک کر دیتی ہے۔ انہوں نے کہا: ہوا سے بھی کوئی سخت چیز ہے؟ اللہ نے فرمایا: ہاں ابن آدم ہے جو اس طرح دائیں ہاتھ سے صدقہ کرے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلے۔

[سنن الترمذي، حديث: ٣٣٦٩]

علماء نے فرمایا کہ سخت چیز کے ساتھ مثال دی جارہی تھی۔ اگر اس کی مثال تانبے کے ساتھ دی جاتی تو وہ آگ پر پگھل جاتا ہے، لیکن ان کے دل تو ایسے ہیں جو قرآن سننے کے بعد بھی نہیں پگھلتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں ایک ایسی چیز کی مثال بیان کی، جو کسی صورت نہیں پگھلتی۔

''أو'' کس معنی میں ہے؟

بعض مفسرین نے جواب دیا ہے کہ ''أو'' بھی اپنے معنی میں نہیں ہوتا، بلکہ ''واؤ'' کے معنی میں ہوتا ہے، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا﴾ [الدهر: ٢٤] اے میرے پاک نبی! ہرگز اطاعت نہ کریں ان گناہ گاروں کی اور نہ ان ناشکروں کی۔ ﴿عُذْرًا اَوْ نُذْرًا﴾ [المرسلات: ٦] میں بھی ''أو''، ''واؤ'' کے معنی میں ہے اور اس آیت میں بھی ''أو''، ''واؤ'' کے معنی میں ہے کہ ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہیں اور پتھر سے زیادہ سخت ہیں۔

جمہور علماء ومفسرین، اور سلف وصالحین نے یہ جواب دیا ہے کہ اللہ نے قرآن میں اپنے بندوں کی عقل کے

مطابق خطاب کیا ہے، وگرنہ اللہ کے علم میں تو ہر چیز ہوتی ہے، اللہ کے آگے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''أو '' بمعنی ''بَلْ '' ہے، ''بَلْ '' اضراب کے لئے ہوتا ہے، جیسے بہت سارے مقام پر ''فی '' بمعنی ''إلی '' آجاتا ہے یا کبھی کبھی ''إلی '' بمعنی ''فی '' آجاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ﴾ [الانعام: ۱۱] اے پیغمبر! آپ مشرکین مکہ سے کہیں کہ وہ زمین میں پھریں اور دیکھیں کہ پہلی قومیں جو تباہ و برباد ہوئی ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ ''فِي '' ظرفیت کے لیے ہوتا ہے۔ اب کوئی آدمی زمین کو پھاڑ کر اندر تو نہیں جا سکتا، اس لیے یہاں ''فِي '' بمعنی ''عَلٰی '' ہے۔ اس طرح دوسری آیت میں ہے: ﴿فَلَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ أَيُّنَا أَشَدُّ عَذَابًا وَأَبْقَىٰ﴾ [طٰہٰ: ۷۱] فرعون نے جب ان لوگوں کو دھمکی دی تھی جو ایمان لے آئے تھے کہ تم موسیٰ (علیہ السلام) کی بات مان رہے ہو اور میری مخالفت کر رہے ہو، میں تمہیں کھجوروں کے جھنڈ کے اندر پھانسی دوں گا۔ اب ان کے اندر تو پھانسی نہیں ہوتی، بلکہ معنی یہ تھا کہ ان پر لٹکا دوں گا۔ تو یہاں بھی ''فِي '' بمعنی ''عَلٰی '' ہے۔

اسی طرح قرآن مقدس کے بہت سارے مقامات میں ''إلی '' بمعنی ''فِي '' کے آگیا، اور کہیں ''فِي '' بمعنی ''عَلٰی '' آگیا اور کبھی ''أوْ '' بمعنی ''واؤ '' کے یا کبھی ''بَلْ '' کے معنی میں آگیا اور کبھی ''تخییر '' کے لیے آگیا اور ''أوْ '' کا اصل استعمال ''شک '' کے لیے ہوتا ہے، لیکن دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس کا استعمال اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کے لیے تو جائز نہیں ہو سکتا۔ چونکہ شک تو اس کو ہوتا ہے جس کا علم مکمل نہ ہو۔ ایک آدمی کہے کہ میں نے فلاں کتاب میں یہ پڑھا تھا یا یہ پڑھا تھا۔ جیسے راوی کہتا ہے کہ یوں کہا تھا یا یوں کہا تھا۔ لیکن اللہ کی شان تو یہ ہے کہ اس کی ذات نہ کبھی بہکتی ہے اور نہ بھولتی ہے۔ وہ بھولنے سے بھی پاک ہے اور اس کا علم کامل ہے۔

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک قول یہ ہے کہ ''أوْ '' بمعنی ''بَلْ '' ہے۔ تو معنی یہ ہوگا کہ یہ سخت ہو گئے پتھر کی طرح، بلکہ پتھر سے بھی زیادہ۔ جیسا کہ قرآن میں آتا ہے: ﴿إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً﴾ [النساء: ۷۷] یہاں ''أو '' بمعنی ''بَلْ '' ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ﴾ [الصافات: ۱۴۷] کہ ہم نے ان کو پیغمبر بنا کر بھیجا ایک ایسی قوم کے پاس جن کی تعداد ایک لاکھ کے برابر تھی یا زیادہ تھی۔ تو یہاں بھی ''أو '' بمعنی ''بَلْ '' کے ہے اور اسی طرح آتا ہے: ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ﴾ [النجم: ۹] یہاں بھی ''أو '' بمعنی ''بَلْ '' کے ہے۔

بعض مفسرین نے یہ ارشاد فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ ﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً﴾ تمہاری شرع کے مطابق یہ پتھر ہیں یا پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مخاطب فرما کر ویسے کلام فرمایا جیسے ان کے محاورات ہیں۔ مفسر ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو نقل فرمایا:

أُحِبُّ مُحَمَّدًا حُبًّا شَدِيدًا
وَ عَبَّاسًا وَ حَمْزَةَ وَ الْوَصِيَّا
فَإِنْ يَكُ حُبُّهُمْ رُشْدًا أُصِبْهُ
وَ لَسْتُ بِمُخْطِئٍ إِنْ كَانَ غَيًّا

وہاں بھی ابہام مخاطب کے لیے ہے، یعنی کہنے والے کو ابہام نہیں ہے کہ اگر ان کی محبت ہدایت ہے تو میں ہدایت پر پہنچ جاؤں گا اور میں اگر ان کی محبت میں گمراہی پر ہوں، پھر بھی میں خطا پر نہیں ہوں، مجھے یقین ہے کہ میں ان سے محبت کے معاملے میں حق پر ہوں۔ اگر آپ کو کوئی شبہ ہے تو ہوتا رہے۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب ابوالاسود نے یہ اشعار کہے تو لوگوں نے اس سے کہا کہ تمہیں شبہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت یا اہل بیت کی محبت ہدایت کا راستہ ہے یا نہیں ہے؟ اس نے کہا: مجھے تو کوئی شبہ نہیں، یہ تو اندازِ تخاطب ہے کہ مخاطب کو ابہام میں ڈالا جا رہا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: ﴿وَإِنَّا أَوْ إِيَّاكُمْ لَعَلَىٰ هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ [سبا: ۲۴] کہ اے میرے نبی! ان کافروں کو کہہ دیں کہ ہم یا تم دونوں میں سے کوئی تو ہدایت پر ہے اور کوئی تو گمراہی پر ہے۔ تو یہ مخاطب کو ابہام میں ڈالنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ تو ابوالاسود نے کہا کہ اس آیت کے اندر جو آ رہا ہے تو کہنے والے کو تو کوئی شک نہ تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۴، البقرۃ: الآیۃ: ۷۴]

دل کی سختی سے پناہ مانگو:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت دل ہونے سے پناہ مانگی ہے: ''اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْقَسْوَةِ وَ الْغَفْلَةِ'' اے اللہ! ہمیں قسوہ (دل کی سختی) اور غفلہ (غفلت) سے پناہ عطا فرما دے۔ [المعجم الصغیر، حدیث: ۳۱۶]

سنگ دلی کی انتہاء:

بعض دل ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں ''رحم'' کا مادہ ہی نہیں ہوتا، یعنی ان کی لغت میں کبھی ''رحم'' کا لفظ ہی نہیں

ہوتا، جیسے فرعون، ہامان، شداد، تاتاری گزرے۔ یہ لوگ ایسے تھے کہ ان کو لوگوں کے خون سے ہولی کھیلتے ہوئے خوشی ہوتی تھی، تاتاری انسانوں کو قتل کرنے کے بعد ان کی کھوپڑیوں کے مینار بنواتے تھے، ان کے جنگجو سرداروں میں جس کا مینار اونچا ہو گیا، وہ بڑا سردار ہے کہ اس نے زیادہ بندوں کو مارا ہے۔ اور ان کی شقاوتوں کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ انسان کو قتل کرتے، اس کا سر جسم سے جدا اور اندر سے مغز وغیرہ نکال کر اور کھوپڑی کا پیالہ بنا کر اس میں شراب پیتے تھے۔ بہت سارے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے مخالف کو آگ کے بھٹے میں ڈلوا دیتے ہیں، ان کو پروا بھی نہیں ہوتی۔ حالانکہ انسان اگر کوئی حادثہ بھی دیکھ لے تو دو چار دن تک نیند نہیں آتی کہ کیسے انسان تڑپ اور پھڑک رہے تھے!؟ کیسے ان کے اعضاء ٹکڑے ٹکڑے ہوئے پڑے تھے!؟ لیکن بعض لوگ لطف لیتے ہیں......

اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرمائے...... انسان جب حیوان بنتا ہے تو پھر درندے بھی اس سے شرماتے ہیں۔ آج آپ کشمیریوں سے، بوسنیا کے مسلمانوں سے جا کر پوچھیں کہ وہاں درندوں نے کیا سلوک کیا ہے؟ ہم تو اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے ہیں، کھا پی رہے ہیں، دس دس کھانے کھا کر ڈکار مار دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ یا اللہ! ان کو فتح عطا فرما۔

دعا تو تب ہوتی ہے کہ اللہ کے پیغمبر بھی مقامِ بدر میں کھڑے تھے، پاؤں جل رہے تھے، اوپر سورج کی گرمی سے آگ برس رہی تھی، سامنے دشمن کی قوت تھی، اپنے پاس تین سو تیرہ کی ایک قلیل جماعت تھی، تمام اسباب منقطع ہو گئے تھے اور حضور اکرم ﷺ دعا کر رہے ہیں کہ میرے پروردگار! آج تُو نے اگر میری مدد نہ کی تو مسلمان مٹ جائیں گے۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۱۷۶۳، بَابُ: الْإِمْدَادِ بِالْمَلَائِكَةِ فِي غَزْوَةِ بَدْرٍ]

ے گر تُو فضائے بدر پیدا کر دے تو فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں قطار اندر قطار اب بھی

جب تک فضاء ہی پیدا نہ کر سکو تو دعا کا کیا معنی ہے؟ اور اس طرح کی دعائیں کر کے بھی ہم اس کو احسان سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمان بھائیوں کے لیے دعا تو کرتے ہیں۔ اب تو لوگ اخبار کے اندر پڑھتے ہیں کہ اتنے لوگ قتل ہو گئے تو ان کی زبانوں سے "اِنَّا لِلّٰہِ" بھی نہیں نکلتا، کیونکہ روزانہ جو ایسی خبریں پڑھ رہے ہیں۔ افسوس کی کیفیت ہی مٹ گئی ہے، اب ہم اس مقام پر آ گئے ہیں کہ ہمارے دل بھی مسلمانوں کے لیے نہیں دھڑکتے۔ اگر وہ بات میرے بیٹے،



بیٹی، بہن، بھائی وغیرہ پر آجائے تو پھر روتے ہیں کہ ہمارے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے، حالانکہ ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ [الحجرات:۱۰] مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اگر کسی مسلمان کی بیٹی کی بے عزتی ہوتی ہے تو گویا ہماری بیٹی کی بے عزتی ہوئی۔ ہمیں تڑپنا چاہیے اور ہمیں غیرت آنی چاہیے، ہمارا ضمیر بیدار ہونا چاہیے، لیکن سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وجہ وہی قساوتِ قلب ہے کہ ہمارے دل سخت ہو گئے ہیں، اس کا علاج توبہ ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی قول کو ابن جریر رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔ تو یہ ایسے ہوگا جیسے قرآن میں آیت ہے: ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ [البقرۃ:۱۷] اور ﴿أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ﴾ [البقرۃ:۱۹] کہ وہ ان دو حالتوں سے باہر نہیں نکلے یا جیسے اللہ کا فرمان ہے: ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً﴾ [النور:۳۹] یا فرمایا: ﴿أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ﴾ [النور:۴۰] یعنی بعض کافر اُن میں سے اس حالت پر ہیں اور بعض اُن میں سے اس حالت پر ہیں۔

کثرتِ کلام قساوتِ قلبی کا سبب ہے:

حافظ ابوبکر مردویہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا تُكْثِرُوا الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللهِ؛ فَإِنَّ كَثْرَةَ الْكَلَامِ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللهِ قَسْوَةٌ لِلْقَلْبِ، وَ إِنَّ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللهِ الْقَلْبُ الْقَاسِي.)) [سنن الترمذی، حدیث:۲۴۱۱]

''اللہ کے ذکر کے سوا بلاوجہ باتیں نہ کیا کرو، ورنہ تمہارا دل سخت ہو جائیں گے اور اللہ کی رحمت سے سب سے بعید وہ ہوتا ہے جس کا دل سخت ہو۔''

مذاق میں بھی دوسرے کو تکلیف نہ دو:

آج یہی عذاب ہے۔ ایک آدمی نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ میں مولانا مکی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا: مجھے مولانا کا تو پتہ نہیں، البتہ مکی میں ہوں۔ کہنے لگا کہ آپ سچی بات کر رہے ہیں؟ میں نے کہا: مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن وہ بے چارا بار بار پوچھے۔ اس کو کہا: بات کیا ہے؟ کہنے لگا: ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے ایک آدمی ملا تھا، اس نے کہا کہ مولوی مکی تو مر گیا ہے۔ میں چونکہ آپ کا شاگرد ہوں، میں بے ہوش ہو گیا اور پھر کسی سے آپ کا ٹیلی فون نمبر لیا اور آپ سے بات کی، لیکن مجھے تسلی نہیں ہو رہی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی نے ایسے ہی مذاق کے لیے کہہ دیا

ہوگا اور اس بے چارے کو اتنی تکلیف ہوئی۔ اس لیے تم وہ بات کرو جس کا تمہیں فائدہ ہو، ورنہ چپ رہو۔

بعض لوگوں کو میں نے دیکھا...... ماشاء اللہ!...... وہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے۔ اور کئی بزرگ دیکھے کہ ہم بات کر رہے ہیں اور وہ اپنا قرآن اور اللہ کے ذکر میں لگے ہوئے ہیں، ہر حال میں ذکر ہے، کیونکہ ان کو پتہ ہے کہ جو گھڑی گزر گئی، میری زندگی کی گھڑی گزر گئی۔ ماں باپ تو خوش ہوتے ہیں کہ بیٹا بڑا ہو رہا ہے، یہ نہیں سوچتے کہ موت کے قریب جا رہا ہے۔ لیکن ہم غافل ہیں، اپنے اوقات کو ضائع کرتے ہیں اور اپنے اوقات گالیوں میں اور جھوٹے قصے کہانیوں میں گزارتے ہیں۔

اس لیے اس بارے میں حضور اکرم ﷺ کا فرمان سنیں کہ جو آدمی بھی اللہ کے ذکر کے علاوہ کثرت کے ساتھ بات کرتا ہے، یہ دل کی سختی کا ذریعہ ہے۔ تحقیق وہ لوگ جو اللہ سے بہت دور ہو جاتے ہیں، وہ لوگ ہیں جن کے دل سخت ہو گئے ہیں۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۴۱۱]

بدبختی کی چار علامات:

حضرت بزار نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع حدیث نقل فرمائی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((أَرْبَعٌ مِنَ الشَّقَاءِ: جُمُوْدُ الْعَيْنِ وَ قَسْوَةُ الْقَلْبِ وَ الْحِرْصُ عَلَى الدُّنْيَا وَ طُوْلُ الْأَمَلِ.))

[جامع الاحادیث، حدیث: ۳۰۸۹]

چار چیزیں بدبختی کی علامت ہیں:

❁...... پہلی علامت یہ ہے کہ آنکھوں سے آنسو نہ بہیں کہ لاکھ دعائیں مانگ رہا ہے اور نمازیں پڑھ رہا ہے، طواف کر رہا ہے، ملتزم پر لگا ہوا ہے، لیکن آنسو نہیں نکلتا۔

❁...... دوسری علامت یہ ہے کہ دل سخت ہو گیا ہے کہ کسی بات کا بھی اثر نہیں لیتا۔

❁...... تیسری علامت یہ ہے کہ بڑی بڑی اُمیدیں لگائی ہوئی ہیں کہ میں یہ کروں گا اور وہ کروں گا۔

❁...... اور چوتھی علامت یہ ہے کہ دنیا پر ہر وقت حرص ہے کہ کس طرح سے پیسہ بنے۔

یہ ساری بدبختی کی علامات ہیں، کیونکہ مومن جانتا ہے کہ جو میرے اللہ نے میرے مقدر میں لکھا ہے، مجھے وہی ملے گا۔

نکات:

عربوں کا ایک محاورہ ہے: "اَلنَّصِیبُ یُصِیبُ وَ لَوْ تَحْتَ الْجَبَلَیْنِ" دو پہاڑوں کے نیچے بھی رکھ دو، جو ہمارا نصیب ہے وہ ہمیں پہنچے گا۔ ایک صحابی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اسلام سے پہلے کا کوئی واقعہ سناؤ۔ اس نے کہا: حضور! جب میں کافر تھا تو میں نے تقریباً اپنی آٹھ بیٹیاں اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کر دیں۔ حضور اکرم ﷺ رو پڑے اور فرمایا: تجھے اپنی بیٹیوں پر رحم بھی نہیں آیا؟

[المعجم الکبیر حدیث: ۸۶۳]

اسی طرح ایک اور صحابی آئے اور کہا: حضور! آپ بھی روتے ہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: الحمد للہ! مجھے اللہ نے نرم دل عطا فرمایا ہے، مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ نے رحمت للعالمین بنا کر بھیجا ہے، مجھے اللہ تعالیٰ نے قساوتِ قلب سے محفوظ رکھا ہے۔ اس صحابی نے کہا: یا رسول اللہ! اس وقت تو ہمارے ہاں رواج تھا اور ہم لوگ عادی تھے۔ اس لیے رحم کا کیا مطلب ہے، اللہ پاک ہم سب کو شقاوتِ قلبی سے بچائیں اور اللہ تعالیٰ ہمیں سعادت نصیب فرمائیں۔

﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۷۵ تا ۷۷]

اب کیا تم اے مسلمانو! توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے اور ان میں ایک فرقہ تھا جو اللہ کا کلام سنتا تھا، پھر وہ اُس کو جان بوجھ کر بدل ڈالتے تھے، حالانکہ وہ جانتے تھے۔ اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں، کہتے ہیں: ہم مسلمان ہوئے اور جب ایک دوسرے کے پاس تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: تم ان سے کیوں کہہ دیتے ہو جو اللہ نے تم پر ظاہر کیا ہے، تاکہ اس سے وہ تمہارے رب کے سامنے تمہیں جھٹلائیں، کیا تم نہیں سمجھتے؟ کیا وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔

﴿وَقَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ اس میں مفسرین کے دو گروہوں میں سے ایک کہتا ہے کہ اس سے

مراد وہ ستر لوگ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام ان کو کوہِ طور پر ساتھ لے گئے، کلام سنا تو کہنے لگے: ہمیں زیارت کروائیں۔ اللہ نے ان کو مار دیا، پھر بعد میں زندہ کر دیا اور بظاہر زندہ ہو کر موسیٰ علیہ السلام سے راضی ہو گئے اور ان کے ساتھ مل کر بنی اسرائیل میں آ گئے۔

اب قوم ان کے پاس اکٹھی ہو کر پوچھنے لگی: آپ لوگوں نے اللہ کا کلام سنا؟ کہنے لگے: ہم نے اللہ کا کلام سنا ہے۔ قوم نے کہا: اللہ نے کیا حکم دیا ہے؟ کہا کہ اللہ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ تورات میری کتاب ہے، موسیٰ میرے نبی اور رسول ہیں، ان کی اطاعت کرو، تورات کے اندر جو باتیں ہیں سب کی تعمیل کرو۔ یہ ساری باتیں ٹھیک بتاتے آئے اور آخر میں آ کر ایک لفظ بڑھا دیا کہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر تمہیں ہمت اور طاقت ہو تو کر لینا، ورنہ نہ کرنا۔

(لطیفہ) جیسا کہ مثل مشہور ہے کہ ایک جھوٹا گواہ تھا، اس نے کسی آدمی سے طے کیا کہ ہزار روپے لے کر جھوٹی گواہی دوں گا۔ لیکن چونکہ وہ جھوٹا مشہور تھا تو اب پیسے دینے والے کو بھی ڈر تھا کہ پیسے دوں، پھر یہ گواہی نہ دے۔ دوسری طرف جھوٹے آدمی کو بھی ڈر ہوا کہ میں جھوٹی گواہی بھی دے دوں اور یہ مجھے پیسے نہ دے۔ بہر حال انہوں نے آپس میں طے کیا کہ جب میں گواہی دے دوں تو میں پیچھے ہاتھ کروں گا، تم دے دینا۔ اگر مجھے پیسے نہ دیئے تو میں شور کروں گا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ اب عدالت میں جا کر اس نے گواہی دی اور اس کے بعد ہاتھ پیچھے کیا۔ دوسرے آدمی نے کہا: خواہ مخواہ اب اس جھوٹے آدمی کو پیسے دینے کی کیا ضرورت ہے؟ گواہی تو ہو گئی ہے۔ جھوٹا آدمی اس کو بار بار ہاتھ مارتا ہے، لیکن وہ آرام سے کھڑا ہے اور اس کو یقین ہو گیا ہے کہ یہ مجھے پیسے نہیں دیتا۔ اتفاق سے مجسٹریٹ نے جب ساری باتیں لکھ لیں تو گواہ سے پوچھا کہ آپ نے اور کچھ کہنا ہے۔ اس نے کہا کہ اس نے جتنا مجھے سکھایا تھا اتنا تو میں نے کہہ دیا ہے۔

مسلمان چاہتے تھے کہ اہل کتاب اسلام میں جلدی داخل ہو جائیں، کیونکہ جب پڑھے لکھے لوگ اسلام میں داخل ہوں گے تو اسلام کو ترقی اور عظمت ملے گی اور پھر پوری دنیا پر اس کے اثرات مرتب ہوں گے کہ اسلام سچا مذہب ہے، اس لیے تو اہل کتاب نے مان لیا ہے۔ اللہ نے ان آیات میں فرمایا کہ اے اُمتِ مصطفیٰ! تم ان لوگوں سے طمع رکھتے ہو جنہوں نے اللہ کا کلام سن کر بھی بدل ڈالا، کیا وہ تمہاری بات مان لیں گے؟ تم ان سے کیا اُمیدیں لگا کر بیٹھے ہو کہ اہل کتاب ہمارے دوست بن جائیں گے؟ ہمارے ساتھ اسلام میں آ جائیں گے؟

جیسے آج کل کئی لوگ اس زعم میں ہیں کہ یہ اہل کتاب معقول لوگ ہیں، اسلام اور حضور اکرم ﷺ کی بڑی



تعریفیں کرتے ہیں، یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس لیے ان کے ساتھ ہمیں رہنا چاہیے۔ حالانکہ یہ ایک وہم ہے۔ جو لوگ چودہ سو سال تک اپنی فطرت نہ بدل سکے تو تم ان کی کیا فطرت بدلو گے؟

دوسرا قول یہ ہے کہ کلام سے مراد تورات ہے۔ تورات بھی اللہ کا کلام اور اللہ کی کتاب ہے۔ بطور خاص وہ لوگ مراد نہیں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گئے تھے، بلکہ بنی اسرائیل کے عام بڑے بڑے احبار و علماء مراد ہیں کہ یہ اللہ کا کلام سنتے ہیں اور اس میں تحریف کر دیتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۵]

تحریف کی اقسام:

تحریف دو قسم کی ہوتی ہے: ایک تحریفِ لفظی اور دوسری تحریفِ معنوی۔ تحریفِ لفظی یہ ہے کہ اللہ کی کلام کے لفظ کو بدل ڈالا۔ تحریفِ معنوی یہ ہے کہ لفظ تو اپنی جگہ رہنے دیں، لیکن معنی بدل دیا کہ یہ مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے۔ بنی اسرائیل کے بارے میں جہاں جہاں بھی آیا ہے تو انہوں نے تحریفِ لفظی کی تھی، لفظ ہی بدل ڈالے تھے۔ جیسے قرآن نے دوسری جگہ خود ہی بیان فرما دیا: ﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ [النساء: ۴۶] کہ وہ کلمات کو بھی بدل ڈالتے تھے، آگے کا لفظ پیچھے کر دیا اور پیچھے کا لفظ آگے کر دیا تو اس سے ترجمہ بہت بگڑ گیا۔

ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی جو صفات تورات میں موجود تھیں، ان کو بدل ڈالا۔ جیسے حضور اکرم ﷺ کے بارے میں تورات میں یہ علامت موجود تھی: ''لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ وَ لَا بِالْقَصِيْرِ'' حضور پاک ﷺ کا قد مبارک بہت لمبا بھی نہیں اور بہت چھوٹا بھی نہیں، یعنی معتدل اور میانہ قد ہے۔ ان بدبختوں نے اس لفظ کو اُڑا دیا اور ''بِالطَّوِيْلِ'' کا لفظ رہنے دیا، تاکہ کوئی دیکھے کہ تورات میں تو لمبا قد آیا ہے اور آپ کا قد تو معتدل ہے تو یہ نشانی آپ ﷺ میں نہیں ملتی۔ اسی طریقہ سے تورات میں حضور اکرم ﷺ کی جو صفات تھیں، وہ بدل ڈالیں۔

اسی طرح جب ان کا کوئی بڑا آدمی جرم میں مبتلا ہوتا اور وہ وقت کے احبار و رہبان سے فتویٰ لیتا کہ مجھ سے فلاں گناہ ہو گیا ہے، اس کی کیا سزا ہے؟ تو وہ دیکھتے کہ یہ بڑا آدمی ہے، یہ ہدیہ ٹھیک دے گا تو وہ سزا والے پیرے میں تبدیلی کر کے چھوٹی سزا اور نرم سزا بتا دیتے تھے۔ اور اگر کوئی عام اور غریب آدمی پھنس جاتا تو اس کو پوری سزا بتاتے تھے۔ اس طرح انہوں نے تورات میں بہت ساری تبدیلیاں کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۵]

قرآن میں بعض لوگوں کی لفظی و معنوی تحریف:

آج کل بھی......اللہ معاف کرے، اللہ معاف کرے......قرآن میں تحریف معنوی عام ہے، ہر کوئی اپنی منشاء سے قرآن کے معانی بدل رہا ہے۔ جو چیز اُسے سوٹ کرتی ہے وہ قرآن سے لے لیتا ہے اور جس آیت میں اس کے خلاف کوئی بات ہوتی ہے تو اس کے معنی بدل دیتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام بدل ڈالے ہیں۔

(واقعہ) پُرانی بات ہے، میری عمر اس وقت بارہ تیرہ سال کی تھی۔ ایک مولوی صاحب اور ان کے والد بہت بڑے عالم تھے، اپنے وقت میں مشہور علماء میں شمار ہوتے تھے اور ان کا بیٹا بھی بڑا عالم تھا، لیکن چونکہ دولت مل گئی، پیسہ مل گیا، شہرت مل گئی، وہ بڑا آدمی بن گیا......اور جس شخص کو تھوڑی سی شہرت مل جائے وہ زمین پر نہیں ٹکتا، وہ اوپر اُڑنا شروع کر دیتا ہے...... بہر حال اس مولوی کو بھی بڑا مقام اور شہرت ملی تھی۔ اتفاق سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اس سے خود سنا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ ٹھیک ہے، شراب حرام ہے، لیکن یہ وِسکی حرام نہیں ہے، کیونکہ قرآن میں خمر آیا ہے کہ جو عقل کو ڈھانپ دے، آدمی عقل میں نہ رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس خمر کی حرمت آئی، وہ انگور سے نکالا جاتا تھا اور وِسکی کوئی سیب سے بنتا ہے، کوئی مالٹے سے بنتا ہے اور کوئی گندم سے۔ اس لیے یہ حرام نہیں۔

ایک اور آدمی ہیں، وہ بھی اپنے آپ کو عالم کہتے ہیں، اس نے بھی تقریر میں مولویوں پر طنز کیا ہے۔ کہنے لگا کہ اگر ان مولویوں کو دو دو کلو انگور لا کر دیں تو کھا جاتے ہیں اور اسی انگور کا ہم پانی نکال لیں تو حرام ہو جاتا ہے۔ لوگ کہنے لگے کہ بات تو اس نے بڑی کی ہے کہ جب انگور حلال ہے تو اس سے جو پانی نکالا ہے، وہ کیوں حرام ہے؟ یہ مولوی بڑا پڑھا لکھا ہے، یہ پُرانے ملاں ہیں، یہ پُرانی کتابوں سے باہر بھی نہیں نکلتے۔

حالانکہ اتنا غور نہیں کیا کہ اللہ نے تمہارے لیے بیوی حلال کی ہے، اگر اسی بیوی سے ایک بچی نکلی تو کیا وہ تمہارے لیے حلال ہے؟ کیا اس سے بھی شادی کر سکتے ہو؟ ورنہ تو بیٹیوں سے بھی شادی کرو، وہ بھی تو اس عورت سے نکلی ہیں۔ جب ماں حلال ہے تو اس کی بیٹی کیوں حرام ہے؟

بس لوگوں کا ایک دماغ ہے، ان کا قرآن و حدیث سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، کسی کی کوئی بات سن لی تو پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ ان کو کسی نے کہا کہ انگور کا پانی حرام ہے، حالانکہ اصل تو مسکر حرام ہے، جو چیز نشہ دے وہ حرام ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ'' ہر ہر نشہ آور چیز حرام ہے، وہ چاہے انگور

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۶۱۲۴، باب: قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ : يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا]



سے نکالو یا گندم سے نکالو یا گڑ سے نکالو یا کسی بالا سے نکالو۔ اگر وہ مسکر بن گیا ہے تو حرام ہے، اور اگر مسکر نہیں بنا تو حلال ہے۔

اس طرح قرآن پاک کی تحریف معنوی عام ہے اور قرآن کی تحریف لفظی بھی ہورہی ہے، جیسا کہ بعض فرق باطلہ کا عقیدہ ہے کہ اس قرآن کو تین صحابہ نے لکھا ہے: ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے۔ اور یہ قرآن ٹھیک نہیں ہے، اس قرآن کو بدلا گیا ہے اور اس میں کہیں اضافہ کیا گیا ہے اور کہیں کمی کی گئی ہے۔ اس میں اہل بیت کی جتنی باتیں تھیں وہ نکال دی گئی ہیں۔ ان کا اس قرآن پر قطعاً ایمان نہیں ہے اور قرآن میں انہوں نے تحریف کی ہے، جیسے قرآن میں آیا ہے: ﴿عَلِيٌّ حَكِيمٌ﴾ [الشوریٰ: ۵۱] تو انہوں نے کہا: یہاں ''علیٌّ'' سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ جہاں قرآن میں ﴿عَلِيًّا﴾ کا لفظ ملا تو نیچے لکھ دیا کہ علی بن ابی طالب۔ قرآن میں آیا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ﴾ [المائدۃ: ۶۷] اے میرے رسول! جو ہم نے آپ پر بھیجا ہے آپ اس کو پہنچا دیجیے۔ کہتے ہیں کہ یہاں آگے لکھا تھا: ''بِخِلَافَةِ عَلِيٍّ'' کہ علی کی خلافت کے بارے میں جو ہم نے آپ کو فرمایا ہے وہ پہنچا دیجیے۔ وہ کہتے ہیں کہ سنیوں نے اس لفظ کو کاٹ دیا ہے۔

اور اسی طرح ان کا کلمہ اتنا کیا، اور کہتے ہیں کہ سنیوں نے کلمہ بھی چھوٹا کر دیا ہے، اسی طرح اذان کے بارے میں کہتے ہیں کہ تم اذان بھی پوری نہیں دیتے، درمیان میں کھا گئے ہو اور انہوں نے اسی طرح اذان بھی لمبی کردی۔ اسی طرح انہوں نے یہ تحریف بھی کی ہے کہ سورج غروب ہو تو افطار کرو، لیکن وہ کہتے ہیں کہ جب تک تارے نہ نکلیں، اس وقت تک غروب کیسے ہوسکتا ہے؟ قرآن میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم آیا تو انہوں نے کہا: انگلیاں کاٹو۔ زکوٰۃ کا حکم آیا تو انہوں نے کہا: ہمارے لیے کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور ہمارے سامنے بعض جاہل سنی کہلانے والے لوگ کہتے ہیں کہ یہ تحریف معنوی تو ہے، تحریف لفظی نہیں ہے، یعنی انہوں نے قرآن کا لفظ تو نہیں بدلا، لیکن معانی انہوں نے بدلے ہیں، جیسے قرآن کے لفظ ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ﴾ کا ترجمہ کیا: اے غیب کی خبر دینے والے! چلو ''نباء'' کا ترجمہ ''خبر دینا'' ہے، لیکن ''غیب کی خبر'' کا ترجمہ کہاں سے لگا لیا ہے؟

بہرحال اللہ ہمیں تحریف لفظی اور معنوی سے بچائے اور اسی طرح قرآن پر عمل کرنے کی توفیق دے جس طرح میرے آقا ﷺ نے ہمیں سمجھایا اور پہنچایا ہے۔

﴿مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ﴾ یہ تحریف بھی کرتے ہیں اس بات کے بعد کہ یہ جانتے اور سمجھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود

بھی جان بوجھ کر اللہ کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ غلطی پر ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ کے کلام میں غلط طور پر تحریف وتبدیلی کرر ہے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيثَاقَهُمْ لَعَنَّـٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَـٰسِيَةً ۖ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ﴾ [المائدۃ: ۱۳]۔ اگر صرف اعراب زبر زیر میں بھی فرق آجائے تو معنی اتنا بدل جاتا ہے کہ انسان کفر میں جا پہنچتا ہے، جیسا کہ ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ اگر اس کو کوئی ''أَنْعَمْتُ'' پڑھے تو کفر ہو جائے گا، کیونکہ ''أَنْعَمْتَ'' کا معنی ہے: جن پر تُو نے انعام فرمایا اور ''أَنْعَمْتُ'' کا معنی ہے: جن پر میں نے انعام کیا۔ معنی میں اتنا بڑا فرق واقع ہو جائے گا، جو مستلزم کفر ہے، صرف ایک زبر کو بدلنے سے، تو جو لوگ حرف اور کلمات ہی بدل ڈالیں تو اس کا اندازہ خود کیا جا سکتا ہے۔

﴿أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ﴾ محمد بن اسحاق فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: اللہ پاک نے اپنے پاک پیغمبر اور مومنین کو فرمایا کہ ان سے امید نہ لگاؤ، یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے، کیونکہ یہ تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ کا کلام کوہِ طور پر سنا، لیکن پھر بھی اللہ کے کلام کو بدل ڈالا۔ اس لیے ان کا کیا حل ہو سکتا ہے؟

محمد بن اسحاق نے بعض اہل علم سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کی خواہش ظاہر کی تو اس واقعہ کے آخر میں ہے کہ جب بنی اسرائیل کے وہ چیدہ چیدہ لوگ سجدہ میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے اوامر اور منہیات دیئے، جو انہوں نے سنا، اس کو سمجھا۔ اب موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر بنی اسرائیل کی طرف تشریف لے آئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو حکم دیا کہ اللہ نے یہ حکم دیا ہے، یہ حکم نہیں دیا اور اس کو کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو نہ کرنے کا۔ اور جو موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا انہوں اس کو بدل ڈالا۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے کلام کے اندر اپنے پیغمبر کو بتایا: ﴿أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ﴾۔

دوسرا قول حضرت سدی کا یہ ہے کہ کلام اللہ سے مراد تورات ہے کہ اس کو بھی انہوں نے بدل ڈالا۔ یہ قول زیادہ عام ہے، کیونکہ وہ ایک خاص موقع تھا۔ کلام اللہ سے مراد توراۃ ہے، اسی قول کو ابن جریر نے بھی لیا ہے۔ یہ ضروری تو نہیں ہے کہ کلام اللہ کے سننے کا معنی ہو کہ جیسے موسیٰ علیہ السلام نے سنا، بلکہ موسیٰ علیہ السلام سے جن لوگوں نے کلامِ الٰہی سنا، وہ بھی مراد ہیں۔



بہر حال مفسر رحمہ اللہ نے یہ قول نقل فرمائے ہیں اور یہ دونوں قول جمع ہو سکتے ہیں کہ جو لوگ اس وقت تھے، انہوں نے اس حکم میں تحریف کی اور جو لوگ بعد میں آئے، انہوں نے تورات میں تحریف کی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا: ﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ [التوبۃ:٦] اگر کوئی مشرک آپ سے امان طلب کرے، پناہ مانگے کہ مجھے امان دے دو تو آپ اس کو پناہ دے دیں، تاکہ وہ سنے کہ اللہ کا حکم کیا ہوتا ہے۔ تو اب یہ ضروری نہیں کہ وہ مشرک اللہ کا کلام، اللہ سے سنے، بلکہ اللہ کا کلام پیغمبر اور ان کے بعد علماء کے واسطہ سے سنے گا۔

اسی لیے قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے اللہ کے کلام کو سننے اور سمجھنے کے بعد بھی اللہ کے کلام کو بدل ڈالا۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تحریف کرنے والے اور حق چھپانے والے ان کے علماء تھے، کیونکہ جاہل کو تو یہ پتہ ہی نہیں کہ تورات میں کیا لکھا ہوا ہے؟ تو وہ تحریف کیسے کر سکتا ہے؟

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ کا معنی ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہم گناہ کر رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی کرتے ہیں۔

حضرت ابن زید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ﴾ کہ کتاب تورات جو سنتے اور پڑھتے ہیں، اسی میں تبدیلی کی کہ جو چیزیں اللہ نے حلال کی تھیں، ان کو حرام کر دیا۔ جو چیزیں اللہ نے حرام کی تھیں، ان کو حلال کر دیا۔ اور جو حق تھا، اس کو باطل اور جو باطل تھا، اس کو حق بنا دیا۔

علماء حق اور علماء سو:

اب اگر ان کے پاس کوئی سائل کوئی ایسا سوال لے آتا جو قابلِ اُلجھن نہ ہو اور وہ رشوت دیتا تو اس کو صحیح مسئلہ بتا دیتے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائیں۔ آج کل ہم بھی بعینہٖ اسی قسم کے اَدوار سے گزر رہے ہیں، ﴿وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝﴾ [سبا:١٣] مگر جو صحیح معنوں میں عالم ہیں، ایسے علماء کو تو اللہ نے ہر دور میں محفوظ رکھا ہے، کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ ہر دور کے اندر علماء تو ہوتے ہیں، لیکن دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک علماء حق ہوتے ہیں اور دوسرے علماء سُو ہوتے ہیں۔ علماء حق وہ ہوتے ہیں جو اللہ کے قرآن اور سنت مصطفیٰ پر ایسے جمے ہوتے ہیں کہ پہاڑ اپنی جگہ

سے ہٹ سکتا ہے، لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے۔ جو حق ہے وہ بتاتے ہیں، چاہے نقصان ہو یا فائدہ ہو۔ اور بعض علماء بظاہر تو علماء والا لباس اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کے پاس علم بھی ہوتا ہے اور بڑے جبے بھی پہنے ہوتے ہیں، لیکن علماء سُو ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنی منفعت حاصل کرو، بڑے لوگوں کے ساتھ مل جاؤ، اقتدار والوں کی خدمت خوشامد کرو اور ایسے ایسے مسئلے بتاؤ جن سے وہ خوش ہو جائیں اور ہمیں کوئی نہ کوئی دنیاوی مفاد حاصل ہو جائے۔

یہ ہر دور میں رہا ہے، کیونکہ جب دن ہے تو رات ہوگی اور جب رات ہوگی تو دن ہوگا۔ جب روشنی ہے تو اندھیرا بھی ہوگا اور اندھیرا ہے تو روشنی بھی ہوگی۔ حق ہے تو مقابلہ پر باطل بھی ہوگا، صدق ہے تو مقابلہ پر کذب بھی ہوگا، اگر جھوٹ نہ ہو تو سچ کی کیا قیمت ہے؟ اگر ساری دنیا ہی سچ بولنے والی ہو تو کون کسی کو سچا کہے گا؟ جھوٹ کے مقابلہ پر ایک آدمی سچ بولنے والا ہو تو پھر سچ کی قیمت بنتی ہے۔

اسی طرح یہ قاعدہ ہے، اللہ کا نظام ہے اور یہ سنت اللہ جو ابتداء سے لے کر آج تک چلی آ رہی ہے، ہر دور میں حق والے علماء بھی رہے ہیں اور علماء سُو بھی رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اللہ کے احکام کو رشوت کے لیے، دولت کے لیے اور اقتدار کے لیے ہمیشہ بدل ڈالا۔

ہر صدی میں ایک مجدد ہوتا ہے:

خدا کی قدرت یہ ہے۔ آپ غور کریں! جیسے حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ نے ایک ایسا نظام بنا دیا ہے کہ ہر صدی گزرنے پر ایک ایسا آدمی پیدا فرما دیتے ہیں جو اس کے دین کا محافظ بنتا ہے۔[1] ہر سو سال کے ختم پر جب ایک صدی پوری ہوگی اور دوسری صدی شروع ہوگی اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی آدمی ضرور پیدا فرما دیتے ہیں جو اللہ کے دین کی تجدید کرتا ہے، یعنی جیسے ایک عمارت کا رنگ روغن خراب ہو جائے تو آپ دوبارہ رنگ روغن کرتے ہیں، دروازے کھڑکیاں وغیرہ ٹھیک کرتے ہیں تو وہ بھی دین میں جتنا ضعف آ جائے اس پر کام کرتے ہیں۔

سب سے پہلا دور خیر القرون کا ہے، اس پر تو بحث نہیں، کیونکہ وہ تو نبی کریم ﷺ کا دور ہے، اس سے اعلیٰ دور تو دنیا میں کوئی ہو نہیں سکتا۔ آپ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور ہے اور ان کے بعد تابعین کا دور ہے، اسی طرح پھر تبع تابعین کا دور ہے۔ علماء نے نشاندہی کی ہے کہ تقریباً سات سو سال تک ان میں جو لوگ اللہ نے پیدا فرمائے، وہ

[1] [سنن أبي داود، حديث: ۴۲۹۱، باب: ما يذكر في قرن المائة]

سارے سرزمین عرب میں پیدا فرمائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے چلیں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور جتنے بڑے بڑے لوگ سات سو سال تک پیدا ہوئے، وہ سارے عرب میں پیدا ہوئے۔

جب یہ سات صدیاں بیت گئیں اور اگلا دور شروع ہوا تو اللہ کی قدرت دیکھیں کہ پھر یہ سارا سلسلہ عرب کی بجائے عجم کے سپرد ہو گیا۔ کیونکہ اللہ کا ایک نظام ہے کہ تم لوگ اگر میرے دین پر نہیں رہو گے تو میں قادر ہوں اور لوگ پیدا کر دوں، ﴿وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ﴾ [محمد:۳۸] اگر تم نے میرے دین سے اعراض کر لیا تو ہم اور قوم لے آئیں گے، ہمیں تمہاری کیا ضرورت ہے؟ اللہ تو غنی ہیں، بے پرواہیں۔ جب عرب کا دین کے ساتھ وہ تعلق نہ رہا جو ہونا چاہیے تھا تو یہ نعمت ان سے چھین لی گئی اور بجائے عرب کے عجم کی طرف چلی گئی۔

اور عجم میں اللہ کی شان یہ ہے کہ یہ ہندوستان کو نصیب ہوئی۔ ہند سے مراد صرف موجودہ ہندوستان نہیں ہے۔ ان میں اللہ نے بڑے بڑے لوگ پیدا کیے: شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ، سید احمد بریلی رحمہ اللہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ وغیرہ پیدا کیے اور پھر یہ سلسلہ چلتا آیا اور چلتا آیا، حضرت محمود الحسن اسیر مالٹا پیدا ہوئے۔ بڑے بڑے لوگ عجم میں پیدا ہوئے۔ اسی کی طرف اقبال نے اپنے ایک شعر میں بھی اشارہ کیا تھا:

شکوہ ترکمانی ذہن ہندی نطق اعرابی

اسی طرح ایک وقت آنے والا ہے کہ جب پوری روئے زمین پر دین محمد مصطفیٰ غالب آجائے گا، جیسے یہ کعبہ سامنے ہے، مجھے یقین ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی گھر روئے زمین پر نہیں بچے گا چاہے مٹی کا بنا ہوا ہو یا بالوں کا بنا ہوا ہو، خیمے کا بنا ہوا ہو، مگر اس میں کلمۂ اسلام داخل ہو کر رہے گا۔[1] یا تو یہ کلمہ اللہ تعالیٰ اس کے اعزاز سے داخل کریں گے یا پھر اللہ ان کو مغلوب کریں گے، لیکن دین اسلام پورے روئے ارض پر قائم ہوگا۔ جیسے ابتداء میں اللہ نے اسلام کو عظمت بخشی تھی اور اللہ کا اپنے پاک نبی سے وعدہ ہے: ﴿لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ﴾ آپ کے دین کو ہم تمام ادیان پر غالب کر دیں گے، اور وہ وعدہ ضرور پورا ہوگا۔

قربِ قیامت کے حالات:

احادیث میں آتا ہے کہ وہ حضرت مہدی علیہ السلام کا زمانہ ہوگا...... اور مہدی سے روافض والا مہدی مراد نہیں ہے

[1] [مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۴۲، کتاب الإیمان و الفصل الثالث]

اور...... اس زمانہ میں خراسان (موجودہ افغانستان اور اس کے ملحقہ علاقے) سے ایک لشکر اس کی اعانت کے لیے آئے گا اور پھر وہ آکر بیت المقدس میں جھنڈا گاڑ دے گا، پوری دنیا کی کوئی طاقت اس کو نہیں روک سکے گی۔

اب یہ کڑیاں ملائیں کہ جب اللہ نے تجدید دین کا کام لیا تو اس کے لیے بھی اس علاقے کو منتخب کرلیا کہ اب وہاں سے لوگ پیدا ہو رہے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ غلبۂ دین کا کام لیں گے تو وہیں سے آدمی اُٹھے گا۔

اور اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے جذبے اور ان کی قربانی کو، کیسے انہوں نے سرخ ریچھ یعنی روس کو شکست دی ہے!؟ یہ سارا اللہ کا نظام ہے، کافر لاکھ اپنا قانون بناتے رہیں، اپنے دماغ کو لڑاتے رہیں، اللہ کا بھی اوپر سے ایک نظام چل رہا ہے۔ اور عین وہ موقع آئے گا جب پوری دنیا میں کفر کو پناہ نہیں ملے گی، پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہوگا۔ اور اسی دور میں خروجِ دجال کا موقع آئے گا اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا، پوری دنیا پر اسلام چھا جائے گا اور اللہ پوری دنیا پر اسلام کو غالب کر دیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ کفر جہاں ہے اسلام سے ڈر رہا ہے۔ وہ پاگل نہیں ہو گئے، وہ پڑھ رہے ہیں، تم تو پڑھتے نہیں ہو۔ تم لوگوں نے قرآن شریف تعویذ لکھنے کے لیے رکھا ہے یا کبھی کسی کا پیسہ چوری ہو جائے یا جھگڑا ہو جائے تو قرآن ہاتھ رکھنے کے لیے رکھا ہوا ہے یا کوئی دلہا دلہن کو رخصت کرنا ہو تو ان کے سر پر سایہ کرنے کے لیے۔ زیادہ سے زیادہ کسی کا بچہ ڈرتا ہو تو کہتے ہیں: جیب میں پنج سورہ رکھ لو۔ حالانکہ جب قرآن اندر ہی داخل نہیں ہوگا تو جیب میں رکھنے کا کیا فائدہ؟ بڑے بڑے کافر ہیں جنہوں نے قرآن کا ترجمہ کیا ہے تو کیا وہ ترجمہ کرنے سے مسلمان ہو گئے؟ کافروں کے بڑے بڑے پریس ہیں، جنہوں نے سب سے اعلیٰ قرآن چھاپا۔ اللہ تعالیٰ خادم الحرمین کو جزائے خیر عطا فرمائے...... ساڑھے چار سو ریال میں ایک قرآن شریف ملتا ہے، لیکن اللہ نے خادم الحرمین کے دماغ میں ایک بات ڈالی کہ کل کو کافر طعنہ نہ دیں کہ یہ خود قرآن کو اتنا اچھا کیوں نہیں چھاپ رہے؟ چنانچہ انہوں نے مدینہ منورہ کے اندر "مجمع فہد" قائم کیا، جس کی مثال پوری دنیا قائم نہیں کر سکتی۔ پوری دنیا میں اتنا بڑا پریس نہیں جو قرآن چھاپتا ہو۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے اور اللہ تعالیٰ زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی توفیق دے۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ باتیں پوچھیں۔ میرے آقا سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مت گھبراؤ، ایک وقت آئے گا جب پوری روئے ارض پر اسلام غالب آئے گا۔ صحابی کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چپ کر گئے تو چپ کرنے کی بھی وجہ تھی کہ جب اسلام کا غلبہ آئے گا، آخر

قیامت بھی آنی ہے کہ ایک ٹھنڈی ہوا چلے گی، جتنے اسلام والے ایمان والے لوگ ہوں گے، وہ مرجائیں گے۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ چپ ہو گئے کہ غلبہ کی خوشی سنائی ہے، اب مسلمان اُداس نہ ہو جائیں۔

یہ ایک نظام ہے جو چلتا آ رہا ہے اور وہ تمام نشانیاں جو میرے آقا ﷺ نے بتائی ہیں، وہ بالکل اپنے وقت پر پوری ہوتی چلی جارہی ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم کس پلڑے میں اپنا وزن ڈالتے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ نے جو کرنا ہے، وہ کرے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کو پوری دنیا کی طاقت نہ روک سکتی ہے، نہ ٹال سکتی ہے اور نہ منع کرسکتی ہے۔ دین حق غالب ہوگا اور ضرور ہوگا۔ میرے اللہ جو فیصلہ فرمادیتے ہیں، اس کو پھر دنیا کی کوئی طاقت نہیں ٹال سکتی۔

یہود و منافقین کا تذکرہ:

﴿وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٧٦﴾﴾ [البقرۃ:۷۶]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان یہودیوں کا یہ عالم ہے کہ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم پکے مسلمان ہیں، ہم بھی ایمان لے آئے ہیں کہ واقعی تمہارے نبی سچے ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ ان کی تمہاری طرف بھیجا گیا ہے۔

منافقوں کا ہمیشہ یہی عالم ہوتا ہے کہ جو ملا، اس سے مل گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ماشاء اللہ! یہ بڑا سوشل اور بڑا وسیع الظرف آدمی ہے، ماشاء اللہ! بڑا وسیع القلب آدمی ہے، کسی مذہب سے اس کا کوئی جھگڑا بھی نہیں ہے۔ جس شخص کی ایسے تعریف کی جائے تو سمجھا کرو کہ وہ ایمان سے فارغ ہے۔ کیونکہ کسی سے جھگڑا نہ ہونا، اگر شرافت کی دلیل ہے تو حضور اکرم ﷺ کے ساتھ لوگ جھگڑا کیوں کرتے تھے؟ پھر تو حضور اکرم ﷺ کی ذات ایسی ہوتی کہ کوئی بھی آپ سے جھگڑا نہ کرتا۔ دیکھ لیں کہ حضور اکرم ﷺ کے دشمن زیادہ تھے یا دوست زیادہ تھے؟

بہر حال جب وہ یہودی علیحدہ ہوتے تو ان کو ان کے بڑے بڑے علماء سمجھاتے کہ تم مسلمانوں کو جاکر بتادیتے ہو کہ ہماری کتاب میں بھی موجود ہے کہ ان کے پیغمبر سچے نبی ہیں۔

﴿وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٧٢﴾﴾ [آل عمران:۷۲]

حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ منافقین یہود کا طریقہ یہ تھا کہ جب حضور



اکرم ﷺ کے اصحاب سے ملتے تو کہتے: ''آمنا''۔ اسی طرح حضرت سدی نے فرمایا کہ یہ یہودیوں میں سے ایک جماعت تھی، پہلے ایمان لے آئے، پھر انہوں نے نفاق اختیار کرلیا۔

اصل بات یہ تھی کہ مدینہ منورہ میں جو یہودی تھے، ایک تو ان کے دلوں میں حضور اکرم ﷺ کا حسد تھا اور دین اسلام اور رسالت محمد مصطفیٰ ﷺ سے بغض تھا۔ اگر ان کو خبر ملتی کہ مسلمان فلاں جگہ غالب ہو گئے ہیں تو مسلمانوں کے ساتھ مل جاتے، پھر خبر ملتی کہ فلاں جگہ سے مسلمانوں کو نقصان ہوا تو فوراً مکہ کے کافروں کو پیغام بھیجنا شروع کر دیتے تھے۔ ﴿مُذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ إِلَىٰ هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلَىٰ هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَن يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا﴾ [النساء: ۱۴۳]

اسی طرح ربیع بن انس اور قتادہ اور بہت سارے سلف وخلف نے یہی قول نقل فرمایا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے پاس وہ لوگ آئیں جو پکے مومن ہیں۔ جو منافق ہیں ان کو ہمارے پاس آنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تو کافروں اور منافقوں کے بڑے بڑے سرداروں نے کہا: اگر ہمارا مدینہ میں آنا جانا اور داخلہ بند ہو گیا تو ہمیں پتہ نہیں چلے گا کہ مسلمان ہمارے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟ ہمارا آنا جانا ہوگا تو اندر کی خبر کا ہمیں پتہ چلتا رہے گا، لہٰذا تم لوگ ایسا کرو کہ مدینہ میں جاؤ، جب تمہیں مسلمان ملیں تو کہو کہ ہم تو ایمان لے آئے اور ہم مسلمان ہیں، اس لئے ہم تمہارے پاس آتے ہیں۔ اور جب تم لوگ ہمارے پاس واپس آجاؤ تو تم اپنے اسی کفر پر جمے رہو۔ چنانچہ وہ لوگ جب مدینہ میں آتے اور آکر یہ اظہار کرتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور عصر کو جب واپس لوٹتے تو کافروں کو جا کر کہتے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو منافقوں کے بارے میں باخبر کردیا، جیسا کہ سورۃ المنافقون اور قرآن مقدس کی ایک اور آیت میں بھی ہے: ﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ ۖ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ﴾ [التوبۃ: ۱۰۱]

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ان منافقوں کے ناموں کے بارے میں بھی باخبر کردیا کہ فلاں منافق ہے، فلاں منافق ہے۔ چونکہ اس مسئلے کا تعلق تبلیغ سے نہیں تھا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے نہیں تھا، بلکہ مقصد یہ تھا کہ حضور پاک ﷺ باخبر ہوجائیں۔ لیکن یہ کمال امانت ودیانت ہے کہ میرے آقا ﷺ نے ان لوگوں کے ناموں کی فہرست حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو بتلا دی، تاکہ اللہ نے جو مجھے بتایا ہے میں کسی کو بتادوں۔ اور حضور اکرم ﷺ نے ان کو شریک راز بنایا۔ ان کو یہ حکم نہیں دیا کہ تم دوسرے لوگوں کو بتاؤ۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کا

نفاق اور ان کے نام حضور اکرم ﷺ کو بتا دیئے تو وہ گھبرا گئے اور ان کا آنا جانا ترک گیا۔

منافقین کے بارے میں:

ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک دن حضور اکرم ﷺ بنو قریظہ میں تشریف لے آئے۔ بنو قریظہ کے قلعہ کے نیچے کھڑے ہو کر آپ ﷺ نے فرمایا: اے خنزیر اور بندروں کے بھائیو! اے طاغوت کے پجاریو! اب یہودی گھبرا گئے کہ حضور اکرم ﷺ کو کس نے بتایا کہ ہماری قوم کے کچھ لوگ بندر بھی بن گئے تھے، خنزیر بھی بن گئے تھے اور یہ ان کو کس نے بتایا کہ ہم نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اندر سے کسی نے جا کر ان کو خبر کر دی ہے۔

اسی سے بعض علماء نے یہ مسئلہ بھی استنباط کیا ہے کہ دعوت کا انداز ہمیشہ محبت سے ہونا چاہیے، جیسے اللہ نے فرعون کے بارے میں فرمایا کہ جا کر اس سے نرمی سے بات کرو، سخت بات نہ کرو۔ لیکن کبھی کبھی اگر داعی ایسے حالات دیکھے کہ قوم اتنی مردہ دل ہو گئی ہے کہ ان پر کوئی بات اثر بھی نہیں کرتی تو اس کو سخت الفاظ میں بھی بیان کرنے کی اجازت ہے، کیونکہ طبائع مختلف ہیں، بعض طبیعتیں اللہ نے ایسی پیدا فرما دی ہیں کہ ان پر نرم بات کا اثر نہیں ہوتا، بلکہ ان پر سخت بات اثر کرتی ہے۔

ے
پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مگر مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اور دوسری جگہ اقبال نے کہا:

ع
زہر بھی کرتا ہے کبھی کار تریاقی

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہودیوں کے پاس بھیجا تو یہودیوں نے کچھ ایسی باتیں کیں جو میرے آقا ﷺ کی شان کے خلاف تھیں۔

حضور اکرم ﷺ کی صورت عیسائیوں کے پاس:

حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم ﷺ کو ایک واقعہ سنایا کہ ہم ایک گرجا میں گئے جو ایک بادشاہ نے بنوایا تھا۔ اس گرجا کے پادری نے ہم سے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو؟ ہم نے کہا: ہم مکہ کے رہنے والے ہیں۔ پادری نے

کہا: اگر تم مکہ مکرمہ کے رہنے والے ہو تو مکہ مکرمہ میں ایک عظیم ہستی پیدا ہوں گی، جن کا نام محمد بن عبداللہ ہوگا۔ اگر میں ان کی تصویریں تمہیں دکھلاؤں تو کیا پہچان لو گے؟ ہم نے کہا: پہچان لیں گے۔

اس پادری نے آکر ایک الماری کھولی، اس میں تصویریں تھیں، وہ ہمیں دکھائیں۔ ہم نے کہا: ان میں تو نہیں ہیں۔ اس نے ایک اور الماری کھولی، اس کے اندر سب تصویریں ترتیب سے لگی ہوئی تھیں۔ ہمیں کہا: ان میں دیکھو، کوئی ہے؟ ہم نے کہا: نہیں ہے۔ پھر اس نے جاکر آخری الماری کھولی، اس میں جاکر ہم نے دیکھا تو اس میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ہم نے کہا: یہی ہیں۔ اس پادری نے کہا: اس کا مطلب ہے کہ اللہ کے سچے اور آخری نبی پیدا ہو گئے ہیں۔

اس دور میں مصور نے تورات و انجیل کی معلومات اور اپنے تخیلات کی بنا پر یہ تصویریں بنائی ہوئی تھیں۔ اس طرح اہل کتاب کے پاس حضور اکرم ﷺ کے بارے میں معلومات تھیں، لیکن وہ خواہ مخواہ لوگوں پر چھپاتے تھے، تاکہ وہ ایمان نہ لے آئیں، حالانکہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ سب جانتے ہیں۔

﴿وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ۚ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ ۝﴾ [البقرۃ: ۷۸، ۷۹]

اور بعض اُن میں اَن پڑھ ہیں جو کتاب کی خبر نہیں رکھتے، سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور اُن کے پاس خیالات کے سوا کچھ نہیں۔ پس اُن لوگوں کے لیے خرابی ہے جو اپنے ہاتھ سے کتاب کو لکھتے ہیں، پھر کہہ دیتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے، تاکہ اس پر تھوڑا سا مول لے لیں۔ پس اُن کے لیے خرابی ہے جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور اُن کے لیے اُن کی اپنی اس کمائی سے ہلاکت ہے۔

آیات کا باہمی ربط:

ان آیاتِ مبارکہ میں یہودیوں کے دوسرے گروہ کا ذکر ہے۔ پہلا گروہ وہ جو پڑھے لکھے لوگ تھے، جو اللہ کی کتاب اور احکام کو بدل ڈالتے تھے اور اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایسے بھی تھے جو اُمّی تھے۔ ''اُمِّیُّوْن''، ''اُمّی'' کی جمع ہے، اس کا معنی قرآن نے آگے خود بیان فرمایا، کہا: ﴿لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ﴾ جو پڑھے لکھے نہیں تھے

اور کتاب نہیں جانتے تھے، اُمّی، ان پڑھ کو کہتے ہیں۔ اُمّی کی نسبت ماں کی طرف کی جاتی ہے، جیسے آدمی ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے اور ابھی اس کو پڑھنا لکھنا نہیں سکھایا گیا تو وہ اُمّی یعنی ان پڑھ ہے۔

محمد ﷺ کو اُمّی کہنے کی وجہ:

کسی کو اُمّی کہنا، یہ صفت تعریف نہیں ہے، لیکن اللہ کی شان ہے کہ وہ لفظ جو ساری دنیا کے لئے باعث تنقیص تھا، وہی لفظ جب حضور اکرم ﷺ سے لگا تو باعثِ شرف بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ﴾ [الاعراف: ۱۵۷] اور میرا وہ نبی اُمّی یعنی محمد مصطفیٰ ﷺ۔ لیکن جب حضور اکرم ﷺ کے ساتھ لگا تو معنی یہ ہوا کہ ایسی جگہ پیدا ہوئے جہاں کوئی مدرسہ نہیں، علماء نہیں، کتابیں نہیں تھیں، لیکن شان یہ ہے کہ سارے عالم کو پڑھا دیا۔ اس لئے بھی حضور اکرم ﷺ کو اُمّی کہا گیا ہے کہ آپ جس اُمت میں پیدا ہوئے، جس قبیلہ میں پیدا ہوئے، وہ لوگ بھی اُمّی تھے، ان کے پاس کوئی علم نہیں تھا اور اس وجہ سے بھی حضور اکرم ﷺ کو اُمّی کہا گیا کہ آپ کی پیدائش مکہ میں ہوئی اور مکہ کا نام اُمّ القریٰ یعنی تمام بستیوں کی ماں ہے۔

یہودیوں کی قسمیں:

وہ جاہل لوگ جو کتاب تورات کو نہیں جانتے، مگر وہ انہی اُمیدوں اور گمانوں میں پڑے ہوئے ہیں جو ان کے احبار نے ان کے دماغوں میں ڈالی ہوئی ہیں، جن کا ذکر اگلی آیات میں آرہا ہے۔ غور کریں کہ یہودیوں کی دو پارٹیاں ہوگئیں: ایک ان کے عالم جنہوں نے تورات کو بدل ڈالا اور دوسرے جاہل لوگ جن کو راہبوں نے اُمیدوں میں ڈال دیا تھا۔ اب کہیں حضور اکرم ﷺ کی اُمت تو اس حال میں مبتلا نہیں ہے؟ آج ہمارا تو یہی عالم نہیں ہے کہ کوئی اللہ کے قرآن کو بدل رہا ہے اور کوئی حدیث کا انکار کر رہا ہے، کوئی عائلی قانون بنا کر کہتا ہے کہ یہ اسلام کا قانون ہے اور قرآن کا قانون ہے۔ اور جو جاہل ہیں ان کو اس گمان میں ڈالا ہوا ہے کہ جب کلمہ پڑھ لیا تو بات ختم ہوگئی، تمہارے جیسا پکا مسلمان کوئی نہیں ہے۔ ﴿وَمِنۡهُمۡ اُمِّیُّوۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ الۡکِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا یَظُنُّوۡنَ۝﴾ [البقرۃ: ۷۸]

حضور اکرم ﷺ کی امت بھی اُمّی ہے:

''اُمِّیُّوۡن''، ''اُمّی'' کی جمع ہے، اس کا معنی ہے: ایسا آدمی جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ حضور اکرم ﷺ کی صفات

میں بھی یہ آیا ہے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ [العنکبوت: ۴۸] میرے نبی! قرآن پاک اُترنے سے پہلے آپ کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ ہی آپ اپنے ہاتھ مبارک سے لکھنا جانتے تھے۔ اگر آپ پڑھنے والے یا لکھنے والے ہوتے تو "مُبْطِلُوْن" یعنی کفار کو شک کرنے کا زیادہ موقع حاصل ہوتا کہ حضور پاک ﷺ تو پڑھے لکھے ہیں، قرآن خود بنا کر کہہ دیتے ہیں کہ اللہ نے اُتارا ہے۔ لیکن جب ایک شخص نے پڑھا ہی نہ ہو، کسی مدرسہ میں بھی نہ بیٹھا ہو، کسی استاد کے پاس زانوئے تلمذ بھی تہہ نہ کیے ہوں، کبھی اس نے کسی کے سامنے کوئی قراءت، کوئی لکھنے اور پڑھنے کا کام کیا ہی نہ ہو تو پھر جب وہ اللہ کا قرآن پڑھے تو صاف بات ہے کہ یہ اللہ کی وحی ہے۔

اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی جب بعثت ہوئی ہے تو آپ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے، لیکن اس کے بعد جیسے اللہ تعالیٰ نے حضور پاک ﷺ کو قرآن کا علم عطا فرمادیا کہ اللہ نے بطور خاص اپنی رحمت کے ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ جب قرآن پڑھا جائے تو آپ چپ کر کے سنتے رہیں، اپنی زبان مبارک کو نہ ہلائیں، ہم قرآن آپ کے سینے میں بٹھادیں گے۔

چنانچہ اللہ نے پورا قرآن حضور پاک ﷺ کے سینہ مبارک میں جمع کردیا اور فرمادیا: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى﴾ [الاعلیٰ: ۶] کہ ہم آپ کو ایسا قرآن پڑھادیں گے کہ پھر آپ بھولیں گے بھی نہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض آیات اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سینہ مبارک سے خود اُٹھالیں، لیکن اس کے علاوہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے پڑھایا، آپ ﷺ نہیں بھولیں گے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ نے اتنا علم عطا فرمایا ہے جو مجھ سے پہلے گزرے ہیں یا میرے بعد آئیں گے، ان کا علم اللہ نے مجھے عطا فرمایا ہے۔ [روح البیان: ۳/۳۸۶]

اور جب اللہ نے اتنا بڑا علم عطا فرمایا تو اس کے بعد لکھنے کا علم عطا فرمایا گیا یا نہیں؟ اس کے اندر مفسرین کے دو قول ہیں:

❁...... پہلا قول یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی شان بھی یہی ہے کہ آپ کسی سے پڑھیں بھی نہیں، کسی مدرسہ میں بھی نہ جائیں اور ساری دنیا کو پڑھادیں۔ کیونکہ پڑھا ہوا آدمی پڑھادے تو کوئی بہادری کی بات نہیں، لیکن کمال اُن لوگوں کا ہوتا ہے جنہوں نے علم نہ پڑھا ہو اور وہ علم کے مشکل مسئلے حل کرڈالیں۔ آسمان وزمین کے تمام مباحث،

مسائل اور قیامت تک آنے والے تمام حالات پر ایسی روشنی ڈالیں جو اول درجے پر صحیح ثابت ہوتی آرہی ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے ایسے ایسے علوم کا ذکر فرمایا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بات موجود ہے کہ ایک دن انہوں نے حضور پاک ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کبھی کبھی عربی میں ایسے لفظ بولتے ہیں جو ہمیں سمجھ نہیں آتے، حالانکہ ہم عرب ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے خوش ہو کر فرمایا: اے ابوبکر! ایسے کیوں نہ ہو، میں بنو ہاشم کے خاندان میں پیدا ہوا ہوں، میری ولادت مکہ میں ہوئی اور میری تربیت بنو سعد کے قبیلہ میں ہوئی، اگر مجھ سے فصاحت و بلاغت کا اظہار نہیں ہوگا تو کس سے ہوگا؟

ان کی دلیل یہی دو آیات اور حضور اکرم ﷺ کا اپنا فرمان بھی ہے: ''إِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ، لَا نَكْتُبُ وَ لَا نَحْسُبُ، الشَّهْرُ هٰكَذَا وَ هٰكَذَا'' (ہم اُمت اُمیہ ہیں کہ لکھنا پڑھنا زیادہ حساب کتاب نہیں جانتے۔ مہینہ کبھی دس، دس، دس یعنی تیس کا ہوتا ہے اور کبھی اُنتیس کا ہوتا ہے)۔

[صحيح البخاري، حديث: ۱۹۱۳، باب: قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ]

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے دین کا نظام آسان رکھ دیا ہے کہ شریعت کے جتنے احکام ہیں، ان کا تعلق قمری مہینوں سے ہے، شمسی سے نہیں۔ نظامِ قمر کا دور تقریباً اٹھائیس دن میں مکمل ہوتا ہے، نظامِ شمسی کا دورہ تقریباً تین سو ساٹھ دنوں کے اندر جا کر مکمل ہوتا ہے۔ نظامِ شمسی کو سمجھنے کے لیے بڑی بڑی رصد گاہوں کی ضرورت ہے، لیکن چاند کا نظام سادہ ہے۔ بڑی آسانی نظامِ قمری کے اندر یہ ہے جس پر بڑا شور ہوتا ہے کہ لوگ چاند پر پہنچ گئے اور یہ مولوی ابھی تک یہیں کھڑے ہیں۔ آج مشینوں سے حساب کر کے بتایا جا سکتا ہے کہ چاند اس وقت کہاں ہے؟ اور چاند کس تاریخ کو فلاں علاقہ میں نظر آ سکتا ہے یا ابھی نظر نہیں آ سکتا۔ تو لوگ خواہ مخواہ عید پر تماشا بناتے ہیں کہ کوئی کہتا ہے کہ آج عید ہوگی اور کوئی کہتا ہے: کل عید ہوگی۔ مولوی ہر مسلمان کو لڑوا رہے ہیں، اگر یہ اتفاق کر لیں تو سارے مسلمانوں کی عید ایک دن ہو جائے گی۔

مسئلہ سمجھیں! اسلام چاند کے تابع نہیں ہے، جیسے کعبہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میرے گھر کا طواف کرو۔ اگر یہ کعبہ نہ ہو تو کیا طواف ختم ہو جائے گا؟ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں یہ ڈوب گیا تھا، سیدنا ابراہیم علیہ السلام جب یہاں تشریف لائے تو یہاں کوئی کمرہ نہیں تھا، کوئی کعبہ شریف نہیں تھا، بس ایک ٹیلہ پڑا تھا تو کیا طواف ختم ہو گیا تھا؟ کیا ہم اس پتھر اور اس چار دیواری کے پجاری ہیں؟ اس لیے اس کے گرد پھرتے ہیں؟ نہیں، بلکہ

ہم نے اللہ کے حکم کی تعمیل کرنی ہے، ان پتھروں کی عبادت نہیں کرنی۔ اسلام تو اس حکم کی تعمیل کا نام ہے کہ اللہ نے اس کا طواف کرنے کا حکم دیا ہے، چاہے اس کی عمارت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بنائی تھی یا مکہ کے کافروں نے بنائی تھی، ہم نے طواف کرنا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی تعلیم:

اب اگر کسی کو کہہ دو کہ حضور اکرم ﷺ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے تو وہ کہے کہ یہ گستاخ ہے تو لڑائی شروع ہوگئی۔ یہ کوئی نہیں پوچھے گا کہ مولوی کی کیا جرأت ہے؟ حضور اکرم ﷺ کے غلاموں کے غلام کی بڑی شان ہے۔ مولوی تو حضور اکرم ﷺ کے دروازے کی مٹی کی تہہ کے برابر بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ تو اللہ نے فرمایا: ﴿النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ﴾ اور پھر اس کی تفصیل بیان فرما دی: ﴿وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَٰبٍ وَلَا تَخُطُّهُۥ بِيَمِينِكَ ۖ إِذًا لَّٱرْتَابَ ٱلْمُبْطِلُونَ﴾ [العنکبوت:۴۸] میرے نبی! آپ کتاب پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے اور قلم سے دائیں ہاتھ سے لکھنا بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ اللہ پاک فرما رہے ہیں، مولوی نہیں کہہ رہا۔

اصل بات سمجھنے والی یہ ہے کہ ایک آدمی پڑھا لکھا نہ ہو اور ساری دنیا کو پڑھا دے، یہ شان زیادہ ہے یا جو پڑھا لکھا ہو وہ پڑھا دے، اس کی شان زیادہ ہے؟ کمال یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کو کسی کا شاگرد نہیں بننے دیا، کیونکہ استاد کا درجہ زیادہ ہوتا ہے اور میرے نبی سے کسی کا درجہ زیادہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے احناف اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ امام بھی ہیں، حجہ بھی ہیں، حافظ الحدیث بھی ہیں، لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے پاس تو کچھ احادیث ثلاثیات ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی احادیث ہی ثلاثیات اور ثنائی ہیں۔

اسی طرح اگر حضور اکرم ﷺ کسی کے شاگرد ہوتے تو دنیا کہتی: خاتم الانبیاء کی بڑی شان ہے، لیکن فلاں کا شاگرد تو ہے۔ اللہ نے فرمایا: میں اپنے نبی کو کسی سے پڑھنے نہیں دیتا، خود پڑھا دوں گا۔ میں نے اپنے مدنی کا نظام ہی ایسا بنایا کہ ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے کہ باپ فوت ہوگئے، تاکہ باپ یہ نہ کہے کہ میں نے پالا تھا۔ ابھی بچپن تھا کہ ماں بھی فوت ہوگئیں، وہ بھی احسان نہ جتلائیں کہ میری گود میں پلے ہو۔ اللہ نے فرمایا: ہم ان کو پالیں گے اور ہم ہی ان کی حفاظت فرمائیں گے اور ان کو ہم پڑھائیں گے۔ پڑھانے والا نوری فرشتہ ہو، اللہ کے حکم سے آئے

اور پڑھائے، لیکن میرے مدنی کا خادم ہو۔ وہ بھی نہ کہہ سکے کہ میں نے پڑھایا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور اکرم ﷺ کے پاس بغیر اجازت کے داخل بھی نہیں ہو سکتے، جب تک آپ ﷺ اجازت نہ دیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے بارے میں کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے اس کو پڑھایا تھا۔

یہودیوں کے اُمّی:

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہودیوں کی ایک ایسی جماعت تھی جو کتاب کو نہیں مانتے تھے، اپنے گمان اور خیال کے مطابق کلام کرتے تھے، اس کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ پر اُمیدیں اور تمنائیں لگاتے تھے، ان کی وہ اُمیدیں سچی نہیں تھیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۷، البقرۃ: الآیۃ: ۷۸]

یہاں ایک شبہ ہوتا ہے کہ شروع آیت میں آیا: ﴿وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ﴾ [البقرۃ: ۷۸] اور بعد میں آیا: ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِندِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ [البقرۃ: ۷۹] اس سے پہلے ان لوگوں کا ذکر گزر چکا ہے جن لوگوں نے کلام اللہ میں تحریف کی، یعنی ان کے رہبان اور پادری۔ اس کے بعد اُمّیین کا ذکر آیا اور ان کی مذمت آئی کہ یہ "اُمّیین" ہیں، جاہل ہیں، اس کے پاس جھوٹی تمناؤں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لیکن ان لوگوں کی ہلاکت و بربادی دیکھو جو لکھنا بھی جانتے ہیں، پڑھنا بھی جانتے ہیں، مسئلہ خود لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کا کلام اور حکم نہیں ہوتا۔ یہ اس لیے کرتے ہیں: ﴿لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ تاکہ دنیا کے اندر تھوڑا سا سامان و دولت حاصل کر سکیں۔

﴿ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ "ثمن" قیمت کو کہتے ہیں، اور "قلیل" بمعنی تھوڑی۔ یہاں یہ مربوط نہیں کہ تھوڑے پیسے لیتے تھے اور تورات بدل ڈالتے تھے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اللہ کا حکم بدلنے کے مقابلہ میں چاہے پوری دنیا کی دولت بھی مل جائے، تھوڑی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ دنیا میں رہنا، کھانا، پینا معمولی نفع ہے۔ اصل نفع وہ ہے جو لوگ حیاتِ اُخروی میں اُٹھائیں گے، دنیا تو عارضی اور فانی چیز ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ دنیا حاصل کرنے کے لیے اور دنیا میں مرتبہ، عہدہ بچانے کے لیے اللہ کے کلام کو بدل ڈالتے ہیں، ان کے لیے ہلاکت و بربادی ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے جن اُمیین کی صفت بیان کی ہے، ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو کتاب (تورات) کو سمجھنے والے نہیں تھے اور اس کے باوجود جھوٹ گھڑتے تھے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا قول ہے: "مَا تَغَنَّيْتُ وَ لَا تَمَنَّيْتُ...مُنْذُ أَسْلَمْتُ" (میں نے زندگی میں کبھی بھی گانا نہیں گایا اور کبھی بھی جھوٹ نہیں گھڑا)۔ لیکن آج کل تو گانا گانا فخر سمجھا جاتا ہے اور گانے والوں کا اتنا بڑا اعزاز ہوتا ہے کہ کسی عالم کا اتنا بڑا اعزاز نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے: ﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴾ [النور:٢٦] یعنی اچھا اچھوں کی طرف اور گندا شیطان کی طرف ضرور مائل ہوتا ہے۔ بہر حال اس حدیث سے ہمیں معلوم ہوا کہ جھوٹ بولنا، جھوٹا گھڑنا شریعت کے اندر حرام ہے۔ [تفسیر ابن کثیر:١ /١١٧، البقرۃ: الآیۃ:٧٨]

﴿اَمَانِيَّ﴾ کا معنی "پڑھنا" بھی آتا ہے:

بعض مفسرین نے فرمایا: ﴿اِلَّآ اَمَانِيَّ﴾ میں دو قراءتیں ہیں، ایک تخفیف کے ساتھ اور ایک تشدید کے ساتھ ہے۔

بعض نے فرمایا: ﴿اَمَانِيَّ﴾ کا معنی ہے: تلاوت کرنا، جیسے قرآن میں آتا ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ﴾ [الحج:٥٢] جب اللہ کا نبی پڑھتا ہے تو اس کی تلاوت میں شیطان روڑے اٹکاتا ہے۔ ﴿اَمَانِيَّ﴾ کا معنی تلاوت کریں گے تو استثناء منقطع ہوگا اور "لٰکِنْ" کے معنی لے گا۔ مطلب یہ ہوگا کہ وہ کتاب کو نہیں جانتے، لیکن تلاوت کرتے ہیں، جیسا کہ کعب بن مالک شاعر نے اور بعض تفسیروں میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا نام آیا ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ شعر کہا:

تَمَنّٰى كِتَابَ اللهِ أَوَّلَ لَيْلَةٍ
وَ آخِرَهٗ لَاقٰى حِمَامَ الْمَقَادِرِ

"اوّل رات میں تو اللہ کا قرآن پڑھتے رہے اور جب رات کا آخری حصہ آیا تو شہید کر دیئے گئے۔"

[تفسیر ابن کثیر:١/١١٧، البقرۃ:الآیۃ:٧٨]

بعض سوشل لوگ:

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ رحمٰن بھی راضی اور شیطان بھی راضی ہو کہ کوئی بھنگی مل جائے تو اس کے ساتھ بھی

[١] المعجم الکبیر، حدیث:٥٠٦١، سنن ابن ماجہ، حدیث:٣١١، باب کراھۃ مس الذکر بالیمین

چلے جاتے ہیں، کوئی تعزیہ والا ہو تو اس کے ساتھ بھی چلے جاتے ہیں، کوئی دلدل والا مل جائے، اس کے ساتھ بھی چلے جاتے ہیں اور کبھی ہندو، مندر میں بلائے تو وہاں چلے جاتے ہیں اور پرشاد کھا لیتے ہیں۔ اسی طرح کبھی کوئی نماز والا مل جائے تو نماز بھی پڑھ لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم تو بڑے سوشل لوگ ہیں، ہم کسی لڑتے جھگڑتے نہیں ہیں، ہم نے سب کو راضی رکھا ہوا ہے، نماز بھی پڑھ لیتے ہیں، شراب بھی پی لیتے ہیں، جھوٹ بھی بول لیتے ہیں۔

ایک افسر اتنا پکا نمازی تھا، مجال ہے کہ پانچ وقت نماز میں سے کوئی نماز چھوٹنے اور قرآن شریف کی تلاوت کا اتنا بڑا پابند تھا کہ صبح کی نماز کے بعد چاہے کچھ ہو جائے، وہ تلاوت ضرور کرتا تھا اور دوسری طرف رشوت لینے کا اتنا عادی تھا کہ لوگوں کو کہتا: صبح مسجد میں منزل پڑھ رہا ہوں گا وہیں آ کر پیسے دے دینا، لفافے کے اندر رقم رکھ کر لے آنا۔ کوئی کہتا: یہاں نیچے رکھ دو۔ یہی وہ آدمی ہیں جن کے بارے میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ''رُبَّ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَ الْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ''

[روح المعاني، سورة: فاطر، آية: ۲۹، تفسير ابن باديس، ص: ۳۸]

اور میرے آقا ﷺ کی حدیث مبارک کا مفہوم ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے سر پر مٹی بھی ہوتی ہے، سر پر عمامہ نہیں ہوتا اور پاؤں پر غبار ہوتا ہے کہ پاؤں میں پہننے کے لیے جوتا بھی نہیں ہوتا، پھٹے پرانے کپڑوں میں ہوتے ہیں، کسی سے رشتہ مانگیں تو ان کو کوئی رشتہ نہ دے، کسی کو سفارش کریں تو ان کی سفارش نہ مانی جائے، کسی سے بات کریں تو کوئی ان کی بات نہ سنے، لیکن اللہ کے ہاں ان کا اتنا بڑا مرتبہ ہوتا ہے کہ اگر وہ قسم کھالیں تو اللہ اس کو پورا کر دیتا ہے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۶۴۴۷، بابُ: فضلِ الفقرِ، صحیح مسلم، حدیث: ۲۶۲۲]

فقیر کی دعا سے بارش کا برسنا:

حضرت حکیم الاسلام قاری طیب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ بارش نہ آئے، نمازِ استسقاء پڑھی اور دعائیں مانگیں، لیکن بارش نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت میری عمر چھوٹی سی تھی۔ مجھے اپنے استاد نے بلا کر فرمایا کہ فلاں گلی میں ایک فقیر بیٹھا ہے، اس کو جا کر کہو کہ اللہ سے دعا مانگے اور بارش آئے، ہم تو بارش کے بغیر مر گئے۔ آپ نے فرمایا: حضرت! میں تو بچہ ہوں۔ استاد نے کہا: کیونکہ تم جاتے رہتے ہو، کبھی اس کو لسی پلاتے ہو، کبھی پانی پلاتے ہو اور کبھی اس کو کچھ دے دیتے ہو، وہ تمہارے ساتھ مانوس ہے، تم جا کر اس کو کہو۔ فرماتے ہیں کہ میں اس کے پاس گیا اور کہا: حضرت! اللہ سے دعا کرو، پانی نہیں ہے، لوگ پریشان ہیں۔ کہنے لگے: اچھا! تم میرے پاس کیوں آ گئے؟ میں نے

کہا: نیکی کا کام ہے۔ کہنے لگے: اللہ میاں کو کہتے تو ہیں، لیکن آج کل ہم سے ناراض ہیں، پتہ نہیں شاید ہماری بات مان لیں۔ تم مولویوں نے زور لگایا ہے؟ میں نے کہا: حضرت! مولویوں کے بس میں کیا ہے؟ اگر ان کے بس میں کچھ ہوتا تو ساری دنیا ٹھیک ہو جاتی، مولوی بھی بندے ہوتے ہیں، کبھی اللہ نے دعا منظور کر لی اور کبھی نہیں کی۔ ان بزرگوں نے کہا: چلو ہم اپنے اللہ سے مانگتے ہیں۔ قاری صاحب نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ میں ابھی مدرسہ نہیں پہنچا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔

ایسے بھی لوگ تھے!! کیونکہ اندر حلال ہے اور زبان پر کبھی جھوٹ نہیں آیا۔ جب ہاتھ اُٹھاتے ہیں تو اللہ خالی نہیں لوٹاتا۔

حلال رزق دعا کی قبولیت کا سبب ہے:

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب تمہارے لباس حرام کے ہوں گے، تمہارے کھانے حرام کے ہوں گے، تمہیں غذا حرام سے ملے گی اور چیخ چیخ کر کہو گے: ''یَارَبِّ، یَارَبِّ، یَارَبِّ!'' پھر کہاں سے تمہاری دعائیں قبول ہوں گی؟

[صحیح مسلم، حدیث: ۱۰۱۵، باب: قُبُوْلِ الصَّدَقَۃِ مِنَ الْکَسْبِ الطَّیِّبِ]

جب اندر حرام چلا جائے تو دعا قبول نہیں ہوتی۔ آج ہمارے اندر حرام کسی نہ کسی شکل میں داخل ہو چکا ہے۔

﴿وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿١٣﴾﴾ [سبا: ۱۳] مگر وہ لوگ جن کو اللہ نے اپنی رحمت سے بچایا ہوا ہے۔

آج ہم مولوی بھی روتے ہیں، پیر بھی روتے ہیں، سفید داڑھیوں والے بھی روتے ہیں، حالانکہ حدیث میں ہے کہ دعا کے لیے بندہ جب ہاتھ اُٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میری رحمت کو حیاء آتی ہے کہ میں اس کے ہاتھوں کو کیسے خالی لوٹا دوں۔[1] لیکن آج اتنے سفید داڑھیوں والے رو رہے ہیں کچھ نہیں ہو رہا، ہر جگہ مسلمان قتل ہو رہے ہیں، عصمتیں، عزتیں لٹ رہی ہیں، مسلمانوں کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں سے ہندو اجتماعی زیادتی کر رہے ہیں اور مسلمان بیٹیوں کے پستان کاٹ کر اوپر لکھا جاتا ہے: ''اسلام زندہ باد'' اور ہم بے غیرت زندہ ہیں، گھروں میں کھا پی رہے ہیں، ہمارے اندر تھوڑا سا فرق بھی نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت اس لیے نہیں آ رہی کہ ہمارے بدن حرام سے پلے ہیں، ہمارے اندر حرام ہے۔ کسی کے اندر رشوت کا پیسہ ہے، کسی کے پیٹ میں یتیم کا پیسہ ہے، کسی کے پیٹ میں دھوکہ کا پیسہ ہے، کسی کے پیٹ میں جوئے کا پیسہ ہے اور کسی کے پیٹ میں ربوا کا پیسہ ہے

[1] [سنن أبی داود، حدیث: ۱۴۸۸، باب: الدُّعَاءِ]

اور مُلاّ، مولوی کے پیٹ میں زکوٰۃ، صدقات اور چندے کا پیسہ ہے۔

مکی صاحب کے والد کی احتیاط:

میرے والد کی خدمت میں ایک آدمی نے اس زمانہ میں دس ہزار ریال آکر پیش کئے۔ میں اس وقت چھوٹا تھا اور ان کے پاس بیٹھا تھا۔ والد صاحب نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: زکوٰۃ کے پیسے ہیں۔ آپ نے فرمایا: الحمدللہ! میں زمیندار آدمی ہوں، میں زکوٰۃ نہیں لیتا، میرے لئے حرام ہے۔ اس نے کہا: میں اس لئے دے رہا ہوں کہ جن کو آپ جانتے ہیں، مستحق ہیں ان کو دے دیں، ہم تو باہر کے مسافر ہیں، ہم تو نہیں جانتے۔ والد صاحب بلوچ آدمی تھے، جلال کے اندر آکر ایسے ہاتھ مارا تو پیسے دور جا پڑے۔ اب وہ ان کو چن رہا ہے۔ والد صاحب نے فرمایا: سارے حرم میں نوکر میں نظر آیا تھا، زکوٰۃ تیری ہوگی اور چلانے والا میں تجھے ملا ہوں؟ زکوٰۃ تمہارے ذمہ ہے، تم جاکر ڈھونڈو کہ کون مستحق ہے اور کون مستحق نہیں ہے؟ اگر کچھ ریال میری جیب کے اندر رہ گئے اور وہ میں نے اپنے بچوں کو کھلا دیئے تو قیامت کے دن کون ذمہ دار ہوگا؟

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی احتیاط:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس جنگ فتح ہونے کے بعد مشک (کستوری) آیا، آپ نے مجاہدین میں اس کو تقسیم کرنا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ماتھا پکڑ کر گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بیوی نے پوچھا: امیر المومنین! کیا بات ہے؟ کیوں پریشان بیٹھے ہیں؟ انہوں نے کہا: آج میں ایک بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ ایک ملک فتح ہوا، وہاں سے کچھ مشک آیا ہے اور اس کو تقسیم کرنا ہے۔ اب اس کا وزن کرنا، تولنا ہے، اس کے رتی ماشے بنانے ہیں، تاکہ ایک ایک رتی کا فرق نہ پڑے اور ہم نے کبھی مشک تولا ہی نہیں ہے، ہم تو سیدھی سیدھی زندگی گزارنے والے لوگ ہیں، اگر وزن غلط ہوگیا تو قیامت میں پکڑا جاؤں گا۔ بیوی نے عرض کیا: میں بھی سردار کے گھرانے کی بیٹی ہوں، ہم نے زندگی میں بڑا مشک دیکھا ہے، رکھا بھی ہے، مجھے بڑا تجربہ ہے۔ آپ مجھے بتائیں کہ کل اس کا کتنا وزن ہے؟ اور کتنے فوجیوں پر اس کو تقسیم کرنا ہے؟ اتنے بنا کر آپ کو دے دیتی ہوں، آپ تقسیم کردیں۔ آپ نے فرمایا: تم وزن ٹھیک کرو گی، حصے بھی ٹھیک بناؤ گی، لیکن جو تیرے ہاتھ کو لگ جائے، قیامت میں عمر اس کا جواب کیسے دے گا؟ آپ نے اُٹھایا اور اس کو بیت المال میں لے گئے اور خزانچی کو کہا کہ اس کو خود تقسیم کرو، میں اس سے بَری

ہوں، مجھے تقسیم کرنا نہیں آتا۔

ایک استاد کی سوکھی روٹی کھانے کا واقعہ:

ہم نے اپنے استادوں کو دیکھا ہے۔ایک میرے استاد تھے، ان کی عمر نوے سال تھی، صبح کی نماز کے بعد میں گیا کہ استاد کو سلام کرلوں۔ جس کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے وہاں آیا تو دیکھا کہ ایک چائے کا گلاس اور سوکھی روٹی کھا رہے ہیں۔ میں نے دور سے دیکھا اور واپس جا کر اپنے ساتھیوں سے لڑ پڑا کہ عجیب لوگ ہو! ہمارے دس دس کھانے بن رہے ہیں اور حضرت شیخ کے لیے آپ نے ناشتہ بھی نہیں بھیجا۔ انہوں نے کہا: ناراض نہ ہوں، ہم تو سب سے پہلے حضرت کے پاس ناشتہ لے کر گئے، انہوں نے انکار کر دیا اور کہا: ایک گلاس میں چائے ڈال کر لے آؤ۔ میں نے حضرت کی خدمت میں آ کر عرض کیا: حضرت! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کہنے لگے: بات یہ ہے کہ جب پرسوں ہم لاہور سے آ رہے تھے، سمہ سٹہ جنکشن پر ایک روٹی خریدی تھی اور تھوڑے سے آلو بنے ہوئے لیے تھے، آدھی راستے میں ٹرین میں کھالی، آدھی جو بچ گئی اس کو لپیٹ کر تھیلے میں ڈال لیا، کیونکہ آدھی روٹی جب بچی ہوئی موجود ہے تو ناشتہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے کہا: حضرت! آپ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ فرمانے لگے: بھائی! یہ عارضی تکلیف ہے، دعا کرو اللہ قبر، حشر میں تکلیف نہ دے۔ میرے آقا نے تو پیٹ پر پتھر باندھے، انہیں بعض اوقات اتنا بھی کھانے کو نہیں ملا۔

''اُمّی'' کی کچھ اور تفسیریں:

﴿وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ﴾ [البقرۃ:۷۸] ایک قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب کی تفصیلات اور حقائق کو نہیں جانتے، لیکن وہ آپ کی نبوت کے بارے میں گمان رکھتے ہیں۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ﴾ ''يَكْذِبُونَ'' کا معنی ہے کہ جھوٹ بولتے ہیں۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ پر اپنی طرف سے خیال باندھتے ہیں، ان کے خیالات بھی سچے نہیں ہوتے، یعنی اپنی طرف سے خیالات کرتے ہیں کہ اس طرح ہوگا اور یوں ہوگا۔ علماء نے لکھا ہے کہ دنیا کے اندر جتنے باطل فرقے ہیں، ان سب لوگوں کے پاس مسئلے کی کوئی دلیل نہیں ہوتی،

محض ان کے تخیلات اور توہمات ہوتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۷۷، البقرۃ، الآیۃ: ۷۸]

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾

[البقرۃ: ۷۹]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بھی یہود کی ایک قسم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو گمراہی کی دعوت دینے والے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں، تاکہ لوگوں سے مال، باطل طریقوں سے حاصل کرسکیں۔ جیسے آج مسلمانوں میں بھی ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو بڑے لقب لینے والے ہیں اور ان کو یہ لقب انگریزوں سے ملے ہیں۔ انگریز اپنے دشمن کو تو لقب نہیں دے گا، جو اُن کے مفادات کے لیے کام کرتے ہیں، انہی کو دے گا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۷۷، البقرۃ، الآیۃ: ۷۹]

دولت کے بھوکے عالم:

یہ بیماری یہودیوں میں تھی، چلتی چلتی مسلمانوں کے اندر بھی آگئی۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو بُرائیاں پہلی اُمتوں کے اندر تھیں، وہ میری اُمت کے اندر بھی ہوں گی۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں، ان کے پاس غریب بے چارے آکر کہتے ہیں: مولوی صاحب! مہربانی کریں، میرا لڑکا بیمار ہے، اس کے بارے میں کتاب دیکھیں تو ایسے ان کو کوئی بات بتا دی۔

''وَيْلٌ'' کی تفسیر:

''وَيْلٌ'' سے مراد ہلاکت و بربادی ہے۔ ابوعیاض نے فرمایا: ''وَيْلٌ'' پیپ ہے جو جہنم کی تہہ میں ہوگی۔

حضرت عطاء بن یسار رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وَيْلٌ'' جہنم کے اندر ایک وادی ہے، اللہ ان پہاڑوں کو وہاں ڈالیں تو یہ بھی پانی ہو جائیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر کسی کو جہنم سے بچائے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جہنم کے اندر ایک وادی ہے جس کا نام ''وَيْلٌ'' ہے، جب کافر کو ڈالا جائے گا تو چالیس سال تک لڑھکتے لڑھکتے اس کی تہہ تک پہنچے گا۔

مفسر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث بھی غریب ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول ہے کہ ''وَيْلٌ'' سخت عذاب کو کہتے ہیں۔

امام سیبویہ نے فرمایا: محاوراتِ عرب میں آیا: ''وَيْلٌ لِمَنْ وَقَعَ فِي الْهَلَكَةِ'' ویل ہے اس کے لیے جو ہلاکت کے اندر گر گیا۔ ''وَيْحٌ مَنْ أَشْرَفَ عَلَيْهَا'' اور ہلاکت اس کے لیے ہے جو تباہی کے قریب آ گیا۔

علامہ اصمعی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''وَيْلٌ'' کا کلمہ درد کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ''وَيْحٌ'' رحم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کسی کو کہیں: ''وَيْحَكَ'' کہ اللہ تجھ پر رحم کرے، حالانکہ اس کو ڈانٹ رہا ہوتا ہے اور کسی کو تکلیف ہو تو کہتا ہے: ''يَا وَيْلٌ، يَا وَيْلَتَا''

خلیل نحوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''وَيْلٌ، وَيْحٌ، وَيْسٌ، وَيْهٌ، وَيْكَ، وَيْبَ'' یہ سب ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

یہ سب اقوال متقاربۃ المعنی ہیں، کیونکہ اگر ''وَيْلٌ'' جہنم کی وادی کا نام ہے تو وہ بھی ہلاکت و بربادی ہے، اور اگر جہنم کے کسی پہاڑ کا نام ہے تو تب بھی ہلاکت و بربادی ہے، اور جہنم کے گہرے گڑھے کا نام ہے جس میں چالیس سال تک آدمی گرتا ہوا چلا جائے گا، تب بھی ہلاکت و بربادی ہے۔

تو جن کی بربادی کے لیے اللہ نے فرمایا: ﴿فَوَيْلٌ لَّهُمْ﴾ تو ان کی ہلاکت کیسی ہوگی جو اللہ کے کلام کو، اللہ کی تورات کو بدل دیتے ہیں، اللہ کے فرمان کو بدل دیتے ہیں، تاکہ لوگوں کو دھوکہ دے کر ان کا مال کھائیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اے مسلمانو! اہل کتاب سے تم پوچھنا چاہتے ہو، تم کیسی عقل کی بات کر رہے ہو؟ حالانکہ اللہ نے تمہارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر جو قرآن اُتارا ہے، وہ تر و تازہ ہے، وہ تمہارے اللہ کی طرف سے ہے، وہ بوسیدہ نہیں ہوگا۔ اللہ کا قرآن ہر وقت موجود ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسی قرآن میں اہل کتاب کے بارے میں خبر دی ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی کتاب کو بدل ڈالا۔ تو پھر تم ان پر اعتبار کر کے ان سے کیسے مسئلے پوچھتے ہو؟ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اہل کتاب تو تم سے نہیں پوچھتے، لیکن تم ان کے دروازے پر پھرتے ہو کہ ہمیں مسئلہ بتائیں۔

آج بھی دیکھ لیں! کوئی عیسائی رائٹر کتاب لکھ جائے تو مسلمان بڑے حوالے دیتے ہیں کہ فلاں نے کتاب لکھی ہے، حالانکہ تمہارے پاس تو اللہ کا قرآن موجود ہے، تمہارے پاس تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث موجود ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۷۷، البقرۃ، الآیۃ: ۷۹]



﴿وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٨١﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٨٢﴾﴾ [البقرة: ۸۰تا۸۲]

اور کہتے ہیں: ہمیں ہرگز آگ نہ لگے گی، مگر گنے چنے دن۔ آپ کہہ دیجیے: کیا تم اللہ کے ہاں سے عہد لے چکے ہو کہ اب اللہ اپنے کے خلاف ہرگز نہیں کرے گا یا تم اللہ پر بات جوڑ رہے ہو جو تم نہیں جانتے؟ کیوں نہیں، جس نے گناہ کمایا اور اُس کو اُس کے گناہ نے گھیر لیا، وہی لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے، وہ جنتی ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ماقبل آیات سے ربط:

ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے بعض غلط اعتقادات کا ذکر فرمایا ہے جو انہوں نے اپنے ماننے والوں کے اندر پھیلا رکھے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کو آگ نہیں چھوئے گی، مگر چند گنے چنے دن کہ پہلے تو ہمیں جہنم کی آگ لگے گی نہیں، ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کے محبوب اور بیٹے ہیں، یعنی ہم اس کے بیٹے کو ماننے والے ہیں تو ہم بھی اس کے بیٹے ہو گئے۔ یہودی یہ کہتے تھے کہ جب ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہو گئے تو اس لیے ہمیں عذاب نہیں ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کا قرآن میں دوسرے مقام پر رد فرمایا کہ آپ ان کو کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں یہ یقین ہے کہ آخرت کا عذاب تمہیں نہیں ہوگا، جہنم کی آگ تمہیں نہیں چھوئے گی اور تم اللہ کے بڑے محبوب اور مقبول بندے ہو تو موت کی تمنا کرو، تاکہ جلدی مرو اور تمہیں پتہ چلے کہ تمہیں عذاب ہوتا ہے یا نہیں۔ اور قرآن نے آگے یہ بھی فرما دیا کہ میرے نبی! یہ یہودی کبھی زبانی کلامی نہیں کہہ سکتے کہ ہم پر موت آجائے۔ جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے، ان کو پتہ ہے، اللہ بھی جانتے ہیں کہ ان ظالمین نے دنیا میں کیا کچھ ظلم کیے ہیں۔

دوسرا لوگوں کے دماغوں کے اندر انہوں نے یہ بٹھایا ہوا تھا کہ اگر ہمیں جہنم میں ڈالا بھی گیا تو چند دنوں کے لیے

ڈالا جائے گا اور اس کے بعد ہم نکل آئیں گے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ چند دن بھی ہمیں آگ اس لیے لگے گی کہ ہمارے آباؤ اجداد نے ایک بچھڑے کی عبادت کی تھی اور اس کو خدا بنا بیٹھے تھے۔ جتنے دن وہ اس کی عبادت میں مشغول رہے تھے، بس اتنے دن بنی اسرائیل آگ میں ڈالے جائیں گے، پھر نکال لیے جائیں گے۔

دوسری دلیل وہ یہ دیتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے دو وعدے فرمائے تھے: ایک وعدہ یہ فرمایا تھا کہ تیرے بیٹوں کو عذاب نہیں دوں گا اور دوسرا یہ وعدہ فرمایا کہ تیرے بیٹوں کو یعنی آگے جو نسل چلے گی، ان کو بھی عذاب ہوگا تو تھوڑا سا ہوگا۔ یہ کتابوں کے اندر سے حوالہ دیتے تھے۔ حقیقت کا علم اللہ کو ہے کہ وہ اللہ کا کلام بھی تھا یا اپنے ہاتھوں سے لکھا ہوا تھا۔

اگر اللہ کا کلام بھی ہو تو اس سے حضرت یعقوب علیہ السلام کے وہ بیٹے مراد ہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی ہیں۔ چونکہ یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے پکڑ کر کنویں میں ڈالا تھا اور ان کو بیچا تھا تو ان کا ایک بہت بڑا جرم تھا اور بیٹوں نے آکر باپ کے سامنے اقرار کرلیا: ﴿يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ﴾ [یوسف:۹۷] اے ہمارے ابا جان! ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگیں، ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے خطا کی، ہم نے یوسف سے زیادتی کی، اپنے بھائی سے حسد کی بنا پر یہ سب کچھ کیا۔ ابا جان نے اس کے جواب میں فرمایا تھا: ﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ [یوسف:۹۸] اے میرے بیٹو! تم بھی اقرار کر رہے ہو تو میں بھی اپنے اللہ سے بخشش مانگوں گا۔

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا گناہ دو قسم کا تھا: ایک تو انہوں نے اپنے بھائی سے زیادتی کی تھی کہ انہیں مارا، انہیں گھسیٹا، انہیں کنویں میں ڈالا اور ان کو غلام بنا کر کھوٹے پیسوں میں بیچ ڈالا۔ یہ جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ زیادتی ہوئی، وہ انہوں نے معاف کردی کہ جب سارے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے گئے تو انہوں نے کچھ پہچان لیا کہ یوسف ہیں تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ [یوسف:۹۲] اے میرے بھائیو! جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا، آج کے بعد تم پر کوئی طعنہ بھی نہیں۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں معاف کردیا اور جو انہوں نے اپنے باپ اور اللہ کے نبی کے سامنے جھوٹ بولا تو حضرت یعقوب صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی وعدہ کرلیا کہ میں آنے والے وقت میں تمہارے لیے بخشش مانگوں گا۔

علماء نے لکھا ہے کہ اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے بخشش نہ مانگی اور اس سے اشارہ کیا تھا کہ میں تمہارے لیے تہجد کے وقت بخشش مانگوں گا، کیونکہ رات کا آخری پہر اللہ کی خصوصی رحمت کا ہوتا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر آدمی کو

کوئی مشکل پیش آئے، اگر کوئی پریشانی پیش آئے تورات کا جو آخری حصہ ہے، اس وقت اللہ تعالیٰ سے مانگیں۔

یہود نے اپنے لیے جو دعویٰ کیا کہ ان کو جہنم کی آگ نہیں پہنچے گی، مگر چند گنے چنے دن، پھر ان کو جہنم سے مکمل نجات مل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا ہے کہ جو تم یہ دعویٰ کر رہے ہو، اس دعویٰ پر کیا تمہارے پاس اللہ کا کوئی وعدہ، کوئی عہد ہے؟ کیونکہ ایسی باتیں عقل سے تو ثابت نہیں ہوسکتیں۔ اس قسم کی باتوں کے لیے تمہارے پاس باقاعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عہد یعنی دلیل سمعی ہونی چاہیے۔ اگر ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے عہد کے خلاف کبھی نہیں کرتے، کیونکہ عہد کا خلاف کرنا صفتِ نقصان ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ تمام صفاتِ نقصان سے منزہ اور پاک ہیں۔ لیکن تمہارے پاس تو ایسا کوئی عہد نہیں، نہ تورات میں، نہ انجیل میں اور نہ قرآن میں۔ تو تم نے یہ دعویٰ کہاں سے کرلیا؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلکہ تم اللہ پر ایک ایسی بات کہہ رہے ہو جو تم نہیں جانتے، بلکہ اپنی طرف سے جھوٹ اور افتراء بنا رہے ہو۔

محمد بن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہود یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اس دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے۔ ہمیں قیامت والے دن صرف سات دن جہنم میں ڈالا جائے گا، یعنی ہر ہزار سال کے بدلے ہمیں ایک دن جہنم میں جانا پڑے گا۔ جب سات دن پورے ہوجائیں گے تو ہم جہنم سے نکل آئیں گے۔ حالانکہ جب پہلا دعویٰ جھوٹا ہے تو دوسرا بھی خود بخود جھوٹا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۸، البقرۃ، الآیۃ: ۸۰]

حضرت مسیح علیہ السلام اور دجال کا آنا حقیقت ہے:

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ دجال ایک افسانہ ہے۔ یہ غلط بات ہے۔ اس کے بارے میں احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بارے میں احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عیسیٰ بن مریم علیہ السلام دمشق میں اس طرح اُتریں گے کہ ان کے دونوں ہاتھ فرشتوں کے کندھوں پر ہوں گے، ان کے بالوں سے پانی ٹپک رہا ہوگا۔ معلوم ہوگا کہ وہ ابھی ابھی آسمانوں سے غسل کر کے تشریف لا رہے ہیں۔[1] جب وہ زمین پر آئیں گے تو نماز کی اذان ہوچکی ہوگی، تکبیر بھی ہوچکی ہوگی اور حضرت مہدی علیہ السلام مصلے پر نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوں گے۔ جب وہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو دیکھیں گے تو ہٹنے کی کوشش کریں گے کہ نبی کے ہوتے ہوئے کوئی اور امام نہیں بن سکتا۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے: تم ہی نماز پڑھاؤ، پہلی نماز میں تمہارے پیچھے

[1] [صحیح مسلم، حدیث: ۷۲۹۳، باب: ذِكْرِ الدَّجَّالِ وَصِفَتِهِ وَمَا مَعَهُ]

پڑھوں گا، تا کہ واضح ہو جائے کہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کے تابع ہوں، حضور اکرم ﷺ کی شریعت کی اتباع کروں گا، کیونکہ میں کوئی نئی نبوت لے کر نہیں آیا، میں تو سابقہ نبی ہوں، آپ سے پہلے میری نبوت کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اب تو میں اتباع اور تصدیق کے لیے اُتارا گیا ہوں۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۷، باب: نُزُوْلِ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ حَاکِمًا]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو قتل کریں گے، وہ آ کر صلیب کو توڑ ڈالیں گے، یعنی عیسائیت کی قوت ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جائے گی اور دنیا ایک دفعہ پھر عدل و انصاف اور رحمت سے بھر جائے گی، زمین اپنے خزانے اُگل دے گی اور آسمان اوپر سے رحمتیں برسائے گا۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۳۴۴۸، باب: نُزُوْلِ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ علیہما السلام]

دعویٰ بنی اسرائیل کہ جہنم میں نہیں جائیں گے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ یہود کہتے تھے: ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ [البقرۃ: ۸۰] ہم لوگ آگ میں نہیں جائیں گے، مگر چالیس راتیں۔ کیونکہ ہمارے باپ دادا نے بچھڑے کی عبادت چالیس دن کی تھی، اس لیے اتنے دن ہمیں عذاب ہوگا۔ حالانکہ ان کو یہ علم ہے کہ اللہ کا فیصلہ ہے: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾ [الانعام: ۱۶۴] ہم کسی کو کسی دوسرے کے گناہ میں نہیں پکڑیں گے۔

قرطبی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمہ اللہ کے حوالہ سے اور اسی طرح حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے کہ یہودی یہ خیال کرتے تھے کہ ہم نے تورات میں لکھا ہوا دیکھا ہے کہ جہنم کے دو کنارے ہیں، ان پر چلتے چلتے آدمی اس مقام تک پہنچتا ہے جہاں ﴿اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ﴾ [الصافات: ۶۲] جو جہنم کا ایک درخت ہے اور جہنم کے وسط میں ہے۔ لہٰذا چالیس سال چلتے چلتے ہم عذاب بھگتیں گے، اس جگہ پر جب پہنچیں گے تو عذاب کی مدت ختم ہو جائے گی اور ہم فارغ ہو کر نکل جائیں گے۔ انہوں نے ایک جگہ کہا کہ ہمیں سات دن عذاب ہوگا، دوسری جگہ کہتے ہیں کہ ہمیں چالیس راتیں عذاب ہوگا اور اس ایک روایت میں کہتے ہیں کہ ہمیں چالیس سال عذاب ہوگا۔

اب چالیس سال دنیا والے ہیں یا آخرت والے ہیں؟ کیونکہ دنیا کا سال علیحدہ ہے، جب دنیا نئی پیدا ہوگی تو ایک دن کسی کے لیے ایک ہزار سال کے برابر ہوگا اور کسی کے لیے پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔ اب اگر وہ

چالیس سال رہیں گے تو چالیس کو پچاس ہزار سال سے ضرب دیں تو کتنا عرصہ جہنم میں رہیں گے۔ اصل یہ ہے کہ یہ سب کذب وافتراء تھا جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کے خلاف باندھا تھا اور اللہ کی تورات کو بدل ڈالا تھا۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ بنی اسرائیل یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم جہنم میں نہیں جائیں گے، مگر چنے ہوئے چند دن اور یہ دن اتنے ہوں گے جتنے دن گائے کے بچھڑے کی عبادت کی گئی تھی۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ یہودیوں نے ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ کے پاس آکر مباحثہ کیا اور کہنے لگے کہ ہم جہنم میں نہیں جائیں گے۔ اگر جہنم میں گئے تو صرف چالیس راتوں کے لیے جائیں گے، اس کے بعد ہمارے بعد جہنم میں ایک اور قوم آئے گی (یعنی نعوذ باللہ آپ کی امت آئے گی)۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنا ہاتھ ان کے سر پر رکھا اور فرمایا: تم ہمیشہ جہنم میں رہو گے، کبھی نہیں نکلو گے اور تمہارے بعد کوئی داخل نہیں ہوں گے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت مبارک نازل فرمائی کہ یہود دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم جہنم میں نہیں جائیں گے، مگر چند دن۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۱۱۸، البقرۃ، الآیۃ:۸۰]

یہودیوں نے حضور اکرم ﷺ کے کھانے میں زہر ملا دیا تھا:

حافظ ابو بکر مردویہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے روایت نقل فرمائی ہے کہ جب خیبر فتح ہو گیا تو حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں یہودیوں نے ایک بھنی ہوئی بکری پیش کی۔ چونکہ حضور اکرم ﷺ کو بکری کا گوشت بہت پسند تھا تو انہوں نے بکری کے اگلے چوڑے بنائے اور ان کو بھون کر اس کے اندر زہر ڈال دیا اور حضور اکرم ﷺ کو ہدیہ پیش کر دیا۔ دوسری روایت کے اندر یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ ﷺ نے اس کو تناول بھی فرمایا اور کچھ صحابہ نے بھی گوشت کو کھا لیا اور وہیں فوت ہو گئے یعنی فوری طور پر زہر نے اتنا اثر کیا کہ وہیں شہید ہو گئے، لیکن حضور اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہودیوں کو جمع کرو۔ تو ان کو جمع کیا گیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تمہارا باپ کون ہے؟ تم کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہمارا باپ فلاں ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم جھوٹ بولتے ہو، بلکہ تم فلاں کے بیٹے ہو۔ کہنے لگے: ہاں! سچی بات ہے۔ آپ نے سچ فرمایا، ہم نے جھوٹ بولا ہے۔ ہم دھوکہ دینا چاہتے تھے، لیکن آپ نے سچی بات فرمائی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر میں تم سے کوئی

بات پوچھوں تو سچی بات بتاؤ گے؟ انہوں نے کہا: ہم خود بخود بتائیں گے، کیونکہ اگر ہم جھوٹ بولیں گے تو آپ کو پتہ چل جائے گا، اس لئے جھوٹ بولنے کا کیا فائدہ ہوگا؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا تم جہنم میں جاؤ گے؟ کہنے لگے: جائیں گے، لیکن تھوڑی مدت کے لیے اور پھر ہم وہاں سے نکل آئیں گے، پھر آپ کی اُمت کو وہاں ڈالا جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم جھوٹ بول رہے ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں ہمیشہ جہنم میں رکھیں گے اور تمہارے بعد میری اُمت کو نہیں ڈالا جائے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس کے بعد اگر میں تم سے کوئی بات پوچھوں تو سچی بات کرو گے یا نہیں؟ کہنے لگے: سچی بات کریں گے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے اس بکری کے گوشت کے اندر زہر ملایا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! ملایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں؟ انہوں نے کہا: اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اس لئے ملایا ہے کہ اگر تم جھوٹے ہو، یعنی سچے نبی نہیں ہو تو زہر اثر کرے گا اور ہماری جان بھی چھوٹ جائے گی اور اگر تم اللہ کے سچے نبی ہو تو زہر تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اس لئے ہم نے اپنی طرف سے ایک قسم کا امتحان رکھا تھا اور ہم نے زہر ملایا تھا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۵۷۷۷، باب: مَا يُذْكَرُ فِي سَمِّ النَّبِيِّ ﷺ]

مفسر رحمہ اللہ کا اس روایت کو نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہم جہنم میں نہیں رہیں گے، مگر تھوڑے سے دن۔ جیسا کہ قرآن پاک نے ان کے اس واقعہ کا ذکر کیا: ﴿وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّآ أَيَّامًا مَّعْدُودَةً﴾ [البقرۃ: ۸۰] ہمیں آگ نہیں چھوئے گی، مگر چند دن۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۸، البقرۃ، الآیۃ: ۸۰]

فتح خیبر اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کی شادی:

حضور اکرم ﷺ نے خیبر میں یہودیوں کے ساتھ بڑی رعایت کی تھی۔ خیبر فتح ہو چکا تھا، اسلام کو غلبہ مل چکا تھا، کفر شکست تسلیم کر چکا تھا۔ اگر حضور اکرم ﷺ چاہتے تو ان کی نسل ہی ختم کر دیتے، لیکن حضور اکرم ﷺ نے ان سے بڑی رعایت کی اور آپ ﷺ ہمیشہ جنگ میں اعلان فرماتے تھے کہ خبردار! کسی غیر مذہب کے عالم پر حملہ نہ کیا جائے اور نہ اسے قتل کیا جائے۔ ہاں! اگر وہ خود ہتھیار لے کر مسلمانوں کے خلاف لڑ رہا ہو تو اسے قتل کیا جائے۔ اسی طرح حکم تھا کہ کسی عورت کو قتل نہ کیا جائے، کسی بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کیا جائے[1]۔ کسی بستی پر شب خون نہ مارا جائے جب تک اس بستی کے بارے میں تمہیں پتہ نہ ہو کہ اس بستی کے رہنے والے لوگ کون ہیں۔ صبح کی اذان کا انتظار کیا

[1] [سنن أبي داود، حدیث: ۲۶۱۴، باب: فِي دُعَاءِ الْمُشْرِكِينَ]

جائے، اگر اذان کی آواز آجائے تو بستی پر حملہ نہ کرو، کیونکہ اس میں مسلمان بھی رہتے ہوں گے اور وہ بے چارے بلاوجہ مارے جائیں گے۔ اگر کسی بستی سے اذان کی آواز نہ آئے تو سمجھ لو کہ یہ مسلمانوں کی بستی نہیں ہوگی پھر اس پر تم حملہ کر سکتے ہو۔ [سنن أبي داود، حديث: ٢٦٣٥، باب: في دُعاءِ الْمُشْرِكِينَ]

جنگ فتح ہوجانے کے بعد بی بی صفیہ جو حضور اکرم ﷺ کی بعد میں بیوی بنی تھیں، گرفتار ہوکر حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئیں تو صحابہ نے مشورہ دیا کہ وہ ایک سردار کی بیوی تھیں اور آپ نے وہ ایک غلام کو دے دی۔ شریعت کے اندر تو کوئی منع نہیں ہے، بہتر یہ تھا کہ آپ اس لڑکی کو اپنے لئے رکھتے، سردار گھرانے کی لڑکی ہے، چلو سردار دو جہاں کے گھر میں آجائے اور ان کے دلوں کو ٹھیس نہ پہنچے۔ یعنی اتنی رعایت کی جا رہی ہے کہ کسی کے دل کو ٹھیس نہ پہنچے۔ حضور اکرم ﷺ نے رائے قبول فرمالی اور حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور فرمایا کہ وہ عورت جو تمہارے حصے میں آئی ہے تم مجھے اپنی خوشی کے ساتھ واپس کرنا چاہتے ہو یا مال کے عوض؟ انہوں نے کہا: میرا تو اپنا جان و مال بھی قربان ہے، ایک لڑکی کا کیا مسئلہ ہے۔ حضور! قسم ہے میں نے تو ابھی اس کی شکل تک بھی نہیں دیکھی۔ (چونکہ اللہ نے اس کو حضور اکرم ﷺ کے لیے محفوظ رکھنا تھا تو کسی دوسرے کو ان کی شکل دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئی)۔ حضور اکرم ﷺ نے بی بی صفیہ کو اپنے حصے میں لے کر آزاد فرمادیا اور نکاح کر کے ان کی شان کو اتنا اونچا کر دیا کہ وہ اُمہات المومنین میں شامل ہوگئیں۔ [صحيح البخاري، حديث: ٣٧١، باب: مَا يُذْكَرُ فِي الْفَخِذِ...]

بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا کہتی تھیں کہ اللہ نے مجھے بڑا نصیب والا بنایا ہے۔ جب میں حضور اکرم ﷺ کی بیوی بن گئی تو جتنے حضور اکرم ﷺ کے صحابہ کے گھروں کے اندر میرے خاندان کے لڑکے یا لڑکیاں قید میں تھے، انہوں نے ان کو آزاد کر دیا۔ کیونکہ یہ اب حضور اکرم ﷺ کے رشتہ دار ہوگئے، ان کو ہم کیسے غلام بنا سکتے ہیں؟ ان سے ہم نوکروں والا کام کیسے لے سکتے ہیں؟ اس لئے بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ میری وجہ سے میری قوم کے سینکڑوں لوگوں کو آزادی مل گئی۔

جب آپ نبی کریم ﷺ کی زوجہ بنیں، آپ کی اور بیویاں بھی تھیں، چونکہ بی بی عائشہ اور بی بی حفصہ کا آپس میں بڑا اتفاق و اتحاد تھا۔ فطری بات ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں اور بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں، دونوں قریش سے تعلق رکھتی تھیں، ان کا نسب، قوم، قبیلہ بھی ایک تھا اور پھر ان کے والدین کو جو مرتبہ حضور اکرم ﷺ کے ہاں ملا تھا، وہ اور کسی کو نہیں ملا تھا۔

ایک دن حضور اکرم ﷺ تشریف لائے تو بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا رو رہی تھیں۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: کیوں رو رہی ہو؟ انہوں نے کہا: آج مجھے بی بی عائشہ نے طعنہ دیا ہے کہ تم ہمارے مقابلہ پر کس بات پر ناز کرتی ہو؟ تم یہودیوں کی لڑکی ہو...... ایک یہودی کی بیٹی اور ایک یہودی کی بیوی تھیں...... حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: صفیہ! کیا تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟ انہوں نے کہا: میں ان کو کیا جواب دیتی؟ میرا تو انہی کے خاندان سے تعلق ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم ان کو بتاؤ کہ میرا تعلق تو دو نبیوں سے ہے: میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل سے ہوں، وہ نبی تھے اور محمد مصطفیٰ ﷺ میرے شوہر ہیں اور وہ بھی نبی ہیں۔ اور تمہارا شوہر تو نبی ہے، لیکن باپ تو نبی نہیں ہے۔ بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا نے یہ جواب یاد کرلیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد یہ بات ہوئی تو بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا نے ان کو جواب دیا تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

[تفسیر القرطبی: ۱۶/۳۲۶، سورۃ الحجرات: ۱۱، الترمذی، حدیث: ۳۸۹۲]

حضور اکرم ﷺ بی بی عائشہ کے گھر تشریف لائے، دیکھا کہ ان کا موڈ خراب ہے۔ پوچھا تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: حضور! اللہ نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے یا بیویوں کے جھگڑے کا جواب سکھانے کے لیے بھیجا ہے؟ حضور! یہ جواب صفیہ نہیں دے سکتی، یہ آپ نے اس کو سکھایا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی اگر غیر خاندان کا کٹ کر میرے گھر آجائے اور میں اس کی امداد نہ کروں تو یہ نبوت و رسالت کے خلاف ہے۔ وہ میری بیوی ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے یہ شرف بخشا ہے۔

حضور اکرم ﷺ پر زہر کا اثر:

حضور اکرم ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ یہ معاملات کئے، لیکن انہوں نے آپ کے کھانے میں زہر ملا دیا۔ یہ اتنی دھوکے باز قوم ہے کہ اللہ کے نبی کو دھوکہ دینے سے باز نہیں آسکتی تو تمہارے ساتھ کیا وفا کرے گی؟ حضور اکرم ﷺ کو جب زہر دیا گیا تو ایک روایت میں یہ تفصیل بھی ملتی ہے کہ جس عورت نے زہر دیا تھا، اس کا نام فاطمہ تھا، حضور اکرم ﷺ نے اس عورت کو بلایا اور ان کے سرداروں کو بلایا اور فرمایا: اس گوشت میں زہر ہے؟ تو وہ مان گئے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ اس عورت نے کہا: آپ کو کیسے پتہ چلا کہ اس میں زہر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: گوشت نے مجھے بتایا ہے، اللہ نے اسے بولنے کی توفیق دی ہے۔ لیکن یہ بات بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے

اس کو نوش فرمالیا۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: سنو! میں نے جو زہر کھالیا، مجھے اللہ نے بچالیا، لیکن چونکہ میرے صحابہ شہید ہو گئے، لہٰذا ان کا بدلہ اس عورت سے لیا جائے گا جس نے زہر ملایا ہے، میں اپنا بدلہ نہیں لیتا۔

اللہ کی قدرت دیکھیں کہ ساری زندگی میرے آقا ﷺ پر اس زہر کا اثر نہیں ہوا، لیکن جب وفات کی گھڑی قریب آئی، صحیح احادیث مبارک میں یہ الفاظ ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! معلوم ہوتا ہے کہ اندر سے میری آنتیں کٹی جارہی ہیں، یہ اس زہر کا اثر ہے جو مجھے خیبر میں دیا گیا تھا۔

[صحيح البخاري، حديث: ۴۴۲۸، باب: مَرَضِ النَّبِيِّ ﷺ وَوَفَاتِهِ]

محدثین اور علماء نے اس کی وجہ لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موت کی جتنی قسمیں بنائی ہیں، ان میں سب سے بڑا درجہ اس کا ہے جو اللہ کے راستے میں شہید ہوتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے چونکہ اپنے پیغمبر کو باعتبار شان کے سارے نبیوں سے افضل بنایا، آپ ﷺ کی زندگی میں بھی کوئی آپ کی شان کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اللہ نے آپ ﷺ کو مرتبۂ شہادت دینے کے لئے اس زہر کے اثر کو باقی رکھا، ورنہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس بات پر قادر ہیں کہ جب خیبر میں اس زہر نے اثر نہیں کیا تو مدینے میں اثر کیوں کرے؟ لیکن یہ اس لیے ہوا، تاکہ میں اپنے نبی کی شان شہادت کے ساتھ بلند کروں۔ یہ نصیبوں اور اللہ کی قدرت کے فیصلے ہیں، وہ جن کے چاہے نصیب بلند کردے۔ جس طرح حضور اکرم ﷺ کو زہر کی وجہ سے مرتبۂ شہادت ملا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر زہر کا اثر:

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب سانپ نے ڈس لیا تھا، اس کا اثر بدن میں رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کے وزیر کو وہی مرتبہ نصیب فرمادیا۔

اسی طرح تاریخ پر نظر دوڑا کر دیکھیں کہ میرے مدنی پاک ﷺ کے نواسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ اسی طرح سب سے بڑے بطل اسلام حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھی زہر دیا گیا، لیکن وہ سالم رہ گئے۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو بھی زہر دیا گیا، مگر وہ اس کے اثر سے شہید ہو گئے۔

جب حضور اکرم ﷺ نے دو لقمے کھالیے تو پھر گوشت بول پڑا کہ میرے اندر زہر ہے۔ اگر وہ گوشت پہلے بول پڑتا تو حضور ﷺ وہ دو لقمے بھی نہ کھاتے۔ چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو مرتبۂ شہادت دینا تھا، لہٰذا اس وقت

گوشت کو بولنے کی اجازت نہیں ملی۔ دوسرا یہ بھی فیصلہ فرما دیا کہ علم غیب کا مالک اللہ ہے۔ اگر نبی کو علم غیب ہوتا تو وہ زہر کو جاننے کے بعد تو نہ کھاتے، کیونکہ زہر کھانا شریعت کے اندر حرام ہے، وہ تو خودکشی ہے۔ ورنہ شریعت کے اندر اس کی اجازت نہیں ہے۔ اگر نبی کو علم غیب ہوتا اور صحابہ کو علم غیب ہوتا تو وہ بھی زہر والا گوشت نہ کھاتے۔

فتنوں کے دور ہمیں ہدایت کی دعا کی اہمیت:

اس لیے دن رات اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ پاک ہمیں اپنی رحمت کے ساتھ ہدایت پر رکھیں اور اپنی رحمت کے ساتھ ہمیں ہدایت پر موت نصیب فرمائیں۔ اسی وجہ سے ہم نماز کے اندر دعا مانگتے ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ [الفاتحہ] اے اللہ! ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرما۔ حالانکہ جو نماز پڑھ رہا ہے وہ صراطِ مستقیم پر کھڑا ہے، لیکن بار بار مانگنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یا اللہ! ہمیں ہدایت پر ثابت قدم فرما اور اسی طرح ہدایت فرما کر ہمیں جنت میں پہنچا دے۔

حدیث میں آتا ہے اور قرآن میں بھی موجود ہے کہ جب اہل جنت، جنت میں داخل ہوں گے تو وہ کہیں گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۣ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ [الاعراف: ۴۳] اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تُو نے ہمیں جنت کا راستہ دکھایا، تُو نے ہمیں جنت میں پہنچایا۔ اگر آپ ہمیں جنت کا راستہ نہ دکھاتے اور جنت میں نہ پہنچاتے تو ہم ہرگز نہیں پہنچ سکتے تھے۔ [الزہد والرقائق لابن المبارک: ۱/۵۰۸]

اس لیے ہمیشہ دعا کیا کریں کہ اللہ پاک اپنے فضل و کرم کے ساتھ ہمیشہ اسلام پر رکھیں، اسلام پر موت دیں۔ ورنہ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، یہ فتنوں کا دور ہے، پُرخطر دور ہے، جس کے بارے میں میرے آقا ﷺ نے فرمایا تھا: ایک وقت میری اُمت پر ایسا بھی آجائے گا کہ آدمی صبح کو مومن ہوگا تو شام کو کافر ہوگا، شام کو مومن ہوگا تو صبح کو کافر ہوگا۔[1] یعنی ایسے ایسے فتنے آجائیں گے کہ لوگ اپنے ایمان سے محروم ہو جائیں گے۔ کوئی ذاتی مفادات کے لیے، کوئی اقتدار کے لیے، کوئی دولت کے لیے اور کوئی جھوٹے جاہ و مال اور منصب کے لیے اللہ کے دین کو چھوڑ دیں گے اور اللہ کے راستے سے ہٹ جائیں گے۔

اس کا ایک ہی حل ہے کہ ہم اللہ کے دروازے پر لوٹ آئیں، توبہ کریں، اللہ سے معافی مانگتے رہیں اور اللہ سے ہمیشہ یہ دعا کرتے رہیں کہ اے اللہ! ہمیں ہدایت پر رکھنا۔ ورنہ دنیا کے اندر جتنے باطل فرقے ہیں، انہوں نے

[1] [صحیح مسلم، حدیث: ۱۸۶، باب: الحَثِّ عَلَى الْمُبَادَرَةِ بِالْأَعْمَالِ قَبْلَ تَظَاهُرِ الْفِتَنِ]



اپنے اپنے ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے، اپنے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے مختلف دلائل بھی تلاش کیے ہوئے ہیں اور ایسے سوالات و جوابات ہوتے ہیں کہ عام آدمی سنے تو گھبرا جائے، اس کو سمجھ بھی نہ آئے کہ میں کیا کروں۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ﴾ [المومنون:۵۳] ہر جماعت اپنے اپنے مسلک اور اپنے اپنے طریقے پر چلی جارہی ہے اور اسی پر خوش ہے، لیکن یہ فیصلہ قیامت میں ہوگا، پھر ہم سب کو علیحدہ علیحدہ کر دیں گے، جنت والوں کو بھی علیحدہ کر دیں گے اور جہنم والوں کو بھی علیحدہ کر دیں گے، ورنہ دنیا کے اندر ہر جماعت، ہر مذہب، ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ میں ہی حق پر چل رہا ہوں۔

اگلی آیاتِ مبارکہ کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک اُصولی قاعدہ بیان فرما دیا ہے کہ دنیا کے اندر دو قسمیں ہیں: ایک مؤمن، ایک کافر۔ مومن جنتی ہے، کافر اللہ کے عدل کے مطابق جہنمی ہے۔ تو اللہ نے ایک فیصلہ فرما دیا ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ ہم جہنم میں نہیں رہیں گے، کیا تمہارے ہاتھ میں جہنم ہے کہ جتنے دن چاہو گے جہنم میں رہو گے اور جب چاہو گے نکل جاؤ گے؟

دنیا کے قید خانے بھی مجرموں کے ہاتھ میں نہیں ہوتے ہیں، بلکہ با قاعدہ عدالتیں سزائیں دیتی ہیں اور جیل بھیجا جاتا ہے، اس کی تاریخ لگتی ہے اور اس کے دن پورے ہوتے ہیں تو اس کو ایک دن بھی زیادہ جیل میں نہیں رکھا جاتا، اس کو جیل سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ جب دنیا کے قید خانے میں کوئی اپنی مرضی سے جا نہیں سکتا اور اپنی مرضی سے نکل نہیں سکتا تو تم نے جہنم کو مذاق سمجھ رکھا ہے کہ جتنے چاہو گے اندر رہو گے اور جب چاہو گے باہر نکل آؤ گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿بَلَىٰ مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝﴾ [البقرۃ:۸۰تا۸۲]

ایسا ہرگز نہیں جیسے تم کہتے ہو، بلکہ جو بھی بُرا کام کرے اور اس کے گناہ اس کا احاطہ کر لیں...... اور یہ کافر کے گناہ ہو سکتے ہیں جو اس کا احاطہ کریں گے، کیونکہ مسلمان جتنا بڑا گناہ گار کیوں نہ ہو، اس کے اندر ایمان کی چنگاری موجود ہوتی ہے، لہٰذا اس کے گناہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتے...... آگ ان سے جدا نہیں ہوگی۔ اس لیے فرمایا: ﴿هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ یہ جس کے ساتھی ہیں، اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ چالیس راتوں کے بعد نکل آئیں گے، بلکہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے بڑا کفر کیا کہ میرے محبوب ﷺ کا کلمہ نہیں پڑھا،



ان کی نبوت پر ایمان نہیں لائے۔ اور ان کے مقابلہ پر جو لوگ ایمان لے آئے اور اچھے عمل کیے، یہ جنت کے ساتھی ہیں، یہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے، کبھی جنت سے نکالے نہیں جائیں گے۔

اس آیت کے اندر دو قسموں کا بیان آ گیا۔ جو شخص کافر بھی ہے اور گناہ گار بھی، جن گناہوں نے بھی احاطہ کیا ہوا ہے، ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ جو شخص مومن بھی ہے اور عمل بھی سارے اچھے ہیں تو وہ ہمیشہ جنت میں رہے گا۔

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝﴾ [البقرة:۸۱، ۸۲]

کافروں کے اچھے اعمال کہاں جائیں گے؟

اور ایک قسم یہ ہے کہ کافر ہے، لیکن اس کے اعمال اچھے بھی ہیں۔ جیسے بہت سارے کافر ایسے ہوتے ہیں جو بڑے بڑے سکول اور ہسپتال بنا دیتے ہیں، غریبوں کی امداد کرتے ہیں، کہیں زلزلہ آ جائے تو وہاں امداد کو پہنچ جاتے ہیں۔ بظاہر ان کے یہ اعمال اچھے ہیں، لیکن حقیقت میں کچھ نہیں۔ جیسے قالین پر شیر بنا ہوا ہے، اس کے اوپر آدمی چڑھتا رہتا ہے، وہ شیر نہیں، وہ تو شیر کی شکل ہے، ان کے بھی یہ اعمال ہمیں بظاہر اچھے لگ رہے ہیں، لیکن چونکہ اصل بنیادی شرط ایمان کی نہیں ہے، لہٰذا ان کے ان اعمال کی کوئی حیثیت نہیں۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَـيْــــًٔـا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۝﴾ [النور:۳۹]

جن لوگوں کے اندر کفر ہے، وہ چاہے دنیا میں جتنے اعمالِ صالحہ کریں، ان کی مثال سراب کی سی ہے کہ دور سے پانی نظر آتا ہے، لیکن پانی نہیں ہوتا۔

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کئی مقامات پر ارشاد فرمایا: جو آدمی کافر ہے، اگر وہ اعمالِ صالحہ کرتا بھی ہو تو ان اعمالِ صالحہ کا قیامت میں کوئی دخل نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ عادل ہیں وہ کافروں کو ان کے اعمال کا بدلہ دنیا میں دے دیتے ہیں، صحت دے دی، شہرت دے دی، عزت دے دی، پیسہ دے دیا، لیکن آخرت میں ان کے عمل کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ ان کے عمل ایسے ہوں گے جیسے کوئی ریت کو اُڑا دے اور ہاتھ میں کچھ نہ بچے۔ اس لیے جو

کافر ہے، عمل اچھے ہیں، جب شرط نہ رہے تو مشروط خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ کسی سے شرط کرتے ہیں کہ اگر تم میرے پاس آئے تو میں آپ کی تکریم کروں گا۔ اگر وہ نہ آئے تو تم بھی تکریم نہیں کرو گے۔ کیونکہ جب شرط نہیں ہے تو مشروط خود بخود ختم ہو گیا۔ اسی لیے ہر عمل کے قبول ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ پر ایمان ہو۔

گناہگار مسلمان کا انجام:

اب ایک آدمی اللہ کو نہ مانتا ہو اور وہ کہے کہ میرے عمل اچھے ہوں تو ان کو اچھا نہیں سمجھتا۔ اور ایک مومن آدمی ہے، اس کے اچھے عمل بھی ہیں اور برے عمل بھی ہیں۔ اگر عمل برے ہیں تو ان کی دو کیفیتیں ہیں:

1 ......اگر اس نے دنیا میں توبہ کر لی تو الحمد للہ! اللہ توبہ قبول فرما لیں گے۔ کیونکہ جب آدمی توبہ کرے تو وہ گناہ ختم ہو جاتے ہیں، اس کے گناہوں کو اللہ ایسے مٹا دیتے ہیں گویا کہ اس نے وہ گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ میرے آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ''[1] (جو شخص کسی گناہ سے توبہ کرے تو گویا اس نے وہ گناہ کیا ہی نہیں تھا)۔ یعنی اگر ایک آدمی ستر سال تک کفر و شرک کرتا رہے، لیکن اللہ کے دربار میں توبہ کر لے تو سارے گناہ معاف ہو گئے۔

2 ......اسی طریقہ سے ایک آدمی مسلمان ہے، اللہ و رسول پر ایمان ہے، قرآن پر ایمان ہے، اعمال اچھے بھی ہیں اور برے بھی ہیں، لیکن توبہ نہیں کر سکا اور بغیر توبہ کے مر گیا، گناہ کی حالت میں مر گیا۔ مثلاً شراب کے نشہ میں تھا، ہارٹ اٹیک ہوا اور مر گیا، یا نشہ کی حالت میں کسی دریا میں گرا اور ڈوب کر مر گیا اور اس کو توبہ کا موقع نہیں ملا۔ اسی طرح ایک چور چوری کر رہا ہے، اسی حالت میں کسی نے ڈنڈا مارا تو موقع پر مر گیا۔ اس کو بھی توبہ کرنے کا موقع نہیں ملا، حالانکہ مسلمان تو تھا۔ اس کے بارے میں یہ ہے کہ یہ اللہ کی مشیت پر ہے۔ چاہیں تو اس کو جہنم میں ڈال دیں اور وہ اپنی سزا کی مدت پوری کرنے کے بعد جہنم سے نکالا جائے گا اور اگر اللہ تبارک و تعالیٰ چاہیں تو اس کو معاف فرما دیں۔

گناہوں کی اقسام اور بندوں کے حقوق:

گناہ دو قسم کے ہیں: ایک اللہ کے حقوق اور ایک بندے کے حقوق ہیں۔ اللہ اپنے حقوق تو توبہ سے معاف فرما دیتے ہیں اور اگر چاہیں تو بغیر توبہ کے معاف فرما دیں۔ لیکن بندے کے حقوق معاف نہیں فرماتے، جب تک تم

[1] [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۴۲۵۰، باب: ذِکْرِ التَّوْبَۃِ]

بندے کو اس کا حق ادا نہ کرو۔ تمہارے ذمہ کسی کا قرضہ ہے یا کسی کی جائیداد ہے، تمہارے ذمہ کسی کی کوئی چیز ہے وہ تمہیں ادا کرنے ہوں گے یا معافی لینی ہوگی۔ اگر وہ معاف کر دے تو تم بخشے گئے، اگر وہ معاف نہ کرے تو اس کو ادا کر دو۔ اور اگر وہ آدمی مر گیا جس کے تم نے پیسے دینے تھے تو اس کے وارثوں کو ادا کر دو۔ اگر اس کا وارث نہ ملے تو اتنے پیسے اس کے نام سے خیرات کر دو کہ اللہ میاں! پیسے فلاں آدمی کے تھے اور آپ جانتے ہیں کہ مجھے وہ ملتا نہیں ہے تو ان پیسوں کو خیرات کر دو۔ اس کا ثواب اللہ اس کو بھی عطا فرمائیں گے اور تمہیں بھی عطا فرمائیں گے اور قیامت میں اس کا مواخذہ بھی نہیں ہوگا۔ چونکہ حقوق العباد اتنے اہم ہیں کہ شہید کا ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: اس کے خون کا قطرہ بعد میں گرتا ہے اور اللہ اس کے سارے گناہ معاف کر دیتے ہیں[1] لیکن حقوق العباد شہید سے بھی معاف نہیں ہوتے۔ اگر کسی کے ذمہ کوئی قرض ہے یا کوئی لین دین ہے وہ چاہے اللہ کے راستے میں شہید بھی ہو جائے تو وہ قرض معاف نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ انسان کا حق ہے۔

اگر کسی آدمی نے کسی بندے کے حقوق دینے تھے اور دنیا میں ادا نہیں کئے اور مر گیا۔ مثلاً آپ نے کسی کا ایک ہزار ریال دینا تھا، آپ نے ادا نہیں کیا اور موت آگئی۔ اب آپ کے وارث بھی ادا کر دیں تو ادا ہو جائے گا۔ آپ کے وارثوں نے ادا نہیں کیا تو قیامت میں معاملہ یہ ہوگا کہ قیامت میں دولت، پیسہ تو کسی کے پاس نہیں ہوگا، نہ کسی امیر کے پاس ہوگا، نہ کسی غریب کے پاس ہوگا۔ سب بغیر کفن کے اپنی اپنی قبروں سے ایسے کھڑے ہوں گے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ سب کو ان کے اعمال کے مطابق لباس عطا فرمائیں گے۔ اب اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس آدمی کی اتنی ہزار نیکیاں اس قرضہ کے بدلے میں اس آدمی کو دے دو۔ اگر تمہارے اوپر قرضہ اتنا ہے کہ نیکیاں ساری ختم ہو گئیں تو ملائکہ کہیں گے: اللہ میاں! نیکیاں نہیں بچیں، قرض لینے والے موجود ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ حکم فرمائیں گے کہ ان کے گناہ اس پر رکھ دو، یہ اتنی دیر جہنم بھگتے۔ حقوق العباد کی کسی شکل میں معافی نہیں مل سکتی جب تک کہ تم بندے کے حقوق کو بخشواؤ گے نہیں۔

بعض لوگ اس معاملہ میں بڑی غفلت کرتے ہیں۔ جیسے تم کسی کی غیبت کرتے ہو، یہ بھی حقوق العباد ہے۔ اسی طرح تم نے کسی کو گالی دی، کسی کو برا کہا، یا کسی پر تہمت لگائی یا کسی پر الزام لگایا ہے، یہ سب حقوق العباد ہیں۔ جو بھی تم نے کسی دوسرے کو ایذاء پہنچائی، وہ دنیا میں بھی تم سے بدلہ لینے کا حق دار ہے اور آخرت میں بھی حق دار ہے۔ لہٰذا

---

[1] [سنن ابن ماجہ، حدیث:۲۷۹۹، بَابُ: فَضْلِ الشَّهَادَةِ فِي سَبِيلِ اللهِ]

کوئی ایسا بندہ موجود ہے تو جلدی سے معافی لے لو۔ اس کو کہہ دو کہ میں نے آپ کی غیبت کی تھی، مجھے آپ معاف کر دیں۔ دنیا کے اندر ایسا آدمی کوئی بھی نہیں ہوتا کہ آپ جا کر کہیں اور وہ آپ کو معاف نہ کرے۔ کسی کا قرضہ دینا ہے تو ادا کرو۔ اگر قرض دینے کی طاقت نہیں تو اپنے ورثاء کو وصیت کرو کہ اگر میں مرجاؤں تو میرا اتنا قرضہ ہے، ادا کر دینا۔ تمام معاملات کو رجسٹر میں لکھ کر محفوظ رکھو، تاکہ تمہارے بعد تمہارے ورثاء کو پتہ چلے کہ تم نے کس کا قرضہ دینا ہے اور کس سے قرضہ لینا ہے؟ اس لئے اسلام کے اندر حکم ہے کہ تم میں سے کوئی آدمی نیند نہ کرے، مگر وصیت لکھی ہوئی سرہانے کے نیچے موجود ہو،[1] کیونکہ کوئی پتہ نہیں موت کس وقت آجائے۔

زندگی میں اپنی وصیت لکھنے کا طریقہ:

وصیت کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ لکھو کہ میری موت کے بعد جو میرا ترکہ بچے، اس کو شریعت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ شریعت کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھایا جائے، اللہ کے قرآن اور سنت کے مطابق اس کو تقسیم کر دیا جائے یا پہلے کسی عالم کے پاس جا کر باقاعدہ فتویٰ کیا حاصل کرلو کہ میری بیوی ہے، اتنے بچے ہیں، ماں باپ ہیں، فلاں ہے، اگر میں مرجاؤں تو میری جائیداد شرعی طور پر تقسیم کیسے ہوگی؟ وہ آپ کو حصص نکال کر دیں گے، وہ اپنی وصیت میں درج کردو کہ میں نے فلاں عالم سے فتویٰ لیا تھا، لہٰذا میری جائیداد کو اس طرح تقسیم کیا جائے۔

اور دوسرا تفصیل لکھ دو کہ اتنے آدمیوں سے قرض لینا ہے اور اتنے آدمیوں کو میں نے قرض دینا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی صدقہ جاریہ کی وصیت بھی کرو، اگر اللہ نے آپ کو توفیق دی ہے کہ فلاں مدرسہ میں دو کمرے بنوا دینا، فلاں مسجد کی چھت نہیں ہے، چھت ڈلوا دینا، فلاں علاقے میں پانی کا انتظام نہیں ہے وہاں کنواں لگوا دینا۔ اگر زندگی میں کر دو تو بہت اچھی بات ہے، ورنہ وصیت کر جاؤ اور وصیت میں یہ بات بھی یاد رکھو کہ جو خیرات کا کام کرنا ہے، وہ اپنی جائیداد کے تیسرے حصے سے زیادہ نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ساری جائیداد اللہ کے راستے میں دے دو اور اولاد پیچھے خوار ہوتی پھرے۔ یہ ناجائز ہے، شریعت نے اس سے منع کیا ہے۔

حضور اکرم ﷺ سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے پوچھا تھا: یارسول اللہ! میرا دل چاہتا ہے کہ جتنا مجھے اللہ نے دیا ہے، میں سارا خیرات کر دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل نہیں۔ انہوں نے کہا: حضور! مجھے اتنی اجازت دیں کہ



[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۲۷۳۸، باب الوصایا وقول النبی ﷺ: وَصِيَّةُ الرَّجُلِ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ]

میں مال کا تیسرا حصہ خیرات کردوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تیسرا حصہ خیرات کردو، تمہیں اجازت ہے، لیکن تیسرا حصہ بھی زیادہ ہے اس سے بھی کم کرنا چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بُری بات ہے کہ تم اپنے بچوں کو یتیم اور مسکین چھوڑ جاؤ، وہ لوگوں سے بھیک مانگتے پھریں۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم ان کو غنی چھوڑ کر جاؤ، ان کے لئے جائیداد چھوڑ کر جاؤ، تاکہ وہ کسی کے محتاج نہ رہیں، کسی کے دروازے پر جاکر قرض مانگنے کے محتاج نہ ہوں۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۲۷۴۲، باب: أَنْ یَتْرُكَ وَرَثَتَهُ أَغْنِیَاءَ خَیْرٌ...]

کافر نے ہر حال میں جہنم میں رہنا ہے، اس کا جہنم سے نکلنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور مومن نے اللہ کی رحمت سے جنت میں جانا ہے اور ضرور رہنا ہے، اگر گناہوں کی وجہ سے وہ عذاب بھگت رہا ہے تو علیحدہ بات ہے، لیکن ایک نہ ایک وقت جنت میں جائے گا۔

(حدیث) جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہے تو اللہ اسے کسی نہ کسی وقت جہنم سے ضرور نکالیں گے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۳۹، باب: قَوْلِ اللهِ تعالیٰ: وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ...]

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں قیامت میں سفارش کروں گا، شفاعت کروں گا، شفاعت کروں گا، حتیٰ کہ میری سفارش پر اللہ تعالیٰ لاکھوں کروڑوں کو جہنم سے نکالیں گے اور اس کے بعد اللہ فرمائیں گے: اے محمد مصطفیٰ! اب تم راضی ہوگئے ہو یا نہیں؟ حضور اکرم ﷺ عرض کریں گے: اے میرے رب! میں راضی ہوگیا، میں راضی ہوگیا۔ [کنز العمال، حدیث: ۳۹۷۵۸، باب: الشفاعۃ، المعجم الاوسط، حدیث: ۲۰۶۲]

ایک اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ راضی ہونے کے بعد بھی عرض کریں گے: یا اللہ، یارب العالمین! وہ لوگ جن کے دل میں ذرہ کے برابر بھی ایمان ہے، وہ تو جہنم میں ہیں۔ مہربانی کریں ان کے بارے میں بھی میری سفارش منظور کرلیں۔ اللہ پاک فرمائیں گے: ان کو رہنے دو، ان کو میں اپنی رحمت سے نکالوں گا۔ پھر اللہ پاک ان کو اپنی رحمت کے ساتھ جہنم سے نکال دیں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ﴾ [الضحیٰ: ۵] یہ آیت سب سے بڑی اُمید دلانے والی آیت ہے کہ اللہ نے اپنے نبی سے وعدہ کیا ہے کہ ہم آپ کو اتنا دیں گے کہ آپ کو راضی کردیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ہمیں یقین ہے رحمت دو جہاں ﷺ اس وقت تک راضی نہیں ہوں گے جب تک ساری اُمت جنت میں نہ چلی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے راضی کرنے کا وعدہ کیا ہے تو ضرور پورا فرمائیں گے۔ اللہ کا وعدہ تو کبھی خلاف نہیں ہوتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، مقامِ محمود حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لئے ہے، ''لواء الحمد'' (حمد کا جھنڈا) حضور اکرم ﷺ کے ہاتھ میں ہوگا اور شفاعت کا پرچم بھی حضور اکرم ﷺ کے پاس ہوگا۔ ہم پر لازم ہے کہ کم از کم ہم اپنی شکل اور حالت ایسی بنائیں کہ حضور اکرم ﷺ کے سامنے جانے کے قابل ہوجائیں، ایسی حالت تو نہ ہو کہ ہم حضور اکرم ﷺ کے سامنے بھی نہ جاسکیں۔

(حدیث) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں حوضِ کوثر پر کھڑا ہوں گا، میری اُمت کے لوگوں کو فرشتے دھکے دے دے کر ہٹا رہے ہوں گے۔ حضور اکرم ﷺ فرمائیں گے: ٹھہرو ٹھہرو، ملائکہ! ان کو کچھ نہ کہو، یہ تو میری اُمت ہے، ان کو آنے دو۔ فرشتے عرض کریں گے: حضور! آپ کو پتہ نہیں ہے کہ یہ لوگ آپ کے بعد کیا کیا بدعات اور شرک میں پڑ گئے، انہوں نے تو دین میں نئے نئے مسئلے نکال لئے۔ حضور اکرم ﷺ فرمائیں گے: بربادی ہو ان کے لئے، ان کو جہنم میں لے جاؤ۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۶۵۸۴، باب: في الحوض]

اگر ہم سامنے جانے کے قابل بھی نہ ہوں اور حضور اکرم ﷺ فرمائیں کہ ان کو دفع کرو تو ہماری سفارش کون کرے گا؟

داڑھی کی اہمیت:

ایک آدمی نے مضمون لکھا کہ مولوی داڑھی داڑھی کہتے رہتے ہیں، کیا داڑھی میں اسلام رکھا ہوتا ہے؟ حالانکہ اس بے وقوف کو پتہ نہیں کہ داڑھی میں اسلام نہیں، اسلام میں داڑھی ہے۔ ورنہ تو جس بچے کی داڑھی نہ نکلی ہو، وہ مسلمان نہ ہو، کوئی عورت مسلمان نہ ہو کہ اس کی داڑھی نہیں ہوتی۔ بلکہ معنی یہ ہے کہ اسلام میں داڑھی کا حکم ہے اور یہ سنت الانبیاء والمرسلین ہے اور دنیا میں کوئی اللہ کا ولی نہیں گزرا، جس نے داڑھی نہ رکھی ہو۔ آپ نے دنیا میں کوئی ایسا ولی، عالم، محدث نہیں سنا ہوگا جو داڑھی نہ رکھتا ہو اور پھر بھی ولی اللہ ہو۔ اس لیے کوشش کرو، ہمت کرو، اللہ تعالیٰ توفیق دے۔

جو اَب تک ہم نے غلطی کی، اللہ تعالیٰ معاف فرمادے، کم از کم جن کو اللہ نے مکہ و مدینہ نصیب فرمادیا ہے اور وہ اپنا چہرہ کعبہ پر بھی رگڑتے ہیں، ان کو تو لحاظ کرنا چاہیے کہ ہم نے تو کعبہ کی دیواروں کو گواہ بنالیا ہے۔ ویسے بھی

اُصولی بات یہ ہے کہ ایک آدمی کو خط لکھوں اور کسی کو دوں کہ فلاں آدمی کے پاس لے جاؤ۔ وہ جب واپس آئے اور میں اس سے پوچھوں۔ وہ کہے کہ مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ میں نے کہا: کیا بات ہے، اس نے میرا خط قبول نہیں کیا؟ اس نے کہا: نہیں، بلکہ اس نے خط لے کر پھاڑ کر گندی نالی میں پھینک دیا۔ ایمان سے بتائیں! اس وقت میرے دل پہ کیا گزرے گی؟ اور جب تم حضور اکرم ﷺ کی سنت کے بال پر اُسترا پھیر کر گندی نالی میں بہادو تو حضور اکرم ﷺ کے دل پر کیا گزرے گی؟

حضرت شاہ جی ؒ فرمایا کرتے تھے: ہمیں کہنے کی عادت پڑ گئی ہے اور لوگوں کو سننے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ہم کہتے کہتے مرجائیں گے اور یہ سنتے سنتے مرجائیں گے، پرنالہ وہیں رہے گا جہاں تھا۔ لیکن الحمد للہ! ہم سرخرو ہیں، ہم نے اللہ کا فرمان تم تک پہنچا دیا ہے، تم قیامت میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں کسی نے بات پہنچائی نہیں تھی۔ آگے کوئی مانے یا نہ مانے اس کی مرضی ہے۔

میرے آقا ﷺ نے فرمایا: جب بھی اللہ سے جنت مانگو تو جنت الفردوس مانگا کرو۔ کیونکہ وہ سب سے اعلیٰ جنت ہے، ساتواں آسمان اس کی زمین ہے اور اس کی چھت عرشِ معلی ہے۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۲۷۹۰، باب: دَرَجَاتِ الْمُجَاهِدِينَ فِي سَبِيلِ اللهِ]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو لوگ ایمان لے آئے اور اچھے عمل کئے، یعنی جو عمل موافق ہو شریعت محمد مصطفیٰ ﷺ کے، یعنی ہر عمل اچھا نہیں ہوتا۔ جسے تم اپنی عقل سے کہو، وہ عمل اچھا نہیں ہوتا، بلکہ اس عمل کے اچھے ہونے کے لئے شرط ہے کہ وہ حضور اکرم ﷺ کی شریعت کے مطابق ہو۔ مثلاً کوئی آدمی طواف اُلٹا کرے تو اس کا عمل صالح نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہیں ہوگا، کیونکہ وہ شریعت اور حضور اکرم ﷺ کے طریقے کے موافق نہیں۔ اگر کوئی اذان دے، لیکن حضرت بلال رضی اللہ عنہ والی اذان نہ ہو، اس سے پہلے بھی ٹکڑا بڑھا دیا، درمیان میں بھی ٹکڑا بڑھا دیا اور بعد میں بھی ٹکڑا بڑھا دیا تو وہ عمل صالح نہیں ہوگا، کیونکہ وہ شریعت محمد مصطفیٰ ﷺ کے موافق نہیں ہے۔

عبادت میں اخلاص کی ضرورت:

حدیث مبارک کے اندر آتا ہے کہ ہر عمل کے لئے دو شرطیں ضروری ہیں، اگر وہ شرطیں پائی جائیں گی تو عمل قبول ہوگا، ورنہ قبول نہیں ہوگا۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ عمل خالص اللہ کے لئے ہو، اللہ کے سوا کسی غیر کو شریک نہ کرے۔ اگر کہتا ہے کہ یا اللہ!

خیرات تیرے فلاں کے نام پر ہے تو اللہ فرماتے ہیں: اے بندہ! جب تُو ان کو میرا شریک کر رہا ہے تو مجھے ایسی خیرات کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ہے کہ میرے اللہ! خیرات تیرے نام پر ہے، اس کا ثواب ان کو عطا فرما، یہ علیحدہ بات ہے، کیونکہ ثواب دینا تو اللہ کا کام ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ حضور پاک ﷺ کی سنت کے مطابق ہو، اگر چہ چھوٹا سا عمل کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ اس کا بڑا مرتبہ عطا فرما دیتے ہیں۔

تو وہ لوگ جنت والے ہیں، وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا﴾ [النساء: ۱۲۳] نہ تمہاری اُمیدیں کچھ رکھتی ہیں اور نہ اہل کتاب کی اُمیدیں کچھ رکھتی ہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک قاعدہ یہ ہے کہ جو بُرائی کرے گا اس کو بدلہ ملے گا، اس کو جہنم ملے گی، اللہ تعالیٰ کے سوا اس کا کوئی مدد کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔ اور جو آدمی اچھا عمل کرے، چاہے مرد ہے یا عورت ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان رکھنے والا ہو۔ یہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جنت میں داخل کریں گے اور ان پر ذرے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اگر مرنے سے پہلے اسلام قبول کر لیا تو وہ مسلمان ہو گیا۔ بہت سارے لوگ ہوتے ہیں کہ پوری زندگی کفر میں گزر گئی، لیکن آخری وقت مسلمان ہو گیا۔ جس آدمی کو ایمان پر موت آئی اور اس نے عمل صالح کیے، اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے جنت میں داخل فرمائیں گے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور تمام کلمہ پڑھنے والوں کو جنت میں داخل فرمائیں۔

جو کفر کے گھیرے میں آجائے، اس کا انجام:

﴿بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾

[البقرة: ۸۱]

ایسے نہیں ہے جیسے تم کہتے ہو۔ تمنا کرتے ہو کہ ہم جہنم میں نہیں رہیں گے، مگر تھوڑے دن۔ تمہاری یہ بات غلط ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قاعدہ یہ ہے کہ جس شخص نے گناہ کیا اور گناہوں نے اس کا احاطہ کر لیا، وہی جہنم کے

ساتھی ہیں اور وہی جہنم میں رہیں گے۔ ﴿مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً﴾ سے مراد یہ ہے کہ جس نے کفر کیا اور اس کی موت بھی کفر پر آئی ہو۔

مومن گناہ گار کا انجام:

علماء نے لکھا ہے، جیسے اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم نے جنت متقین کے لئے تیار کی ہے۔ اور فرمایا: ﴿وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ [الشعراء: ۹۰] اسی سے معتزلہ کے فرقہ ضالہ کو دھوکا لگا کہ جب جنت متقی لوگوں کے لیے ہے تو جو گناہ کرتا ہے وہ متقی تو نہیں ہے، وہ تو فاسق ہے اور اگر اسی حالت میں مر گیا تو وہ جنت میں نہیں جائے گا، بلکہ جہنم میں جائے گا۔

عقیدۂ اہلسنت والجماعت سلفاً وخلفاً جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ جو آدمی مسلمان ہے اور اس سے گناہ کبیرہ ہوا ہے اور گناہ کی حالت میں ہی مر گیا تو اللہ چاہیں گے تو اس کے گناہ کے بقدر سزا دیں گے اور اگر چاہیں تو وہ سزا بھی نہ دیں اور معاف فرمادیں۔ اللہ قادر ہیں، وہ تو بڑے ارحم الراحمین اور اکرم الاکرمین ہیں، معاف کرنے پر آئیں تو بڑی سی خطاء پر معاف فرما دیتے ہیں، اگر محاسبہ لینے پر آئیں تو چھوٹی سی خطاء بھی معاف نہ کریں۔ کسی فارسی نے فرمایا:

رحمتِ حق بہانہ مے جوید

اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بندوں کو چھوڑنے کے لئے کوئی چھوٹا سا بہانہ چاہتی ہے، وہ تو کہتے ہیں: میرا بندہ کسی حال میں آکر میرے دروازے پر گر جائے تو معاف کردوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اللہ تعالیٰ کے غضب پر سبقت رکھتی ہے، اللہ کی رحمت ہر چیز پر چھا چکی ہے اور اس کی صفت ''الرَّحْمٰن''، ''الرَّحِيْم'' ہے، یہ سب سے بڑا اظہار صفت ہے کہ جب اللہ نے اپنے استقرار عرش کا ذکر کیا تو فرمایا: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰہٰ: ۵] حالانکہ ایسے مواقع پر صفت جبار، صفت قہار، صفت متکبر، کبریاء ان کو زیبا تھی، لیکن وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت والی صفت کا ذکر فرمایا۔

صحیح حدیث میں یہ بات ثابت ہے کہ اللہ نے سو رحمتیں پیدا فرمائیں (ہمارے سمجھانے کے لئے) اس میں سے صرف ایک حصہ (ایک جزء) دنیا میں بھیجی ہے اور ساری مخلوق کو ایک جزء سے حصہ ملا ہے۔ والد اپنی اولاد پر جو رحمت کرتے ہیں، میاں بیوی کی آپس میں جو مودّت اور رحمت ہوتی ہے، جانوروں کو اپنے بچوں سے جو مودّت اور رحمت ہوتی ہے، یہ صرف ایک جزء کا اثر ہے اور ننانوے حصے میں نے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں اور اس کا اظہار

میں قیامت میں اپنے بندوں پر کروں گا۔

[صحيح البخاري، حديث: ٦٠٠، بَابٌ: جَعَلَ اللهُ الرَّحْمَةَ مِائَةَ جُزْءٍ]

جب دنیا میں ایک رحمت کا یہ عالم ہے تو جب وہ ننانوے رحمتیں بھی آجائیں گی تو اس وقت رحمتوں کے دریا بہہ رہے ہوں گے۔ کوئی بدبخت باغی ہی ہوگا جو جہنم میں جائے گا، ورنہ مسلمان جو اللہ کی توحید کا قائل ہے وہ جنت میں جائے گا۔ اس لئے اہلسنت والجماعت نے فرمایا کہ کوئی کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو، وہ جنت میں ضرور داخل ہوگا۔

فاحشہ عورت کی بخشش کا واقعہ:

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ایک فاحشہ عورت جس کی ساری زندگی گناہ میں گزر چکی تھی اور اعلانیہ زنا کرنے والی، اللہ کے قانون کو توڑنے والی عورت تھی۔ ایک مقام سے گزری، پیاس لگی، پانی نکالا، قریب دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے تڑپ رہا ہے تو اس نے وہ پانی خود نہیں پیا، بلکہ کتے کو ڈال دیا کہ میں تو دوسرا پانی نکال لوں گی۔ یہ تو جانور ہے، پانی نہیں نکال سکتا۔ اللہ نے صرف اسی وجہ سے اس کو معاف کر دیا۔ حالانکہ کتا نجس ہے، حلال جانور نہیں ہے۔

[مسند البزار، حدیث: ۸۷۲۵]

اس لئے اسلام نے ہمیں حکم دیا ہے کہ راستے میں کانٹا بھی پڑا ہو تو ہٹا دو۔ شاید اس کانٹے کے ہٹانے کی وجہ سے تیرا مالک راضی ہو جائے۔ اس لئے یہ بھی حکم ہے کہ کوئی اندھا گزر رہا ہو تو اس کو راستہ پار کرا دو، اور کوئی معذور گزر رہا ہو تو اس کا ہاتھ پکڑ لو، کوئی آدمی گرنے والا ہو تو اس کو سہارا دے کر تھام لو، کوئی آدمی بیٹھا ہے، پانی کا گلاس دے کر پلا دو۔ یہ نہ سمجھو کہ یہ معمولی کام ہے، اللہ تعالیٰ تو بخشش کے لئے بہانہ چاہتے ہیں، پتہ نہیں کس معمولی بات پر راضی ہو جائیں۔

علماء اہلسنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ جس آدمی کی موت ایمان اور عقیدۂ توحید پر آئے تو اس کی بخشش ہو جائے گی۔ اگر مشرک ہے تو اس کی بخشش نہیں ہوگی۔ مشرک کا یہ معنیٰ نہیں کہ وہ بتوں کی پوجا کرتا ہو، چاہے بتوں کی پوجا کرے، شمس و قمر کی پوجا کرے، آگ کی پوجا کرے، گنگا جمنا کی پوجا کرے یا کسی قبر کی پوجا کرے، اس کو سجدہ کرے یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا کرے یا حضرت عزیر علیہ السلام کی پوجا کرے، جبرائیل و میکائیل علیہما السلام، فرشتوں کی پوجا کرے، سب شرک ہے۔



﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً﴾ کی تفسیر:

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے معنی یہ کیا ہے کہ اے بنواسرائیل! جس نے بُرے اعمال کئے، جیسے تم کر رہے ہو کہ تم نے ہمارے نبی کو نہیں مانا، انہوں نے بھی نہیں مانا تھا جس طرح تم نے کفر کیا، اسی طرح انہوں نے بھی کفر کیا تھا، چاہے عرب ہو یا عجم ہو، چاہے اہل کتاب ہو یا اُمی ہو، چاہے بنی اسرائیل سے ہو یا بنی اسماعیل سے ہو، کفر نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اس کی کوئی اچھائی نہیں بچی، کیونکہ کافر کے اعمالِ حسنہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اس لیے نتیجہ نکلے گا: ﴿فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ حضرت حسن رحمہ اللہ اور حضرت سدی رحمہ اللہ نے فرمایا: "سَيِّئَةً" سے مراد ایسا گناہ ہے جو کبیرہ ہے، اور بڑے گناہوں میں پہلی چیز شرک ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۱۹، البقرۃ، الآیۃ: ۸۱]

کبائر کی تعداد:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسے گناہ جو بندے کو ہلاک اور برباد کر دینے والے ہیں، وہ یہ ہیں: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، کسی انسان کو ناحق قتل کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، پاکدامن عورت پر تہمت لگانا، میدانِ جنگ سے دشمن کے مقابلہ کے وقت بھاگ جانا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا، جھوٹی قسم کھانا، بیت اللہ میں بے دینی پھیلانا۔

[الجامع الصغیر، حدیث: ۸۷۳۱، بخاری، حدیث: ۲۷۶۶، باب: قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى: إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ...]

بعض علماء نے ستر کبائر لکھے ہوئے ہیں اور بعض نے اس سے بھی زیادہ گناہ شمار کئے ہیں۔ اس کے بارے میں علامہ ذہبی رحمہ اللہ کی ایک کتاب ہے: "الکبائر"، علامہ ابن نجیم کا رسالہ "رسائل ابن نجیم" میں موجود ہے اور اسی طرح ابن حجر مکی رحمہ اللہ کی کتاب ہے: "الزواجر"، اس میں علماء نے ان تمام روایات کو جمع کیا ہے۔

﴿وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ﴾ حضرت ابن جریج رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کا معنی ہے کہ اس کے دل میں بُرائی داخل ہوگئی، کیونکہ ایمان اور کفر کا اصل مقام دل ہے۔ اگر دل ٹھیک ہے تو سب ٹھیک ہے، اگر دل خراب ہے تو سب خراب ہے۔

(واقعہ) حضرت لقمان کے بارے میں لکھا ہے کہ سردار نے ان کو حکم دیا کہ ایک بکرا ذبح کرو اور اس کے بعد کہا کہ اس بکرے کے گوشت کے دو عمدہ ٹکڑے لے آؤ، جو سب سے زیادہ بہتر ہوں۔ حضرت لقمان ایک زبان کا ٹکڑا



اور ایک دل کا ٹکڑا کاٹ کر لے آئے کہ یہ سب سے اچھے ٹکڑے ہیں۔ کچھ دن گزر گئے تو سردار نے پھر حکم دیا کہ بکرا ذبح کرو اور اس کے بعد حکم دیا کہ اس کے اندر جو خراب گوشت کے ٹکڑے ہوں، وہ لے آؤ۔ حضرت لقمان پھر بھی زبان اور دل کاٹ کر لے آئے۔ ان کے سردار نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ جب یہ اچھے ہوں تو ان سے اچھا کوئی نہیں اور اگر برے ہو جائیں تو ان سے برا اور کوئی نہیں ہوتا۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بدن کے اندر گوشت کا لوتھڑا ہے، اگر وہ ٹھیک ہو جائے تو سارا بدن ٹھیک ہو جاتا ہے اور وہ خراب ہو جائے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ فرمایا: سن لو، وہ دل ہے، وہ دل ہے۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۵۲، باب: فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ]

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی مجھے دو چیزوں کی ضمانت دے: ایک زبان اور دوسری شرمگاہ کی کہ ان کو غلط استعمال نہیں کروں گا، اس کی جنت کا میں محمد ضامن ہوں۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۶۴۷۴، باب: حِفْظِ اللِّسَانِ]

﴿وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ﴾ حضرت ربیع بن خیثم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کا معنی ہے کہ جو اس حال میں مر گیا کہ گناہوں پر توبہ نہ کر سکا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے آقا ﷺ نے فرمایا: ''إِيَّاكُمْ وَ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوبِ، فَإِنَّهُنَّ يَجْتَمِعْنَ عَلَى الرَّجُلِ حَتَّى يُهْلِكْنَهُ'' یعنی خبردار! گناہوں سے بچتے رہنا۔ یہ نہ کہا کرو کہ یہ معمولی گناہ ہے، صغیرہ گناہ ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے گناہ جمع ہو کر بندے کو برباد کر دیتے ہیں۔ [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۳۸۱۸]

گناہوں کی مثال:

اس کے لیے حضور اکرم ﷺ نے ایک مثال دے کر سمجھایا کہ کچھ لوگ جنگل میں سفر کر رہے ہوں اور ایک جگہ پڑاؤ ڈالیں کہ ہم کھانا پکا لیں اور وہ سب ساتھی جنگل میں دوڑ پڑیں، کوئی ایک لکڑی لا رہا ہے، کوئی دو لا رہا ہے، کوئی چھوٹی لا رہا ہے اور کوئی بڑی لکڑی لا رہا ہے۔ جب ساری لکڑیوں کو جمع کر کے آگ جلائی تو بہت بڑی آگ بن گئی تو جو کچھ پکانا تھا، پکا لیا۔ جیسے یہ چھوٹی چھوٹی لکڑیاں جمع ہو کر اتنی بڑی آگ کا ذریعہ بن گئیں، اسی طرح تیرے چھوٹے چھوٹے گناہ اکٹھے ہو کر تجھے جلانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

علماء نے اسی حدیث کے ضمن میں فرمایا کہ بڑی لکڑی آگ نہیں پکڑتی، پہلے اس کے نیچے چھوٹی لکڑیاں رکھ کر آگ جلائی جاتی ہے تو آگ بھڑکتے بھڑکتے بڑی لکڑیوں کو بھی لگ جاتی ہے۔ اس طرح بندے کے چھوٹے

چھوٹے گناہ جمع ہو کر جلانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اگر کبھی چھوٹا گناہ ہو جائے تو اس کا علاج اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمایا ہے: ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴾ [ہود: ۱۱۴] میرے بندے! اگر کبھی ایسی غلطی ہو جائے تو اچھے کام کر لیا کرو، ان سے میں تیرے چھوٹے گناہ مٹا دوں گا، اور بھی کبیرہ گناہ ہو جائے تو فرمایا: توبہ کے دروازے بند نہیں ہوئے، جب تک سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع نہیں ہوگا، اس وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ اسی طرح جب بندہ موت کے قریب ہو اور اس کو سکرات الموت لگی ہوئی ہو۔ اب اندر سے خرخر کی آواز آتی ہے، نگلنے کی طاقت نہیں رہی، پانی باہر آ جاتا ہے۔ یہ مقام جب آ جائے تو پھر بھی توقبول نہیں ہوتی، اس لئے پہلے توبہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کو منانے کی کوشش کرو۔

بنی اسرائیل کے لیے فیصلہ کن بات:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۸۲] اور جو لوگ اللہ پر سچا ایمان لے آئے اللہ کے رسولوں پر ایمان لے آئے اور پھر عمل بھی اچھے کئے (یعنی جو عمل سنت کے مطابق ہو وہ عمل اچھا ہوتا ہے اور جو سنت کے مخالف ہو وہ خراب ہے)۔ یہی لوگ ہیں جو جنت والے ہیں اور یہ جنت میں ہمیشہ رہیں۔ تو مطلب یہ نکلا کہ ہر خیر والا اپنے مقام پر ہے اور ہر شر والا اپنے مقام پر ہے۔ اس میں بنی اسرائیل اور غیر کی کوئی تفریق نہیں ہے، بلکہ جو ایمان لے آئے، اچھے عمل کرے، وہ جنتی ہے۔ اور جو کفر پر مرے، وہ جہنمی ہے۔ لہٰذا تمہارا یہ دعویٰ کرنا کہ ہم جہنم میں نہیں جائیں گے یا جہنم میں چند روز جائیں گے، یہ زبانی کلامی دعوے ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ إِلَّا اللّٰهَ ۚ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۸۳]

اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا (کہ) عبادت نہ کرنا، مگر اللہ کی اور والدین سے عمدہ سلوک کرنا اور قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے بھی۔ اور کہو لوگوں کو نیک بات، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ پھر تم (اس عہد سے) پھر گئے، مگر تم میں سے تھوڑے سے اور تم ہو ہی پھرنے والے۔

ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے نواقضات کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ تمہارے ساتھ میرا کوئی عہد نہیں کہ میں تمہیں جہنم میں نہیں ڈالوں گا، بلکہ ہم نے تم سے عہد لیا تھا، تم نے عہد توڑ ڈالا اور اس عہد میں کئی شرطیں تھیں:

پہلی شرط یہ تھی کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے۔ کیونکہ جو اللہ کے سوا کسی غیر کی عبادت کرے گا، وہ مشرک ہے اور مشرک کے لئے نجات کوئی نہیں۔ ﴿لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ نماز، رکوع، سجود، صدقہ و خیرات کرنا عبادت ہے اور دعا مانگنا بھی عبادت ہے، بلکہ فرمایا: ''اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ'' تو دعا بھی صرف اللہ سے مانگنی چاہیے۔

علماء نے لکھا ہے کہ آدمی نماز میں دعا مانگ رہا ہو یا علیحدگی میں دعا مانگ رہا ہو تو اس کی دعا کو دیکھ کر اندازہ لگاؤ کہ اس کا اللہ سے کتنا تعلق ہے؟ بعض آدمی ایک سیکنڈ سے زیادہ ہاتھ کھڑے نہیں کر سکتے، ان کو اللہ تعالیٰ مانگنے نہیں دیتا۔ اور ایک آدمی دعا میں مشغول ہے، گڑگڑا رہا ہے اور اس کا جی نہیں بھر رہا۔ ساری کتابیں آپ پڑھ لیں، ایک جگہ بھی آپ ثابت نہیں کر سکتے کہ کسی پیغمبر نے اللہ کے سوا کسی دوسرے پیغمبر سے مانگا ہو، ایک نبی نے دوسرے نبی سے مانگا ہو یا ایک پیغمبر نے کسی دوسرے پیغمبر کا واسطہ اور وسیلہ پکڑا ہو۔

دوسرا حکم یہ تھا کہ ہم نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ اپنے والدین سے احسان کا معاملہ کرو۔ والدین کا اتنا بڑا مرتبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ احسان کا ذکر فرمایا۔ حالانکہ اللہ کی توحید کے بعد نبوت کا درجہ ہے، لیکن کئی مقامات پر عبادت کے بعد والدین سے احسان کا حکم ہے۔ جیسے: ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ [النساء:٣٦] اور فرمایا: ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا﴾ [الاحقاف:١٥] اللہ نے اپنی عبادت کے بعد اس کو ذکر کیا، کیونکہ حقیقی طور پر پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں اور مجازی طور پر والدین ہیں، اس لئے جب خالق حقیقی کا شکر کرو تو ان کا بھی شکر کرو کہ ان اسباب کے ذریعے تو اس دنیا میں آیا ہے۔ پھر والدین میں سب سے بڑا مرتبہ ماں کا ہے۔

ایک صحابی نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا: حضور! مجھے بتائیں، سب سے زیادہ بھلائی کس کے ساتھ کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ بھلائی کرو۔ صحابی نے عرض کیا: اس کے بعد کس سے کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ماں کے ساتھ بھلائی کر۔ اس نے عرض کیا: حضور! اس کے بعد؟ حضور اکرم ﷺ

[1] [سنن الترمذی، حدیث:٣٣٧١]

نے فرمایا: ماں کے ساتھ بھلائی کر۔ صحابی نے عرض کیا: اس کے بعد؟ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: باپ کے ساتھ بھلائی کر۔

[صحیح البخاري، حدیث: ٥٩٧١، بَابُ: مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ الصُّحْبَةِ]

تین دفعہ اللہ کے نبی ﷺ نے ماں کا نام لیا، کیونکہ وہ تین مرحلوں میں گزری ہے، ایک پیٹ میں اُٹھانے کا مرحلہ، دوسرا ولادت کا مرحلہ اور تیسرا ولادت کے بعد رضاعت کا مرحلہ ہے۔ چونکہ ماں نے تین تکلیفیں برداشت کی تھیں تو حضور اکرم ﷺ نے بھی تینوں مقام ماں کو دیئے اور چوتھے پر باپ کو رکھا۔

والدین کی خدمت:

ایک صحابی نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا: میری ماں بہت بوڑھی ہوگئی ہے اور میں نے اپنی پیٹھ اپنی ماں کے لئے سواری بنائی ہوئی ہے، جہاں مجھے حکم دیتی ہے پیٹھ پر اُٹھا کر لے جاتا ہوں اور میں چوبیس گھنٹے ان کی خدمت کے لئے کھڑا ہوں۔ میرے ہاتھ بھی ان کے لئے ہیں، میری پشت بھی ان کے لئے ہے، میرا جسم و جان بھی ان کے لئے ہے، میرا مال بھی اس کے لئے ہے، کیا میں اپنی ماں کا شکریہ ادا کر چکا ہوں؟ اس نے مجھے دس مہینے اُٹھایا اور مجھے دس سال ہو گئے، اللہ کا شکر ہے اُٹھا رہا ہوں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تم ان کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ وہ جب اُٹھا رہی تھی تو دعا مانگتی تھی: میرا بچہ بڑا ہو، جوان ہو، عالم بنے، عزت والا بنے اور تم اُٹھا تو رہے ہو، لیکن دعا مانگتے ہو کہ جلدی مرے اور میری جان چھوٹ جائے۔ اس کے اُٹھانے اور تیرے اُٹھانے میں بڑا فرق ہے۔

والدین کی ناقدری کے واقعات:

ہمارے معاشرے میں جتنا آج والدین ذلیل ہو رہے ہیں اتنا کوئی ذلیل نہیں ہو رہا۔ مجھے ایک باپ نے خود سنایا کہ میں نے اپنے بیٹے کو جوتیاں سی سی کر پڑھایا...... وہ جوتوں کا کام نہیں کرتا تھا، بڑی قوم کا آدمی تھا...... لیکن مسافر، مزدوری میں سب کرنا پڑتا ہے اور کہا کہ لوگوں کے باغوں میں مالی بھی رہا، سر پر بوریاں بھی اُٹھائیں، لیکن بیٹے کو کہا: تم پڑھو اور تم کوئی کام نہ کرو۔ جب بیٹے کو اعلیٰ تعلیم مل گئی اور کمپنی میں منیجر کے عہدے پر لگا اور گاڑی ملی، بیس پچیس ہزار تنخواہ لگی۔ میں مدتوں کے بعد گیا کہ چلو بیٹے کو بھی مل لوں گا اور اپنا ملک بھی دیکھ آؤں گا۔ میرے پاس ایڈریس تھا اور تو میں کچھ نہیں جانتا تھا، اس ایڈریس پر ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہرحال میں وہاں پہنچ گیا اور وہاں

جا کر کہا: میں نے فلاں صاحب کو ملنا ہے۔ انہوں نے کہا: ٹھہریں، پہلے ہم اجازت لیں گے۔ میں نے کہا: اجازت کیا لو گے؟ میرا بیٹا ہے۔ انہوں نے کہا: صاحب کا آرڈر ہے۔ انہوں نے جا کر اطلاع دی۔ آدھا گھنٹہ تو میں بیٹھا رہا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ باہر تشریف لے آئے اور ان کے ساتھ اور بھی کئی دوست تھے، ان کے ساتھ ہنستا ہوا آیا اور میرے پاس سے گزرنے لگا تو کہا: میں ابھی آتا ہوں۔ دوستوں نے کہا: یہ کون ہے؟ کہنے لگا: نوکر ہے، گاؤں سے ملنے آیا ہے۔ وہ دوستوں کو گاڑی تک چھوڑنے کے لئے گیا۔ میں اسی وقت وہاں سے اُٹھ کر چھپ گیا، ساتھ ایک مسجد تھی، وہاں میں چار گھنٹے تک روتا رہا کہ اس قسم کی اولاد بھی ہوگئی ہے، جو باپ کو نوکر کہتی ہے۔ اس کے بعد میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ میں اس کو ملوں۔ پتہ نہیں اس نے مجھے ڈھونڈا ہوگا یا نہیں ڈھونڈا ہوگا۔ جس نے منہ پر اس طرح کہا، اس نے بعد میں کیا ڈھونڈا ہوگا؟

ہمارے ہاں تو ایسی بھی ناخلف اولادیں موجود ہیں۔ یہاں ایک بڑا آدمی ہے، اس کے باپ کے سر پر اٹیچی کیس ہو اور بیٹا آگے جا رہا ہے۔ حالانکہ والدین کا اتنا بڑا حق ہے کہ اللہ نے اپنے حق کے بعد والدین کے حق کا ذکر فرما دیا کہ میری عبادت کرو اور اپنے والدین کے حقوق بھی ادا کرو۔

یاد رکھیں! جن اولادوں پر والدین ناراض ہیں، وہ اولادیں دنیا و آخرت میں ذلیل ہو جائیں گی۔ چاہے ان کو چند سالوں میں کچھ ترقی مل جائے۔ اور جنہوں نے والدین کی عزت نہیں کی ان کی اپنی اولاد کبھی ان کی عزت نہیں کرے گی۔

ایک دفعہ ایک آدمی میرے پاس روتا ہوا آیا۔ سفید داڑھی تھی۔ میں نے اُٹھ کر اس کو بٹھایا اور پوچھا: کیوں روتے ہو؟ کہنے لگا: آج مجھے میرے بیٹے نے لاٹھیوں سے مارا ہے۔ میرا اور کوئی نہیں تھا، میں نے کہا: چلو آپ کو فریاد سنا دوں۔ میں نے اس کے سامنے اس کے بیٹے کو بلا کر ٹھیک ٹھاک مارا۔ لیکن میں جب اس کو حد سے زیادہ مارنے لگا تو باپ نے اُٹھ کر اُلٹا مجھے پکڑ لیا کہ اس کو معاف کر دیں۔ میں نے کہا: آپ نے ہی تو شکایت کی تھی۔ کہنے لگا: میں نے بھی اپنے باپ کو اسی طرح مارا تھا، مجھے سزا مل گئی ہے۔ میں نے ایک تھپڑ مارا تھا اور مجھے اتنی سوٹیاں کھانا پڑیں۔ یہ تو جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا﴾ [الاحقاف: ۱۵] تم نے اللہ کا وعدہ بھی توڑ ڈالا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا بھی حق ادا نہیں کیا۔ تم اس کے باپ ہونے پر فخر کرتے ہو، وہ تو میرا نبی ہے، تم اس کے کہنے پر چلتے۔ ادھر کہتے ہو

کہ ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کے پیارے ہیں اور ادھر نہ میری عبادت کرتے ہو اور نہ والدین کا حق ادا کرتے ہو۔

والدین کے لیے مغفرت کی دعا کرنے کا اجر:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس آدمی نے پانچ دفعہ نماز پڑھ کر اللہ تبارک وتعالیٰ کے دربار میں سر جھکایا، اس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور پانچ دفعہ جس نے نماز پڑھنے کے بعد اپنے والدین کے لیے بخشش مانگی، اس نے اپنے والدین کا شکر ادا کیا۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ والد یا والدہ جو دعا اپنے بیٹے کے حق میں مانگیں، وہ ایسے ہوتی ہے جیسے کوئی اللہ کا نبی اپنی اُمت کے لیے دعا مانگے۔ روایات میں ہے کہ والد یا والدہ اولاد کو بددعا کر دیں تو وہ بددعا کبھی بھی خالی نہیں جاتی۔

(مسئلہ) حتیٰ کہ فقہاء نے یہ مسئلہ بھی لکھا ہے کہ تم نماز پڑھ رہے ہو اور والدہ نے پکارا اور تمہیں یقین ہے کہ مجھے جماعت مل جائے گی تو نماز توڑ کر ماں کی بات پوری سن لو۔ اسی طرح یہ بھی موجود ہے کہ جن لوگوں پر والدین ناراض ہوتے ہیں، موت کے وقت ان کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں، ان کی زبانوں پر کلمہ جاری نہیں ہوتا۔

والدین کے نافرمان کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بددعا:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہلاکت ہو، ہلاکت ہو، ہلاکت ہو۔ صحابہ نے پوچھا: کس کے لیے یہ بددعا فرمائی؟ ارشاد فرمایا کہ جس کے بوڑھے والدین ہوں اور وہ آدمی (انہیں راضی نہ کر لے) ان سے جنت حاصل نہ کر سکے۔ ایسے آدمی کے لیے بربادی ہو۔ [صحیح مسلم، حدیث:۲۵۵۱]

تو جن کے والدین زندہ ہیں، وہ ان کو راضی کر لیں۔ اور اگر والدین ناراض حالت میں مر گئے تو ان کا بدلہ یہ ہے کہ جو تمہارے والدین کے دوست ہیں ان کے ساتھ بہتر سلوک کرو اور والدین کے لیے دعائیں کرو۔ عبادت کرو، صدقہ جاریہ کرو اور کہیں مدرسہ، مسجد یا ہسپتال قائم کر دو۔

والدین کے ساتھ احسان کا مطلب ہے کہ والدین کی ہر حالت میں اطاعت کرو، جب تک وہ اللہ کی نافرمانی کا حکم نہ کریں۔ اگر تمہارے والدین کافر بھی ہوں تو ان کے ساتھ بھلائی کرو۔

والدین کافر بھی ہوں تو خدمت کے حق دار ہیں:

صحیح احادیث میں موجود ہے، بی بی اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض



کیا: میری والدہ مجھے مدینہ میں ملنے کے لئے آئی ہیں، لیکن میری والدہ مسلمان نہیں ہیں، کیا میں والدہ کی خدمت کروں؟ میں ان کو گھر میں رہنے دوں یا نہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اپنی والدہ کا احترام کرو، وہ کافرہ ہے تو کیا؟ تمہاری ماں تو ہے۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۵۹۷۸، باب: صِلَةِ الْوَالِدِ الْمُشْرِكِ]

اس سے علماء نے مسئلہ نکالا ہے کہ اگر چہ والدین کافر ہوں، پھر بھی اولاد کے لئے ضروری ہے کہ ان کی خدمت کریں۔

حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا زوجہ نبی کریم ﷺ اور اُمہات المومنین میں سے ہیں، ان کے والد ابو سفیان مکہ سے مدینہ آئے۔ بی بی اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے بھی جا کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! میرے والد آئے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ وہ کافر ہیں۔ کیا میں اپنے والد کا احترام کرسکتی ہوں؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: اپنے والد کا احترام کرو، اور یہ ضروری ہے چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔

روایت میں آتا ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے مکہ فتح کرلیا اور طائف کا محاصرہ کیا اور جعرانہ کے مقام پر کنواں کھودا، وہاں پانی کڑوا نکلا۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے پاس پانی کا کوئی انتظام نہیں ہے، ہم نے بڑی محنت سے یہ کنواں کھودا ہے لیکن اس کا پانی کڑوا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کنویں پر تشریف لے آئے اور فرمایا: اس سے پانی کا ڈول نکالو۔ وہ نکالا گیا تو حضور اکرم ﷺ نے اپنا لعابِ دہن اس میں ڈال دیا اور فرمایا: اس پانی کو واپس اس کنویں میں ڈال دو۔ جب پانی کو کنویں میں ڈالا گیا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اب اس پانی کو استعمال کرو۔ صحابہ کہتے ہیں کہ اس جیسا بہترین پانی ہمیں دنیا میں ملا ہی نہیں۔

تقریباً ایک ماہ تک اس جگہ حضور اکرم ﷺ قیام فرما رہے۔ چونکہ غنائم تقسیم کرنے تھے اور طائف کا محاصرہ بھی کر چکے تھے، اسی جگہ سے حضور اکرم ﷺ نے احرام باندھ کر عمرہ بھی کیا۔

صحابہ کہتے ہیں کہ ہم اس مقام جعرانہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بوڑھی عورت لاٹھی ٹیکتے ہوئے آئی۔ جب حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچی تو آقائے نامدار ﷺ نے اپنی چادر مبارک بچھادی، اس بڑھیا کو اس پر بٹھا کر اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوگئے۔ حضور اکرم ﷺ نے اس سے پوچھا: کیسے آئی ہو؟ کیا بات ہے؟ اس بڑھیا نے کہا: میرے قبیلے کے اتنے لوگ قیدی ہیں، ان کو میں چھڑوانے کے لئے آئی ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ ان کو فوراً چھوڑ دو۔ اس بڑھیا نے کہا: حضور! ان کا سارا مال صحابہ لے آئے ہیں، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ

سارا مال بھی لوٹا دو۔ اس کے بعد اس نے کہا: حضور! میرے علاقے کا فلاں کام ہے، حضور اکرم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: وہ بھی کر دو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم حیران ہو گئے۔ ایک بوڑھی سی عورت ہے اور ایسے باتیں کر رہی ہے جیسے حضور اکرم ﷺ کو آرڈر کر رہی ہو اور حضور اکرم ﷺ بھی انکار نہیں فرماتے، بلکہ جو اس کے منہ سے نکلتا ہے، فرماتے ہیں: کر دو۔ جو مانگتی ہے، فرماتے ہیں: دے دو۔

جب وہ چلی گئیں تو ہم نے حضور پاک ﷺ سے پوچھا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ میری ماں تھی جس نے مجھے دودھ پلایا تھا۔ میں اپنی ماں کو انکار کیسے کر سکتا تھا؟

تو رضاعت کی وجہ سے بھی ماں کے وہ حقوق ہیں جو حقیقی ماں کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا شریعت کے اندر یہ مسئلہ ہے کہ ہر حال میں والدین کے ساتھ بھلائی کرو۔ علماء نے اس کا ایک طریقہ یہ بھی لکھا ہے کہ ہر نماز کے بعد والدین کے لئے دعا کرو۔

والدین کی اطاعت کے متعلق واقعات:

ایک مسئلہ یاد رکھیں! والدین کی اطاعت ہم پر ہر حال میں فرض ہے۔ والدین اپنی اولاد کی جائیداد مانگیں، ان کا حق ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''أَنْتَ وَ مَالُكَ لِأَبِيْكَ'' کہ تم اور تمہارا مال سب تمہارے باپ کا ہے۔ اگر ضرورت مند والدین تمہاری پوری جائیداد بھی لینا چاہیں تو ان کو حق ہے۔

اسی طرح شریعت کے اندر بھی یہ مسئلہ ہے کہ والدین اگر غریب ہیں اور بیٹے کو اللہ تعالیٰ نے نوکری دے دی اور پیسہ دے دیا تو والدین کا تمام خرچہ بیٹے کے ذمہ ہے، ورنہ وہ قیامت میں اللہ کے ہاں پکڑا جائے گا۔

میرے آقا ﷺ نے یہ بھی فرمایا: اگر کسی نوجوان پر حج فرض ہو گیا ہے، لیکن اس کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک بوڑھا زندہ ہے، وہ اجازت نہیں دیتے تو جب تک وہ اجازت نہیں دیتے، وہ حج نہ کرے، بلکہ ان کی خدمت میں رہے۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ کے سامنے ایک نوجوان صحابی آئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے سنا ہے کہ آپ فوج بھیج رہے ہیں تو میرا نام بھی ان میں لکھ دیں۔ میں جہاد میں جانے کے لئے آیا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا: تمہارے والدین زندہ ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں! وہ بہت بوڑھے ہیں۔ جب میں آیا تو وہ رو

رہے تھے، انہوں نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی کہ تم جہاد پر نہ جاؤ، ہماری کون خدمت کرنے والا ہے؟ لیکن حضور! میرے جذبۂ جہاد کا یہ عالم ہے کہ میں ان کو روتا ہوا چھوڑ آیا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم واپس جاؤ اور والدین کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب حاصل کرو۔ اور واپس جاؤ، جس طرح تم ان کو روتا ہوا چھوڑ آئے ہو، اسی طرح ان کو ہنساؤ۔ [صحيح البخاري، حديث: ٣٠٠٤، باب: الجهاد بإذن الأبوين]

علماء نے لکھا ہے کہ جس اولاد پر والدین ناراض ہوں، اس کا خاتمہ ایمان پر نہیں ہوتا۔ لیکن خبردار! اگر والدین تجھے مجبور کریں کہ خدا کے ساتھ شرک کرو یا جیسے بعض جاہل والدین اپنی اولاد کو کہتے ہیں: چلو پیر کی قبر پر سجدہ کرو، چلو وہاں نذر و نیاز چڑھانے کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہر بات میں والدین کی اطاعت کرنا، لیکن جو چیز اللہ کے ہاں حرام اور کفر و شرک ہیں، ان میں والدین کی اطاعت نہ کرنا۔ اگر والدین کفر کے لیے جبر کریں، آدمی نہیں مانے گا۔ اگر گناہِ کبیرہ کے لئے کہیں تو نہیں مانے گا۔

جیسے دیہات کے اندر ہوتا ہے، مثلاً آپ کے خاندان میں سے کسی نے زیادتی کی تھی تو والدین بیٹے کو بلا کر کہتے ہیں: تم کیسے نوجوان ہو، تم جا کر ان سے بدلہ لو، ان کی لڑکی اُٹھا لو اور ان کی بے عزتی کرو۔ ایسے معاملات میں والدین کی اطاعت نہیں کی جائے گی، یعنی جو چیزیں اللہ نے حرام اور منع کر دی ہیں، ان میں والدین کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ جب وہ مسلمان ہو گئے، ان کی والدہ بوڑھی تھیں۔ جب ان کو پتہ چلا کہ میرا بیٹا مسلمان ہو گیا ہے تو اس نے بیٹے کو بلایا اور پوچھا: کیا تم اسلام لے آئے ہو؟ انہوں نے کہا: الحمدللہ! میں اسلام لے آیا ہوں۔ ان کی ماں نے کہا: خدا کی قسم! میں کھانا بھی نہیں کھاؤں گی، پانی بھی نہیں پیوں گی، جب تک کہ تم کافر نہ بنو۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بڑی کوششیں کیں اور منتیں کیں کہ اماں جان! تم کھانا کھا لو۔ بولے: تم دھوپ میں کیوں بیٹھی ہو؟ اس نے کہا: میں نے قسم کھالی ہے کہ جب تک تم محمد عربی ﷺ کا دامن نہیں چھوڑو گے، جب تک تم اسلام کو نہیں چھوڑو گے، میں اپنی بھوک ہڑتال کو نہیں چھوڑوں گی۔ اس طرح تیسرا دن بھی ہو گیا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اپنی ماں کے پاس آ کر کہا: اے میری ماں! بات سن لو، اگر تم اسی طرح بیٹھے بیٹھے تڑپتی ہوئی بھی مر جاؤ، تب بھی میں اسلام نہیں چھوڑ سکتا، میں اب جہنم میں جانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

جب ان کی ماں کو یقین ہو گیا کہ بیٹا کسی شکل میں نہیں مانتا تو اس نے بھوک ہڑتال توڑ ڈالی۔

اس لئے اللہ پاک نے قرآن میں حکم نازل فرمادیا کہ خبردار! کسی ایسی بات میں والدین کی اطاعت نہ کرنا جو باتیں اللہ کے حکم کے خلاف ہوں، ورنہ ہر حال میں ہر صورت میں والدین کی اطاعت ضروری ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اگر والدین کافر ہیں، یہودی ہیں، نصرانی ہیں، ہندو ہیں، آغا خانی ہیں یا قادیانی ہیں، ان کی زندگی میں تو دعا کر سکتا ہے کہ یا اللہ! میرے والدین کو ہدایت عطا فرما، میرے والدین کو اسلام کی دولت سے مالا مال فرما۔ لیکن اگر وہ کفر کی حالت میں مر جائیں تو والدین کے لئے بخشش نہیں مانگ سکتا، کیونکہ اللہ نے قرآن میں واضح فرمادیا: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرٰهِيْمَ لِأَبِيْهِ إِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ إِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ أَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرٰهِيْمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيْمٌ﴾ [التوبۃ: ۱۱۴] ابراہیم علیہ السلام اس وقت تک بخشش کی دعا مانگتے رہے جب تک واضح نہیں ہو گیا۔ جب واضح ہو گیا کہ میرا باپ کفر پر مر گیا ہے تو بخشش ختم۔

گریبان کے اندر جھانکیں۔ دیکھیں! کتنے بیٹے ہیں جو والدین کا خیال کرتے ہیں۔ اپنی بیوی کا سب کو خیال ہے، اپنے دوستوں کا سب کو خیال ہے، اپنے ساتھیوں کا سب کو خیال ہے، لیکن ایسی بے حیت اولاد ہے کہ باپ کو خط لکھنا گوارا نہیں کر سکتے۔ ایسی اولاد نے دنیا میں بھی ذلیل ہونا ہے اور آخرت میں بھی ذلیل ہونا ہے۔ جو کچھ تم آج اپنے والدین کے ساتھ کر رہے ہو، اس عاقبت کو جھیلنے کے لئے تیار ہو جاؤ کہ تمہاری اولاد تمہارے ساتھ کیا کرتی ہے۔

والدہ کی بددعا لگنے کا واقعہ:

حدیث میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں جُریج نامی ایک آدمی بڑا عابد و زاہد تھا۔ اس کی زندگی عبادت میں گزر گئی۔ ایک دفعہ والدہ نے کسی کام سے بلایا، دیر ہو گئی، اپنی عبادت میں مشغول رہا۔ جب گیا تو والدہ نے کہا: اتنی دیر سے آیا ہے؟ اس نے کہا: مصروف تھا۔ اس نے کہا: عجیب تمہاری عبادت ہے کہ ماں تجھے بلا رہی ہے اور تم اپنی عبادتوں میں لگے ہوئے ہو۔ ماں نے غصے سے کہا: تم اس وقت تک نہ مرو جب تک تجھے اللہ فاحشہ عورت کے منہ نہ لگا ہے۔

اس کی والدہ فوت ہو گئیں۔ مدت گزر گئی۔ وہ اپنے اس عبادت خانہ میں موجود تھا کہ ایک عورت نے عبادت کے لیے آنا جانا شروع کیا۔ کبھی آ کر مسئلہ پوچھتی اور کبھی آ کر عبادت کا ذریعہ پوچھ لیتی۔ بعض لوگوں نے اسے

اُکسایا اور شیطان نے بھی اس کے دماغ میں خیال ڈالا۔ اس عورت نے ایک چرواہے کے ساتھ بدفعلی کی۔ جب بچہ پیدا ہونے پر آیا تو اس عورت نے قوم کے سامنے تہمت لگا دی کہ یہ جو تمہارا پیر بنا بیٹھا ہے، اس نے میری بے عزتی کی ہے اور یہ بچہ اسی کا ہے۔

شہر والے دوڑ پڑے اور اس کو مارنا شروع کر دیا۔ کسی نے اس کا عبادت خانہ توڑ ڈالا، کسی نے غسل خانہ توڑ ڈالا اور کسی نے گھر کا سامان اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔ اس نے کہا: خدا کے بندو! عقل کرو، میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ انہوں نے کہا: ایک عورت لڑکا لے کر سامنے کھڑی ہے اور کہتی ہے کہ اسی کا لڑکا ہے، اس کے بعد بھی ہم تمہاری بات مانیں۔ اس نے کہا: میں نے یہ جرم نہیں کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میری والدہ نے مجھے بددعا دی تھی اور یہ عورت میرے متھے لگ گئی۔ ماں کے منہ سے جو کلمہ نکلا تھا، اس کی سزا اللہ نے مجھے دنیا میں دے دی ہے۔

[صحيح البخاري، حديث: ۱۲۰۶، بَابُ: إِذَا دَعَتِ الأُمُّ وَلَدَهَا فِي الصَّلَاةِ]

اور ہم نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ اپنے رشتہ داروں سے بھلائی کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے کہ جس آدمی کے رشتہ دار غریب ہوں، اس کو جائز نہیں کہ وہ زکوٰۃ کسی دوسرے کو دے۔

چونکہ رشتے داروں کا حق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار بیان فرمایا ہے۔ آج ہم صرف رشتہ داروں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جو ہمارے ساتھ تعلق رکھیں۔ اگر کوئی رشتہ دار ہم سے تھوڑی سی زیادتی کرے تو ہم ناراض ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو تم سے رشتہ (تعلق) توڑے، تم اس سے تعلق جوڑو۔

[مسند أحمد، حديث: ۱۷۴۵۲]

اور ہم نے تم سے یہ بھی وعدہ لیا تھا کہ جتنے یتیم ہیں، ان سے ہمدردی کرو۔ کہتے ہیں: جس کا باپ نہ ہو اور نابالغ ہو وہ یتیم ہے۔ بالغ ہونے کے بعد آدمی یتیم نہیں رہتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو آدمی مسکین، یتیم بچوں کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے اور یتیموں کی خبر گیری کرتا ہے اور ان کی امداد کرتا ہے، یتیموں کے ساتھ اولاد جیسا سلوک کرتا ہے، قیامت میں اس کا گھر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے قریب ہوگا۔

اس لئے اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یتیم بنایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد آپ کی ولادت سے پہلے ہی فوت ہو گئے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چھ سال تھی، والدہ فوت ہو گئیں۔ ﴿أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝﴾ [الضحیٰ: ۶، ۷] اللہ نے اپنے نبی کو یتیم بنایا، تاکہ یتیموں کے درد کا پتہ چل سکے۔ کیونکہ جس آدمی نے غریبی نہ

دیکھی ہو، خود شاہوں کے گھر میں آنکھ کھولی ہو، اسے ایک غریب کے دکھ درد کا کیا پتہ ہو سکتا ہے؟

(واقعہ) تاریخ کے اندر آتا ہے کہ ایک بادشاہ اپنی بیگم کے ساتھ کسی علاقے میں چلا گیا۔ وہاں غریب لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ان لوگوں نے مظاہرہ کیا اور بڑی فریادیں کیں۔ بادشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا: یہ کیا کہتے ہیں؟ اس نے کہا: غریب ہیں، بھوکے ہیں، کھانے کو نہیں ملتا، روٹی مانگ رہے ہیں۔ ان کی بیگم نے فوری طور پر حکم جاری کیا: اگر ان کو روٹی نہیں ملتی تو ان کو کہیں کہ کیک کھائیں، پیسٹری کھائیں، بسکٹ کھائیں۔

تو ایسے لوگ اس طرح کے فیصلے کرتے ہیں۔ ان کو پتہ نہیں کہ جن کو سوکھی روٹی نہیں ملتی، وہ کیک کہاں سے کھائیں گے؟

ایک بادشاہ کا جنگلی جانوروں میں کمبل تقسیم کرنے کا واقعہ:

مظفر گڑھ میں سیت پور کے علاقے کی بات ہے۔ بادشاہ ایک دفعہ شکار کے لیے نکلے۔ رات کا وقت تھا، گیدڑ بڑی آوازیں نکال رہے تھے۔ بادشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا: یہ گیدڑ کیوں رو رہے ہیں؟ اس نے کہا: ان کو سردی لگتی ہے، کپڑے مانگ رہے ہیں۔ بادشاہ نے آرڈر جاری کر دیا کہ اتنے لاکھ کمبل ان میں تقسیم کیے جائیں۔ وہ لاکھوں کے کمبل وزیروں کے گھروں میں چلے گئے۔ اتفاق سے سال دو سال کے بعد بادشاہ سلامت کو پھر خیال آ گیا۔ رات کو پھر شکار کو نکلا، گیدڑ چیخ رہے تھے۔ بادشاہ نے وزیر سے کہا: ہم نے آرڈر کیا تھا کہ ان کو کپڑے دے دو، یہ تو ابھی تک رو رہے ہیں۔ وزیر نے کہا: جناب! یہ تو خوشیاں منا رہے ہیں، آپ کا استقبال کر رہے ہیں، آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ بادشاہ نے کہا: ہماری طرف سے بھی ان کو ''تھینک یو'' کہہ دینا۔

اسی لئے اللہ اپنے نبیوں کو یتیم پیدا کرتا ہے، چالیس سال تک بکریاں چروا دیتا ہے، تاکہ ان کو تکلیفوں کا پتہ لگے کہ مزدور کیا ہوتا ہے؟ غریب کیا ہوتا ہے؟ اگر ایک بکری بھاگ جاتی ہے تو چرواہے کو کتنا خیال کرنا پڑتا ہے، اس لئے وہ سب کا خیال کرتا ہے۔ جو لوگ ان مراحل سے نہ گزرے ہوں، ان کو یہ باتیں سمجھانے سے نہیں سمجھائی جا سکتیں۔ جس آدمی نے غریبی ہی نہیں دیکھی، اس کو غریب کا کیا پتہ ہے؟ جس نے یتیمی ہی نہیں دیکھی، اس کو یتیم کا پتہ ہے؟ جس بے چارے نے تکلیف نہیں دیکھی، اس کو تکلیف کا کیا پتہ؟

(واقعہ) حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ مسکراتے تھے اور فرماتے تھے کہ جب میں ان لیڈروں کی باتیں سنتا ہوں اور

اسلام کے نعرے سنتا ہوں تو مجھے افسوس ہوتا ہے، میرا دل جاگ جاتا ہے۔ جو آدمی اپنے چھ فٹ کے بدن پر اسلام نافذ نہیں کر سکتا، وہ پورے ملک میں کہاں سے اسلام نافذ کر سکتا ہے؟ لیکن لوگ بے وقوف ہیں، ان کی باتیں مان لیتے ہیں۔

کفر کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور اقسام:

لغت کے اعتبار سے کفر کا معنی چھپانا ہے اور اصطلاحِ شرع میں جامع تعریف یہ ہے کہ اللہ کے پاک پیغمبر جو اللہ کی طرف سے تشریف لائے ہیں، ان کی تصدیق نہ کرنا کفر ہے۔ جو ہمارے پاک نبی حکم لائے، بلکہ سب کا ماننا ایمان ہے۔ یہ نہیں کہ آدھا مانے اور آدھا نہ مانے۔ بلکہ سب پر ایمان لانا ضروری ہے اور ان کی تصدیق نہ کرنے کا نام کفر ہے۔ کفر کی کئی قسمیں ہیں:

1 ...... کفر تکذیب: مثلاً اللہ کے نبی کو جھٹلا دیا کہ یہ نبی نہیں ہیں، یہ تو جادوگر ہے۔

2 ...... کفر استکبار: تکبر کرنا اور بات نہ ماننا، جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا: ﴿أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ [البقرۃ: ۳۴] ابلیس لعین نے انکار بھی کیا تھا اور تکبر بھی کیا تھا۔ انکار کی وجہ تکبر تھا: ﴿قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ﴾ [ص: ۷۶] کہ میں آدم سے بہتر ہوں، آپ نے مجھے آگ سے بنایا ہے اور اس کو آپ نے مٹی سے بنایا ہے۔

3 ...... کفر اعراض: اللہ کے احکام سے روگردانی کرنا۔ اللہ کے نبی دعوت دے رہے ہوں اور یہ منہ پھیر کر چلا جائے۔ اس کو قرآن نے فرمایا ہے: ﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ﴾ [طٰہٰ: ۱۲۴] جن لوگوں نے ہمارے قرآن اور آیات سے اعراض کیا۔

4 ...... کفر نفاق: ﴿وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا﴾ [البقرۃ: ۷۶] کہ جب مسلمان ملے تو کہے ہم تو پکے مسلمان ہیں، ہم تو پکے مومن ہیں، روزہ رکھتے ہیں، تمہارے ساتھ مسجد میں آتے ہیں، حلال کھاتے ہیں، ہم تو پکے مومن ہیں اور جب اپنے شیطانوں، کافروں، سرداروں کے پاس جاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ آج کل تم تو بڑی نمازیں پڑھ رہے ہو۔ کہتے ہیں: ہم تو ان کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ یہ کفر نفاق ہے کہ آدمی ظاہر میں کچھ کرتا ہے اور باطن میں کفر رکھتا ہے، جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقوں کا حال تھا۔



5 ......کفرارتیاب: کہ اللہ کے احکام کے اندر شک ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قیامت آئے گی اور یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں، اللہ فرماتے ہیں کہ جنت اور جہنم ہوگی لیکن یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں، اللہ فرماتے ہیں: عذابِ قبر ہوگا، یہ کہتے ہیں کہ سمجھ نہیں آتا، کیسے ہوگا۔

یہ پانچ قسمیں نہ قرآن پاک میں ذکر کی گئی ہیں اور نہ کسی حدیث پاک میں حضور پاک ﷺ نے نمبر لگائے ہیں۔ علماء و مفسرین اور سلف صالحین نے جو یہ قسمیں لکھی ہیں، انہوں نے قرآن پاک سے استنباط کی ہیں اور انہوں نے کفر کی پانچ قسمیں بنا کر ہمارے لیے واضح کر دیا ہے۔

افضل عمل نماز وقتِ مقررہ پر ادا کرنا:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا کہ سب سے افضل ترین عمل کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی نماز وقت پر ادا کرنا۔ یہ نہیں کہ جب نیند کھلی تو نماز پڑھ لی یا جب موقع ملا تو نماز پڑھ لی، یا اپنے کام کاج سے فارغ ہو گئے تو چلو نماز پڑھ لو۔ بلکہ نماز کو اس کی شروط، حدود، ارکان اور اوقات کے اندر ادا کرنا سب سے افضل عمل ہے۔

[صحیح البخاري، حدیث:۵۲۷، بابُ: فَضلِ الصَّلاۃِ لِوَقتِہَا]

احادیث میں آتا ہے کہ نماز دین کا عمود ہے۔ جیسے عمارت عمود (ستون) پر کھڑی ہوتی ہے، اگر خدانخواستہ وہ عمود گر جائے تو عمارت بیٹھ جائے گی۔ اسی طرح جس نے نماز کا خیال نہیں کیا، گویا اس کا سارا دین تباہ ہوگیا۔

[شعب الإیمان، حدیث:۲۵۵۰]

صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: حضور! اس کے بعد دوسرا عمل بیان فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے والدین کی فرمانبرداری کرو۔ اس صحابی نے پوچھا: اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔ [صحیح البخاری، حدیث:۵۲۷، بابُ: فَضلِ الصَّلاۃِ لِوَقتِہَا]

تعارض بین الاحادیث کے شبہ کا جواب:

بعض احادیث میں جہاد مقدم ہے اور کہیں والدین کی اطاعت کو مقدم ذکر کیا گیا ہے۔ حضور پاک ﷺ نے صلوٰۃ کو مقدم کر دیا۔ یہ احادیث میں تعارض نہیں ہے، بلکہ جیسے دنیا کا کوئی طبیب دوائی دیتا ہے اور ہفتے کے بعد جاتے ہیں تو دوائی میں کچھ ردّ و بدل کر دیتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام ہمارے روحانی معالج ہوتے ہیں، روحانی بیماریاں جو

اصل بیماریاں ہیں، ان کو ہٹانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ اس لئے حضور اکرم ﷺ کے سامنے جو مریض بھی حاضر ہوتا تھا، جس بات کا وہ سوال کرتا، حضور اکرم ﷺ اسی کا جواب دیتے تھے، تاکہ اس کا ساتھ ساتھ علاج بھی ہو جائے۔ یعنی ایک آدمی پکا نمازی ہے، لیکن جہاد میں کمزور ہے تو حضور اکرم ﷺ فرماتے کہ سب سے افضل عمل جہاد ہے، تاکہ اس کا جہاد کا جذبہ برقرار رہے۔ اور ایک آدمی آیا، وہ نمازی بھی ہے اور مجاہد بھی ہے، لیکن والدین کے معاملے میں کمزور ہے۔ اس نے جب آپ ﷺ سے پوچھا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے والدین کی اطاعت کرو۔ لہٰذا یہ احادیث میں تعارض نہیں ہوتا، بلکہ سائل کے حالات کے مطابق علاج ہوتا ہے۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور خلیفہ غلام محمد دین پوری رحمۃ اللہ علیہ:

ایک بہت بڑے، شیخ، عالم، مجاہد گزرے ہیں، حضرت غلام محمد دین پوری رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کا لقب تھا ''خلیفہ''۔ ان کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور اس نے کہا: میں تھانہ بھون جا رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا: حضرت تھانوی کو میرا سلام عرض کریں اور دو تین مسواک دیئے کہ یہ ہدیہ بھی حضرت کی خدمت میں دے دینا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو جب یہ ہدیہ ملا تو بہت خوش ہوئے۔ جتنے خلفاء اور شاگرد موجود تھے، ان سے فرمایا: حضرت خلیفہ صاحب نے مجھے یہ مسواک کا ہدیہ کیوں بھیجا ہے؟ انہوں نے کہا: ہدیہ ہے۔ فرمایا: میں کچھ دنوں سے مستحبات میں غفلت کر رہا تھا تو حضرت نے نصیحت کی ہے کہ خبردار! مستحبات کا خیال رکھو۔ اگر مستحب کو چھوڑ دو گے تو سنت چھوٹ جائے گی اور جب سنت چھوٹ جائے گی تو فرض چھوٹ جائے گا۔ کسی سنت کو چھوٹا خیال نہ کرو کہ مسواک کیا تو کیا، نہ کیا تو نہ کیا۔ کیا مسواک سنت مصطفیٰ ﷺ نہیں ہے؟

شریعت کے اندر مسواک کا اتنا حکم ہے کہ اگر مسواک نہ ہو تو آپ وضو کرتے ہوئے انگلی کو مسواک کے طور پر استعمال کریں، تاکہ مسواک کا ثواب حاصل ہو جائے۔ اس سے ثواب کے کئی درجے (ستر درجے) بڑھ جاتے ہیں۔

مسواک کے فائدے:

علماء نے احادیث کی روشنی میں مسواک کے ستر فوائد لکھے ہیں۔ سب سے چھوٹا فائدہ ہے کہ جو آدمی پابندی سے ہر نماز کے ساتھ مسواک کرے، اللہ اس کا خاتمہ ایمان پر فرما دیتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ سونے سے پہلے مسواک کرتے تھے اور اس کے اندر حکمتیں ہیں۔ چودہ سو سال کے بعد اب جدید تحقیقات یہاں تک آ گئی ہیں کہ ڈاکٹر مجبور کرتے ہیں کہ سونے سے پہلے برش ضرور کریں اور اُٹھتے ہوئے سب سے پہلا کام یہی کریں کہ برش کریں۔ حالانکہ یہ باتیں تو حضور اکرم ﷺ نے ہمیں چودہ سو سال پہلے سکھا دیں اور جو حضور اکرم ﷺ نے مسواک بتایا ہے، وہ کسی تکلف کا محتاج بھی نہیں ہے۔

جدید ٹوتھ پیسٹ کی خرابیاں:

برش کے لیے تو ضروری ہے کہ اس کے ساتھ ٹوتھ پیسٹ بھی رکھیں۔ اگر آدمی متقی ہے تو اس کو خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے اندر خنزیر کے اجزاء ملے ہوئے نہ ہوں۔ آج کل جتنے پیسٹ ملتے ہیں، سو میں سے ننانوے فیصد کے اندر سور کی چربی ہوتی ہے اور نوجوان جتنی کریمیں لگاتے ہیں، یہ سب سور کی چربی سے بنتی ہیں۔ اسی کی وجہ سے چکناہٹ زیادہ دیر تک باقی رہتی ہے اور جتنے خوبصورت صابن ہیں ان سب میں خنزیر کی چربی ہوتی ہے اور مسواک کے اندر کوئی چیز نہیں ملائی جاسکتی۔ جب خراب ہو گیا، اس کو کاٹ دیا تو وہ پھر تازہ ہو گیا۔ مسواک کو آپ مسوڑھوں پر دانتوں پر استعمال کر سکتے ہیں اور برش جو قیمتی ہوتا ہے وہ خنزیر کے بالوں کا ہوتا ہے۔ نہیں تو وہ ربز کا بنا ہوا ہوگا، اور ربز کے ریشے جو اندر بلائیں چھوڑتے ہیں، وہ بیماریاں زیادہ پیدا کرتے ہیں۔

تفسیر:

﴿وَالْمَسٰكِيْنِ﴾ اس کی تفصیلی بحث سورۃ النساء میں آئے گی۔ مسکین وہ لوگ ہیں جن کے پاس اتنا پیسہ بھی نہیں کہ اپنی جان اور اپنے اہل پر خرچ کر سکیں۔

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ [البقرۃ: ۸۳] جب لوگوں سے بات کرو تو نرم رویہ اختیار کرو۔ یہ دعوت ہے۔ اور ایک ہے کہ کہیں برائی دیکھو تو وہاں طاقت استعمال کرو۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: ﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ اس سے مراد ہے کہ لوگوں کو بھلائی کا حکم کرو اور برائی سے روکو اور برداشت کرو۔ اگر لوگ گندی بات کریں تو اعراض کر کے گزر جاؤ، لڑائی جھگڑا نہ کرو۔ ہر وہ قول اور ہر وہ لفظ جس سے اللہ کی رضا حاصل ہو بہتر ہے اور جس سے اللہ کی ناراضگی حاصل ہو وہ بہتر نہیں ہوتی۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کوئی نیکی چھوٹی سمجھ کر چھوڑا نہ کرو (کہ پانی پلانا یہ تو معمولی نیکی ہے، بلکہ

اس کو کرو) اگر کچھ بھی نہ کر سکو تو کم از کم جب اپنے بھائی سے ملو تو خوش ہو کر ملو، (اس طرح نہ ملو کہ آدمی ڈرتا رہے)۔
[صحیح مسلم، حدیث:۲۶۲۶، باب: اسْتِحْبَابِ طَلَاقَةِ الْوَجْهِ عِنْدَ اللِّقَاءِ]

اللہ تعالیٰ کا کروڑ کروڑ شکر ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی اُمت نے بہت ساری چیزوں پر عمل کر کے سنبھال لیا، یعنی جو پہلی اُمتوں نے نہیں کیا اور آپ ﷺ کی اُمت نے کر لیا۔ الحمد للہ!

کافر کو ابتداء بالسلام نہیں کرنی چاہیے:

بعض لوگوں نے عجیب اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ اسد بن وداعہ جب اپنے گھر سے نکلتے تھے تو جو آدمی بھی راستے میں ملتا تھا، چاہے یہودی ملتا یا نصرانی ملتا، اس کو بھی کہتے تھے: السلام علیکم۔ لوگوں نے کہا: یہ کیا کر رہے ہو؟ یہودیوں اور نصرانیوں کو بھی سلام کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا: اللہ نے فرمایا ہے کہ لوگوں سے اچھی بات کرو۔ یہ لوگ ہی تو ہیں چاہے یہودی ہوں یا نصرانی ہوں۔

لیکن صحیحین کی حدیث مبارک ہے کہ کافر کو ابتداء میں سلام نہ کرو۔ اگر وہ تمہیں کچھ کہے تو تم کہو: وعلیک، یوں کہ پتہ نہیں اس نے کیا کہا ہے۔ اگر اس نے اچھی بات کہی ہے تو ہم نے بھی کہہ دیا کہ تم پر بھی ہو۔ اسی طرح اگر کسی کافر کو خط لکھنا پڑے تو اس کے اندر میرے آقا ﷺ کی سنت موجود ہے، آپ ﷺ لکھتے تھے: ﴿وَالسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی﴾[طٰہٰ:۴۷] اللہ کی طرف سے سلامتی اس پر ہو، جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اس لیے صحیح قول یہ ہے کہ کافر پر تم ابتداء میں سلام نہ کرو اور نہ کافر کی تکریم کرو اور نہ کافر سے دل سے محبت کرو۔

یاد رکھیں! ایک ہے معاملات لین دین، تجارت، اُٹھنا، بیٹھنا، یہ کافروں کے ساتھ جائز ہے۔ مثلاً: آپ کسی کمپنی سے مال لیتے ہیں وہ کمپنی کافروں کی ہے یا آپ کسی کمپنی کو مال بیچتے ہیں وہ کافروں کی ہے، آپ کی کمپنی میں کافر ملازم کام کرتے ہیں، کوئی بات نہیں، لیکن دل میں کافر سے محبت کبھی مسلمان کو نہیں ہونی چاہیے۔ اسی طرح کافروں سے معاملات میں آدمی نظر رکھے کہ جتنی حدود ہیں، اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے، اس پر چلے اور جس سے روکا ہے، اس سے رک جائے۔



﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ؗ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؗ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۸۴ تا ۸۶]

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنے خون نہ بہاؤ اور اپنے ایک دوسرے کو اپنے وطن سے نہ نکالو۔ پھر تم نے اس کو قبول کیا اور تم (اپنے اوپر خود) گواہ تھے۔ پھر تم اے یہودیو! قتل کرتے ہو آپس میں اور نکالتے ہو اپنے سے ایک فریق کو ان کے وطن سے، تم ان کے خلاف گناہ اور ظلم کا تعاون کرتے ہو۔ اور اگر وہ تمہارے پاس کسی کے قیدی ہو کر آئیں تو تم ان کا فدیہ دے کر چھڑا دیتے ہو، حالانکہ تم پر ان کا نکال دینا حرام ہے۔ تو کیا تم بعض کتاب کو مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو؟ پس اس شخص کی جو تم میں سے یہ کام کرے کوئی سزا نہیں، مگر ذلت و رسوائی دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں گے، اور اللہ غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلہ میں خریدا، ان سے نہ تو عذاب کو ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔

آیات کا ربط:

اللہ پاک نے ان سے عہد لیا تھا کہ تم خونریزی نہیں کرو گے، کیونکہ جب آدمی اپنے کسی رشتہ دار یا برادری کے آدمی کو قتل کرے تو گویا اس نے اپنے آپ کو قتل کیا۔ دوسرا وعدہ یہ ہے کہ تم کسی پر ظلم کر کے ان کی دیوار، ان کی حویلیوں سے، ان کے وطن سے، ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے، اور تم اقرار بھی کرتے ہو کہ یہ وعدہ تھا، ہمارے آباؤ اجداد سے یہ عہد لیا گیا تھا اور تم گواہی بھی دیتے ہو، لیکن تم نے میرے عہد کو توڑ ڈالا ہے اور خونریزی کی اور ان

کو گھروں سے نکالا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو مشرکین کے دو بڑے قبیلے تھے اور یہودیوں کے بھی دو قبیلے تھے۔ مشرکین کے دو بڑے قبیلے ایک اوس اور دوسرا خزرج تھا اور یہودیوں کے بڑے قبائل ایک بنو قریظہ اور دوسرا بنو نضیر تھا۔ اوس اور خزرج کے اندر بڑی خون ریز لڑائیاں ہوئی تھیں۔ بنو قریظہ، بنو نضیر، بنو قینقاع، یہ یہود تھے۔ ان لوگوں نے آپس میں ایک معاہدہ کیا، بنو قینقاع اور بنو نضیر، خزرج کے حلیف بن گئے اور بنو قریظہ اوس کے حلیف بن گئے۔ ''حلیف'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ جو تمہارے دوست وہ ہمارے دوست اور جو تمہارے دشمن وہ ہمارے دشمن ہیں۔ جو تم سے لڑائی کرے گا ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ جب لڑائیاں ہوتیں تو صاف ظاہر ہے کہ یہودی بھی ایک دوسرے کے خلاف لڑتے تھے، جس سے اللہ نے روکا تھا کہ تم خون نہ بہاؤ اور ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔

اس ساری لڑائی کے بعد جس کا زور چلتا، ان کو اس علاقے سے اور اس قبیلہ سے نکال دیتا اور ان کا مال لوٹ لیتا اور گھر توڑ دیتا۔ اس سب کے باوجود یہودی ایک بات میں بڑے پکے تھے۔ یہود کا کوئی ایک آدمی قید ہو جاتا تو ان کے سارے قبیلے اکٹھے ہو جاتے کہ ہمارے اہل کتاب میں سے ایک آدمی قید ہو گیا ہے، لہٰذا پیسے اکٹھے کرو اور اس کا فدیہ ادا کرو اور اس کو چھڑوا لیتے۔ اگر لوگ ان کو کہتے کہ تمہارا تو جھگڑا تھا؟ تو کہتے: اللہ کا حکم ہے کہ اگر ہماری قوم کا کوئی قید ہو جائے تو اس کو ہم چھڑائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم عجیب لوگ ہو! تمہیں حکم دیا گیا تھا کہ قتل نہ کرو، قتل کرتے ہو۔ تمہیں حکم دیا گیا تھا کہ ان کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور تم نکال رہے ہو۔ لیکن فدیہ دینے کے لئے تیار ہو۔ حالانکہ ان کا نکالنا بھی تم پر حرام تھا تو ان کو نکالا کیوں تھا؟ قتل کیوں کیا تھا؟ اصل وجہ یہی تھی کہ ان کو اللہ کے حکم کی تعمیل نہیں کرنی تھی، بلکہ جو حکم ان کو آسان نظر آتا، اس پر عمل کر لیتے۔ یہ ان کے اپنے نفس کی خواہش تھی کہ جو مزاج کے مطابق لگتا اس کو لے لیتے اور جو حکم مزاج کے مطابق نہ لگتا اس کو چھوڑ دیتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اللہ کے بعض حکموں پر ایمان لاتے ہو اور بعض کو چھوڑ دیتے ہو۔

وجہ یہی ہے کہ جو اس کو پسند آیا وہ مان لیا اور جو دل کو گوارا نہ ہوا اس کو نہ مانا۔ مثال کے طور پر عمرہ بڑی عبادت ہے۔ ایک عمرہ سے دوسرے عمرہ کے درمیان تک اللہ گناہوں کا کفارہ کر دیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

عمرہ گناہوں کو اور فقر کو مٹا دیتا ہے۔ اب ایک آدمی اتنا خرچ کرتا ہے، عمرہ کرتا ہے، مشقتیں بھی برداشت کرتا ہے، اس کو اگر کہیں کہ داڑھی بھی رکھ لے تو کہے گا: دعا کریں۔ اس کا مطلب ہوا کہ عمرہ والا حکم پسند آگیا، جان ماردی، پچیس ہزار لگا دیئے، داڑھی والا حکم پسند نہیں تو اس کو نہیں مانتے۔ حالانکہ دونوں حضور اکرم ﷺ کی سنتیں ہیں کہ ایک سنت سے محبت ہے اور دوسری سے کیوں دشمنی ہے؟ اس طرح یہودیوں میں اور ہمارے میں کیا فرق رہا؟ وہ بھی اسی طرح کرتے تھے کہ جو حکم ان کو پسند آیا اس کو مان لیا اور کر لیا اور جو حکم پسند نہ آیا اس کو نہ کیا۔

اسی طرح ایک آدمی زمیندار ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جائیداد میں بہن، بیٹی کو حصہ نہ دوں۔ اس کو سمجھایا جائے کہ قرآن میں ہے: ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾ [النساء:۱۱] عورت کا بھی میراث میں حصہ ہے۔ تو وہ کہتا ہے: ٹھیک ہے، لیکن ہمارے ہاں رواج نہیں ہے۔ اس کو چونکہ نقصان ہے، اس لئے وہ اس حکم کو نہیں مانتا۔

اسی طرح ایک آدمی کی نوجوان بیٹی بیوہ ہو جائے تو وہ اس کی دوسری شادی نہیں کرے گا۔ کہے گا کہ ہمارے خاندان میں یہ بات عیب ہے۔ غریب تو نہیں ہیں، اللہ پاک نے سب کچھ دے رکھا ہے، کوئی بھوک ننگی تو نہیں ہے، ہم اس کو کھلا سکتے ہیں اور خاوند بھی اتنی جائیداد دے کر گیا ہے کہ گھر میں بیٹھ کر کھا سکتی ہے۔

تم کسی کی بیٹی کو چٹ لکھ کر بھیجو کہ میں تم سے خالص محبت کرتا ہوں، یہ تمہیں پسند ہے۔ اور اگر کوئی تمہاری بیٹی کو ایسا لکھے تو یہ پسند نہیں۔ اس لئے اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ [المائدة:۴۴] جو میرے اُتارے ہوئے قرآن کے قانون کو نہیں مانتا، وہ کافر ہے۔ کیا ہمارے سب کام قرآن کے مطابق ہیں؟

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مرد کے لئے اس کا کپڑا نصف پنڈلی تک ہو، یہ افضل ہے۔ ٹخنوں سے اوپر جائز ہے، نیچے ہو تو حرام ہے اور عورتوں کے لئے فرمایا: ان کا کپڑا پاؤں سے ایک بالشت یا دو بالشت نیچے ہو، تاکہ ان کا چلتے ہوئے پاؤں نظر نہ آئے۔

اب ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ جن کی عورتیں یہاں منی اسکرٹ میں آگئیں اور مردوں کے دامن جوتے کے نیچے آتے ہیں۔ کہتے ہیں: فیشن ایسا ہے۔ اور کچھ لوگ ایسے بن گئے ہیں کہ انہوں نے کہا: پنڈلی پر چادر رکھ لو، مسواک جیب میں رکھ لو تو دنیا میں تمہارے جیسا حدیث پر عمل کرنے والا کوئی پیدا بھی نہیں ہوا۔

گھروں پر پردے لٹکے ہوئے ہوں تو اگر ان کو کہا جائے تو کہتے ہیں: ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ [الضحیٰ:۱۱]

تو یہ سنت کہاں گئی کہ حضور اکرم ﷺ کے گھر میں پردے نہیں تھے۔

حضور اکرم ﷺ نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا تھا کہ کپڑا اس وقت تک نہ بدلا کرو، جب تک ٹاکیاں نہ لگا لو۔ تو کوئی ہے جو اس سنت پر عمل کرتا ہو؟

حضور اکرم ﷺ کا سرہانہ چمڑے کا تھا اور اس کے اندر کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے۔ آج کسی کے گھر کے اندر اس سنت پر عمل ہو رہا ہے؟ حضور اکرم ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا گھر میں چکی پیس کر بچوں کو روٹی کھلاتی تھیں۔ آج کیا گھر کے اندر تمہاری کسی عورت نے بھی چکی پیسی ہے؟ یہ تو ممکن ہے کہ تم سے چکی پسواتی ہو، کیونکہ آج کل خاوند بڑے فرمانبردار ہیں اور اولاد نافرمان۔

کتاب اللہ پر عمل نہ کرنے والے کی سزا:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسے شخص کی سزا کیا ہے جو بعض کتاب پر عمل کرتا ہے اور بعض پر عمل نہیں کرتا۔ اس کی سزا یہ ہے کہ دنیا میں رُسوائی ہے اور آخرت میں سخت عذاب ہے۔ اب ضروری نہیں کہ وہ رُسوائی ہر فرد کو ملے۔ بنی اسرائیل پر ایسا وقت بھی آیا کہ چھ چھ لاکھ بنی اسرائیل ایک دن میں مرے، اور ستر ہزار آدمی ایک دن میں قتل ہوا، ستر ستر ہزار آدمی طاعون کی بیماری سے مرا۔

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۷۴] اگر کوئی یہ کہے کہ نہ ماننے والوں کو عذاب کیوں نہیں ہوتا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں غافل نہیں، میں اس کو جانتا ہوں۔ یہ اللہ کی مرضی ہے کہ اس کو کب پکڑے اور کب سزا دے اور کب سزا نہ دے۔ وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اس کی مرضی ہے۔ بنی اسرائیل یہ ساری حرکتیں کہ کبھی حکم مان لیا اور کبھی حکم نہیں مانا اور کبھی حکم بدل دیا، اس لئے کرتے تھے کہ دنیا کی زندگانی لے لیں اور آخرت کو بیچ ڈالیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر انہوں نے دنیا کو چنا ہے تو ان کو عیش کرنے دو، جب آخرت آئے گی تو نہ ان سے عذاب کو کم کیا جائے گا اور نہ ان کی کوئی مدد کرنے والا ہوگا کہ ان کو عذاب سے بچا سکے۔

عامی کے لیے تقلید اور مجتہد کے لیے اجتہاد لازم ہے:

علماء نے لکھا ہے کہ اگر عالم نے فقہی مسائل میں کسی امام کے قول کو لیا ہے تو اسی پر عمل کرتا رہے۔ اگر وہ عالم اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ افضل، اعلیٰ، اولیٰ کے فیصلے وہ خود سمجھتا ہے، ناسخ اور منسوخ کو سمجھ سکتا ہے تو اس کو کسی کی پابندی

لازم نہیں۔ اگر اتنا عالم نہیں تو کسی کی اتباع میں رہے۔ کیونکہ اگر اپنے آپ کو تقسیم کرے گا کہ کبھی اس پر عمل کر لیا اور کبھی اس پر عمل کر لیا تو آدمی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے۔

(حدیث) ''مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَ تَرَاحُمِهِمْ وَ تَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَ الْحُمَّى''[1] (ایمان والوں کی مثال محبت میں، ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے میں اور ایک دوسرے پر رحم کھانے میں ایسے ہے جیسے کہ ایک نفس ہوں، ایک جان ہوں۔ ساری دنیا کے مسلمان آپس میں ایسے ہیں، ایک جسم ہے۔ اگر پاؤں میں کانٹا بھی لگ جائے تو سارے بدن کو تکلیف ہوتی ہے، سارا بدن رات کو جاگ رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ تکلیف تو صرف پاؤں کو ہوتی ہے۔ اسی طرح مومن بھی گویا یک جان ہیں، مشرق میں مسلمان کو تکلیف ہو تو مغرب میں رہنے والے مسلمان کو تڑپنا چاہیے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو سمجھو کہ ہمارے اندر ایمان کمزور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج مسلمان مختلف مقامات پر رہنے والے علیحدہ علیحدہ مارے جا رہے ہیں، قتل ہو رہے ہیں، عزتیں لٹ رہی ہیں اور باقی مسلمان دل کرے تو دعا کر لی اور بہت زیادہ رحم آیا تو کہہ دیا کہ بہت افسوس ہے، مسلمانوں پر بڑا ظلم ہو رہا ہے، حالانکہ مسلمان کو ایک جسد کی طرح ہونا چاہیے تھا۔ اور جب ایسے ہو جائے گا تو دنیا کی کوئی طاقت ان کو تکلیف نہیں دے سکے گی۔

عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا پادری کو کنیز فروخت کرنے کا واقعہ:

مفسر رحمہ اللہ نے ایک واقعہ نقل فرمایا ہے جو اسباط نے حضرت سدی سے نقل کیا ہے۔ عبد خیر فرماتے ہیں کہ سلمان بن ربیعہ الباہلی کی قیادت میں ہم نے بلنجر کے علاقہ پر حملہ کیا۔ وہاں جا کر ہم نے محاصرہ کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے ہم مسلمانوں کو فتح دی۔ وہاں سے مال بھی حاصل ہوا اور لڑکیاں بھی قیدی بنیں۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی بڑھیا سات سو درہم میں خرید لی۔

اس کو وہ لے کر آئے تو ان کا ایک پادری تھا جس کا نام راس جالوت تھا، عبداللہ بن سلام اس کے پاس آئے اور کہا: میرے پاس ایک یہودی بڑھیا ہے، جسے میں بیچنا چاہتا ہوں، تم خریدو گے؟ اس نے کہا: ہاں! بالکل خریدوں گا۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا: میں نے اس کو سات سو درہم میں خریدا ہے۔ جالوت نے کہا: میں تمہیں چودہ

[1] [صحیح مسلم، حدیث: ۶۷۵۱]

سو درہم دیتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا: میں نے تو قسم کھالی ہے کہ اس کو چار ہزار درہم سے کم میں نہیں بیچوں گا۔ اگر لینا ہے تو چار ہزار درہم میں لے لو، ورنہ میں نہیں دیتا۔ اس نے کہا: چار ہزار درہم بہت زیادہ ہیں، البتہ میں دو ہزار درہم دینے کے لیے تیار ہوں۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا: تم یہودی ہو، تمہیں یہ کنیز جس قیمت پر بھی بیچوں گا، خریدنی ہوگی، ورنہ تم اپنے دین سے بھی کافر ہو جاؤ گے۔ اس نے کہا: وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا: کان ادھر لاؤ، میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں۔ اس نے کان قریب کیا تو حضرت عبداللہ بن سلام نے تورات کی وہ آیت پڑھی جس میں اللہ نے حکم دیا تھا کہ اگر کوئی یہودی یا یہودیہ قید ہو جائے تو ان کا چھڑانا تم لوگوں پر فرض ہے۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، میں چھڑاتا ہوں۔ چنانچہ وہ اندر گیا اور چار ہزار درہم لے آیا اور کہا: لے لو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم عبداللہ بن سلام ہو؟ آپ نے کہا: ہاں! میں عبداللہ بن سلام ہوں۔ اس نے کہا: ورنہ کسی کو تورات کا کیا پتہ کہ اس کے اندر کیا لکھا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا: میں چار ہزار نہیں لیتا، یہ دو ہزار تم واپس رکھ لو اور دو ہزار لے لیے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ دو ہزار پر پادری راضی تھا، چار ہزار تو گویا زبردستی لیا تھا۔ اس لئے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے یہ گوارا نہ کیا کہ مسلمان ایک بیع کرے جو زبردستی کسی سے وصول کی جائے۔

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ نے بھی ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن سلام رأس الجالوت کے پاس کوفہ شہر سے گزرے۔ اور رأس الجالوت کی یہ عادت تھی کہ جو یہودی لڑکیاں عرب مسلمانوں کے پاس قید ہوتیں اور ان کے ساتھ مسلمان مجاہد مل چکے ہوتے تو وہ ان کا فدیہ نہیں دیتا تھا کہ یہ تو اب اس قابل نہیں رہی کہ ہمارے خاندان میں واپس آئے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی مسلمان کا حمل ٹھہرے اور یہ بچہ ہمارے ہاں پیدا ہو۔ پھر تو مسلمانوں کا ایک آدمی ہمارے ہاں پیدا ہو گیا۔ اس لیے وہ ان کو نہیں چھڑواتا تھا۔ لیکن جو لڑکیاں مسلمانوں کی قیدی بن جاتیں، لیکن ابھی تقسیم نہ ہوئی ہوتیں اور نہ کسی مجاہد کو ملی ہوتی تھیں، ان کا فدیہ دے کر چھڑا لیتا تھا۔

عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جب اس پر گزرے تو اس کو کہا: تم تو اپنے مذہب پر عمل نہیں کر رہے۔ اس نے کہا: وہ کیسے؟ فرمایا: تمہیں تو تورات کے اندر یہ حکم ہے کہ ہر قیدی کو چھڑاؤ، چاہے مرد ہو یا عورت ہو۔ وہاں یہ نہیں لکھا کہ جو مسلمان کے گھر میں ہو اس کو نہ چھڑاؤ اور باقیوں کو چھڑاؤ۔ تم تو اپنے دین سے بھی انحراف کر رہے ہو۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، ہم سب کو چھڑاتے ہیں۔

اس لیے اللہ پاک نے یہود کی مذمت کی کہ جو اُن سے اللہ نے وعدے لئے، انہوں نے ان سب کو بدل ڈالا اور

اپنی منشاء پر چلتے رہے۔[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۲۱، البقرۃ: الآیۃ: ۸۵]

تورات میں حضور انور ﷺ کی صفات:

اُمت مسلمہ کے نزدیک یہ قاعدہ ہے کہ نہ تو ہم نے ان کی کسی امانت و دیانت پر اعتبار کرنا ہے اور نہ ہم نے کسی یہودی کی روایت کا اعتبار کرنا ہے۔ اس لئے کتب اسرائیلیہ کی جتنی روایات ہیں، ان کے بارے میں اہلسنت والجماعت سلفا خلفا کا متفق علیہ فیصلہ ہے کہ اگر وہ روایت کتاب اللہ یا سنت رسول ﷺ کے مطابق ہے تو لیں گے اور اگر مخالف ہے تو اس کو رڈ کر دیں گے۔ اور اگر نہ موافق ہے اور نہ مخالف ہے تو "لَا نُصَدِّقُ وَ لَا نُكَذِّبُ" ہم نہ کہیں گے کہ یہ سچی ہے اور نہ کہیں گے کہ جھوٹی ہے، کیونکہ ان لوگوں کا تو یہ عالم ہے کہ انہوں نے اللہ کی تورات کو بدل ڈالا۔ انہوں نے تورات میں ہمارے حضور اکرم ﷺ کی صفات کو بدل ڈالا، حالانکہ حضور اکرم ﷺ کی صفات لکھی ہوئی تھیں کہ آپ مکہ میں پیدا ہوں گے، مکہ میں نبوت کا دعویٰ کریں گے، مکہ میں آپ پر وحی اُترے گی، مدینہ منورہ آپ ہجرت کریں گے، آپ ﷺ نہ بہت زیادہ لمبے ہوں گے اور آپ ﷺ کا قد مبارک چھوٹا ہوگا، بلکہ اعتدال پر ہوگا۔ اور یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ آپ ﷺ کے دو کندھوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوگا اور آپ ﷺ کی پشت پر مہر نبوت کی علامت ہوگی اور آپ ﷺ ہدیہ قبول فرمائیں گے، لیکن صدقہ اور خیرات قبول نہیں فرمائیں گے، یعنی خود استعمال نہیں کریں گے۔ اور یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ حضور اکرم ﷺ جب چلیں گے تو ایسے معلوم ہوگا جیسے اوپر سے نیچے اُتر رہے ہیں اور آپ ﷺ بڑے حلم اور بردباری کے ساتھ چلیں گے۔ حضور پاک ﷺ قمیص نہیں پہنیں گے، حضور پاک ﷺ کبھی کبھی دو چادریں مبارک بھی استعمال فرمائیں گے۔ حضور پاک ﷺ ٹوپی مبارک کے اوپر پگڑی مبارک باندھیں گے۔

یہ تمام عادات وصفات یہودیوں نے اپنی کتابوں سے مٹا ڈالیں، تا کہ لوگ ہماری کتاب پڑھ کر حضور اکرم ﷺ پر ایمان نہ لائیں۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کا قصہ بیان فرمایا، تا کہ سمجھ لیں کہ ان کا اصل دین کیا ہے۔ اللہ نے فرمایا: ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں بھی رُسوائی ہے اور آخرت کے اندر اللہ تعالیٰ ان کو سخت عذاب دیں گے، اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے احکام کی مخالفت کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دی کہ دنیا میں مزے کرو، آخرت کس نے دیکھی ہے؟ فرمایا: ان لوگوں کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جب ہم ان کو

قیامت کے دن جہنم میں ڈالیں گے تو ان کو یہ ہوگا کہ ایک دن کی چھٹی مل جائے، عذاب میں خفت آ جائے۔ ایسا بالکل نہیں ہوگا اور نہ قیامت میں ان کا کوئی مددگار ہوگا جو ان کی مدد کر کے ان کو جہنم سے چھڑا لے۔

یہی بات ذہن میں رکھ لیں! اصل جزا، سزا کا مقام آخرت ہے، دنیا نہیں ہے۔ دنیا مسافر خانہ ہے، اصل فیصلے، اصل کامیابیاں، اصل جزا، اصل سزا، جنت، جہنم۔ یہ سب عالم آخرت میں ہوں گے۔ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دار الجزاء ہے، یہاں اللہ پاک سزا یا انعام کا کبھی تھوڑا سا نمونہ دکھا دیتے ہیں۔

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿٨٧﴾﴾ [البقرۃ:۸۷]

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) دی اور ان کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو صریح معجزات دیئے اور ہم نے ان کو روح القدس (جبرئیل) کے ساتھ قوت دی۔ کیا جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول آیا ایسے احکام کے ساتھ جن کو تمہارے نفس پسند نہ کرتے تھے، تم نے تکبر کیا، پھر ایک جماعت کو تم نے جھٹلایا اور ایک جماعت کو تم نے قتل کر دیا۔

ایمان کی اہمیت:

اللہ پاک نے ایک قاعدہ وضابطہ بیان فرمایا کہ جو آدمی ایمان لایا اور اچھے عمل کیے اور ایمان پر مر گیا تو اس کے لئے دائمی جنت ہے اور جس نے کفر کیا اور کفر پر ہی مر گیا تو اس کے لئے ہمیشہ کے لئے جہنم ہے۔ نہ اس میں بنی اسرائیل کے لئے کوئی خصوصی رعایت ہے اور نہ دوسری اقوام کے لئے۔ اور نہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی نسب فائدہ پہنچائے گا اور قرابت، رشتہ داری فائدہ پہنچائے گی، جب تک ایمان نہ ہو۔

تمام دنیا کی تاریخ پر نظر دوڑا کر دیکھ لیں کہ حضرت آدم علیہ السلام پہلے خلیفۃ اللہ فی الارض ہیں۔ ان کے دو صلبی بیٹے ہیں: ایک قاتل ہے اور ایک فرمانبردار ہے۔ قاتل جہنم میں گیا اور فرمانبردار جنت میں گیا۔ تو اس کو آدم علیہ السلام کی وجہ سے رعایت نہیں ملے گی، اللہ کے قانون میں ایسی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سب سے پہلے رسول نبی ہیں،

ان کا بیٹا کافر تھا، اس کو حضرت نوح علیہ السلام کی وجہ سے رعایت مل جائے کہ نبی کا بیٹا ہے، ایسا نہیں ہوگا۔ لوط علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، ان کی بیوی کافرہ ہے، اس کو پیغمبر کی وجہ سے رعایت مل جائے، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اللہ کا ایک نظام ہے، وہ مالک الملک ہے، وہ خالق کائنات ہے، وہ غنی ہے، ساری دنیا اس کی محتاج ہے۔ انہوں نے ایک قانون بنا دیا ہے کہ ایمان پر مرو گے تو جنت ہے، کفر پر مرو گے تو جہنم ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اللہ دولتِ ایمان بھی نصیب فرما دے اور اللہ کے نبی کے ساتھ بھی تعلق ہو تو شان زیادہ ہے۔ جیسے دنیا کی ایک عام عورت ہے اور ایک نبی کی بیوی ہے۔ تو جو نبی کی بیوی کا مرتبہ ہے یا نبی کی بیٹی کا مرتبہ ہے، وہ اُمت کی عام عورتوں کا مرتبہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک آدمی سید ہے، اس کا سلسلۂ نسب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے، سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے یا سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے یا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے اور اس کے بعد وہ ایمان والا بھی ہے اور اعمالِ صالحہ بھی کرتا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ ہم سے افضل ہے، کیونکہ اس کو رشتہ داری کی وجہ سے بھی شرف مل رہا ہے جو کسی غیر رشتہ دار کو نہیں ملتا۔ لیکن اگر پہلی شرط اور پہلی کڑی ہی ٹوٹ جائے تو زنجیر جڑ نہیں سکتی۔ پہلی کڑی ایمان ہے، اگر وہ حلقہ، وہ کڑی ہی ایمان والی ٹوٹ گئی تو پھر نبی کے ساتھ کیا رشتہ؟

مقامِ بدر میں جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تھا: یہ سردار ہیں، مکہ کے سردار ہیں، قید ہو گئے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ان کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ ہم ان کو قتل کر دیں یا ان کو قید میں ڈال دیں یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں یا بغیر فدیہ کے چھوڑ دیں؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میری رائے تو یہ ہے کہ تلوار سے ان کی گردن اُڑا دیں۔ جب انہوں نے آپ کا کلمہ نہیں پڑھا اور آپ کی نبوت پر ایمان نہیں لے آئے تو رشتہ داری کس بات کی ہے؟ آپ مجھے حکم دیں، میں اپنے رشتہ داروں کی گردن اُڑاتا ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیں، وہ اپنے رشتہ داروں کی گردن اُڑائیں۔ جن جن کے رشتہ دار ہیں، وہ تلوار لے کر ان کی گردن اُڑا دیں۔

[صحیح مسلم: ۱۷۶۳، باب: الإمداد بالملائكة في غزوة بدر وإباحة الغنائم]

یہی رشتہ داری والا دھوکا یہودیوں کو لگا ہوا تھا اور آج ہمارے جاہلوں کو لگا ہوا ہے اور علماءِ سوء مبتدعین جو بدعت کے امام ہیں، وہ بھی ان کو اس اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہیں، تاکہ ہمارا کاروبار چلتا رہے۔ اور ذہنوں کے اندر یہ بات بٹھائی ہوئی ہے کہ یہ سادات ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ہیں، عمل اچھے ہوں یا نہ ہوں، کیا فرق پڑتا ہے؟ یہی نظریہ ہمارے لوگوں نے دماغ میں ڈال دیا کہ مرشد ہے، اس کا باپ بڑا ولی تھا، حضرت خواجہ معین

الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہے، حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہے، یہ حضرت جیلانی محبوب سبحانی کی اولاد میں سے ہے، یہ حضرت بہاء الحق ملتانی کی اولاد میں سے ہے، یہ حضرت گنج شکر کی اولاد میں سے ہے، ان کے بڑوں کا بڑا مقام تھا۔ ان کو بھی خالی نہ سمجھو، ان کی وجہ سے ہم چھوٹ جائیں گے۔ وہی یہودیوں والا ذہن ہے۔ وہ بھی کہتے تھے: ﴿نَحْنُ أَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَأَحِبّٰٓؤُهٗ﴾ [المائدۃ:۱۸] حالانکہ مسئلہ واضح ہے کہ ابولہب، ابوطالب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں، ابوجہل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رشتہ داری رکھتا ہے، یہ بھی جہنم میں چلے گئے۔

تو جن کا ڈائریکٹ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق تھا وہ تو جہنم میں چلے جائیں اور ہم مرشد در مرشد کے دامن کو پکڑ کر جنت میں چلے جائیں گے۔

آپ ایک مسجد بنائیں، سونے چاندی کی اینٹیں لگا دیں، کروڑوں روپے لگا دیں۔ اگر اس مسجد کا رخ قبلہ کی بجائے دوسری طرف کر دیں تو نماز نہیں ہوتی۔ حالانکہ مسجد بڑی خوبصورت اور شاندار ہے۔ چونکہ اس کا رخ قبلہ کی طرف نہیں، اس لئے وہ مسجد نہیں کہلا سکتی۔ اور اگر کسی کا رخ توحید و رسالت کی طرف نہیں آتا تو بھی مسلمان نہیں کہلا سکتا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے وقت جو آیات پڑھی تھیں، یہ تھیں: ﴿إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [الانعام:۷۹] ﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ [الانعام:۱۶۳] میرے اللہ! میں اپنا رخ تیری طرف کر رہا ہوں، تُو ہی آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والا ہے۔ میرا اللہ! میں تمام کو چھوڑ کر خالص تیرے دامن کو پکڑنے والا ہوں اور مجھے مشرکین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے اللہ! میں اقرار کرتا ہوں کہ میری عبادت بدنی، میری عبادت مالی، میری نمازیں، میری زندگی، میری موت سب تیرے لئے ہے اور تُو ہی رب العالمین ہے اور تیرا کوئی شریک نہیں ہے اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ الحمد للہ! ہم جس طرح محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہیں، اسی طرح صحابہ و اہل بیت، اولیاء اللہ کے بھی پیروکار ہیں، لیکن ان کی پیروی کتاب و سنت کے حکم کے مطابق ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے ایک قاعدہ ضابطہ بتا دیا ہے کہ اگر کسی پیغمبر کا بیٹا اپنے کفر کی وجہ سے جہنم سے نہیں بچ سکتا اور تم بے وقوف ہو کہ ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی تم کہتے ہو کہ ہم حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، اس لئے جنت میں چلے جائیں گے۔ تمہارے یہ دعوے جھوٹے ہیں کہ اللہ نے ہم سے عہد کیا ہے۔ بلکہ اللہ نے جو تم سے وعدے لئے تھے، تم نے وہ بھی توڑ ڈالے ہیں۔

تحقیق ہم نے دی موسیٰ کو کتاب تورات.......... اور پھر بنی اسرائیل میں تقریباً چار ہزار نبی آئے، ان سب کو کوئی نئی کتاب نہیں دی گئی، وہی کتاب تورات کا حکم کرتے تھے اور اسی پر وہ چلتے تھے۔ پھر تورات کے بعض احکام منسوخ ہوئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل ہوئی۔ وہ بھی جامع کتاب تھی۔ قرآن مقدس میں انجیل کا ذکر متعدد مقام پر آیا ہے، کسی مقام پر زبور کا ذکر آیا ہے، لیکن زیادہ تورات کا ذکر آیا ہے۔

حضور اکرم ﷺ مقامِ نخلہ پر صبح کی نماز پڑھا رہے تھے، جن وہاں سے گزرے اور انہوں نے قرآن سنا تو کہا: ﴿يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى﴾ [الاحقاف:۳۰] حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی گزر چکے تھے، لیکن جنات نے موسیٰ علیہ السلام کا نام لیا۔ کیونکہ یہ جامع شریعت تھی، اس لئے انہوں نے اس کا ذکر کر دیا کہ تورات میں ہمیں ایسے الفاظ سنائی دیئے تھے یا حضور اکرم ﷺ کی زبانی سنائی دیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا کلام پڑھ رہے ہیں۔

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ﴾ جہاں اس طرح کا جملہ ہو کہ واؤ، لام، قد، ہو اور اتیان کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو معنی ہوتا ہے: ''پکی بات ہے'' ہم نے موسیٰ کو کتاب دی ہے۔

﴿وَقَفَّيْنَا﴾ کا معنی ہے: کسی کے نقش قدم پر چلنا۔ جیسے ہم نے ان کے پیچھے متواتر اپنے رسول بھیجے، یعنی ہمارا کتنا بڑا احسان ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام جیسا رسول بھیجا، جن کو ہم نے کلام کا شرف بخشا تھا کہ بغیر کسی واسطے کے ہم نے موسیٰ سے کلام کیا تھا اور اس کے بعد ہم نے تمہاری بہتری کے لئے پے در پے متواتر رسول بھیجے۔

﴿وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ماں کی طرف کی جاتی ہے، ورنہ دنیا میں ہر اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ قیامت میں ماں کی طرف نسبت جائے گی۔ یہ غلط بات ہے، یہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے: ﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [الاحزاب:۵] کہ جب کسی کو بلاؤ تو اس کے باپ کی طرف نسبت کر کے بلاؤ۔ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ماں کی طرف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بغیر باپ کے پیدا کیا تھا۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۱۲۲، البقرۃ:الآیۃ:۸۷]

حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید:

﴿الْبَيِّنٰتِ﴾ کا معنی ہے: واضح کھلی ہوئی دلیل۔ ﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ پھر ہم نے عیسیٰ کی حفاظت کی

جبرائیل کے ساتھ، جن کا لقب ''روح القدس'' ہے۔ اور جبرائیل علیہ السلام کا لقب روح، رسول کریم، روح الامین بھی آیا ہے۔ اللہ نے فرمایا: ہم نے عیسیٰ کی مدد روح القدس کے ساتھ کی، کیونکہ تم حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو مارنے کی بجائے ان کو قتل کے درپے ہو گئے تھے تو ہم نے جبرائیل کو بھیجا، جو ہر وقت ان کے ساتھ رہے اور ان کی حفاظت کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیدا ہونے سے آسمانوں پر اُٹھائے جانے تک حضرت جبرائیل علیہ السلام کا پہرہ ساتھ ہوتا تھا، ورنہ تم تو ہر جگہ ان کو قتل کرنے پر تیار تھے۔

﴿أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ﴾ [البقرۃ:۸۷]

تمہارے پاس جب بھی کوئی رسول آیا، جب بھی میرا پیغمبر آیا اور ایسا حکم لایا جو تمہارے نفسوں کی خواہش کے مطابق نہیں، تمہیں پسند نہیں تو تم نے تکبر کر لیا اور اکڑ گئے کہ ہم نہیں مانتے اور تم نے ان رسولوں کی ایک جماعت کو جھٹلایا کہ تم جھوٹے ہو، ہم تمہاری نبوت کو نہیں مانتے اور رسولوں کی ایک جماعت کو قتل کرتے ہو۔

﴿كَذَّبْتُمْ﴾ ماضی کا صیغہ ہے اور ﴿تَقْتُلُونَ﴾ مضارع کا صیغہ ہے۔ ماضی کا صیغہ اس لئے آیا کہ جن کو تم جھٹلا چکے ہو، وہ بات ختم ہوگئی، وہ گزر گئے، اور مضارع کا صیغہ آگے آیا کہ اب بھی تو تم نبی کو قتل کرنا چاہتے ہو۔ جیسے قرآن نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾ [البقرۃ:۶۱]

اور ایک روایت میں ہے کہ ایک ایک دن میں ستر انبیاء علیہم السلام کو قتل کر ڈالا، کیونکہ ایک ایک قوم اور ایک ایک قبیلہ کے لئے نبی آتے تھے، ایک ایک بستی کے لئے نبی آتے تھے۔ یہ بدبخت ایسے تھے کہ ان کو قتل کر دیتے تھے۔ اور اللہ پاک نے مضارع کے صیغہ سے اشارہ کر دیا کہ تمہارے باپ دادا کے قتل کرنے والی عادت ابھی تمہارے اندر موجود ہے، جیسا کہ حدیث میں موجود ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہود کے علاقے میں تشریف لے گئے تو انہوں نے اوپر سے پتھر پھینک کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی سازش کی۔ تو کیا انبیاء کو جھٹلا کر اور ان کو قتل کرنے کے بعد اب بھی تم یہ اُمید کرتے ہو کہ تم چند دن جہنم میں رہو گے اور پھر نکل جاؤ گے؟ [تفسیر ابن کثیر:۱/ ۱۲۲، البقرۃ: الآیۃ:۸۷]

نبی اور رسول کی تعریف:

﴿وَقَفَّيْنَا مِن بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ﴾ رسول کی مشہور تعریف یہ ہے جو صاحب کتاب اور صاحب شریعت ہو۔ اور نبی وہ ہوتا ہے جس کے لئے علیحدہ کتاب یا شریعت نہیں ہوتی، بلکہ وہ کسی شریعت اور کتاب کے تابع ہوتا ہے۔ یہاں اللہ

تعالیٰ نے فرمایا: اس کے بعد ہم نے رسول بھیجے، حالانکہ تورات کے بعد کوئی ایسی کتاب نازل نہیں ہوئی، اور جب کتاب نازل ہوئی تو رسول بھی صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے۔

بعض علماء نے فرمایا: کبھی اس لفظ سے مقصود پیغام دینے والے، رسالت کا حق ادا کرنے والے ہوتے ہیں، اصطلاحی معنی مراد نہیں ہوتا کہ نئی شریعت لے کر آئے، جیسے قرآن میں آتا ہے: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝﴾ [بنی اسرائیل:۱۵] ہم کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتے، جب تک ہم اپنا رسول ان کے پاس نہیں بھیج دیتے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں چار ہزار نبی گزرے ہیں۔ جیسے کبھی لفظ ''اسلام'' آجاتا ہے اور کبھی لفظ ''ایمان'' آجاتا ہے، اسی طرح کہیں ''رسول'' کا لفظ ہے اور کہیں ''نبی'' کا لفظ ہے، کیونکہ یہ ایک دوسرے کے معنی کے اندر استعمال ہوتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام واضح اور کھلی نشانیاں لائے، اگر عام آدمی بھی غور کرے تو عقیدۂ توحید سمجھ لے۔

تائید بروح القدس کا معنی:

﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ تائید کا معنی یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت مریم علیہا السلام کے پاس جبرائیل علیہ السلام تشریف لے کر آئے اور انہوں نے پھونک ماری۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ بی بی مریم علیہا السلام اللہ تعالیٰ کی قدرت سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ حاملہ ہوگئیں۔

اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ تخلیق ایک چیز سے نہیں بنایا۔ آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا، کیونکہ مٹی تو پیدا کرتی ہے اور آگ تو جلاتی ہے۔ ہم نے آگ سے بھی ایک مخلوق پیدا کردی اور ہم نے پانی سے بھی مخلوق پیدا کردی۔ اور اگر پھر اسی مادے کو ہمیشہ کے لئے پیدا کرنے کا ذریعہ بنا لیا جاتا تو قوم اسی میں اُلجھ جاتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اس مادے کے بغیر بھی پیدا کردیا۔ آج دنیا علوم کی ترقی کے عروج پر پہنچی ہوئی ہے، اس کے باوجود ڈاکٹر اس کے محتاج ہیں کہ مرد اور عورت کے مادہ منویہ کو لے کر ملائیں گے اور جوڑے بنیں گے، پھر جا کر بچہ پیدا ہوگا اور یہاں جوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بی بی مریم علیہا السلام (جنس) انسان سے تعلق رکھتی ہیں اور ملائکہ جنس نور سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی جنس بھی آپس میں نہیں ملتی۔ بی بی مریم علیہا السلام ماں باپ سے پیدا ہوئیں اور جبرائیل علیہ السلام امر ''کُن'' سے پیدا ہوئے۔



اللہ کی شان دیکھیں! جو پھونک حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ماری تھی، کسی بندے کو بھیج دیتے یا کسی عبد صالح کو بھیج دیتے کہ تم جا کر پھونک مار دو، لیکن اس طرح دشمن بی بی مریم علیہا السلام کے کردار پر حملہ کرتے۔ چنانچہ اللہ نے پھونک مارنے کے لئے اس ذات کو بھیجا جو گناہوں سے پاک ہے۔ کوئی وہم، شک اور ذہن کے اندر گندا خیال لا ہی نہیں سکتا۔ اس لئے جب حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور بی بی مریم علیہا السلام نے ان کو دیکھا تو چیخ پڑیں۔ آج کی عورت تو نہیں تھیں۔

آج کی عورت تو بڑی معزز اور مکرم شمار ہوتی ہے جو سوشل، غیر مردوں سے ہاتھ ملاتی ہو، غیر مردوں کے ساتھ فلور پر ڈانس کر سکتی ہو، ہوٹلوں میں پھرتی ہو، لیکن اسلام کی نظر میں ایسی عورتوں کی کوئی حیثیت نہیں، اسلام کے اندر عورت کا ایک مقام ہے۔ وہ ماں، بیٹی، بہن، بیوی ہوتی ہے، اس کے علاوہ اسلام میں پانچواں رشتہ ہی نہیں ہے اور اسی کے اندر اس کا مقام ہے، اللہ نے اس کو عظمت دی، نبیوں کی ماں بنایا، اسے تسکین و موّدت و رحمت کا ذریعہ بنایا۔ اللہ نے اس کو اتنی شان دی ہے کہ اللہ نے پورے قرآن کی ایک سورت کا نام اس "عورت" کے نام پر رکھا ہے۔

اسلام عورت کی عظمت کو گھٹاتا نہیں، لیکن اس کی حدود ہیں۔ جب حدود سے کوئی تجاوز کرے تو وہ خود اپنے آپ کو گڑھے میں ڈالتا ہے۔ اسلام کی حدود کے اندر رہیں تو عظمت ہے۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا پر نظر ڈالیں، اور وہ عورتیں جو عظیم محدث، مفسر گزری ہیں، اللہ کی اولیاء بی بی رابعہ بصریہ گزری ہیں، اس طرح بی بی مریم علیہا السلام گزری ہیں، امراۃ عمران گزری ہیں، بی بی آسیہ گزری ہیں۔ ان کی عظمتوں کا یہ عالم ہے کہ ابھی حضور اکرم ﷺ دنیا میں ہیں اور خوش خبری دی جاتی ہے کہ ہم آپ کی بی بی آسیہ، بی بی مریم سے شادی کریں گے۔

بی بی مریم علیہا السلام کی جب حضرت جبرائیل علیہ السلام پر نظر پڑی تو بول پڑیں: ﴿إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا﴾ [مریم:۱۸] خبردار! غیر مرد ہو، میرے قریب نہ آؤ اور میں اپنے اللہ کے نام رحمٰن سے پناہ مانگتی ہوں، تم اگر اس رحمٰن کو ماننے والے ہو تو تم بھی رحم کرو۔ کنواری، باعزت لڑکی کے قریب نہ آؤ۔

آج کی تہذیب کے تقاضے آپ جانتے ہیں، ہم مولوی لوگ ہیں، پرانے لوگ ہیں، آپ تو وی۔ سی۔ آر۔ پر بیٹھنے والی قوم ہیں، ہماری جدید نسل ایٹمی اور جدید ترقیاتی نسل ہے۔ میں نے ایک میگزین میں عورت کے بارے میں پڑھا۔ اس نے لکھا کہ میری لڑکی کی عمر آٹھ سال ہے، میرے ذہن میں آیا کہ بیٹھ کر اس سے جنسی موضوع پر بات کروں اور اس کو سمجھاؤں کہ جنس کیا ہوتی ہے۔ جب میں نے اس سے اس موضوع پر بات کی تو وہ مجھ سے زیادہ

اس میں سمجھدار نکلی۔

جدید دور کے لوگ ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جہنم میں جائیں یا کہاں جائیں۔ آج ہم سب جہنم کے کنارے پر کھڑے ہیں۔ اللہ نے نکال لیا تو ٹھیک، ورنہ بچنے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ خشکی و بری، ہواؤں اور فضاؤں میں فساد پھیل چکا ہے۔ عقیدے بھی برباد ہیں، عمل بھی برباد ہیں، افکار بھی برباد ہیں۔ نام کا اسلام رہ گیا ہے، تاکہ ہم اسلام کو بدنام کرسکیں۔ اللہ قادر ہیں، اس سے دعا کریں کہ وہ ہمیں اس غار ہلاکت سے نکال دے۔ قوم یونس جب اللہ کے دروازے پر گئی تو اللہ کو رحم آ گیا، آیا ہوا عذاب ٹل گیا۔ اللہ ہم سب سے بھی عذاب کو ٹال دیں اور ہم کو بچالیں۔ وہ قادر ہیں، ورنہ ہم اپنی طرف سے اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ فصل پک چکی ہے اور کٹنے کا وقت آ چکا ہے۔

اس کا علاج یہ ہے کہ جس طرح ہم اجتماعی طور پر گناہوں میں مبتلا ہو گئے ہیں، اسی طرح اجتماعی طور پر اللہ کے آگے توبہ کر کے اس کے دروازے پر گر جائیں، اپنی ناکامیوں پر غور کریں اور فرد جرم بنا کر ایک ایک پر ندامت کا احساس دلائیں اور اللہ کے آگے گر جائیں۔ وہ رحیم و کریم ہیں، اسلام کی اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو نکال لیں گے اور کنارے پر لگا دیں گے۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ان سے کہا: ﴿إِنَّمَآ أَنَا۠ رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَٰمًا زَكِيًّا﴾ [مریم:۱۹] میں تو تیرے رب کا قاصر ہوں، مجھ سے ڈرنے کی کیا بات ہے؟ میں فرشتہ ہوں اور دور کھڑے ہو کر پھونک ماردی اور عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔

﴿وَأَيَّدْنَٰهُ بِرُوحِ ٱلْقُدُسِ﴾ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو شیطان مس کرتا ہے، یعنی ہاتھ لگاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مس شیطان سے محفوظ رکھا۔ اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ''روح'' اس لئے کہا گیا ہے کہ جیسے روح سے بندہ زندہ ہوتا ہے، اسی طرح اللہ کے قرآن سے مردہ دل زندہ ہو جاتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۱۲۳]

فرشتوں اور نبیوں میں سب سے آخر میں موت کس کو آئے گی؟

اللہ کی شان دیکھئے! جب ساری دنیا ختم ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ جبرائیل علیہ السلام سے پوچھیں گے: اب کون بچ گیا؟ وہ کہیں گے: اللہ میاں! ہم چار ہی بچے ہیں اور کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: آج تم ان تینوں کی روح قبض کرو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ جبرائیل علیہ السلام سے پوچھیں گے تو عرض کریں گے: اب تو میں تیرا ایک بندہ باقی ہوں۔

اللہ فرمائیں گے: تم بھی مر جاؤ۔ تو فرشتوں میں آخری موت حضرت جبرائیل علیہ السلام کو آئے گی۔ اور مشہور روایات میں یوں ہے کہ سب سے آخر میں حضرت ملک الموت کو ہی موت آئے گی۔ (انور)

اور نبیوں میں آخری موت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آئے گی، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں میں ابھی زندہ موجود ہیں، انہوں نے زمین پر اُترنا ہے، وہ چالیس سال تک یہاں رہیں گے، ان کی شادی ہوگی، دنیا میں امن قائم فرمائیں گے، اسلام کا بول بالا ہوگا اور وہ روضۂ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں دفن ہوں گے۔ وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دفن کی جگہ باقی ہے۔ اللہ کی شان دیکھیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جس فرشتے کو جوڑ رکھا تھا، ان کو بھی آخر میں موت آئے گی۔

معجزاتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

اللہ پاک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں دیں کہ اندھے پر ہاتھ پھیرتے تو بینا ہو جاتا، کوڑھی اور برص والے شخص پر ہاتھ پھیرتے تو ٹھیک ہو جاتا، مردے پر ہاتھ پھیرتے تو مردہ کھڑا ہو جاتا اور اس کو کہتے: ''قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ'' تو وہ مردہ کھڑا ہو کر بول پڑتا۔

اے بنی اسرائیل! تم نے اتنی نشانیاں دیکھنے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی نہ مانا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی نہ مانا، تورات کو بھی نہ مانا، بلکہ تم نے یہ کیا کہ جب بھی رسول میرا حکم لے کر آیا جو تمہارے نفس اور خواہش کے خلاف ہوتا تم اس کا انکار کر دیتے تھے اور تم نے انبیاء کی ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو تم نے قتل کیا، یہی تمہارا دین اور ایمان ہے۔

عمرہ، حج اور طواف کی فضیلت:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بار بار حج کرنا اور بار بار عمرہ کرنا گناہوں کو مٹا ڈالتا ہے اور غریبی کو بھی مٹا ڈالتا ہے، یعنی آدمی جتنے زیادہ حج کرے، عمرے کرے، اس کے دو فائدے ہوتے ہیں: ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ مٹا دیتے ہیں، دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ اس کے رزق میں برکتیں عطا فرما دیتے ہیں۔ حالانکہ بظاہر دیکھیں اِحج عمرے میں پیسہ خرچ ہوتا ہے، لیکن اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ خزانۂ غیب میں سے عطا فرما دیتے ہیں۔

اصل بات یہ ہوتی ہے کہ آدمی کا اللہ پر یقین کامل ہو جائے۔ زکوٰۃ میں بظاہر پیسہ خرچ ہوتا ہے کہ اڑھائی فیصد

نکالتے ہیں اور سود میں بظاہر پیسہ بڑھ رہا ہے، سات فیصد بیس فیصد لے رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝﴾ [البقرۃ:۲۷۶] زکوٰۃ دینے سے اللہ برکتیں عطا فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے مال کو محفوظ رکھتے ہیں، اس کی اولاد کو محفوظ رکھتے ہیں، اس کو حوادثات سے بچا لیتے ہیں، آنے والی بڑی بڑی مصیبتوں کو ٹال دیتے ہیں۔ اس کے مقابلہ پر سود کا پیسہ آ گیا، حرام کا پیسہ آ گیا، لیکن اس کا انجام یہ ہوگا کہ ایک جگہ سے لاکھوں مل گئے، لیکن دوسری جگہ کوئی بیماری گلے پڑ جائے گی تو لاکھوں خرچ ہو جائیں گے، تیسری جگہ کوئی مقدمہ بن جائے گا تو لاکھوں اس میں لگ جائیں گے، چوتھی جگہ کوئی حادثہ ہو جائے گا تو لاکھوں اس پر خرچ ہو جائیں گے۔

علماء نے لکھا ہے جو آدمی غریب ہو، جس کے رزق میں تنگی ہو، اس کو چاہیے کہ بار بار عمرے کرے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے رزق میں برکتیں عطا فرما دیتے ہیں اور رزق کو کھول دیتے ہیں۔

عمرے کی اصل فضیلت وہی ہے جو آدمی اپنے وطن سے آتے ہوئے میقات سے احرام باندھے، لیکن ہمارے لوگ چھٹیوں میں جاتے ہیں، مفت میں عمرہ مل رہا ہے، لیکن اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایئر پورٹ سے احرام باندھ کر اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں فارغ ہو جائے۔ اگر آپ مکہ میں رہتے ہیں اور مدینہ گئے، تب بھی آپ کو واپسی پر میقات کا عمرہ مل سکتا ہے۔ آپ طائف گئے، واپسی پر میقات ہے، وہاں سے بھی عمرہ مل سکتا ہے۔ اگر آپ مکہ کے اندر رہتے ہیں، آپ تنعیم چلے گئے اور احرام باندھ کر عمرہ کیا، اس طرح عمرہ تو ہو جاتا ہے، لیکن یہ میقات کے برابر نہیں، حل علیحدہ چیز ہے، میقات علیحدہ چیز ہے۔ میقات صرف پانچ ہیں جو حضور اکرم ﷺ نے مقرر فرمائے ہیں۔

آپ مکہ میں رہتے ہیں، کثرت سے طواف کریں۔ کیونکہ یہ عبادت پوری دنیا میں میسر نہیں آ سکتی۔ باقی ہر عبادت آپ پوری دنیا میں کر سکتے ہیں، لیکن طواف اللہ کے گھر کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا طواف کی عبادت نفلی عبادات میں سے افضل ترین ہے۔ آدمی جتنے شوق، ذوق اور تمنا سے اور عاجزی سے طواف کرے، اس کو مذاق نہ سمجھے، بلکہ یہ سمجھے کہ میں اللہ کے دربار میں حاضر ہوں۔

علماء نے لکھا ہے جب آدمی حجر اسود پر بوسہ دیتا ہے، اشارہ کرتا ہے گویا وہ اللہ کے دربار میں حاضر ہو کر مصافحہ کرنے کے بعد عبادت کی ابتداء کر رہا ہوتا ہے۔ طواف میں ذکر اللہ پر زور دے...... ''سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، لَا

إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، وَ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ''......اسی طرح کلمہ طیبہ، آیتِ کریمہ، چوتھا کلمہ، درود شریف اور جو بھی چیز تمہیں یاد ہے اور جس میں تمہارا دل لگے، خشوع وخضوع کے ساتھ ادب سے چلے، نظر نیچی رکھے، طواف کرنے کے بعد دو رکعت ادا کرے اور ملتزم پر آ کر دعا کرے۔ اگر اللہ پاک نے یہاں آنے کی توفیق دی ہے تو اس کے گھر کے حقوق ادا کرے۔

اللہ پاک نے بنی اسرائیل میں ان کی قوم سے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا، ان کو کچھ نئے احکام ملے، جو تورات میں نہیں تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو کھلی کھلی نشانیاں دیں، یعنی معجزات دیئے اور وہ معجزات بڑے بڑے تھے اور یہ اللہ نے اس لئے دیئے، تاکہ لوگ ان کی صداقت پر ایمان لے آئیں کہ وہ اللہ کے سچے رسول، سچے پیغمبر اور سچے نبی ہیں۔

شریعت کے احکام منسوخ یا تبدیل کیوں ہوتے ہیں؟

یاد رکھیں! شریعت کا جو اختلاف ہوتا ہے وہ اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ بعض مستشرقین اور معاندین اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ جب خدا اعلام الغیوب ہے تو اس کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ قانون بدل دے؟ آدم علیہ السلام کے زمانہ میں اور قانون ہو، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں اور شریعت آ جائے، موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں شریعت کے احکام بدل جائیں، عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اور احکام آ جائیں، تو اللہ کو احکام بدلنے کی کیا ضرورت تھی؟

یہ اعتراض جہالت ہے۔ اللہ نے جہاں احکام بدلے ہیں، وہاں اپنے بندوں پر رحم کھایا ہے۔ حالات اللہ کے علم میں ہیں۔ ہمارے والدین جو عبادت میں مشقت برداشت کر سکتے تھے وہ ہم برداشت نہیں کر سکتے اور جو ہمیں نصیب ہے، اللہ ہماری آنے والی اولادوں کو ہدایت دے، پتہ نہیں وہ کیا کریں گی؟ کیونکہ روزانہ ہم جتنا جتنا قیامت کے قریب جا رہے ہیں، کمزوریوں کی طرف بڑھ رہے ہیں ہر چیز بڑھاپے کی طرف جا رہی ہے۔ جیسے انسان بڑھاپے کی طرف جاتا ہے تو اس کے قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح دنیا بھی ختم ہونے کی طرف جا رہی ہے، جوانی کی طرف نہیں جا رہی۔ اللہ تعالیٰ رحم فرما کر اپنے بندوں پر نرمی فرما دیتے ہیں۔ یہ اللہ کا کرم ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تہجد فرض کر دی، ہر پیغمبر پر فرض تھی اور اس اُمت پر بھی فرض تھی کہ آدھی رات آرام کرو اور آدھی رات تہجد پڑھو۔ پھر یہ ہوا کہ دو حصے رات کے تہجد پڑھو اور ایک حصہ رام کرو۔ پھر آیت آ گئی کہ دو حصے آرام کرو اور ایک حصہ تہجد پڑھو۔ اس کے بعد جب پانچ نمازیں فرض ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے تہجد کی فرضیت ختم

کردی کہ اب پانچ نمازیں فرض ادا کرو۔ اگر اللہ توفیق دے تو تہجد پڑھ لو۔ اگر نہ پڑھو تو گناہ کوئی نہیں ہے۔ اگر دنیا میں ڈاکٹر مریض کے حالات کو دیکھ کر نسخہ بدل ڈالے تو اس کو کہتے ہیں کہ ڈاکٹر بڑا سمجھدار ہے۔ جیسے جیسے مرض تبدیل ہوتا گیا دوائیں بھی تبدیل کرتے گئے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات دیکھ کر قانون میں تبدیلی فرمادیں تو کہتے ہیں: کیوں بدلا ہے؟ بندے پر کوئی اعتراض نہیں کرتا، لیکن خالق پر اعتراض کرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت اور احکام کے اندر تبدیلی تھی۔ اللہ نے ان کو بڑے معجزات دیئے، تاکہ لوگ معجزات کو دیکھ کر ان کی صداقت کو پہچان لیں، لیکن یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ تورات کے مخالف آرڈر لے کر آگئے، شریعت کے خلاف حکم دے رہے ہیں۔ اس کو انہوں نے عناد اور بغض بنالیا، جیسا کہ قرآن میں ہے: ﴿وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ﴾ [آل عمران: ۵۰] حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ بعض چیزیں جو تم پر حرام ہیں، حلال کردوں، تاکہ تمہارے ساتھ رعایت ہوجائے، اور میں کھلی ہوئی نشانی لے کر آیا ہوں۔ لیکن بنی اسرائیل کا معاملہ تھا کہ وہ انبیاء کے ساتھ سخت بُرا معاملہ کرتے تھے اور بعض تو کہتے: ہم تو تورات کو پکڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ تورات کے احکام کو بھی انہوں نے بدل ڈالا تھا۔

حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لیے تائید جبرائیلی:

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰي قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝﴾ [الشعراء: ۱۹۳، ۱۹۴] روح الامین قرآن لے کر آیا۔ یہاں حضرت جبرائیل علیہ السلام کا لقب روح الامین ہے۔ جس زمانہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے، اس زمانہ میں شاعر لوگوں کا بڑا زور تھا۔ عرب میں بڑے بڑے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے۔ بعض شعراء جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے، وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص میں اشعار کہتے تھے۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر تھے اور یہ ان کافروں کو استعاروں میں جواب دیتے تھے۔

ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے منبر منگوایا، اس پر حسان رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دفاع کیا اور کافروں کو جواب دیتے رہے، آپ قصیدہ پڑھتے رہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگتے رہے: ''اَللّٰهُمَّ أَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ'' یا اللہ! میرے اس صحابی کی جبرائیل کے ذریعے مدد فرما،

جو اس کے دل و دماغ میں مضمون ڈالے، جیسے جبرائیل میرے لئے قرآن لے آتا ہے اور میری تائید ہوتی ہے۔

(مسئلہ) اگر کسی بڑی شان والے کے سامنے اس کے حکم پر چھوٹا آدمی منبر پر کھڑا ہو جائے تو جائز ہے۔ جیسے بڑے بڑے علماء بیٹھے ہوتے ہیں، لیکن چھوٹے طالب کو کہتے ہیں کہ تم تقریر کرو، تلاوت کرو۔ اس میں علماء کی توہین نہیں ہوتی، بلکہ یہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت ہے۔

نعت رسولِ مقبول ﷺ پڑھنے کا جائز و شرعی طریقہ:

جس نعت میں اللہ کی توحید ہے، محمد ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہے یا حضور اکرم ﷺ کی تعریف ہے، لیکن ایسی تعریف جو حدودِ شریعت سے باہر نہ نکلے، یہ نہ ہو کہ تعریف کرتے کرتے نبی کو خدا بنا دیں۔ یہ تعریف نہیں ہوتی، بلکہ کفر ہوتا ہے۔

اس کی دلیل موجود ہے کہ میرے آقا ﷺ ایک دفعہ جنگ سے تشریف لے آئے، بعض بچیوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں حضور اکرم ﷺ کی محبت میں خوشی سے گیت گانا شروع کیا اور انہوں نے ایک شعر کہا: ''وَ فِينَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِي غَدٍ'' ہمارے درمیان میں اللہ نے ایک ایسا نبی بھیجا ہے جو کل کی خبریں بھی جانتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کو فرمایا: چپ کرو، ایسی بات نہ کرو، جو شریعت کے خلاف ہے۔ جو تم پہلے کہہ رہی تھیں وہ کہو۔ علم غیب اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور کسی کے پاس نہیں ہوتا۔

[صحيح البخاري، حديث: ٥١٤٧، باب: ضَرْبِ الدُّفِّ فِي النِّكَاحِ وَالْوَلِيمَةِ]

اس سے علماء نے مسئلہ نکالا کہ حضور اکرم ﷺ کی مدح جائز، نعت پڑھنا جائز، لیکن اس میں ایسے الفاظ نہ ہوں جو شریعت کے خلاف ہوں، ایسے الفاظ نہ ہوں جو اللہ کی توحید سے ٹکرا جائیں اور قرآن و سنت کے احکام کے خلاف ہوں۔ نعت پڑھنا جائز ہے، لیکن باجے وغیرہ کے بغیر۔ طبلہ، سارنگی، ہارمونیم، پتہ نہیں کیا کیا بلائیں ہوتی ہیں، موسیقی اور لہو ولعب کے جو بھی آلات ہوتے ہیں، یہ نہ ہوں۔

بعض بزرگوں کے بارے میں جو آیا ہے کہ وہ سنتے تھے۔ دعا کریں کہ اللہ ان پر رحم فرما دے۔ پتہ نہیں وہ کن حالات میں سنتے تھے؟ کیا وجوہات تھیں؟ کیا مجبوریاں تھیں؟ ان کے سننے کو کوئی شرعی دلیل بنائے تو وہ دلیل نہیں بن سکتی۔ کیونکہ شریعت میں دلیل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا فرمان ہے۔ کسی بزرگ، مولوی یا پیر کا عمل شریعت میں حجت نہیں بن سکتا۔ تمام علماء، محدثین اور فقہاء کا متفق علیہ فیصلہ ہے: ''کلامِ صوفیاء در شریعت حجت نیست'' جتنے

صوفی بزرگ گزرے ہیں، ان کا کلام شریعت میں حجت نہیں ہوتا۔صوفی حضرات کبھی اپنے استغراق میں بیٹھے ہوتے ہیں کوئی بات ان کی زبان سے نکل جاتی ہے تو وہ شریعت میں حجت نہیں بنتی۔

آج کل لوگ حضور اکرم ﷺ کی نعت غیر محرم عورتوں سے سنتے ہیں...... لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ......

حالانکہ غیر محرم عورت کی خوش آوازی سننا حرام ہے، چہ جائیکہ آدمی غیر محرم عورت سے ریڈیو، ٹیلی ویژن پر، اسکرین پر، محفلوں میں اس کی نعت سنے۔اللہ نے فرمایا: عورت قرآن زور سے نہ پڑھے، عورت اذان نہیں دے سکتی، تاکہ اس کی آواز غیر محرم نہ سنے۔عورت امام نہیں بن سکتی، تاکہ مقتدی اس کی آواز نہ سنیں۔عورت کو حکم ہے کہ گھر میں عبادت کرے، زور سے بات نہ کرے، تاکہ اس کی آواز باہر نہ جائے۔آج کل ایک اور رواج ہے کہ بعض عورتیں قاری ہیں، اچھا قرآن پڑھنے والی ہیں، لوگ ان کی کیسٹ سنتے ہیں، یہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔غیر محرم عورت کی آواز سننا ہی حرام ہے، چاہے وہ قرآن تلاوت کرے، حدیث تلاوت کرے یا نعت پڑھے۔

حضور پاک ﷺ کے زمانہ میں کبھی کسی نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا سے نعت سنی؟ کبھی بی بی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے قرآن کی آواز صحابہ کے کان میں آئی؟ ہاں! ازواجِ مطہرات سے مسئلہ پوچھتے تھے اور درمیان میں پردہ لٹکا دیتے تھے۔امی جان! شریعت کا فلاں مسئلہ بتا دیں۔ماں اپنے بیٹوں کو مسئلہ بتا دیتی تھی کہ مسئلہ یوں ہے۔ کیونکہ بعض مسائل گھر کے ہوتے ہیں، میاں بیوی کے درمیان پیش آتے ہیں اور کسی کے سامنے وہ نہیں ہو سکتے۔ ان سے پوچھتے کہ حضور اکرم ﷺ کتنے پانی سے غسل فرماتے تھے؟ کیا کبھی ایسے بھی ہوا کہ ایک برتن سے اکٹھے غسل فرمایا ہو؟ فرمایا: ہاں! مسئلے معلوم ہو گیا ہے کہ میاں بیوی ایک ٹب سے دونوں نہالیں تو کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ سمجھ لیں کہ حضور اکرم ﷺ کی نعت پڑھنا، لکھنا، حضور اکرم ﷺ کی شان میں قصیدے لکھنا جائز، مدح، ثنا، سننی، پڑھنی، پڑھانی جائز ہے، عشق اور ایمان کی علامت ہے، لیکن جو چیزیں شریعت کے خلاف ہوں، وہ حرام ہیں، مثلاً گانا بجانا وغیرہ۔سوز و ساز نہ ہوں۔یہ جو بڑے بڑے عاشق بنے پھرتے ہیں کہ فلاں قوال حضور اکرم ﷺ کا بڑا عاشق ہے۔داڑھی منڈواتا ہے اور عاشق ہے!! دو کلو پان کھا جاتا ہے اور عاشق ہے!! کیا ......معاذ اللہ!......حضور اکرم ﷺ پان کھاتے تھے؟ آپ اس کے سر پر کبھی ٹوپی نہیں دیکھیں گے، پھر بھی وہ اپنے آپ کو عاشق کہلاتا ہے۔

بعض لوگ فلمی انداز میں نعتیں پڑھتے ہیں، یہ بھی ناجائز ہے۔جو اللہ نے تمہیں آواز دی ہے اس کے ساتھ محمد



مدنی ﷺ کی نعت پڑھو۔ ادب، وضو، انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ نعت پڑھو اور اس تصور کے ساتھ نعت پڑھو کہ اللہ قیامت میں بھی حضور اکرم ﷺ کے سامنے نعت پڑھنے کی سعادت نصیب فرمائیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مسجد سے گزرے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے شعر پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ بات ناگوار گزری۔ آپ نے فرمایا: عجیب بات ہے کہ تم مسجد میں کھڑے ہو کر شعر پڑھتے ہو، کیا مسجد شعر پڑھنے کی جگہ ہے؟ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے عمر! ناراض نہ ہوں۔ یہ شعر تو میں نے اس وقت بھی پڑھے تھے جب آپ سے بھی زیادہ شان والی ہستی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ موجود تھے۔ انہوں نے منع نہیں کیا تو آپ کیوں منع کرتے ہیں؟ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا اور کہا: ابو ہریرہ! میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں، آپ گواہی دیں اس بات کی کہ مجھے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا: ''أَجِبْ عَنِّي'' (میری طرف سے مشرکین کو جواب دو)؟ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''نَعَمْ'' ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔

[صحیح بخاری، حدیث: ۳۲۱۲، باب: ذِكْرِ الْمَلَائِكَةِ]

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب میں نے جواب دیا تھا تو حضور اکرم ﷺ نے دعا کی تھی: ''اَللّٰهُمَّ أَيِّدْهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ؟'' اے پروردگار عالم! میرے شاعر کی مدد فرما، جبرائیل امین کی طرف سے تقویت دے کر اور ان کے ذریعے اس کے دل ودماغ میں مضمون ڈال دے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بالکل آپ نے صحیح کہا ہے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ بھی پڑھا۔

وَ جِبْرِيْلٌ رَسُوْلُ اللهِ فِيْنَا
وَ رُوْحُ الْقُدُسِ لَيْسَ بِهِ خِفَاءُ

''جبرائیل علیہ السلام ہمارے درمیان اللہ کا قاصد اور روح القدس ہے اور اس میں کوئی خفا نہیں ہے۔''

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۹۰، باب: فَضَائِلِ حَسَّانَ بْنِ ثَابِتٍ رضی اللہ عنہ]

تفسیر:

حضرت شہر بن حوشب الاشعری سے روایت ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے آکر حضور اکرم ﷺ سے ایک سوال کیا کہ روح کیا ہے؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''أَنْشُدُكُمْ بِاللهِ وَ بِأَيَّامِهِ عِنْدَ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ، هَلْ

تَعْلَمُوْنَ أَنَّهُ جِبْرَائِيْلُ وَ هُوَ الَّذِيْ يَأْتِيْنِيْ؟ قَالُوْا: نَعَمْ" میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں اور ان ایام کی جو بنی اسرائیل پر آئے، کیا تم یہ جانتے ہو کہ روح سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ اور یہ وہی فرشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے پاس آتا ہے۔ (اس حدیث پاک میں بھی یہ بات وضاحت سے آگئی کہ "روح" سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں)۔ انہوں نے کہا: جی ہاں! روح سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۲۲]

صحیح ابن حبان میں ایک روایت ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت فرمائی ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "إِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رَوْعِيْ أَنَّهُ لَنْ تَمُوْتَ نَفْسٌ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا وَ أَجَلَهَا، فَاتَّقُوا اللهَ وَ أَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ" روح القدس یعنی جبرائیل علیہ السلام نے میرے دل میں یہ بات ڈالی، اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوئی بندہ اس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک کہ اللہ نے اس کا جو وقت لکھا ہے، وہ پورا نہ کر لے، اور جو رزق لکھا ہے وہ پورا نہ کر لے اور تم اللہ سے ڈرو اور رزق حاصل کرنے میں اچھا طریقہ اختیار کرو۔ (یہ نہ کرو کہ حلال، حرام، مشتبہات، منکرات اور محرمات سب کو جمع کرتے جاؤ، حالانکہ تم نے جتنا رزق کھانا ہے، جو اللہ نے تمہارے لئے لکھا ہے، تمہارا رزق کوئی اور نہیں کھا سکتا اور جتنی تمہاری زندگی ہے، اتنا دنیا میں رہنا ہے)۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱۲۳، ۱۲۲/۱، شرح السنة للبغوي، حدیث: ۴۱۱۲]

"روح القدس" اسم اعظم ہے:

ابن ابی حاتم نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ اس آیت میں اسم اعظم ہے اور یہ وہی اسم اعظم ہے جو اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا اور اس اسم اعظم کی برکت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۲۳]

اسم اعظم کون سا ہے؟

اللہ کے اسماء بہت ہیں، لیکن ان میں ایک اسم اعظم ہے، "إِذَا دُعِيَ بِهِ اسْتَجَابَ" (جب اس اسم کے ساتھ دعا کی جائے تو وہ قبول ہوتی ہے)، اس کو "اسم اعظم" کہتے ہیں، اور وہ اسم اعظم کیا ہے؟ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک راز میں رکھ دیا ہے۔

بعض روایات میں آتا ہے: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الانبیاء: ۸۷] اس آیت



میں اسم اعظم ہے، کیونکہ جس آدمی نے بھی اس کے ساتھ دعا مانگی ہے، اللہ پاک اس کی دعا منظور فرماتے ہیں۔

بعض روایات میں آیۃ الکرسی کے بارے میں آیا ہے کہ اس کے اندر اسم اعظم ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ "سورۃ الحشر" کی آخری تین آیات میں اسم اعظم ہے۔ اسی طرح "یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ!" اسم اعظم ہے۔ اسی طرح "یَا ذَا الْجَلَالِ وَ الْاِکْرَام" بھی اسم اعظم ہے۔

یہ مختلف اقوال ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس کو چھپا دیا ہے۔ اور بندے کا کام یہ ہے کہ اس کو تلاش کرے اور اللہ کے اسماء کے ساتھ اللہ سے دعا مانگے۔

یاد رکھیں! وہ دعائیں کبھی قبول نہیں ہوتیں جو شریعت کے خلاف ہوں، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کے خلاف ہوں۔ مثلاً: ایک آدمی ڈاکہ مارنے کے لیے جا رہا ہے اور کامیابی کی دعا مانگ رہا ہے، ایسے لوگ حدودِ اسلام سے بھی نکل سکتے ہیں، کیونکہ اس نے گناہ کے لیے دعا کو ذریعہ بنایا، جو خود گناہ ہے۔ آدمی کو وہ دعا مانگنی چاہیے جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق ہو۔ آدمی کو چاہیے کہ اللہ کے اسماء کے ساتھ دعا مانگے۔

دعا کی قبولیت کے بعض طریقے:

بعض بزرگوں نے ایک طریقہ لکھا ہے۔ طریقہ محنت والا ہے، اس شرط پر آپ حضرات کو بتا رہا ہوں کہ آپ اس کو غلط استعمال نہیں کریں گے۔ اگر آپ نے اس کو غلط استعمال کیا تو قیامت میں آپ پکڑے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے جو ننانوے اسماء ہیں، ان میں سے تین نام منتخب کر لو، یعنی ابتداء سے جہاں اللہ کے نام شروع ہوتے ہیں، احادیث میں موجود ہیں اور چھپے ہوئے مل جاتے ہیں۔ ان میں تین ناموں پر نشان لگا کر مثلاً: یا اللہ! یا رحمٰن! یا رحیم۔ ان تین ناموں کے ساتھ گیارہ دن تک، سات دن تک یا اکیس دن تک کسی خاص کام کے بارے میں دعا مانگتے رہو۔ صبح و شام، اُٹھتے بیٹھتے، وضو ہے یا نہیں، چلتے پھرتے، جب بھی یاد آ جائے تو مانگو: یا اللہ! یا رحمٰن! یا رحیم! میری فلاں حاجت پوری کر دے۔ اس کے بعد اور تین نام اور اس کے بعد اور تین نام لیں۔

جن ناموں کے ساتھ آپ کی دعا فوراً منظور ہو جائے تو سمجھ لو کہ تمہارے حق میں اللہ کو وہی منظور ہے۔ بس انہی کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لو۔ ان شاء اللہ! ہر جگہ کامیابی ملے گی۔ یہ ایک ایسا آسان طریقہ ہے کہ جس میں شریعت کی بھی مخالفت نہیں ہے اور اللہ کا حکم بھی ہے کہ ان ناموں کے ساتھ پکارو۔

بعض علماء نے ایک اور طریقہ بھی لکھا ہے کہ قرآن میں جو آیات ہیں، ایک تو یہ آیت ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿٨٧﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَ نَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَ كَذٰلِكَ نُـْۨجِی الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿٨٨﴾﴾ [الانبیاء: ۸۷، ۸۸]، دوسری آیت ﴿وَاَیُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ﴿٨٣﴾﴾ [الانبیاء: ۸۳]، اور تیسری آیت ﴿وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ ﴿١٧٣﴾﴾ [آل عمران: ۱۷۳]، چوتھی آیت ﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٤٤﴾﴾ [غافر: ۴۴]، پانچویں آیت ﴿فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴿١٠﴾﴾ [القمر: ۱۰] ہر آیت کو کم از کم سو سو دفعہ پڑھے، پانچ سو دفعہ پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو منظور فرماتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جو آدمی ان پانچ آیات کو اس انداز میں پڑھ کر اللہ سے دعا مانگے اور اس کو یقین نہ ہو کہ میرا کام ہوگا یا نہیں تو سمجھو کہ وہ اللہ پر ایمان بھی نہیں رکھتا۔ کیونکہ یہ آیات ایسی ہیں جہاں قرآن میں آئی ہیں تو ان کے آگے آیا ہے: ﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ﴿٧٦﴾﴾ [الانبیاء: ۷۶] کہ جنہوں نے ہم سے ان آیات کے ذریعے مانگا ہے، ہم نے ان کو دیا ہے۔ فرمایا: میں اس آدمی پر حیران ہوتا ہوں۔ وہ بڑا بدبخت ہے کہ ان کے ساتھ دعا مانگے اور اس کی دعا قبول نہ ہو۔ شرط یہ ہے کہ جب دعا مانگو تو پہلے استغفار کرلو، کپڑے پاک ہوں، بدن پاک ہو، جگہ پاک ہو اور اس دن میں کوشش کرو کہ کم از کم آپ کے اندر حرام کا رزق نہ جائے۔

ایک بوڑھا آدمی اور اس کی سفید داڑھی ہے۔ ماشاء اللہ! بڑا نیک آدمی ہے۔ میں نے اس کو صف اوّل میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بارے میں بڑا حسنِ ظن رکھتا تھا کہ یہ اللہ کا ولی ہے۔ میں طواف کر رہا تھا تو ایک آدمی نے پتہ نہیں اس کو کیا کہا، انہوں نے کہا: یہ شیطان ہے، کتے کا بچہ ہے، کافر ہے، حرام زادہ ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ اس کو تو میں ولی سمجھتا تھا، جو دوسروں کو کتے کا بچہ کہتا ہے۔ دوسرے چکر میں آیا تو وہ پھر وہی گالیاں یہاں پورے طواف میں دیتا رہا۔

روح اور قدس کسے کہتے ہیں؟

حضرت ابن ابی نجیح رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''روح''، ان فرشتوں کا لقب ہے جو ملائکہ پر سپروائزر اور ان کی محافظت کرنے والے ہیں۔

حضرت ابوجعفر الرازی رحمہ اللہ حضرت ربیع رحمہ اللہ سے نقل فرماتے ہیں کہ "قدس" سے مراد پروردگار عالم ہیں۔
حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قدس سے مراد اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے اور روح سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔
حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قدس سے مراد "برکۃ" ہے، یعنی جہاں اللہ کی تقدیس بیان کی جائے۔
حضرت عوفی رحمہ اللہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرماتے ہیں: ﴿وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ اللہ کی پاکی مراد ہے۔
ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل بھیجی تو روح کے ساتھ، جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو بھی روح کے ساتھ بھیجا۔ دونوں روح اللہ ہیں۔
ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس مقام پر "روح" سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں، اور یہی راجح قول ہے۔
جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَیَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ میں بھی "روح" سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ اگر روح سے مراد بھی انجیل ہو اور ﴿تُكَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ﴾ [المائدۃ:١١٠] میں "الإنجیل" سے مراد بھی "انجیل" ہو تو اس طرح تکرار ہو جائے گا اور ایک ایسی بات کو دہرایا گیا جس کا فائدہ بھی نہ ہو۔ [تفسیر ابن کثیر:١/ ١٢٣]

﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:٨٨]

اور کہتے ہیں: ہمارے دلوں پر پردے پڑ چکے ہیں، بلکہ اللہ نے ان کو ان کے کفر کے سبب لعنت کی ہے، پس تھوڑے ہی ایمان قبول کرتے ہیں۔

﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾ یہودیوں کی شرارتوں میں یہ بھی تھا کہ وہ کہتے تھے: ہمارے دل پردے میں ہیں اور وہ اس بات کو عزت اور شرف کے طور پر کہتے تھے کہ ہمارے دلوں پر اس طرح غلاف چڑھا ہوا ہے کہ ان کے اندر کسی دوسرے کی بات داخل نہیں ہو سکتی، ہم اس کو سمجھ نہیں سکتے۔
مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "غُلف"، "غِلَاف" سے بھی ہے اور "أَغْلَف" سے بھی ہے۔ "غُلف" کا معنی "أَكِنَّة" بھی ہے، جیسے قرآن میں دوسرے مقام پر آیا: ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَیْهِ وَفِیْۤ اٰذَانِنَا وَقْرٌ

مِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝﴾ [فصلت:۵]

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۲۲]

لعنت کا مفہوم:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۸۸] اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت فرمادی ہے، اللہ نے ان کو اپنی رحمت سے دور کردیا ہے۔ اور یہ اسی لعنت کا اثر ہے کہ ان کو بات سمجھ نہیں آتی۔

لعنت کا معنی ہے: ''اَلْبُعْدُ عَنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ'' اللہ کی رحمت سے دور ہوجانا۔ علماء نے فرمایا: جب آدمی ارتکابِ جرم کی وجہ سے لعنت کا مستحق بنتا ہے تو اس کا اثر سب سے پہلے یہ ہوتا ہے کہ اس کی عقل کام نہیں کرتی اور اس کو حق بات سمجھ نہیں آتی۔ اس کو آپ جتنا حق بات سمجھانے کی کوشش کریں، وہ کہے گا: آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن ہمارے دماغ میں یہ بات نہیں بیٹھتی۔ اس طرح وہ آدمی صحیح بات سمجھنے سے قاصر ہوجاتا ہے، اس کا دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

مثال کے طور پر زمین پر سب سے پہلا جرم قابیل نے کیا کہ اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا۔ ہابیل بڑا مطیع اور فرمانبردار تھا، قابیل نافرمان تھا۔ قابیل نے جب ہابیل کو قتل کردیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر ایسی لعنت فرمائی کہ اس کی عقل جواب دے گئی۔ اس کو سمجھ نہ آئے کہ لاش کو کدھر لے جاؤں۔ لاش اُٹھا کر پہاڑوں میں پھر رہا ہے، کیونکہ آبادی میں تو جا نہیں سکتا۔ جب تھک ہار کر بیٹھ گیا تو اس نے دیکھا کہ چند کوے اکٹھے ہوئے ہیں، ایک کوا مردہ پڑا ہوا ہے، سارے کوے اس کے اردگرد اکٹھے ہوتے ہیں اور ایک جگہ اپنی چونچ سے گڑھا کھود کر مردہ کو اس میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ جب اس نے ان کو دیکھا تو کہنے لگا: ﴿يٰوَيْلَتٰٓى أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَأُوَارِيَ سَوْءَةَ أَخِيْ ۚ فَأَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۝﴾ [المائدۃ:۳۱] میں تو ان کوّوں سے بھی کم عقل نکلا، کمزور نکلا۔ مجھے اتنی سمجھ نہ آئی کہ بھائی کی لاش کو گڑھے میں ڈال کر چھپا دوں۔

اصل وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جرم کی وجہ سے عقل چھین لیتے ہیں اور اس بندے کو صحیح راستہ نہیں ملتا۔ آج کہیں قتل کی واردات ہوجائے تو پولیس کہتی ہے: اس جگہ کو بالکل نہ چھیڑیں اور اس محل وقوع کے قریب مت جائیں۔ اس لئے اپنے آدمی بھیج کر پہرہ لگا دیتے ہیں کہ یہاں سے کوئی آدمی نہ گزرے۔ پھر قدم ڈھونڈتے ہیں، نعش کی ہیئت کو ڈھونڈتے ہیں کہ اس کا رخ کس طرف ہے اور اس کو گولی کہاں سے لگی ہے؟ ان ساری چیزوں پر وہ نظر کرتے ہیں۔ کیونکہ قاتل ضرور کوئی نہ کوئی غلطی کرتا ہے۔ اگر کوئی سمجھدار اور محنت کرنے والا آفیسر ہو، اس کو مجرمین اور جرائم کے



بارے میں تجربہ ہو تو وہ اسی غلطی پر زور لگاتا ہے کہ کوئی غلطی ظاہر ہو اور ہم اس کو پکڑیں۔ مثلاً اس مجرم کی جیب سے کوئی کاغذ گر گیا، سگریٹ پی کر مجرم نے پھینک دیا۔ تو وہ افسر دیکھتے ہیں کہ کس برانڈ کا سگریٹ ہے؟ یہ کہاں بکتا ہے؟ جب انسان سے اس طرح کی ملتی ہے تو قاتل تک پہنچ جاتے ہیں، کیونکہ جب آدمی جرم کرتا ہے تو عقل کی نعمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس سے لازماً کوئی نہ کوئی غلطی ہوتی ہے جس سے وہ پکڑا جاتا ہے۔

جن لوگوں نے اتنا بڑا کفر کیا ہو، اللہ کے ساتھ شریک بنا ڈالا ہو، حضور اکرم ﷺ کی رسالت کا انکار کیا ہو، حضور اکرم ﷺ کی سیرت وصورت، صفات کو چھپا دیا ہو، تورات کو بدل ڈالا ہو تو ان جرائم پر ان کو سزا ملے گی کہ ان کی عقل کام کرنا چھوڑ جائے گی، لیکن وہ سمجھیں گے کہ آپ کی بات ہمارے دل ودماغ میں داخل نہیں ہوتی۔

سنت نبوی ﷺ اور جدید تعلیم یافتہ:

جیسے آج کل جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے اور ان کی تعلیم ابتدائی مراحل سے آخر تک انگریزی سکولوں میں ہوتی ہے، ان کو بھی جب آپ کوئی دین کی بات سمجھائیں تو وہ فوراً کہیں گے: آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ چودہ سو سال گزر گئے، اب بھی آپ نماز کا کہتے ہیں، ٹخنوں سے اوپر شلوار رکھنے کا کہتے ہیں، آپ کہتے ہو کہ سرمہ ڈالا کرو، حالانکہ ڈاکٹروں نے تحقیق کی ہے کہ اس کے اندر سکہ ہوتا ہے جو آنکھوں کے لئے نقصان دہ ہے اور آپ کہتے ہو کہ سنت ہے۔ اس طرح ان کے دماغ میں یہ بات نہیں بیٹھتی، ان کو کون سمجھائے کہ حضور پاک ﷺ نے جس سرمہ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے، اس سرمہ کو تلاش کر کے اس میں سکہ دکھاؤ تو ہم تمہاری بات مانیں۔ تم جھوٹے سرمے بنا دو تو اس میں حضور اکرم ﷺ کا کیا قصور ہے؟

اصل وجہ یہ ہے کہ اللہ اپنی ناراضگی کی وجہ سے ان کی عقل پر پردہ ڈال دیتے ہیں، وہ دنیا کی باتیں سمجھ لیتے ہیں، لیکن آخرت کی باتیں نہیں سمجھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: حضور اکرم ﷺ کے یہ جتنے منکر اور کافر ہیں، دنیا کمانے کے ڈھنگ تو بڑے جانتے ہیں، لیکن آخرت کی باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔

ان کو کسی انگریز کا قول سنا دو کہ ابراہام لنکن نے لکھا ہے، مورث بکائے نے یہ لکھا ہے، گلیلو نے لکھا ہے تو کہیں گے: یہ مولوی بڑا پڑھا لکھا ہے، اور اگر آپ ان کو کہیں گے: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا ہے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا ہے تو کہیں گے: چھوڑو، یہ وہی مولوی ہے جو ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کو لے کر بیٹھا ہوا ہے۔ چودہ سو سال پہلے گزر گئے ہیں، وہ تو

اس زمانہ میں پیدا ہوئے جب سائنس کا دور نہیں تھا، ان کو کیا پتہ کہ آسمان کیا ہوتا ہے؟ زمین کیا ہوتی ہے؟ چاند تارے کیا ہوتے ہیں؟

حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان ہے کہ جو باتیں حضور اکرم ﷺ نے اللہ کے قرآن میں بتائی ہیں، چودہ سو سال کے بعد ابھی سائنس وہاں پہنچ رہی ہے۔ یہ تو اب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ زمین وآسمان کی پیدائش سے پہلے ہائیڈروجن اور نائٹروجن کا جب اشتراک ہوا تو اس سے ایک دھواں سا خارج ہوا، وہ چلتے چلتے مختلف ٹکڑوں میں بٹ گیا، کہیں آسمان بن گیا اور کہیں زمین بن گئی۔

حالانکہ قرآن پاک کو کھول کر دیکھیں، چودہ سو سال پہلے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جب ہم نے زمین وآسمان کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو یہ دھواں دھواں تھا۔ یہ بے چارے تو ٹھوکریں کھاتے کھاتے اب وہاں پہنچے ہیں۔ انہوں نے کہاں سے ترقی کی ہے؟ ہمیں تو چودہ سو سال پہلے حضور اکرم ﷺ نے یہ بات پڑھا دی تھی۔ تم نے تو اب ترقی کی ہے۔

جدید سائنس اب اس بات پر پہنچی ہے کہ نباتات میں جوڑا ہوتا ہے: ایک نر ہوتا ہے اور ایک مادہ ہوتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے فرما دیا: ﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝﴾ [الذاریات:۴۹] ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کئے۔

اب ان کی ایک تحقیق سے معلوم ہوا کہ نباتات میں بھی حمل ہوتا ہے، پولن مادہ کبھی اس کو پانی کے ذریعے پہنچ جاتا ہے اور کبھی ہواؤں کے ذریعے اس کو پہنچ جاتا ہے اور کبھی ساتھ والے پودے پر وہ مادہ موجود ہوتا ہے، جب وہ پودا ہلتا ہے تو گر کر اس پر پہنچ جاتا ہے تو سبزی میں پھل پھول لگ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے پہلے بیان فرما دیا ہے: ﴿وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ﴾ [الحجر:۲۲] ہم کچھ ہوائیں ایسی چلاتے ہیں جو حمل کرنے والی ہیں۔ یہ بے چارے سمجھتے ہیں کہ یہاں ہمارا دماغ پہنچا، ان کو یہ پتہ چلا، مولویوں کو کوئی پتہ نہیں ہے۔

ان کو پتہ نہیں کہ ان کے جتنے بڑے بڑے جدید سائنسدان ہیں، یہ چور ہیں، انہوں نے سب ہماری کتابوں سے چرایا ہے۔ یہ علیحدہ بدقسمتی ہے کہ ہمارے مولوی تعویذ لکھنے لگے اور اسی چکر میں پڑے ہوئے ہیں اور ان لوگوں نے سائنسی ترقیاں کر کے پوری دنیا پر کنٹرول کر لیا اور ہم نے اپنا کام چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں تو اللہ پاک نے ہر چیز قرآن پاک پر حضور اکرم ﷺ کے فرمان میں کھول کھول کر بیان کر دی ہے۔

جدید تعلیم یافتہ شخص کا واقعہ:

کچھ دن قبل ایک آدمی باہر سے آئے تھے اور کئی علوم میں انہوں نے P.H.D کیا ہوا تھا۔ ان سے باتیں چل رہی تھیں، وہ مجھے بڑے فخر سے سنانے لگا کہ میں نے بڑی ریسرچ کی ہے، مجھے بڑی تحقیق ہوئی ہے، آپ سنیں گے تو حیران ہو جائیں گے کہ یہ گوہ کیا ہے؟ اور اس کے پاؤں کی انگلیاں کتنی ہوتی ہیں؟ زمین سے یہ کتنی اونچی ہوتی ہے؟ اس کا طول وعرض کتنا ہوتا ہے؟ اس کے گوشت میں کیا کیا فوائد ہیں؟ کہنے لگا: آپ کا یہ موضوع تو نہیں ہے، کیونکہ آپ حضرات کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے کہا: آپ کو یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ ہمارا تعلق نہیں ہے؟ یہ ہماری کتابوں میں موجود ہے کہ گوہ کی عمر سات سو سال ہوتی ہے، کیا تمہیں یہ پتہ ہے؟ وہ حیران ہو کر دیکھنے لگا اور کہا: جرمنی کے ایک کتب خانہ میں ایک کتاب سے پڑھا تھا۔ آپ کو کس نے بتا دیا؟ میں نے دو چار کتابیں نکال کر اس کو دکھائیں کہ دیکھو! ان میں یہ بات لکھی ہوئی ہے۔

اور یہ واحد جانور ہے جو کبھی مذکر ہوتا ہے اور کبھی مؤنث ہوتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا: آپ کو یہ تحقیق ہے؟ کہنے لگا: یہ تو ابھی پتہ نہیں۔ میں نے کہا: آپ ریسرچ کریں۔ اور میں نے کہا: آپ کو پتہ ہے کہ یہ واحد جانور ہے جس کے دانت ایک ہڈی ہوتی ہے اور اس میں ٹکڑے نہیں ہوتے۔ کہنے لگا: آپ کی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے؟ ہمارے مولوی اگر ان کو نہ پڑھیں تو اس میں علم کا قصور تو نہیں ہے۔ ہمارے بزرگوں نے تو ہر چیز لکھ دی ہے، مگر وہ حیران ہو گیا۔ میں نے کہا: حضور اکرم ﷺ کے سامنے گوہ کا گوشت لایا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو حرام بھی نہیں کہتا، لیکن میں خود نہیں کھاتا۔

احادیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے دسترخوان پر اس کو کئی دفعہ کھایا گیا۔ اگر یہ حرام ہوتی تو حضور اکرم ﷺ اس کو کھانے سے منع فرما دیتے۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کے سامنے تو کوئی آدمی حرام نہیں کھا سکتا۔ حضور اکرم ﷺ کے نہ کھانے کی دو وجوہات تھیں، جو احادیث میں آ گئیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے کراہت آتی ہے اور دوسری جگہ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے گوشت سے ایک بدبو پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ مجھے اللہ کے فرشتوں سے ہر وقت ہمکلام ہونا ہوتا ہے اور ان کو یہ بدبو اچھی نہیں لگتی، اس وجہ سے میں نہیں کھاتا۔

حضور اکرم ﷺ لہسن نہیں کھاتے تھے، اگرچہ یہ حلال ہے، لیکن چونکہ منہ میں بدبو پیدا ہوتی ہے، اس لئے



حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص تھوم (لہسن) کھالے، وہ مسجد میں نہ آئے۔ کیونکہ اس کے منہ سے ہوا آئے گی۔ یا ان کی بدبو ختم کردو کہ ان کو نمک سے دھوڈالو یا پکا ڈالو، تاکہ بدبو پیدا نہ ہو تو کھا کر مسجد میں جا سکتے ہیں۔

ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ایمان کا ثبوت عقلی دلائل سے:

اللہ پاک نے ہر چیز کو بیان فرمایا ہے۔ لیکن ان جدید لوگوں کو سمجھ نہیں آتا، کیونکہ ان کی عقل پر جرائم اور قرآن کے انکار کی وجہ سے قدرت ایک پردہ ڈال دیتی ہے، حق بات ان دل و دماغ کے اندر داخل نہیں ہو سکتی۔ جن کے دل و دماغ کے اندر سیدنا ابو بکر صدیق، عمر فاروق رضی اللہ عنہما کا بغض بیٹھ گیا ہو، ان کو لاکھ سمجھاؤ اور حضور اکرم ﷺ کے روضہ پر لے جاؤ کہ حضور اکرم ﷺ کا مزار ہے اور یہ ابو بکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما کا مزار ہے۔ وہ کہے گا: میں سلام نہیں پڑھتا۔ اللہ کی طرف سے دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔

ایک طرف تو کہتے ہیں کہ مدینہ کی مٹی میں شفاء ہے تو حضور اکرم ﷺ کے روضہ کی مٹی میں کتنی برکت ہوگی۔ جس میں ابو بکر صدیق، عمر فاروق رضی اللہ عنہما سوئے ہوئے ہیں اس میں شبہ ہے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ جس نے سب سے پہلے کلمہ پڑھا وہ بھی مسلمان نہ ہو تو چودہ سو سال بعد کلمہ پڑھنے والے کا کیا اعتبار سے ہے؟ تمہیں ماں باپ نے پڑھایا اور انہیں محمد رسول اللہ ﷺ نے کلمہ پڑھایا، تیرے ماں باپ کا پڑھایا ہوا کلمہ بڑا پکا ہے اور جن کو میرے نبی نے کلمہ پڑھایا، ان کا کچا تھا۔

تم اپنے بچے کو بزرگ کے پاس یا تبلیغی جماعت کے پاس بھیجتے ہو، وہ ماہ دو ماہ میں ٹھیک ہو جاتا ہے اور جن کی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں زندگی گزر گئی، ان کی کوئی اصلاح نہیں ہوئی؟ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں جو چڑھ جائے وہ عذاب سے جائے اور جو مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ دفن ہو جائے وہ نہ بچے۔

ان کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی۔ ان کو اتنا بغض ہے کہ اپنی کتابوں میں وظیفہ لکھا ہوا ہے کہ صحابہ کا نام لکھ کر جوتا مارنے سے بیماری چلی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت دے، اللہ ان کی آنکھوں کو کھول دے اور ان سے پردوں کو ہٹا دے اور ان کو معنوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت نصیب فرما دے۔

﴿قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾ کی ایک تفسیر:

''غُلْفٌ'' کا ایک معنی یہ ہے کہ ہمارے دل سمجھتے نہیں ہیں۔ ایک ''غُلْفٌ'' ہے لام کی جزم کے ساتھ اور ایک

"غُلُفٌ" ہے لام کے ضمہ کے ساتھ۔ اور جب لام کے ضمہ کے ساتھ ہو تو معنی ہوگا کہ ہمارے دل گویا کہ برتن ہیں، تورات وانجیل کے علم سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور وہ کہتے تھے کہ ہمیں تمہارے علم اور کتاب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اور ایک قول ہے: "لَمْ تُخْتَنْ" کہ ہمارے دلوں پر پردہ ہے۔ جیسے بغیر ختنہ کے پردہ پڑا ہوتا ہے، اسی طرح گویا کہ ان کے دل ختنہ کئے ہوئے نہیں ہیں، ختنہ اس لئے کرتے ہیں، تاکہ پاکی حاصل ہو جائے، گندی چیز اندر نہ رہے اور انسان کے عضو کا حصہ صاف ہو جائے۔

﴿فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ﴾ ان میں سے نہیں ایمان لائیں گے، مگر تھوڑے لوگ۔ اور ایک ترجمہ یہ ہے کہ نہیں ہے ان کا ایمان، مگر تھوڑا۔ یعنی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعض باتوں پر تو ایمان ہے اور بعض سے انکار ہے، اور تھوڑی باتوں پر ایمان بدلنے سے آدمی مسلمان نہیں بنتا۔ مسلمان تب بنتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی کامل شریعت پر ایمان لائے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آگیا تو ان پر ضروری تھا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر ایمان لاتے۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا، اب ان کو سابقہ کتابوں پر ایمان کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۲۴، البقرۃ: الآیۃ: ۸۸]

﴿وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ [البقرۃ: ۸۹]

اور جب (ان یہودیوں) کے پاس اللہ کی طرف سے کتاب (قرآن) آیا جو تصدیق کرتا ہے اس کی جو اُن کے پاس ہے، یہ (نزولِ قرآن سے) پہلے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے) کافروں پر فتح کی دعا مانگا کرتے تھے۔ پھر جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے پاس آئے جن کو یہ حق جانتے تھے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کر دیا۔ پس کافروں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔

گزشتہ آیات سے ربط:

اس آیت کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی مزید شقاوتوں کی خبر دی ہے کہ جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب آئی جو سابقہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کفار یہود کا یہ عالم ہے کہ

جب اللہ تعالیٰ نے قرآن اُتارا اور قرآن جامع، کامل، مکمل کتاب ہے، جو سابقہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے تو اُصولاً اور عقلاً قاعدہ یہ ہے کہ وہ ایسی کتاب کو فوراً مان لیتے کہ اللہ نے ایسی کتاب تو نہیں بھیجی جو اُن کی نفی کر رہی ہو۔

❁......تصدیق ایک تو اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی کتابیں اُتاری ہیں جن میں تورات اور انجیل بھی اللہ کی کتابیں ہیں۔

❁......دوسری تصدیق یہ تھی کہ جن جن لوگوں کو تورات، زبور اور انجیل ملی، وہ اللہ کے برحق پیغمبر، سچے نبی اور سچے رسول تھے۔

❁......تیسری تصدیق یہ تھی کہ جو بنیادی اور اُصولی مسائل ہیں، وہ سب کتب میں یکساں تھے۔ جیسے تورات، انجیل بھی توحید کی دعوت ہے، قرآن میں بھی توحید کی دعوت ہے۔ ان کتب میں بھی نبوت و رسالت کا مسئلہ موجود ہے، قرآن بھی نبوت و رسالت کا مسئلہ سمجھا رہا ہے۔ تورات و انجیل میں بھی معاد کا مسئلہ موجود ہے کہ قیامت برحق ہے، ہم نے مرنا ہے، پھر اُٹھنا ہے۔

اور فروعی مسائل میں اختلاف ہوا، ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور یہ تبدیلیاں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے حسبِ حال رحم فرمایا اور احکام تبدیل فرما دیئے۔

تسبیح و تنزیہ کی وضاحت:

جب تک آدمی کو تین چیزوں کی سمجھ نہ آئے، توحید کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا۔ (۱) تنزیہ، (۲) تنویع، (۳) تکبیر۔

کتابوں کے اندر ''تنزیہ'' کی تفصیل موجود ہے۔ مختصراً اللہ تعالیٰ تمام صفاتِ نقصان سے پاک ہے۔ مثلاً: آپ نماز شروع کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ''، رکوع میں کہتے ہیں: ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ''، سجدے میں کہتے ہیں: ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى''، طواف میں کہتے ہیں: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ''، نماز کے بعد وظیفہ پڑھتے ہیں: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ''، اسی طرح قرآن مقدس میں جہاں بھی لفظ ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ①﴾ [الحدید:۱]، ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ①﴾ [الجمعۃ:۱]، ﴿وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۗ إِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ⑭﴾ [بنی اسرائیل:۴۴] آیا ہے، یہ سب تنزیہ ہے۔

تسبیح کا معنی ہوتا ہے: تنزیہ بیان کرنا، اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا کہ ہمارا رب اس صفتِ نقصان سے پاک ہے جو اللہ کی شان کے مطابق نہ ہو۔ ہمارا رب پاک ہے۔ جب تک پاکی کا عقیدہ نہ بنے توحید کی بنیاد نہیں بنتی۔ جیسے

یہودیوں نے تورات کے اندر ایک جگہ تحریف کر کے لکھا ہے کہ جب نوح علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی کہ یہ لوگ اسلام نہیں لاتے، یہ بغاوت میں اتنے پکے ہوگئے ہیں کہ اگر ان کی اور بھی نسل پیدا ہوگی تو وہ کافر ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے دعا مانگی: اے اللہ! اس قوم کو ہلاک اور برباد کردے۔ اللہ نے دعا منظور کر کے ایک طوفان بھیجا اور ساری دنیا غرق ہوگئی، ماسوائے ان لوگوں کے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے تھے۔

یہودی اس واقعہ کو لکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ جب لوگ غرق ہوگئے تو اللہ تعالیٰ......معاذ اللہ......رونے لگ گئے اور روتے روتے آنکھیں سوج گئیں، فرشتے عیادت کرنے کے لیے آئے کہ اب آنکھوں میں آرام ہے؟ تکلیف کم ہوگئی ہے؟ جس کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ رو رہا ہے، طوفان روک نہیں سکتا،......نعوذ باللہ......اللہ رو رہا ہے اور کسی کو بچا نہ سکے۔ یہ تو نقص ہے، اور اللہ تعالیٰ صفتِ نقصان سے پاک ہے۔ جو کمزور ہو وہ خدا نہیں ہوسکتا۔ اس لیے جب تک تنزیہ کی صفت نہ آئے توحید کا عقیدہ اس وقت تک نہیں آسکتا۔

اسی لیے یہود و نصاریٰ مارے گئے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنالیا اور بی بی مریم علیہا السلام کو......نعوذ باللہ......اللہ کی بیوی بنا دیا، مشرکین مکہ نے اللہ کے تمام فرشتوں کو......نعوذ باللہ......اللہ کی بیٹیاں بنا دیا۔ پروردگار عالم کی صفت ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝﴾ ہے، وہ نہ جنتا ہے اور نہ جنا گیا ہے۔ وہ تو دونوں چیزوں سے پاک ہے۔ یہ دونوں چیزیں نقصان اور کمزوری کا باعث ہیں، اللہ ان سے پاک ہیں۔

بعض لوگوں نے نشہ میں بیٹھ کر کتاب لکھ دی کہ اللہ میاں نے حضرت ابوالحسن خرقانی رحمہ اللہ سے کشتی لڑی۔ بہرحال اللہ میاں غالب آگئے، کیونکہ وہ اللہ یہاں دو سال بڑے تھے۔ (کتاب: فوائد فریدیہ) اور کسی نے لکھ دیا کہ اللہ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں سیر کر رہے تھے، اللہ میاں کا پاؤں کیلے کے چھلکے پر آگیا......نعوذ باللہ......خدا گرنے لگے تو پیر صاحب نے پکڑ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم دستگیر ہو۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ یہ تنزیہ کے خلاف ہے، اس کے بغیر توحید کچھ نہیں آسکتی۔ اللہ نیند سے پاک ہے، ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ کیونکہ نیند نقصان ہے، غفلت ہے۔ اسی طرح مر جانا، فنا ہو جانا صفتِ نقصان ہے، اللہ اس سے بھی پاک ہے۔ اس لئے یہودی، نصرانی اور مشرکین مارے گئے، کیونکہ انہوں نے اللہ کے ساتھ نقصان والی صفتیں جوڑ دیں۔ اس لئے اپنے عقیدہ کو ٹھیک کریں، جب تک توحید نہیں آئے گی، جنت نہیں ملے گی۔

تنزیہ کا معنی ہے کہ تمام کمالات اس کی ذات میں ہیں، وہ سراپا کمال ہے، اس کے کمالات کا کوئی مقابلہ نہیں

کر سکتا۔

تکبیر کا معنی ہے کہ وہ سب سے بڑا ہے، ساری دنیا اس سے نیچے، ساری دنیا اس کی محتاج، ساری دنیا اس کے بندے، اس سے مانگنے والے ہیں، کبریائی صرف اسی کی ذات کو زیبا ہے۔ جب تک دل میں خدا کی بڑائی نہ بیٹھے، اس وقت تک توحید نہیں آسکتی۔ اگر ہمارے دماغ کے اندر ہو کہ فلاں بڑا ملک ہے، فلاں سپر طاقت ہے۔ یہ مسلمان کے عقیدے کے خلاف ہے۔ سپر طاقت اللہ ہے، وہ سب سے بڑا اور سب سے عظمت والا ہے، وہ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ [البروج:۱۶] ہے، سب اسباب کے محتاج ہیں اور اللہ خالق الاسباب ہیں۔ اگر تیرے دل و دماغ میں اللہ سے بڑا اور کوئی ہے تو تُو کافر ہے، مسلمان ہیں اور اگر تُو خدا کی عظمت کے مقابلے پر کہتا: یا پیر! یا معین الدین! یا غوث الاعظم! کہے تو یہ خداؤں کی لسٹ لگ گئی ہے، سب پکار میں برابر آگئے اور جو خدا کے برابر کسی کو جانے، وہ مسلمان نہیں ہوتا۔

ہم اللہ کے ولیوں کے دشمن نہیں ہیں، اللہ کے ولیوں کا دشمن کافر ہوتا ہے۔ اللہ کے ولی برحق ہیں، اللہ کے ولیوں کی کرامات کا قرآن میں بیان ہے، ان کا کوئی انکار نہیں کر سکتا اور یہ بھی نہیں کہ تم ولی کو نبی بنا دو اور نبی کو خدا بنا دو۔ نبی نبی ہوتا ہے، ولی ولی ہوتا ہے اور خدا خدا ہوتا ہے۔ اگر تم نے اللہ کی عظمتوں کے برابر کسی کو کیا تو تم مر گئے، کافر ہو گئے۔ اسی مسئلے کے اندر یہود اور نصاریٰ مارے گئے، جس میں آج جاہل مسلمان مبتلا ہیں۔

تفسیر:

قرآن میں کہیں لفظ ''الکتاب'' معرّف باللام آتا ہے، جیسے: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ﴾ اور کہیں ''کتابٌ'' تنکیر کے ساتھ آتا ہے، جیسے: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ﴾ اور ﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ﴾۔ جہاں لفظ ''کتاب'' معرّف باللام ہو تو مراد ''قرآن'' ہوتا ہے اور جہاں تنکیر کے ساتھ آئے، وہاں کتاب کی عظمتِ شان کا بیان ہوتا ہے کہ کتاب کہلانے کا مستحق قرآن ہے، باقی سب کتابیں اسی کی محتاج ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کی حدیث اسی کی تفسیر ہے۔

﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ اور ایسی کتاب جو تصدیق کرنے والی ہے اس شریعت کی جو اُن کے پاس ہے۔

﴿وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ حال یہ ہے کہ یہ مدد مانگتے تھے ان لوگوں پر جو کافر ہیں۔ یعنی جب یہود کا کافروں سے مقابلہ ہوتا یا لڑائی جھگڑا ہو جاتا تو کافروں کو کہتے تھے کہ تم ہمارے ساتھ لڑو، تمہارے لڑنے کے ابھی تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔ ایک نبی آخر الزمان پیدا ہوگا، جس کا نام ''محمد'' ہوگا، ہم اس پر ایمان

لائیں گے اور اس نبی کے غلام اور اُمت بن کر تم سے لڑیں گے اور ہم تمہیں ایسے کاٹ ڈالیں گے جیسے قوم عاد اور قوم ارم کو کاٹا گیا تھا۔ ﴿فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرۃ:۸۹] پس لعنت ہو اللہ کی ان پر جو انکار کرنے والے ہیں۔ یہاں "کافرین" سے مراد یہود ہیں، کیونکہ بنو اسرائیل کا قصہ چلا آ رہا ہے، ورنہ اللہ کی لعنت ہر کافر پر ہے، چاہے وہ کافر کسی نسب میں ہو یا کسی قوم میں ہو۔

حضرت عاصم بن عمر و حضرت قتادہ الانصاری سے اور وہ اپنے بزرگوں سے روایت نقل کرتے ہیں۔ خدا کی قسم ہے! یہ آیات ہمارے اور اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ یہودی کہتے تھے: وہ زمانہ قریب آ گیا ہے جب اللہ کے نبی پیدا ہوں گے، ہم ان کی اتباع کریں گے، ان کے آنے کا وقت قریب آ چکا ہے، ان کی اتباع کرنے کے بعد جب ہم ان سے مل جائیں گے تو ہم تم سے سارے بدلے لیں گے، تمہیں ایسے قتل کریں گے جیسے عاد اور ارم کو کیا گیا۔

اور ان کو یہ خیال تھا کہ وہ ہمارے درمیان پیدا ہوگا۔ لیکن جب اللہ نے قریش بنو ہاشم میں نبی پیدا فرمایا تو الحمد للہ! ہم نے حضور اکرم ﷺ کی غلامی کی اور یہ یہود کافر ہو گئے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرۃ:۸۹] کفر کرنے والوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول یہ بھی ہے: ﴿وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ [البقرۃ:۸۹] کا معنی ہے کہ جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ خاتم الانبیاء پیدا ہوں گے تو ہم ہم حضور اکرم ﷺ کی امداد کریں گے اور ان (مشرکین) کے خلاف لڑیں گے اور ان سے بدلہ لیں گے۔ حالانکہ یہ بات نہیں تھی، وہ جھوٹ بولتے تھے۔

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک واقعہ کیا ہے کہ یہودی حضور اکرم ﷺ کی ذات سے اوس اور خزرج کے قبیلوں کے خلاف مدد پکڑتے تھے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور حضرت بشر بن البراء بن معرور رضی اللہ عنہ نے کہا: اے یہودیو! تمہیں کیا ہو گیا؟ تم اللہ سے ڈرو اور حضور اکرم ﷺ پر ایمان لے آؤ۔ تم لوگ ہی ہمیں حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے بارے میں خبر دیتے تھے، حضور اکرم ﷺ کی صفات تم بیان کرتے تھے، حضور اکرم ﷺ کی نشانیاں تم بتانے والے تھے۔ اب جب اللہ کے نبی آ گئے ہیں تو تم کفر کرتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور ایمان لے آؤ۔ وہ کہنے لگے: جو ہم نے تم کو کہا تھا، یہ وہ نبی نہیں ہیں اور جو ہم تم کو صفات بیان کرتے تھے، وہ ان میں نہیں ملتیں۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/ ۱۲۴، البقرۃ: الآیۃ:۸۹]

چودہ سو سال بعد بھی بخاری شریف کو حفظ کرنے والے:

ہمارے ایک ساتھی نے کچھ سال قبل ایک مدرسہ بنایا اور ایک نیا سلسلہ شروع کیا کہ اپنے مدرسہ میں طلبہ کو ''بخاری شریف'' حفظ کراتے ہیں۔ ماشاء اللہ! سنا ہے کہ کئی لڑکے حافظ بن گئے۔ بڑی بات ہے کہ چودہ سو سال بعد اللہ نے حضور اکرم ﷺ کی حدیث کی حجیت کو ثابت کرنے کے لئے ایسا ذریعہ پیدا کر دیا۔

حدیث پاک گویا قرآن پاک کی تفسیر ہے۔ حالانکہ حافظے ختم ہو گئے۔ پہلے دور میں عام بدو کو بھی پچاس ہزار اشعار یاد ہوتے تھے، جب پڑھنے کے لئے کھڑے ہوتے تو لگا تار دو تین دن یاد سے پڑھ رہے ہیں۔ اس انحطاط اور بدعملی کے دور میں کہ جب ہم نام کے مسلمان رہ گئے ہیں، ایسی مثال سامنے آجائے کہ بخاری شریف یاد ہو جائے، کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ بخاری شریف عظیم کتاب ہے اور ''أَصَحُّ الْكُتُبِ بَعْدَ كِتَابِ الله'' ہے، اللہ کے قرآن کے بعد صحیح کتاب ہے، سوائے مرجوع و منسوخ روایات کے اس پر آدمی آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتا ہے۔ اللہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر اور تمام محدثین اور تمام ائمہ فقہاء کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ مسلمانوں کا کوئی ایسا مدرسہ نہیں ہو سکتا جہاں بخاری شریف نہ پڑھائی جاتی ہو۔

روس سے آزاد شدہ ریاستوں میں احیائے دین:

ان بزرگوں نے جو اثرات ثمرقند و بخارا میں چھوڑے تھے، وہاں کمیونسٹ نے ستر سال تک تالے لگا کر رکھے۔ ستر سال کے بعد جب تالے ٹوٹے ہیں تو وہاں قرآن و حدیث موجود ہے۔ اللہ پاک ان لوگوں کو جزائے خیر دے جو وہاں کام کر رہے ہیں۔ ہمارے ساتھی ہیں اور ایک والد صاحب کے شاگرد اور ایک میرے شاگرد بھی ہیں۔ انہوں نے ایک سو چھپن مساجد کی ان ریاستوں کے اندر بنیاد رکھی ہے۔ دو سو استاد وہاں قرآن و حدیث پڑھا رہے ہیں اور دس ہزار طالب علم پڑھ رہے ہیں۔ یہ محنت ہمارے ساتھیوں کی ہے اور جو پوری دنیا کر رہی ہے اس کا پتہ نہیں ہے۔

تعلیم الاسلام، تقویۃ الایمان، حضرت مفتی کفایت اللہ، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور اسی طرح اور بزرگوں کی کتابیں اُزبک زبان کے اندر لاکھوں کی تعداد میں تراجم ہو کر شائع ہو گئے ہیں۔ شیخ نعمان صاحب ان کے آباؤ اجداد تاشقند کے ہیں، بتاتے ہیں کہ وہاں اتنی پابندی کے باوجود لڑکے تو لڑکے، لڑکیاں بھی حافظاتِ قرآن

موجود ہیں، یعنی لوگوں کے سینوں سے اسلام نہ نکل سکا۔ بظاہر دشمن نے دبائے رکھا، مسجدیں بند ہیں، اذانیں نہیں ہوتی تھیں، جماعت نہیں ہوتی تھی، لیکن اسلام کو کوئی دبا نہیں سکتا۔ اللہ نے اس میں ایک ایسی قوت رکھی ہے کہ اس کو آپ جتنا مٹائیں گے، یہ اتنا اُبھرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم پھونکیں مار کر یہ چراغ بجھا ڈالیں۔ تم جتنی بجھانے کی کوشش کرو گے اللہ اس نور کو اتنا چمکائے گا۔

یہ گناہوں کی وجہ سے جھٹکے لگ جاتے ہیں، ورنہ اگر ہم اللہ کی طرف لوٹیں تو اللہ کی رحمت دیر ہی نہیں کرتی ہے۔ آپ ایک قدم آگے بڑھیں، اللہ کی رحمت دس قدم آگے آتی ہے۔

آسمان وزمین میں پہلا گناہ حسد تھا:

علماء نے لکھا ہے کہ سب سے پہلا گناہ جو آسمانوں میں ہوا وہ بھی حسد ہے اور سب سے پہلا گناہ جو زمین پر ہوا وہ بھی حسد ہے۔ ابلیس نے آسمانوں پر حسد کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو یہ شان مل گئی اور مجھے نہ ملی۔ اور زمین میں قابیل نے اپنے بھائی ہابیل سے حسد کیا کہ اس کے حصے میں بیوی بھی خوبصورت آگئی اور اس کے حصے میں نیکی بھی آگئی اور وہ جو خیرات کرتا ہے اللہ قبول کر لیتے ہیں، میں جو کرتا ہوں وہ قبول نہیں ہوتی، اور آدم علیہ السلام کو بھی ان سے زیادہ محبت ہے، قابیل حسد میں مبتلا ہوا اور اس نے اپنے بھائی کو قتل کر ڈالا۔

حسد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھے اور یہ تمنا کرے کہ اس سے یہ نعمت زائل ہو جائے اور مجھے مل جائے۔ اس طرح کسی کی عزت کو دیکھ کر حسد کرنا، اقتدار، دولت کو دیکھ کر حسد کرنا، کسی کی اولاد کو دیکھ کر حسد کرنا۔ حاسد اللہ کی تقسیم قسمت کا منکر ہوتا ہے، اللہ کے فیصلے کا انکار کرتا ہے کہ اس کو امیر کیوں بنایا ہے؟ اور مجھے غریب کیوں بنایا ہے؟ وہ الد کی تقدیر کا منکر ہوتا ہے۔ دعا کریں اللہ ہر مسلمان کو حسد سے بچائے۔

''غبطہ'' علیحدہ چیز ہے۔ ''حسد'' کا معنی ہوتا ہے: دوسرے سے زوالِ نعمت کی نیت کی جائے۔ ''غبطہ'' یہ ہے کہ کسی آدمی کو دیکھا، مثلاً بڑا تہجد گزار ہے، شب بیداری کرتا ہے اور اس کی اولاد بھی بڑی فرمانبردار ہے، اللہ نے اس کو دین اور دنیا بھی دی ہوئی ہے، وہ کہتا ہے: اے اللہ! اس کو بھی مبارک کر اور مجھے بھی عطا فرما۔

حاسد آدمی اپنے حسد میں خود جلتا رہتا ہے، یہ اس کے لئے سب سے بڑی سزا ہے۔ اس لیے حسد سے بچیں۔ یہودیوں نے جو بربادی قبول کی، اس کی وجہ حسد تھا۔ کیونکہ عربوں سے ان کا جھگڑا تھا اور نبوت عرب میں آگئی تو

انہوں نے کہا: ہم نہیں مانتے۔ ابوجہل جانتا تھا اور اقرار کرتا تھا کہ یہ نبی بالکل سچے ہیں۔ اس سے کہا گیا: مانتے کیوں نہیں ہو؟ اس نے کہا: ہمارے اور ان کے خاندان کا مقابلہ ہے، کبھی ان کا امیر بنتا ہے اور کبھی ہمارا امیر بنتا ہے۔ اب ان کے خاندان میں نبوت آگئی تو ہم نبی تو نہیں بن سکتے، اس لئے ان کو نہیں مانیں گے۔ یہ بھی حسد تھا۔

﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰي غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾ [البقرۃ:۹۰]

جس کے بدلہ میں انہوں نے خود کو بیچا یہ کہ انہوں نے کفر کیا اس کا جس کو اللہ نے اُتارا حسد کرتے ہوئے، اللہ اپنے فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے (رسول بنا کر وحی) اُتارے۔ پس یہ (اللہ کی طرف سے) غصہ پر غصہ کے ساتھ لوٹے اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

ان آیات میں بنی اسرائیل کی مزید بدبختی، غلط عقائد اور غلط اعمال کے بارے میں ذکر فرمایا ہے کہ انہوں نے کیا بُرا سودا کیا ہے۔

مفسرین نے یہاں ﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ﴾ میں دو قول نقل کیے ہیں: چنانچہ بعض مفسرین فرماتے ہیں: ''اِشْتَرَوْا'' شِرَاء (خریدنا)، یعنی کیا بُری چیز انہوں نے اپنے نفسوں کے بدلے میں خریدی۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ لفظ ''شِرَاء'' کبھی بیع میں بھی استعمال ہوتا ہے کہ کیا بُرا سودا کیا کہ انہوں جانوں کو بیچ ڈالا۔ جس کو بیچا وہ جان ہے اور جو اس کے بدلے میں خریدا وہ کفر ہے۔ اتنا بڑا گھاٹے کا سودا ہے کہ اپنی جانوں کو دے کر کفر کرلیا۔ یا اس کا معنی ہے کہ انہوں نے کفر کے بدلے میں اپنی جانوں کو خرید لیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے...... نعوذ باللہ...... جیسے آدمی کوئی چیز خرید کر اس کا مالک بن جاتا ہے کہ ہم نے اپنی جانیں خرید لی ہیں، اب ہم پر کیسے عذاب ہوسکتا ہے؟ ان جانوں کے اندر اور کسی کا تصرف کیا ہوسکتا ہے؟

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ پر انکارِ ختم نبوت کا اعتراض و جواب:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''تحذیر الناس'' میں بڑی عظیم اور بڑی دقیق بحث کی ہے، اس کے پڑھنے اور سمجھنے کے لیے علم کی ضرورت ہے۔ ہم جیسے طالب علموں کی فکر سے بالاتر کتاب ہے۔ اس بحث



سے مخالفین، مبتدعین نے بڑا شور مچایا ہے کہ یہ دیوبندی حضور اکرم ﷺ کو آخری رسول نہیں مانتے۔

اصل وجہ یہ ہے کہ ان بے چاروں کو بات سمجھ نہ آئی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ ایک چیز آخری ہوتی ہے اور اس کا آخری ہونا حقیقی ہے یا اس کا آخری ہونا مجازی یا صوری ہے۔ (اب اتنے دقیق مسئلے کو سمجھنے کے لئے بہت بڑے علم کی ضرورت ہے)۔ حضور اکرم ﷺ کو اللہ نے جو خاتم الانبیاء والمرسلین بنایا ہے تو آپ ﷺ کا آخری ہونا صرف ظاہری نہیں، بلکہ ظاہری بھی ہے اور باطنی بھی ہے، حقیقی بھی ہے اور معنوی بھی ہے۔ اب جو حقیقی آخر ہوگا اس کا آخری ہونا اتنا محقق ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی اگر علی سبیل التمثال کوئی اور چیز آئے تو اس کے آخری ہونے کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس کی ابتداء ''سورۃ الفاتحہ'' سے کی اور سب سے آخری ''سورۃ الناس'' ہے، حالانکہ باعتبار نزول کے سورۃ الناس آخری نہیں ہے اور سورۃ الفاتحہ باعتبار نزول کے اول آیت نہیں ہے، بلکہ سورۃ العلق کی پانچ آیات ہیں اور آخری آیات ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدۃ: ۳] اور ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝﴾ [النصر: ۱] اور ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ﴾ [البقرۃ: ۲۸۱] جو آخری وقت میں نازل ہوئیں، لیکن ترتیب نزول الگ تھی اور ترتیب قراءت میں آخری سورۃ ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝﴾ [الناس: ۱] ہے۔

اس پر علماء نے ایک نکتہ بھی لکھ دیا ہے جیسے سورۃ الفاتحہ شروع کرتے ہیں تو کیسے پڑھتے ہیں؟ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ آپ حرف باء سے شروع کریں گے اور جب ختم کریں گے تو ''النّاس'' کے سین پر ختم کریں گے۔ اور جب ان دونوں کو ملائیں گے تو مطلب یہ ہوگا کہ بات ختم ہوئی۔ اگر بفرض محال آج اگر کوئی آدمی اپنے پاس ترجمہ پڑھنے کے لئے سورتیں لکھے کہ سورۃ الناس پہلے لکھ دے اور سورۃ الفاتحہ بعد میں لکھ دے تو کیا اس میں سورۃ الناس کے آخری ہونے میں کوئی خطرہ ہو سکتا ہے؟ کیونکہ ہر آدمی کہے گا کہ سورۃ الناس بعد میں ہے، اس بے چارے نے پڑھنے کے لئے پہلے لکھ دی ہے۔

یہی بات حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے فرمائی تھی۔ لوگوں نے اس کو سمجھا نہیں اور فتوے لگانے شروع کر دیئے کہ اب اگر آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی آ بھی جائے تو آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ حضور اکرم ﷺ حقیقتاً بھی آخری ہیں، ظاہراً بھی آخری ہیں اور معنوی طور پر بھی آخری ہیں۔ اس لئے

اب اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُتریں گے تو ان سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ وہ تو پہلے سے نبی تھے اور وہ بنو اسرائیل کے آخری نبی تھے، اس کے بعد حضور اکرم ﷺ آ گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو اس طرح آخری بنتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے خاندان میں آخر میں آئے اور ان کا اس طرح آخری ہونا کوئی حقیقی نہیں تھا۔ حقیقی ختم نبوت کا تاج حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ملا۔

اس کی حضور اکرم ﷺ نے کافی پیاری مثال دی ہے کہ ایک عام آدمی کو بھی سمجھ آ جائے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزیں ہیں: پہلی چیز ہے: ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ'، اگر اللہ کی توحید پر اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت پر ایمان نہیں تو بات ختم ہو گئی۔ جب ایمان آ گیا تو اقامت صلوٰۃ (نماز کا قائم کرنا)، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا، اللہ کے گھر کا حج طاقت والوں کو ادا کرنا، اب آ کر اسلام مکمل ہو گیا۔

اب اگر ایک آدمی زکوٰۃ نہیں دیتا تو گویا ایک دیوار نہیں، روزے نہیں تو دوسری دیوار نہیں، اگر نماز نہیں تو تیسری دیوار ختم، دولت کے باوجود حج نہیں کرتا تو چوتھی دیوار ختم اور اگر کلمۂ توحید ہی نہیں تو اصل ہی ختم ہو گیا۔ حضور اکرم ﷺ نے بناء کے ساتھ مثال دی، تا کہ ہر آدمی کو مثال سمجھ آ سکے۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے اپنی ختم نبوت کی مثال بڑی عجیب بیان فرمائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک آدمی بلڈنگ بناتا ہے، ساری اینٹیں لگ گئیں اور صرف ایک اینٹ اس میں نہیں لگی۔ جو بھی دیکھنے والا آئے گا تو کہے گا: ماشاء اللہ! عمارت تو مکمل ہو گئی ہے، ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے، یہاں اینٹ لگنی چاہیے تھی۔ جب وہ اینٹ لگا دو تو عمارت مکمل ہو گئی۔ اب ایک محل میں مثلاً ایک لاکھ چوبیس ہزار اینٹیں لگانے کی جگہ تھی، ایک اینٹ باقی تھی، جب وہ لگ گئی تو جگہ نہ رہی۔ اگر آپ ایک اور اینٹ لگائیں گے تو کہاں لگائیں گے؟ اس لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: نبوت کے محل میں جو آخری اینٹ کی جگہ تھی، وہ اللہ نے مجھے بھیج کر مکمل کر دی ہے۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۳۵۳۵، باب: خَاتِمِ النَّبِيِّيْنَ ﷺ]

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے ختم نبوت کی تین قسمیں قرار دی ہیں: (۱) ختم نبوت مکانی (۲) ختم نبوت زمانی (۳) ختم نبوت مرتبی۔ ختم نبوت کا مرتبہ تو حضور اکرم ﷺ کو سب انبیاء کے بعد نبی بنانے سے پہلے مل گیا تھا، باقی انبیاء کو نبوت کا مرتبہ بعد میں ملنے سے آپ ﷺ کی ختم نبوت پر کوئی فرق نہیں پڑا، اسی طرح حضور اکرم ﷺ اس وقت بھی خاتم النبیین تھے جب باقی انبیاء دنیا میں آتے رہے۔ آپ ﷺ زمانہ کے اعتبار سے خاتم النبیین ہیں،

جب آپ ﷺ دنیا میں تشریف لائے تو پھر اور کوئی نیا نبی نہیں آ سکتا اور نہ ہی مکانی طور پر کوئی آپ کے بعد نبی بن سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے متعلق آپ ﷺ نے خود ہی فرما دیا تھا جبکہ وہ نئے نبی نہیں، وہ بھی اپنی نبوت کے ساتھ حضور اکرم ﷺ سے پہلے آ چکے ہیں۔

اگر اب بھی کوئی فتنہ پرور حضرت نانوتوی رحمہ اللہ پر انکارِ ختم نبوت کا الزام لگائے تو اس کی اپنی حماقت ہے۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سے تو اس بات میں حضور اکرم ﷺ کی ختم نبوت کی عظمت ہی آشکارا ہو رہی ہے۔ (امداد اللہ انور)

ان آیات کے اندر بھی مثال دی ہے کہ ان لوگوں نے اپنی جانوں کے بدلے کفر کو خرید ا بغض اور عناد کی وجہ سے کہ اللہ نے بنو اسرائیل کی بجائے اپنا نبی بنو اسماعیل میں کیوں بھیجا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ میری مرضی اور میرا فضل ہے، میں جس پر چاہوں فضل کروں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جیسے روزی تقسیم کرنے میں ہم سے نہیں پوچھتے تو نبوت والی نعمت کی تقسیم میں وہ ہمارے کیسے محتاج ہو سکتے ہیں؟ اس کی مرضی ہے۔ ان کے سودے کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ اللہ کے غضب پر غضب کے مستحق ہوتے گئے اور ان میں اگر اور برائیاں نہ بھی ہوں تو کفر ہی عذاب کے لئے کافی ہے۔ کافروں کے لئے اہانت لگانے والا عذاب ہے۔

مسلمان کو عذاب ہونے کی وجہ:

اس سے ایک اندازہ نکلا کہ مسلمانوں کو بھی عذاب ہو سکتا ہے۔ (اللہ تبارک وتعالیٰ ہر مسلمان کو بغیر عذاب اور بغیر حساب کے جنت نصیب فرمائے)۔ اللہ پاک چاہیں تو مسلمان کو بھی عذاب ہوگا، لیکن وہ عذاب اہانت والا نہیں ہوگا، وہ صرف کافروں کو ہوگا۔ جیسے کپڑا میلا ہو جائے تو اس کو گرم پانی میں ڈالتے ہیں، گرم پانی میں بھی صاف نہ نکلے تو اس میں کیمیکل ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں: اس کو بھی بھٹی پر چڑھاؤ۔ اب اس کپڑے کو جلانا مقصد نہیں ہوتا، بلکہ اس کی میل کو جلانا مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اگر کسی گناہ گار مسلمان کو جہنم میں ڈالا تو اس کے گناہوں کو جلانا اور اس کو پاک کرنا مقصود ہوگا۔ جب وہ پاک صاف ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں بھیج دیں گے۔ اس لئے مومن کے عذاب میں اور کافر کے عذاب میں بڑا فرق ہے، کافر کو عذاب اہانت کے لیے ہوگا اور مسلمان کو عذاب طہارت کے لیے ہوگا۔

﴿فَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰي غَضَبٍ﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی پہلی ناراضگی یہ تھی کہ انہوں نے تورات پر عمل نہ کیا اور اس کو بدل ڈالا۔ پھر اللہ تعالیٰ کا غضب آیا کہ وہ حضور اکرم ﷺ کے دشمن بن

گئے۔ ﴿فَبَاءُوْ﴾ کا معنیٰ "رَجَعُوْا" بھی ہے اور "اِسْتَوْجَبُوْا" بھی ہے کہ وہ اس بات کے مستحق بن گئے، اپنے اوپر اللہ کے قہر کو واجب کرلیا۔

حضرت ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ پہلے ان پر غضب اس بات پر آیا کہ انہوں نے انجیل کا بھی انکار کیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی انکار کیا اور پھر ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب اس لئے آیا کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کا انکار کیا اور قرآن کا بھی انکار کیا۔

حضرت سدی فرماتے ہیں کہ یہود پر پہلا غضب اس وقت ہوا جب انہوں نے گائے کے بچھڑے کی عبادت کی تھی، اس کو خدا بنالیا تھا۔ اور دوسرا غضب اس وقت آیا جب انہوں نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ کفر کیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۲۵، البقرۃ: الآیۃ: ۹۰]

اللہ پاک ہمیں ان واقعات کے ذریعے سے جگاتے ہیں کہ تم بھی اگر ایسا کرو گے تو تم پر بھی غضب پر غضب آئیں گے، کبھی تم پر زلزلے آئیں گے اور کبھی کافر تم پر مسلط ہو جائیں گے اور کبھی تم پر غضب آئے گا کہ تمہاری اولادیں نافرمان ہو جائیں گی اور کبھی تم پر قحط پیدا کردوں گا، کھانے کے لئے کچھ نہیں ملے گا اور کبھی تم پر غضب آئے گا کہ بارشیں نہیں ہوں گی اور کبھی تم پر غضب آئے گا کہ زمینیں اپنی برکتیں چھوڑ دیں گی۔ یہ ہماری نافرمانیوں کی وجہ سے آتا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اٰمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَأَنْتُمْ ظٰلِمُونَ ﴿٩٢﴾﴾ [البقرۃ: ۹۱، ۹۲]

اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ (اس قرآن) پر جس کو اللہ نے اُتارا ہے، کہتے ہیں: ہم تو اس (تورات) پر ایمان رکھیں گے جو ہم پر اُتاری گئی، حالانکہ یہ انکار کر رہے ہیں جو اس کے بعد آئی (یعنی قرآن) اور یہ حق ہے، تصدیق کرتی ہے اس تورات کی جو اُن کے پاس ہے۔ کہہ دیجیے پھر تم نے اللہ کے انبیاء کو اس سے پہلے کیوں قتل کیا؟ اگر تم (تورات پر) ایمان رکھتے تھے۔ اور تمہارے پاس موسیٰ معجزات لے کر آئے، پھر تم نے ان کے (میقات پر جانے کے) بعد بچھڑے کو (معبود) بنالیا اور تم حد سے گزر گئے تھے۔

ان آیات میں بھی بنی اسرائیل کی شقاوت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ جب ان کو ایمان کی دعوت دی جاتی ہے کہ قرآن پر ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں: ہم تو صرف اسی کتاب پر ایمان لائیں گے جو ہم پر اُتری ہے۔ تورات کے علاوہ جتنی کتابیں ہیں ان کا انکار کرتے ہیں۔ انجیل کا انکار کیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا، بلکہ ان پر ایسی تہمتیں لگائیں جو کسی شریف انسان سے متوقع نہیں ہوسکتیں، قتل کرنے کی کوشش بھی کی۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا: ان کو کہیں کہ اگر تم واقعی تورات پر ایمان لاتے ہو اور تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ ہم اس کتاب پر ایمان لائیں گے جو ہمارے پیغمبر پر اُتری ہے تو پھر تم نے اس پہلے انبیاء کو کیوں قتل کیا؟ کیا تورات میں.....نعوذ باللہ...... یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کردو؟ ایک دو نبی نہیں، بلکہ اللہ کے سینکڑوں انبیاء کو تم نے قتل کیا۔

تم دعویٰ کرتے ہو کہ ہم صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی مانیں گے اور کتاب تورات کو مانیں گے، اس کے علاوہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی نہیں مانتے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں مانتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: موسیٰ تمہارے پاس کھلی نشانیاں معجزات عصا، ید بیضا لے کر آئے، لیکن ان معجزات کو دیکھنے کے بعد بھی تم نے بچھڑے کی عبادت شروع کر دی تھی۔

یہود و نصاریٰ کافر کیوں؟

ایک مسئلے کو ذہن میں رکھنا! آج کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس دھوکہ میں ہے کہ نصرانی، یہودی ان سب لوگوں کو آپ کافر کہتے ہیں، جہنمی کہتے ہیں، حالانکہ وہ بھی اللہ کی ایک کتاب کو مانتے ہیں۔ تورات کو، انجیل کو، اللہ کو، آخرت کو، جنت کو، جہنم کو مانتے ہیں اور اچھے اچھے کام کرتے ہیں، جہاں مسلمانوں کو تکلیف ہوتی ہے دوائیں لے کر پہنچ جاتے ہیں، جہاں سردی ہوتی ہے وہاں رضائیاں اور کمبل پہنچاتے ہیں، جہاں قحط پڑتا ہے وہاں آٹا، گندم، دالیں اور کھانے کی چیزیں پہنچاتے ہیں، ایسے شریف آدمیوں کو ہم بلاوجہ کافر اور جہنمی کیوں کہہ دیں؟ ان کے مقابلہ پر دیکھو کہ مسلمان چوری کرتے ہیں، ڈاکے ڈالتے ہیں، ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں، سود کھاتے ہیں۔ اس طرح وہ تقابل کا ایک نقشہ کھینچتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں یہود و نصاریٰ کی محبت پیدا ہوجائے۔ اگر یہی بات ہوتی تو جو یہودی اور نصرانی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے، وہ بھی تو ایک کتاب کے ماننے کے دعوے دار تھے تو پھر ان کو ایمان کی دعوت دینے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو یہ فرماتے کہ تم اپنی کتاب کو مانتے رہو، ہم

اپنی کتاب کو مانتے ہیں، تم بھی مسلمان ہو ہم بھی مسلمان ہیں۔

یاد رکھیں! جب پہلی شریعت ختم ہو جائے اور پہلی کتاب کو منسوخ کر دیا جائے تو عقل کا اندھا آدمی بھی جانتا ہے کہ کسی ملک میں انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کو اگر منسوخ کر دیا جائے تو کوئی آدمی یہ حوالہ نہیں دے سکتا کہ پہلے یہ قانون موجود تھا۔ کیونکہ کورٹ کہے گی کہ یہ قانون اگرچہ پہلے موجود تھا، لیکن اب تو موجود نہیں ہے۔ اس لئے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تو پہلی شریعت منسوخ ہو گئی، اس وقت جو آدمی موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا اور عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لایا تو وہ کافر کہلائے گا۔ اسی طرح جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آئے تو ساری شریعتیں ختم، تمام ادیان ختم ہو گئے، اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دیا۔ اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں کوئی آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلمہ پڑھے یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلمہ پڑھے یا وہ دعویٰ کرے کہ میں تورات پر عمل کرتا ہوں یا انجیل پر عمل کرتا ہوں تو وہ کافر کہلایا، کیونکہ اس نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلمہ نہیں پڑھا اور اللہ نے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کتاب اُتاری ہے، اس پر ایمان نہیں لایا۔

یاد رکھیں کہ ایک نبی کا انکار کرو یا ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کا انکار کرو، بات برابر ہے۔ یعنی آپ قبلہ کا انکار یا ساری مسجدیں جن کا رُخ قبلہ کی طرف ہے، ان کا انکار کریں، ایک جیسا ہے۔ کیونکہ تمام مساجد کا قبلہ کعبۃ اللہ ہے۔ تو جب سب سے افضل اور سب سے اعلیٰ خاتم الانبیاء، حبیب کبریاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے وعدے لئے کہ جب میرے نبی کا زمانہ آئے تو ان کی مدد کرنا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ وہ ان کے بعد آئیں گے تو انبیاء سے وعدہ لینے کی کیا ضرورت تھی؟ مقصد یہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت واضح ہو جائے کہ جب ہم نبیوں سے یہ وعدے لئے جا رہے ہیں کہ اگر تم کو میرے نبی محمد مصطفیٰ کا زمانہ ملے تو ان کی اتباع کرو گے، اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر ناراض ہوئے جب وہ تورات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنانے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلال میں آ گئے اور فرمایا: اے عمر! اگر آج خود موسیٰ علیہ السلام میرے زمانہ میں موجود ہوتے تو وہ بھی میری اتباع کرتے اور تم قرآن کے ہوتے ہوئے تورات پڑھ رہے ہو؟

[مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۱۹۴، بابُ: الاعْتِصَامِ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ]

دوسری بات سمجھ لیں کہ پوری دنیا میں جتنے باطل مذاہب ہیں، ایک تو اس وجہ سے کافر ہیں کہ ان کا قرآن پر ایمان نہیں ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں ہے، اس لئے ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ جو اللہ کی

توحید کا منکر ہے اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے، جو حضور اکرم ﷺ کی رسالت کا منکر ہے اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں، اللہ تعالیٰ کے قرآن کی صداقت اور حقانیت کا جو منکر ہے اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ وہ تو اپنے نبیوں کی کتاب کو بھی نہیں مانتے اور جو اُن کے پاس کتاب ہے اس کو بدل ڈالا، اللہ کی توحید کے مقابلہ پر تثلیث کا عقیدہ پیدا کیا، کسی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنادیا اور کسی نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنادیا، کسی نے بی بی مریم علیہا السلام کو اللہ کی بیوی بنادیا، کسی نے کہا: ان تین میں سے ہر ایک خدا ہے۔ جب یہ عقیدے گھڑ لیے تو اس وجہ سے بھی وہ کافر ہیں۔ جو اللہ کی ذات اور صفات میں شرک کرنے والا ہے اس کے کفر کے اندر کسی کو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا یہ کہنا کہ شریف آدمی ہیں، لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ کسی کی مدد کرنے سے کسی کا جرم ختم نہیں ہو جاتا۔ مثلاً ایک ڈاکو ڈاکہ مار کر غریبوں میں مال تقسیم کردے تو کوئی عقل والا آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ بڑا اچھا کام ہے۔ یہ کونسی انسانیت ہے کہ دو انسانوں کو قتل کرو اور چار انسانوں کو کھلا دو۔ اس لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جس کو میری نبوت کا زمانہ ملا اور مجھ پر ایمان نہیں لے آیا، وہ یہودی ہو یا نصرانی ہو یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھتا ہو، وہ کافر ہے۔ چونکہ میں آخری نبی ہوں اور میری شریعت آخری شریعت ہے، مجھ پر جو کتاب اُتری ہے وہ آخری کتاب ہے اور میری نبوت کے بعد جو آدمی میری نبوت اور رسالت پر ایمان نہ لے آئے، اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

اگر کوئی آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا، پھر حضور اکرم ﷺ پر ایمان لے آیا تو ہم ان کو دہرا اجر دیں گے، ایک اپنے نبی پر ایمان لانے کا اور ایک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لانے کا۔ لیکن اگر ایک نبی کا انکار کرے تو گویا ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کا انکار کردیا، کیونکہ جو کسی ایک نبی پر ایمان لے آئے، اس کو سارے انبیاء پر ایمان لانا ہوگا۔ جیسے فرمایا: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ﴾ [البقرۃ:۲۸۵] ہم اس میں کوئی تفریق نہیں کریں گے کہ اس رسول پر ایمان لائیں اور اس پر ایمان نہ لائیں۔

خدا کی توحید کو بلا دلیل کے مانو:

کتب میں لکھا ہے کہ امام رازی رحمہ اللہ کو ایک خیال آگیا کہ اللہ کی توحید پر میں نے سینکڑوں دلائل جمع کئے ہیں تو ایک بدو اونٹ لے کر جارہا تھا، اونٹ کی مہار ڈنڈے سے باندھ کر اس ڈنڈے کو کندھے پر رکھ کر گنگناتا ہوا جارہا

ہے اور اس کے پیچھے اونٹ آ رہے ہیں۔ رازی کو کچھ سوجھی کہ اس سے پوچھوں تو سہی، اس کو توحید کی کوئی دلیل آتی بھی ہے یا نہیں؟ چنانچہ جا کر اسے سلام کیا اور پوچھا: خدا کو مانتے ہو؟ اس نے کہا: بالکل۔ اس کو کہا: تم نے خدا کو کیسے پہچانا ہے کہ خدا ہے؟ اس نے کہا: واہ بھائی صاحب! کیسی باتیں کرتے ہو؟ اس شخص نے لید اُٹھا کر کہا: یہ کیا ہے؟ امام رازی نے فرمایا: لید ہے۔ اس نے کہا: جہاں لید پڑی ہو تو ہمیں پتہ لگتا ہے کہ ادھر سے اونٹ گزر گیا ہے۔ پھر ایک مینگنی اُٹھا کر پوچھا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: مینگنی ہے۔ پوچھا: کس جانور کی ہے؟ انہوں نے کہا: بکری کی ہے۔ اس نے کہا: مینگنی دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ بکری کی ہے، لید دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ اونٹ کی ہے اور یہ ساری کائنات دیکھ کر پتہ نہیں چلتا کہ خدا ہے!!؟ انہوں نے کہا: بات تیری ٹھیک ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے پتہ چلے گا کہ خدا وحدہ لاشریک ہے؟ اس نے ڈنڈا اُٹھایا اور ان کے پیچھے بھاگ پڑا۔ امام رازی صاحب آگے ہیں اور وہ پیچھے ہے۔ انہوں نے کہا: خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ اس نے کہا: خدا پر دلیل مانگتے ہو، میں ابھی تمہارا سر پھاڑ دوں گا۔ امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے آ کر دو رکعت نماز پڑھی، اللہ کا شکر ادا کیا اور عرض کیا: اللہ میاں! اس کا جتنا پکا عقیدہ ہے، اتنا تو میرا بھی نہیں ہوگا کہ بندے ہو کر خالق پر دلیل مانگتے ہو۔

جب اللہ راضی ہوتا ہے تو جاہل کو بھی دین سمجھا دیتا ہے اور جب اللہ ناراض ہوتا ہے تو بڑے سے بڑے عالم بہک جاتے ہیں، بک جاتے ہیں اور گمراہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے گمراہ ہوئے کہ ان کے علم کو دیکھو تو حیرت ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کیا کرو کہ اللہ ہدایت پر رکھیں اور خاتمہ ایمان پر فرمائیں۔

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ؕ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا ؕ قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۚ وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ [البقرۃ: ۹۳]

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے اوپر طور کو اُٹھایا (کہ) لو جو ہم تمہیں دے رہے ہیں قوت کے ساتھ اور قبول کرو، کہنے لگے: ہم نے قبول کیا اور نہ مانا۔ اور ان کے دلوں میں ان کے کفر کی وجہ سے بچھڑے کی محبت سرایت کر گئی تھی، کہہ دیجیے! بری چیز ہے جس کا تمہیں تمہارا ایمان حکم دے رہا ہے، اگر تم مومن ہو۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کی مزید شقاوتوں کا بیان ہے۔ ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا﴾ کا عامل محذوف ہے، یعنی "وَ اذْكُرْ إِذْ

أَخَذْنَا" (یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا)۔ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل سے ایک عہد لیا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے احکام کی اتباع کرو گے، اللہ کے رسول کی اتباع کرو گے، اللہ کے جو حکم آئیں گے ان کو سنو گے اور مانو گے، اللہ تبارک و تعالیٰ جن چیزوں منع فرمائیں گے تم رک جاؤ گے۔ انہوں نے یہ عہد دے دیا، مگر اس کے بعد مکر گئے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کسی آدمی کے باپ دادا نے کوئی کام کیا ہو اور وہ اپنے باپ دادا کے طریقہ پر قائم ہو تو وہ بھی ان میں شمار ہوگا اور اسی طرح کا مجرم ہوگا جیسے اس کے باپ دادا تھے۔ اگر انہوں نے نقضِ عہد کیا تھا تو گویا انہوں نے بھی نقضِ عہد کیا۔ اگر انہوں نے گاؤ سالہ کی عبادت کی تو گویا انہوں نے بھی گاؤ سالہ کی عبادت کی۔

﴿خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ قوت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی آدمی زور سے قرآن سے چمٹ جائے کہ قوت سے پکڑ رہا ہوں، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ پوری دیانت داری، امانت اور حکمت کے ساتھ ان کے احکام پر عمل کرو۔

﴿وَاسْمَعُوْا﴾ اور سنو۔ سننے کا یہ معنی نہیں کہ تم تقریر سنو اور اس کے بعد اپنے اپنے کام میں لگ جاؤ، بلکہ ایسا سننا ہو کہ جس پر عمل کیا جائے، ورنہ جب حضور اکرم ﷺ قرآن پاک پڑھتے تھے تو کفار مکہ بھی سنتے تھے، لیکن ان کے سننے کا ان کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔

﴿قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ انہوں نے کہا: ہم نے سنا اور نہ مانا۔ اس پر مفسرین نے لکھا ہے کہ انہوں نے زبانِ قال سے کہا: ﴿سَمِعْنَا﴾ کہ اللہ میاں! ہم نے سن لیا، مان لیا اور زبانِ حال سے کہا: ﴿عَصَيْنَا﴾ کیونکہ جب پہاڑ ہٹ گیا تو وہ اسی طرح ہو گئے جیسے پہلے تھے۔ لہٰذا تعارض نہ رہا۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ:

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک کشتی میں موجود تھا، اس کشتی کو طوفان نے گھیرا تو سارے مکے کے سردار کہنے لگے: یا اللہ! یا اللہ! ہمیں بچا لے۔ اللہ نے مہربانی کی، طوفان سے ہماری کشتی نکل گئی۔ جب کنارے کے قریب پہنچے تو چھلانگ مار کر سب اُتر گئے اور ہر کسی نے اپنا بت نکالا اور اس کی پوجا شروع کر دی۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: خدا کی قسم ہے! اس دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اپنا ہاتھ محمد مصطفیٰ ﷺ کے ہاتھ پر رکھوں گا اور مسلمان ہو جاؤں گا۔ مجھے تو اسی دن سمجھ آ گیا کہ محمد ﷺ سچ کہتے ہیں۔

نصرانیوں کا بھی...... نعوذ باللہ...... یہ عقیدہ ہے کہ جو آدمی نصاریٰ میں داخل ہوتا ہے اس کو ایک پانی سے غسل

دیتے ہیں، جس کو عربی میں ''صباغ'' کہتے ہیں، انگریزی اور اُردو میں بپتسمہ کہتے ہیں۔ اب وہ تمام گناہوں سے پاک ہوگیا۔ اور یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر ایک آدمی ہفتہ بھر گناہ کرتا رہے، چوری کرتا رہے، شراب پیتا رہے، ڈاکے مارتا رہے، لیکن اتوار کے دن پادری کے سامنے آکر اپنے گناہوں کا اقرار کرلے تو پادری اس کو سرٹیفکیٹ دے دیتا ہے اور اس کے سارے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

بعینہٖ اسی طرح مجوسیوں کا بھی عقیدہ ہے (مجوسی، جو لوگ آگ کی پوجا کرتے ہیں، ہندوستان میں وہ پارسی کہلاتے ہیں) کہ ہر وقت ان کے عبادت خانے میں آگ کا الاؤ روشن رہتا ہے اور ان کے گھروں کے اندر بھی آگ جلتی رہتی ہے اور وہ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر اشلوک پڑھتے رہتے ہیں اور اس کے اردگرد پھرتے ہیں، یہ ان کی ایک عبادت ہے۔ اور ان کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ ہم جہنم میں نہیں جائیں گے۔ جب ہم نے آگ کو خدا مانا ہوا ہے اور اس کی ہم عبادت کررہے ہیں تو یہ اپنے عبادت کرنے والوں کو نہیں جلائے گی۔

اللہ تعالیٰ سے اُمید اور خوف کی مقدار:

حالانکہ ہمارا ایمان ہے کہ جنت کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولنے والے بھی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہوں گے، سب سے پہلے شفاعت کرنے والے آپ ﷺ ہوں گے، سب سے پہلے جنت کے اندر جانے والے آپ ﷺ ہوں گے، سب سے اعلیٰ مقام ''مقامِ محمود'' آپ ﷺ کے پاس ہوگا، ''لِوَاءُ الْحَمْد'' (حمد کا جھنڈا) آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کے ڈرنے کا یہ عالم تھا کہ ساری ساری رات مصلے پر کھڑے رہتے تھے، پاؤں مبارک سوج جاتے تھے، اکثر رات نماز اور تہجد میں گزرتی تھی۔

حضور ﷺ سے عرض کیا گیا: ایک نیا جوڑا پہن لیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نیا جوڑا پہن کر کیا کروں گا؟ اللہ کا فرشتہ صور کو منہ میں لئے ہوئے انتظار کررہا ہے کہ کب مجھے حکم ملے اور میں پھونکوں اور قیامت قائم ہوجائے۔ تو جب زندگی کا اتنا بھروسہ بھی نہیں ہے تو اچھے کپڑے پہننے کی کیا ضرورت ہے؟ اتنی بڑی شان کے باوجود اللہ کی خشیت سے آنسو مبارک بہتے تھے تو آپ ﷺ کی داڑھی مبارک بھیگ جاتی تھی۔ حضور اکرم ﷺ سجدے میں سر رکھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اللہ کی یاد میں گھنٹے گزر گئے ہیں۔ یہی عمل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا، یہی عمل تابعین کا تھا، یہی عمل محدثین کا تھا اور یہی عمل اللہ کے اولیاء کا تھا۔



یاد رکھیں! دنیا نے یہ مذہب ایسے اس لئے بنائے ہیں، تا کہ لوگوں کو دین سے ہٹا دیں، اللہ کے قرآن سے ہٹا دیں اور جھوٹی اُمیدوں میں مبتلا کر دیں کہ دیکھیں! ایک زانیہ عورت نے کتے کو پانی پلایا تھا، اللہ اس سے راضی ہو گئے اور اس کو معاف کر دیا تو عمل کی کیا ضرورت ہے؟ تم بھی زنا کرتے رہو، شراب پیتے رہو، اگر اللہ راضی ہونے پر آ گیا تو کسی چھوٹی سی بات پر راضی ہو جائے گا۔ لیکن یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اگر اللہ جہنم میں ڈالنے پر آئے تو ایک بلی کی وجہ سے جہنم میں ڈال دیا۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ سے ڈرتے بھی رہیں اور اس کی رحمت کی اُمید بھی رکھیں۔

مسئلہ ثابت کرنے کے طریقے:

مسئلہ ثابت کرنے کے تین طریقے ہوتے ہیں:

1 ......ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اُٹھ کر مسئلہ بتلا دے تو سمجھ آ گیا۔

2 ......اور ایک یہ ہوتا ہے کہ آگے آدمی ماننے والا نہیں تو مناظرہ کیا جاتا ہے اور دلائل دیئے جاتے ہیں۔ جب مناظرہ سے آگے بات بڑھ جائے تو مجادلہ بھی ہوتا ہے، یعنی جھگڑے تک نوبت چلی جاتی ہے۔

3 ......اور سمجھانے کا ایک طریقہ مباہلہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک دوسرے کو چیلنج کرتا ہے کہ آؤ میدان میں نکلتے ہیں۔ تم بھی اپنے بیوی بچے لے آؤ اور میں بھی اپنے بیوی بچے لے آتا ہوں۔ میدان میں کھڑے ہو کر جو جھوٹا ہو، اس کے لئے عذاب مانگتے ہیں۔ جو حق پر ہو گا وہ بچ جائے گا اور جو باطل پر ہو گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔

﴿قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝﴾ [البقرة: ۹۴، ۹۵]

کہہ دیجئے اگر آخرت کا گھر اللہ کے ہاں خالص تمہارے لئے ہے نہ کہ دیگر لوگوں کے لیے تو موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو۔ اور کبھی بھی یہ موت کی تمنا نہیں کریں گے، ان گناہوں کی وجہ سے جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں۔ اور اللہ گناہگاروں کو خوب جانتا ہے۔

سوال و جواب:

کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہودی جھوٹے ہیں تو تم مسلمان کب سچے ہو؟ کیا تم نے موت کی تمنا کی ہے کہ ہمیں

موت ملے اور جنت میں جائیں؟ تم بھی تو لاکھوں روپے خرچ کرتے ہو، ہسپتال میں ٹیکے لگواتے ہو اور علاج کراتے ہو کہ بچ جاؤں، دو چار دن اور زندگی مل جائے۔ تو تم نے بھی تو موت کی تمنا نہیں کی؟ علماء نے لکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے تو کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ صرف ہم ہی جنت میں جائیں گے، بلکہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جو ایمان اور عمل صالح پر مرے گا وہ جنت میں جائے گا اور اگر گناہگار ہوگا تو اللہ کی مرضی ہے، اللہ جنت میں بھیجیں یا جہنم میں بھیجیں۔ اس لئے مسلمان تو ڈرتا ہے۔

کن صورتوں میں موت کی تمنا جائز ہے؟

دوسری بات کہ موت کی تمنا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ موت اور زندگی کی ایک گھڑی معین ہے، وہ نہ آگے ہوتی ہے اور نہ پیچھے ہوتی ہے۔ اسی طرح اپنے آپ کو موت دینا شریعت میں حرام ہے کہ کوئی آدمی گولی رکھ کر، یا خنجر رکھ کر یا زہر پی کر مر جائے تو وہ بھی حرام موت مرتا ہے اور جہنم میں یہی عذاب اسے ہمیشہ کے لئے ہوتا رہے گا، اسی عذاب سے وہ جیتا اور مرتا رہے گا۔ لہٰذا موت کی تمنا ناجائز ہے۔

لیکن علماء نے لکھا ہے کہ اگر دنیا میں اسبابِ زندگی ختم ہوتے نظر آ گئے، اس وقت کسی نے موت کی تمنا کر لی تو وہ قابلِ اعتراض نہیں ہوتی، جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ (جنہوں نے صحیح بخاری لکھی ہے، جن کی کتاب کو اللہ نے مقبولیت کا درجہ دیا ہے) جب اپنے ملک میں مخالفین سے تنگ آ گئے، بادشاہوں نے تنگ کر دیا، ساری دنیا مخالف ہوگئی تو حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی کہا: میرا اللہ! آج تیری اتنی وسیع زمین مجھ پر تنگ ہوگئی، مجھے جینے کا کوئی مقام نہیں ملتا، رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا، اس سے بہتر ہے کہ مجھے موت عطا فرما دے۔ لہٰذا ایسے حالات کے اندر اگر کسی نے موت کی تمنا کی ہے تو اسے ہم شریعت کا مخالف نہیں کہیں گے۔

اسی طرح اگر کوئی آدمی شوقِ جہاد کے اندر آ کر ایسی باتیں کہتا ہے تو وہ قابلِ اعتراض نہیں ہوتیں۔ جیسا کہ جنگ اُحد کے اندر ایک صحابی نے اپنے ہاتھ کے اندر کھجوریں پکڑی ہوئی تھیں، دوسرے ساتھی سے کہا: جلدی دوڑو، مجھے اُحد کی طرف سے جنت کی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔ کھجوریں ڈال کر گئے اور شہید ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اختیار دیا تھا کہ اگر دنیا میں رہنا چاہتے ہو تو ہم آپ کی عمر بڑھا دیتے ہیں، ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں۔ اگر آپ ہمارے پاس آنا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرض کیا:

''اَللّٰھُمَّ! اَلْحِقْنِیْ بِالرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی'' اے اللہ! میں تیرے پاس آنا چاہتا ہوں۔[سنن الترمذی، حدیث:۳۴۹۶]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا کہ خدا کا ایک ایسا بندہ بھی ہے جس کو اللہ نے اختیار دیا ہے کہ دنیا میں رہنا چاہتے ہو یا آخرت میں آنا چاہتے ہو تو اس بندے نے اللہ کا ملنا چن لیا ہے۔ اس بات پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہمیں تعجب ہوا کہ رسول اللہ نے تو کسی بھی ایک بندے کی بات کی ہے کہ اسے دنیا اور آخرت میں سے کسی ایک کا اختیار دیا گیا ہے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس بات پر رونے لگ گئے!! لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی ہم میں سب سے زیادہ جاننے والے تھے کہ اس ''عبد'' سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

[صحیح البخاری، حدیث:۳۶۵۴، باب: قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: سُدُّوا الْأَبْوَابَ إِلَّا بَابَ أَبِي بَكْرٍ...]

طویل عمر کے بعد بھی تو جہنم سے نہیں بچ سکتے:

حضور اکرم ﷺ کو اللہ نے فرمایا: یہ یہودی زندگی پر بڑے بھوکے ہیں، مشرکین سے بھی زیادہ کہ ان کو بھی ڈر ہوتا ہے کہ ہم نے مرنے کے بعد جہنم میں جانا ہے، لیکن وہ بھی زندگی پر اتنے حریص نہیں، جتنے یہودی حریص ہیں۔ ان کا ہر آدمی تمنا کرتا ہے کہ مجھے ایک ہزار سال کی زندگی ملے، میں دنیا میں ہزار سال زندہ رہوں۔ اللہ نے فرمایا: اگر ہم ان کو ہزار سال کی زندگی دے بھی دیں تو کیا اس طرح وہ عذاب سے بچ جائیں گے؟ پہلی اُمتوں کے لوگوں کی عمریں ہزار ہزار سال ہوتی تھیں، کیا وہ عذاب سے بچ گئے؟

موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے ایک جن سے آپ ﷺ کی ملاقات:

ایک دن حضور ﷺ باب السلام سے عکاظ بازار کی طرف جا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک آدمی آ رہا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: یہ آنے والا جن معلوم ہوتا ہے، اس کی چال ایسے ہے۔ جب قریب آ کر اس نے سلام کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: تم کون ہو؟ اس نے کہا: حضور! میں جن ہوں۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ مجھے آپ اسلام سکھلائیں اور اللہ کا قرآن سنائیں۔ حضور پاک ﷺ نے اس کو کلمہ پڑھایا۔ اس کے بعد اُس نے کہا: یارسول اللہ! میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تورات سنی تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے انجیل بھی سنی تھی اور آج حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے اللہ کا قرآن بھی سن لیا ہے۔

اسی طرح سانپوں کی بڑی عمر ہوتی ہے۔ بڑی عمر ہو جانے سے کیا ہو جاتا ہے؟ اللہ پاک سے دعا کرو کہ اللہ جتنی عمر دے اسلام، ایمان پر دے اور خاتمہ ایمان پر ہو۔ پھر تھوڑی عمر بھی ہو تو سبحان اللہ!! اور بڑی عمر بھی ہو تو سبحان اللہ!!

جوانی کے نیک اعمال بڑھاپے میں بھی لکھے جاتے ہیں:

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے، بال سفید ہو جاتے ہیں اور آدمی چلنے کے قابل نہیں رہتا تو اللہ پاک فرشتوں کو حکم دیتے ہیں کہ میرا بندہ صحت میں دس پارے قرآن کے پڑھتا تھا، اب بوڑھا ہو گیا ہے، لیکن تم لکھتے رہو کہ یہ پڑھ رہا ہے، عاجز ہو گیا ہے، لیکن اس کا دل تو کرتا ہے۔ لہٰذا جب تک زندہ ہے، اس کے یہ اعمال لکھتے چلے جاؤ۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو ساٹھ سال سے زیادہ عمر عطا فرماتے ہیں اور وہ ایمان پر قائم رہتا ہے، وہ شکر کرے کہ اللہ نے مجھے جنتی بنا دیا ہے۔ اسی طرح اگر عمر تھوڑی بھی ہے، لیکن ایمان پر گزری ہے تو سبحان اللہ!

کسی چیز کی محبت محب کو اندھا بہرا کر دیتی ہے:

اس لئے اللہ پاک نے فرمایا: اگر ان یہودیوں کو ہزار سال عمر بھی دے دیں، تب بھی یہ اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ اور اللہ جاننے والے ہیں جو یہ عمل کر رہے ہیں، اللہ کے آگے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے، اس لئے ان کو ان کے ہر عمل کی سزا ملے گی۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِي وَ يُصِمُّ''[1] (کسی چیز کی محبت آدمی کو بہرا اور اندھا کر دیتی ہے)۔ یعنی جب آدمی کسی چیز کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اندھا ہو جاتا ہے، اس کو دوسرا راستہ نظر ہی نہیں آتا اور بہرا ہو جاتا ہے کہ کسی کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

اللہ پاک نے جن کے دلوں کے اندر توحید کی محبت بھر دی ہے وہ توحید کے دیوانے ہو گئے، اسلام کے پروانے بن گئے۔ انہوں نے اسلام کے لئے تکلیفیں اُٹھائیں، انہیں انگاروں پر لٹایا گیا، پھانسیوں پر لٹکایا گیا، ان کی ٹانگوں کو چیرا گیا، لیکن وہ اللہ کی توحید کی محبت سے باز نہ آ سکے اور ان کی زبانوں پر ''اَللّٰہُ الصَّمَدُ'' کے نعرے رہے۔

[1] [سنن ابی داؤد، حدیث: ۵۱۳۰، باب: في الهوى]

حضور اکرم ﷺ سے عشق و محبت کے تقاضے:

اسی طرح جو لوگ حضور ﷺ کی محبت میں آئے اپنی جانیں قربان کر دیں، اپنے بچے قربان کر دیئے، اپنی اولادیں قربان کر دیں۔ کہہ دینا تو بڑا آسان ہے، لیکن کوئی عمل کر کے دکھلائے کہ جنگ ہو رہی ہے اور تیروں کی برسات آرہی ہے، ایک صحابی ڈھال لے کر حضور ﷺ کے سامنے کھڑے ہیں، کہیں سے تیر آتے ہیں تو ڈھال پر روک رہے ہیں۔ خدا کی قدرت کہ دشمن کے تیروں کی بارش کی وجہ سے ان کی ڈھال ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد جب تیر آئے تو صحابی نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا، اپنا بدن چھلنی کروا دیا، لیکن حضور ﷺ تک تیر نہیں پہنچنے دیا۔

زبان سے کہہ دینا تو بڑا آسان ہے کہ ماشاء اللہ! حضور کملی والے سے ہمیں بڑی محبت ہے، حضور ﷺ کا روضہ مبارک دیکھ کر سینے میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ سبحان اللہ! ہم تو نبی کے غلام ہیں، لیکن دو تولے کی داڑھی بھی نہیں رکھ سکتے، پانچ وقت کی نماز ادا نہیں کر سکتے۔ اذان ہو رہی ہے، لیکن کاروبار میں مست بیٹھے ہوئے ہیں۔ ویسے پوچھو تو کہتے ہیں: ہم حضور ﷺ کے غلام ہیں، حضور کی محبت ہی تو ہمیں مکہ، مدینہ میں لے آئی ہے، لیکن ایسے بھی بدبخت لوگ یہاں رہتے ہیں جن کو سالہا سال گزر جاتے ہیں، لیکن کعبہ کی نماز بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں سالہا سال گزر جائیں گے مدینہ نصیب نہیں ہے، طواف نصیب نہیں، رمضان کے اندر سگریٹ پیتے ہیں، رمضان المبارک کے مہینہ میں ٹیپ لگا کر گانے سنتے رہتے ہیں...... اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ...... اس لئے دعویٰ کرنا بڑا آسان ہے، لیکن میرے محمد مدنی ﷺ کے ساتھ عشق نبھانا بڑا مشکل ہے۔ اپنے عمل، کردار اور اپنے لباس سے عشق کا اظہار بڑا مشکل ہے۔

اتباعِ سنت میں ایک بزرگ کا واقعہ:

ہمارے ایک شیخ تھے، تقریباً ایک سو دو سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ ساری زندگی انہوں نے شیشے کے گلاس میں پانی نہیں پیا۔ جب دنیا نے زور لگایا تو فرمایا: بالکل جائز ہے، میں انکار نہیں کرتا، مگر میرے پاک نبی ﷺ نے مٹی کے برتن میں پیا ہے، میں اس سے پیوں گا۔ ساری زندگی انہوں نے میز پر بیٹھ کر کھانے کا تصور ہی نہیں کیا۔ جب ان کے گاؤں میں بجلی آگئی تو سب لوگوں نے زور لگایا کہ آپ کی مسجد اور آپ کے گھر میں ہم بجلی لگا دیتے ہیں، خرچ نہیں لیں گے، اور ساتھ یہ بھی کہ آپ کی مسجد اور گھر کی بجلی کا بل چارج نہیں کیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا: میرے

نبی کے گھر میں بجلی نہیں تھی، میں بجلی نہیں لگواؤں گا۔ میں جب تک زندہ ہوں، گھر میں دیا جلے گا اور مسجد میں بھی دیا جلے گا۔ یہ لوگ عاشق رسول اللہ تھے!! اللہ تعالیٰ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں فرمائے۔

یہ لوگ تھے جن کی صحبت میں بیٹھنے کے بعد شرابی نے توبہ کر لی، ڈاکو نے توبہ کر لی، چور نے توبہ کر لی، زانی نے توبہ کر لی۔ ہم بڑے سے بڑے خطرناک قسم کے لوگوں کو حضرت کی خدمت میں جاتے تھے، کیونکہ ہماری برادری ایسی ہے، اللہ پاک سب کو ہدایت دے۔ ان کو کسی نہ کسی بہانے سے اپنے ساتھ لے آتے تھے۔ حضرت نے کچھ نہیں کہا، صرف پوچھ لیتے تھے کہ اس کا نام کیا ہے؟ کون ہے؟ کس علاقے کا ہے؟ کیا کام کرتا ہے؟ تو کہتے: ماشاء اللہ! اللہ مجھے اچھے کاموں کی توفیق دے، اللہ تمہیں بُرے کاموں سے بچالے۔ اللہ تجھے میرے مدنی کا غلام بنادے۔ جب صبح کے وقت ان کی مسجد سے نکلتے تو وہ آدمی کہتے: ہماری توبہ کراؤ، جو گناہ ہو گئے وہ ہو گئے، آگے (ان شاء اللہ) ختم!

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی اپنی زندگی سنت محمد مصطفیٰ ﷺ پر تھی۔ آج پیر نہیں ہیں، پیر تو وہ ہوتے تھے کہ جن کی نظر پڑنے سے انقلابات آتے تھے، جن کی صحبت اختیار کرنے سے انسانوں میں تبدیلی آتی تھی۔ اب یا تو ہماری آنکھیں کام نہیں کرتیں، ورنہ ہمیں کوئی ایسی جگہ نظر آتی یا اللہ والوں نے فیصلہ کر لیا کہ ہم نے ان اندھوں کے سامنے نہیں آنا۔ لہٰذا ہم کہیں چھپ چھپا کر زندگی گزاریں۔

جیسا کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ایک وقت آجائے گا کہ آدمی اپنے دین کو بچانے کے لئے پہاڑوں کی غاروں میں بھاگ جائیں گے، وہ علیحدہ جا کر رہیں گے، جلوت کو پسند نہیں کریں گے اور کسی سے بات نہیں کریں گے۔

میں نے باہر کی دنیا میں سوچا ہے یا سمجھا ہے۔ یہ تبلیغی جماعت والے لوگ غنیمت ہیں، ان کے اندر بھی اگر کوئی لگ جائے تو تبدیلی آتی ہے، اس کی اصلاح ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنت کو قبول فرمائے۔ میں تو اس نظریے کا آدمی ہوں کہ جو آدمی جس شکل میں بھی دین کا کام کر رہا ہے، وہ غنیمت ہے۔ کوئی قلم سے کام لے رہا ہے، کوئی اپنے محاضرات سے کام لے رہا ہے اور کوئی جدید انداز سے دین کا کام کر رہا ہے...... اللہ پاک سب کی محنت قبول فرمائے...... چونکہ جو بھی دین کا کام کرے، ان کے لئے ہمارے دلوں میں محبت ہے، ہمارے دلوں کے اندر بغض، شرک و بدعت والے کے لئے ہے، صحابہ کے دشمن کے لئے ہے، اہل بیت کے دشمن کے لئے ہے۔ ورنہ جو آدمی جس جماعت سے ہے، جس طرح ہے اور جیسا کام کرتا ہے، ہم دعائیں کرتے ہیں کہ اللہ پاک سب کی محنت کو قبول فرمائے۔

اس دور میں کوئی آدمی خدا کا نام لے تو شکر کرو، ورنہ ہم تو ایسے دور سے گزر رہے ہیں کہ لوگ رات دن، دولت دولت، پیسے کے چکر میں ہیں، ان کو خدا یاد ہے اور نہ رسول یاد ہے۔ اس دور کے اندر بھی کوئی آدمی صبح کی نماز پڑھا کر بیس بچوں کو بٹھا کر پڑھاتا ہے تو شکر کرو کہ کوئی قرآن کا نام لینے والا تو ہے، اس کی برکت سے بستی بچی ہوئی ہے۔ اور اس آدمی کی فکر کرو جو محروم ہے۔ اللہ پاک اس کو مسجد کے اندر آنے کی توفیق دے، اللہ پاک جھگڑوں اور اختلافات سے بچائے، اللہ ہمارے دلوں کے اندر سے بغض، عناد اور کدورتیں دور فرمادے۔

تفسیر:

حضرت سدی رحمہ اللہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کو پکڑا جو سامری نے سونے چاندی کا بنایا تھا اور مبرد کے ساتھ اس کو ذرہ ذرہ کر دیا، پھر اس کو دریا میں پھینک دیا، پھر اس دریا سے جتنے دریاؤں کو پانی جاتا تھا، سب دریاؤں میں کچھ نہ کچھ ذرہ اس کا بھی پہنچ گیا۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اس دریا سے اب سارے پانی پی لو۔ انہوں نے پانی پیا۔ کہتے ہیں کہ جس آدمی کے دل میں اس بچھڑے کی محبت تھی، اس کی مونچھوں والی جگہ پر اس سونے کے کچھ ذرات ظاہر ہو گئے۔

اللہ پاک نے فرمایا: ﴿وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ﴾ [البقرۃ: ۹۳] یہ ہیں جن کے دلوں میں ابھی تک محبت بھری ہوئی ہے۔

بعض روایات کے اندر آتا ہے کہ جب ان لوگوں نے اس دریا کا پانی پیا تو ان کو جنون ہو گیا، یعنی ان کے دماغوں پر اثر ہو گیا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۲۶، البقرۃ: الآیۃ: ۹۳]

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾﴾ [البقرۃ: ۹۶]

اور آپ ان کو لوگوں سے زیادہ زندگی کا حریص دیکھیں گے اور ان لوگوں سے بھی جنہوں نے شرک کیا ہے، ان میں سے ہر ایک پسند کرتا ہے کاش کہ اس کی عمر ہزار سال کی ہو، پھر بھی یہ عذاب سے نہیں بچ سکے گا، اگرچہ اس کو یہ عمر دے دی جائے اور اللہ دیکھتا ہے جو یہ عمل کرتے ہیں۔

اگر یہود موت کی تمنا کرتے تو سب مر جاتے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان آیات کا ترجمہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ اگر آخرت کی حویلی خالص ان کے لئے ہے اور انہی کے لئے اگر جنت ہے تو ان کو چاہئے کہ یہ موت کی تمنا کریں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہاں دوسرا ترجمہ فرمایا کہ تم یہ دعا کرو کہ ہم دو میں سے جو جھوٹا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ موت دے۔ اگر تمہیں موت آگئی تو جنت میں چلے جاؤ گے، اگر تم سچے ہو۔ لیکن اللہ نے فرمایا: یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ یہ جانتے ہیں، ان کے پاس علم ہے، یہ کبھی ایسی بات نہیں کریں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے دین کے علم کے بعد کفر کر رہے ہیں جس دن یہ چیلنج ہوا۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَوْ أَنَّ الْيَهُوْدَ تَمَنَّوُا الْمَوْتَ لَمَاتُوْا'' اگر یہودی اس چیلنج کے بعد اس دن موت مانگ لیتے کہ اللہ میاں! ہمیں موت دے دے اگر ہم جھوٹے ہوں تو تمام یہودیوں پر موت آجاتی اور جہنم میں اپنا ٹھکانہ دیکھ لیتے۔ اور اگر میرے مقابلے میں مباہلے کے لئے نکلتے تو یہ واپس اس حال میں لوٹتے کہ وہ اپنے گھروں میں اپنے اہل وعیال میں سے کسی کو موجود نہ پاتے۔

اس میں ایک خلجان ہوتا ہے کہ جب موت کا وقت مقرر ہے تو آگے کیسے آجاتا اور ان کو جلدی موت کیسے آجاتی؟ یاد رکھیں! تقدیر میں جو اللہ نے لوح محفوظ میں لکھا ہے وہ صدق وعدل ہے، اس میں کسی قسم کا شک اور شبہ نہیں ہوسکتا۔ اس میں ساری تفصیلات لکھی ہوئی ہیں کہ اگر موت کی تمنا کریں گے تو ہم ان کو موت دے دیں گے، اگر تمنا نہیں کریں گے تو اپنے وقت پر مریں گے۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے بدلا نہیں کرتے۔ ہاں! تقدیر کے بعض معاملات ایسے ہیں کہ اللہ چاہتے ہیں تو بدل دیتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی قدرت کا اظہار فرماتے ہیں کہ میں تقدیر کا مالک اور خالق ہوں، قضا وقدر میرے ہاتھ میں ہے، خلق اور امر میرے ہاتھ میں ہے۔ اب وہ کسی کی زندگی بڑھا دیں تو اس کی مرضی ہے، اس کی شان ہے وہ جیسے چاہیں کر دیں۔ وہ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ [ہود: ۱۰۷] ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۲۷]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا واقعہ:

جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ملک الموت پر ناراض ہوئے تو موت کا فرشتہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا



اور واقعہ ذکر کیا تو اللہ نے حکم دیا کہ آپ ان سے کہیں کہ کسی بیل پر ہاتھ رکھ لیں، ان کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آ جائیں گے، اتنے سال ان کی زندگی بڑھا دیں گے...... اور ہاتھ کے نیچے ہزاروں بال آ جاتے ہیں...... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے عزرائیل! یہ بات بتلاؤ کہ اتنی عمر بڑھ جانے کے بعد پھر کیا ہوگا؟ انہوں نے کہا: موت تو آئے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: بعد میں جو مرنا ہے تو وقت پر مر جائیں، لہٰذا مجھے اور عمر بڑھوانے کی تمنا نہیں ہے۔

والدین کی اطاعت سے عمر میں برکت ہوتی ہے:

اسی طرح حدیث پاک میں آتا ہے: جو شخص یہ چاہے کہ میری عمر لمبی ہو اور میرے رزق کے اندر برکتیں پیدا ہو جائیں، وہ اپنے والدین کی فرمانبرداری کرے، والدین کی اطاعت کرے، والدین کو راضی کر لے۔ ان کی دعا لگے گی تو اللہ عمر بھی دراز کر دیں گے اور رزق بھی بڑھا دیں گے۔

اس کے اندر بھی اللہ کی تقدیر میں یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اگر یہ والدین کو راضی کرے گا تو ہم اس کی عمر اتنی بڑھا دیں گے، اگر والدین کو ناراض کرے گا تو اس کی عمر متعین یہ ہے۔ جیسا کہ اصحاب کہف پر اللہ نے تین سو نو سال نیند مسلط فرما دی اور نیند کے بعد بیدار ہو گئے۔ یہ تمام چیزیں، ان کی تفصیلات لوحِ محفوظ میں لکھ دی ہیں جو اللہ نے اپنے کمالِ علم سے کہ ابھی ہم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، تمام چیزیں اللہ پاک نے لکھ دی تھیں۔

تفسیر:

دوسری بات تحدی ہے کہ اگر وہ اللہ کے نبی کے مقابلہ پر آ کر چیلنج کرتے اور اس چیلنج کو قبول کر لیتے تو اللہ اپنے نبی کو سچا فرما دیتے۔ اس لئے فرمایا: اگر اس دن یہودی موت کی تمنا کر لیتے تو ان میں سے ایک بھی باقی نہ بچتا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ایک کرامت:

ایک آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا...... وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بڑا بغض رکھنے والا تھا...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے (بطور طنز) جواب میں کہا: ''جمرہ'' (انگارہ) ہے۔ فرمایا: تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: ''ابن شہاب'' (انگارے کا بیٹا)۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کس قبیلے سے ہو؟ اس نے کہا: ''الحرقة''. آپ نے فرمایا: کون سی جگہ کے رہنے والے ہو؟ اس نے کہا: ''بحرة النار''. آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کے کس قبیلے میں؟ کہا: ''ذات لذی'' میں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اپنے گھر کی طرف لوٹ جاؤ، اللہ نے

تمہارے گھر کو جلا دیا۔ جب وہ گھر لوٹا تو اس کا پورا گھر جل چکا تھا اور گھر کے رہنے والے بھی اکثر جل چکے تھے۔

[موطا امام مالک]

کوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ان کی گستاخی کرے تو اللہ نے اس وقت دنیا میں اس کا اثر ظاہر کر دیا تو جو اللہ کے نبی کے سامنے گستاخی کی جرأت کرے، وہ کیسے بچ سکتا ہے؟

صحابیٔ رسول پر تہمت لگانے والا بددعا سے اندھا ہو گیا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک آدمی نے ایک صحابی پر تہمت لگائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو گورنر بنا کر بھیجا تھا...... اب تو نہیں ہو سکتا کہ ساری دنیا گورنر سے خوش ہو جائے...... ان پر ایک آدمی نے جھوٹی تہمت لگا دی۔ آپ نے ان کو بلا لیا اور اس آدمی کو بھی بلا لیا۔ اس آدمی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بیٹھ کر اس صحابی پر تہمت لگائی کہ اس نے فلاں غلطی کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس صحابی سے پوچھا: تم کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا: میں صفائی میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں اتنا دور مدینہ میں آیا ہوں اور یہ مدعی بن کر آیا ہے اور گواہ بھی لے آیا ہے۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ میری انکوائری ہوگی تو میں بھی گواہ لے آتا۔ لہٰذا میرے اور اس کے درمیان اللہ احکم الحاکمین ہے، اور اسی وقت اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ اُٹھا لئے کہ یا اللہ! اگر میں سچا ہوں اور یہ ظالم مجھ پر ناحق تہمت لگا رہا ہے تو مجھے زندگی میں دکھا دے کہ یہ اندھا ہو جائے۔ ابھی انہوں نے ہاتھ بند کئے تھے کہ وہ اسی مجلس میں اندھا ہو گیا۔

علماء نے لکھا ہے کہ اس کو دیکھا گیا کہ کوفہ کے بازاروں میں اندھا ہو کر بھیک مانگتا پھرتا تھا۔

﴿وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ﴾ کی اور ایک تفسیر:

ایک روایت میں ہے کہ عباد بن منصور نے حضرت حسن سے پوچھا: آپ نے اس آیت سے کیا سمجھا ہے کہ وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے بوجہ اس کفر و شرک کے جو وہ آگے بھیج چکے ہیں؟ انہوں نے کہا: تم مجھے بتلاؤ، اگر وہ موت کو محبوب رکھتے، پسند کرتے اور مانگ لیتے تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ مرجاتے؟ اگر مانگتے تب بھی نہ مرتے، چونکہ موت کا ایک وقت معین ہے۔ مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ قول غریب ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بات مضبوط ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۲۷]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نصارائے نجران:

عیسائیوں کا وفد نجران سے آیا اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مناظرہ کیا اور پوچھا: آپ عیسیٰ علیہ السلام کو

مانتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: بالکل مانتے ہیں۔ انہوں نے کہا: یہ بتلائیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ نے ان کو بغیر باپ کے پیدا فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کی کوئی مثال دیں۔ دنیا میں کوئی ایسا آدمی ہے جو بغیر باپ کے پیدا ہوا ہو؟ یا تو ہمیں کوئی دوسرا بندہ دکھائیں یا پھر ہمارے عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ مان لیں تو اللہ نے قرآن نازل فرمایا: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٥٩﴾﴾ [آل عمران:٥٩] کہ عیسیٰ کی اللہ کے نزدیک پیدائش کی مثال ایسے ہے جیسے حضرت آدم علیہ السلام کی۔ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ فرمایا: ہو جا۔ تو وہ جیتے جاگتے انسان ہو گئے۔

[تفسیر ابن کثیر:١/١٢٧]

جوش اور جگر:

جیسے جوش مراد آبادی اور جگر مراد آبادی دونوں شاعر تھے، جوش کمیونسٹ اور دہریہ قسم کا آدمی تھا اور جگر مذہبی ذہن رکھنے والا آدمی تھا۔ ایک دن اکٹھے ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، جگر نے بیٹھے بیٹھے کہا: اللہ! ۔ جوش نے فوراً جگر کی طرف دیکھ کر کہا: اچھا! آپ نے مجھے پکارا ہے؟ جگر نے فرمایا: میں نے تو اپنے خدا کو پکارا تھا، پتہ نہیں شیطان درمیان میں کہاں سے ٹپک پڑا؟

عیسائیوں کی ہٹ دھرمی:

عیسائیوں نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کا بیٹا ہے۔ اللہ نے فرمایا: اس لئے کہتے ہو کہ اس کا باپ نہیں۔ اس طرح تو آدم علیہ السلام کا بھی باپ نہیں اور ماں بھی نہیں ہے۔ عیسائیوں سے جواب نہ بنا اور خاموش ہو گئے۔ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ باہر کھڑے ہو کر اللہ سے دعا مانگتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ رات کو موقع دیں۔ پھر رات کو سوچ کر جواب دیں گے۔ رات کو پھر گئے کہ ہم مباہلہ نہیں کرتے۔ ان کے پادریوں نے بتلا دیا کہ اگر مباہلہ کرو گے تو اللہ کا قہر ٹوٹ پڑے گا، کیونکہ یہ اللہ کے سچے نبی ہیں، لیکن ہم مانتے نہیں۔ [تفسیر ابن کثیر:١/١٢٧]

طویل عمری کی فضیلت:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابن جزری نے اس آیت کی تفسیر فرمائی ہے کہ اس کا ایک پہلو بہت شاندار ہے،

لیکن ایک پہلو میں قابلِ اعتراض بات بنتی ہے کہ مباہلہ صرف اس بات پر ہے کہ موت مانگو۔ یہ تو دشمن بھی کہہ سکتا ہے کہ مسلمان بھی تو موت نہیں مانگتے اور کتنے مسلمان ہیں جو بیمار ہوتے ہیں تو اپنے اوپر لاکھوں خرچ کرتے ہیں، بلکہ حدیث پاک میں آیا، حضور پاک ﷺ نے فرمایا: ''خَيْرُ النَّاسِ مَنْ طَالَ عُمُرُهُ وَ حَسُنَ عَمَلُهُ'' (تم لوگوں میں وہ آدمی بڑا اچھا ہوتا ہے کہ جس کی عمر بھی لمبی ہو اور وہ عمل بھی اچھے کرے)۔ [کنز العمال، حدیث: ۴۲۶۴۹]

کیونکہ ایک آدمی چالیس سال نماز پڑھے، اب پانچ نمازوں کا حساب لگالیں اور اگر اللہ اس کو سو سال عمر دے اور وہ سو سال نماز پڑھے تو ظاہر بات ہے کہ اس کی نمازیں زیادہ ہو جائیں گی، اس کی عبادت زیادہ ہو جائے گی اور جتنے نیک اعمال زیادہ اور خوبصورت ہوتے چلے جائیں گے، اتنے درجات بڑھتے چلے جائیں گے۔

اگر بڑی عمر بُری ہوتی تو صحیح احادیث کے اندر موجود ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے خادم ہیں، وہ اور ان کی والدہ اُمّ سلیم رضی اللہ عنہا بھی موجود تھیں۔ انہوں نے عرض کیا: حضور! آپ کا یہ چھوٹا خادم انس ہے، اس کے لئے تو دعا فرما دیں۔ حضور ﷺ نے ان کے لئے دعا فرمائی: اے اللہ! میرے اس خادم کی عمر، اس کی اولاد اور اس کے رزق و مال میں بھی برکت عطا فرما۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ حضور ﷺ کی ساری دعائیں منظور ہو گئیں۔ عمر اتنی لمبی ہو گئی کہ میں ایک سو بیس سال کی عمر کو پہنچ گیا، اور اللہ نے اولاد اتنی دی کہ اولاد کی اولاد اور ان کی اولاد کو گنوں تو ایک سو بیس آدمی بنتے ہیں، اور اللہ نے میرے رزق میں ایسی برکتیں عطا فرما دیں کہ ساری دنیا کے باغ سال میں ایک دفعہ پھل لاتے ہیں اور میرا باغ دو دفعہ پھل لاتا ہے، ساری دنیا کے باغوں میں ریحان کی خوشبو ریحان کی ہے، لیکن میرے باغ میں جو ریحان ہے، اس کی خوشبو مشک وغیرہ کی ہے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۱۹۸۲، باب: مَنْ زَارَ قَوْمًا فَلَمْ يُفْطِرْ عِنْدَهُمْ]

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ایک ہزار پچاس سال ہے، جس میں ساڑھے نو سو سال تو آپ نے تبلیغ فرمائی اور چالیس سال کے بعد آپ کو نبوت ملی۔ طوفان کے بعد بھی آپ ساٹھ سال زندہ رہے۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اسی لئے موت کی تمنا کو مقامِ مباہلہ قرار دینا، یہ بات قابلِ اعتراض لگتی ہے۔ کیونکہ وہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ تم موت کی تمنا کرو۔ اور پھر حضور ﷺ نے موت کی تمنا سے منع بھی فرمایا ہے کہ موت کی تمنا بھی نہ کیا کرو اور یہ تمنا بھی نہ کیا کرو کہ دشمن سے ہمارا مقابلہ ہو۔ ہاں! ہو جائے تو پھر جم جاؤ، لیکن خود نہ مانگا کرو۔ اس

لئے اصل بات وہی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمائی کہ اگر تم سچے ہو تو باہر نکل کر مباہلہ کرو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۲۸، البقرۃ: الآیۃ: ۹۶]

وحدتِ ادیان کے فلسفے کا رد:

میرے آقا خاتم الانبیاء ﷺ کے بعد کسی آدمی کو اس وقت تک نجات نہیں مل سکتی، جب تک کہ وہ حضور ﷺ پر ایمان نہ لے آئے۔ جدید پڑھے لکھے لوگوں کو بھی مغالطہ ہے اور ان لوگوں کو بھی جنہوں نے علم مطالعہ سے حاصل کیا اور باقاعدہ کسی استاد سے یا طریق علم سے حاصل نہیں کیا۔ ان کو بھی ذہنوں میں ایک مغالطہ ہے کہ جو آدمی اللہ پر ایمان رکھتا ہو، آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور دنیا میں اچھے کام کرتا ہو تو وہ بھی جنت میں جائے گا اور جہنم میں نہیں جائے گا۔

یہ غلط بات ہے۔ اور اس کو وہ وحدتِ ادیان سمجھتے ہیں کہ تمام دین ایک ہیں، اللہ نے حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک جتنے انبیاء علیہم السلام بھیجے ہیں، سب کا دین ایک ہے، لہٰذا اگر کوئی آدمی کسی نبی پر ایمان رکھتا ہے تو یہ اس کی نجات کے لئے کافی ہے۔ بلکہ آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ ہندوؤں کے جو وید ہیں، دراصل ان کے معتقدات میں یہ ہے کہ وید بھی اللہ کی اُتاری ہوئی کتابیں ہیں، بھگوان وغیرہ جتنے انہوں نے بنائے ہوئے ہیں، ان کو بس سفارشی سمجھتے ہیں اور اپنی محبت کے اظہار کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں، ورنہ ان کا ایمان بھی خدا پر ہے۔

یہ ایک بڑا دھوکہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے فتنوں سے محفوظ رکھے اور جو ہماری جدید نسل ہے جس کو ''نوجوان طبقہ'' کہتے ہیں اور انہوں نے مشنری سکولوں میں پڑھا ہے۔ ماں باپ کو اس لئے داخل کرتے ہیں کہ انگریزی سیکھ لے گا، لیکن ان کو نہیں پتا کہ ایمان سے بھی فارغ ہو کر گھر آئے گا۔ ان کے اندر ماسوائے ایمان کے سب کچھ ہوگا، اس کی تہذیب بھی اچھی ہو جائے گی، اس کا بولنا بھی اچھا ہو جائے گا، لباس پہننا بھی وہ سیکھ جائے گا، لیکن وہ ایمان کی دولت سے خالی ہو کر لوٹے گا!!!

کوئی آدمی اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ آپ کے ملک میں کروڑوں روپے خرچ کر کے لوگوں کو ان کے مذہب پر قائم رکھے۔ تم بھی تو محنت کرتے ہو کہ وہ مسلمان بنے، قرآن وحدیث کا متبع بنے، حافظ قرآن بنے اور اس کی تہذیب محمد مصطفیٰ ﷺ میں ڈھل جائے۔ اس لئے وہ بھی اتنا پیسہ خرچ کرتے ہیں کہ بچے پڑھ جائیں۔ پڑھنے کے بعد انہی لوگوں نے اقتدار میں آنا ہے، انہی لوگوں نے کرسیوں پر بیٹھنا ہے۔ آپ کے مدارس عربیہ کا کوئی آدمی پڑھا ہوا کرسی

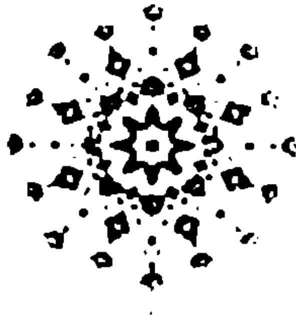


پر نہیں آئے گا۔ اقتدار میں وہ آئیں گے جو آکسفورڈ سے پڑھیں گے۔ اور جب وہ آئیں گے تو وہ بھی ان کے قالب میں ڈھل کر آئیں گے۔

یہاں تک ''تفسیر مکی'' حضرت مولانا محمد مکی مجازی مدظلہ کے سلسلہ دروس سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 35 تا 96 کی تفسیر مکمل ہوئی۔ آگے جلد نمبر 4 میں سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 97 سے تفسیری دروس شروع ہوں گے۔

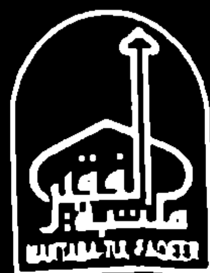
وَ لِلّٰہِ الْحَمْدُ وَ بِتَوْفِیْقِہٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ

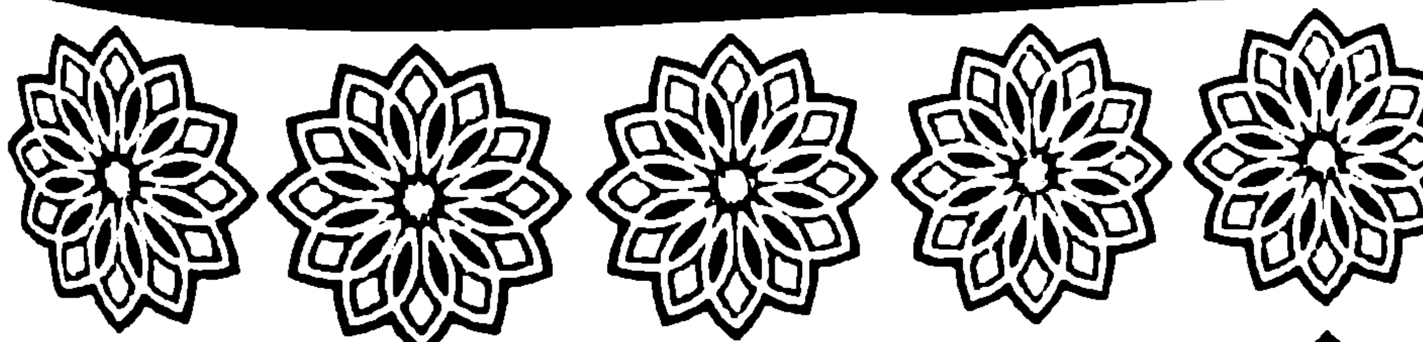
امداد اللہ انور غفرلہ اللہ





الله الله الله





تفسیرِ مکی

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں بیت اللہ، کتاب اللہ اور اہل اللہ۔ اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھنچ آنا امر بدیہی ہے، جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی دامت برکاتہم العالیہ کے درسِ قرآن کے حلقہ میں کیا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا محمد مکی دامت برکاتہم العالیہ کے درس کا یہ حُسن ہے کہ وہ جہاں توحیدِ خداوندی کے رُسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں، وہاں عشقِ رسول ﷺ اور سلف صالحین کی عقیدت و احترام پر حرف نہیں آنے دیتے، بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمال مہارت سے سامعین کو راہِ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دُروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکرِ آخرت، اخلاص و تقویٰ، اخلاقِ حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ زیرِ نظر تفسیر "انوار الحرم" المعروف "تفسیرِ مکی" حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دُروس کا مجموعہ ہے۔



مکتبۃ الفقیر
223 سنت پورہ فیصل آباد
0322-8669680
Cell: 0300-9652292 Email: ALFaqeerfsd@yahoo.com